سالانہ چندہ
ہندستان سے ۶/-
پاکستان سے ۶/-
ششماہی
ہندستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

سالانہ چندہ
اعزازی خریداروں سے
پندرہ روپے
غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

جلد ۳۲ | بابتہ ماہ محرم الحرام ۱۳۸۴ھ مطابق جون ۱۹۶۴ء | شمارہ (۱)

اگر اس دائرے میں ○ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے، براہ کرم آیندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ جون تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:- اپنا چندہ سکریٹری اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیدیں۔ ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:- براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھدیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:- الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کردیا جاتا ہے اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں اسکی اطلاع ۲۰ تاریخ کے اندر آجانی چاہئے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔ — دفتر الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان سے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات

[illegible]ب کریم کے فضل و احسان سے گزشتہ شمارہ پر الفرقان کی عمر کے ۴۱ سال پورے ہوگئے
[illegible]ر اس شمارہ سے اس کی زندگی کا ۴۲ واں سال شروع ہو رہا ہے۔ حق تعالیٰ ہندوستانی مسلمانوں کو
[illegible] نازک ترین دور میں حق بینی اور حق گوئی کی توفیق دے اور نفس کی شرارتوں اور ہر قسم کی گمراہیوں سے حفا[illegible]

رَبَّنَا آتِنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا۔

صحیح ہے کہ ہمارے ملک کا دستور جمہوری اور سیکولر ہے اور اس کی نگاہ میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی
[illegible]رسی سب برابر ہیں، وہ مذہب یا نسل و رنگ کی بنا پر ملک کے شہریوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتا اس
[illegible]یں ایسی دفعات موجود ہیں جو اقلیتوں کے مذہب، زبان، تہذیب اور حقوق و مفادات کے تحفظ کی پوری
ضمانت دیتی ہیں۔

یہ بھی صحیح ہے کہ آزادی کے پہلے دن ۱۵ اگست ۴۷ء سے لے کر ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء تک زمام حکومت
جس شخصیت کے ہاتھ میں رہی اور جو مسلسل ۱۷ برس تک حکومت کا سربراہ اور ملک و قوم کا سب سے زیادہ با اثر
اور مقبول لیڈر رہا ——— یعنی پنڈت جواہر لال نہرو ——— وہ اپنے ذہن و مزاج اور سیاسی
معتقدات کے لحاظ سے پورا جمہوریت پسند، کمزوروں کا ہمدرد، فرقہ پرستی کا دشمن اور اقلیتوں کے ساتھ انصاف کا حا[illegible]

لیکن اس سب کے باوجود یہ بھی واقعہ ہے جس پر گزشتہ سترہ سال کا ایک ایک دن گواہ ہے کہ اس
ساری مدت میں یہاں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ رہا ہے اور ان کے ساتھ اتنی بڑی بڑی ناانصافیاں ہو[illegible]
رہی ہیں جو جمہوریت اور سیکولرزم کے تصورات سے کوئی میل نہیں کھاتیں ——— اگر تہذیبی اور اقتصا[illegible]
ومعاشی معاملات کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو یہ بات تو نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ ۴۷ء کے طوفانی او[illegible]
ہوائی فسادات کے بعد (جن کا سلسلہ گاندھی جی کی قربانی پر ختم ہوا تھا) کئی سو (بعض باخبر حضرات کے بیا[illegible]

ے گئے لیکن یاد نہیں پڑتا کہ کسی جگہ کے بارہ میں سنا ہو یا کبھی اخبار میں دیکھا ہو کہ ان فسادات کے کسی
کو کسی مسلمان کے قتل کے جرم میں پھانسی دی گئی ۔۔ شاید دنیا کے کسی جمہوری اور سکولر ملک میں اقلیت
خون کی ارزانی کی ایسی مثال تلاش نہ کی جا سکے۔

پھر یہ سب کچھ ان ۱۷ سالوں میں ہوا جن میں پورے ملک پر بلا شرکت غیرے جمہوریت اور سکولرزم کی
ردار کانگریس کا اقتدار رہا اور حکومت کے سربراہ پنڈت جواہرلال نہرو رہے جن کی جمہوریت پسندی اور
توں کی بہی خواہی اور ہمدردی واقعۃً ایک مسلم حقیقت ہے۔ انہی کے آخری دور میں دو ہی مہینے پہلے
ہ واڑیسہ (جمشید پور راورکیلا وغیرہ) کے وہ فسادات ہوئے جو دراصل ان علاقوں میں مسلمانوں کا صفایا
نے کی ایک حیرت انگیز حد تک منظم ہمہ گیر اور انتہائی وحشیانہ مہم تھی ۔۔۔۔۔ سرودے لیڈر جے پرکاش
ہ اور ان کے چند ساتھیوں نے ضمیر کی خلش سے بےچین اور بےتاب ہو کر ان فسادات کی سنگینی اور وحشت
بربریت کا کچھ ذکر اپنے ایک بیان میں کیا تھا لیکن فسادات کی بےپناہ وسعت اور ہلاک شدہ مسلمانوں
تعداد کے بارہ میں انہیں بھی خاموش رہنا پڑا جس کے لئے ہم انہیں معذور سمجھتے ہیں۔

خیر راقم سطور نے جب تک خود ان مقامات پر جاکر صورت حال کو نہیں دیکھا تھا فسادات کی
تباہی کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ اخبارات اور بیانات میں سب کچھ پڑھ لینے کے بعد بھی جو کچھ اس نے
ناتھا وہاں جاکر اس سے دس، بیس، پچاس گنا زیادہ دیکھا اور مردوں سے گزر کر عورتوں اور بچوں
ن کے ساتھ درندگی اور بربریت کی وہ دردناک اور شرمناک داستانیں عینی شاہدوں سے سنیں جن سے
،، بھیڑیے اور جنگلی سوّر بھی پناہ مانگیں ۔۔۔۔۔

انہی فسادات کے متعلق مسٹر جے پرکاش نرائن کے ایک خط کی بنا پر اور ان کی دردمندانہ اپیل پر
طے کیا گیا تھا کہ ممبران پارلیمنٹ کا ایک وفد وزیر بحالیات مسٹر مہابیر تیاگی کی قیادت میں ان مقامات
جائے گا، چند ہفتوں تک ان مقامات کے مظلوم مسلمان بھی اس وفد کے آنے کا تکتے رہے اور اس کے ساتھ انتظار
لے رہے لیکن اپنے انتقال سے چند ہی دن پہلے خود پنڈت نہرو نے اعلان فرمادیا کہ چونکہ واقعات معلوم ہو چکے ہیں

اس لئے وفد کے جانے کی تو ضرورت نہیں رہی البتہ مسٹر تیاگی مناسب وقت پر جائیں گے۔

بہرحال جو بھی مجبوریاں یا مصلحتیں ہوں پنڈت نہرو اپنی ذات و خیالات اور ذہن و مزاج کے لحاظ سے ملک کے بہترین آدمی ہونے کے باوجود مسلمانوں پر ظلم و ستم اور قتل و غارتگری کے اس سلسلہ کو روکنے کے لئے اپنا پورا اثر اور اپنی طاقت استعمال نہیں کر سکے، بلکہ اُن کے ۱۶ سالہ وزارت عظمیٰ کے دور میں مسلم دشمن طاقتوں کی سرگرمیاں برابر بڑھتی ہی رہیں اور حکومت کی پالیسی اُن سے ٹکر لینے کے بجائے چشم پوشی کرنے اُن کو نہ چھیڑنے بلکہ اُن کی مفسدانہ سرگرمیوں کو ہلکا کر کے دکھانے کی رہی، ہمارے نزدیک اسی پالیسی کے نتیجہ میں کلکتہ، جمشید پور اور راوڑکیلا وغیرہ میں مسلمانوں پر وہ قیامت آئی ——— کہ

آسمان را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

اب نہرو کے بعد ملک میں ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے ضرورت ہے کہ مسلمان زعما اور علماء اولیں فرصت میں جمع ہوں اور بہت سی باتوں میں اپنے نظریاتی اختلافات کے باوجود ملت کے اس مشترک اور بنیادی مسئلہ پر غور کریں کہ مسلم دشمن طاقتوں نے ہندوستان کو مسلمانوں سے خالی کرنے کی جو مہم خفیہ اور علانیہ چلا رکھی ہے جس کے پروگرام میں وہ سب کچھ بھی شامل ہے جو جنوری اور مارچ میں مغربی بنگال بہار، اور اڑیسہ میں ہوا اور حکومت کا جو رویہ (قولی نہیں عملی) اس بارہ میں رہا ہے اس پر گزشتہ ۱۶ سالہ تجربہ کی روشنی میں غور کر کے ملت کو کوئی رہنمائی دیں ———

ہمیں معلوم ہے کہ اس قسم کے مشاورتی اجتماع کی بات چیت دو تین مہینے سے چل رہی ہے اور وہ اسباب بھی ہمارے علم میں ہیں جن کی وجہ سے اس میں اب تک تاخیر ہوتی رہی لیکن اب جبکہ ہندوستان میں کم از کم حکومتی سطح پر ایک نئے دور کا آغاز کیا جا رہا ہے ——— یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی مشکلات، ان کے مسائل اور مطالبات پوری صفائی اور دیانتداری کے ساتھ نئی حکومت کے سامنے جلد از جلد لے آئے جائیں۔ اور ملت کو بھی نمائی سے بتا دیا جائے کہ اس ملک میں باعزت زندگی کا مقام حاصل کرنے کے لئے ان کو کیا رویہ اختیار کرنا ہے اور پیش آمدہ حالات سے کس طرح نمٹنا ہے ہماری گزارش ہے کہ مسلمان عمائد و زعما کا یہ مشاورتی اجتماع جولائی میں ضرور ہو جانا چاہئے، مزید تاخیر کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔

واللہ ولی التوفیق وھو المستعان

معارف الحدیث

مسلسل

میقات — احرام — تلبیہ

کعبۂ مکرمہ کو اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کا قبلہ اور اپنا محترم و مقدس "بیت" (گھر) قرار دیا ہے اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا، جو لوگ وہاں حاضری کی استطاعت رکھتے ہوں اُن پر عمر میں ایک دفعہ حاضر ہونا اور حج کرنا فرض کیا ہے اور اس حاضری اور حج کے کچھ لازمی آداب مقرر کئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ حاضر ہونے والے اپنے روزمرہ کے اور عام عادی لباس میں حاضر نہ ہوں بلکہ ایسے فقیرانہ لباس میں حاضر ہوں جو مُردوں کے کفن سے مشابہت رکھتا ہو اور آخرت میں میدانِ حشر کی حاضری کو یاد دلاتا ہو — کُرتا، پاجامہ صدری، شیروانی، کوٹ، پتلون کچھ نہ ہو، بس ایک تہبند باندھ لیں اور ایک چادر جسم کے اوپر کے حصہ پر ڈال لیں، سر بھی کھلا ہو، پاؤں میں موزہ بلکہ ایسا جوتا بھی نہ ہو جس سے پورا پاؤں ڈھک جائے[1]، اسی قسم کی کچھ اور بھی پابندیاں عائد کی گئی ہیں جن کا منشا یہ ہے کہ بندہ ایسی ہیئت اور صورت میں حاضر ہو جس سے اس کی عاجزی اور

---

[1] احرام کے سلسلہ میں یہ احکام صرف مردوں کے لئے ہیں عورتوں کو پردہ کی وجہ سے سِلے کپڑے پہننے اور سر ڈھکنے کی اور اسی طرح پاؤں میں موزہ وغیرہ پہننے کی اجازت دی گئی ہے۔

بے چارگی اور بے حیثیتی و بے مائگی اور عیش دنیوی سے بے رغبتی ظاہر ہو ـــــ لیکن بندوں کے ضعف کا لحاظ رکھتے ہوئے اُن کو اس کا مکلف نہیں کیا گیا کہ وہ اپنے گھر ہی سے احرام بند اور ان آداب کے پابند ہو کے روانہ ہوں، اگر یہ حکم دیا جاتا تو اللہ کے بندے بڑی مشکل میں پڑ جاتے، ابھی کچھ ہی زمانہ پہلے تک بہت سے ملکوں کے حاجی کئی کئی مہینے سفر کرنے کے بعد مکہ معظمہ پہنچا کرتے تھے اور اب بھی بہت سے ملکوں کے حجاج کئی کئی ہفتے کا بری اور بحری سفر کر کے وہاں پہنچتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنی طویل مدت تک احرام کی پابندیوں کا نبھانا اکثر لوگوں کے لئے سخت مشکل ہوتا اس لئے مختلف راستوں سے آنے والے حجاج کے لئے مکہ معظمہ کے قریب مختلف سمتوں میں کچھ مقامات مقرر کر دیئے گئے ہیں اور حکم دیا گیا ہے کہ حج یا عمرہ کے لئے آنے والے جب اِن میں سے کسی مقام پہ پہنچیں تو "بیت اللہ" اور "بلد اللہ الحرام" کے ادب میں وہیں احرام بند ہو جائیں۔

مختلف سمتوں کے یہ معین مقامات جن کی تفصیل آگے آئے گی "مواقیت" کہلاتے ہیں۔

یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ احرام باندھنے کا مطلب صرف احرام والے کپڑے پہن لینا نہیں ہے بلکہ یہ کپڑے پہن کے پہلے دو رکعت نماز (دوگانۂ احرام) پڑھی جاتی ہے اسکے بعد پکار کے تلبیہ پڑھا جاتا ہے "لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ"۔ اس تلبیہ کے پڑھنے کے بعد آدمی مُحرِم (احرام بند) ہو جاتا ہے اور اسی سے حج کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور احرام والی ساری پابندیاں اس پر عائد ہو جاتی ہیں ـــــ جس طرح تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد نماز کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور نماز والی ساری پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں۔

اس تمہید کے بعد مواقیت، احرام اور تلبیہ کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ ذیل احادیث پڑھیئے!

مواقیت:۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ وَقَّتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ذَا الْحُلَيْفَةِ وَلِاَهْلِ الشَّامِ الْجُحْفَةَ وَلِاَهْلِ نَجْدٍ قَرْنَ الْمَنَازِلِ وَلِاَهْلِ الْيَمَنِ يَلَمْلَمَ فَهُنَّ لَهُنَّ وَلِمَنْ اَتٰى عَلَيْهِنَّ مِنْ غَيْرِ اَهْلِهِنَّ لِمَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ فَمَنْ كَانَ دُوْنَهُنَّ فَمُهَلُّهُ مِنْ اَهْلِهٖ وَكَذَالِكَ وَكَذَاكَ حَتّٰى اَهْلُ مَكَّةَ يُهِلُّوْنَ مِنْهَا ــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذو الحلیفہ کو اہل مدینہ کا میقات مقرر کیا اور جحفہ کو اہل شام کا اور قرن المنازل کو اہل نجد کا اور یلملم کو اہل یمن کا پس یہ چاروں مقامات خود ان کے رہنے والوں کے لئے میقات ہیں اور ان سب لوگوں کے لئے جو دوسرے علاقوں سے ان مقامات پر ہوتے ہوئے آئیں جن کا ارادہ حج یا عمرہ کا ہو۔ پس جو لوگ ان مقامات کے ورے ہوں (یعنی ان مقامات سے مکہ معظمہ کی طرف کے رہنے والے ہوں) تو وہ اپنے گھر ہی سے احرام باندھیں گے اور یہ قاعدہ اسی طرح چلے گا یہاں تک کہ خاص مکہ کے رہنے والے مکہ ہی سے احرام باندھیں گے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ جَابِرٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مُهَلُّ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مِنْ ذِي الْحُلَيْفَةِ وَالطَّرِيْقِ الْاٰخَرِ الْجُحْفَةُ وَمُهَلُّ اَهْلِ الْعِرَاقِ مِنْ ذَاتِ عِرْقٍ وَمُهَلُّ اَهْلِ نَجْدٍ قَرْنٌ وَمُهَلُّ اَهْلِ الْيَمَنِ يَلَمْلَمُ ــــــ رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا اہل مدینہ کا میقات (جہاں سے ان کو احرام باندھنا چاہیئے) ذو الحلیفہ ہے اور دوسرے راستہ سے جانے

والوں کا میقات جحفہ ہے اور اہل عراق کا میقات ذات عرق ہے اور اہل نجد کا میقات قرن المنازل ہے اور اہل یمن کا میقات یلملم ہے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) اوپر والی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں صرف چار میقاتوں کا ذکر ہے، ذوالحلیفہ، جحفہ، قرن المنازل، یلملم۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں پانچویں میقات ذات عرق کا بھی ذکر ہے جس کو اہل عراق کا میقات قرار دیا گیا ہے۔ دونوں روایتوں میں ایک اور خفیف سا فرق یہ بھی ہے کہ پہلی روایت میں جحفہ کو اہل شام کا میقات بتایا گیا ہے اور دوسری روایت میں اس کو "دوسرے راستہ والوں کا" میقات کہا گیا ہے جس کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ اہل مدینہ بھی اگر دوسرے راستہ سے یعنی جحفہ کی طرف سے مکہ معظمہ جائیں تو وہ جحفہ سے بھی احرام باندھ سکتے ہیں اور ان کے علاوہ جو دوسرے علاقوں کے لوگ مثلاً اہل شام جحفہ کی طرف سے آئیں وہ بھی جحفہ سے احرام باندھیں اور بعض شارحین نے "دوسرے طریقہ والوں" سے مراد اہل شام ہی لئے ہیں اس صورت میں دونوں روایتوں میں صرف تعبیر اور لفظ ہی کا فرق رہے گا۔

بہر حال یہ پانچوں مقامات معین اور متفق علیہ میقات ہیں جن علاقوں کے لئے یہ میقات قرار دئے گئے تھے اُن سے مکہ مکرمہ آنے والوں کے راستہ میں یہ پڑتے تھے۔ ان کا مختصر تعارف یہ ہے۔

ذُوالحُلَیْفَہ ۔ جو اہل مدینہ کے لئے میقات مقرر کیا گیا ہے، مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ جاتے ہوئے صرف پانچ چھ میل پر پڑتا ہے، یہ مکہ معظمہ سے سب سے زیادہ بعید میقات ہے یہاں سے مکہ مکرمہ قریباً دو سو میل ہے، بلکہ آج کل کے راستہ سے قریباً ڈھائی سو میل ہے ـــــ چونکہ مدینہ طیبہ کا دین سے خاص تعلق ہے اس لئے اُن کا میقات اتنی بعید مسافت پر مقرر کیا گیا ہے، دین میں جس کا مرتبہ جتنا بڑا ہے اس کو مشقت بھی اتنی ہی زیادہ اٹھانی پڑتی ہے۔ ع

جن کے رتبے ہیں سوا اُن کو سوا مشکل ہے

جُحْفَہ ۔ یہ شام وغیرہ مغربی علاقوں سے آنے والوں کے لئے میقات ہے، یہ موجودہ رابغ کے قریب ایک بستی تھی اب اس نام کی کوئی بستی موجود نہیں ہے لیکن یہ معلوم ہے کہ اس کا محل وقوع رابغ کے قریب تھا جو مکہ معظمہ سے قریباً سو میل کے فاصلہ پر بجانب مغرب ساحل کے قریب ہے

قرن المنازل۔ یہ نجد کی طرف سے آنے والوں کا میقات ہے مکہ معظمہ سے تقریباً ۳۰۔ ۳۵ میل مشرق میں نجد جانے والے راستہ پر ایک پہاڑی ہے۔

ذات عرق۔ یہ عراق کی طرف سے آنے والوں کے لئے میقات ہے مکہ معظمہ سے شمالی شرق میں عراق جانے والے راستہ پر واقع ہے یہ مسافت مکہ معظمہ سے پچاس میل کے قریب ہے۔

یلملم۔ یہ یمن کی طرف سے آنے والوں کے لئے میقات ہے یہ تہامہ کی پہاڑیوں میں سے ایک معروف پہاڑی ہے جو مکہ معظمہ سے تقریباً ۴۰ میل جنوب شرق میں یمن سے مکہ آنے والے راستہ پر پڑتی ہے۔

جیسا کہ مندرجہ بالا دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ان مقامات کو خود ان کے باشندوں کے لئے اور دوسرے تمام علاقوں کے ان لوگوں کے لئے جو حج یا عمرہ کے واسطے ان مقامات کی طرف سے آئیں "میقات" مقرر فرمایا ہے فقہائے امت کا اس پر اتفاق اور اجماع ہے کہ جو شخص حج یا عمرہ کے لئے ان مقامات میں سے کسی مقام کی طرف سے آئے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ احرام باندھ کے اس مقام سے آگے بڑھے۔ احرام باندھنے کا مطلب اور اس کا طریقہ ابھی اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔

احرام کا لباس:-

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلًا سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا یَلْبَسُ الْمُحْرِمُ مِنَ الثِّیَابِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَلْبَسُوا الْقُمُصَ وَلَا الْعَمَائِمَ وَلَا السَّرَاوِیْلَاتِ وَلَا الْبَرَانِسَ وَلَا الْخِفَافَ اِلَّا اَحَدٌ لَا یَجِدُ النَّعْلَیْنِ فَلْیَلْبَسْ خُفَّیْنِ وَلْیَقْطَعْهُمَا اَسْفَلَ مِنَ الْکَعْبَیْنِ وَلَا تَلْبَسُوْا مِنَ الثِّیَابِ شَیْئًا مَسَّهُ زَعْفَرَانٌ وَلَا وَرْسٌ ۔۔۔ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ محرم (حج یا عمرہ کا احرام

باندھنے والا) کیا کیا کپڑے پہن سکتا ہے ؟ آپ نے فرمایا کہ (حالتِ احرام میں) نہ تو کرتا قمیص پہنو اور نہ سر پہ عمامہ باندھو اور نہ شلوار یا پاجامہ پہنو اور نہ باراتی پہنو اور نہ پاؤں میں موزے پہنو، سوائے اس کے کہ کسی آدمی کے پاس پہننے کے لئے چپل جوتا نہ ہو تو وہ مجبوراً پاؤں کی حفاظت کے لئے موزے پہن لے۔ اور ان کو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ کے جوتا سا بنا لے (آگے آپ نے فرمایا کہ حالتِ احرام میں) ایسا بھی کوئی کپڑا نہ پہنو جس کو زعفران یا ورس لگا ہو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) سوال کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں قمیص، شلوار، عمامہ وغیرہ صرف ان چند کپڑوں کا نام لیا ہے جن کا اس وقت رواج تھا یہی حکم ان تمام کپڑوں کا ہے جو مختلف زمانوں اور مختلف قوموں اور ملکوں میں ان مقاصد کے لئے استعمال ہوتے ہیں یا آئندہ استعمال ہوں گے جن مقاصد کے لئے قمیص، شلوار، عمامہ وغیرہ استعمال ہوتے تھے۔

زعفران تو معروف ہے ورس بھی ایک خوشبودار زرد رنگ کی پتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں چونکہ خوشبو کے لئے استعمال ہوتی تھیں اس لئے حالتِ احرام میں ایسے کپڑے کے استعمال کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے جس کو زعفران یا ورس لگی ہو۔

سوال کرنے والے شخص نے پوچھا تھا کہ "محرم کون سے کپڑے پہنے؟" آپ نے جواب میں فرمایا کہ "فلاں فلاں کپڑے نہ پہنے" اس جواب میں گویا آپ نے اس کی بھی تلقین فرمائی کہ پوچھنے کی بات یہ نہیں ہے کہ محرم کون سے کپڑے پہنے؟ بلکہ یہ دریافت کرنا چاہئے کہ کن کپڑوں کے پہننے کی اس کو ممانعت ہے، کیونکہ احرام کا اثر یہی پڑتا ہے کہ کچھ کپڑے اور کچھ چیزیں جن کا استعمال عام حالات میں جائز ہے احرام کی وجہ سے ان کا استعمال ناجائز ہو جاتا ہے اس لئے یہ دریافت کرنا چاہئے کہ احرام میں کن کپڑوں اور کن چیزوں کا استعمال ممنوع اور ناجائز ہو جاتا ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
يَنْهَى النِّسَاءَ فِي إِحْرَامِهِنَّ عَنِ الْقُفَّازَيْنِ وَالنِّقَابِ
وَمَا مَسَّ الْوَرْسُ وَالزَّعْفَرَانُ مِنَ الثِّيَابِ وَلْتَلْبَسْ
بَعْدَ ذٰلِكَ مَا أَحَبَّتْ مِنْ أَلْوَانِ الثِّيَابِ مُعَصْفَرًا أَوْ خَزًّا

أَوْ حُلِيٍّ أَوْ سَرَاوِيْلَ أَوْ قَمِيْصٍ أَوْ خُفٍّ ——— رواہ ابو داؤد

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ منع فرماتے تھے عورتوں کو احرام کی حالت میں دستانے پہننے سے اور چہرہ پر نقاب ڈالنے اور ان کپڑوں کے استعمال سے جن کو زعفران یا ورس لگی ہو۔ اور ان کے بعد وہ ان کے علاوہ جو رنگین کپڑے چاہیں پہن سکتی ہیں کسمی کپڑا ہو یا ریشمی اور اسی طرح وہ چاہیں تو زیور بھی پہن سکتی ہیں اور شلوار اور قمیص اور موزے بھی پہن سکتی ہیں۔　　(سنن ابی داؤد)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ احرام کی حالت میں قمیص، شلوار وغیرہ سلے کپڑے پہننے کی ممانعت صرف مردوں کو ہے، عورتوں کو پردہ کی وجہ سے ان سب کپڑوں کے استعمال کی اجازت ہے اور موزے پہننے کی بھی اجازت ہے، ہاں دستانے پہننے کی ان کو بھی ممانعت ہے اور منہ پر نقاب ڈالنے کی بھی ممانعت ہے ——— لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اجنبی مردوں کے سامنے بھی اپنے چہرے بالکل کھلے رکھیں، حدیث میں ممانعت چہرہ پر باقاعدہ نقاب ڈالنے کی ہے لیکن جب اجنبی مردوں کا سامنا ہو تو اپنی چادر سے یا کسی دوسری چیز سے ان کو آڑ کر لینی چاہئے ——— سنن ابی داؤد میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے، فرماتی ہیں کہ

"ہم عورتیں حج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ احرام کی حالت میں تھیں (تو احرام کی وجہ سے ہم چہروں پر نقاب نہیں ڈالتی تھیں) جب ہمارے سامنے سے مرد گزرتے تو ہم اپنی چادریں اوپر سے لٹکا لیتی تھیں اور اس طرح پردہ کر لیتی تھیں پھر جب وہ گزر جاتے تو ہم اپنے چہرے کھول دیتی تھیں۔"

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس بیان سے صاف ظاہر ہو گیا کہ احرام کی حالت میں عورتوں کو نقاب کے استعمال کی ممانعت ہے لیکن جب اجنبی مردوں کا سامنا ہو تو چادر سے یا کسی اور چیز سے ان کو آڑ کر لینی چاہئے۔

احرام سے پہلے غسل :-

عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ اَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَجَرَّدَ لِاِهْلَالِهِ وَاغْتَسَلَ ــــــــ

رواہ الترمذی والدارمی

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے کپڑے اتارے اور غسل فرمایا احرام باندھنے کے لئے۔

(جامع ترمذی، مسند دارمی)

(تشریح) اس حدیث کی بنا پر احرام سے پہلے غسل کو سنت کہا گیا ہے لیکن اگر کسی نے دوگانۂ احرام پڑھنے کے لئے صرف وضو کر لیا تب بھی کافی ہے اور اس کا احرام صحیح ہوگا۔

تلبیۂ احرام

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُهِلُّ مُلَبِّدًا يَقُولُ لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ، لَا يَزِيْدُ عَلٰى هٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ ــــ

رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلبیہ پڑھتے ہوئے سنا اس حال میں کہ آپ کے سر کے بال جمے ہوئے اور مرتب طور پر لگے ہوئے تھے (جیسا کہ غسل کے بعد سر کے بالوں کا حال ہوتا ہے) آپ اس طرح تلبیہ پڑھتے تھے۔

لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ	میں حاضر ہوں خدا وندا تیرے حضور
لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ	حاضر ہوں، حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک
لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ	ساتھی نہیں میں تیرے حضور حاضر ہوں'
لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ۔	ساری حمد و ستائش کا تو ہی سزاوار ہے

اور ساری نعمتیں تیری ہی ہیں اور ساری
کائنات میں فرمانروائی بھی بس تیری
ہی ہے تیرا کوئی شریک و سہیم نہیں۔

بس یہی کلمات تلبیہ میں آپ پڑھتے تھے اِن پر کسی اور کلمہ کا اضافہ نہیں
فرماتے تھے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل ابراہیم (علیہ السلام)
کے ذریعہ اپنے بندوں کو حج یعنی اپنے دربار کی حاضری کا بلاوا دلوایا تھا (جس کا ذکر
قرآن مجید میں بھی ہے) تو حج کو جانے والا بندہ جب احرام باندھ کے یہ تلبیہ پڑھتا ہے
تو گویا وہ ابراہیم علیہ السلام کی اُس پکار اور اللہ تعالیٰ کے اس بلاوے کے جواب میں
عرض کرتا ہے کہ خداوندا تو نے اپنے دربار کی حاضری کے لئے بلوایا تھا اور اپنے خلیل علیہ السلام
سے ندا لوائی تھی میں حاضر ہوں اور سر کے بل حاضر ہوں ۔۔ (لبیک اللھم لبیک الخ)

احرام کا پہلا تلبیہ کس وقت:۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ
عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اَدْخَلَ رِجْلَہٗ فِی الْغَرْزِ وَاسْتَوَتْ
بِہٖ نَاقَتُہٗ قَائِمَۃً اَھَلَّ مِنْ عِنْدِ مَسْجِدِ ذِی الْحُلَیْفَۃِ

رواہ البخاری و مسلم

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ ذوالحلیفہ کی مسجد میں دو رکعت نماز پڑھنے
کے بعد) جب آپ مسجد کے پاس ہی ناقہ کی رکاب میں پاؤں رکھتے اور ناقہ آپ کو
لے کر سیدھی کھڑی ہو جاتی تو اس وقت آپ احرام کا تلبیہ پڑھتے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) صحابہ کرام کی روایات اور ان کے اقوال اس بارہ میں مختلف ہیں کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں احرام کا پہلا تلبیہ کس وقت اور کس جگہ پڑھا تھا

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان (جیسا کہ اس حدیث میں بھی مذکور ہے) یہ ہے
ذوالحلیفہ کی مسجد میں دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد آپ وہیں اپنی ناقہ پر سوار ہوئے اور جب
ناقہ آپ کو لے کر سیدھی کھڑی ہوئی تو اُس وقت آپ نے پہلی دفعہ احرام کا تلبیہ پڑھا
گویا اس وقت سے آپ محرم ہوئے اور بعض دوسرے صحابہ کا بیان ہے کہ جب آپ ناقہ پر
ہوکر کچھ آگے بڑھے اور مقام بیداء پر پہنچے (جو ذوالحلیفہ کے بالکل قریب کسی قدر بلند پیدا
تھا) تو اس وقت آپ نے پہلا تلبیہ کہا اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ نے مسجد
ذوالحلیفہ میں دوگانۂ احرام پڑھا تو اسی وقت ناقہ پر سوار ہونے سے پہلے آپ نے پہلا تلبیہ
پڑھا ——— سنن ابی داؤد اور مستدرک حاکم وغیرہ میں مشہور جلیل القدر تابعی حضرت سعید
بن جبیر کا ایک بیان مروی ہے کہ میں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے صحابہ کرام کے اس
اختلاف کے بارہ میں دریافت کیا تھا تو انھوں نے بتایا کہ اصل واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے مسجد ذوالحلیفہ میں دوگانۂ احرام پڑھنے کے بعد متصلاً پہلا تلبیہ پڑھا تھا لیکن اس
کا علم صرف ان چند لوگوں کو ہوا جو اس وقت آپ کے قریب وہاں موجود تھے۔ اس کے بعد
جب آپ وہیں ناقہ پر سوار ہوئے اور ناقہ سیدھی کھڑی ہوئی تو اس وقت پھر آپ نے تلبیہ
پڑھا اور ناقہ پر سوار ہونے کے بعد یہ آپ کا پہلا تلبیہ تھا تو جن لوگوں نے یہ تلبیہ آپ سے سُنا
اور پہلا نہیں سنا تھا انھوں نے سمجھا کہ پہلا تلبیہ آپ نے ناقہ پر سوار ہوکر پڑھا۔ پھر جب ناقہ چلدی
اور مقام بیداء پر پہنچی تو پھر آپ نے تلبیہ پڑھا۔ تو جن لوگوں نے پہلا اور دوسرا تلبیہ آپ سے
نہیں سنا تھا انھوں نے سمجھا کہ آپ نے پہلا تلبیہ اس وقت پڑھا جب آپ بیداء پر پہنچے" حضرت عبداللہ
بن عباس رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے اصل حقیقت پوری طرح واضح ہوجاتی ہے۔

تلبیہ بلند آواز سے پڑھا جائے:۔

عَنْ خَلَّادِ بْنِ السَّائِبِ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتَانِيْ جِبْرَئِيْلُ فَأَمَرَنِيْ أَنْ آمُرَ
أَصْحَابِيْ أَنْ يَّرْفَعُوْا أَصْوَاتَهُمْ بِالْإِهْلَالِ أَوِ التَّلْبِيَةِ۔

——— رواہ مالک والترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجہ والدارمی

خلاد بن سائب تابعی اپنے والد سائب بن خلاد انصاری سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس جبرئیل آئے اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے حکم پہنچایا کہ میں اپنے ساتھیوں کو حکم دوں کہ وہ تلبیہ بلند آواز سے پڑھیں۔

(موطا امام مالک جامع ترمذی سنن ابی داؤد سنن نسائی سنن ابن ماجہ مسند دارمی)

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُلَبِّي اِلَّا لَبَّى مَنْ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَشِمَالِهٖ مِنْ حَجَرٍ اَوْ مَدَرٍ حَتّٰى تَنْقَطِعَ الْاَرْضُ مِنْ هٰهُنَا وَهٰهُنَا

——— رواہ الترمذی و ابن ماجۃ

حضرت سہل بن سعد سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کا مومن و مسلم بندہ جب حج یا عمرہ کا تلبیہ پکارتا ہے (اور کہتا ہے لبیک اللّٰھم لبیک الخ) تو اس کے داہنی طرف اور بائیں طرف اللہ کی جو بھی مخلوق ہوتی ہے خواہ وہ بے جان پتھر اور درخت یا ڈھیلے ہی ہوں وہ بھی اس بندہ کے ساتھ لبیک کہتی ہیں یہاں تک کہ زمین اِس طرف اور اُس طرف سے تمام ہو جاتی ہے۔

(جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) یہ حقیقت واضح طور پر قرآن مجید میں بیان کی گئی ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور حمد کرتی ہے لیکن اس حمد و تسبیح کو انسان نہیں سمجھ سکتے۔ بس اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ لبیک کہنے والے صاحب ایمان بندہ کے ساتھ اس کے داہنے اور بائیں کی ہر چیز لبیک کہتی ہے لیکن ہم انسان اس لبیک کو نہیں سن سکتے۔

تلبیہ کے بعد کی خاص دعا:۔

عَنْ عُمَارَةَ بْنِ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ كَانَ اِذَا فَرَغَ مِنْ تَلْبِيَتِهٖ سَاَلَ اللّٰهَ رِضْوَانَهٗ وَالْجَنَّةَ وَاسْتَعْفَاهُ بِرَحْمَتِهٖ مِنَ النَّارِ

رواہ شافعی

عمارہ بن خزیمہ بن ثابت انصاری اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تلبیہ سے فارغ ہوتے (یعنی تلبیہ پڑھ کر محرم ہوتے) تو اللہ تعالیٰ سے اس کی رضا اور جنت کی دعا کرتے اور اس کی رحمت سے دوزخ سے خلاصی اور پناہ مانگتے۔ (مسند شافعی)

(تشریح) اس حدیث کی بنا پر علماء نے تلبیہ کے بعد ایسی دعا کو افضل اور مسنون کہا ہے جس میں اللہ تعالیٰ سے اس کی رضا اور جنت کا سوال کیا جائے اور دوزخ کے عذاب سے پناہ مانگی جائے۔ ظاہر ہے کہ مومن بندہ کی سب سے بڑی حاجت اور اس کا سب سے اہم مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت نصیب ہو جائے اور اللہ کے غضب اور دوزخ کے عذاب سے اس کو پناہ مل جائے اس لئے اس موقع کی سب سے اہم اور مقدم دعا یہی ہے اس کے بعد اس کے علاوہ بھی جو چاہے دعا کرے۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْأَلُكَ رِضَاكَ وَالْجَنَّةَ وَنَعُوْذُ بِكَ مِنْ غَضَبِكَ وَالنَّارِ۔

تجلّیاتِ مجدّدِ الفِ ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

ترجمہ ـــــــــ از:۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب (۴۰) خواجہ حسام الدین احمد دہلویؒ کے نام:۔

الحمد للہ وسلامٌ علی عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ احوال و اوضاع اِس طرف کے فقراء کے مستوجب حمد ہیں ـــــ اللہ تعالیٰ سے آپ کی سلامتی و عافیت مطلوب ہے۔ صحیفۂ شریفہ جو از روئے شفقت و مہربانی اس فقیر کے نام تحریر فرمایا تھا اسکے مطالعے سے مشرف ہوا ـــــ آپ نے اُس میں اس بات کا اشتیاق ظاہر کیا تھا کہ حرمین شریفین (مکہ معظمہ و مدینہ منورہ) میں سے کسی ایک مقام میں اپنے متعلقین سمیت متوطن و اقامت پذیر ہو جائیں اور وہاں ہی مدفون ہوں ـــــ مخدوما و مکرما! متعلقین کا جانا نظر (نظر کشفی) میں نہیں آتا ہے بلکہ قریب ہے کہ منع مفہوم ہو ـــــ اگر آپ تنہا جائیں تو بہتر معلوم ہوتا ہے اور اُمید ہے کہ سلامتی کے ساتھ پہونچیں گے ـــــ والامر الی اللہ سبحانہٗ۔

مکتوب (۴۱) ایک نیک خاتون کے نام [عورتوں کو ضروری نصیحتیں]

قال اللہ تبارک وتعالیٰ ـــــ یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ عَلٰٓی اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰہِ شَیْئًا وَّلَا یَسْرِقْنَ وَلَا یَزْنِیْنَ وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَھُنَّ وَلَا یَاْتِیْنَ

بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ

(اے پیغمبر جب کہ ایمان والی عورتیں آپکے پاس بیعت ہونے کی غرض سے اس شرط پر آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو (بموافق رواج جاہلیت) قتل نہ کریں گی، ایسا بہتان نہ لائیں گی جس کو انھوں نے اپنی طرف سے گڑھا ہو اور وہ آپ کی کسی کار نیک میں نافرمانی نہ کریں گی ـــــ تو آپ اُن کو بیعت کر لیجئے اور ان کے لئے اللہ سے طلب مغفرت کیجئے، بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے)

یہ آیت کریمہ فتح مکہ کے دن نازل ہوئی ہے ـــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مردوں کی بیعت سے فارغ ہوگئے تو آپنے عورتوں کو بیعت کرنے کا سلسلہ شروع فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عورتوں کو بیعت کرنا فقط قول کے ذریعے تھا۔ آپکا دست مبارک ہرگز بیعت ہونے والی عورتوں کے ہاتھوں تک نہیں پہونچا ـــــ چونکہ عورتوں میں ناقص اخلاق بمقابلہ مردوں کے زیادہ ہوتے ہیں اسلئے عورتوں کی بیعت کے وقت، مردوں کی بیعت کے مقابلے میں زیادہ احکام لائے گئے ـــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بیعت کے وقت عورتوں کو بُرے اخلاق سے منع فرمایا ہے ـــــ (عورتوں سے بیعت کی) پہلی شرط یہ ہے کہ کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ بنایا جائے وجوب وجود میں بھی اور استحقاق عبادت میں بھی ـــــ جس شخص کے اعمال دکھاوے اور ریا دے کی آمیزش سے صاف اور غیر خدا سے طلب اجر کے گمان سے ـ اگرچہ قولاً ہی کیوں نہ ہو ـــــ پاک نہ ہوں گے ـــــ وہ شخص دائرۂ شرک سے باہر اور توحید پرست نیز اخلاص والا نہ ہوگا .... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ـــــ شرک اصغر سے پرہیز کرو، صحابہؓ نے عرض کیا حضور شرک اصغر کیا ہوتا ہے؟

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ریا کاری شرک اصغر ہے" ـــــ مراسم شرک اور
رسم کفر کی تعظیم کو بھی شرک میں بڑا دخل حاصل ہے اور دوسرے مذہبوں کی تصدیق کرنے والا بھی
یا شرک ہی سے ہے نیز احکام اسلام اور احکام کفر پر مشترکاً عمل کرنے والا بھی مشرک ہی ہے
کفر سے بیزاری شرط اسلام ہے اور آلودگی شرک سے نفرت شرط توحید ہے ـــ بیماریوں
کے دور کرنے کے لئے بتوں اور شیطانوں سے مدد طلب کرنا، جیسا کہ جاہل مسلمانوں میں رائج
ہو گیا ہے عین شرک و ضلالت ہے ـــ ناکارہ سنگہائے تراشیدہ سے طلب حاجات کرنا
عین کفر اور واجب الوجود کا انکار ہے ـــ اللہ تعالیٰ بعض گمراہوں کے حال کی شکایت
کرتے ہوئے فرماتا ہے ـــ

يُرِيدُونَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوٓا اِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ اُمِرُوٓا اَنْ
يَّكْفُرُوا بِهٖ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا

(وہ چاہتے ہیں کہ اپنے مقدمات طاغوت (غیر اللہ) کے پاس لے جائیں حالانکہ
ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اُن کے معتقد نہ ہوں اور شیطان چاہتا ہی یہ ہے کہ
اُن کو بہت زیادہ گمراہ کر دے۔)

بہت سی (مسلمان) عورتیں اپنی انتہائی جہالت کی بنا پر ایسی چیزوں سے مدد طلب کرتی
ہیں جن سے منع کیا گیا ہے اور بلا و مصیبت کا دفعیہ اُن اسماء سے کرتی ہیں جن کا کوئی مسمیٰ
نہیں ـــــ نیز وہ مراسم شرک و اہل شرک میں گرفتار ہیں ـــ عورتوں سے یہ بات
ـــ خواہ وہ نیک ہوں یا بد خاص طور پر چیچک کا مرض جس کو سیتلہ بھی کہتے ہیں عارض
ہونے پر ـــــ ظاہر و محسوس ہوتی ہے ـــــ بہت کم عورتیں ہوں گی جو اس
شرک کی باریکیوں سے خالی ہوں۔ اور چیچک کے رسوم میں سے کسی نہ کسی رسم کا ارتکاب
کرتی ہوں ـــــ بس اللہ ہی جس کو محفوظ رکھے وہ ہی بچتی ہو گی ـــــ غیر مسلموں
کے معظم ایام کی تعظیم کرنا اور اُن کے مشہور رسوم بجا لانا بھی مستلزم شرک اور مستوجب
کفر ہے ـــ چنانچہ ایام دِوالی میں جاہل مسلمان خصوصاً اُن کی عورتیں غیر مسلموں کے
رسم ادا کرتے ہیں اور ان دنوں میں عید کی سی خوشی مناتے ہیں اور اہل شرک کی

طرح اپنی لڑکیوں اور بہنوں کو ہرا بار روانہ کرتے ہیں وہ اس زمانے میں اپنے برتنوں کو مانند کفار رنگین کرتے ہیں اور ان کو سرخ چاولوں سے بھر کر بھیجتے ہیں اور اس زمانے کو قابلِ اعتبار و توجہ سمجھتے ہیں یہ باتیں شرک کی اور دینِ اسلام سے انکار کی ہیں ــــــ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ ۔

(ان میں سے اکثر کا حال یہ ہے کہ وہ بغیر اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کئے ہوئے خالص طریقے پر اللہ پر ایمان نہیں لاتے ہیں)

جیوزانات کو جو نذر مشائخ کرتے ہیں اور ان بزرگوں کی قبروں کے سرہانے ان حیوانات کو ذبح کرتے ہیں فقہ کی روایتوں میں اس عمل کو بھی داخلِ شرک قرار دیا گیا ہے اور اس بارے میں بہت کچھ ممانعت کی گئی ہے نیز اس ذبح کو "ذبائحِ جن" میں سے شمار کیا ہے جو کہ ممنوعِ شرعی ہے اور شرک کے دائرے میں آتا ہے ــــــ لہٰذا اس عمل سے بھی پرہیز کرنا چاہیئے اس لئے کہ اس میں بھی آمیزشِ شرک ہے ــــ نذر کی اقسام بہت سی ہیں یہ کیا ضرور ہے کہ کسی حیوان کے ذبح کرنے کی نذر کریں اور عملِ ذبح کا ارتکاب کر کے اس کو "ذبائحِ جن" کے ساتھ لاحق کر دیں اور جنات کے پجاریوں کے مشابہ ہو جائیں ــــــ اور اسی (شرک کے) قبیل سے ہے عورتوں کا روزہ رکھنا پیروں اور بیبیوں (حضرت فاطمہؓ و حضرت مریمؑ وغیرہما) کی نسبت سے ــــــ عورتیں بہت سے پیروں کے نام اپنی طرف سے تراش کر ان کے نام کا روزہ رکھتی ہیں اور ہر روزے کے افطار کے وقت ایک خاص قسم کا کھانا مخصوص وقت کے ساتھ متعین کرتی ہیں اور ان روزوں کے لئے تعینِ ایام بھی کرتی ہیں نیز اپنی حاجات کے پورا ہونے کو ان روزوں کے ساتھ وابستہ کرتی ہیں۔ ان روزوں کے توسل سے پیروں اور بیبیوں سے اپنی حاجتیں مانگتی ہیں اور حاجت برآری کو ان کی ذات سے جانتی اور سمجھتی ہیں یہ بات عبادت کے اندر شرک ہے اور عبادتِ غیر اللہ کے ذریعے غیر اللہ سے اپنی حاجات کو طلب کرنا ہے اس فعل کی خرابی کو بھی خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے ــــ درآنجا حدیثِ قدسی میں آیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلصَّوْمُ لِيْ وَأَنَا أَجْزِيْ بِهٖ یعنی

روزہ میرے ہی لئے مخصوص ہے میرے غیر کی اس عبادت میں کوئی شرکت نہیں میں ہی اس روزے کی جزا دوں گا ۔۔۔ اگرچہ کسی عبادت میں بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا جائز نہیں مگر روزے کی تخصیص اُس کے اہتمام شان کی وجہ سے ہے اور مقصود تاکید کے ساتھ اس عبادت میں شرکت کی نفی کرنا ہے ۔۔۔۔۔۔ اور یہ محض بہانہ بازی ہے جو بعض عورتیں اس قسم کے شرکیہ روزوں کی خرابی ظاہر کرنے کے وقت کہا کرتی ہیں کہ ہم تو ان روزوں کو اللہ تعالیٰ کے واسطے رکھتے ہیں اور اُن کا ثواب پیروں کو بخشتے ہیں ۔۔ اگر اس بات میں وہ سچی ہیں تو پھر یا دنوں کا مخصوص و مقرر کرنا کس واسطے ضروری ہوا؟ اور تخصیص طعام اور افطار میں مختلف قسم کی غلط اور خراب رسموں اور رسموں کا تعین کس لئے ہے ؟ اکثر ویسا ہوتا ہے کہ وہ افطار کے وقت، ارتکاب محرمات کرتی ہیں اور فعل حرام کے ذریعے افطار کرتی ہیں یعنی بلا ضرورت (ٹوٹکے کے طور پر) سوال و گدائی کر کے اس سے افطار کرتی ہیں اور اپنی حاجتوں کے پورا ہونے کو اس حرام فعل یعنی بھیک کے ساتھ مخصوص سمجھتی ہیں۔ یہ خود عین ضلالت اور شیطان لعین کا فریب ہے ۔۔۔۔ بس اللہ ہی محفوظ رکھنے والا ہے ۔۔۔

دوسری شرط جو بیعت نساء کے وقت درمیان میں لائی گئی ہے وہ چوری سے باز رہنا ہے ۔ چوری کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور چونکہ یہ خصلتِ بد اکثر عورتوں میں (کسی نہ کسی صورت میں) پائی جاتی ہے اور کم عورتیں ہوں گی جو اس بُری عادت کی باریکیوں سے خالی ہوں اس لئے اس ذمیمہ سے نہی بھی اُن کی بیعت کے لئے ضروری ہوئی ۔۔۔ وہ عورتیں جو کہ اپنے شوہروں کے مالوں میں بغیر اُن کی اجازت کے تصرفِ بیجا کرتی ہیں اور بے تحاشا خرچ کرتی ہیں سارقوں ہی میں داخل اور سرقے کے گناہ کا ارتکاب کرنے والی ہوتی ہیں ۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بات عورتوں میں عام طور پر پائی جاتی ہے یعنی خیانت کا مرض ان کے عام افراد میں موجود ہے ۔۔۔ مگر جس کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا ہو ۔۔۔ کاش وہ اس بات کو گناہ شمار کریں اور بُرا سمجھیں .... جب عورتوں کے اندر اپنے شوہروں کے اموال کو بار بار (ناجائز طریقے پر) لینے کی وجہ سے ملکۂ خیانت پیدا ہو جاتا ہے اور اموال غیر میں تصرف کرنے کی قباحت اُن کی نظر سے زائل ہو جاتی ہے تو پھر بعید نہیں ہوتا کہ وہ اپنے شوہروں کے علاوہ

دوسروں کے املاک میں بھی بیجا تصرف کریں اور دوسروں کے مالوں میں بھی خیانت و سرقہ کی مرتکب ہوں ـــــ امید ہے کہ میری یہ بات تھوڑے سے تامل کے بعد واضح ہو جائے گی ـــــ پس ثابت ہو گیا کہ سرقے سے منع کرنا عورتوں کے حق میں امور ضروریہ اسلام میں ضروری ترین امر ہے ـــــ (اسی ضمن میں یہ بھی لکھتا ہوں کہ) ایک دن حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ سے دریافت فرمایا جانتے ہو سب چوروں سے زیادہ چور کون ہے؟ یعنی بدترین چور کون ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا ہم کو معلوم نہیں آپ ارشاد فرما دیجئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے زیادہ بدتر چور وہ ہے جو اپنی نماز میں چوری کرتا ہے اور ارکان نماز کو بتمام و کمال ادا نہیں کرتا ـ (لہٰذا) اس سرقے سے بھی پرہیز ضروری ہوا تاکہ بدترین چوروں میں شمار نہ ہو ـــــ حضور دل کے ساتھ نیت نماز کرنی چاہئیے، اسلئے کہ بغیر حصول نیت کے عمل، صحیح نہیں ہوتا ہے ـــــ قرآن کو درست پڑھنا چاہئیے، رکوع و سجود کو اطمینان کے ساتھ پورا کرنا چاہئیے، قومہ و جلسہ کو بھی اطمینان کے ساتھ ادا کرنا چاہئیے یعنی رکوع کے بعد ٹھیک طریقے پر کھڑا ہونا چاہئیے، اور ایک تسبیح کی بقدر کھڑے ہونے میں دیر کرنی چاہئیے ـــــ دونوں سجدوں کے درمیان بھی صحیح طریقے پر بیٹھنا چاہئیے اور ایک تسبیح کی بقدر بیٹھنے میں بھی توقف کرنا چاہئیے تاکہ قومہ و جلسہ میں اطمینان میسر ہو جو ایسا نہیں کرتا وہ اپنے آپ کو "قطاع سارقان" میں داخل کرتا ہے اور خود کو محل وعید بناتا ہے ـ

تیسری شرط جو بیعت نساء کے سلسلے میں نص قرآن سے ثابت ہے زنا سے نہی ہے اس شرط کی تخصیص، بیعت نساء کے ساتھ اس بنا پر ہے کہ زنا کا حصول زیادہ تر عورتوں کی رضامندی حاصل ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے اور عورتیں اپنے نفسوں کو مردوں پر پیش کرتی ہیں پس اس عمل میں سابق تر ہوتی ہیں اور ان کی رضامندی اس عمل زنا کے حاصل ہونے میں معتبر ہوتی ہے لہٰذا اس عمل سے نہی عورتوں کے حق میں موکد ہوگی اور مرد اس عمل میں عورتوں کے تابع ہوں گے ـــــ اسی وجہ سے حضرت حق سبحانہٗ نے اپنی کتاب مجید میں زانیہ عورت کو زانی مرد سے مقدم رکھا۔

فرمایا ہے:
اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ۔

(بے شادی شدہ) زانیہ عورت اور (بے شادی شدہ) زانی مرد ان دونوں کے سو سو کوڑے مارو]۔

یہ زنا کی خصلت بد، دنیا و آخرت دونوں جگہ نقصان پہونچانے والی ہے اور تمام مذاہب اس فعل کو برا سمجھا گیا ہے۔ حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

"اے لوگو زنا سے پرہیز کرو اس لئے کہ اس میں چھ بری صفتیں ہیں تین دنیا میں اور تین آخرت میں ـــــ وہ تین جو دنیا میں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ زانی (کے چہرے) کی رونق اور نورانیت زائل ہو جاتی ہے دوسری یہ ہے کہ زنا مفلسی کا سبب ہے، اور تیسری یہ ہے کہ زنا، عمر کو گھٹاتا ہے ـــــ اور وہ تین باتیں جو زانیوں کے لئے آخرت میں پیش آنے والی ہیں ان سے ایک خدا کا غصہ و غضب ہے، دوسری حساب آخرت کی خرابی ہے تیسری عذاب زنا ہے۔"

یہ بھی جاننا چاہیے کہ حدیث نبوی میں آیا ہے نظروں کا زنا نامحرم عورتوں کی طرف نظر کرنا ہے اور ہاتھوں کا زنا نامحرموں کا ہاتھ پکڑنا ہے اور پاؤں کا زنا نامحرم کی طرف چلنا ہے۔"

ـــــ اللہ تعالٰے فرماتا ہے:۔
قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ ذٰلِکَ اَزْکٰی لَھُمْ ـــــ

(آپ مومنین سے فرما دیجئے کہ وہ اپنی نظروں کو نیچا رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے لئے پاکیزہ تر اور مفید تر ہے)

(اور عورتوں کے متعلق) اللہ تعالٰے فرماتا ہے:۔
قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِھِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَھُنَّ

(اے رسول آپ ایمان والی عورتوں سے فرما دیجئے کہ وہ اپنی نظروں کو نیچا رکھیں
اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔)

جاننا چاہیئے کہ دل آنکھ کے تابع ہے تاوقتیکہ آنکھ محرمات سے بند نہیں رکھی جائے گی دل کی محافظت مشکل ہے۔ جب آنکھ گرفتار ہوتی ہے دل کی محافظت دشوار ہو جاتی ہے اور جب دل گرفتار ہوتا ہے شرمگاہ کی محافظت سخت دشوار ہو جاتی ہے پس آنکھ کا محرمات سے بند رکھنا ضروری ہوا تاکہ محافظتِ شرمگاہ میسر آ جائے اور خسارت دینی و دنیوی تک بات نہ پہونچے ـــــــ قرآن مجید میں عورتوں کو اس بات سے منع فرمایا گیا ہے کہ وہ بیگانہ مردوں سے کلام نرم و ملائم، بدکار عورتوں کی طرح کریں اس طرح کہ وہ بدکار مردوں کو وہم بد میں مبتلا کر دیں اور ان کے دل میں بری طمع واقع ہو جائے ـــــــ بلکہ عورتوں کو چاہیئے کہ وہ مردوں سے (بوقتِ ضرورت) ایسے قولِ معروف و حسن کے ساتھ بولیں جس سے مردوں کو وہم و طمع نہ پیدا ہو۔ ـــــــ نیز قرآن مجید میں اس کی نہی آئی ہے کہ عورتیں اپنی زینت اور حسن کا مظاہرہ مردوں کے سامنے کریں ... ... اور مردوں کو خواہش میں ڈالدیں اور قرآن مجید میں اس کی بھی نہی آئی ہے کہ وہ اپنے پاؤں (چلنے کے وقت) اس انداز سے زمین پر ماریں کہ ان کی زینتِ پوشیدہ ظاہر ہو جائے مثلاً پازیب اور اس قسم کے زیور حرکت میں آ جائیں اور ان سے آواز نکلنے لگے، کیونکہ اس سے بھی مردوں کا میلان عورتوں کی طرف ہو جاتا ہے، حاصل کلام یہ ہے کہ جو بات فسق و فجور تک پہونچانے والی ہو وہ ممنوع اور بری ہے۔ اس کی احتیاط کی جائے کہ مقدمات و مبادی محرمات کا بھی ارتکاب نہ ہونے پائے تاکہ نفسِ محرمات سے سلامتی میسر آ جائے ـــــــ اللہ تعالیٰ ہی ان کاموں سے بچانے والا ہے۔ وَمَا توفیقی اِلَّا بِاللہِ، عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ[1]ـــ

یہ بات بھی پوشیدہ نہ رہے کہ جو شخص نظر اور مس بشہوت میں اجنبی عورت بھی دوسری عورت

---

[1] اور نہیں ہے مجھے توفیق مگر اللہ کے ذریعہ سے اسی پر میں بھروسہ کرتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع ہوتا ہوں۔

لئے اجنبی مرد کا حکم رکھتی ہے ۔ جائز نہیں ہے کہ عورت اپنے آپ کو غیر شوہر کے لئے مزین
ے اور سجائے وہ غیر شوہر خواہ مرد ہو یا عورت ہو ـــــــ جس طرح مردوں کو شہوت
ساتھ امردوں (نابالغوں) کی طرف نظر کرنی اور شہوت کے ساتھ ان کو چھونا حرام ہے
نکے کو اچھی طرح ملحوظ رکھا جائے اس لئے کہ یہ (عدم احتیاط) دنیا و آخرت کی زیاں کاری
ابی کا کھلا ہوا راستہ ہے ـــــــ مرد کا عورت تک پہونچنا تباین صنفین (دو مختلف صنف
لے) کی وجہ سے (ذرا) مشکل ہے اور (کچھ نہ کچھ) موانع درمیان میں ہوتے ہیں برخلاف
ت کے عورت کے پاس پہونچنے کے کہ وہاں اتحادِ صنف (ایک قسم ہونے) کی وجہ سے
ت آسانی ہے ـــــ یہاں بہت زیادہ احتیاط ملحوظ رکھی جائے اور عورتوں کو عورتیں
شہوت سے دیکھنے اور چھونے سے اندازِ بلیغ اور بلاغ بین کے ساتھ اس سے بھی زیادہ
کیا جائے جتنا کہ مردوں کو عورتوں کے اور عورتوں کو مردوں کے دیکھنے سے منع کیا
ہے ۔

چوتھی شرط ـــــــ جو بیعت نساء میں ذکر فرمائی گئی ہے وہ قتلِ اولاد سے منع ہو
کہ (ایام جاہلیت میں) عرب کی عورتیں اپنی لڑکیوں کو خوفِ فقر کی بنا پر مار ڈالتی تھیں
ـــــــ یہ بُرا عمل جس طرح قتلِ نفس بغیرِ حق کو شامل ہے اسی طرح قطعِ رحم کو بھی شامل
جو کہ بڑے گناہوں میں سے ہے ـــــ ـــ

پانچویں شرط ـــ ـــ جو بیعتِ نساء کے سلسلے میں بیان فرمائی گئی ہے وہ افتراء
بہتان سے بچنا ہے چونکہ یہ صفت عورتوں میں بہت ہوتی ہے اس لئے ان کو اس سے
ص طور پر منع کیا گیا ہے ـــ یہ صفت انتہائی مذموم صفت ہے اور اخلاقِ رذیلہ میں
سب سے زیادہ رذیل عادت ہے ـــ اس لئے کہ یہ صفت جھوٹ کو شامل ہے اور
وٹ تمام مذاہب میں حرام اور قبیح ہے ـــ افتراء و بہتان ، ایذائے مومن کو بھی
من ہے جس کے بارے میں بہتان گھڑا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ مومن کو ایذا پہونچانا
م ہے اور اس افتراء و بہتان سے زمین کے اندر فساد بھی برپا ہوتا ہے اور فساد
فی الارض بنصِ قرآنی ممنوع و حرام ہے ـــــــ

چھٹی شرط ـــــ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی سے بچنا ہے ہر اس کام میں جس کا انھوں نے حکم فرمایا ہے اور یہ چھٹی شرط تمام اوامر کی تعمیل کرنے اور تمام نواہی سے باز رہنے کو متضمن ہے ـــ نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج، ایمان کے بعد اسلام کے بنیادی رکن ہیں (اور یہ بھی اسی شرط کے ضمن میں آجاتے ہیں)

نماز پنجگانہ کو بغیر سستی اور بغیر نقصان کے پورے اہتمام کے ساتھ ادا کیا جائے۔ (بشرطِ نصاب) زکوٰۃ کو رغبت اور جذبۂ تشکر کے ساتھ اسکے مصارف میں ادا کرنا چاہئیے روزۂ رمضان ـــ جو کہ سال بھر کے گناہوں کا مٹانے والا ہے اسکی بھی نگہداشت ضروری ہے (بشرطِ استطاعت) حج بیت اللہ کو بھی جس کی شان میں مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ (مقبول) حج ماقبل کے تمام (صغیرہ) گناہوں کا مٹانے والا ہوتا ہے ـــ ادا کرنا چاہئیے تاکہ اسلام کو قائم و برقرار رکھا پایا جائے ـــ اسی طرح ورع و تقویٰ کے بغیر بھی کوئی چارہ کار نہیں ہے ـــ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تقویٰ تمھارے نظامِ دین کو قائم رکھنے والا ہے اور تقویٰ نام ہے منہیات و ممنوعاتِ شرعیہ کو ترک کرنے کا ـــ تمام نشے والی چیزوں سے پرہیز کرنا چاہئیے اور انکو شراب کی مانند ہی حرام اور برا سمجھا جائے ـــ گانے بجانے سے بھی اجتناب ضروری ہے کیونکہ یہ اصل لہو و لعب ہے اور لہو و لعب حرام ہے ـــ حدیث میں آیا ہے کہ "گانا زنا کا منتر ہے" ـــ غیبت کرنے اور چغلخوری سے بھی بچنا لازم ہے یہ بھی ممنوعِ شرعی ہے۔ نیز کسی کا مذاق بنانا اور مومن کو ناحق ایذا دینا جس صورت سے بھی ہو، منع ہے اس سے بھی پرہیز ضروری ہے ـــ بدشگونی کو کوئی حیثیت نہ دیں اور اس میں کوئی تاثیر نہ جانیں اور یہ بھی عقیدہ نہ بنائیں کہ ایک کا مرض اڑ کر دوسرے کو لگ جاتا ہے اور مریض سے تندرست تک پہونچ جاتا ہے ـــ مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں (بدشگونی اور تعدیۂ مرض) کے ماننے سے منع فرمایا ہے اور ان کا ارشاد ہے کہ "بدشگونی و بدفالی کوئی چیز نہیں ہے اور مرض کا متعدی ہونا بھی صحیح نہیں ہے" ـــ یعنی شگونِ بد کی اصل ثابت نہیں ہے اور ایک کا مرض دوسرے کو لگ جانا مطلق متحقق

نہیں ہے ـــــــ کاہن اور نجومی کی باتوں کو سچا نہ جانیں، غیبی اُمور اُن سے نہ دریافت کریں اور اُن کو اُمورِ غیبیہ کا عالم نہ سمجھیں شریعت میں اس بارے میں بہت زیادہ ممانعت آئی ہے ـــــــ جادو نہ کریں اور جادوگری کو بروئے کار نہ لائیں اس لئے کہ یہ حرام قطعی ہے اور اس کو کفر میں پورا پورا دخل حاصل ہے ـــ کوئی کبیرہ گناہ جادو اور جادوگری کے مقابلے میں کفر سے نزدیک تر نہیں ہے ـــ احتیاط کرنی چاہیئے کہ جادو کا کوئی دقیقہ بھی عمل میں نہ آنے پائے اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے کہ "جب تک ایک مسلمان (اپنے اندر) ایمان و اسلام رکھتا ہے جادو اس سے وجود میں نہیں آتا ہے اور جب نعوذ باللہ اس سے ایمان جدا ہو جاتا ہے تو پھر جادو اُس سے ثابت و متحقق ہوتا ہے"۔ پس گویا کہ جادو اور ایمان ایک دوسرے کی ضد ہیں اگر جادو ہے تو ایمان نہیں ہے ـــــــ اس نکتے کو اچھی طرح پیش نظر رکھا جائے تاکہ کارخانۂ اسلام میں کوئی خلل نہ پڑنے پائے اور اس عملِ جادو کی نحوست سے کہیں اسلام ہاتھ سے نہ نکل جائے ـــــ حاصل کلام یہ ہے کہ جو کچھ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے اور علماء نے کتب شرعیہ میں بیان فرمایا ہے جان و دل کے ساتھ اس کی فرمانبرداری کرنی چاہیئے اور اُس کے خلاف کو ایسا زہرِ قاتل تصور کیا جائے جو موتِ ابدی تک پہونچاتا ہے اور عذاب ہائے گوناگوں میں مبتلا کر دیتا ہے ـــــــ جب بیعت ہونے والی عورتوں نے ان تمام شرائط کو قبول کر لیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شرائط کے زبانی اقرار سے ہی ان عورتوں کو بیعت فرمالیا اور بحکم حق تعالیٰ عورتوں کی اس جماعت کے لئے طلبِ مغفرت فرمائی ـــ جو طلبِ مغفرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بحکم حق تعالیٰ وقوع میں آئی ہو اُس کے متعلق پوری پوری اُمید ہے کہ درجۂ اجابت و مقبولیت کو پہونچے گی اور عورتوں کی وہ جماعت مغفور ہوگی ـــ ہندؓ زوجۂ ابوسفیانؓ بھی اس بیعت میں داخل تھیں بلکہ ان تمام عورتوں کی وہی سرگروہ اور سردار تھیں اُن کے حق میں بھی اس بیعت اور اس استغفار سے اُمیدواری عظیم ہے ـــــ پس عورتوں میں سے (قیامت تک) جو بھی اِن شرائط کو قبول کرکے اِن کے مطابق عمل کرے گی وہ اسی بیعت (کے حکم) میں داخل ہوگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم والے استغفار

کے برکات کی امیدوار ہو جائے گی ــــــ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ــــــ

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ــــــ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم اس کا شکر ادا کرتے رہو اور ایمان لے آؤ ــــــ

شکر کے ادا کرنے سے مراد یہ ہے کہ احکامِ شرعیہ کو قبول کر کے اس کے مطابق عمل کیا جائے۔

طریقِ نجات اور چھٹکارے کا راستہ اعتقاد و عمل میں صاحبِ شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے اندر ہے ــــــ اُستاد و پیر کو اسی لئے اختیار کیا جاتا ہے کہ وہ شریعت کا راستہ بتائیں اور ان کی برکت سے اعتقاد و عمل بشریعت میں آسانی و سہولت ہو جائے۔

یہ نہیں ہے کہ مرید جو چاہے کریں اور جو مَن چاہے کھائیں اور پیر اُن کے لئے ڈھال بن جائیں گے اور عذاب سے محفوظ رکھیں گے ــــــ کیونکہ یہ بات محض تمنا ہی تمنا ہے وہاں کوئی بھی بغیر اجازت شفاعت نہ کر سکے گا اور جب تک کوئی پسندیدہ حق نہ ہوگا کوئی شفیع اُسکی شفاعت نہ کرے گا ــــــ پسندیدہ حق اُس وقت ہوگا جب کہ بمقتضائے شریعت عمل کرنے والا ہوگا ــــــ البتہ ہو یہ بشریت اگر کوئی لغزش اُس سے سرزد ہو جائے تو شفاعت کے ذریعے اُس کا تدارک ممکن ہے .... وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ الْمُوَفِّق

ــــــ "اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنے پاس سے رحمت کا سامان عطا فرمائیے اور ہمارے لئے کام میں درستی کا سامان مہیا کر دیجئے" ــــــ (والسلام)

مکتوباتِ خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ

حضرت مجدد کی مسند اصلاح و ہدایت کو آپ کے بعد جس ہستی نے سنبھالا اور سلطنتِ مغلیہ میں آپ کے ڈالے ہوئے دینی رنگ کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا، وہ ہیں آپ کے صاحبزادے خواجہ محمد معصومؒ۔ ان کے مکتوبات بھی آپ کے والد ماجد کے شہرۂ آفاق مکتوبات کی طرح عظیم مصلحانہ کاوشوں اور عرفانی علوم و حقائق کے آئینہ دار، اور فصاحت و بلاغت کا بحرِ ذخار ہیں۔ اصل زبان فارسی ہے۔ فارسی کے اس خزانہ کو مولانا نسیم احمد فریدی نے تلخیص و انتخاب کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے اور اصل زبان کی آب و تاب کو بڑی حد تک برقرار رکھا ہے۔ قیمت ۲/-

کامیاب تبلیغ کا راز

از

وحیدالدین خاں صاحب (اعظم گڑھ)

ایک اسلامی شاعر نے کہا ہے:۔

خبر نہیں کہ گرے ہیں کہاں کہاں آنسو
کدھر کدھر سے اٹھے گا دھواں نہیں معلوم

شاعر کے ذہن میں خود اس شعر کا مفہوم کیا ہوگا، اسکے متعلق کچھ قیاس کرنا مشکل ہے، مگر میں نے ... کو یہاں ایک خاص مفہوم میں نقل کیا ہے۔ اللہ کے وہ بندے جو واقعی طور پر اللہ کی اطاعت ... پنی زندگی میں شامل کر لیتے ہیں، ان کا عمل ایسے ایسے پہلوؤں سے اپنے نقش چھوڑتا ہے اور ... ایسے مقامات سے اسکے اثرات و نتائج ظاہر ہو کر سامنے آتے ہیں جن کا پہلے سے کوئی اندازہ ... کیا جا سکتا۔

یہاں میں ایک نیک بخت مسلم خاتون کا واقعہ نقل کروں گا۔ یہ خاتون بفضلہ تعالیٰ زندہ موجود ... اور واقعہ بھی سنا ہوا نہیں ہے بلکہ ذاتی طور پر میرے علم میں آیا ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ایک دست ... سے علاج کرا رہی تھیں۔ ڈاکٹر موصوف ان کے وطن سے پانچ سو کیلومیٹر کے فاصلے پر رہتے ہیں، ... لئے احوال و کیفیت بذریعہ خط لکھ کر بھیجتی تھیں۔ یہ ڈاکٹر صاحب ہومیوپیتھ ہیں اور اپنے

مخصوص طریق علاج کے مطابق ان کی تاکید تھی کہ حالات بتانے میں یہ بات خاص طور پر لکھی جائے کہ مرض کیسے پیدا ہوا، کب بڑھتا ہے اور کب گھٹتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

خاتون کو جوڑوں کا درد تھا۔ جب وہ اچھا ہوا تو سر کا درد شروع ہو گیا۔ کسی علاج سے فائدہ نہیں ہوتا تھا، بالآخر انھوں نے ڈاکٹر کو لکھا:-

"اپنے حالات کے سلسلے میں آپ کو کچھ لکھنا تھا تاکہ آپ مرض کی نوعیت سمجھ کر صحیح دوا تشخیص کر سکیں۔ مگر کئی دن سے سوچ سوچ کر رہ جاتی تھی۔ اب چونکہ یہ علاج کا معاملہ ہے اور طویل علالت کی وجہ سے وہ میرے لئے سخت تکلیف دہ ہو چکا ہے، اس لئے مجبوراً لکھتی ہوں:

کہنا یہ ہے کہ جوڑوں کا درد جو مجھے پہلے ہو گیا تھا، وہ بفضلہ تعالیٰ آپ کے علاج سے بالکل ٹھیک ہو گیا، مگر اس کے بعد درد سر کی مستقل پریشانی شروع ہو گئی ہے۔ یہ درد کیسے اٹھتا ہے، یہ لکھنے یا کہنے کی بات نہیں تھی، مگر مجبوراً لکھ رہی ہوں کہ اس کے بغیر شاید ہومیو پیتھک طریق علاج میں صحیح دوا تجویز نہیں کی جا سکتی۔

بات یہ ہے کہ اگر میں رات کو ساری رات آرام سے بستر پر پڑی رہوں تو سر میں قطعاً درد نہیں ہو گا۔ اور دن بھی خیریت سے گزر جائے گا، مگر مجھ کو راتوں کی تنہائی میں اٹھ کر نماز پڑھنا بہت پسند ہے، انہیں رات کی نمازوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آخرت کا منظر یا قبر وغیرہ کی یاد شدت سے دماغ میں آتی ہے اور اس وقت بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ بس انھیں آنسوؤں کا نکلنا مضر ہوتا ہے۔ جیسے ہی آنکھ سے آنسو نکلے، سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے بار بار اندازہ کیا ہے کہ آنسوؤں ہی کے نکلنے سے سر میں درد شروع ہوتا ہے۔

یہ بات کسی سے کہنے کی نہیں تھی، محض علاج کی خاطر میں نے اپنے دل پر جبر کر کے آپ کو لکھ دیا ہے، براہ کرم خط کو پڑھنے کے بعد اسے پھاڑ کر ضائع کر دیں۔"

یہ سادہ سے چند الفاظ جو ایک معمولی پڑھی لکھی خاتون کے قلم سے محض ضرورت شدید
نا پر نکل گئے تھے۔ جب وہ تعلیم یافتہ ڈاکٹر کے پاس پہنچے تو انھوں نے حیرت انگیز کام
ڈاکٹر نے جواب میں لکھا :۔

"گرامی نامہ ملا۔ آپنے دردسر کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ میرے لئے
تشخیص کے سلسلے میں بہت معاون ثابت ہوئی۔ چنانچہ میں نے دوا تجویز کرلی
ہے۔ آپ نیٹرم میور ۔۔۔ ۳۰ بازار سے منگواکر کھا لیجئے۔ انشاء اللہ ایک ہی
خوراک میں فائدہ محسوس ہوگا۔

مگر میں یہ کہنے کے لئے آپ سے معذرت چاہتا ہوں کہ آپکے حکم کے
بموجب میں آپکے خط کو پھاڑ نہ سکا۔ کیونکہ اس کا تعلق صرف آپکے علاج سے
نہیں ہے بلکہ خود اپنے روحانی علاج کے سلسلے میں میں نے اس کو اس قدر موثر
پایا کہ کسی بھی تحریر یا نصیحت کا اتنا گہرا اور فوری اثر نہ ہوا تھا۔ آپنے خط کو
پھاڑنے کی بات اس خیال سے لکھی ہوگی کہ اس کے اظہار سے آپکے اجر میں
کمی ہوگی۔ لیکن اگر مجھ جیسے کھوئے ہوئے شخص کو کوئی تحریر حرکت میں لاسکے تو
وہ بلاشبہ میرے لئے آخری دم تک محبوب ہوگی۔ کاش میرے اندر بھی ایسی
ہی کیفیت پیدا ہوجاتی اور رات کی تاریکی میں آخرت کی بازپرس کا ہولناک
منظر دیکھنے کی توفیق ہوتی۔ اس لئے یہ اظہار محض آپ کی اجازت کے لئے ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس لحاظ سے اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت پایا کہ
اپنے ایک مریض کے جسمانی علاج سے مجھے روحانی غذا ملی ہے۔"

یہ خاتون جن کا خط میں نے اوپر نقل کیا، وہ ایک خاموش طبیعت کی خاتون ہیں اور ان کو
اپنے بارے میں اس کمی کا شدید احساس ہے کہ وہ تبلیغ و دعوت کا کام نہیں کرسکتیں، مگر آپ
نے دیکھا کہ ان کے ایک خاموش عمل نے کس طرح ایک ایسی تبلیغ کا کام انجام دیا جو تقریروں
پر بھی بھاری ہوگیا۔ اس لئے دوسروں کے اوپر تبلیغ و دعوت کا کام کرنے کا مسئلہ جتنا پہلے
خود اپنے آپ کو بدلنے کا مسئلہ ہے۔ تبلیغ و دعوت کا کام فاتی عمل سے نہایت گہرا ربط رکھتا ہے۔

ین اسلام کے ہم مبلغ ہیں، اگر وہ خود ہماری زندگیوں میں اترا ہوا ہے تو وہ بے شمار پہلوؤں سے دعوتی کام میں موثر ہوگا۔ اور اگر ہماری زندگی اس سے خالی ہو تو تقریر و تحریر کی شکل میں اگرچہ کچھ الفاظ وجود میں آجائیں، مگر اس چیز کا وجود نہیں ہوسکتا جس کو حقیقی معنوں میں تبلیغ و دعوت کہا جاتا ہے۔

دعوت و تبلیغ اور ذاتی عمل کے درمیان یہ رشتہ ان معنوں میں نہیں ہے جیسے کوئی شخص ریاضیات کا ٹیچر بننا چاہتا ہو تو وہ پہلے ریاضی کی تعلیم حاصل کرکے اسے خود سیکھتا ہے تاکہ وہ ریاضی کے طلبہ کو اس کا درس دے سکے۔ ذاتی عمل اور تبلیغ کے درمیان اس قسم کا ارادی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ایک فطری تعلق ہے۔ ذاتی عمل کا محرک اصلاً یہ نہیں ہے کہ آدمی کامیاب مبلغ بن جائے، ایسا ذاتی عمل کبھی وجود میں نہیں آسکتا اور اسی لئے اس قسم کا ذہن رکھنے والا شخص کبھی اچھا مبلغ بھی نہیں بن سکتا، مومن کے اندر عمل کا داعیہ اس لئے نہیں ابھرتا کہ وہ اس کے ذریعہ سے عمدہ قسم کا مبلغ بن جائے گا، بلکہ جب خدا کا خوف اور آخرت کی بازپرس کا احساس اسے باعمل بنا دیتا ہے تو اس وقت عین اسکے نتیجہ کے طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اس کی تبلیغ میں اس کی زندگی کے شرارے جھلکنے لگتے ہیں۔ وہ خود بخود ایک کامیاب مبلغ بن جاتا ہے۔

تبلیغ و دعوت میں ذاتی زندگی کے یہ اثرات مختلف پہلوؤں سے داخل ہوتے ہیں میں یہاں صرف دو چیزوں کا ذکر کروں گا۔

۱۔ سب سے پہلا اثر تو وہ ہے جس کو میں بالواسطہ تبلیغ کہوں گا۔ یہ وہ اثر ہے جو تبلیغ میں نکلنے سے پہلے بلا ارادہ اپنے تبلیغی اثرات دکھانا شروع کر دیتا ہے۔ جب ایک بندۂ خدا کے دل میں اپنے رب کے سامنے حاضری کا خوف سماتا ہے تو وہ فوراً اپنی زندگی پر نظر ثانی شروع کر دیتا ہے۔ اندر سے باہر تک اس کی زندگی بدلنے لگتی ہے۔ یہ تبدیلی اگرچہ اپنی انتہائی اور مکمل شکل میں کسی انسان کے لئے ناقابل مشاہدہ ہے مگر اس کے باوجود اس کی کچھ جھلکیاں مختلف شکلوں میں لوگوں کے سامنے آتی رہتی ہیں اور دیکھنے اور سننے والوں کو متاثر کرتی ہیں۔

جب اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ پچھلی غفلت کی زندگی میں اس نے فلاں شخص کے ساتھ ایک ایسی زیادتی کی تھی جو اس کے لئے آخرت میں بازپرس کا سبب بن سکتی ہے اور وہ اس کے سامنے معافی مانگنے کے لئے حاضر ہوتا ہے تو اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹ سننے والے کو بھی ہلا دیتے ہیں اور غلطی کا اظہار کرتے وقت نکل پڑنے والے آنسو کتنے سیاہ اور غبار آلود دلوں کو دھوکر صاف کر دیتے ہیں۔ جب وہ غلط طریقے سے حاصل کئے ہوئے ایک مال کو اس اندیشے کی بنا پر واپس کرنے جاتا ہے کہ آخرت میں اس کے اصل مالک کو یہ اختیار دیا جائے گا کہ وہ اس کے بدلے غاصب کا سارا عمل لے لے۔ اور اسے بالکل خالی کر کے چھوڑ دے، تو وہ ایک شخص کو صرف اس کا مال ہی نہیں لوٹاتا، بلکہ اس کے ساتھ اس کو ایمان کی وہ دولت بھی واپس دلاتا ہے جو غفلت میں شیطان اس سے اُچک لے گیا تھا۔ جب ایک واقعی نمازی بندے میں ہمہ تن پڑا ہوا خدا سے اس طرح سرگوشی کر رہا ہوتا ہے کہ بقیہ دنیا کی اسے خبر بھی نہیں ہوتی، عین اس وقت اس کی اس ہیئت و فنائیت کو دیکھ کر کسی بندۂ خدا کا دل اندر ہی اندر اپنے رب کے آگے جھک جاتا ہے۔ وہ بے اختیار چاہنے لگتا ہے کہ وہ بھی اسی طرح اپنے خدا کو پائے اس سے لپٹ جائے۔ جب زندگی کے عملی معاملات میں لوگوں کو اس سے سابقہ پیش آتا ہو اور لوگ اس کی سچائی، پاکیزگی، دیانت داری اور ایفائے عہد کا تجربہ کرتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو بالکل مجبور پاتے ہیں کہ اس دین کی قدر کریں جس کے اندر یہ طاقت ہو کہ ایسے عمدہ انسان تیار کرے، حتیٰ کہ کتنے غیر مسلموں کو اس طرح کے تجربات سے اسلام کی توفیق ملتی ہے اور کتنی غافل روحوں کو دوبارہ اسلام کا شعور نصیب ہوتا ہے۔

دو پتھر باہم ملیں تو کوئی خاص بات نہیں ہوگی۔ لیکن بجلی کا ایک تار جب دوسرے تار سے مس کرتا ہے تو فوراً سادہ تار میں برقی رو دوڑنے لگتی ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ ایک اچھے انسان کی خصوصیات دوسرے انسان کے لئے برقی رو کی حیثیت رکھتی ہیں، انسان کے اندر فطری طور پر یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اچھی چیز سے اثر قبول کرتا ہے اور خدا پرستی کی چیزیں اس کے دل کی آواز بن کر اس کی نفسیات

میں پیوست ہوجاتی ہیں جب ایک شخص کوئی عمدہ عمل کرتا ہے۔ یا اس کی زندگی سے خدا کا کوئی نور چھن کر لوگوں کے سامنے آجاتا ہے تو اس وقت دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان اسی طرح اس کو قبول کرتے ہیں جیسے بجلی کے تار سے کوئی دوسرا تار برقی رو قبول کرتا ہے۔ اس وقت فطرت کے ایک ان دیکھے تار پر ایک طرف کے جذبات دوسری طرف منتقل ہونے لگتے ہیں، ایک کی ہلچل دوسرے کو لرزہ براندام کردیتی ہے، ایک کی روشنی سے دوسرے کا باطن چمکنے لگتا ہے۔ یہ ایک بالکل فطری عمل ہے جو لازمی طور پر اس وقت وجود میں آتا ہے جب کسی کے اندر ایمان و اسلام کا شعلہ بھڑکے اور اس کے گرد و پیش ایسے لوگ موجود ہوں جن کی فطرت مسخ نہ ہوگئی ہو اور انسانی اوصاف ابھی باقی ہوں۔

۲۔ دوسری چیز وہ ہے جو براہ راست تبلیغ میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ الفاظ جن کے ذریعہ سے ہم اپنی بات دوسرے تک پہنچاتے ہیں وہ کسی مفہوم کا مجرد اظہار نہیں ہیں جیسے پانچ اور دس کسی چیز کے عدد کا مجرد اظہار ہیں۔ بلکہ اسی کے ساتھ ان کے اندر مختلف قسم کی کیفیات پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ اور مفہوم کے اعتبار سے دو بالکل یکساں کلام اپنی کیفیت اور اثر کے اعتبار سے بے حد مختلف ہوجاتے ہیں۔ اس فرق کو واضح کرنے کے لئے میں یہاں دو شعر نقل کرتا ہوں:-

خرابات عالم میں ہر چار جانب چھلکتے ہوئے جام و مینا دھرے ہیں
ضرورت اسی کی ہے لے اہل محفل کوئی ہاتھ اس کو بڑھا کر اٹھا لے
حماد

یہ مے خانہ ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے
شاد

یہ دونوں اشعار مفہوم کے اعتبار سے بالکل ہم معنی ہیں، مگر الفاظ اور دروبست کے فرق نے دونوں میں زمین آسمان کا فرق پیدا کردیا۔

یہ فرق کی ابتدائی قسم ہے جس کو ہم ادبی فرق کہہ سکتے ہیں۔ اور وہ قدرت کلام اور

ی ذوق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ دوسرا فرق وہ ہے جو صاحب کلام کی اپنی اندرونی کیفیات کے
تیار سے وجود میں آتا ہے۔ اگر آپ ایک واقعہ سے متاثر ہوں تو اس کا ذکر کرتے ہوئے نہ صرف
پ کا لب و لہجہ بدل جائے گا، بلکہ آپ کی زبان سے ایسے ایسے الفاظ نکلیں گے جو آپ کی
ندرونی کیفیات کی ترجمانی کر رہے ہوں جن میں آپ کا تاثر اسی طرح بھرا ہوا ہو جیسے کسی
ازہ پھل میں اس کا رس بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ متاثر نہ ہوں تو آپ کا
یان واقعہ محض اخباری رپورٹ معلوم ہوگا۔

ذاتی طور پر ایمان و اسلام کی زندگی کو پالینا آدمی کے تبلیغی کام میں یہی دوسری
خصوصیت پیدا کرتا ہے۔ وہ اس کے کلام کو مجرد کلام کے مقام سے اٹھا کر موثر کلام بنا دیتا
ہے۔ وہ اس میں شدت جذبات کا رس بھرتا ہے، وہ ننگے الفاظ کو کیفیات کا لباس
وڑھاتا ہے وہ حروف کے مجموعوں کو دل کے ٹکڑے بنا دیتا ہے، وہ کلام کو خوشبو
فروش کا معطر اشتہار بنا دیتا ہے جو صرف پڑھا نہیں جاتا، بلکہ اپنی خوشبو بھی مخاطب تک
پہنچا دیتا ہے۔

جس کے اپنے اندر اسلام اترا ہوا نہ ہو، اسکے کلام میں بظاہر تمام شرعی باتیں موجود
ہوں گی مگر وہ بس الفاظ کا ایک مجموعہ ہوگا جس میں دل کی بو بسی ہوئی نہیں ہوگی۔ وہ
یک سپاٹ کلام ہوگا جو خود اپنی حقیقتوں سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جب ایک
یسا شخص بولتا ہے جس نے فی الواقع دین کو پالیا ہو تو اس کی زبان اور اسکے الفاظ
یں حیرت انگیز خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ جب لوگوں کو آخرت سے ڈراتا ہے
تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ اسرافیل صور لئے کھڑے
ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ کس وقت حکم ہو اور پھونک مار کر دنیا کو تہ و بالا کر دیں۔
اس کے بے قرار جملے صاف بتاتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ محض کچھ الفاظ کی تکرار نہیں
ہے، بلکہ وہ ان ہیجان خیز واقعات سے براہ راست آشنا ہو کر بول رہا ہے۔ اسکی تحریروں
میں دل کا سوز گھلا ہوا ہوتا ہے، اس کے الفاظ اندرونی تپش کی آنچ سے جل رہے ہوتے
ہیں، اس کے پہلوؤں میں حقیقت کی خوشبو بسی ہوئی ہوتی ہے، اس کی سطروں کے

درمیان ہے بلکہ یہ نظر آتا ہے کہ آنسوؤں نے ٹپک کر لکھی ہوئی سیاہی کا رنگ بدل دیا ہے —— یہ چیزیں اس کے کلام کو حقیقت بیانی کے ایک ایسے مقام پر پہنچا دیتی ہیں جہاں دیکھنے والوں کو نظر آتا ہے گویا حقیقت خود مجسم بے نقاب ہو کر سامنے آگئی ہے۔

تبلیغ و دعوت کے کام کو موثر بنانے کے لئے خارج میں کوئی ہتھیار موجود نہیں ہے۔ اس کی صرف ایک ہی تدبیر ہے —— اپنے اندرون کو مسلمان بناؤ، اسی وقت تم اپنے بیرون کو مسلمان بنا سکو گے۔

معاشرہ کی اصلاح

(عتیق الرحمٰن سنبھلی)

جس طرح کسی انسان کے جسم پر پھوڑے پھنسی یا کسی دوسرے ظاہری فساد کو دیکھکر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے باطن میں مادۂ فاسد بھرا ہوا ہے اور اس سارے ظاہری فساد کی جڑ یہی ان دیکھا فساد ہے، ٹھیک اسی طرح انسانی معاشرہ کے بیرونی بگاڑ کو دیکھ کر یقین کر لینا چاہیئے کہ یہ کسی اندرونی خرابی کا نتیجہ ہے اور جس طرح پہلی صورت میں علاج کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اصل توجہ مادۂ فاسد کو جڑ سے نکال دینے پر کی جائے اسی طرح دوسری صورت یعنی معاشرہ کے بیرونی بگاڑ) کے علاج میں بھی یہی طریقۂ علاج صحیح اور کارگر ہے اور اسی سے سوسائٹی (معاشرہ) کی پائدار صحت مندی کی توقع کرنا صحیح ہے۔ اس اصول کو چھوڑ کر اگر علاج کیا جائے تو ممکن ہے کہ ظاہری فساد کچھ دیر کیلئے دب جائے مگر مٹ نہیں سکتا۔

پہلا طریقہ نبض شناس اطباء کا ہے اور دوسرا نبض سے بے بہرہ ظاہر بین جراحوں کا، بیشک ایسا ہوتا ہے کہ پھوڑوں سے بھرا ہوا جسم جراح کے علاج اور اس کی مرہم پٹی سے بھی ٹھیک ہو جاتا ہے اور مریض کو صحت کا سکون مل جاتا ہے، مگر اس پر یہ سمجھ لینا کہ صحت تام حاصل ہو گئی بڑی خطرے کی بات ہے اس لئے کہ اندرونی مادہ کو مہلت مل جاتی ہے کہ وہ اندر رہی اندر بگڑتا اور سڑتا رہے اور پھر کسی دوسرے وقت میں پہلے سے زیادہ شدت و قوت کیساتھ ظاہری جسم پر حملہ کرے لہٰذا اندرونی فساد کو ختم کئے بغیر ظاہری سکون پر اطمینان دانش مندی کے خلاف ہے۔

بدقسمتی سے آج ہمارے معاشرہ کی حالت بالکل اسی انسان کی سی ہو جس کا جسم زہریلے پھوڑوں سے بھرا ہوا ہے، ہمارے معاشرہ کے پھوڑے کیا ہیں بداخلاقی، بے حیائی، ظلم، حقوق تلفی، رشوت، بددیانتی، اور اسی قسم کی سیکڑوں برائیاں۔ یہ وہ زہریلے پھوڑے ہیں جن کی وجہ سے چین وسکون سماج سے کوسوں دور ہو گیا ہے۔ صحیح اصول علاج کے ماتحت ہمیں ان امراض کے اسباب کا پتہ لگانا چاہیئے، صرف وعظ ونصیحت کے مرہم یا کسی آہنی نظام کے دباؤ پر بھروسہ نہ کرنا چاہیئے۔

بعض مدعیان نبض شناسی کی تشخیص یہ ہے کہ سوسائٹی میں یہ بگاڑ عام غریبی اور طبقاتی ناہمواری سے آیا ہے اگر ہر شخص کو بقدر ضرورت دولت مل جائے تو یہ مریض معاشرہ صحت مند ہو سکتا ہے، جب اس تشخیص پر نگاہِ تحقیق پڑی تو اس کے سامنے یہ سوال آکھڑا ہوا کہ سوسائٹی میں ایسے افراد کی کمی نہیں ہے جن کے پاس بقدر ضرورت یا زائد از ضرورت مال و دولت موجود ہے پھر ان سے یہ امراض کیوں دور نہیں ہوئے، بلکہ برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ دوا ان کے امراض کی شدت میں مزید اضافہ کرتی ہے، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بسا اوقات کم پیسے والا اتنا بداخلاق نہیں ہوتا جتنا زیادہ روپیہ والا۔ اگر غریب ظالم ہوتا ہے تو امیر ظلام۔ اگر ایک کانسٹبل دوچار روپیہ رشوت لیتا ہے تو تھانہ کا انچارج سیکڑوں کے وارے نیارے کرتا ہے اگر ایک تھوڑی تنخواہ والا کلرک رشوت لیتا ہے تو سیکڑوں پانے والا آفیسر اس سے بدرجہا زیادہ گندی کمائی کرتا ہے، فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ ایک طرف برائی عریاں اور بے ڈھنگی ہوتی ہے دوسری طرف کوئی خوبصورت آڑ اور ظرف پردہ چھپا ہو جاتا ہے۔ برائی یہاں بھی وہی برائی ہے۔ اور وہ برائی یقیناً زیادہ بری ہے جس کی قباحت وشناعت عام طور سے محسوس نہ کی جا سکتی ہو۔

اس سوال کی روشنی میں ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ افراد کو بقدر ضرورت دولت مل جانا سوسائٹی کے پھوڑوں کا علاج ہرگز نہیں ہو سکتا، یہ دوا جب معاشرہ کے بعض

افراد کو فائدہ نہ دے سکی تو کیسے ضمانت کی جا سکتی ہے کہ پورا معاشرہ اس سے صحت پائے گا۔

تجویز کی غلطی ہمارے نزدیک تشخیص کی خطا کی طرف اشارہ کرتی ہے، مگر بعض حکمائے وقت نے تشخیص سے اتفاق کرتے ہوئے تجویز میں کچھ ضروری اضافہ کیا ہے، وہ ہے "نظام حکومت کا آہنی شکنجہ" یعنی سماج کا جسم اس طرح کس دیا جائے کہ اندرونی مواد کو پھوڑے بن کر ابھرنے کی گنجائش باقی نہ رہے۔ لیکن زمانۂ ماضی کے انقلابات و حوادث کی تاریخ اگر محفوظ ہے اور اس سے عبرت و بصیرت حاصل ہوتی ہے تو ہمیں اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ سارے گذشتہ نظاموں کی طرح اس نظام کے اعضاء میں بھی اضمحلال کا عمل ضرور ہوگا، اس کی گرفت یقیناً ڈھیلی ہو جائے گی، اور برسوں کے سڑے ہوئے مواد کو ابھرنے کے بجائے ابلنے کا موقع ہاتھ آئے گا، اور اس وقت اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت سماج کا بگاڑ کس درجہ پر ہوگا، ممکن ہے موجودہ پیمانہ اس کو ناپ بھی نہ سکے۔۔۔۔ اس آخری تجویز پر اگر عمل کر لیا جائے تو نتیجہ ثابت کریگا کہ اشرف المخلوقات انسان اور ایک سرکش گھوڑے میں کوئی فرق نہیں کہ جب تک چاروں طرف سے چار رسیوں میں جکڑا ہوا ہے معقول ہے، اور جہاں بندش دور ہوئی پھر وہی شرارت اور سرکشی۔

ایک انسانی مثال لے لیجئے کہ بعض لوگوں میں چوری یا ڈکیتی کی عادت ہو جاتی ہے جو بیشک سوسائٹی کے لئے ایک ایسا ہی زہریلا پھوڑا ہے جیسے چند اوپر ذکر ہوئے ایسے لوگوں کو گرفتار کر کے جیل خانے میں ڈال دیا جاتا ہے، مار پیٹ کی جاتی ہے، لیکن کتنے چور اور ڈاکو ہیں جو جیل خانہ سے نکلنے کے بعد اس حرکت سے باز آ جاتے ہیں اور اس طریقۂ علاج سے ان کا مرض دور ہو جاتا ہے، بیشک وہ قید کی مدّت میں یہ کام نہیں کر پاتے مگر باہر نکلتے ہی پہلے سے زیادہ کرتے ہیں ــــــ یہ تو تھی انسانی دماغوں کی تشخیص اور تجویز جس کی غلطی اور ناکامی ہمیں صاف نظر آ رہی ہے۔ اس سے بالکل الگ ایک تشخیص اور تجویز وہ ہے جس کو ایک انسان نے وحی کی روشنی میں ساری

دنیا کے سامنے پیش کیا، اس کے مختصر الفاظ یہ ہیں:۔

الا وان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب ۔	معلوم ہونا چاہیئے کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جس پر انسان کی اچھائی برائی کا دارومدار ہے ٹھیک رہا ہو تو انسان ٹھیک رہتا ہے اور جب بگڑ جاتا ہو تو انسان میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے، اور وہ انسان کا دل ہو

عقلیت اور تجدد کا مضحکہ خیز مظاہرہ ہوگا اگر اس کو صرف اس لئے رد کر دیا جائے کہ یہ نظریہ ڈیڑھ ہزار برس پرانا ہے ـــــ یہ نظریہ ہماری اس فطرت کو سامنے رکھ کر تجویز کیا گیا ہے جو اس سے بہت زیادہ پرانی ہے۔ انیسویں صدی میں ملیریا کیلئے کینن کا استعمال اس لئے نہیں ترک کیا جا سکتا کہ اس کی دریافت کسی گذشتہ صدی میں ہوئی تھی اگر ملیریا کے اسباب نہیں بدلتے تو دوا کیسے بدل دی جائے، صحیح طریقے پر کینن کے استعمال سے لاتعداد مریضوں کا ملیریا سے نجات پانا تشخیص و تجویز کی صحت کی سب سے بڑی دلیل ہے، تاریخ اگر کسی زمانے میں کسی جگہ سماجی امراض کے بالکلیہ ازالہ کا پتہ دیتی ہے تو وہ انسانیت کے صحیح اور کامل ارتقار کا صرف وہی دور ہے اور وہی ملک ہے جس میں اس نسخہ کا تجربہ صحیح طریقے پر کیا گیا۔ یہ آپ کا کام ہے کہ تاریخ میں اس زمانہ کا پتہ لگا کر اور اس کی تفصیلات دیکھ کر اطمینان کر لیں کہ مدعی کا یہ دعویٰ صحیح ہے، اور یہ بھی دیکھ لیجئے گا کہ وہ معاشرہ کسی آہنی نظام حکومت میں کسا اور بندھا ہوا تو نہ تھا۔

محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ایک تحصیل دار عبد اللہ بن رواحہؓ کو خیبر کے یہودیوں سے زرعی ٹیکس وصول کرنے کے لئے بھیجتے ہیں، وہ یہودی ٹیکس میں تخفیف کرانے کیلئے بغیر کسی طلب کے رشوت کی پیشکش کرتے ہیں، عبد اللہ بن رواحہؓ جانتے ہیں کہ جاسوسی کا کوئی سسٹم نہیں ہے، ان پر کوئی نگرانی نہیں ہے مگر ان کا ضمیر بالکل نہیں پھسلتا اور پوری نفرت اور حقارت کے ساتھ اس ناپاک پیش کش کو ٹھکرا دیتے ہیں، یہودی ان کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں اور ان کی زبان پر بے ساختہ یہ کہتی ہے کہ بیشک اسی انصاف کے بل پر زمین و آسمان قائم ہیں۔

دوسری مثال لیجئے عمر بن عبدالعزیزؒ جو صحابی نہیں ہیں بلکہ محمد رسول اللہ
لی اللہ علیہ وسلم کے بہت بعد پیدا ہوئے) کو پوری اسلامی سلطنت (روم و ایران
ہ سب سے بڑی شہنشاہیاں جس کا جز بن چکی تھیں) سپرد کی جاتی ہے۔ وہ اپنے
نروں کی روایات سے فائدہ اٹھا کر اس اقتدار کو اپنی ذات اور خاندان
ے لئے استعمال کر سکتے تھے مگر ہوا کیا؟ انھوں نے ان تمام جاگیروں اور اموال
جو شاہی خاندان اور امرا سلطنت کی ذاتی ملکیت بن گئے تھے، ہر قسم کے خطرات
سے بے پروا ہو کر عوام کے خزانہ بیت المال میں واپس کر دیا۔ حتیٰ کہ اپنی بیوی
جو سابق خلیفہ کی صاحبزادی تھیں) کے گلے میں اس قسم کا ایک قیمتی ہار باقی رہنا
ی گوارہ نہ کر سکے اور صاف کہہ دیا۔

"اے فاطمہ یا تم اس کو بیت المال میں واپس کر دو
یا مجھ سے تعلق ختم کر لو"

یا نام نہاد جمہوریت اور "غریب راج" نے ایسی کوئی ایک مثال بھی پیش کی ہے
بلکہ اسلام نے ٹھیٹ شہنشاہیت اور ملوکیت کے دور میں اپنی تاریخ میں ایسی
ثنت مثالیں چھوڑیں، مگر برا ہو نابینائی کا کہ اس پر تو سورج بھی اثر کرنے سے
اجز ہے! گو میرا مقصد مثالوں کا شمار کرانا نہیں ہے، نہ خود کو اتنی فرصت نہ
وراق میں اتنی وسعت، مگر ایک مثال اور پیش کرنا چاہتا ہوں شاید مساوات
ے سچے جویا کچھ غور کریں۔ اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس دور کے سچے
در مخلص مساواتیوں کیلئے بھی مساوات اب تک لیلیٰ خیال سے آگے کوئی حقیقت
ہیں رکھتی، جی چاہتا ہے کہ وہ چشم تصور کی مدد سے چند لمحوں کے لئے اس دور پر
یک نظر ڈالیں، جس میں اسلام کا صحیح تجربہ ہوا ہے، ممکن ہے وہ اپنی اس ذہنی محبوبہ
و پیکر حقیقت میں دیکھ پائیں۔

حضرت عثمان غنی (رضی اللہ عنہ) اسلامی حکومت کے تیسرے خلیفہ ہیں۔ انھیں
خلافت اس وقت ملی ہے جب اسلامی فوجیں روم و ایران میں اپنی فتوحات

قریباً مکمل کر چکی تھیں) ان کی اس حیثیت کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے بعد ذرا ایک واقعہ سُنئے۔

ایک مرتبہ غصہ میں آکر اپنے کسی غلام کا کان کھینچ دیا، فوراً متنبہ ہوا اور اس سے کہا "تو اس کے بدلے میں میرا کان کھینچ" اس غریب کو کیسے جرأت ہو سکتی تھی لیکن انہوں نے خوشامدانہ اور حاکمانہ لہجوں کی پوری طاقت استعمال کر کے اسے اس پر آمادہ کیا۔ اس نے تعمیل حکم میں بمشکل کان پکڑ لیا، مگر ابھی ایک مرحلہ اور باقی تھا یعنی کھینچنا اس کی جرأت کہاں سے لائے، بہت کہنے سننے سے کھینچا بھی تو بہت آہستہ سے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے کہا: "تجھے اتنی ہی زور سے کھینچنا ہوگا جتنی زور سے میں نے کھینچا تھا، تب اس کے بغیر نہیں مانوں گا۔"

اب میں اصل مدعا کی طرف آتا ہوں جو تشنۂ تفصیل رہ گیا تھا یعنی نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی تشریح کہ "الا ان فی الجسد مضغۃ" الخ، جو تشخیصی حیثیت رکھتا ہے اور اس تشخیص کی بنیاد پر آپ کی تجویز۔

آپ کی تشخیص کا حاصل تو یہ ہے کہ معاشرہ کا بناؤ بگاڑ، صلاح و فساد اہل معاشرہ یعنی افراد کے دل کی حالت پر موقوف ہے، اگر دل میں بگاڑ آگیا ہے تو معاشرہ میں یہ امراض پیدا ہو جائیں گے اور افراد کا دل اگر درست ہے تو ان افراد کی ترکیب جو معاشرہ وجود میں آئے گا اس کی حالت بھی درست ہو گی، گویا سوسائٹی کے ان امراض کو دیکھتے ہی افراد کے دل کے علاج کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، اگر دل کی حالت بدل گئی تو بہت آسانی سے ان برائیوں پر قابو پایا جا سکتا ہے ورنہ تو پوری عمر اسی میں صرف ہو جائے گی اور امراض کا استیصال پھر بھی نہ ہو پائے گا، آج ایک پھوڑا اچھا ہوگا تو کل دوسرا پھوڑا دوسری جگہ نکل آئے گا، غرض جب تک دل میں سیلاب فساد موجود ہے وہ روزنئے نئے راستوں سے باہر آتا رہے گا، سبب سے تعرض کئے بغیر مسبب کے ظہور کو کوئی پیش بندی نہیں روک سکتی، کسی تیز دریا پر بند باندھ کر اس کا راستہ روکا نہیں جا سکتا، تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس بنا پر افراد انسانی کے

قلوب کی اصلاح کیلئے آپ نے دو بنیادی چیزیں پیش فرمائیں، ایک ایمان باللہ۔ دوسرے ایمان بالیوم الآخر۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس بیّن حقیقت پر ایمان لائے کہ میرا اور ساری کائنات کا خالق ایک اللہ ہے، اسی طرح اس حقیقت کا بھی یقین کرے کہ اس سب کا حقیقی مالک اور حاکم بھی وہی ہے، ہر وقت ہر چیز پر اس کی نظر ہے نہ اسے دھوکہ دیا جا سکتا ہے نہ کوئی بات چھپائی جا سکتی ہے، وہ سب کچھ کرنے پر قادر ہے، غرض ساری اعلیٰ صفات اس میں پائی جاتی ہیں، کائنات کا وجود اور بقا پھر اس میں یہ ہمہ گیر نظم و ضبط عقلی طور پر بھی تقاضہ کرتے ہیں، ایک ایسی ذات اور اس کی ان صفات کا۔

اسی طرح یقین کرے کہ موت سے کتاب زندگی بند نہیں ہوتی بلکہ اس کا ایک دوسرا باب شروع ہوتا ہے۔ عمل کا باب ختم ہو کر جزا و سزا کا باب شروع ہوتا ہے، وہاں اس زندگی کا کیا دھرا سامنے آئے گا، باز پرس ہو گی اور حسب استحقاق بہترین انعام یا بدترین عذاب دیا جائے گا، یہی عقل اور انصاف کا تقاضہ بھی ہے، لیکن عقل اگر اس زندگی کا پورا ادراک نہیں کر سکتی تو کیا بات ہے، یہ عقل کا قصور ہے نہ کہ ایک حقیقت کے بطلان کا ثبوت، خصوصاً جبکہ عقل کی شکست و درماندگی اب کوئی چھپی ہوئی بات نہیں رہ گئی ہے، اور بڑے بڑے فلاسفہ و عقلا اس اعتراف پر مجبور ہو گئے کہ (العقل لیس کل شیئ) عقل ہی سب کچھ نہیں ہے کہ ہر بات کا فیصلہ کر سکے۔ عقل میدان چھوڑ چکی اب اس خالی میدان میں ایک شخص کہتا ہے کہ میں اللہ کا فرستادہ ہوں اور اس نے مجھے خبر دی ہے کہ دوسری زندگی ضرور آئے گی اور اس کی تفصیلات یہ ہیں۔ آپ تردید کس بنیاد پر کر سکتے ہیں جبکہ اس کو غیر ممکن بتانے کیلئے عقل کے پاس دلائل نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں اس شخص کی تردید یا تائید کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اس شخص کی پوری زندگی کو سچائی کی کسوٹی پر کسا جائے۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال سے پرکھنے کا یہ عمل مسلسل ہو رہا ہے، لیکن نتیجہ برابر ایک ہی رہا کہ صرف سچائی نہیں بلکہ ہر پہلو سے اس کی سیرت عام انسانی سطح سے بہت بلند ہے، اعلیٰ سے اعلیٰ انسانی سیرتوں

کے پیمانے اسے ناپنے کیلئے بیکار رہے، یہ سیرت کسی اور ہی پیمانے کی ہے، یہ سیرت اگر کہیں اور بھی پائی جاتی ہے تو صرف انھیں انسانوں میں جن کو انسانیت محضہ کے علاوہ نبوت یا رسالت کا منصب عطا ہوا ہے (ان افراد کی تصدیق خود یہ شخص کر رہا ہے جس کو ہم اللہ کے آخری پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام سے یاد کرتے ہیں)۔ عقل نے خود کو عاجز پا کر سیرت سے شہادت طلب کی، بیان کے ہر ہر فقرہ سے ٹپک رہا ہے "حاش للہ ما ھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم" لیکن وہ خود اپنے متعلق صفائی سے پکار رہا ہے نہیں! ہرگز نہیں!! میں پیکر نوری نہیں، تمھاری ہی طرح جسد خاکی ہوں، ہاں بس افضلیت اتنی ہے کہ اللہ نے مجھے اپنی رسالت کیلئے منتخب کیا ہے۔

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ اَنَّمَا اِلٰھُکُمْ	اسکے سوا کچھ نہیں کہ میں تمھاری طرح ایک بشر ہوں
اِلٰہٌ وَّاحِدٌ فَمَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَاءَ	وحی کی گئی ہو میری طرف کہ تمھارا معبود واحد
رَبِّہٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشْرِکْ	ایک اللہ ہے، پس جو امید رکھے اپنے اس رب سے
بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖٓ اَحَدًا	ملنے کی تو اس کو اچھے، اور شریک کرے اپنے رب کی بندگی میں کسی کو۔

ممکن ہے کہ ضمنی بات کی طوالت نے اصلی بات بھلا دی ہو، اس لئے پھر اجمالی اعادہ کرتا ہوں۔ اللہ کے پیغمبر نے اللہ کی جانب سے ان امراض کے ازالہ کیلئے یہ چند یقین پیش کئے ہیں، اللہ کی ذات کا یقین، اس کی صفات کا یقین، موت کے بعد جزا سزا والی زندگی کا یقین۔

دنیا انصاف سے کہے، کیا جس معاشرہ کے افراد کے دل ان چند یقینوں سے لبریز ہونگے وہاں یہ امراض پنپ سکیں گے، جو آج عام ہیں؟ یہ برائیاں باقی رہ سکیں گی جو آج غالب ہیں؟ — گویا یہ مادہ فاسد کے مقابلے میں صالح مواد ہے، خراب خون کے مقابلے میں اچھا خون ہے، خارجی صحت مندی جس کے تابع ہوتی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ یہ یقین زندہ اور طاقت ور ہوں، جن میں بری خواہشات کے آڑے آنے کی طاقت ہو، جو مادہ فاسد کے عمل کو روک سکیں، اچھے خون کے یہ قطرے اگرچہ چند ہیں مگر

کافی ہیں بشرطیکہ گرم ہوں، اگر گرمی کی جگہ سردی ہے تو پھر اس مقصد کیلئے ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے ——— مسلمانوں میں ہیں مگر سرد ———

اللہ کے رسولؐ نے عبادات کا نظام اس آگ کو ہوا دیتے رہنے ہی کیلئے پیش کیا ہے لیکن یہ عبادات اگر صرف رسوم بن کر رہ جاتی ہیں تو اس مقصد کے لیے مفید نہیں رہتیں مسلمانوں کی عبادات کا آج یہی حال ہے اور ان کی بے اثری کا یہی راز ہے۔

ہاں اس اندرونی اصلاح کی طرف اصلاً اور اولاً توجہ دینے کیساتھ ساتھ خارجی علاج کا بھی پورا اہتمام کیا جائے۔ یعنی غریبوں کی بھوک اور افلاس کے ازالہ کی کوشش کی جائے۔ مال داروں کے اموال کو خزانوں کی شکل نہ اختیار کرنے دی جائے، فضول خرچی کے مواقع ختم کئے جائیں، مثلاً جوا، شراب، سینما، اور تعیش کے وسائل، کہ یہ چیزیں بہت سی برائیوں کیلئے ترغیبات بنتی ہیں، جیسے رشوت اور بددیانتی وغیرہ۔ بے حیائی اور بد اخلاقی کی ترغیبات دور کی جائیں مثلاً بے پردگی غیر مردوں عورتوں اور لڑکوں لڑکیوں کا اختلاط، ورنہ ان مذکورہ اور ان جیسی بہت سی غیر مذکورہ بد پرہیزیوں کی موجودگی میں مکمل اصلاح کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے گا۔

حاصل مدعا یہ ہے کہ اگر ہمارا معاشرہ طبیب انسانیت کے اس نسخہ کو اس کی پوری پوری رعایات کر کے استعمال کرے تو صحت کامل میں کوئی شبہ نہیں، اطمینان کے لئے پہلا تجربہ موجود ہے، ورنہ صرف ظاہری لیپ پوت اور خارجی مرہم پٹی پر اعتماد اور اس غلط طریقۂ علاج کے ماتحت روز نئے نئے تجربات کی مشقِ ستم اس مریض کو وہیں پہونچا کے رہے گی جو اس غلط اندیشی کی آخری منزل ہے۔

فانتظروا انا معکم منتظرون

اسلام — ایک مقصد

(جناب وحید الدین خاں صاحب (اعظم گڑھ)

(مسلمانوں کے ایک اجتماع میں کی گئی تقریر)

دوستو! ہم مسلمان ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے بارے میں دعویٰ رکھتے ہیں کہ ہم بامقصد لوگ ہیں۔ کیونکہ اسلام زندگی کا ایک مقصد ہے۔ مگر میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ بامقصد ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ ایک مقصدی تصور آپ کے ذہن میں پایا جا رہا ہو۔ کچھ تقریروں کو سُن کر یا کچھ تحریروں کو دیکھ کر ایک مقصدی نظریہ کسی کے دماغ میں پہنچ جائے تو صرف اس بنا پر اس کو بامقصد انسان نہیں کہا جا سکتا۔ بامقصد انسان تو وہی ہے جو اپنے پورے وجود کے ساتھ بامقصد بن گیا ہو۔ جس کی زندگی اس کے مقصد میں اس طرح ڈھل جائے کہ دونوں کے درمیان کوئی دوئی باقی نہ رہے۔

آپ اس وقت ایک مسجد میں بیٹھے ہیں جس کے اوپر اونچے اونچے مینار کھڑے ہیں۔ اگر ہوا کے ذریعے کچھ آم کے پتے اڑ کر آئیں اور ان میناروں پر اٹک جائیں تو اس بنا پر ان میناروں کو آپ آم کا درخت نہیں کہنے لگیں گے۔ آم کا درخت تو وہی ہے جو اپنی جڑ میں بھی آم ہو، اپنے تنہ میں بھی آم ہو، اپنی شاخوں میں بھی آم ہو، اپنے پتوں میں بھی آم ہو، اور وہ آم ہی کے پھل دے۔ آم کا درخت آپ اسی کو کہتے ہیں جو اس طرح اوپر سے نیچے تک آم ہو۔ محض کسی لمبی کھڑی ہوئی چیز پر آم سے مشابہت رکھنے والی کچھ چیزوں کا اتفاق سے جمع ہو جانا، اس کو ہرگز نہیں بنا دیتا۔ اسی طرح آپ کو بھی بامقصد انسان کا لقب اسی وقت دیا جا سکتا ہے جب آ

سے پاؤں تک اپنے پورے وجود میں بامقصد بن گئے ہوں۔ محض کچھ نظریات کا کہیں سے آکر آپ کے ذہن میں اٹک جانا آپ کو بامقصد نہیں بنا دیتا۔ اسلام زندگی کا ایک مقصد ہے اور ہم اسی وقت مسلمان کہے جانے کے مستحق ہیں جب ہم نے واقعی ایک مقصد کی طرح اسلام کو اپنی زندگی میں شامل کیا ہو۔

بامقصد انسان کی پہچان کیا ہے۔ اس کو در جنوں پیرایہ سے بیان کیا جا سکتا ہے، اس وقت یہاں اس کی چند خصوصیات کا مختصر طور پر ذکر کروں گا۔

۱۔ بامقصد آدمی کی پہلی پہچان وہ ہے جس کو میں "ارتکاز" کے لفظ سے تعبیر کروں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی تمام فکری اور ذہنی قوتیں آپ کے مقصد میں مرکوز ہو جائیں۔ آپ کا سوچنا آپ کا محبت کرنا، آپ کا نفرت کرنا، سب کچھ آپ کے مقصد کے ساتھ وابستہ ہو گئے ہوں۔ آپ کی کوئی چیز دوسری سمت بکھری ہوئی نہ ہو۔ جوتا بنانے والوں کے یہاں آپ نے دیکھا ہوگا۔ کام کرتے کرتے ان کے پاس بہت سی کیلیں پھیل جاتی ہیں۔ اس وقت وہ یہ کرتے ہیں کہ مقناطیس کا ایک ٹکڑا لے کر وہاں پھراتے ہیں جس سے تمام بکھری ہوئی کیلیں کھنچ کھنچ کر اس سے چمٹ جاتی ہیں۔ وہ اس کو اٹھا کر اسے خانے میں رکھ لیتے ہیں۔ اس مثال میں اگر مقناطیس کی جگہ آپ اپنے مقصد کو رکھیں اور کیلوں کے بجائے اپنے افکار و خیالات اور جذبات و احساسات کا تصور کریں تو زندگی اور مقصد کے درمیان تعلق کو آپ سمجھ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مقناطیس کے گرد لوہے کے ٹکڑے جس طرح ایک ایک کر کے اکٹھا ہو جاتے ہیں اور آس پاس کا کوئی ٹکڑا ایسا نہیں ہوتا جو اس سے آکر چمٹ نہ گیا ہو، اسی طرح آدمی کے مقصد کے گرد اس کے سارے دل اور سارے دماغ کو مرکوز ہو جانا چاہیے۔

یہاں ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب میرے یہاں آئے۔ ان کو بازار کا کچھ کام تھا۔ بازار جا کر جب وہ لوٹے تو انھوں نے ایک واقعہ بتایا جس سے مجھے بڑی عبرت ہوئی۔ واقعہ بہت چھوٹا سا ہے مگر اس میں ہمارے لیے بڑی نصیحت ہے۔ انھوں نے کہا میں ایک جگہ پہنچا جہاں سڑک کے کنارے بہت سے موچی اپنی اپنی دوکان لیے بیٹھے تھے جب میں ان کے پاس سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ ان میں سے ہر شخص میرے جوتے کی طرف دیکھ رہا ہے

جس موچی کی نظر کچھ تو مسافر کے جوتے پر اگر رک جاتی ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ موچی بھی اپنے مقصد میں کس قدر گم ہیں۔ ان کو انسان صرف جوتے کی شکل میں نظر آتا ہے۔ بھرے بھرے بازار میں سینکڑوں انسان ان کے سامنے سے آتے جاتے ہیں۔ مگر انھیں ان انسانوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ ان کو نظر اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں۔ وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ یہ آنے جانے والے لوگ اپنے پاؤں میں ایک ایسی چیز پہنے ہوئے ہیں جس کی پالش کر کے یا جس کی مرمت کر کے وہ کچھ پیسے حاصل کر سکتے ہیں۔

اسی طرح بامقصد آدمی اپنے مقصد میں گم رہتا ہے۔ اس کو ہر چیز میں صرف اپنا مقصد نظر آتا ہے۔ وہ ہر واقعہ کو، ہر مسئلہ کو، ہر بات کو اپنے مقصد کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے مقصد کے تصور میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ دوسری چیزیں اسے بھولنے لگتی ہیں۔ ایک صاحب ہیں جو بہت فعال آدمی ہیں جو کام بھی کرتے ہیں اس کو پوری طرح لگ کر کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں ایک ایسے زمانے میں ان سے ملنے گیا جب وہ اپنا نیا مکان بنوانے میں مصروف تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے پائجامہ پر ایک جگہ بہت سے لال لال دھبے پڑے ہوئے ہیں۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ انھوں نے دیکھ کر کہا، مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ اس کے بعد انھوں نے پائجامہ اٹھایا تو معلوم ہوا کہ کسی سخت چیز سے ٹکرانے کی وجہ سے ٹانگ میں ایک جگہ چوٹ لگ گئی ہے۔ چوٹ لگ کر خون بہا، کپڑے میں لگا، پھر خود بخود سوکھ کر بند ہو گیا۔ اور انھیں مطلق خبر نہیں ہوئی۔ جب آدمی کے سامنے کوئی مقصد ہو تو وہ اسی طرح اس میں منہمک ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ ایک اندر ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں دوسری چیزیں اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ جہاں دوسری چیزیں اسے محسوس نہیں ہوتیں، حتیٰ کہ خود اپنی ذات کے جسمانی تقاضے بھی بعض اوقات اسے یاد نہیں رہتے۔

یہی وہ بات ہے جس کو میں نے "انہماک" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ بامقصد آدمی وہی ہے جس کو اپنے مقصد میں اس درجہ شغف اور انہماک ہو جائے۔ اس کے بغیر اپنے آپ کو بامقصد لوگوں کی فہرست میں لکھنا، مقصد کے لفظ سے ایک طرح کا مذاق کرنا ہے۔

۲۔ بامقصد آدمی کی دوسری پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد کے مطابق زندگی گزارتا ہو۔ "مقصد کے مطابق" عمل سے میں ایک خاص چیز مراد لے رہا ہوں جس کو آپ ایک مثال سے سمجھ

سکتے ہیں۔ ایک حکیم صاحب ہیں جو ایک دیہات میں دوا علاج کا کام کرتے ہیں۔ وہ کوئی سند یافتہ طبیب نہیں ہیں نہ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ بس لوگوں کی صحبت اور تجربہ کی وجہ سے کچھ باتیں جان گئے ہیں اور اس کے مطابق کام کررہے ہیں۔ بلکہ اپنی محنت اور توجہ کی وجہ سے اپنے علاقہ میں اچھے خاصے متعارف بھی ہو گئے ہیں۔ ان کے گھر پر کچھ کھیتی باڑی کا کام بھی ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہا کہ میں کھیتی کے موٹے کام مثلاً کھودنا، ہل چلانا وغیرہ اپنے ہاتھ سے نہیں کرتا۔ آپ سمجھیں گے، وہ شاید کوئی شیروانی پوش آدمی ہوں گے اور اپنی شیروانی کی عزت رکھنے کے لیے ایسے کاموں سے بچتے ہوں گے۔ مگر ان کو "شیروانی" اور "پتلون" کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ بالکل سیدھے سادے دیہاتی حکیم ہیں۔ کھیتی کے سخت کاموں سے الگ رہنے کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ اگر میں اس طرح کے کام کروں تو میرا ہاتھ سخت ہو جائے گا، انگلیوں کی کھال موٹی ہو جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مریض کی نبض میں ٹھیک طرح سے دیکھ نہ سکوں گا۔ نبض کی ضربیں ہلکی ہوتی ہیں اور ان میں بہت نازک اور لطیف فرق ہوتے ہیں۔ ان کو محسوس کرنے کے لیے انگلیوں کا نرم ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر انگلیاں ہل اور کدال پکڑتے پکڑتے سخت ہو جائیں، جیسا کہ اس طرح کا کام کرنے والوں کی ہوتی ہیں، تو وہ نبض کی ضربیں محسوس کرنے کے قابل نہیں رہیں گی۔

ہر مقصد اپنے اختیار کرنے والے سے اسی کا تقاضا کرتا ہے۔ جو شخص بھی کسی مقصد کو اپنائے، ضروری ہے کہ وہ اپنی عملی زندگی کو اپنی روزانہ کی سرگرمیوں کو اپنے مقصد کے ساتھ ہم آہنگ رکھے۔ وہ دونوں میں کوئی تضاد پیدا ہونے نہ دے۔ بامقصد آدمی ایک باشعور آدمی ہوتا ہے۔ اگر اس کے اندر حقیقۃً ایک مقصد اترا ہوا ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ایسے عملی حالات اور ایسے مشاغل کی طرف نہ لے جائے جہاں وہ اور اس کا مقصد الگ الگ ہو جائیں۔ جب وہ ویسا بن کر نہ رہ سکے جیسا اپنے مقصد کے اعتبار سے اسے بن کر رہنا چاہیے۔

میں ایک ایسے مسلم خاندان کو جانتا ہوں جس کی آمدنی اتنی تھی کہ وہ معقول طریقہ سے ایک سادہ زندگی گزار رہا تھا اور اسی کے ساتھ دین کے تقاضے بھی پورے کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس کے یہاں ایک لڑکی اور ایک لڑکے کی شادی ہوئی۔ اس کے مقصد کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ شادی کو اس طرح کرے کہ اس کی وجہ سے اس کے گھر میں معمول کے مطابق جو زندگی چل رہی ہے، اس

میں کوئی خلل پیدا نہ ہو۔ مگر اس نے پہلی غلطی یہ کی کہ شادی کے لیے ایک ایسے خاندان کا انتخاب کیا جس کا معیارِ زندگی اس کے مقابلے میں بڑھا ہوا تھا۔ پھر شادی بھی اس طرح کی جیسے عام دنیا دار لوگ اپنی شادیاں کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف اس کے گھر کا سارا سرمایہ شادی میں لگ گیا۔ بلکہ وہ کافی مقروض بھی ہو گیا۔ اس کے پیچھے اس کا سارا کاروبار اجڑ گیا۔ اگر صرف اتنا ہی نقصان ہوا ہوتا جب بھی غنیمت تھا، کیوں کہ جس طرح مختلف قسم کے وقتی حادثے آدمی کے اوپر پڑتے ہیں اور پھر وہ سنبھل جاتا ہے، اسی طرح وہ دوبارہ سنبھل جاتا۔ مگر شادی نے اس کو ایک نئی مصیبت میں ڈال دیا۔ جس کا پہلے اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا اپنی لڑکی کو اس نے جو کپڑے اور سامان دیے اور سسرال سے اس کے لیے جو کپڑے وغیرہ آئے اس کی وجہ سے شادی شدہ لڑکی کی پوشش اور رہن سہن کا معیار یکایک بہت بڑھ گیا۔ اور جب گھر کی ایک لڑکی کا معیار بڑھا تو اسی کے ساتھ دوسروں کا لحاظ کرنا ضروری تھا۔ پھر اسی کے ساتھ نئے نئے فرنیچر سے لدی ہوئی پوری ایک گاڑی بھی اس کے گھر میں اتری۔ ان چیزوں کے نتیجہ میں اس کی گھریلو زندگی کا معیار بالکل مصنوعی طور پر یکایک بدل گیا۔ اب ہر چیز میں پہلے سے زیادہ خرچ ہونے لگا۔ اس طرح ایک طرف پچھلے قرضوں کی ادائگی اور دوسری طرف بڑھے ہوئے اخراجات کو پورا کرنا، ایسے دو پاٹ بن گئے جس کے نیچے اس کی زندگی پس کر رہ گئی اس کا گھر دیکھتے دیکھتے دین دار گھرانے سے ایک دنیا دار گھرانے میں تبدیل ہو گیا۔

یہ صرف ایک واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ میں نے کتنے لوگوں کو دیکھا ہے کہ اسی طرح وہ اپنے نیوی معاملات میں ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ بالآخر وہ انھیں گھسیٹ کر تباہی کے غار میں پہنچا دیتا ہے۔ جو شخص کسی مقصد کے لیے دنیا میں جینا چاہتا ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ باشعور زندگی گزارے۔ وہ اپنی سرگرمیوں پر نظر رکھے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو اس مادی دنیا میں ہر وقت اس کا امکان ہے کہ آدمی ایسے بندھنوں میں اپنے آپ کو پھنسا لے جس کے بعد وہ بظاہر زندہ نظر آتا ہو، مگر مقصد کے اعتبار سے اس نے خودکشی کر لی ہو۔ دنیا کی نمائشی چیزوں کا مادی ساز و سامان کی کثرت، سطحی مشاغل میں پڑنا، غیر ضروری عادتوں میں اپنے کو ڈالنا، پست لٹریچر کا مطالعہ —— یہ وہ چیزیں ہیں جو آدمی کو مقصد سے دور کر دیتی ہیں، اس

وقت کو غیر ضروری مشغولیتوں میں لگا دیتی ہیں، اس کے جذبات و احساسات کو مقصد کے بارے میں کمزور کر کے دوسری چیزوں کے بارے میں شدید کر دیتی ہیں، اس کو ایسے تعلقات اور ایسے تقاضوں میں الجھا دیتی ہیں کہ وہ نہ چاہنے کے باوجود دوسری طرف کھنچتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اپنے مقصد سے دور ہو جاتا ہے۔

اگر آپ کو اسلام عزیز ہے اور آپ اس کو اپنا مقصد بنا کر اسی کے لیے جینا اور اسی کے لیے مرنا چاہتے ہیں تو آپ کے لیے لازم ہے کہ اپنی عملی زندگی، اپنے تعلقات اور اپنی روزانہ کی مصروفیتوں کو اس سے ہم آہنگ رکھیں، آپ دونوں میں کوئی تضاد پیدا نہ ہونے دیں۔ اس معاملے میں آپ کو اس ہوشیار طبیب کی طرح بن جانا چاہیے جو اپنی انگلیوں تک کی اس حیثیت سے حفاظت کرتا ہے کہ وہ ایسے حالات سے دوچار نہ ہوں کہ وہ نبض دیکھنے کی صلاحیت کو کھو دیں پھر ایک مسلمان کا مقصد تو اس سے زیادہ نازک اور اس سے زیادہ مشکل ہے، اس لیے آپ کو اس سے زیادہ ہوشیاری کے ساتھ اپنی حرکات پر نظر رکھنی چاہیے۔

۳۔ تیسری چیز بامقصد آدمی کو پہچاننے کی یہ ہے کہ اس کے عمل میں مقصد کی روح موجود ہو۔ یہاں "عمل" سے میری مراد عام عمل نہیں ہے، بلکہ وہ عمل ہے جو مقصد کے تعلق سے ظاہر ہوتا ہے۔ آپ تعجب نہ کریں۔ مقصد سے متعلق عمل بھی کبھی بے مقصد ہوتا ہے۔ بظاہر آدمی مقصد کا سا عمل کر رہا ہوتا ہے، مگر حقیقتاً اس کے عمل کا مقصد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ایک مثال لیجیے۔ ہمارے یہاں جو مذہبی فرقے ہیں ان کی ابتدا بھی اصلاً ایک مقصدی گروہ کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ وہ ایک مخصوص مشن لے کر اٹھے تھے مگر ہر شخص جانتا ہے کہ آج وہ اپنی مقصدی حیثیت کو کھو چکے ہیں۔ وہ تحریک کے بجائے ایک جامد قسم کی روایتی انجمن بن کر رہ گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا مقصدی تصور ان کے ذہن سے نکل گیا، اور نہ ایسا ہے کہ مقصد کے لیے کام کرنا انھوں نے چھوڑ دیا ہے۔ یہ سب چیزیں آج بھی کسی نہ کسی شکل میں ان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ مگر ان میں اب وہ اسپرٹ باقی نہیں رہی جو ایک مشن کے علم بردار کے اندر ہوتی ہے۔ اب ان کا مقصد محض ایک بحث و گفتگو کا موضوع ہے جس پر وہ کبھی آپس میں اور کبھی دوسروں سے باتیں کر لیتے ہیں۔ ان کے رسالے اور اخبار نکلتے ہیں۔ مگر ان رسالوں اور اخباروں کی حیثیت مقصدی پرچوں سے

زیادہ کاروباری اداروں کی ہے۔ ان کے اجتماعات بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان اجتماعات کی حیثیت کسی مقصدی سرگرمی کی نہیں۔ بلکہ وہ ماضی کی پڑی ہوئی ایک لکیر ہے جس پر وہ رسمی طور پر چلے جا رہے ہیں۔ ان کے جماعتی فنڈ بھی ہیں جن میں وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ دیتے ہیں۔ مگر یہ دینا زیادہ تر جماعتی تقاضے کے تحت ہوتا ہے نہ کہ حقیقتاً انفاق فی سبیل اللہ کے جذبے کے تحت۔ وہ اپنے خیالات کو پھیلانے کے لیے دورے اور تقریریں کرتے ہیں۔ مگر یہ سب کسی مقصدی بے تابی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یا تو محض روایتی ذوق کا اظہار ہوتا ہے یا اسی قسم کے جذبے کے تحت ہوتا ہے جیسے کسی فرم کی پبلسٹی برانچ کا افسر اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لیے کیا کرتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص موضوعات پر کتابیں اور پمفلٹ چھاپتے ہیں۔ مگر اس کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی کہ ایک بنے ہوئے حلقہ کی مانگ پوری کر دی جائے۔

وہ عمل جو حقیقتاً داعیانہ جذبے کے تحت نکلتا ہے اور وہ عمل جو روایتی طور پر یا محض ڈیوٹی انجام دینے کے لیے کیا جاتا ہے، دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ایک حقیقت ہے اور دوسرا حقیقت کی نقل۔ ایک جگہ بات صرف حلق سے نکلتی ہے اور دوسری صورت میں آدمی جب بولتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے کلام میں اپنی پوری شخصیت کو انڈیل دیا ہے۔ ایک صورت میں آدمی کا عمل صرف ایک بنی بندھی کارروائی نظر آتا ہے، اور دوسری صورت میں اس کا عمل اس کے بیتاب جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک صورت میں آدمی کی تمام زندگی سراپا اس کے مقصد میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے اور دوسری صورت میں بعض مقصد نما اجزا اس کی غیر متعلق زندگی کے ساتھ اس طرح ادھر ادھر لگے ہوئے ہوتے ہیں جیسے کسی مینار میں آم کے چند پتے۔

یہ خطرہ ہر اس گروہ کو ہے جو ایک مقصد کو لے کر اٹھے اور اس پر اس کو پچیس پچاس سال گزر جائیں۔ لیکن یاد رکھیے کوئی گروہ اسی وقت تک مقصدی گروہ ہے جب تک حقیقتاً وہ مشنری اسپرٹ کے تحت کام کر رہا ہو۔ اس کے بعد جب اس کی گاڑی اس سے اتر کر روایتی ڈگر پر چل پڑے، جب اس کی سرگرمیاں بے تابانہ جذبات کے اظہار کے بجائے مقررہ کارروائی بن کر رہ جائیں، تو وہ تحریک کے بجائے رسم اور جماعت کے بجائے انجمن بن جاتی ہے۔ اس کے بعد بھی اگرچہ شکلاً وہ ایک با مقصد گروہ کی مانند نظر آتا ہے۔ مگر مقصدی حیثیت سے اب اس پر موت وارد ہو چکی ہوتی ہے۔

قصد انسان نہیں ہوتا۔ بلکہ سابقہ بامقصد انسان کی لاش ہوتی ہے جو دیکھنے میں سابقہ انسان
نظر آتی ہے۔ مگر حقیقۃً انسان نہیں ہوتی۔

اب میں ایک آخری بات کہہ کر اپنی گفتگو کو ختم کروں گا۔ اس طرح کی باتیں جب کہی جاتی ہیں
لوگ جواب دیتے ہیں ـــــ "آپ کی باتیں تو سب ٹھیک ہیں، ہم خود بھی اپنے اندر یہی چیز پیدا
اہتے ہیں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ چیز کیسے پیدا ہو" یہ بظاہر ایک سوال ہے مگر حقیقۃً اس کے
ے اپنے الزام کو اپنے سے ہٹا کر اسے خارج کے اوپر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر سوچیے کہ وہ
جس کے اوپر آپ اپنا الزام ڈالنا چاہتے ہیں، وہ کون ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس دنیا کا مالک
ہے۔ اسی نے ساری چیزوں کو بنایا ہے۔ اس لیے خارج کو الزام دینے کا مطلب یہ ہے کہ
یہ دنیا اس ڈھنگ سے بنائی ہے کہ ہم وہاں اپنے ایمانی تقاضوں کو حاصل کرنا چاہیں تو
ر کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بالکل غلط بات ہے۔ خدا اس سے پاک ہے کہ اس پر یا اس کی
پر اس قسم کا الزام عائد ہو سکے۔ اس لیے جب خارج پر الزام ڈالا نہیں جا سکتا تو لامحالہ
کی طرف لوٹے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اپنی ذات کے سوا اور کوئی نہیں ہے جو ہماری ترقی
ں رکاوٹ ڈالنے والا ہو۔ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ فطرت اور حقیقت میں تضاد نہیں ہو سکتا۔ اگر
ہے کہ ہم کو ایسا ہی بننا چاہیے تو لازماً ہماری فطرت اور کائنات کو ایسا ہونا چاہیے کہ ہم
ا سکیں۔

اس لیے ہر خرابی کا سبب اپنے اندر ڈھونڈیے۔ کیونکہ آپ کے باہر درحقیقت کوئی چیز ہی نہیں ہے
اسباب پائے جا رہے ہوں۔

ساعتے با اولیا

قاضی ابوبکر محمد بن عبدالباقی انصاری پانچویں صدی ہجری کے اولیاء امت میں سے ہیں انھوں نے اپنا یہ عجیب غریب واقعہ خود ہی بیان فرمایا ہے جس کو یوسف بن خلیل حافظ نے اپنے معجم میں سند کے ساتھ نقل کیا ہے اور انھیں کے حوالے سے ابن رجب نے طبقات حنابلہ میں بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ بیان فرماتے ہیں کہ میں ایک زمانے میں مکہ معظمہ میں مقیم تھا اور فقر و تہی دستی کی وجہ سے فاقوں پر فاقے آتے تھے، ایک دن جب میں بھوک سے بہت ہی بیتاب تھا اور بھوک کی تکلیف سے نجات حاصل کرنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں تھا مجھے ریشم کی ایک تھیلی پڑی ملی جو ریشمی دھاگے ہی سے بندھی ہوئی تھی، میں نے اس کو اٹھا لیا اور اپنے گھر لے آیا، کھول کے دیکھا تو اس میں ایسے نفیس اور بیش قیمت موتیوں کا ایک ہار تھا جو میری چشم تصور نے کبھی نہیں دیکھے تھے، میں اس کو گھر میں رکھ کے باہر نکلا تو دیکھا کہ ایک صاحب وجاہت بزرگ اپنے گم شدہ ہار کے بارے میں اعلان کر رہے ہیں، ان کے ہاتھ میں رومال میں بندھی پانچ سو اشرفیاں ہیں اور وہ پکار کے کہہ رہے ہیں، کہ یہ اشرفیاں میں اللہ کے اس بندہ کی خدمت میں پیش کروں گا جو میرا ہار کہیں سے پا کے مجھ تک پہنچا دے مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں نے سوچا کہ غالباً وہ ہار انھی بزرگ کا ہے، میں ان کو دے دوں اور چونکہ میں اس وقت بہت بھوکا اور سخت حاجت مند ہوں اس لیے یہ رقم ان سے لے لوں اور اپنی ضرورتیں اس سے پوری کروں، چناں چہ میں نے ان سے کہا آپ ذرا میرے ساتھ آئیے! وہ میرے ساتھ میرے گھر آئے، پھر میرے دریافت کرنے پر انھوں نے اپنی گم شدہ تھیلی اور اس کے تسمہ کی خاص علامات بتائیں اور بتلایا کہ ہار میں کتنے موتی ہیں اور

وتیوں میں کیا خاص نشانات ہیں اور دھاگہ کی کیا خاص پہچان ہے۔ انھوں نے جو کچھ یا اس سے مجھے یقین ہوگیا کہ وہ تھیلی انہی کی ہے تو میں نے نکال کے ان کی خدمت میں پیش کردی وں نے اپنے اعلان کے مطابق پانچ سو اشرفیاں مجھے دینی چاہیں لیکن اب میرے دل نے کہ ان کا لینا ٹھیک نہیں، چنانچہ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ کی چیز ادا اور آپ کی نت تھی میرا فرض تھا کہ میں آپ کو پہنچاؤں، اللہ تعالیٰ نے اس فرض کی ادائیگی میرے لیے سان فرمادی، میں اس کا کوئی معاوضہ اور بدلا نہیں لے سکتا، انھوں نے اصرار کیا اور سخت صرار کیا لیکن میرا ضمیر قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوا، اور اپنی سخت بھوک اور حاجت مندی ے باوجود میں نے اس کو قبول نہیں کیا ـــ آگے اللہ کی قدرت کا تماشا دیکھئے!

ایک مدت کے بعد میں مکہ معظمہ سے چلا اور ایک کشتی پر سوار ہوا جس پر اور بھی بہت سے مسافر تھے، اللہ کی شان کشتی بیچ سمندر میں ٹوٹ گئی اور اس کے سارے مسافر ایک ایک کرکے سمندر یں ڈوب کے ختم ہوگئے مجھے اللہ تعالیٰ نے بچالیا اور کشتی کے ایک ٹکڑے پر میں کسی طرح بیٹھا رہا، سمندر کی موجیں کشتی کے اس ٹکڑے یا تختے کو چلاتی اور بڑھاتی رہیں ایک مدت تک میں سمندر یں اس تختہ پر رہا اور مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ میں کہاں جارہا ہوں یہاں تک کہ کشتی کے اس تختہ نے مجھے ایک جزیرے میں پہنچادیا، اس جزیرے میں مسلمانوں کی آبادی تھی اور مسجدیں تھیں میں ایک مسجد میں جاکے بیٹھ گیا اور قرآن مجید کی تلاوت کرنے لگا، وہاں کے لوگوں نے جب مجھے قرآن مجید پڑھتے ہوئے سنا اور اس کا چرچا ہوا تو جزیرے کے باشندے ایک ایک کرکے میرے پاس آئے اور سب نے مجھ سے استدعا کی کہ ہم کو بھی قرآن سکھا دو، میں ان کو قرآن مجید پڑھانے اور سکھانے لگا، اہل جزیرہ نے میرا بڑا اکرام کیا اور طرح طرح کے ہدایا اور عطایا مجھے دیئے۔

ایک دن اسی مسجد میں مجھے نہایت خوشخط لکھے ہوئے قرآن مجید کے کچھ اوراق ملے، وہاں کے لوگوں نے میرے پاس جب وہ اوراق دیکھے تو انھوں نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ آپ لکھنا بھی بہت اچھا جانتے، میں نے کہا کہ ہاں اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ چیز بھی نصیب فرمائی ہے اور میں خطاط بھی ہوں، ان لوگوں نے کہا کہ آپ ہم کو لکھنا بھی سکھا دیجیے، چنانچہ سارے جوان اور نوعمر بچے خطاطی سیکھنے کے لیے میرے پاس آنے لگے اور میرا اور زیادہ اکرام ہونے لگا اور ہدایا

اور تحائف سے انھوں نے مجھے مالا مال کر دیا کچھ دنوں کے بعد وہاں کے لوگوں نے مجھ سے کہا کہ ہمارے ہاں ایک بڑے معزز اور باثروت گھرانے کی ایک یتیم لڑکی ہے ہم چاہتے ہیں کہ اس کا نکاح آپ سے ہو جائے میں نے ابتداءً عذر کیا لیکن انھوں نے ازراہ اکرام و محبت اصرار کیا یہاں تک کہ میں آمادہ ہو گیا اور بالآخر نکاح ہو گیا، جب نکاح کے بعد وہ لڑکی میرے پاس پہنچائی گئی تو میری نگاہ اس کے گلے کی طرف گئی، میں نے دیکھا کہ اس کے گلے میں نہایت بیش قیمت موتیوں کا گویا بعینہ وہی ہار ہے جو مکہ معظمہ میں مجھے پڑا ہوا ملا تھا اور میں نے وہ اس کے مالک کے حوالہ کر دیا تھا، میں حیرت اور تعجب اور غور کے ساتھ اس ہار کو دیکھنے لگا، میری یہ حرکت بڑی نامناسب سمجھی گئی کہ نئی بیوی کو دیکھنے اور اس کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے میں اس کے گلے میں پڑے ہوئے ہار کو دیکھ رہا ہوں۔ آخر میں نے بتایا کہ میں ہار کو اس لیے دیکھ رہا ہوں کہ بالکل ایسا ہی بلکہ گویا یہی ہار میں نے مکہ معظمہ میں پایا تھا اور پھر اس طرح اس کے مالک کو پہنچا دیا تھا پھر میں نے مکہ معظمہ کا وہ پورا قصہ بیان کیا۔ لوگوں نے جب وہ قصہ مجھ سے سنا تو سبحان اللہ اور لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر ان کی زبانوں پر جاری ہو گیا اور ایک شور مچ گیا اور پھر ان لوگوں نے بتایا کہ بیشک یہ وہی ہار ہے جو مکہ معظمہ میں گم ہو گیا تھا اور تم نے پایا تھا، اور وہ صاحب جاہ بزرگ جن کو تم نے وہ ہار واپس کیا تھا اس لڑکی کے والد تھے جو ہمارے جزیرے کے بڑے صالح بزرگ تھے ان کا ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے انتقال ہوا ہے وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے دنیا میں بس ایک ہی سچا مسلمان مرد دیکھا ہے جس نے مکہ معظمہ میں میرا ہار پا کر مجھے واپس کیا تھا اور میں اصرار سے اس کو پانچ سو اشرفیاں دینا چاہتا تھا مگر وہ قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ بزرگ برابر یہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ کسی طرح اپنے اس بندے کو میرے پاس پہنچا دے اور ایسی صورت پیدا فرما دے کہ میں اپنی بیٹی کی اس سے شادی کر دوں ۔ اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس صالح بندے کی دعا کس طرح قبول فرمائی۔

تذکرہ مجدد الف ثانی
مجدد الف ثانی نمبر الفرقان کا تازہ کتابی ایڈیشن
الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر میں پہلی بار یہ حقیقت سامنے آئی تھی کہ امام ربانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کا وہ کون سا امتیازی کارنامہ ہے جس کی وجہ سے آپ کو کسی ایک صدی کا نہیں بلکہ الف ثانی یعنی پورے دوسرے ہزار سالہ کا مجدد مان لیا ہے۔ الفرقان کے اس نمبر کی اشاعت پر اکیس برس گزر چکے ہیں۔ اس عرصہ میں عالم اسلامی دنیا کے حالات میں بہت کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں ان تبدیلیوں کو اور انکے دینی تقاضوں کو دیکھ کر یقین بڑھ جاتا ہے کہ واقعۃً حضرت موصوف پورے الف ثانی کے مجدد ہیں اور ہمارے اس دور کیلئے بھی انکے تجدیدی کام میں پوری رہنمائی موجود ہے۔
یہ حقیقت آپ پر اس کتاب کے مطالعہ سے کھلے گی جس میں
مجدد الف ثانی کے ذاتی حالات بھی ہیں اور انکے تجدیدی
کام کی تفصیلات بھی، نیز آپ کے تمام مشہور خلفاء کا تذکرہ بھی۔
سائز متوسط • قیمت
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

ترتیب

عتیق الرحمن سنبھلی

ور نعمانی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

سالانہ چندہ

ہندوستان سے ۶/-

پاکستان سے ۷/-

ششماہی

ہندستان سے ۳/۵۰

پاکستان سے ۴/-

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

جلد (۳۲) بابتہ ماہ صفر المظفر ۱۳۸۴ھ مطابق جولائی سنہ ۱۹۶۴ء شمارہ (۲)

اگر اس دائرے میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہو۔ براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں' یا خریداری کا ارادہ نہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۰ جولائی تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی' پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری اصلاح و تبلیغ اسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں' اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیدیں۔ ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کردیا جاتا ہو۔ اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں اس کی اطلاع ۲۸ تاریخ کے اندر آجانی چاہیئے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان ، کچہری روڈ ، لکھنؤ

(مولانا) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر اڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہ اوّلیں

از عتیق الرحمٰن سنبھلی

آج پورے پانچ ماہ کے بعد قلم ہاتھ میں لینے کی نوبت آ رہی ہے۔ محض خدا کا کرم ہے کہ کھوئی ہوئی قوتیں جسم میں واپس آ گئیں۔ اور اُن کی واپسی و بحالی کے لیے جس قدر عرصہ بھی آرام اور کام سے اجتناب کی ضرورت محسوس ہوئی اس کا بھی موقع خدا کے کرم سے بلا کسی پریشانی کے نصیب ہوا، ورنہ کتنے انسان ہیں جو صحت کی ایسی افتادوں میں بھی آرام کی سانس نہیں لے پاتے اور یا طرح طرح کی پریشانیاں اُن کے آرام کو بھی بے آرامی کی ایک دوسری شکل بنا ڈالتی ہیں خدا کا شکر ہے کہ اس پانچ ماہ کے اچھے خاصے طویل عرصہ میں کوئی ایک وقت بھی ایسا گزرنا یاد نہیں آتا۔

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاہُ۔

اس پانچ ماہ کے عرصۂ علالت و تعطل کا یہ وہ رُخ ہے جس پر جتنا بھی جذبۂ شکر دل میں ابھرے کم ہو۔ لیکن انہی پانچ مہینوں کے درمیان میں بیک وقت ہندوستان کے دو تین صوبوں کے مسلمانوں پر آگ اور خون اور ہلاکت و بربادی کی وہ قیامتیں ٹوٹ گئیں جن کی کوئی نظیر ۴۷ء سے اِدھر نہیں ملتی۔ یہ اندوہناک واقعات جب غیروں کے دلوں کو تڑپائے بغیر نہ رہ سکے تو ملت کا کوئی بڑا ہی محروم الاحساس فرد ایسا ہو سکتا تھا جس کے دل و جگر میں ان نئی جراحتوں کی کوئی سوزش اور اُن پر پیچ و تاب کا کوئی طوفان نہ برپا رہا ہو۔ مگر اپنا منفرد غم اسی کے ساتھ یہ بھی رہا کہ ایسے مواقع پر اور کچھ نہیں تو قلم ہی سے اپنا حصہ ادا کرنے کے جو وسائل میسر ہیں اُن کے بھی استعمال میں ایک مجبوری اور بے بسی حائل، اور دل و دماغ میں اس قومی المیہ کی تفصیلات سن سن کر اور پڑھ پڑھ کر جو کچھ آتا وہ اس مجبوری کے ہاتھوں وہیں کا وہیں دفن ہوتا چلا جاتا ــــ مگر اللہ کی مصلحتوں کو کون جانتا ہے، شاید اس میں بھی کوئی خیر رہا ہو!

مسلمانوں کی موت وحیات کے اس مسئلہ پر کس نظر سے غور کرنا چاہیے؟ اس کے لیے بہت ہی بروقت روشنی ہمیں اپنے محترم ومحبوب بزرگ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے اس خطبہ سے ملتی ہے جو آپ نے گزشتہ دنوں میں آپ نے دینی تعلیمی کونسل کی ریاستی کانفرنس (الٰہ آباد) کی صدارت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ اس میں آپ نے انسان کے عام تعلیمی مسئلے سے بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ

"تعلیم کا نشیمن جس شاخ پر قائم ہوا اور ہمیشہ جس شاخ پر قائم رہے گا وہ انسانی زندگی کا تحفظ اور امن وامان کی فضا ہو اس لیے نشیمن کی تعمیر و تزئین کے منصوبوں اور اسکی ترتیب وتنظیم کی تجویزوں سے پہلے اس شاخ کی حفاظت ضروری ہے"۔

اور پھر خاص مسلمانوں کی تعلیم کی طرف رخ موڑتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ

"کلکتہ، جمشید پور اور راوڑکیلا کے واقعات نے اس شاخ ہی کو خطرہ میں ڈال دیا ہو جس پر یہ نشیمن تعمیر ہوگا اور ہمارے پورے تعلیمی فکر وفلسفہ کو متزلزل کر دیا ہے"۔

اس خطبہ کا تعلق صرف تعلیم (دینی تعلیم) کے موضوع سے تھا، ورنہ ایک تعلیم ہی کیا، تہذیب ہو یا تمدن، مذہب ہو یا عقیدہ، معاش ہو یا روزگار، امارت و ثروت ہو یا سیاست واقتدار کا حصہ سب کے بارے میں یہی بات حق ہو کہ ان کے وجود اور بقاء و ترقی کا انحصار انسان کی زندگی پر ہو۔ آج اگر مسلمان کی زندگی کا بھروسہ اس کے اس ملک میں نہیں اور اس کی منظم نسل کشی کے سیلاب اسی رفتار سے اسے موت کے گھاٹ اتارتے رہے تو مسلمانوں کی دینی و مذہبی اصلاح کی جد وجہد کے پھول کس شاخ پر کل کو کھلیں گے؟ اسلامی تہذیب و تمدن کے گیسوؤں کی آرائش کے لیے رُخ وشانہ کی جستجو کہاں کی جائے گی؟ معاشی بحالی و خوشحالی کی تدبیروں سے فائدہ کون اٹھائے گا؟ کون رہ جائے گا جسے دولت وثروت کے ذخیرے کام دیں گے؟ اور کون ہوگا جس کے نام سے لوگ سیاسی عہدوں میں حصہ پائیں گے؟ اسلئے بات دو اور دو چار کی طرح سیدھی اور صاف ہو کہ آج ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے مقدم مسئلہ اُن کی نسل کشی اور تباہی کی ان لہروں کا انسداد اور ان کی زندگی کے لیے حفاظت اور امن وامان کا اطمینان ہے۔ اور سارے مسائل کی فکر بھی ضروری ہے اور جاری رہنی چاہیے۔ مگر موت وحیات کے اس مسئلہ کو سب سے آگے رکھ کر اور اس کے تقاضوں کی ادائیگی کو ان سارے ہی کاموں کا تقاضہ سمجھ کر!

اس مسئلے سے نپٹنے کی ذمہ داری یوں تو ملت کے ہر فرد پر اپنی حیثیت اور استطاعت کے بقدر عائد ہوتی ہے مگر پیشقدمی اور آگے چلنے کی ذمہ داری ان منظم جماعتوں کی ہے جنہوں نے اپنے دائرۂ کار میں اس مسئلہ کو بھی رکھا ہے اور اس کی پکار پر وہ میدان عمل میں آتی ہیں، یہ جماعتیں جس حد تک میدان عمل میں آتی ہیں اس کی ضرورت اور قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس کا تعلق مسئلہ کے حل سے ہے ہی نہیں، اس مسئلہ کے حل کا تو دنیا بھر میں ایک ہی طریقہ ہے جس کے تجربہ کی جرأت کچھ خاص اندیشوں کی بنا پر نہیں کی جاتی۔ بیشک ان جماعتوں میں سے بعض کے ہاتھوں اس طریقہ کا تجربہ بہت خطرناک بن سکتا ہے اس لیے کہ وہ موجودہ ہندوستان میں اس کے لیے بالکل موزوں نہیں ہیں لیکن جن جماعتوں کی پوزیشن ایسی نہیں ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کب تک ان اندیشوں کو انگیز کرنے کی جرأت نہیں کریں گی۔ ان کی بے ضرر پالیسی کے باوجود جب قوم خود ان کے احساس کے مطابق بھی روز بروز موت کی گرفت میں آتی جا رہی ہے تو پھر اس کے سوا چارۂ کار کیا ہے کہ کچھ پرخطر راستوں پر ہی قسمت آزمائی کی جائے؟ ان راستوں پر اگر ہلاکت کے سوا کوئی دوسرا امکان ان جماعتوں کی نظر میں نہیں تو ٹھیک ہے کہ قوم کو کھلے میدان کی بارش سے ہٹا کر پرنالے کے نیچے کیوں کھڑا کیا جائے۔ لیکن اگر نجات کا کوئی بھی امکان ان راہوں پر انہیں تسلیم ہے تو پھر یہ قیادت کا کوئی اچھا نمونہ نہیں کہ اس امکان پر قسمت آزمائی کے لیے وہ کسی بھی درجہ کی قابل عمل راہ نہ پیدا کر سکیں! ذہن صاف ہو تو ہلکے ہلکے تجربات سے راہ دریافت کی جا سکتی ہے اور اسی کا نام قیادت کی اہلیت ہے۔

دو حرف خریداران الفرقان سے

الفرقان کی پابندیٔ وقت کے ساتھ اشاعت کے نظام میں تھوڑا بہت خلل تو راقم الحروف کی ان ذمہ داریوں کے باعث کافی دن سے چل رہا تھا جو ہفت روزہ ندائے ملت کی ادارت کیلئے کوئی دوسرا انتظام نہ ہو سکنے کے سبب اپنے سر لی گئی تھیں مگر ادھر پانچ مہینے کے عرصہ میں قدرتی طور سے اس صورت حال میں مزید اضافہ ہوا۔ اس سے خریداروں کو جو ذہنی کوفت ہوتی رہی ہوگی اسکے باوجود امید ہے کہ وہ ایک معقول عذر کی بناء پر اسکے باب میں کوئی شکایت نہ رکھتے ہوں گے۔

آئندہ کے بارے میں یوں تو خدا بہتر جانتا ہے مگر بظاہر ایسی کوئی وجہ نہیں کہ اشاعت کی بے نظمی برقرار رہے۔ حالات کی مجبوری بھی خدا کے فضل سے نہیں رہی ہے۔ اور ادھر ندائے ملت کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی کا بھی فیصلہ کر لیا ہے۔ اس لیے پوری امید ہے کہ اب الفرقان پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہوتا رہے گا۔

معارف الحدیث

مُسلسل

حجۃ الوداع یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رخصتی حج :-

اس بارہ میں علماء کے اختلاف رائے کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ حج کی فرضیت کا حکم کس سنہ میں آیا، اور یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ راجح قول یہ ہے کہ ۸ھ میں مکہ معظمہ پر اسلامی اقتدار قائم ہو جانے کے بعد ۹ھ میں حج کی فرضیت کا حکم آیا، اُس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تو حج نہیں فرمایا لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا اور ان کی امارت میں اس سال حج ادا ہوا اور آئندہ کے لیے چند اہم اعلانات کیے گئے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ آئندہ کوئی مشرک اور کافر حج میں شرکت نہیں کر سکے گا اور جاہلیت کے گندے اور مشرکانہ طور طریقوں کی کسی کو اجازت نہیں ہوگی ــــــ غالباً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سال خود حج نہ کرنے کی خاص حکمت یہ بھی تھی کہ آپ چاہتے تھے کہ آپ کا حج ایسا مثالی حج ہو جس میں کوئی ایک آدمی بھی کفر و شرک اور جاہلیت کے طور طریقوں سے حج کو مکدّر کرنے والا نہ ہو، بلکہ از اول تا آخر بس نور ہی نور اور خیر ہی خیر ہو اور آپ کی دعوت و ہدایت اور تعلیم و تربیت کے نتائج کا صحیح آئینہ ہو ــــــ اس طرح گویا ۹ھ کا یہ حج جو صدیق اکبر کی امارت میں ادا ہوا اگلے سال ہونے والے آپ کے حج کا پیش خیمہ اور اس کی تیاری کے سلسلے ہی کا ایک قدم تھا۔

پھر اگلے سال ۱۰ھ میں جو آپ کی حیاتِ مبارکہ کا آخری سال ہے آپ نے حج کا

ارادہ فرمایا، اور چونکہ آپ کو یہ اشارہ مل چکا تھا کہ اب دُنیا میں آپ کے قیام اور کام کا وقت تھوڑا ہی باقی رہ گیا ہے اس لیے آپ نے اپنے اس ارادۂ حج کی خاص اہتمام سے اطلاع تشہیر کرائی تاکہ زیادہ سے زیادہ مسلمان اس مبارک سفر میں آپ کے ساتھ رہ کر مناسک حج اور دین کے دوسرے مسائل و احکام سیکھ سکیں اور سفر حج کی صحبت و رفاقت کی خاص برکات حاصل کر سکیں۔ چنانچہ دور و قریب کے ہزارہا ہزار مسلمان جن کو اس کی اطلاع ہوئی اور ان کو کوئی خاص مجبوری نہیں تھی مدینۂ طیبہ آ گئے، ۲۴ ذی قعدہ کو جمعہ تھا اُس دن آپ نے خطبہ میں حج اور سفر حج کے متعلق خصوصیت سے ہدایتیں دیں اور اگلے دن ۲۵ ذیقعدہ سنہ بروز شنبہ بعد نماز ظہر مدینۂ طیبہ سے یہ عظیم الشان قافلہ روانہ ہوا اور عصر کی نماز ذوالحلیفہ جا کر پڑھی جہاں آپ کو پہلی منزل کرنی تھی، اور یہیں سے احرام باندھنا تھا، رات بھی وہیں گزاری اور اگلے دن یکشنبہ کو ظہر کی نماز کے بعد آپ نے اور آپ کے صحابۂ کرام نے احرام باندھا اور مکۂ معظمہ کی طرف روانہ ہو گئے اور نویں دن ۴ ذی الحجہ کو مکۂ معظمہ میں داخل ہوئے ــــ رفقاء سفر کی تعداد میں راستہ میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔

اس سفر میں آپ کے ساتھ حج کرنے والوں کی تعداد کے بارے میں روایات میں بہت اختلاف ہے۔ چالیس ہزار سے لے کر ایک لاکھ بیس ہزار اور ایک لاکھ تیس ہزار تک کے بیانات روایتوں میں موجود ہیں۔ اس عاجز کے نزدیک یہ اختلاف ایسا ہی ہے جیسا کہ بڑے مجمعوں اور میلوں میں شرکت کرنے والوں کی تعداد کے بارہ میں لوگوں کے اندازے آج کل مختلف ہوتے ہیں جس نے جو عدد بتایا ہے اپنے اندازے کے مطابق بتایا ہے، باقاعدہ حساب لگا کے اور شمار کر کے کسی نے بھی نہیں بتایا ہے۔ تاہم اتنی بات بطور قدر مشترک کے تمام ہی روایات میں ہے کہ مجمع بے حد و حساب تھا۔ حد نظر جاتی تھی آدمی ہی آدمی نظر پڑتے تھے۔

اس حج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر خطبے دیئے اور بالکل اس انداز سے بلکہ صاف صاف یہ آگاہی دے کے یہ خطبے دیئے کہ اب میرا وقت موعود قریب ہے اور تمھیں دین کی تعلیم و تربیت مجھ سے حاصل کرنے کا موقع اس کے بعد نہیں مل سکے گا

جہاں اس پورے سفر میں آپ نے تعلیم وتلقین اور ہدایت وارشاد کا خاص اہتمام فرمایا۔
ــــــــ حجۃ الوداع کے سلسلے میں جو روایات کتب حدیث میں ہیں (جن میں سے چند
اں بھی درج کی جا رہی ہیں) ان سے حج کے مناسک واحکام اور اس کا تفصیلی طریقہ
دم ہونے کے علاوہ دین اور شریعت کے دوسرے بہت سے ابواب اور شعبوں کے بارہ میں نہایت
م تعلیمات اور ہدایات بھی امت کو مل جاتی ہیں ــــــــ حقیقت یہ ہے کہ قریباً ایک مہینے
ے اس سفر میں دین کی تعلیم وتبلیغ اور ہدایت وارشاد کا اتنا کام ہوا اور اتنے وسیع پیمانے پر
ا کر اس کے بغیر برسوں میں بھی انجام نہ پا سکتا ــــــــ اسی سے بعض باتوفیق اکابر امت نے
مجھا ہے کہ دین اور برکات دین حاصل کرنے کا مؤثر ترین ذریعہ دینی سفروں کی رفاقت
ر صحبت ہے۔

اس تمہید کے بعد حجۃ الوداع کے سلسلہ میں سب سے پہلے حضرت جابر بن عبداللہ کی حدیث
صحیح مسلم سے نقل کی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ حدیث بہت طویل ہے اس لیے ناظرین کی سہولت
م کے لئے اس کے ایک ایک حصہ کا ترجمہ کر کے تشریح کی جائے گی اور ہر حصے کے متن کا
وت ابتدائی اور آخری فقرہ نقل کیا جائے گا۔ پورا متن صحیح مسلم یا مشکوٰۃ المصابیح وغیرہ
یں دیکھا جا سکتا ہے۔

عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ دَخَلْنَا عَلٰى جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ
فَسَأَلَ عَنِ الْقَوْمِ حَتّٰى انْتَهٰى اِلَيَّ فَقُلْتُ اَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيِّ بْنِ
حُسَيْنٍ فَاَهْوٰى بِيَدِهٖ اِلٰى رَاْسِيْ فَنَزَعَ زِرِّيَ الْاَعْلٰى ثُمَّ نَزَعَ
زِرِّيَ الْاَسْفَلَ ثُمَّ وَضَعَ كَفَّهٗ بَيْنَ ثَدْيَيَّ وَاَنَا يَوْمَئِذٍ غُلَامٌ
شَابٌّ فَقَالَ مَرْحَبًا بِكَ يَا ابْنَ اَخِيْ سَلْ عَمَّا شِئْتَ فَسَاَلْتُهٗ وَ
هُوَ اَعْمٰى وَحَضَرَ وَقْتُ الصَّلٰوةِ فَقَامَ فِيْ نِسَاجَةٍ مُلْتَحِفًا بِهَا
كُلَّمَا وَضَعَهَا عَلٰى مَنْكِبِهٖ رَجَعَ طَرَفَاهَا اِلَيْهِ مِنْ صِغَرِهَا وَرِدَائُهٗ
اِلٰى جَنْبِهٖ عَلَى الْمِشْجَبِ فَصَلّٰى بِنَا فَقُلْتُ اَخْبِرْنِيْ عَنْ حَجَّةِ رَسُوْلِ
اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ...... اِلٰى قَوْلِهٖ وَلَزِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمْ نَلْبِيَتَهُ "

جعفر بن محمد (جو سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے پرپوتے ہیں اور امام جعفر صادق کے لقب سے معروف ہیں۔) اپنے والد ماجد محمد بن علی (معروف بہ امام باقر) سے روایت کرتے ہیں کہ ہم چند ساتھی جابر بن عبداللہ کی خدمت میں پہونچے، انھوں نے ہم سے دریافت کیا کہ ہم کون کون ہیں (ہم میں سے ہر ایک نے اپنے متعلق بتلایا) یہاں تک کہ جب میری باری آئی تو میں نے کہا کہ میں محمد بن علی بن حسین ہوں (وہ اس وقت بہت بوڑھے تھے اور نابینا ہو چکے تھے انھوں نے شفقت اور محبت سے) اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھا پھر میرے کرتے کی اوپر والی گھنڈی کھولی اس کے بعد نیچے والی گھنڈی کھولی، پھر اپنا ہاتھ (کرتے کے اندر لے جاکر) میرے بیچ سینے پر رکھا اور میں ان دنوں بالکل نوجوان تھا[لہ] اور (میرے آنے پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے) مجھ سے فرمایا۔ "مَرْحَبًا بِكَ يَا ابْنَ أَخِي" (مرحبا اے میرے بھتیجے میرے بھائی حسین کی یادگار!!) جو کچھ تمھیں مجھ سے پوچھنا ہو بے تکلف پوچھو! (امام باقر کہتے ہیں) کہ اس اثنا میں نماز کا وقت آگیا، حضرت جابر ایک چھوٹی سی چادر لپیٹے ہوئے تھے وہ اسی میں لپیٹے ہوئے نماز کے لیے کھڑے ہو گئے اور اس کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے حالت یہ تھی کہ جب وہ اس کو اپنے مونڈھوں پر رکھتے تو اس کے کنارے اٹھ کے اُن کی طرف آجاتے۔ حالانکہ ان کی رداء (یعنی بڑی چادر) ان کے قریب ہی کھٹن پر رکھی ہوئی تھی (مگر انھوں نے اس کو اوڑھ کے نماز پڑھنا ضروری نہیں سمجھا بلکہ وہی چھوٹی سی چادر لپیٹ کر

لہ محمد بن علی امام باقر ۵۶ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اگر حضرت جابر سے یہ ملاقات انھوں نے ۱۴-۱۵ سال کی عمر میں بھی کی ہو تو اس وقت حضرت جابر کی عمر قریباً نوّے سال کی ہو گی۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی وفات ۹۴ سال کی عمر میں ۷۴ھ میں مدینہ طیبہ میں ہوئی اور مشہور قول کے مطابق اہل مدینہ میں وہ آخری صحابی تھے جن کے انتقال کے بعد مدینہ طیبہ صحابی کے وجود سے خالی ہو گیا۔

ہیں نماز پڑھائی، نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج (حجۃ الوداع) کی تفصیلات بتائیے ـــــ انھوں نے ہاتھ کی انگلیوں سے ۹ کی گنتی کا اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ آکر ۹ سال تک کوئی حج نہیں کیا پھر ۱۰ھ میں آپ نے اعلان کرایا کہ اس سال آپ کا ارادہ حج کرنے کا ہے۔ یہ اطلاع پاکر لوگ بہت بڑی تعداد میں مدینہ آگئے۔ ہر ایک کی خواہش اور آرزو یہ تھی کہ اس مبارک سفر میں آپ کے ساتھ رہ کر آپ کی پوری پوری پیروی کرے اور آپ کے نقش قدم پر چلے ـــــ (حضرت جابر کہتے ہیں کہ پھر جب روانگی کا دن آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں یہ پورا قافلہ مدینہ سے روانہ ہو کر ذوالحلیفہ آیا، اور اس دن یہیں قیام کیا۔ یہاں پہونچ کر ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ اسماء بنت عمیس (جو ابوبکر صدیق کی بیوی تھیں اور وہ بھی اس قافلہ میں تھیں) ان کے یہاں بچہ پیدا ہوا یعنی محمد بن ابی بکر، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرایا کہ ایسی حالت میں میں کیا کروں؟ آپ نے فرمایا کہ اسی حالت میں احرام کے لیے غسل کرلیں اور اور جس طرح عورتیں ایسی حالت میں کپڑے کا لنگوٹ استعمال کرتی ہیں اسی طرح استعمال کریں اور احرام باندھ لیں۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالحلیفہ کی مسجد میں آخری نماز (ظہر کی) پڑھی، پھر آپ اپنی ناقہ قصواء پر سوار ہوئے یہاں تک کہ جب ناقہ (مسجد ذوالحلیفہ سے کچھ آگے بڑھ کر) بیداء پر پہونچی (جو ذوالحلیفہ کے قریب ہی ذرا بلند اور ہموار میدان سا تھا) تو میں نے اس بلندی سے ہر طرف نگاہ دوڑائی تو آگے پیچھے داہنے بائیں حد نظر تک سوار اور پیادے آدمی ہی آدمی نظر آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان میں تھے اور آپ پر قرآن نازل ہوتا تھا اور آپ اس کی حقیقت اور اس کا صحیح مطلب و مدعا جانتے تھے (اس لیے آپ جو کچھ بھی کرتے تھے اللہ کے حکم اور اس کی وحی کے مطابق کرتے تھے) اور ہمارا رویہ یہ تھا کہ جو کچھ

آپ کو کرتے دیکھتے تھے وہی ہم بھی کرتے تھے (تو جب آپ کی ناقہ بیدا، پہونچی)، اس وقت آپ نے بلند آواز سے توحید کا یہ تلبیہ کہا۔

"لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ"

اور آپ کے رفقاء صحابہ جو تلبیہ پڑھتے تھے جس میں بعض الفاظ کا اضافہ بھی ہوتا تھا انھوں نے اپنا وہی تلبیہ بلند آواز سے کہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے تلبیہ کی کوئی تردید اور تغلیط نہیں کی اور خود اپنا ہی تلبیہ پڑھتے رہے۔ (مطلب یہ ہے کہ آپ کے بعض صحابہ تلبیہ میں بعض تعظیمی اور تعبدی کلمات کا اضافہ کرکے پکارتے تھے، اور چونکہ اس کی اجازت اور گنجائش ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے منع نہیں فرمایا، لیکن آپ نے اپنے تلبیہ میں کوئی کمی زیادتی نہیں فرمائی)

قَالَ جَابِرٌ لَسْنَا نَنْوِىْ اِلَّا الْحَجَّ لَسْنَا نَعْرِفُ الْعُمْرَةَ ...... اِلٰى قَوْلِهٖ فَشَبَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَصَابِعَهٗ وَاحِدَةً فِى الْاُخْرٰى وَقَالَ دَخَلَتِ الْعُمْرَةُ فِى الْحَجِّ لِاَبَدٍ لِاَبَدٍ اَبَدٍ۔

حضرت جابر نے (حجۃ الوداع کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے) بتلایا کہ اس سفر میں ہماری نیت (اصلاً) صرف حج کی تھی (مقصد سفر کی حیثیت سے) عمرہ ہمارے ذہن میں نہیں تھا۔ یہاں تک کہ جب ہم سفر پورا کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیت اللہ پر پہونچ گئے تو آپ نے سب سے پہلے حجر اسود کا استلام کیا (یعنی قاعدہ کے مطابق اس پر ہاتھ رکھ کے اس کو چوما، پھر آپ نے طواف شروع کیا، جس میں تین چکروں میں آپ نے رمل کیا (یعنی وہ خاص چال چلے جس میں قوت اور شجاعت کا اظہار ہوتا ہے) اور باقی چار چکروں میں اپنی عادت کے مطابق چلے، پھر (طواف کے سات چکر پورے کرکے) آپ مقام

ابراہیم کی طرف بڑھے اور یہ آیت تلاوت فرمائی "وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى" (اور مقام ابراہیم کے پاس نماز ادا کرو) پھر اس طرح کھڑے ہوکر کہ مقام ابراہیم آپ کے اور بیت اللہ کے درمیان تھا آپ نے نماز پڑھی (یعنی دوگانہ طواف ادا کیا) حدیث کے راوی امام جعفر صادق بیان کرتے ہیں کہ میرے والد ذکر کرتے تھے کہ ان دو رکعتوں میں آپ نے "قُلْ يَا أَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ" اور "قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ" کی قرأت کی ____ اس کے بعد آپ پھر حجر اسود کی طرف واپس آئے اور پھر اس کا استلام کیا[1]، پھر ایک دروازہ سے (سعی کے لیے) صفا پہاڑی کی طرف چلے گئے اور اس کے بالکل قریب پہونچ کر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی "إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ" (بلاشبہ صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں جن کے درمیان سعی کا حکم ہے) ____ اس کے بعد آپ نے فرمایا ____ "میں اسی صفا سے سعی شروع کرتا ہوں جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں پہلے کیا ہے" چنانچہ آپ پہلے صفا پر آئے اور اس حد تک اس کی بلندی پر چڑھے کہ بیت اللہ آپ کی نظر کے سامنے آگیا اس وقت آپ قبلہ کی طرف رخ کرکے کھڑے ہو گئے اور اللہ کی توحید اور تکبیر و تحمید میں مصروف ہو گئے، آپ نے کہا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ أَنْجَزَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهٗ۔

(اللہ کے سوا کوئی عبادت اور پرستش کے لائق نہیں، وہی تنہا معبود و مالک ہے۔ کوئی اس کا شریک ساجھی نہیں، ساری کائنات پر اسی کی فرمانروائی ہے۔ اور حمد و ستائش اسی کا حق ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی تنہا مالک و معبود ہے۔ اس نے (مکہ پر اور سارے عرب پر اقتدار بخشنے اور اپنے دین کو سربلند کرنے کا)

---

[1] یہ استلام سعی کے لیے تھا، جس طرح بیت اللہ کا طواف حجر اسود کے استلام سے شروع کیا جاتا ہے اسی طرح سعی سے پہلے بھی استلام مسنون ہے ۱۲

اپنا وعدہ پورا فرما دیا، اپنے بندے کی اس نے بھرپور مدد فرمائی اور کفر و شرک کے لشکروں کو اُس نے تنہا اُسی نے شکست دی)

آپ نے تین دفعہ یہ کلمات فرمائے اور ان کے درمیان میں دعا مانگی۔ اس کے بعد آپ اُتر کے مروہ کی طرف چلے یہانتک کہ جب آپ کے قدم وادی کے نشیب میں پہونچے تو آپ کچھ دوڑ کے چلے پھر جب آپ نشیب سے اوپر آگئے تو پھر اپنی عام رفتار کے مطابق چلے یہانتک کہ مروہ پہاڑی پر آگئے اور یہاں آپ نے بالکل وہی کیا جو صفا پر کیا تھا، یہاں تک کہ جب آپ آخری پھیرا پورا کر کے مروہ پر پہونچے آپ نے اپنے رفقا صحابۂ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا ــــــ اگر پہلے سے میرے خیال میں وہ بات آجاتی جو بعد میں آئی تو میں قربانی کے جانور مدینہ سے ساتھ نہ لاتا اور اس طواف وسعی کو جو میں نے کیا ہے عمرہ بنا دیتا ــــــ تو اب میں تم لوگوں سے کہتا ہوں کہ تم میں سے جن کے ساتھ قربانی کے جانور نہیں آئے ہیں وہ اپنا احرام ختم کر دیں اور اب تک جو طواف وسعی انھوں نے کی اس کو عمرہ بنا دیں ــــــ آپ کا یہ ارشاد سُن کر سراقہ بن مالک نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا یہ حکم (کہ اشہر حج (حج کے مہینوں) میں عمرہ کیا جائے) خاص اسی سال کے لیے ہے یا ہمیشہ کے لیے یہی حکم ہے ــــــ آپ نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر فرمایا کہ "دَخَلَتِ الْعُمْرَةُ فِی الْحَجِّ" "لا بل لابد ابد" (عمرہ حج میں داخل ہو گیا، خاص اسی سال کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے)

(تشریح) آپ نے مروہ پر سعی کے خاتمہ پر یہ جو بات فرمائی کہ "جو لوگ قربانی کے جانور ساتھ نہیں لائے ہیں وہ اپنے طواف وسعی کو عمرہ قرار دے دیں اور میں بھی اگر قربانی کے جانور ساتھ نہ لایا ہوتا تو ایسا ہی کرتا" ــــــ اس کا مطلب اور اس کی حقیقت سمجھنے کے لیے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ زمانۂ جاہلیت میں حج اور عمرہ کے سلسلے میں جو اعتقادی اور عملی غلطیاں رواج پا کر دلوں میں راسخ ہو چکی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ شوال، ذی قعدہ

ذی الحجہ جو (اشہر حج یعنی حج کے مہینے کہلاتے ہیں (کیونکہ حج کا سفر انہی مہینوں میں ہوتا ہے) ان مہینوں میں عمرہ کرنا سخت گناہ سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط اور من گڑھت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع سفر ہی میں وضاحت کے ساتھ لوگوں کو یہ بات بتا دی تھی کہ جس کا جی چاہے صرف حج کا احرام باندھے (جس کو اصطلاح میں افراد کہتے ہیں) اور جس کا جی چاہے شروع میں صرف عمرہ کا احرام باندھے اور مکۂ معظمہ میں عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد حج کے لیے دوسرا احرام باندھے (جس کو تمتع کہتے ہیں)، اور جس کا جی چاہے حج و عمرہ دونوں کا مشترک احرام باندھے اور ایک ہی احرام سے دونوں کو ادا کرنے کی نیت کرے (جس کو قران کہتے ہیں) —— آپ کا یہ ارشاد سننے کے بعد صحابۂ کرام میں سے غالباً چند ہی نے اپنے خاص حالات کے لحاظ سے تمتع کا ارادہ رکھا اور انھوں نے ذوالحلیفہ میں صرف عمرہ کا احرام باندھا —— ان میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں —— ورنہ زیادہ تر صحابہ نے صرف حج کا یا حج و عمرہ دونوں کا مشترک احرام باندھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کا احرام باندھا یعنی قران اختیار فرمایا۔ اس کے علاوہ اپنی قربانی کے جانور (اونٹ) بھی آپ مدینہ طیبہ ہی سے ساتھ لے کر چلے اور جو حاجی قربانی کے جانور ساتھ لے کر چلے وہ اس وقت تک احرام ختم نہیں کر سکتا جب تک دسویں ذی الحجہ کو قربانی نہ کرلے، اسلیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ صحابۂ کرام جو آپ کی طرح اپنی قربانی کے جانور ساتھ لائے تھے حج سے پہلے (یعنی ۱۰ ذی الحجہ کو قربانی کرنے سے پہلے) احرام سے باہر نہیں آسکتے تھے۔ لیکن جو لوگ قربانی کے جانور ساتھ نہیں لائے تھے اُن کے واسطے یہ شرعی مجبوری نہیں تھی ——

مکۂ معظمہ پہونچ کر آپ کو اس کا احساس زیادہ ہوا کہ یہ جو جاہلانہ بات لوگوں کے دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا سخت گناہ ہو اسکی تردید اور بیخکنی کے لیے اور دماغوں سے اس کے جراثیم ختم کرنے اور دلوں سے اس کے اثرات کو دھونے کے لیے ضروری ہو کہ وسیع پیمانہ پر اسکے خلاف عمل کر کے دکھایا جائے اور اس کی ممکن صورت یہی تھی کہ آپ کے ساتھیوں میں سے زیادہ سے زیادہ لوگ جو آپ کے ساتھ طواف اور سعی کر چکے تھے اس طواف اور سعی کو عمرہ قرار دے کے احرام ختم کر دیں اور حلال ہو جائیں اور حج کے لیے اُس کے وقت پر دوسرا احرام

باندھیں اور خود آپ چونکہ قربانی کے جانور ساتھ لے کے آئے تھے اس لیے آپ کے لیے اسکی گنجائش نہیں تھی اس لیے آپ نے فرمایا کہ "اگر شروع میں مجھے اس بات کا احساس ہو جاتا جو احساس بعد میں ہوا تو میں اپنے ساتھ قربانی کے جانور نہ لاتا اور جو طواف وسعی میں نے کی ہے اس کو مستقل عمرہ قرار دے کر یہ احرام ختم کر دیتا لیکن میں تو قربانی کے جانور ساتھ لانے کی وجہ سے ایسا کرنے سے مجبور رہوں، اسلیے آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ آپ میں سے جو لوگ قربانی کے جانور ساتھ نہیں لائے ہیں وہ اپنے اس طواف وسعی کو مستقل عمرہ قرار دے دیں اور اپنا احرام ختم کر کے حلال ہو جائیں"۔

آپ کا یہ ارشاد سن کر سراقہ بن مالک کھڑے ہو گئے، چونکہ وہ اب تک یہی جانتے تھے کہ حج کے مہینوں میں مستقل عمرہ کرنا سخت گناہ کی بات ہے اس لیے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ان دنوں میں مستقل عمرہ کرنے کا یہ حکم کیا صرف اسی سال کے لیے یا اب ہمیشہ کے لیے مسئلہ یہی ہے کہ اشہر حج میں مستقل عمرہ کیا جاسکتا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اچھی طرح سمجھانے اور اُن کے ذہن نشین کرنے کے لیے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر فرمایا "دَخَلَتِ الْعُمْرَةُ فِي الْحَجِّ" (حج میں عمرہ اس طرح داخل ہو گیا) یعنی حج کے مہینوں میں اور ایام حج کے بالکل قریب بھی عمرہ کیا جاسکتا ہے اور اس کو گناہ سمجھنے والی بات بالکل غلط اور جاہلانہ ہے اور یہ حکم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے۔

وَقَدِمَ عَلِيٌّ مِنَ الْيَمَنِ بِبُدْنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

لہ یہ وہی سراقہ ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ سے ہجرت فرمانے کے بعد آپ کو معاذ اللہ گرفتار کرنے اور اس کا انعام حاصل کرنے کے لیے اپنے ایک غلام کی نشان دہی پر آپ کا تعاقب کیا تھا اور آپ کے قریب پہونچ گئے پر ان کی گھوڑی کے پاؤں زمین میں دھنس گئے تھے اور ان کی درخواست پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی تو گھوڑی صحیح سلامت نکل آئی تھی اور یہ مکہ واپس لوٹ گئے تھے ۔ ۸ھ تک یہ مکہ معظمہ میں کفر وشرک ہی پر قائم رہے۔ پھر مکہ معظمہ فتح ہونے کے بعد عام اہل مکہ کی طرح انھوں نے بھی اسلام قبول کر لیا ۱۲۔

.......إِلٰى قَوْلِهٖ فَحَلَّ النَّاسُ كُلُّهُمْ وَقَصَّرُوْا إِلَّا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ كَانَ مَعَهٗ هَدْيٌ۔

اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ (جو زکوٰۃ اور دوسرے مطالبات کی وصولی وغیرہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے یمن گئے ہوئے تھے) وہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کے مزید جانور لے کر مکہ معظمہ پہونچے انھوں نے اپنی بیوی فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ وہ احرام ختم کر کے حلال ہو چکی ہیں اور رنگین کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور سرمہ بھی استعمال کیا ہے تو انھوں نے ان کے اس رویہ کو بہت غلط سمجھا اور ناگواری کا اظہار کیا (اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ حضرت علی نے اُن سے کہا کہ تم کو کس نے یہ کہا تھا کہ تم احرام ختم کر کے حلال ہو جاؤ) حضرت فاطمہ نے کہا کہ مجھے ابا جان (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ حکم دیا تھا (میں نے اس کی تعمیل میں ایسا کیا ہے) ـــــ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا کہ جب تم نے حج کی نیت کی اور تلبیہ کہہ کے احرام باندھا تو اس وقت تم نے کیا کہا تھا؟ (یعنی افراد کے طریقہ پر صرف حج کی نیت کی تھی یا تمتع کے طریقہ پر صرف عمرہ کی یا قران کے طریقہ پر دونوں کی ساتھ ساتھ نیت کی تھی) انھوں نے عرض کیا کہ میں نے نیت اس طرح کی تھی کہ اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أُهِلُّ بِمَا أَهَلَّ بِهٖ رَسُوْلُكَ" (اے اللہ میں احرام باندھتا ہوں اس چیز کا جس کا احرام باندھا ہو تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے) آپ نے فرمایا کہ میں چونکہ قربانی کے جانور ساتھ لایا ہوں (اور اس کی وجہ سے اب حج سے پہلے احرام ختم کرنے کی میرے لیے گنجائش نہیں ہے اور تم نے میرے جیسے احرام کی نیت کی ہے) اس لیے تم بھی میری طرح احرام ہی کی حالت میں رہو ـــــ آگے حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ قربانی کے جو جانور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ لے کے آئے تھے اور جو بعد میں آپ کے لیے حضرت علی یمن سے لے کر آئے ان کی مجموعی تعداد سو تھی (بعض روایات سے تفصیل یہ معلوم ہوتی ہے کہ ۶۳ اونٹ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آئے تھے اور ۳۷ حضرت علی یمن سے لائے تھے)
حضرت جابر نے آگے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے
مطابق تمام اُن صحابہ نے احرام ختم کردیا جو قربانی کے جانور ساتھ نہیں لائے تھے
اور صفا مروہ کی سعی سے فارغ ہونے کے بعد اپنے سروں کے بال ترشوائے وہ
سب حلال ہوگئے اور جو طواف وسعی انھوں نے کی تھی اس کو مستقل عمرہ قرار دے
دیا۔ بس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ صحابہ حالت احرام میں رہے جو اپنی
قربانیاں ساتھ لائے تھے۔

(تشریح) جن صحابہؓ نے آپ کی ہدایت اور حکم کے مطابق اپنا احرام ختم کیا انھوں نے اس موقع پر بال منڈوائے نہیں بلکہ صرف ترشوائے، ایسا انھوں نے غالباً اس لیے کیا کہ منڈوانے کی فضیلت حج کے احرام کے خاتمہ پر حاصل کرسکیں۔ واللہ اعلم

(باقی)

عرب قوم پرستی کی تحریک کا آغاز و ارتقاء

اسلامی نقطۂ نظر سے خطرناک کیوں؟

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور اولین قیادت کیلئے اللہ تعالیٰ نے اقوام عالم میں عربوں کو منتخب فرمایا۔ جس طرح بنی اسرائیل کے لیے فرمایا گیا تھا کہ "ولقد اخترناھم علی علم علی العالمین" (بے شک ہم نے اپنے علم کی بنا پر اقوام عالم میں سے ان کا انتخاب کیا) اسی طرح نبی عربی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ارشاد ہوا "اللّٰہ یَعلَمُ حیث یجعل رسالتہ" (اللہ جانتا ہے کہ کس کے سپرد کرے اپنی پیغامبری)

اس انتخاب کے وجوہ اور اسباب کیا تھے اور وہ کیا صفات و خصوصیات تھیں جن کی بنا پر عربوں کو یہ شرف بخشا گیا، یہ عرصہ سے محققین اور اہل نظر کا موضوع چلا آرہا ہے۔ در حق یہ ہے کہ دورِ اول کے عربوں نے اسلام کے مزاج کو سمجھنے، اس کی تعلیمات کو صحیح اور مکمل طریقہ پر اخذ کرنے، اس کے خلاف ہر چیز سے بے تعلقی اور کنارہ کشی اختیار کرنے، اسلام کی اشاعت کے لیے اپنے بے مثال جوش اور بے نظیر قربانی، اس کی روح اور اس کی خصوصیات کی حفاظت میں غیر معمولی احتیاط اور امانت داری اور عقلوں کو مطمئن کرنے اور قلوب کو مسخر کرنے میں حیرت انگیز کامیابیوں سے اس انتخاب کے لیے اپنی اہلیت اور استحقاق کو پوری طرح ثابت کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے عربوں اور اسلام کے درمیان ایک غیر فانی رشتہ قائم کر دیا اور ہر ایک کے مستقبل کو دوسرے سے وابستہ فرما دیا، اب عربوں کو اسلام کے سوا کسی اور چیز سے عزت و سرفرازی حاصل نہیں ہو سکتی اور اسلام اپنی صحیح شکل و صورت اور پورے اعتدال و توازن کے ساتھ اسی وقت تک ظاہر ہوا جب تک عرب اس دعوت کے حامل اور علم بردار رہے۔

عربوں اور اسلام کے درمیان اس رشتہ کی استواری اور پائیداری کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت خیال اور اہتمام تھا۔ آپ نے جزیرۂ عرب کو اسی مقصد سے اس کا ابدی مرکز اور پایۂ تخت بنایا اور اس بات کی پوری فکر کی کہ وہاں امن و سکون کی فضا برقرار رہے۔ اور وہ مضبوطی کے ساتھ اس راستہ پر قائم رہیں اس لیے کہ دارالسلطنت اور مرکز قیادت کو ہمیشہ انتشار، بے یقینی اور کش مکش سے پاک رہنا چاہیے۔ اس کے لیے آپ نے بہت سے دور رس احکام دیئے۔ آپ نے اصحاب کرام سے اس کے لیے عہد و پیمان لیے اور بہت سی حکیمانہ وصیتیں فرمائیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس بات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری وصیت یہ فرمائی تھی کہ لا یترک بجزیرۃ العرب دینان (جزیرہ عرب میں دو دین جمع نہ ہوں)[1]

حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا حکم فرمایا کہ ہم مدینہ میں اسلام کے علاوہ کوئی دین باقی نہ چھوڑیں[2]۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (لأخرجن الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب حتیٰ لا أدع الا مسلما[3]) (میں جزیرۂ عرب سے یہود و نصاریٰ کو ضرور نکالوں گا۔ یہاں تک کہ ایک غیر مسلم کو بھی اس میں باقی نہ چھوڑوں گا)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین بھی اسی اُصول پر کاربند رہے

---

[1] مسند احمد و اوسط طبرانی　[2] طبرانی　[3] صحیح مسلم و جامع ترمذی

در جزیرۂ عرب کو اسلام کا مرکز اور دعوتِ اسلامی کا راس المال سمجھتے رہے، امیرالمومنین
حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے نائب و خلیفہ کو جو وصیت کی اس میں یہ فرمایا:
اوصیہ بالاعراب خیراً فانهم اصل العرب ومادة الاسلام[۵] (عرب کے
ل بادیہ کا خیال رکھا جائے اس لیے کہ وہ اصل عرب اور اسلام کی طاقت کا سرچشمہ ہیں)

ایک طویل عرصہ تک عربوں اور اسلام کا چولی دامن کا ساتھ رہا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے
بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے گویا دونوں نے علیحدہ نہ ہونے کی قسم کھالی تھی اور
س عہد وفا پر مضبوطی سے قائم رہے۔

اس طرح عربوں نے اسلام سے عزت و سرفرازی پائی، پوری دنیا کی قیادت حاصل کی.
ن کی زبان اُن کی ثقافت ایسے ایسے دور دراز اور اجنبی مقامات اور ماحول میں پہونچی جہاں
سلام اور قرآن کے بغیر اس کا پہونچنا ناممکن تھا، علماء اور اہلِ فکر نے اس کو علم دین اور
صنیف و تالیف کی زبان بنایا، اگر وہ اسلام کی سرکاری زبان اور اسلامی کتب خانہ کی
لید نہ ہوتی تو کبھی یہ ممکن نہ تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام نہ صرف باقی رہا بلکہ اس نے
زیز پا ترقی کی مشکلات اور دشواریوں پر قابو حاصل کیا اور اس قدر غیر معمولی سرعت کے ساتھ
پھیلا کہ دُنیا آج تک محوِ حیرت ہے۔ یہ سب عربوں کے جوشِ جہاد، اسلام کی تبلیغ و اشاعت
بر ان کی گرمجوشی اور مفتوحین کے ساتھ اُن کے حسنِ سلوک کا نتیجہ تھا، اسلام اور عرب
ں سے ہر ایک دوسرے کا مددگار، اس کی قوت کا راز اور اس کی عزت و آبرو کا پاسبان تھا۔

اس پرسکون فضا اور خوشگوار ماحول میں صرف دو تین واقعات ایسے پیش آئے جن کی
جہ سے کسی قدر انتشار و اضطراب پیدا ہوا اور اس مبارک اتحاد کو نقصان پہونچا، ان واقعات
ے پیچھے بعض اشخاص اور اغراض کی کارفرمائی تھی، ان میں سے ایک "شعوبیت" (عربوں سے
فرت اور عجمی غرور) کی مشہور تحریک تھی جس کا علم بعض عجمی علماء نے تیسری صدی ہجری میں
ند کیا، یہ وہ لوگ تھے جن کا دل اسلام پر پوری طرح مطمئن نہ تھا اور اُن کے دل میں ایران

۵۔ صحیح البخاری کتاب المناقب باب مناقب عمر بن الخطابؓ۔

کی شہنشاہی کے زوال کا زخم تھا، اس کا دوسرا سبب بعض غیر عربی عناصر[1] کا تکبر و قومی عصبیت اور عربوں کے منصب و کردار اور اُن کی دینی و شرعی حیثیت و مرتبہ کو مجروح کرنے کی کوشش تھی، عربی حمیت اس بے انصافی اور حق تلفی کے خلاف قدرتی طور پر اُبھر کر اس کے سامنے آئی. لیکن ایمان و اسلام کی محبت جو عربوں کے رگ و ریشہ میں پیوست تھی اس فوری اور وقتی جذبہ پر غالب رہی، ہمیں تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتا کہ اس عہد میں کوئی منظم تحریک یا مدوّن فلسفہ وجود میں آیا ہو جس کو "قومیت عربیہ" کا نام دیا جا سکے، عرب اسلام ہی پر جیتے اور مرتے رہے۔ دونوں کی تاریخ ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک دوسرے میں پیوست رہی۔

انیسویں صدی عیسوی کے اواخر تک یہ صورت حال برقرار رہی، ادھر ترکوں میں جو شام و عراق اور حجاز کے حکمراں تھے قومی غرور پیدا ہونا شروع ہوا، بہت سے ترکی حکام عربوں اور عربی زبان سے اس قسم کا معاملہ کرنے لگے جو کوئی سامراجی ذہنیت کی قوم اپنی مفتوح قوم کے ساتھ کرتی ہے اور باوجود اس کے کہ حجاز اور حرمین شریفین کے لیے وہ پوری فیاضی کے ساتھ اپنی دولت کا استعمال کرتے تھے، نیز وہ دینی اور روحانی حیثیت سے عربوں کا ادب و احترام کرتے تھے، لیکن بعض ناعاقبت اندیش حکام سے تشدّد، اکھڑپن اور تکبر وغیرہ کا مظاہرہ ہوا اور رواداری، فراخ دلی، لطافتِ ذوق، آزادیِ رائے اور عربوں کے جائز میلانات اور قدرتی رجحانات کے احترام کا مظاہرہ اُن سے نہ ہو سکا، جس کی اس تغیر پذیر اور نازک عہد میں ایک مدبر و بالغ نظر حکومت سے بجا طور پر توقع تھی، خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ عرب اسلامی دعوت کا سرچشمہ تھے، بعض کوتاہ نظر اور بے لوچ حکام نے عربی شخصیت کو ختم کرنے کی بھی کوشش کی اور عربی زبان و ثقافت کے ساتھ بیگانگی کا معاملہ کیا اور عربوں کے قومی شعور کو کچلنے میں ان سے بڑی بے رحمی اور سنگدلی کا اظہار ہوا[2]۔ ان سب چیزوں نے عربوں میں ایک انتقامی جذبہ اور عربی نخوت و عصبیت

---

[1] ایرانی و ترک۔ [2] اس سلسلہ میں خاص طور پر جمال پاشا گورنر شام کا نام لیا جاتا ہے، جن کے مظالم نے ان کو جمال السفاح کا لقب عطا کیا۔

پیدا کردی اور ایک قوم پرست مصنف کے الفاظ میں "انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں بہت سے عربوں میں عرب قوم پرستی کا شعور پیدا ہونا شروع ہو گیا اور یہ عمل سب سے پہلے ملک شام میں شروع ہوا جبکہ انھوں نے غیر ملکی "ترکی" اقتدار کو ختم کرنے کا ارادہ کیا"[۱]

اس تحریک کے اولین قائد و علم بردار بعض مسیحی فضلاء تھے جن کا ترکوں سے عقیدہ و مذہب اور اخوت اسلامی کا کوئی رشتہ نہ تھا، وہ اس مغربی ثقافت کے حامل تھے جس کی بنیاد ہی قومی عظمت اور قوم پرستی کے جذبہ پر ہے، اس وقت اس تحریک کے لیڈر ڈاکٹر فارس نمر، شیخ ابراہیم الیازجی، استاذ نجیب العاذوری لبنانی تھے[۲]

عربوں میں خلافت عثمانیہ سے علیحدگی اور ایسی خلافت کے قیام کا خیال جو کسی عرب ملک میں ایک عرب کی سربراہی میں قائم ہو اور یہ عقیدہ کہ وہی اس کے جائز وارث ہیں۔ انگریز ماہرین سیاست اور سبک دست انگریز اہل قلم نے پیدا کیا ۱۸۸۲ء میں مسٹر ولفریڈ بلنٹ نے FUTURE OF ISLAM کے نام سے ایک کتاب لکھی جو تمام ممالک اسلامیہ و عربیہ میں اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے متعدد تراجم اسلامی زبانوں میں ہوئے ہندوستان میں اس کی مقبولیت و اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ لسان العصر اکبر حسین الہ آبادی بھی اس کے مترجمین میں ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے بڑی احتیاط اور خوبصورتی سے عربوں میں اس خیال کی تخم ریزی کی ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں لکھتا ہے۔

> "مصر کے لیڈروں نے خلافت کے مسئلہ کے متعلق نہایت اعتدال مرعی رکھا ہے اس جماعت نے مخالفت کو نظر انداز کر کے فقط آزادی کو اپنا مدعا ٹھہرا لیا ہے۔ اور اس نے اسلام کی دیوار میں کوئی نیا رخنہ پیدا نہیں کیا، نہ پیدا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے (سلطان) عبد الحمید خاں برابر اب تک امتی امیر المؤمنین تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اور نسبتاً زیادہ جائز اور مستحق تر خلافت کا

---

[۱] قضیۃ العرب از علی ناصر الدین ص۳۳ طبع بیروت [۲] ملاحظہ ہو کتاب مذکور ص۳۳

کر رقیام اس دن پر تنوی کیا گیا جبکہ عثمانیہ سلطنت کی اجل اس کا خاتمہ کردے، مصریوں کی یہ روش نہایت سنجیدہ ہے۔ ان کو ایسا ہی کرنا چاہیے بھی تھا۔"
آگے چل کر لکھتا ہے:

"یہ کامیابی غالباً چند ہی برسوں کے صبر و تحمل سے نسبتاً زیادہ عام فتح و کامیابی کے ساتھ متبدل ہو سکتی ہے، اس وقت اس میں بہت تھوڑا شبہ ہو سکتا ہے کہ عبد الحمید کی وفات یا سلطنت سے اس کی علاحدگی خلافت کے پھر قاہرہ میں قائم ہونے اور عربوں کے پھر وہاں اپنی گم کردہ مذہبی صدارت کو از سر نو باقاعدہ طور پر قائم کرنے کا پیش خیمہ ہوگی۔"

اسی کتاب کے ایک باب میں جس کا عنوان ہے "اصلی دار السلطنت مکہ" لکھتا ہے:

"دور اندیش مسلمانوں کو اب یہ صاف صاف نظر آ رہا ہے کہ اگر واپسی سفر شروع ہوا[1] تو اور بھی آگے جانا پڑے گا یعنی مذہب کا اصلی صدر مقام عرب میں ہے جو اس کا زاد و بوم اور اس کے الہام کا سرچشمہ ہے، دنیا بھر میں یہی ایسا ملک ہے جہاں مذہبی بادشاہت کو آزادانہ طور پر استعمال کرنے کی شرائط پائی جاتی ہیں۔ عرب میں عیسائی یہودی اور کسی قسم کے غیر مسلم نہیں جن سے اسلام کو مقابلہ کرنا پڑے، نہ یہ ایسا زرخیز ملک ہی ہے کہ اس کو دیکھ کر مغربی دول کے دہاں منہ میں پانی بھر آئے، وہاں خلیفہ کو فرانسیسی یا کسی اور فرنگی رفیق کی تنبیہ کا اندیشہ نہ ہوگا۔ وہ جیسا کہ پیغمبر کے جانشین کے واسطے شایان شان ہے آزادانہ کارروائی کر سکے گا اور وہاں اسلام تمام آلائشوں سے پاک اور صاف ہوگا، پس غالباً آئندہ کو خلافت مدینہ یا مکہ واپس آئے گی"
آگے چل کر لکھتا ہے:

"دینی اقتدار کے صدر مقام کا قسطنطنیہ سے مکہ میں تبدیل ہونا بالکل

---

[1] یعنی قسطنطنیہ کے بجائے ایشیا میں کسی اور جگہ کو مرکز خلافت بنانے کی کارروائی شروع کی گئی۔

آسان اور طبعی امر ہوگا اس سے عوام کے موجودہ خیالات میں کچھ فرق نہ آئے گا
اور علماء کی آراء اور خیالات کے بالکل مطابق ہوگا قسطنطنیہ کے معدوم ہونے
پر مکہ یا مدینہ بالطبع اہل حل وعقد کا شرعی مسکن ہوگا اور دینی اقتدار کا سلسلہ
مرکز بن جائے گا، جن لوگوں سے اس مضمون پر میری گفتگو ہوئی ہے انھوں نے
بالاتفاق تسلیم کیا ہے کہ اس مشکل مسئلہ کے ایسے حل کو ترکی کے حامیوں کے
سوائے تمام علماء تسلیم کریں گے۔ بیشک جہاں تک مسلمانوں کی موجودہ ضرورت
ہے مجھے فیصلہ کرنے کا موقع ملا ہے مکہ خلافت کا صدر مقام ہے آئندہ بھی
اس کا اقتدار زائل نہ ہوگا۔ قدیم زمانہ میں یہ نعرہ سنا جاتا تھا "روما پایہ تخت
ہے"! اور جن لوگوں کو اب مکہ کے پایہ تخت ہونے کا خیال بتایا جاتا ہے
اُن کی قوت متخیلہ پر بہت اثر ہوتا ہے اور مزید برآں جب یہ کہا جاتا ہے
کہ خلافت قریش سے ہوگی تو کم از کم عرب بے تاب ہو جاتے ہیں، اگر ہم گزشتہ
تاریخ پر نظر ڈالیں تو بے شک سوائے اس کے کچھ نہیں نکلتا... ... ...
... ... اسلام کا عربی عنصر بے شک ایسے انتخاب کی تائید کرے گا۔ اور یہ بھی
یاد رہے کہ عرب کا دائرۂ اقتدار مراقش سے بوشہر تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی طرح
ہندوستان اور ملایا کے مسلمان بھی اسی دائرہ میں ہیں، ملکہ ترکوں کے سوا جن کی
وقعت یوماً فیوماً کم ہوتی جاتی ہے اسلام کا ہر ایک عنصر اسی دائرہ میں خیال
کرنا چاہیے۔"[1]

۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء میں پہلی عمومی جنگ ہوئی اور عرب ممالک کو اس کا بہترین موقع
ہاتھ آیا کہ وہ سلطنت عثمانیہ میں شگاف ڈال سکیں، دوسری طرف اتحادیوں نے بھی اس
فرصت کو غنیمت جانا اور قومیت کو خوب ہوا دی، لارنس نے اس سلسلہ میں اپنا مشہور
کردار ادا کیا اور عربوں میں قومی جوش پیدا کر کے اُن کو ترکوں کے خلاف صف آرا کر دیا۔[2]

---

[1] مستقبل اسلام۔ ترجمہ FUTURE OF ISLAM شائع کردہ وطن لاہور۔

[2] ملاحظہ ہو ERIKDOWROTH کی کتاب LAWRENCE OF ARABIA

چنانچہ شریف حسین نے حجاز میں بغاوت کی اور اہل شام نے شام میں' ان مسلمان ترکوں کے مقابلہ میں جنھوں نے پانچ سو برس تک اسلام کا علم بلند اور اس کے دشمنوں کو مرعوب و مغلوب رکھا اور جو اپنی ساری کمزوریوں اور خرابیوں کے باوجود اسلامی قوت وشوکت کی علامت تھے، ان عربوں نے اتحادیوں کا ساتھ دیا اور اُن کے کیمپ میں شامل ہونا گوارا کیا جنھوں نے کبھی کسی مسلمان کی عزت وآبرو کی پرواہ نہیں کی اور کسی عہد وپیمان کا پاس نہیں کیا اور جن کی قیادت وہ انگریز کر رہے تھے جن کے ہاتھ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سخت ترین مظالم سے رنگین اور ان کی تاریخ اسلام دشمنی کی خونی داستانوں سے آلودہ ہے۔

انھوں نے اس جوش وردعمل میں قرآن وحدیث کے اُن قطعی نصوص کی بھی پرواہ نہیں کی جو دشمنان اسلام سے ترک موالات اور ان کے حلیف بن کر جنگ کرنے کے خلاف صاف موجود تھے، انھوں نے ان خوش کن اور پُرفریب سیاسی وعدوں پر اعتماد کرلیا جو ہر لحظہ وہرآن بدلتے رہتے ہیں اور جو سوائے مصلحت اور سوائے قوت کے کسی اور چیز سے آشنا نہیں' انھوں نے حرم کے حدود میں بھی ترکوں کو تہ تیغ کرنے سے گریز نہیں کیا، یہ وہ اقدام تھا جس کی نحوست سے ابھی تک عربوں کا پیچھا نہیں چھوٹا، اس کے بعد شام میں امیر فیصل کی سربراہی میں ہاشمی عربی حکومت کا قیام، اتحادیوں کی وعدہ خلافی اور تغافل شعاری اور اس حکومت کے ڈرامائی خاتمہ کے وہ واقعات پیش آئے جن سے سب واقف ہیں۔

اس کے بعد قومیت کے اس مغربی مفہوم کا زمانہ آیا جو ایک مستقل فکر اور فلسفہ ہے اور اس میں وہ ساری حمیت وحرارت اور شعائر ومقدسات پائے جاتے ہیں جو مذہب کے ساتھ مخصوص ہیں۔

تعلیم یافتہ عرب خاص طور پر جن کا رشتہ (مختلف اسباب کی بنا پر) دین سے کمزور پڑ چکا تھا اور قومی عظمت وشوکت تک جلد از جلد پہونچنے کی شدید خواہش ان میں پیدا ہوگئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ تہذیب وتمدن اور ترقی پسندی کے میدان میں اپنی معاصر قوموں کے دوش بدوش آگے بڑھیں، ان میں موجودہ حالات سے مایوسی اور مغربی اقوام سے بیزاری اور جھنجھلاہٹ پیدا ہوگئی تھی جنھوں نے اسرائیل کو جنم دیا اور جو برابر اسرائیل کی حمایت کرتی رہتی ہیں،

ان نوجوانوں نے سخت رد عمل اور فکری اُبال کے عالم میں قومیت کے سایہ میں پناہ لی اور اس کو اپنے درد کا درماں سمجھا۔

انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا اور قومیت کو صرف ایک دفاعی یا تنظیمی تدبیر یا عبوری مرحلہ کے طور پر استعمال نہیں کیا جیسا کہ اس کے بعض داعیوں کا دعویٰ ہے[۱] بلکہ قومیت عربیہ کی تقدیس و تنزیہ اور اس کا کلمہ پڑھنے میں انھوں نے پورے جوش و مبالغہ سے کام لیا اور اس کے ساتھ اپنی وابستگی اور وفاداری کے اظہار کے لیے اس کے سوا ہر چیز کے انکار اور اس کی تحقیر کو ضروری سمجھا اس کو انھوں نے عقیدہ و مذہب کی جگہ دی جس کے لیے ان کے اندر وہی تعصب پیدا ہو گیا جو اس وقت تک مذہب کی خصوصیت سمجھی جاتی تھی اس قومیت کے لیے انھوں نے بیا کانہ طریقہ پر مذہب اور اہل مذہب کی تحقیر اور استہزا میں بھی تامل نہیں کیا، اس کا اندازہ ان اقتباسات سے ہوگا جو ان قوم پرست اہل فکر و اہل قلم کی کتابوں اور تحریرات سے لیے گئے ہیں جو قومیت عربیہ کی تحریک کے مستند ترجمان اور شارح سمجھے جاتے ہیں:۔

لبنانی مسلمان فاضل علی ناصر الدین اپنی مقبول عام کتاب قضیۃ العرب[۲] میں لکھتے ہیں۔

> "عربوں کا مسئلہ ایک مومن آزاد فطرت، عاقل، شریف، صالح عادل، خود دار اور بلند نظر عرب کے نزدیک ایمان کے مسئلہ سے کم نہیں، وطن پر ایمان وطن کے لیے ٹھیک اسی طرح جس طرح اللہ پر ایمان اللہ کے لیے ہو سکتا ہے اور بس"[۳]

---

[۱] جس تحریک کے ساتھ مستقل فلسفہ اور فکر ہو اور جس کی جڑیں قلب و دماغ میں بہت گہری ہوں وہ کبھی بھی محض عارضی سلاح یا عبوری مرحلہ کے طور پر استعمال نہیں کی جا سکتی۔ [۲] اس کتاب کے تین ایڈیشن تھوڑے وقت میں نکل چکے ہیں، کتاب اور مصنف کتاب پر ممتاز عرب زعماء و مفکرین کی تقریظیں اور تعریفی تبصرے ہیں۔
[۳] مقدمہ قضیۃ العرب از علی ناصر الدین طبع بیروت ۱۹۶۳ء صـ ۱۹

عربوں کے مسئلہ اور اس کے مقاصد و عزائم کے متعلق لکھتے ہیں :-

" وہ (یعنی عربی قومیت) جہالت، افلاس، بیماری، ظلم و ناانصافی اور ہر قسم کی بے عنوانی اور عصبیت عربیہ کے سوا ہر عصبیت کا مقابلہ کرے گی جو دین و سیاست کی تفریق کی قائل ہے، وہ اہل دین کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہ دے گی، ایک عرب کے لیے اس کی تعلیم یہ ہوگی کہ وہ جہاں کہیں بھی ہو دو چیزوں کے لیے پورا تعصب برتے، ایک اپنی قومیت کے لیے، ایک حق و صداقت کے لیے[۵]"

یہی مصنف " العروبة " یعنی عربیت کی تشریح کرتے ہوئے صاف اور واضح الفاظ میں کہتا ہے :-

قومیت عربیہ پر راسخ ایمان رکھنے والے ہم عرب قوم پرستوں کے نزدیک " عروبة " بجائے خود ایک دین ہے اس لیے کہ وہ اسلام اور مسیحیت دونوں سے پہلے اس دنیا میں موجود ہے، اگرچہ وہ آسمانی مذاہب کے اخلاق و معاملات اور فضائل کا خود بھی حامل و داعی ہے[۶]"

اس کے ثبوت میں کہ عربی قومیت اس کے بہت سے داعیوں اور رہنماؤں کی نظر میں مذہب کے متوازی ایک مذہب اور عقیدہ کے بالمقابل ایک عقیدہ بن چکی ہے، ایک دوسرے قوم پرست مفکر کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے :-

" العربي " کے جنوری ۱۹۵۹ء کے شمارہ میں ایک قوم پرست عرب فاضل لکھتے ہیں :-

وحدت عربیہ کے سب سے پہلے معنی یہ ہیں کہ اس زمین کے تمام باشندوں میں جو اس نام (عرب) سے اپنے کو موسوم کرتے ہیں اتحاد قائم ہو، عرب اتحاد کی عربوں کے دلوں میں وہی جگہ اور مرتبہ ہے جو اہل ایمان کے قلوب میں خدا کی توحید کا ہے "

۵؎ مقررۃ قضیۃ العرب از علی ناصر الدین طبع بیروت ۱۹۶۳ء ص ۱۲۵، ۶؎ ایضاً ص ۱۲۰

مشہور مصری ادیب استاذ محمود تیمور مصر کے مشہور رسالہ العالم العربی کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں :۔

"اگر ہر عہد کی ایک مقدس نبوت تھی تو اس زمانہ کی نبوت ہمارے معاشرہ میں عربی قومیت ہے، اس نبوت کا پیغام اپنی قوت کو جمع کرنا، اپنے محاذ کو مضبوط کرنا اور عرب معاشرہ کی انسانی طاقت کو اس رُخ پر لے چلنا ہے کہ زندگی کی نعمت و عزت حاصل ہو، عرب مفکرین وادباء کے کاندھوں پر ایک امانت ہے کہ وہ اس سچی نبوت کے حواری ثابت ہوں، اپنے قلم سے اس کو روشن کریں، اس میں اپنی روح پھونکیں اور اس کے لیے کوشش کریں کہ ترقی و سرسبزی کے سارے اسباب اس کے لیے مہیا ہو سکیں"[1]

یہ مفکرین و اہل قلم اس کو اسلامی اتحاد پر ترجیح دیتے ہیں، اس کو زیادہ آسان ممکن الحصول، زیادہ مؤثر اور اقتدار زیادہ وسعت پذیر تحریک سمجھتے ہیں، ڈاکٹر محمد احمد خلف اللہ اپنے ایک مضمون "عربی قومیت جتنا کہ اس کو ہمیں سمجھنا چاہیے" میں لکھتے ہیں :۔

"آج سیاست داں عربی قومیت کی دعوت دیتے ہیں اور کوئی شک نہیں کہ عرب اتحاد آج اسلامی اتحاد سے زیادہ سہل الحصول ہے، ہماری مصلحت اسی میں ہے کہ پہلے ہم اس قریبی مقصد کو حاصل کریں، اس پر مستزاد یہ ہے کہ عربی فکر اسلامی فکر کے مقابلہ میں پھیلنے اور متاثر کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ عالم عربی کے تمام باشندوں پر محیط ہے لیکن اسلام ان سب پر شامل نہیں، ان ممالک کے سب باشندے عرب ہیں، لیکن سب مسلمان نہیں، ان میں اب بھی یہودی اور عیسائی موجود ہیں"[2]

بعض مفکرین و اہل قلم قومیت کی حمایت میں اس قدر مبالغہ اور غلو سے کام لیتے ہیں کہ جو اس نعمت سے محروم ہو اس کا اسلام بھی معتبر نہیں سمجھتے۔ علی ناصر الدین جن کا ذکر پہلے

---

[1] عربی قومیت از محمود تیمور مجلہ العالم العربی شمارہ ۱۱، ؛ [2] مجلۃ العربی پہلا شمارہ دسمبر ۱۹۵۸ء صفحہ ۲۴

گذر چکا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"ہماری رائے میں یہ بہت مشکل ہے کہ کوئی غیر عرب ایسا مسلمان بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ خدا اور اس کے رسول کو مطلوب ہے، کوئی شخص اتنی بات پر کہ اس کے والدین مسلمان ہیں اور وہ ایک مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہو مکمل مسلمان نہیں ہو سکتا، اس کو ایسا ہونے کے لیے اس بات کی ضرورت ہو کہ وہ اپنی زبان اپنی ثقافت اور اپنے رجحانات کے لحاظ سے عرب ہو۔"[۵]

یہ انداز فکر (جو ایک ایسے عقیدہ اور نظریہ کی غمازی کرتا ہے جو خوب راسخ اور پختہ ہو چکا ہے اور اپنے ارتقاء کی آخری منازل طے کر چکا ہے) صرف مغرب کی لادینی قومیت کی صدائے بازگشت ہے اور یہی چیز ہے جسے ہم اسلام کے لیے خطرناک سمجھتے ہیں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام کا حریف و رقیب ہے اور عربوں کے معاشرہ اور اُن کے قلب و دماغ میں وہ جگہ لینا چاہتا ہے جو ابھی تک اسلام کے لیے مخصوص تھی، وہ جس قدر ترقی کرے گا اور پھلے پھولے گا اسلام کی گرفت کمزور اس کا اثر مضمحل ہوتا چلا جائے گا۔ وہ اسلام کے اولین داعیوں کی تمام کوششوں پر پانی پھیر دینے کے درپے ہے اور چاہتا ہے کہ عربوں کا رشتہ اُن کی قوت و حیات کے سرچشمہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی دعوت و پیغام سے اور اس کے بعد سارے عالم اسلام اور مسلم اقوام سے منقطع ہو جائے اور ان کی توجہ انسانیت کے مستقبل اور اقوام عالم کی رہنمائی سے بالکل ہٹا دے[۶]، وہ عربوں کو جو ایک ایسی ملت کا اہم حصہ ہیں جو پوری انسانیت کے لیے پیدا کی گئی ہے ایک ایسی محدود اور تنگ نظر قوم میں تبدیل کر دینا چاہتا ہے جو مسائل کو صرف اپنے (قومی) نقطۂ نظر سے سوچنے کی عادی اور صرف اپنے ہی لیے جینے اور مرنے کا خواب دیکھتی ہے۔

---

۵ حاشیہ قضیۃ العرب صد ۱۳۹ ۶ عالم اسلامی کی دوسری مسلم اقوام سے عرب قوم پرست حکومتوں اور افراد کی بے تعلقی بالکل عیاں ہے۔ قبرص کے ترکوں اور ہندستان کے مسلمانوں کے بارے میں ان کے اندر کوئی گہرا ہمدردی کا جذبہ اور جوش نہیں پایا جاتا، اور انھوں نے اس صورت حال کے خلاف کوئی احتجاج تک نہیں کیا۔

حیرت و افسوس کی بات ہے کہ عرب قوم پرست تو اپنے دائرہ کے اندر سوچیں اور اپنی تمام
[...]رمی اور جدوجہد کو صرف عرب اقوام تک محدود رکھیں حالانکہ ان کی اکثریت دین اور عقیدہ
[...]ے لحاظ سے مسلمان ہے اور ملحد کمیونسٹ انسانیت کی سطح پر سوچیں اور ملک و قوم کے امتیازا
[...]ے بالاتر ہو کر تمام دنیا کے محنت کش طبقہ اور مزدوروں و کسانوں کے مسئلہ پر غور کریں طرز فکر
[...]یہ اختلاف اس وقت کھل کر سامنے آیا جب روسی وزیر اعظم خروشچیف نے جو مصر کا دورہ
[...]ر رہے تھے ۱۶ مئی ۱۹۶۴ء کو عرب مزدور ٹریڈ یونین کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے جمال
[...]عبدالناصر کی تقریر پر نکتہ چینی کی۔ انھوں نے کہا کہ :-

> "آپ نے اپنی تقریر میں ایک ایسا سوال اٹھایا ہے جس کا میں پہلے بھی کئی بار
> تذکرہ سن چکا ہوں، آپ عرب اتحاد پر زور دے رہے ہیں لیکن میں اس سلسلہ میں
> کہنا چاہوں گا کہ اتحاد کے سوال کو ہم روسی اس کے وسیع ترمعنوں میں دیکھتے ہیں،
> ہم اتحاد کی بنیاد قوم پروری کے تصور پر نہیں بلکہ محنت کش طبقہ کی طاقت پر
> رکھتے ہیں[1]"

عرب مسلمان دراصل اس بات کے زیادہ حقدار تھے کہ عالمی سطح پر مسائل پر غور کریں اور
[...]ایدہ اسلامی اقدار کی بنیاد پر پوری انسانیت کی فلاح و بہبود سے دلچسپی لیں اور زیادہ
[...]ین الاقوامیت" اور "انسانیت دوستی" کا ثبوت دیں۔ لیکن قومیت کا مزاج ان کو اس
[...]ے دائرے سے باہر نہیں نکلنے دیتا اور انسانیت کے لیے ان کے دل میں کچھ زیادہ گرمجوشی
[...]ر جذبہ نظر نہیں آتا،

قوم پرستی کی غالی تحریک کا ایک قدرتی نتیجہ یہ بھی ہے کہ الحاد و بے دینی اور مذہب
[...]بیزاری کی ایک تیز و تند لہر عالم عربی میں اٹھی اور نوجوان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں،
[...]ں طرز فکر کے نمونے قوم پرست ادبا و مفکرین کے مضامین میں نظر آنے لگے۔ اس کا ایک
بہترین نمونہ" مشہور قوم پرست صحافی ڈاکٹر احمد زکی مدیر رسالہ "العربی"[2] کا وہ مضمون ہے جو

---

[1] روزنامہ قومی آواز ۲۲ مئی ۱۹۶۴ء۔ [2] مشرق اوسط اور ممالک عربیہ کا سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اور مقبول عربی رسالہ جو کویت کی حکومت کی سرپرستی میں نکلتا ہے اور جسکو عربوں کے مزاج کو بگاڑنے میں بہت بڑا دخل ہے۔

انھوں نے کویت کے کثیر الاشاعت اور مقبول رسالہ "رسالہ العربی" کے پہلے شمارہ میں لکھا تھا، لکھتے ہیں :۔

"رسالہ العربی" عربیت کو دین کے ساتھ نہیں جوڑتا سب لوگ اللہ کے بندے اور اس کے راستہ کے مسافر ہیں، راستے مختلف اور منزل مقصود ایک ہے، ہر زندہ انسان اس زندگی کی ضمانت چاہتا ہے اور اطمینان وسکون کا خواستگار ہے، دین کے ذریعہ وہ اس زندگی کے بعد کی ضمانت حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن صدیوں کے خون آشام تجربوں نے اس بات کو ظاہر کر دیا ہے کہ دین (جو اس زندگی کے بعد والی زندگی کی ضمانت کا طالب تھا) اس نے خود اس زندگی کا امن وسکون چھین لیا ہے، اب ایک عاقل (وصاحب فکر جو اللہ کے اس عطیہ آزادی رائے سے متمتع ہو، اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ لوگوں کا پیچھا چھوڑ دو، وہ اللہ تک پہونچنے کے لیے جس راستہ پر چاہیں چلیں، یہاں تک کہ وہ شخص بھی جو اس راستہ پر نہ چل رہا ہو (یعنی ملحد وبے دین) اس لیے کہ اس کے اس فعل کی ذمہ داری تنہا اس پر ہوگی نہ کہ دوسرے لوگوں پر"[1]

یہی بات عمر فاخوری نے عرصہ ہوا اپنی کتاب (کیف ینہض العرب؟) (عرب کیسے ترقی ہیں؟) میں کہی تھی۔

"عرب اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک کہ عربیت اور عربی اصول ان کا مذہب نہ بن جائے گا اور وہ اس کے لیے اتنے غیرت مند، حساس، اور پرجوش نہ ہوں گے جتنے مسلمان نبی کریم کے قرآن مجید کے لیے، عیسائی اور کیتھولک رحم دل مسیح کی انجیل کے لیے، پروٹسٹنٹ لوتھر کی اصلاحی تعلیمات کے لیے اور فرانس کے انقلابی روسو کے جمہوری اصولوں کے لیے ہیں اور اس کے لیے ایسا تعصب نہ برتیں گے جس کا مظاہرہ سینٹ پیٹر کی دعوت پر صلیبیوں نے کیا تھا"[2]

---

[1] "العربی" پہلا شمارہ [2] الاتجاہات العربیہ فی معرکۃ تحقیق الذات صد ۱۴۱۔

درحقیقت عرب مسلمان مشرق وسطیٰ کی اس چھوٹی سی مگر زیرک و ہوشمند غیر مسلم اکثریت کی
سازش کا شکار ہوئے ہیں جس کا مستقبل صرف عربی قومیت کی بقا و ترقی سے وابستہ ہے اور
صرف اسی راستہ سے عالم عربی کی قیادت حاصل کرسکتی ہے اور اس کو اس عالم اسلام سے
قطع کرسکتی ہے جس کا اس اقلیت کے ساتھ دینی عقائد اور تاریخ کا کوئی رشتہ نہیں ہے،
اس بات کو سمجھنے کے لیے اتنا کافی ہے کہ میشل عفلق جو عیسائی ہیں بعث پارٹی کے سربراہ
اور مشرق وسطیٰ میں عرب قوم پرستی کی تحریک کے سب سے بڑے فلسفی اور مفکر مانے جاتے ہیں۔

غیر مسلم عرب مفکرین نے اس فلسفۂ قومیت کو جس چابک دستی اور ذہانت سے مرتب کیا ہے
اور اس میں جس طرح علمی (سائنٹفک) انداز فکر پیدا کیا گیا ہے اور اس میں ایک عرب تعلیم یافتہ
جوان کے لیے جو احساس برتری کے نشہ سے سرشار ہے جو کشش پائی جاتی ہے اس کا اندازہ
مندرجۂ ذیل اقتباسات سے ہوگا جو میشل عفلق کی کتاب فی سبیل البعث[1] سے اخذ کیے گئے ہیں
ان کو اس تحریک و دعوت کا صحیفہ کہنا صحیح ہوگا۔

"یہ قدرتی طور پر بالکل ممکن ہے کہ کوئی شخص بھی خواہ وہ محدود سے محدود
صلاحیت رکھتا ہو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حقیر اور دھندلی تصویر بن سکے جب
تک وہ ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہے جس نے اپنی ساری قوتیں اور صلاحیتیں
جمع کرکے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیدا کیا یا زیادہ مناسب الفاظ میں جب
تک وہ شخص اس قوم کا فرد ہے جس کے لیے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی
ساری قوتیں جمع کردیں اور اس کی تخلیق کی، کسی زمانے میں ایک شخص کے اندر
پوری قوم کی زندگی مجسم ہوگئی تھی اور آج اس کی ضرورت ہے کہ اس قوم کی جو
نئی ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے پوری زندگی اس عظیم الشان شخصیت کی زندگی
کی تفصیل اور امتداد بن جائے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کل عرب تھے آج

---

[1] کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مصر کی قومیت عربیہ کے مفکر و زعما بھی ان کے خوشہ چین اور ان کے سامنے
طفل مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کُل عربوں کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہونا چاہیے۔"[۱]

"___ اسلام کو فتحیاب اور غالب ہونے میں جو اتنی تاخیر ہوئی وہ دراصل اس وجہ سے تھی کہ عرب اپنی ذاتی کوشش اور جدوجہد اور خود اپنے وجود اور دنیا کے باہمی تجربات اور امتحانات کے نتیجہ میں اور بہت سی آزمائشوں اور تکلیفوں، امید و ناامیدی اور کامیابی و ناکامی کے بعد حقیقت تک پہونچ جائیں، یعنی ایمان خود ان کے اندر سے پیدا ہو اور وہ ایمان تجربہ سے ظاہر ہو، زندگی کی گہرائیوں سے وابستہ حقیقی ایمان بن سکے اس لحاظ سے اسلام ایک عربی تحریک تھا اور اس کے معنی تھے عربیت کی تجدید و تکمیل"[۲]

"اسلام عرب قوم کے جذبۂ ابدیت و وسعت کا بہترین اظہار و تعبیر اس لحاظ سے وہ اپنی حقیقت میں عربی ہے، اپنے مثالی مقاصد میں انسانی ہے، پس اسلام کا پیغام درحقیقت انسانی عربی اخلاق ہے"[۳]

"___ اس لیے وہ معنی جن کو اس اہم تاریخی دور میں اور ترقی و تغیر کے اس نازک مرحلہ میں اسلام آشکارا کر رہا ہے یہ ہے کہ ساری قوتیں عربوں کی طاقت بڑھانے اور ان کو ترقی دینے پر صرف کی جائیں اور یہ ساری قوتیں عرب قومیت کے دائرہ کے اندر محصور ہوں۔"[۴]

"یورپ میں خالص قومی نظریہ منطقی بنیاد پر قائم ہے، جب کہ قومیت کا مذہب سے انفصال طے شدہ امر بن چکا ہے، اس لیے کہ یورپ میں مذہب باہر سے آیا ہے اور اس کے مزاج اور تاریخ کے لیے اجنبی ہے اور وہ عقیدۂ آخرت اور اخلاق کا خلاصہ ہے، وہ نہ ان کے ماحول کی ضروریات کا آئینہ دار ہے، نہ ان کی تاریخ کے ساتھ وابستہ ہے جب کہ اسلام عربوں کے لیے صرف ایک اُخروی عقیدہ یا بعض اخلاقیات کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ زندگی کے بارہ میں ان کے

۱ه ص۴۳ ۲ه ص۴۲ ۳ه ص۴۳ ۴ه ص۴۳

نقطۂ نظر، ان کے کائناتی شعور کا فصیح ترین ترجمان اور ان کی شخصیت کی وحدت کی طاقتور تعبیر ہے، جس میں الفاظ شعور اور فکر کے ساتھ وابستہ اور پیوست ہیں " [۱]

میرا اعتقاد ہے کہ عربوں کا خمیر دین کے ساتھ اٹھایا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس طرح گھل مل گیا ہے کہ اب ان کو اس سے علٰحدہ اور آزاد کرنا آسان نہیں اور باوجود اس کے کہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک بڑا حصہ قومیت سے متاثر اس کا علم بردار اور داعی ہے جمہور کو اسلام سے محبت ہے اور وہ اس کے سوا کچھ اور نہیں جانتے، اس کے بغیر کسی اور چیز سے اُن کے اندر جوش نہیں پیدا ہوتا اور یہی وہ جذبہ اور طاقت تھی جس نے اس سے لیبیا (مراکش) الجزائر اور معرکۂ سویز میں زبردست قربانیاں کرائیں، ان میں نشہ پیدا کیا اور ان کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔

لیکن قوم پرستی کے اندر نوجوانوں کے لیے جو کشش اور اس کے علم برداروں کے پاس اپنے نظریہ کی تبلیغ و اشاعت اور حقائق کی رنگ آمیزی کے جو وسیع وسائل و امکانات ہیں اور پھر بعض عظیم عرب حکومتوں نے اس تحریک کی جو کھلی سرپرستی اور پشت پناہی شروع کر دی ہے اور صحافت و دعایت، علم و ادب، فکر و فلسفہ کی زبردست طاقتوں کو اس کی توسیع و اشاعت پر مرکوز کر دیا ہے، پھر مغرب کی مسلسل بے اعتنائیوں اور غلطیوں نے عرب نوجوانوں میں جو اشتعال اور غم و غصہ کی لہر پیدا کر دی ہے اس سب کے ماسوا دینی گرفت کی کمزوری اور مادیت و الحاد کے سیلاب نے اس کے لیے جو زمین ہموار کر دی ہے اس کے پیش نظر اندیشہ ہے کہ یہ عرب تعلیم یافتہ نوجوانوں اور بعض نوخیز عرب اقوام اور حکومتوں کا آئین اور دستور نہ بن جائے اور عربوں کے مزاج میں ایسا گہرا اور دیرپا تغیر نہ واقع ہو جائے جو دعوت اور فکر اسلامی کے لیے مستقل کانٹا اور عربوں کے اسلام سے اسی طرح دور ہو جانے کا ذریعہ نہ بن جائے جس طرح ترکی میں نظر آرہا ہے۔

یہ اندیشہ اور تحلیل (جو بے بنیاد نہیں ہے اور جس کی معقولیت کا ثبوت اوپر کے اقتباسات

---

[۱] ص ۴۳۔

اور تحریری نمونوں سے ہوا) ان لوگوں کو قومیت عربیہ کی تحریک کی مخالفت پر آمادہ کرتی ہے، جو ان تغیرات اور اس کے دوررس نتائج اور اثرات پر نظر رکھتے ہیں اور جو عربوں کو دعوت اسلامی کا راس المال اور بلاد عربیہ کو اسلام کا اولین سرچشمہ اور آخری پناہ گاہ سمجھتے ہیں اور قومیت کے اس مغربی مفہوم سے واقف ہیں جو حقیقت میں دین کا حریف و رقیب اور الحاد و بے دینی کا پیش خیمہ ہے، وہ اس صورتِ حال کو دیکھ کر بے چین ہو جاتے ہیں اور قدیم ایرانی شاعر کے الفاظ میں پکار اٹھتے ہیں ؎

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

جو لوگ قومیت کے اس مغربی مفہوم سے واقف ہیں اور ان کی تحریک قوم پرستی (نیشنلزم) کے مغربی لٹریچر پر براہِ راست نظر ہے وہ اس کو اسلام کا براہِ راست حریف سمجھتے ہیں جو وحدتِ اسلامی کا داعی اور ایک عقیدہ کی بنیاد پر ایک ملت کی تاسیس اور ایک معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے وہ اس قوم پرستی یا مغربی معنی میں وطنیت اور قومیت کو دنیا کی سب سے بڑی تخریبی طاقت اور نوعِ انسانی کی تفریق اور انتشار کا ذمہ دار سمجھتے ہیں انھیں اہلِ فکر و نظر میں علامہ اقبالؒ بھی تھے جن کی مغربی لٹریچر پر گہری اور نہایت وسیع نظر تھی، وہ اپنے ایک مقالہ میں جو مارچ ۱۹۳۸ء میں لکھا گیا ہے قومیت و وطنیت کے مغربی مفہوم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں، ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں کیونکہ ہم سب کرۂ ارضی کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے علیٰ ہذا القیاس، چینی، عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ وطن محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا، ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لیے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے ...... مگر زمانۂ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن "ایک اصولِ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا اور اسی اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے، چونکہ اسلام بھی ایک ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا

ایک قانون ہے۔ اس لیے جب لفظ "وطن" کو ایک سیاسی تصور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے"۔

خطبہ صدارت مسلم کانفرنس منعقدہ لاہور ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر اقبال فرماتے ہیں:۔

"میں یورپ کے پیش کردہ نیشنلزم کا مخالف ہوں اس لیے کہ مجھے اس تحریک میں مادیت اور الحاد کے جراثیم نظر آرہے ہیں، اور یہ جراثیم میرے نزدیک دور حاضر کی انسانیت کے لیے شدید ترین خطرات کا سرچشمہ ہیں۔ اگرچہ حب وطن ایک فطری امر ہے اور اس لیے انسان کی اخلاقی زندگی کا ایک جزو ہے، لیکن جو شی سب سے زیادہ ضروری ہے وہ انسان کا مذہب اور اس کا کلچر اور اس کی ملی روایات ہیں، یہی وہ چیزیں ہیں جن کے لیے انسانوں کو زندہ رہنا چاہیے اور جن کی خاطر انھیں اپنی جان قربان کرنی چاہیے۔ وہ خطۂ زمین جس میں وہ رہتا ہے اور جس کے ساتھ عارضی طور پر اس کی روح وابستہ ہوتی ہے اس لائق نہیں کہ اسے خدا اور مذہب سے برتر قرار دیا جائے۔"

دینی دعوت — ہندستان میں

از جناب حمید الدین خاں صاحب (اعظم گڑھ)

حصہ اوّل

اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ رسولوں کے ذریعہ ہم نے جو تعلیمات بھیجی ہیں ان سے دین کو سمجھو اور اسکی پیروی کرو (لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ ... فبھداھم اقتدہ) مگر رسولوں کی تاریخ سے جب ہم یہ متعین کرنا چاہتے ہیں کہ وہ دین اور وہ مطلوب الٰہی کیا ہے جس کی ہمیں پیروی کرنی ہے، تو ایک نہایت اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ رسولوں کی زندگی اس طرح سے کسی ایک چیز کا نام نہیں ہے جس طرح آج ہمارے لئے قرآن ایک واحد مجموعہ کی شکل میں موجود ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس اعتبار سے دو بڑے دوروں میں تقسیم ہے، ایک ہجرت سے پہلے اور دوسری ہجرت کے بعد۔ ہجرت سے پہلے آپ پر جس چیز کی وحی کی گئی ہے د دین کی بنیادی تعلیمات تھیں۔ اسی نوعیت کی تعلیمات دس بارہ سال تک بھیجی جاتی رہیں۔ اس دوران میں آپ کا کام یہ تھا کہ ان بنیادی چیزوں پر خود عمل کریں، اسی کی دعوت دیں اور ساتھیوں کو اسی کی تلقین کریں۔ اس کے بعد جب ہجرت ہوئی اور مسلمانوں کو "تمکین" حاصل ہوگئی تو سیاسی اور تمدنی نوعیت کے احکام نازل ہونے شروع ہوئے، گویا قبل از ہجرت رسول کے لئے دین جو معنی رکھتا ہے وہ اس سے مختلف تھا جو بعد از ہجرت آپ پر فرض ہ

یہ صورت حال اس وقت اور زیادہ غور طلب ہو جاتی ہے جب ہم دیگر انبیاء کو دیکھتے ہیں، کیونکہ
رف یہ کہ دین اور وحی کی یہی نوعیت ہر نبی کے یہاں ملتی ہے بلکہ کتنے نبی ایسے ہیں جن پر دین کا صرف
ائی حصہ اترا جو قبل از ہجرت آخری رسول پر نازل ہوا تھا۔ انبیاء میں سے جن بزرگوں نے صرف
لا دور پایا، ان پر بنیادی تعلیمات کے سوا اس قسم کا کوئی قانون سرے سے نازل نہیں ہوا جو
ر از تمکین قابل نفاذ ہوتا ہے۔ اور جن حضرات کی جدوجہد دوسرے مرحلہ تک پہنچی ان کو آخری
ول کی طرح اس دور سے متعلق اجتماعی اور سیاسی قوانین بھی دیے گئے۔

یہ تو خود نبی کی اپنی زندگی کے اعتبار سے اس کے دین کا فرق ہوا۔ اسی طرح مختلف انبیاء کی
ی حیثیت کے اعتبار سے ان کے دین میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ کیونکہ جہاں تک پہلی نوعیت
ے احکام —— دین کی بنیادی تعلیمات —— کا سوال ہے، وہ سب کے یہاں یکساں ہیں، وہ سب
رابر ایک ہی شکل میں اتری ہیں۔ مگر دوسری نوعیت کے احکام —— بنیادی تعلیمات کا عملی
انطباق —— میں مختلف انبیاء کی تعلیمات مختلف ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ پہلی نوعیت
کے احکام کے اعتبار سے تو ہم اس حکم کی تعمیل کر سکتے ہیں کہ "انبیاء کی پیروی کرو" کیونکہ اس قسم
کے احکام میں تمام انبیاء کی تعلیمات مشترک ہیں۔ مگر دوسری نوعیت کے احکام میں ان کی مشترک
پیروی ممکن نہیں ہے کیونکہ ان احکام پر ان کے درمیان کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمارے لئے یہ امر مشتبہ ہو گیا ہے کہ کسی مخصوص حالت کے بارے
میں آج حکم الٰہی کیا ہے۔ یہ مسئلہ صرف تعلیمات نبوت کی حکمت سمجھنے کے پہلو سے زیر بحث آتا ہے۔
نہ کہ کسی معاملۂ خاص میں حکم الٰہی کے تعین کے پہلو سے، کیونکہ یہ امر متفق علیہ ہے کہ آخری رسول
کی شریعت تمام سابقہ شریعتوں کی ناسخ ہے۔ مثال کے طور پر آج اگر ایک شخص جائداد چھوڑ کر مرے
تو اس کے ورثاء یہ کہنے کا حق نہیں رکھتے کہ ہم وراثت تقسیم نہیں کریں گے۔ کیونکہ کوئی ایسا واحد
قانونِ وراثت ہمارے پاس موجود نہیں ہے جس کی روشنی میں حقوق کا تعین کیا جا سکے، بلکہ
انھیں لازمی طور پر متروکہ جائداد کو شریعت محمدیہ کے مطابق تقسیم کرنا ہوگا۔

مگر اس اصول سے پوری طرح اتفاق کرتے ہوئے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے اوپر
احکام کی "تکلیف" آج بھی کیا اسی اعتبار سے ہے جس اعتبار سے وہ ابتداءً نازل ہوئے

یا صحیح تر الفاظ میں جس اعتبار سے انبیاء اور ان کے پیرودں کو ان احکام کا مکلف کیا گیا تھا۔
یا اب پورا قرآن نازل ہو جانے کے بعد صورت حال بدل گئی ہے اور اب حالات کے اعتبار سے ہمارے اوپر ان کا انطباق نہیں ہوگا جیسے کہ ابتدائً ہوا تھا، بلکہ اب ہم بیک وقت سارے احکام دین کے مکلف ہیں اور ان سب کے بارے میں ہمارے اوپر یہ فرض ہے کہ ایمان کا شعور ملتے ہی ان کی کامل تعمیل و نفاذ کی جدوجہد شروع کر دیں۔ اگر ہم پہلی صورت (تکلیف باعتبار حالات) کو مانیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم تعلیمات نبوت کے مندرجہ بالا دو قسموں کے درمیان اصل اور تفصیل کی نسبت مانتے ہیں اور اگر دوسری صورت کو صحیح سمجھیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تعلیمات نبوت کی ان دونوں قسموں کے درمیان ہم آغاز اور تکمیل کی نسبت قرار دے رہے ہیں۔

آغاز اور تکمیل کی نسبت ماننے کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں قسم کی تعلیمات یا ان دونوں ادوار کے درمیان وہی نسبت ہے جو پودے اور درخت کے درمیان ہوتی ہے۔ پودا ایک مکمل وجود کی صرف ابتدائی شکل ہے اور درخت بننے کے بعد ہی وہ اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ جو پودا صرف پودا بن کر رہ گیا، وہ گویا ناقص و ناتمام رہا اور جس نے اپنے آپ کو درخت تک پہنچایا وہ اپنی حالت کمال تک پہنچا۔

جہاں تک مجرد طور پر تنزیل احکام کا تعلق ہے، یہ کہنا صحیح ہے کہ احکام میں باعتبار نزول آغاز و تکمیل پائی جاتی ہے، مگر کسی بندے سے اللہ تعالیٰ کو جو کچھ مطلوب ہے اس کے اعتبار سے نسبت کی یہ تشریح صحیح نظر نہیں آتی۔

۱۔ آغاز اور تکمیل کی نسبت ماننے کا مطلب یہ ہوگا کہ بعض انبیاء کا دین بعض دیگر انبیاء کے مقابلے میں ناقص تھا، حالانکہ قرآن کی تصریح کے مطابق سب کے سب یکساں اور مکمل طور پر ہدایت یاب تھے۔ (کلا ھدینا و نوحا ھدینا)

۲۔ پھر اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آج امت مسلمہ حامل دین ہونے کی حیثیت سے ایک ایسی پوزیشن میں ہے جس پوزیشن میں کبھی کوئی نبی بھی نہیں تھا، کیونکہ انبیاء کو یا تو غیر کامل دین ملا تھا، یا اگر کسی کو کامل دین ملا تو وہ بھی اس کی عمر کے بالکل آخری حصہ میں۔ اور اس طرح اس کی زندگی کا بیشتر حصہ "ناقص" دین کے تحت گزر گیا، جب کہ آج ہم

آغاز کار ہی سے کامل دین کے حامل ہونے کا شرف رکھتے ہیں۔

۳۔ اس نسبت کو ماننے کی رو سے ہماری تکلیفِ شرعی یہ قرار پاتی ہے کہ ہم جہاں اور جس حال میں ہوں سارے نازل شدہ احکام دین کو ایک مکمل نظام زندگی کی حیثیت سے بروئے کار لانے کی تحریک چلائیں۔ حالانکہ قرآن و سنت سے کسی بھی نبی کے دعوتی کام کی یہ حیثیت ثابت نہیں ہوتی اور دورِ دعوت میں پورا دین نازل شدہ نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہو سکتی۔

ان وجوہ سے ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ دوسری نسبت اصل اور تفصیل کی نسبت ہی اس مسئلہ کی زیادہ صحیح تشریح ہے۔ اور اصل تفصیل کی نسبت کو ہم روح اور جسم کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ روح اپنی ذات میں مکمل وجود ہے۔ بلکہ وہی اصل ہے۔ اگرچہ مادی دنیا کے اندر اس کا ظہور ایک جسم کی شکل میں ہوتا ہے مگر جسم کا نہ ہونا یا جسم کے اجزاء میں کسی جزو کی عدم موجودگی بذات خود روح کو ناقص ثابت نہیں کرتی روح کے نقص کے اسباب اس کے اپنے اندر ہیں۔ وہ نیک کامل اور معیاری جسم میں رہتے ہوئے ناقص ہو سکتی ہے اور ایک بظاہر ناقص اور غیر مکمل جسم میں رہ کر کمال کے درجہ کو پہونچ سکتی ہے

اس نسبت کو ماننے کی صورت میں یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ کیوں تمام انبیاء پر اولاً اور بیشتر پر کلاً صرف پہلی نوعیت کے احکام اترے۔ کیونکہ اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ یہی ہے۔ بقیہ کی مطلوبیت حالات کے اعتبار سے ہے نہ کہ علی الاطلاق پھر یہ نسبت اس اشکال کو بھی رفع کر دیتی ہے جس کی وجہ سے بزرگانِ دین حتیٰ کہ انبیاء تک "ناقص" نظر آتے ہیں۔ کیونکہ جہاں تک مطلوب اصلی کا تعلق ہے وہ سب کو ملا اور سب نے اسے حاصل کیا۔ پھر اس میں ہمارے کام اور انبیاء کے کام کا فرق بھی ختم ہو جاتا ہے کیونکہ ایسی صورت میں ہمارے کام کا آغاز اصل دین کا اتباع اور اس کی دعوت قرار پاتا ہے، جیسا کہ انبیاء کے ساتھ ہوا۔ اور پھر حالات کے اعتبار سے ہم بقیہ اجزائے دین تک پہونچتے ہیں جیسے کہ انبیاء پہونچے۔

یہاں میں امام رازی کا ایک اقتباس نقل کروں گا جس میں انھوں نے انبیاء کی تعلیمات کے باہمی فرق کی توجیہ کرتے ہوئے اسی بات کو اصول و فروع کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

وردت ایات دالۃ علی عدم التباین　　　طریقۂ انبیاء کے سلسلے میں دو طرح کی آیتیں ہیں

او لم يكمل لهم قبل هذا اليوم ما كانوا محتاجين اليه من الشرائع كان ذلك تاخيرا للبيان عن وقت الحاجة وانه لا يجوز (الثالث) هو الذي ذكره القفال وهو المختار ان الدين ما كان ناقصا البتة بل كان ابدا كاملا يعني كانت الشرائع النازلة من عند الله في كل وقت كافية في ذلك الوقت الا انه تعالى كان عالما في اول وقت المبعث بان ما هو كامل في هذا اليوم ليس بكامل في الغد ولا صلاح فيه فلا جرم كان ينسخ بعد الثبوت وكان يزيد بعد العدم واما في آخر زمان المبعث فانزل الله شريعة كاملة وحكم ببقائها الى يوم القيامة فالشرع ابدا كان كاملا الا ان الاول كمال الى زمان مخصوص والثاني كمال الى يوم القيامة فلاجل هذا المعنى قال اليوم اكملت لكم دينكم

تفسیر کبیر جلد ثالث صفحہ ۵۲۹-۳۰

کہ تم محتاج تھے۔ اس کو میں نے مکمل طور پر تم کو بتا دیا۔ مگر یہ توجیہ بھی کمزور ہے کیونکہ نزول آیت سے پہلے اگر انھیں وہ شرائع مکمل طور پر نہیں بتائے گیے جن کے وہ محتاج تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی حاجت کے وقت ان کو بتایا نہیں گیا اور اس کے بیان میں تاخیر کی گئی حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ تیسرا جواب وہ ہے جس کو قفال نے ذکر کیا ہے اور یہی ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ وہ یہ کہ دین اس آیت کے نزول سے پہلے ناقص نہیں تھا بلکہ وہ ہمیشہ کامل تھا۔ یعنی اللہ کی طرف سے جس وقت جتنی شریعت نازل ہوئی وہ اس وقت کی حد تک بالکل کافی تھی۔ البتہ اللہ تعالیٰ کو ابتدائے بعثت ہی میں اس کا علم تھا کہ آج جو کامل ہے وہ کل کے لیے اور آئندہ حالات کی اصلاح کیلئے کامل نہیں ہے پس بلا شبہ وہ نازل شدہ حکم کو منسوخ کرتا تھا اور غیر نازل شدہ حکم کو نازل کرتا تھا۔ یہاں تک کہ بعثت کے آخری دور میں اللہ تعالیٰ نے کامل شریعت نازل فرمائی اور اسکو قیامت تک باقی رکھنے کا فیصلہ فرمایا۔ پس شریعت ہمیشہ کامل ہی تھی فرق یہ ہے کہ پہلے اسکا کامل ہونا ایک مخصوص زمانے کے اعتبار سے تھا اور بعد کا کمال قیامت تک کیلئے ہے پس اسی مفہوم کو بتا کر فرمایا کہ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے کامل کر دیا۔"

اس کا مطلب ہے کہ کسی وقت خاص میں کسی شخص یا قوم سے جو کچھ اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہو

اس وقت اس کیلئے دین کامل وہی ہے جو اس سے اس وقت مطلوب ہے۔ البتہ امکانی مطلوب یا ممکن الوقوع حالات کے اعتبار سے احکام کی مفروضیت کا جہاں تک تعلق ہے اسکے اعتبار سے قیامت تک کیلئے دین کامل اس پورے مجموعے کا نام ہے جو آخری طور پر نازل کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص حقیقی معنوں میں ایمان اور عمل صالح کی زندگی اختیار کرے تو اسکی اپنی حد تک اس کا دین کامل ہو گیا۔ اسکے بعد اگر ایسا ہو کہ صاحب نصاب نہ ہونے کی وجہ سے وہ سالانہ زکوٰۃ نہ نکال سکا عدالت میں سچی گواہی دینے کیلئے حاضر ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ وراثت تقسیم کرنے کا موقع اسے پیش نہیں آیا تو اس سے اس کے دین میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان احکام پر وہ صدق دل سے ایمان رکھتا ہے اور اس کیلئے بالکل آمادہ ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ اسے ایسے حالات میں لے جائیگا جب احکام بھی اس پر دار دہونے ہوں تو وہ پوری طرح ان کی تعمیل کرے گا۔

حصہ دوم

اب ہم یہ معلوم کرینگے کہ دین کی اصل کیا ہے اور اسکے وہ متعلقات کیا ہیں جو اصل کے اعتبار سے اس میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں جب ہم قرآن سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے یہ آیت ہمارے سامنے آتی ہے۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون 	میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔
ذاریات - ۵۶

اس آیت کے مطابق انسان خدا کا بندہ ہے اور خدا نے اس کو جس غرض کے لیے پیدا کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کی عبادت کرے: عبادت کے معنی ہیں اپنے آپ کو کسی کے آگے جھکانا اور پست کرنا (اصل العبودیۃ الخضوع والتذلل۔ لسان العرب) عبادت کا جو لغوی مفہوم ہے، وہی اس کا شرعی مدلول بھی ہے، ابو حیان اندلسی نے لکھا ہے کہ:۔

العبادۃ التذلل قالہ الجمھور 	عبادت کا مطلب پستی اور عاجزی ہے یہی جمہور کا قول ہے۔
البحر المحیط جلد اول صفحہ ۲۳

عبادت کا اصل مفہوم اگرچہ خضوع اور تذلل ہی ہے۔ مگر خدا کی نسبت سے جب یہ لفظ بولا جائے تو اس میں محبت کا تصور بھی شامل ہو جاتا ہے کیونکہ مومن کے لیے خدا کا تصور کسی ڈراؤنی چیز کا ہم معنی نہیں ہے بلکہ ایک انتہائی محبوب آقا کے سامنے اپنے عجز کا اظہار کرنا ہے اسی لیے عبادت کا مکمل تصور دینے کے لیے علماء ان دونوں چیزوں کو بیان کرتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

العبادة فی اللغة من الذلة یقال طریق معبد و بعیر معبد ای مذلل وفی الشرع عبارة عما یجمع کمال المحبة والخضوع والخوف	عبادت کے لغوی معنی پست ہونے کے ہیں۔ اسی سے طریق معبد اور بعیر معبد کہا جاتا ہے۔ اور شریعت میں اس سے مراد ایک ایسی چیز ہے جس میں انتہائی محبت کے ساتھ انتہائی خضوع اور خوف جمع ہو گیا ہو

تفسیر القرآن، جلد اول صفحہ ۲۵

ابن تیمیہ کے الفاظ یہ ہیں :-

لفظ العبودیة یتضمن کمال الذل وکمال الحب	عبودیت انتہائی عاجزی اور انتہائی محبت کے مجموعے کا نام ہے۔

رسالة العبودیة، صفحہ ۲۰

ابن قیم نے لکھا ہے :

العبادة تجمع اصلین : غایة الحب بغایة الذل والخضوع.	عبادت کے دو اجزاء ہیں۔ انتہائی محبت انتہائی عجز اور پستی کے ساتھ

تفسیر ابن قیم، صفحہ ۶۵

معلوم ہوا کہ عبادت کا مطلب اپنی حقیقت کے اعتبار سے خدا سے بے حد ڈرنا اور خدا سے بے حد محبت کرنا ہے۔ یہی ہماری زندگی کا اصل مقصد ہے۔ اس دنیا میں ہمارا بہترین حاصل یہ ہے کہ ہم خدا کو اپنے محبوب مالک کی حیثیت سے پالیں، ہم کو وہ دل عطا ہو جو خدا کی محبت اور اس کے خوف سے بھرا ہوا ہو، ہم کو وہ صبح و شام میسر آئیں جب ہم اشتیاق اور بے تابی کے ساتھ اپنے رب کی طرف لپک رہے ہوں، ہم کو وہ نظر ملے جو ہر چیز میں خدا کو دیکھے اور وہ ذہن ملے جو ہر واقعہ سے خدا کی یاد حاصل کرے ہم سب سے بڑھ کر اس کے اوپر اعتماد کریں، ہماری تمنائیں اور حوصلے اس کے لیے وقف ہوں ہماری زندگی ہمہ تن اس کی طرف لگی ہوئی ہو، خدا ہمارا سب کچھ بن جائے۔

یہی دین کی اصل حقیقت ہے اور یہی ہمارے رب کو اصلاً ہم سے مطلوب ہے، لیکن جس طرح انسان اصل حقیقت کے اعتبار سے "روح" ہونے کے باوجود خارجی طور پر اپنا ایک "جسم" رکھتا ہے، اسی طرح دین کا بھی ایک مظہر اور اس کا ایک ڈھانچہ ہے۔ اسی ڈھانچہ کا نام شریعت ہے ـــــ جس طرح جسم

کے بغیر اس مادی دنیا میں "انسان" کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اس ڈھانچے کے بغیر اسلامی حقیقت بھی کہیں پائی نہیں جا سکتی۔ شریعت اسلام کے ساتھ اسی طرح لازمی ہے جس طرح روح کے ساتھ جسم۔ یہ دراصل جوارح کے اوپر اس خدا کو طاری کرنا ہے جس کو کیفیت کے طور پر ہم نے اپنے دل پر طاری کیا ہے۔ یہ اپنے محبوب آقا کے آگے جھکنا اور اسکی عملی اطاعت کرنا ہے۔ اور جب تک دونوں چیزیں نہ پائی جائیں اسلام کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں :-

لا یخفی ان تخصیص العبادۃ بہ تعالیٰ	عبادت کو اللہ کے لیے خالص کرنا اس وقت
لا یتحقق الا بتخصیص الطاعۃ ایضا	تک متحقق نہیں ہوتا جب تک اطاعت کو بھی اللہ
بہ تعالیٰ ومتی لم یخص بہ جل	کیلئے خاص نہ کر دیا جائے جبتک اطاعت خدا
شانہ لم تخص العبادۃ بہ	کیلئے خاص نہ کی جائے اس وقت تک گویا عبادت
سبحانہ	بھی خدا کیلئے خاص نہیں ہوئی۔

روح المعانی جلد ۱۰ صفحہ ۷۶-۷۵

عبادت کا لفظ اگرچہ ایک لحاظ سے بہت وسیع ہے کیونکہ اس کے اندر ہر وہ کام داخل ہے جسکی غرض خدا کی خوشنودی ہو، خواہ وہ عقیدہ سے متعلق ہو یا عمل سے مگر احکام کے نوعی فرق کو سمجھنے کے لیے فقہاء اسکو متعین مفہوم میں لیتے ہیں عقیدہ یا دوسرے لفظوں میں اللہ سے صحیح ذہنی اور قلبی تعلق پیدا ہو جانے کے بعد ہم سے جو کچھ مطلوب ہے، وہ فقہا کی تقسیم کے مطابق تین ہے۔ عبادت، اخلاق، معاملات اس تقسیم میں عبادت سے مراد پرستش ہے یعنی وہ مخصوص اعمال جن کو انسان خدا کی عظمت اور کبریائی کے اعتراف میں اس کے سامنے بجا لاتا ہے مثلاً نماز روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی دعا اور ذکر وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں بذات خود بھی عبادت ہیں اور اخلاق سے مراد بندوں کے ساتھ الفت محبت نیکی اور بھلائی کا وہ برتاؤ ہے جس کی اسلام نے تلقین کی ہے اور معاملات سے مراد لوگوں کے ساتھ تعلقات اور کاروبار میں قانون الٰہی کی پابندی اور زندگی کی سرگرمیوں میں اللہ کی مقرر کردہ حدود کی تعمیل ہے۔

جہانتک پرستش اور اخلاق سے متعلق چیزوں کا تعلق ہے وہ نہایت واضح ہیں البتہ آخری جزو کی کسی قدر تفصیل مناسب ہوگی۔

"معاملات" کا لفظ جن احکام کے مجموعے کے لیے بولا جاتا ہے اس کے دو حصے ہیں، ایک انفرادی احکام اور دوسرے اجتماعی احکام۔ انفرادی احکام سے مراد وہ احکام ہیں جن کی تعمیل یا عدم تعمیل کا انحصار ایک شخص کی مرضی پر ہوتا ہے۔ یہ احکام ہر شخص سے ہر حال میں لازماً مطلوب ہیں اور "وسع" کے ہوتے ہوئے وہ کبھی ساقط نہیں ہوتے۔ مگر اجتماعی احکام کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیونکہ ان کی تعمیل کسی ایک شخص کی مرضی پر منحصر نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اسی وقت روبعمل آتے ہیں جب پورا معاشرہ ان کو عمل میں لانے کے لیے تیار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ احکام ہمیشہ اس وقت نازل ہوئے جب اہل ایمان اس پوزیشن میں ہو گئے تھے کہ وہ ان کو اپنے درمیان بزور نافذ کر سکیں۔ گویا ——— دین کے اجتماعی تقاضے مطلقاً شروع نہیں ہیں بلکہ حالات کی نسبت سے شروع ہوتے ہیں۔ اہل ایمان کا دائرہ جس نسبت سے پھیلتا ہے اسی نسبت سے دین کے تقاضے بھی بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جب تنہا ایک شخص مومن ہو تو اس پر احکام کا اتنا ہی حصہ فرض ہوگا جتنا اس کی ذات سے متعلق ہے، جب اہل ایمان ایک یا چند خاندان کی صورت اختیار کر لیں تو یہ خاندان اپنے دائرہ کے لحاظ سے اس کے مخاطب ہوں گے، اور جب اہل ایمان کا کوئی گروہ ایک با اختیار معاشرہ کی حیثیت حاصل کرلے تو اس وقت پورے معاشرے کا فرض ہوگا کہ ——— خدا کی طرف سے اس کے اجتماعی معاملات کے لیے جتنے بھی احکام دیئے گئے ہیں۔ وہ ان سب کی مکمل پابندی اختیار کرے۔

اور چونکہ معاشرہ کے پیمانہ پر عمل اقتدار کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جب اہل ایمان کا کوئی معاشرہ اس حکم کا مخاطب ہو تو لازمی طور پر یہ مفہوم بھی اس میں شامل ہوگا کہ وہ اپنے اوپر ایک سیاسی امیر مقرر کریں اور اس کے ماتحت اجتماعی زندگی بنا کر تمام شرعی قوانین کا اجراء عمل میں میں لائیں۔ کیونکہ:-

مالا یتم الواجب الا بہ فھو واجبٌ — وہ چیز جس کے بغیر واجب کی ادائیگی مکمل نہ ہو وہ خود واجب ہو جاتی ہے۔

نصب امامت کا مسئلہ اسی آخری صورت حال سے متعلق ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ فقہاء اس بحث کو دارالاسلام کی بحث کے تحت اٹھاتے ہیں۔

حصہ سوم

اس وضاحت کے بعد یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ہندستان کے موجودہ حالات میں دینی دعوت کے تحت ہمیں کیا کام کرنا ہے۔ یہ خاص طور پر چار کام ہیں جن کو مندرجہ ذیل طریقے سے بیان کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ مسلمانوں میں حقیقت دین پیدا کرنا اور انکو صحیح معنوں میں خدا کا عابد اور پرستار بنانا۔

۲۔ ان اخلاق و اعمال کو اپنی زندگی میں شامل کرنے پر ابھارنا جن کے وہ اپنے حالات کے لحاظ سے مکلف ہیں۔

۳۔ غیر مسلموں کے حلقہ میں اسلام کا تعارف

۴۔ مسلمانوں کے اندر باہمی تنظیم اور اجتماعیت پیدا کرنے کی کوشش۔

جہاں تک پہلی شق کا تعلق ہے وہ بالکل واضح ہے۔ ظاہر ہے کہ جب دین کا اصل اور اولیں کام یہ ہے کہ بندے اپنے خدا سے تعلق پیدا کریں اور اس کے عابد اور پرستار بن جائیں تو دینی دعوت کے پروگرام کا اولیں جزء بھی یہی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں میں اس دینی حقیقت کو اپنی پوری کیفیات کے ساتھ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسی طرح دوسرا جزء بھی نہایت واضح ہے کیونکہ مسلمان خلا میں نہیں ہیں بلکہ کچھ انسانوں کے درمیان ہیں۔ اور بہر حال ان سے تعلق قائم کرنے پر مجبور ہیں۔ اسی انسانی تعلق کو ــــ خواہ وہ مسلمانوں سے ہو یا غیر مسلموں سے ــــ صحیح طور پر نبھانے کا نام اسلامی اخلاق ہے۔ اسی طرح دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے انھیں خاندان اور سماج کے دائرے میں بہت سے عمل کرنے ہوتے ہیں۔ ایک لقمہ جو کسی مسلمان کے حلق کے نیچے اترتا ہے اور کپڑے کا ایک ٹکڑا جو اس کے بدن پر نظر آتا ہے۔ وہ درجنوں سماجی تعلقات سے گزرنے کے بعد اسے حاصل ہوتا ہے۔ ان تمام مواقع پر مسلمان عین اپنے ایمانی جذبے کے تحت مجبور ہے کہ وہ "عمل صالح" کا رویہ اختیار کرے۔ تیسری شق میں بھی کوئی ابہام نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارا یہ یقین کہ اسلام ہی نجات کا واحد ذریعہ ہے اور ہمارا یہ شاہدہ کہ دنیا میں بہت سے لوگ اس راہ نجات سے محروم رہ کر تیزی سے تباہی کے راستے پر بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ یہ

دونوں چیزیں مل کر ہمارے اس فرض کو متعین کر دیتی ہیں کہ ہم ان بھٹکے ہوئے بندگان خدا کو نجات کے راستہ پر لانے کی جدوجہد کریں۔ پھر ہمارا یہ ایمان کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نبوت ختم ہو گئی ہمارے اس احساس میں شرعی ذمہ داری کا عنصر پیدا کر دیتا ہے کیونکہ نبوت کو ختم ماننے کا لازمی تقاضا ہے کہ نبوت کو ماننے والے اب اس کام کو انجام دیں جس کے لیے پہلے انبیاء تشریف لاتے تھے اور جو بدستور ابھی کرنے کے لیے باقی ہے

اب چوتھی شئی رہ جاتی ہے یعنی اجتماعی تنظیم۔ یہ کام اگرچہ براہ راست اخروی قدروں سے متعلق نہیں ہے مگر اس حیثیت سے وہ بالواسطہ طور پر اس سے متعلق ہو جاتا ہے کہ دنیوی زندگی کے جس لازمی راستہ سے گزر کر اسے آخرت کی منزل کی طرف سفر کرنا ہے وہ ایک ایسی دنیا ہے جو مختلف اعتبارات سے اجتماعیت کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ اجتماعیت کے بغیر آدمی نہ تو زندہ رہ سکتا اور نہ کوئی عمل صحیح طور پر انجام دے سکتا۔ خدا سے تعلق اور اس کی عبادت اگر ہمارا فریضہ ہے تو اجتماعیت اس فریضہ کے لازمی معاون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لیے حدیث میں حکم ہے کہ تین مسلمان بھی اگر کہیں موجود ہوں تو وہ باہم مل کر اپنا ایک امیر بنا لیں۔ اور قرآن میں صریح الفاظ میں یہ حکم دیا گیا ہے:۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا — اللہ کی رسی میں سب سب بندہ جاؤ

ولا تفرقوا (آل عمران — ۱۰۳) — اور متفرق مت ہو۔

تنظیم کیسی ہو اس کا تعین حالات کے اعتبار سے ہوتا ہے، ہجرت سے پہلے مکہ اور مدینہ میں جو حالات تھے وہ صرف ایک ہلکی قسم کی غیر سیاسی اجتماعیت کا تحمل کر سکتے تھے چنانچہ اس وقت اسی قسم کی تنظیم اختیار کی گئی۔ مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اس اجتماعیت و تنظیم کا مرکز تھی۔ اسی طرح مدینہ میں جب ہجرت سے پہلے کچھ لوگ ایمان لائے تو ان کے درمیان آپ نے بارہ آدمیوں کو بطور نقیب مقرر کیا اور ان سے فرمایا:۔

انتم کفلاء علی قومکم — تم اپنی قوم کی دینی نگرانی کے ذمہ دار ہو

اس کے بعد ہجرت ہوئی اور اسلام نے سیاسی استحکام حاصل کر لیا تو باقاعدہ سیاسی تنظیم قائم ہو گئی۔ جس کے سربراہ اپنی زندگی میں جناب رسالت مآب تھے اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء

راشدین۔

ہندستان کے موجودہ حالات میں جس نوعیت کی تنظیم مسلمین ہمارا فریضہ ہے، وہ ایک غیر سیاسی تنظیم ہے اور اس کا مقصد مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے

داقامت جمعہ در دارالحرب اگر از طرف	اگر کفار کی طرف سے (با ختیار) مسلمان
کفار والی مسلمانان در مکانے منصوب	والی دارالحرب کے کسی مقام میں مقرر ہو
باشد باذن او درست است۔ والا مسلمانان	تو اس والی مسلم کی اجازت سے جمعہ قائم
را باید کہ یک کس را کہ امین و متدین باشد	کرنا درست ہے۔ ورنہ مسلمانوں کو چاہیے
رئیس قرار دہند کہ باجازت وحضور او اقامت	کہ ایک امین اور دیندار شخص کو خود ہی
جمعہ واعیاد وانکاح من لاولی من الصغار	امیر مقرر کرلیں اور اس کے حکم سے جمعہ و عید
وحفظ مال غائب وایتام وقسمت ترکات	کی نماز قائم ہو جن نابالغوں کا کوئی ولی
متنازع فیہا علی حسب السہام می نمودہ	نہ ہو ان کا نکاح پڑھایا جائے اور یتیموں اور
باشد بے آنکہ در امور ملکی تصرف کند و	غائب ہو جانے والوں کے مال کی حفاظت
مداخلت نماید۔	کی جائے اور موافق حصص شرعیہ ترکات
فتاوی عزیزی جلد اول صفحہ ۴۲	کی تقسیم کی جائے جس میں نزاع ہو۔ ملکی معاملات
	میں تصرف و مداخلت کے بغیر۔

اور چند سطروں میں ہندستان کے مسلمانوں کے کرنے کا جو کام میں نے بتایا ہے یہی اس طبقہ کے مسلمانوں کی دینی ذمے داریوں کے بارے میں ہمیشہ سے تصور رہا ہے پچھلی پوری تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمان جہاں بھی کسی ایسے علاقہ میں جا کر آباد ہوئے ہیں جو غیر مسلم اقتدار کے ماتحت تھا، وہاں ان کا طریق عمل یہی رہا ہے۔ اولاً ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ خود ایمان اور عمل صالح کی زندگی گزاریں وہ خدا کے سچے عابد اور مطیع بن جائیں، اسی کے ساتھ وہ اس دیس کی آبادی کو ایمان واسلام کی دعوت دینا شروع کرتے تھے وہ انھیں جہنم کے راستے سے ہٹا کر جنت کے راستہ پر لانے کے لیے اپنی ساری قوت لگا دیتے تھے، اور تیسرا کام وہ یہ کرتے تھے کہ اپنے دائرہ میں اپنی ایک تنظیم بنا لیتے تھے اور ایک امیر کے تحت اپنے شرعی

فرائض ادا کرتے تھے۔

جہاں تک اس لائحہ عمل کی ابتدائی شقوں کا تعلق ہے، وہ بالکل واضح تھا۔ ان مسلمانوں کے حالات اور ان کی تبلیغی کوششوں کے بارے میں کوئی بھی کتاب دیکھ کر آدمی معلوم کر سکتا ہے کہ وہ اپنی اسلامی ذمے داریوں کو کیسے ادا کرتے تھے اور ان کے دعوت و تبلیغ کا انداز کیا ہوتا تھا۔ اس لیے ان کے بارے میں نظائر پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ البتہ آخری شق کے بارے میں میں چند حوالے نقل کروں گا۔

چھٹی صدی ہجری میں جب کافر تاتاریوں نے ایران و خراسان و ترکستان و عراق پر قبضہ کر لیا تو علمائے وقت نے اس سے مسلمان والی کا مطالبہ پیش کیا[1]۔ مالابار میں جب مسلمان آکر آباد ہوئے تو وہاں انھوں نے باقاعدہ اپنا ایک نظام قضا قائم کیا جس کی تفصیل تحفۃ المجاہدین میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد بھی ہندوستان میں سلاطین کے عہد میں "صدر جہاں" کے نام سے اس قسم کا عہدہ قائم تھا جس کے تحت تمام قضاۃ و محتسب و ائمہ ہوتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم تک فلپائن، آسٹریلیا، ہنگری، بلگریا، زیگوسلاویہ، یونان اور پولینڈ کے مسلمانوں کے تمام قومی اور مذہبی صیغے ایک مفتی اعظم کے ماتحت ہوتے تھے۔ اور وہ ایک تنظیمی وحدت کے تحت اسلامی زندگی گزارتے تھے۔ اسی طرح مسلمان تجارتی ضرورتوں اور دوسرے اسباب سے جن غیر اسلامی سلطنتوں میں گئے اور وہاں سکونت اختیار کی، وہاں انھوں نے اپنی اسلامی تنظیم بھی قائم کی۔

تیسری صدی ہجری میں مسلمان تاجروں کی نو آبادی چین کے شہر خانفو میں تھی۔ مگر وہ کس طرح رہتے تھے اور ان کے احکام و معاملات کیونکر فیصل پاتے تھے۔ سلیمان تاجر اپنے تیسری صدی ہجری کے سفرنامہ میں لکھتا ہے۔

ان بخانفو وھو مجمع التجار   شہر خانفو (چین) میں، جو مسلمان تاجروں

---

[1] ہندوستان میں نظام قضا قائم کرنے یا امور مسلمین کے تحفظ کے لیے اگر اسمبلیوں سے مدد ملنے کی امید ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ ان مقاصد کیلئے اسمبلی اور پارلیمنٹ میں جانا بالکل جائز ہے۔ اور چھٹی صدی کا یہ واقعہ اس سلسلہ میں ہمارے لیے قطعی نظیر کی حیثیت رکھتا ہے اسمبلی میں امور مسلمین کیلئے کام کرانا ایسا ہی ہے جیسے کافر تاتاری حکومت سے مسلمان والی کے تقرر کا مطالبہ کرنا۔

عربی	ترجمہ
رجلا مسلما یولیہ صاحب الصین	کا مرکز ہے، ایک مسلمان ہے جس کو شاہ چین ان
الحکم بین المسلمین الذین یقصدون	مسلمانوں کے درمیان فصل احکام کے لیے
الی تلک الناحیۃ وان التجار العراقیین	مقرر کرتا ہے جو اس ملک میں جاتے ہیں۔
لا ینکرون من ولایتہ شیئا فی	اور عراقی تاجر اس کی ولایت کے احکام
احکامہ وعملہ بالحق وبما فی کتاب	اور حق کے ساتھ اور کتاب الٰہی اور احکام
اللہ عز وجل واحکام الاسلام	اسلامی کی تحت اسکے جاری کردہ حکموں سے سرتابی نہیں کرتے

عراقیوں کی فارسی زبان میں اس مسلمان ظلی یا قاضی کا نام ہنرمند تھا جو عام استعمال میں ہنرمن بولا جاتا تھا۔ خود ہندستان کے مختلف ساحلی شہروں میں جہاں جہاں مسلمان آبادیاں تھیں، یہ ہنرمند غیر اسلامی سلطنتوں میں اسلامی تنظیم دقضا کے ذمہ دار نظر آتے ہیں۔

چوتھی صدی ہجری کے جہازراں بزرگ بن شہریار اپنے سفرنامہ عجائب الہند میں صیمور (مدراس کے قریب) میں عباس بن ماہان سیرافی ہنرمند کا تذکرہ کرتا ہے۔

عربی	ترجمہ
انہ کان بصیمور رجل من اہل	صیمور میں سیراف کا ایک شخص تھا جس کو عباس
سیراف یقال لہ العباس بن ماہان	بن ماہان کہتے تھے۔ اور جو وہاں مسلمانوں
وکان ہنرمن المسلمین بصیمور ذو جاہ	کا ہنرمند تھا اور شہر کا ذی وجاہت اور وہاں
البلد والمنضوی الیہ من المسلمین	کے پناہ گزیں مسلمانوں کا مرکز تھا۔

وہاں کا راجہ مسلمانوں کے متعلق اسی کے فتویٰ پر فیصلہ کرتا تھا۔ اسی مقام میں ۳۰۴ھ میں مشہور سیاح مسعودی پہونچا ہے وہ کہتا ہے:

عربی	ترجمہ
علی الہنرمنۃ یومئذ ابو سعید معروف	ہنرمندی کے منصب پر ان دنوں ابو سعید
بن زکریا والہنرمنۃ یراد بہ	معروف بن زکریا تھا اور ہنرمند سے مراد رئیس
رئیس المسلمین وذالک ان الملک	المسلمین ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ راجہ
یملک علی المسلمین رجلا من رؤسائھم	مسلمانوں پر انکے رئیسوں میں سے ایک کو افسر بنا دیتا
تکون احکامھم مصروفۃ الیہ۔	ہے مسلمانوں کے تمام مقدمات واحکام اسی کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اقلیت کے علاقے میں اسلامی زندگی کی آخری صورت بس یہی ہے کہ کفار کی ماتحتی میں مسلمان حسب استطاعت بس ملک امکانی زندگی گزارتے رہیں بلکہ اس کی غرض صرف یہ بتانا ہے کہ غیر مسلم اقتدار کے تحت ہم اپنی شرعی ذمہ داریوں کا کیا تصور قائم کریں اور اپنی اسلامی جدوجہد کا آغاز کہاں سے کریں تاکہ ایک طرف ہم خدا کے حضور بری الذمہ ٹھہریں اور دوسری طرف خدا کی اس نصرت و معیت کے مستحق قرار پا سکیں جس سے دنیا میں مزید انعامات کی راہیں کھلتی ہیں اور اہل ایمان کے سارے کام بنا دیئے جاتے ہیں۔

جہاں تک غیر اسلامی اقتدار میں تغیر کیلئے جدوجہد کا سوال ہے۔ یہ مسلم علاقے میں تو فرض علی الکفایہ کے درجہ میں مطلوب ہے، مگر غیر مسلم علاقے میں اس کی یہ نوعیت نہیں ہے۔ غیر مسلم علاقے میں شرعی نصب العین کے طور پر ہمارا یہ فریضہ نہیں ہے کہ وہاں ہم لازمی طور پر اسلامی حکومت برپا کرنے کی جدوجہد کریں۔ مگر شرعی فریضہ نہ ہونے کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ حکومت و اقتدار ہر فکر اور ہر عقیدہ کے لیے ایک اہم ترین عنصر ہے۔ حکومت کا مسلمان ہونا ہر پہلو سے دین اور اہل دین کے لیے اپنے اندر بے شمار فوائد رکھتا ہے اور اس اعتبار سے وہ یقینی طور پر اہل ایمان کی ایک پسندیدہ چیز (آخری تجبوبھا) ہے۔ اور اگر حالات اور مواقع موجود ہوں تو یقیناً یہ جدوجہد بھی ہونی چاہیئے کہ اقتدار بدلے اور اسلامی نظام حکومت کا قیام عمل میں آئے۔ اس طرح کی مہم میں حصہ لینا عین جہاد ہے اور اس کی راہ میں جان قربان کرنا یقینی طور پر شہادت کا درجہ پاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں مسلم علاقے میں اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد کا مسئلہ ایک نظریاتی مسئلہ ہے یعنی وہ عقیدے کے براہ راست تقاضے کے طور پر پیدا ہوتا ہے جبکہ غیر مسلم علاقے میں اسلامی اقتدار لانے کی کوشش ایک عملی سوال ہے جس کا شامل پروگرام ہونا حالات پر موقوف ہے نہ کہ عقیدے اور نظریے پر۔

حصہ چہارم

اس تحریر کے آخری حصہ میں مجھے طریق کار کے بارے میں اپنی معروضات پیش کرنی ہیں۔ مگر فی الحال میں اس سلسلے میں کوئی متعین خاکہ نہیں پیش کروں گا، بلکہ صرف

چند اصولی باتوں پر اکتفا کروں گا۔ آئندہ حسب ضرورت تفصیلی پروگرام بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ طریق کار کے سلسلے میں سب سے پہلے یہ اصولی بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ کوئی بھی طریق کار اس طرح حقیقی نہیں ہوتا جیسے کہ اصل دعوت حقیقی ہوتی ہے۔ طریق کار قطعی طور پر ایک اضافی اور اجتہادی چیز ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ مختلف حالات میں اس کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں، بلکہ ایک ہی ماحول میں اجتہاد کے اختلاف کی بنا پر اس کے ایک سے زیادہ خاکے سوچے جا سکتے ہیں۔ طریق کار دراصل نام ہے اس بات کا کہ انسان کی نفسیات، کسی وقت کے مخصوص طرز فکر اور زمانے کے سماجی اور سیاسی حالات کے سہ طرفہ تقاضوں کے درمیان دعوت کا ایک ہم آہنگ انطباق تلاش کیا جائے۔ اس میں کچھ اجزاء دائمی ہوتے ہیں اور کچھ وقتی ضرورت کے تحت پیدا ہوتے ہیں کچھ پرانی شکلیں ہوتی ہیں اور کچھ نئی شکلیں اختیار کی جاتی ہیں۔ یہ ایک نہایت نازک ترکیب ہے جو حکمت، دینی بصیرت اور وقت کے علم کے تحت وجود میں آتی ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ ایک طریق کار اگر کچھ دنوں کے تجربے سے بعض یا چند پہلوؤں سے کامیاب نظر آنے لگے، تو اس کا مطلب یہ لینا چاہیے کہ وہ علی الاطلاق ایک کامیاب طریق کار ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ہر دور اگرچہ بعض ابھری ہوئی خصوصیات کے اعتبار سے ایک خاص قسم کا دور شمار کیا جاتا ہے مگر اسی کے ساتھ ہر دور میں ہر طرح کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو بھی کام شروع کیا جائے وہ اگر کچھ دنوں تک جاری رکھا جائے تو اپنے مزاج کے مطابق انسانوں کی ایک تعداد کو متوجہ کر لیتا ہے۔ اس طرح ہر تحریک کو کروڑوں انسانوں میں سے ہزاروں انسان مل جاتے ہیں۔ اور ہوتے ہوتے کروڑوں انسانوں کے سمندر میں کچھ ہزار انسانوں کا ایک جزیرہ بن جاتا ہے یہ جزیرہ پریس، اجتماعات، ملاقاتیں، خط و کتابت، تحفے اور چندے وغیرہ کے ذریعہ اپنا ایک حدود اربعہ بنا لیتا ہے، جن کے درمیان خیالات، ملاقات اور وسائل و ذرائع کے تبادلے ہوتے رہتے ہیں، اب جو لوگ اس حدود اربعہ میں بستے ہیں، وہ چونکہ عملاً کسی دوسرے طریق کار کے مقابلے میں اپنے حلقے کے طریقہ کا زیادہ تجربہ کر رہے ہوتے ہیں، نیز اپنے مخصوص مزاج کی بنا پر ان نتائج کو کل نتیجہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جو ان کے مخصوص عمل سے وجود میں آیا ہے۔ اس لیے وہ ایک طرح کے مصنوعی یقین میں مبتلا ہو کر یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ان کا طریق کار سب سے

زیادہ کامیاب اور صحیح طریق کار ہے۔ وہ اپنی جگہ پر برسر حق ہونے کے باوجود ایک ایسی غلطی کے مرتکب ہو جاتے ہیں جس کو نہ خارجی دنیا کی تصدیق حاصل ہوتی ہے اور نہ علمی تجزیہ اس کو تسلیم کرتا ہے۔

۳۔ پھر اس سلسلے میں یہ اہم بات بھی جان لینی چاہیئے کہ طریق کار اور تصورِ دعوت کے درمیان کوئی عینی نوعیت کا تعلق نہیں ہے یعنی طریق کار کسی دعوت کی یکساں تکرار کا نام نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ قانونی الفاظ کی طرح کوئی مقررہ ڈگر ہے جس کو آنکھ بند کر کے بس ایک متعین شکل میں دہراتے رہنا ہے۔ دعوت اپنی علمی اور منطقی تشریح میں بلاشبہ ایک متعین چیز نظر آتی ہے مگر عمل میں آنے کے بعد وہ اسی طرح غیر متعین چیز بن جاتی ہے جیسے پانی لیبارٹری کے آزمائشی گلاس میں تو ایک ساکن چیز ہے مگر دریا میں پہنچ کر وہ موج اور طوفان بن جاتا ہے دعوت کی منطقی تشریح اس لیے کی جاتی ہے کہ اس کے بارے میں صحیح علمی تصور قائم ہو، صحیح ذہن بنیں اور نفسیات کی صحیح نشو ونما ہو۔ مگر عملی زندگی اس قسم کی یکسانیت کی متحمل نہیں ہو سکتی اس لیے بار بار ایسا ہوتا ہے کہ عملی نقشے بدل جاتے ہیں، اگرچہ ذہن کا نقشہ پھر بھی اپنی اصل شکل میں باقی رہتا ہے۔

اس کی ایک واضح مثال تبدیلی اقتدار کا مسئلہ ہے۔ اقتدار کی تبدیلی دین کی حکیمانہ تشریح میں جس مقام پر نظر آتی ہے عملی زندگی میں ہمیشہ بعینہٖ اسی مقام پر نہیں رہتی۔ ذہن کی حد تک تو بہر حال ضروری ہے کہ وہ اپنے واقعی مقام سے کبھی تجاوز نہ کرے۔ مگر عملی اعتبار سے صورت حال مختلف ہے کیونکہ اقتدار کو مسلم بنانے کا یہی ایک پہلو نہیں ہے کہ بعض حالات میں یہ مسلمانوں کا شرعی فریضہ بن جاتا ہے۔ بلکہ وہ سماج کا سب سے طاقتور ادارہ ہونے کی وجہ سے ہر قوم کی ایک ضرورت ہے۔ کسی بھی فکر یا عمل کا اس سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس لیے قانونی طور پر تبدیلی اقتدار کا مکلف نہ ہونے کی صورت میں بھی حکومت' اہل ایمان کی ایک پسندیدہ آرزو (آخری تعبوتھا) اور حالات اگر پائے جائیں تو قانونی حیثیت سے قطع نظر یقیناً اس کے لیے کوشش کی جائے گی اور اس وقت یہ کوشش اعلیٰ ترین ثواب کا کام ہوگا۔

۴۔ ہر شخص کی طرح میرے ساتھ بھی کئی بار ایسا اتفاق ہوا ہے کہ ٹرین کا سفر ایک ایسے موسم میں کرنا پڑا جبکہ غیر مسلموں کا کوئی مذہبی میلا چل رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بے شمار مخلوق ریل کے

ڈبوں میں آکر اس طرح بھر گئی ہے کہ وہاں اتنی بھی جگہ نہیں ہے کہ وہ اپنے سر کی گٹھری کو سر سے اتار کر کہیں رکھ سکے۔ وہ زبردست بھیڑ کے درمیان اس طرح دبا ہوا کھڑا ہے کہ وہ خود گاڑی پر سوار ہے اور اس کی گٹھری اس پر سوار۔

"وہ کیا چیز ہے جو ان بے شمار انسانوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے" ——— ہر بار مجھے یہی جواب ملا کہ کوئی حقیقی چیز ایسی نہیں ہے جو اس عظیم حرکت کے پیچھے موجود ہو۔ اس کا محرک صرف روایت ہے نہ کہ حقیقت۔ تاریخی روایات نے بعض چیزوں کی اہمیت اس طرح ان کے ذہن میں بٹھا دی ہے کہ دلیل اور منطق کے فقدان کے باوجود وہ اس کو ماننے پر مجبور ہیں۔

یہی صورت دینی دعوت میں بھی ممکن ہے۔ ہمارے یہاں کچھ ایسے طریقے ہو سکتے ہیں۔ جن کے پیچھے اگرچہ منطق اور دلیل کی طاقت زیادہ موجود نہ ہو۔ مگر وہ اسلاف سے چلے آرہے ہوں اور اس طرح روایت کا وزن پوری طرح ان کے حق میں جمع ہو گیا ہو ——— اب اگر کوئی دینی دعوت اس روایتی غلاف میں ملفوف ہو کر لوگوں کے سامنے آتی ہے تو قدرتی طور پر بے شمار ایسے لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے جو ان روایات کے سائے میں پلے اور بڑھے ہیں۔ اس طرح بہت جلد عوام کی ایک بھیڑ اس دینی دعوت کے گرد اکٹھا ہو جائے گی مگر اس رجوع کو لازمی طور پر اصل دعوت کی کامیابی نہ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ اگر روایتی غلاف موجود نہ ہوتا تو صورت حال مختلف نظر آتی۔

یہ چند باتیں صرف طریق کار کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے عرض کر دی گئی ہیں۔ باقی موجودہ حالات میں طریق کار کا تفصیلی نقشہ کیا ہو۔ یہ مندرجہ بالا وضاحتوں کے بعد کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں رہتا۔ اور بوقت ضرورت اس کا خاکہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

مفید علمی، فقہی اور تاریخی کتابیں

رحمۃ للعالمین مکمل غیر مجلد دو جلدوں میں =/۳۰
از:- قاضی سلیمان منصور پوری

رسول اللہ کی سیاسی زندگی از:- ڈاکٹر حمید اللہ
=/۸

حضرت ابوبکر و فاروق اعظم از:- ڈاکٹر طٰہٰ حسین (رحلیہ)
دونوں ایک جلد میں ۶/۷۵

تاریخ الخلفاء رح از:- علامہ سیوطی مترجمہ اقبال احمد۔
خلفائے راشدین سے مصر کے فاطمی خلفاء تک کے دور کے مکمل تاریخ۔ قیمت =/۱۲

حیاۃ الصحابہ (اردو) حضرت مولانا محمد یوسف دہلوی کی مشہور تالیف کا ترجمہ۔
حصہ اول ۲/۷۵ حصہ دوم ۳.۵ سوم ۲/۷۵

ائمہ اربعہ رح از:- رئیس احمد جعفری
چاروں اماموں کے سوانح حیات اور اجتہادی خدمات۔ مجلد =/۱۰

تذکرۂ امام غزالی مختصر سوانح حیات
مجلد =/۲

حیات امام ابن القیم بالکل نئی اور بلند پایہ کتاب قاہرہ یونیورسٹی کے استاذ عبد العظیم کے قلم سے۔ مترجمہ سید رشید احمد ارشد =/۱۲

فقہ الاسلام از:- حسن احمد الخطیب۔ مترجمہ ایضاً ارشد صاحب۔
فقہ اسلامی کی تاریخ کا عہد بہ عہد جائزہ اور دور جدید کے پس منظر میں اصول شریعت پر گفتگو۔
مجلد =/۱۲

فتاویٰ دار العلوم دیوبند مکمل
=/۲۱

فتاویٰ رشیدیہ یعنی مولانا گنگوہی کے فتاویٰ کا مجموعہ
=/۴

مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر
مقالات امینی
مولانا محمد تقی امینی
یہ دونوں کتابیں فقہ اسلامی کے اصول اور اس کے اجتہادی کردار پر مسلسل غور و فکر کرنے والے ایک عالم کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ اہل علم نے اس محنت کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ آپ بھی ان عالمانہ کاوشوں سے فائدہ اٹھائیں۔ قیمت علی الترتیب =/۲ اور =/۵۰/۱

کائنات میں انسان کا مقام اسلامی نقطۂ نظر سے
از:- مولانا امینی
کائنات میں انسان کے مقام پر ایک پر مغز مقالہ ۵۰/ صرف

کیا ہم مسلمان ہیں از جناب شمس نوید قرن اول کے مسلمانوں کے آئینہ میں آج کے مسلمانوں کی صورت، بہت ہی درد انگیز اور مؤثر پیرایہ بیان قیمت مجلد ۲/۲۵

انتخاب صحاح ستہ (اردو مع عربی) صحاح ستہ کی ۰ سو حدیثوں کا مجموعہ مجلد =/۵

براہین قاطعہ (نیا ایڈیشن) یہ کتاب اہل بدعت کی تردید میں لاثانی ہے۔ =/۵

کلمات اکابر از:- مولانا محمد اسحٰق بنارسی
بزرگان دین کے حکیمانہ، عارفانہ اور ایمان افروز ملفوظات کا مجموعہ۔ عمدہ کتابت و طباعت =/۱

کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسئول

محمد منظور نعمانی

جلد ۳۲ | بابتہ ماہ ربیع الاول ۱۳۸۴ھ مطابق اگست ۱۹۶۴ء | شمارہ (۳۰۵)

اگر اس دائرے میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰؍ اگست تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں، ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کی پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں، اس کی اطلاع ۲۸ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی ——— **دفتر الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ**

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر اڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

محمد منظور نعمانی

ہندوستان میں مسلمان بیشک اقلیت میں ہیں وہ ملک کی آبادی کا تقریباً آٹھواں حصہ ہیں لیکن پھر بھی
۹۔۱۰ کروڑ کے قریب ہیں اور پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں. بہت سے علاقوں اور اہم شہروں میں
ان کی آبادی کا تناسب ۲۰،۲۵ فیصدی اور کہیں کہیں اس سے بھی زائد ہے۔ ان میں علاقائی، لسانی
نسلی اور بہت سے اعتقادی و مسلکی اختلافات کے باوجود جس قدر دینی اور تہذیبی یگانگت اور ہم آہنگی
اور توحید، رسالت، قرآن اور قبلہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج جیسے بنیادی حقائق اور بنیادی تعلیم
پر جس حد تک اتفاق ہے اس کا دسواں حصہ بھی بہت سی قوموں اور ملتوں میں نہیں ہے۔

... پھر ان کے ان پڑھ عوام تک میں دین کے تعلق سے ایک ایسا جذبہ پایا جاتا
کا ایسا جذبہ اور تحفظ موجود ہے جس کو بیدار اور متحرک کر کے ان کو بڑی سے بڑی قربانی کے لیے آمادہ کیا
جا سکتا ہے؛ اس کے ساتھ ساتھ ان کی ایک شاندار تاریخ ہے جو ان میں عزم و ولولہ اور عالی حوصلگی
پیدا کرنے کا نہایت موثر وسیلہ بن سکتی ہے۔

کتنی افسوس کی بات ہے کہ ۹-۱۰ کروڑ کی تعداد والی جس قوم میں یہ خصوصیات موجود ہوں وہ اس ملک میں ایسا
بے وزن، بے اثر، بے وقار اور خوار ہو جیسی کہ ۱۲-۱۰ سال سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت ہے؟
حیرت انگیز اور بہت سوچنے کی بات ہے اور یقیناً اس کی ذمہ داری ملت کی قیادت پر ہے، آج
ہی کی قیادت پر نہیں بلکہ گذشتہ پورے پچاس سالہ دور کی قیادت پر ہے جب سے کہ ملک میں عوامی تحریکات
کا سلسلہ شروع ہوا۔

مسلمانوں کی سب سے پہلی عوامی تحریک خلافت کی تحریک تھی جو بیک وقت خلافت کی تحریک بھی تھی

ہندوستان کی آزادی کی تحریک بھی، یہ تحریک مسلمانوں کے جوش و خروش، ان کے باہمی اتحاد و اتفاق بلکہ ہندو مسلم اتحاد کے لحاظ سے بھی مثالی تحریک تھی، لیکن کمال اتاترک کے فیصلہ الغائے خلافت کے بعد خلافت کا مسئلہ ہی سرے سے ختم ہوگیا ــــ تاہم مسلمانوں کے بہت سے بااثر لیڈر اور ان کے ساتھ عام مسلمانوں کا بھی ایک بڑا اور اہم طبقہ براہ راست کانگریس سے وابستہ رہ کر یا جمعیۃ العلماء مجلس احرار کے نام سے آزادی کی جد و جہد میں شریک رہا ــــ پھر سنہ ۱۹۳۶ء کے جنرل الکشن کے بعد کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش عوامی سطح پر شروع ہوگئی اور مسلمان لیڈر اور عوام دو حصوں میں بٹ گئے، ایک طبقہ کانگریس کے ساتھ رہا اور دوسرا طبقہ جس کے ساتھ آخر میں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہوگئی مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگیا اور یہ دونوں اپنے اپنے راستہ پر چلتے رہے اور ان کے درمیان کشمکش اور کشیدگی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم پر یہ کشمکش ختم ہوئی اور دونوں حصوں میں انگریزی حکومت کے خاتمہ کے بعد قومی حکومتوں کا نیا دور شروع ہوا ــــ اس وقت سے اب تک ہندوستان میں مسلمانوں کی طرف سے کوئی ایسی جد و جہد نہیں ہوئی ہے جسے عوامی تحریک کہا جا سکے لیکن مختلف جماعتوں کے پلیٹ فارم سے اور پریس سے ان تکلیف دہ حالات اور ناانصافیوں کے خلاف جن سے مسلمان اس ملک میں آزادی کے پہلے دن سے دوچار ہیں مسلسل احتجاج ہو رہا ہے اور اپنی اپنی رائے یا مزاج کے مطابق مسلمانوں کو سرد یا گرم مشورے دئیے جا رہے ہیں۔ یہ بھی دراصل ایک کام ہی ہے اور قوموں کی زندگی میں ایسے بڑے بڑے وقفے آتے ہیں جب ان کے لیے صرف اتنے ہی کام کا میدان ہوتا ہے پھر کسی وقت حالات کے سازگار ہونے پر یہی چیز کسی عوامی جد و جہد کی شکل بھی اختیار کر سکتی ہے۔

یہ ہے بہت ہی مختصر اور اجمالی جائزہ ہندوستانی مسلمانوں کی قریباً پچاس سالہ ان عوامی تحریکات اور کوششوں کا جن کا تعلق سیاست و حکومت سے رہا ہے۔

جس قوم میں پچاس سال سے عوامی پیمانہ پر سیاسی کام ہو رہا ہو وہ آج کے ہندوستان میں ۶۔۵ کروڑ ہونے کے باوجود اور اپنی ان ملی خصوصیات کے باوجود جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اور جن میں سے ہر خصوصیت طاقت کا ایک عظیم خزانہ ہے بالکل بے وزن، بے وقار اور بے اثر ہے، خالص ظاہری اسباب کے نقطۂ نظر سے یہ بات حیرت انگیز ہے اور آج کی گفتگو صرف اسی نقطۂ نظر سے ہے۔

اس عاجز نے جہاں تک غور کیا ہے اس میں بڑا دخل دو باتوں کا ہے۔ ایک یہ کہ اب تک مسلمانوں کی ہر تحریک اور ہر کام میں جوش و خروش اور جذبات ہی کی طاقت سے کام لیا گیا ہے ـــــ ان میں سیاسی شعور پیدا کرنے، سیاسی مسائل اور عوامل کو سمجھنے اور غور کرنے اور حالات کے مطابق سرد یا گرم رویہ کا خوگر بنانے کا کام مختصر لفظوں میں سیاسی تربیت کا کام اس پچاس سالہ دور میں کبھی نہیں ہوسکا۔ اس کا قدرتی نتیجہ ہے کہ جن حالات میں جوش و خروش اور ہنگامہ خیزی مفید ہو اُن میں تو وہ اب بھی بہت اچھا رول ادا کرسکتے ہیں بشرطیکہ قیادت صحیح اور قابلِ اعتماد ہو، لیکن دوسرے حالات میں سوائے اس کے کہ اُن کے اکثر عوام و خواص کچھ جلی کٹی باتوں سے دل کی بھڑاس نکالیں یا ان کے کچھ قائدین صرف عاجزانہ درخواستیں اربابِ حکومت کی بارگاہ میں پیش کریں کوئی اور مفید اور نتیجہ خیز کام نہیں ہوتا اور نہ لوگوں کو اس کے امکانات نظر آتے ہیں۔

دوسری اہم چیز جس کو مسلمانوں کی اس سیاسی پسماندگی میں بڑا دخل ہے مسلمانوں کے دولت مند طبقہ کی یہ کیفیت ہے کہ وہ سیاست سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھنا چاہتا اور اس کی اہمیت کو بالکل نہیں سمجھتا اس لیے اس میدان میں وہ اپنا فرض بالکل ادا نہیں کرتا ـــ ـ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ اسی ملک میں رہنے والی وہ قوم جو ساری اقلیتوں کے مجموعہ کے مقابلہ میں بھی تنہا اسّی فیصدی ہے اور اس کی یہ عددی اکثریت اس کے ہر قسم کے مفادات کی حفاظت کے لیے کافی ہے۔ اس کے دولتمند چونکہ سیاست کی اہمیت اور اس کے ہمہ گیر اور دور رس اثرات کو جانتے سمجھتے ہیں اس لیے اتنی مضبوط اور محفوظ اکثریت میں ہونے کے باوجود وہ کروڑوں روپیہ صرف پریس پر خرچ کرتے ہیں، ملک کے اکثر بڑے بلکہ قریب قریب سب ہی اخبارات ہندو سرمایہ داروں کی ملکیت ہیں یا ان کی مدد سے چل رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات عام طور سے مشہور ہے کہ پارلیمنٹ کے ممبروں میں اور اسی طرح ریاستی قانون ساز مجلسوں کے ممبروں میں اچھی خاصی تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کے الکشن کے لاکھوں کے مصارف ہندو سرمایہ دار بڑے تاجر اور ملوں کے مالک برداشت کرتے [illegible] وہ وہاں اُن کے مفادات کی حفاظت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اور آزادی کے دور سے پہلے کی یہ بات بھی کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ کانگریس کے ہندو لیڈروں میں جو لوگ جواہر لال جی کی طرح گھر کے دولتمند نہیں تھے اُن کی ضروریات کی کفالت ہندو سرمایہ دار کرتے تھے جس کی وجہ سے وہ

…نگریس کے ساتھ سیاسی میدان میں کام کرتے تھے۔ خود گاندھی جی بھی انہی لوگوں میں سے تھے۔

لیکن ہمارے مسلمان سرمایہ دار اجتماعی طور پر بھی آج تک ایک انگریزی روزنامہ کا انتظام نہیں کرسکے
…اس گئی گزری حالت میں بھی ان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اگر اس کمی کو پورا کرنے کا فیصلہ کرلیں تو
…اعلیٰ درجہ کا روزنامہ بمبئی سے، ایک کلکتہ سے، ایک مدراس سے، ایک دہلی سے نکل سکتا ہے۔ لیکن
…ست سے بے تعلقی، بلکہ اس باب میں بے شعوری کا حال یہ ہے کہ جو لوگ بیٹوں بیٹیوں کی شادیوں
میں ایک ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ خرچ کردیتے ہیں اُن سے اگر کہا بھی جائے تو وہ اس مد میں
…ہزار روپئے کو آمادہ نہ ہوں گے۔ اور یہ حال صرف بے پڑھے یا کم تعلیم یافتہ سیٹھوں ہی کا نہیں ہے
ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے دولتمندوں کا حال بھی اس معاملہ میں قریب قریب یہی ہے ـــــ میرے
ایک دوست ہیں بہت اونچے درجہ کے اور کامیاب وکیلوں میں ہیں، جہاں تک مجھے معلوم ہے بہت
معقول یافت ہے۔ دین سے بھی کافی لگاؤ ہے امور خیر میں خرچ کا حوصلہ بھی اللہ نے دیا ہے، چند ہی مہینے کی بات ہو کہ
کانپور کے مظلومین کے لیے بغیر کسی طلب اور تحریک کے ایک ہزار روپے لاکے خاموشی سے دیدئے، اور دو چار
…دن بعد ڈھائی سو مزید خود آکے دے گئے۔ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد اُن کے بعض احباب نے دینی
جیسی تحریک کی ضلعی انجمن کے لیے سرمایہ کی ضرورت کا ان سے تذکرہ کیا تو فوراً پانچسو روپئے پیش کردئیے
لیکن جب مسلمانوں کے ایک نہایت اہم سیاسی قسم کے کام بلکہ کہنا چاہیے کہ قومی، ملکی اور حکومتی سطح
…ہندوستانی مسلمانوں کے مال و جان اور دین و ایمان کے تحفظ کے سلسلے کی ایک اجتماعی تحریک اور
…کوشش کے سلسلہ میں مالی تعاون کے لیے انہی کے طبقہ کے ان کے بعض قریبی دوستوں نے خود ان کے
دولتکدہ پر جاکر ان سے بات کی تو پہلے تو انھوں نے اپنے ان دوستوں کو یہ سمجھانے کی کوشش فرمائی کہ
…ان کوششوں سے کچھ نتیجہ نہیں نکلے گا، مسلمانوں کے حالات یہاں یوں ہی بد سے بدتر ہوتے رہیں گے۔
یہ ساری کوششیں جو آپ لوگ کرنا چاہتے ہیں بالکل فضول ہیں اور اس تلقین اور نصیحت کے بعد پہلے
…روپے پیش کرنے کیلئے کہا اور پھر خود ہی اسکو کم سمجھتے ہوئے کچھ زیادہ یعنی دس روپے دینے چاہے۔
…صرف ایک مثال ہو اس معاملہ میں ہمارے تعلیم یافتہ دولتمندوں کے رویہ کی۔ بلاشبہ اس طبقہ میں اسکے خلاف
بھی مثالیں موجود ہیں لیکن اپنا تجربہ یہی ہے کہ وہ مثالیں بہت شاذ ہیں۔

بہرحال دوسرا بڑا سبب مسلمانوں کی سیاسی پسماندگی کا ہمارے دولتمندوں کا یہ رویہ ہو کہ نہ وہ پیڑت…

موتی لال نہرو، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کی طرح اپنے مالی وسائل کے ساتھ میدان میں آتے ہیں اور نہ یہ کرتے ہیں کہ جو لوگ اپنا وقت اور اپنی صلاحیتیں اس راہ میں لگائیں اور انکے اپنے معاشی وسائل نہ ہوں تو انکی ضروریات خوشدلی کے ساتھ اور باوقار طریقہ پر اپنے ذمہ لیکر انکو اس کام کیلئے اور اس میدان میں جدوجہد کیلئے فارغ کر دیں۔

مسلمانوں کی سیاسی پسماندگی کے ظاہری اسباب میں انکی اور بھی بعض داخلی کمزوریوں اور غلطیوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے لیکن ہمارے نزدیک سب سے بڑا دخل ان دو باتوں کا ہے ـــــ اسلئے سب سے پہلی ضرورت تو ہے ان کی سیاسی تربیت کی، اور حالات کے مطابق اُن کا مزاج بنانے کی، یہ کام اردو اخبارات بھی اچھی خاصی حد تک کر سکتے ہیں، اور دوسری ضرورت ہے اس راہ میں مسلمان دولتمندوں کی فرض شناسی اور صحیح طور پر اپنے فرض کی ادائیگی کی ـــــ اور ان سب باتوں سے پہلے ضرورت ہے غیر مختلف فیہ چیزوں میں اُن کے مختلف عناصر کے باہم اجتماع اور تعاون و اشتراکِ عمل کی، اور ان سب باتوں کی توفیق اور اللہ کی فیصلہ کن مدد حاصل ہونے کیلئے ضرورت ہے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کی ـــــ وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝

معارف الحدیث

(مسلسل)

حجۃ الوداع (۲)

[گزشتہ شمارہ میں حجۃ الوداع (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری اور رخصتی حج) سے متعلق حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کی سب سے مفصل حدیث کا ایک حصہ ترجمہ اور تشریح کے ساتھ ناظرین کرام پڑھ چکے ہیں اس کا باقی حصہ آج مدر ناظرین کیا جارہا ہے

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے یہ حدیث چونکہ بہت طویل ہے اس لیے اس کے ایک ایک حصہ کا ترجمہ کرکے تشریح کی جارہی ہے اور پورا متن نقل کرنے کے بجائے ہر حصہ متن کا صرف ابتدائی اور آخری فقرہ نقل کیا جارہا ہے۔ حدیث کا پورا متن صحیح مسلم یا مشکوٰۃ المصابیح وغیرہ میں دیکھا جاسکتا ہے]

فَلَمَّا كَانَ يَوْمُ التَّرْوِيَةِ تَوَجَّهُوا إِلَى مِنًى فَأَهَلُّوا بِالْحَجِّ ..

.. إِلَى قَوْلِهِ فَأَجَازَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى أَتَى عَرَفَةَ فَوَجَدَ الْقُبَّةَ قَدْ ضُرِبَتْ لَهُ بِنَمِرَةَ فَنَزَلَ بِهَا"

پھر جب یوم الترویہ (یعنی ۸ ذی الحجہ کا دن) ہوا تو سب لوگ منیٰ جانے لگے (اور جو صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے صفا مروہ کی سعی کرکے اپنا احرام ختم کرچکے تھے اور حلال ہوگئے تھے) انھوں نے حج کا احرام باندھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ناقہ پر سوار ہوکر منیٰ کو چلے. پھر وہاں پہونچ کر آپ نے

وادیں صحابہ کرام نے مسجد خیف میں ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر پانچوں نمازیں پڑھیں
پھر فجر کی نماز کے بعد تھوڑی دیر آپ منیٰ میں اور ٹھہرے۔ یہاں تک کہ جب سورج نکل آیا
تو آپ عرفات کی طرف روانہ ہوئے اور آپ نے حکم دیا تھا کہ صوف کا بنا ہوا خیمہ آپ
کے لیے نمرہ میں نصب کیا جائے (نمرہ دراصل وہ جگہ ہے جہاں سے آگے عرفات کا
میدان شروع ہوتا ہے۔) آپ کے خاندان قریش کے لوگوں کو اس کا یقین تھا اور اس کے
بارہ میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ آپ "مشعر حرام" کے پاس قیام کریں گے جیسا کہ قریش زمانۂ
جاہلیت میں کیا کرتے تھے۔ (لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ) آپ مشعر حرام کے حدود سے
آگے بڑھ کے عرفہ پہونچ گئے اور آپ نے دیکھا کہ (آپ کی ہدایت کے مطابق) نمرہ میں
آپ کا خیمہ نصب کر دیا گیا ہے تو آپ اس خیمہ میں اُتر گئے۔

(تشریح) حج کی خاص نقل و حرکت کا سلسلہ ۸ ذی الحجہ سے شروع ہوتا ہے جس کو "یوم الترویہ" کہا
جاتا ہے۔ اس دن صبح کو حجاج منیٰ کے لیے روانہ ہوتے ہیں، افراد یا قران کے طریقہ پر حج
کرنے والے تو پہلے سے احرام کی حالت میں ہوتے ہیں، ان کے علاوہ اور حجاج اسی دن
یعنی ۸ ذی الحجہ کو احرام باندھ کے منیٰ کو جاتے ہیں اور نویں کی صبح تک وہیں قیام کرتے ہیں
—— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ بعض صحابہ جو اپنی قربانیاں اپنے ساتھ
لائے تھے وہ تو احرام کی حالت میں تھے، باقی صحابہ جنھوں نے عمرہ کرکے احرام ختم کر دیا تھا
اُن سب نے آٹھویں کی صبح کو حج کا احرام باندھا اور حج کا یہ سارا قافلہ منیٰ کو روانہ ہو گیا اور
اس دن وہیں قیام کیا۔ اور پھر نویں کی صبح کو سورج نکلنے کے بعد عرفات کے لیے روانگی ہوئی۔ عرفات
منیٰ سے تقریباً [illegible] اور مکہ سے تقریباً [illegible] میل ہے اور یہ حدود حرم سے باہر ہے بلکہ اس جانب میں
حرم کی سرحد جہاں ختم ہوتی ہے وہیں سے عرفات کا علاقہ شروع ہوتا ہے —— عرب کے عام قبائل
جو حج کے لیے آتے تھے وہ سب نویں ذی الحجہ کو حدود حرم سے باہر نکل کے عرفات میں وقوف
کرتے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان والے یعنی قریش جو اپنے کو کعبہ کا مجاور،
متولی اور "اہل حرم اللہ" کہتے تھے وہ وقوف کے لیے بھی حدود حرم سے باہر نہیں نکلتے تھے بلکہ
اس کی حد کے اندر ہی مزدلفہ کے علاقہ میں مشعر حرام پہاڑی کے پاس وقوف کرتے تھے اور اس کو

اپنا امتیاز سمجھتے تھے)، اپنے اس پرانے خاندانی دستور کی بنا پر قریش کو یقین تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مشعر حرام کے پاس ہی وقوف کریں گے، لیکن چونکہ ان کا یہ طریقہ غلط تھا اور وقوف کی صحیح جگہ عرفات ہی ہے اس لیے آپ نے منیٰ سے چلتے وقت ہی اپنے لوگوں کو ہدایت فرمادی تھی کہ آپ کے قیام کے لیے خیمہ نمرہ[1] میں نصب کیا جائے چنانچہ اس ہدایت کے مطابق وادی نمرہ ہی میں آپ کے لیے خیمہ نصب کیا گیا اور آپ وہیں جاکر اترے اور اُس خیمہ میں قیام فرمایا۔

حَتّٰى إِذَا زَاغَتِ الشَّمْسُ أَمَرَ بِالْقَصْوَاءِ فَرُحِلَتْ لَهُ فَأَتَى بَطْنَ الْوَادِي فَخَطَبَ النَّاسَ وَقَالَ .... إِلَى قَوْلِهِ فَقَالَ بِأُصْبُعِهِ السَّبَّابَةِ يَرْفَعُهَا إِلَى السَّمَاءِ وَيَنْكُتُهَا إِلَى النَّاسِ اللّٰهُمَّ اشْهَدْ اللّٰهُمَّ اشْهَدْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ أَذَّنَ بِلَالٌ ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى الظُّهْرَ ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى الْعَصْرَ وَلَمْ يُصَلِّ بَيْنَهُمَا شَيْئًا۔

یہاں تک کہ جب آفتاب ڈھل گیا تو آپ نے اپنی ناقہ قصواء پر کجاوا کسنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اس پر کجاوا کس دیا گیا، آپ اس پر سوار ہوکر وادی (وادئ عُرَنہ) کے درمیان آئے اور آپ نے اونٹنی کی پشت ہی پر سے لوگوں کو خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ ــــــ "لوگو تمھارے خون اور تمھارے مال تم پر حرام ہیں (یعنی ناحق کسی کا خون کرنا اور ناجائز طریقہ پر کسی کا مال لینا تمھارے لیے ہمیشہ کے لیے حرام ہے) بالکل اسی طرح جس طرح کہ آج یوم العرفہ کے دن ذی الحجہ کے اس مبارک مہینہ میں، اپنے اس مقدس شہر مکہ میں (تم ناحق کسی کا خون کرنا اور کسی کا مال لینا حرام جانتے ہو)

خوب ذہن نشین کرلو کہ جاہلیت کی ساری چیزیں یعنی اسلام کی روشنی کے دور سے پہلے تاریکی اور گمراہی کے زمانہ کی ساری باتیں اور سارے قصے ختم ہیں) میرے دونوں

---

[1] نمرہ ٹھیک وہ جگہ ہے جہاں حرم کی حد ختم ہوکر عرفات کی حد شروع ہوتی ہے۔ موجودہ مسجد نمرہ عرفات کے بالکل سرے پر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی جو دیوار مکہ کی جانب ہے وہ عرفات اور نمرہ کے درمیان حد فاصل ہے۔ حتیٰ کہ اگر خدانخواستہ وہ دیوار باہر کی جانب گرے تو عرفات کی حد سے باہر وادئ نمرہ میں گرے گی۔ ۱۲

قدموں کے نیچے دفن اور پامال ہیں (میں ان کے خاتمہ اور منسوخی کا اعلان کرتا ہوں) اور زمانہ جاہلیت کے خون بھی ختم ہیں معاف ہیں (یعنی اب کوئی مسلمان زمانہ جاہلیت کے کسی خون کا بدلا نہیں لے گا، اور سب سے پہلے میں اپنے گھرانہ کے ایک خون ربیعہ ابن الحارث بن عبدالمطلب کے فرزند کے خون کے ختم اور معاف کیے جانے کا اعلان کرتا ہوں جو قبیلہ بنی سعد کے ایک گھر میں دودھ پینے کے لیے رہتے تھے اُن کو قبیلۂ ہذیل کے آدمیوں نے قتل کر دیا تھا۱ (ہذیل سے اس خون کا بدلہ لینا ابھی باقی تھا لیکن اب میں اپنے خاندان کی طرف سے اعلان کرتا ہوں کہ اب یہ قصہ ختم، بدلہ نہیں لیا جائے گا) اور زمانۂ جاہلیت کے سارے سودی مطالبات (جو کسی کے کسی کے ذمہ باقی ہیں وہ سب بھی) ختم اور سوخت ہیں (اب کوئی مسلمان کسی سے اپنا سودی مطالبہ وصول نہیں کرے گا) اور اس باب میں بھی میں سب سے پہلے اپنے خاندان کے سودی مطالبات میں سے اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کے سودی مطالبات کے ختم اور سوخت ہونے کا اعلان کرتا ہوں (اب وہ کسی سے اپنا سودی مطالبہ وصول نہیں کریں گے) اُن کے سارے سودی مطالبات آج ختم کر دیئے گئے ــــــ اور اے لوگو عورتوں کے حقوق اور ان کے ساتھ برتاؤ کے بارے میں خدا سے ڈرو اس لیے کہ تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر لیا ہے اور اللہ کے حکم اور اس کے قانون سے اُن کے ساتھ تمتع تمہارے لیے حلال ہوا ہے۔ اور تمہارا خاص حق اُن پر یہ ہے کہ جس آدمی کا گھر میں آنا اور تمہاری جگہ اور تمہارے بستر پر بیٹھنا تم کو پسند نہ ہو وہ اس کو اس کا موقع نہ دیں ــــ لیکن اگر وہ یہ غلطی کریں تو تم (تنبیہ اور آئندہ سدباب کے لیے اگر کچھ سزا دینا مناسب اور مفید سمجھو) ان کو کوئی خفیف سی سزا دے سکتے ہو۔

---

۱ ربیعہ بن الحارث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے ان کا ایک شیرخوار بچہ جس کو عرب کے دستور کے مطابق قبیلۂ سعد کی ایک عورت نے دودھ پلانے کیلئے اپنے گھر رکھ لیا تھا قبیلۂ ہذیل کے آدمیوں کے ہاتھ سے بنی سعد اور ہذیل کے ایک جھگڑے میں ہوگیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانہ کو اس کا بدلہ لینے کا حق تھا۔ آپ نے اس خطبہ میں اسی حق سے دستبرداری کا اعلان کیا تھا۔ ۱۲

ـــــــ اور ان کا خاص حق تم پر یہ ہے کہ اپنے مقدور اور حیثیت کے مطابق ان کے کھانے پہننے کا بندوبست کرو ـــــــ اور میں تمہارے لیے وہ سامان ہدایت چھوڑ رہا ہوں کہ اگر تم اس سے وابستہ رہے اور اس کی پیروی کرتے رہے تو پھر کبھی تم گمراہ نہ ہوگے ـــــــ وہ ہے کتاب اللہ ـــــــ اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم سے میرے متعلق پوچھا جائے گا (کہ میں نے تم کو اللہ کی ہدایت اور اس کے احکام پہونچائے یا نہیں) ـــــ تو بتاؤ کہ وہاں تم کیا کہوگے اور کیا جواب دوگے؟ ـــــــ

حاضرین نے عرض کیا کہ ہم گواہی دیتے ہیں اور قیامت کے دن بھی گواہی دیں گے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام اور اس کے احکام ہم کو پہونچا دیئے اور رہنمائی اور تبلیغ کا حق ادا کر دیا اور نصیحت و خیرخواہی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اس پر آپ نے اپنی انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے اور لوگوں کے مجمع کی طرف اس سے اشارہ کرتے ہوئے تین دفعہ فرمایا اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ!! اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ!! اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ!!! یعنی اے اللہ تو گواہ رہ کہ میں نے تیرا پیام اور تیرے احکام تیرے بندوں تک پہونچا دیئے (اور تیرے یہ بندے اقرار کر رہے ہیں۔ ـــــــ اس کے بعد آپ کے حکم سے) حضرت بلال نے اذان دی پھر اقامت کہی اور آپ نے ظہر کی نماز پڑھائی اس کے بعد پھر بلال نے اقامت کہی اور آپ نے عصر کی نماز پڑھائی۔

(تشریح) یہ معلوم ہے کہ اس دن (یعنی اس سال وقوف عرفہ کے دن) جمعہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زوال آفتاب کے بعد پہلے مندرجۂ بالا خطبہ دیا۔ اس کے بعد ظہر اور عصر کی دونوں نمازیں (ظہر ہی کے وقت میں) ساتھ ساتھ بلا فصل پڑھیں، حدیث میں صاف ظہر کا ذکر ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ آپ نے اس دن جمعہ کی نماز نہیں پڑھی بلکہ اس کے بجائے ظہر پڑھی اور جو خطبہ آپ نے دیا وہ جمعہ کا خطبہ نہیں تھا بلکہ یوم العرفات کا خطبہ تھا ـــــــ جمعہ نہ پڑھنے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ عرفات کوئی آبادی اور بستی نہیں ہے بلکہ ایک وادی اور صحرا ہے، اور جمعہ بستیوں اور آبادیوں میں پڑھا جاتا ہے ـــــــ واللہ اعلم

یوم العرفہ کے اس خطبہ میں آپ نے جو ہدایات دیں اُس وقت اور اس مجمع میں انہی چیزوں کا

اعلان اور تبلیغ وتلقین ضروری اور اہم تھی ـــــ خطبہ کے بعد آپ نے ظہر وعصر ایک ساتھ ظہر ہی کے وقت میں ادا فرمائیں اور درمیان میں سنت یا نفل کی دو رکعتیں بھی نہیں پڑھیں اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ وقوف عرفات کے دن یہ دونوں نمازیں اسی طرح پڑھی جائیں! اسی طرح مغرب وعشا اس دن مزدلفہ پہونچ کر عشا کے وقت میں ایک ساتھ پڑھی جائیں. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا تھا جیسا کہ آگے معلوم ہوگا ـــــ اس دن ان نمازوں کا صحیح طریقہ اور اُن کے صحیح اوقات یہی ہیں ـــــ اس کی ایک حکمت تو یہ ہوسکتی ہو کہ اس دن کا یہ امتیاز ہر خاص وعام کو معلوم ہوجائے کہ آج کے دن کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نمازوں کے اوقات میں بھی یہ تبدیلی کردی گئی ہے ـــــ اور دوسری حکمت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اُس دن کا اصل وظیفہ جو ذکر اور دعا ہے اُس کے لیے پوری یکسوئی کے ساتھ بندہ فارغ رہے اور ظہر سے مغرب تک بلکہ عشا تک کسی نماز کی بھی فکر نہ ہو۔

آپ نے یوم العرفات کے اس خطبہ میں جو اپنے موقع اور محل کے لحاظ سے آپ کی حیات طیبہ کا سب سے اہم خطبہ کہا جاسکتا ہے سب سے آخری بات اپنی وفات اور جدائی کے قرب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ فرمائی کہ "میں تمھارے لیے ہدایت وروشنی کا وہ کامل مکمل سامان چھوڑ کے جاؤں گا جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہوسکوگے بشرطیکہ تم اس سے وابستہ رہے اور اس کی روشنی میں چلتے رہے اور وہ ہے اللہ کی مقدس کتاب قرآن مجید ـــــ اس سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ مرض وفات کے آخری دنوں میں جبکہ شدت مرض کی وجہ سے آپ کو سخت تکلیف تھی آپ نے بطور وصیت کے ایک تحریر لکھانے کا جو خیال ظاہر کیا تھا جس کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا کہ "تم اس کے بعد گمراہ نہ ہوگے" اس میں آپ کیا لکھانا چاہتے تھے، حجۃ الوداع کے اس اہم خطبہ سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کتاب اللہ سے وابستگی اور اس کی پیروی کی وصیت لکھانا چاہتے تھے، آپ اس اہم خطبہ میں بھی بتا چکے تھے کہ یہ شان کتاب اللہ کی ہے۔ اور چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس حقیقت سے آشنا تھے اور اللہ نے موقع پر بات کہنے کی جرأت بھی دی تھی اس لیے انھوں نے اس موقع پر یہ رائے ظاہر کی کہ آپ کی مسلسل تعلیم وتربیت سے ہمیں معلوم ہوچکا ہے کہ یہ حیثیت کتاب اللہ کی ہے اس لیے اس سخت تکلیف کی حالت میں وصیت لکھنے لکھانے کی زحمت کیوں فرمائی جائے،

ہیں آپ کا پڑھایا ہوا سبق یاد ہے اور یاد رہے گا "حسبنا کتاب اللہ"۔

ثُمَّ رَكِبَ حَتّٰى اَتَى الْمَوْقِفَ...... اِلٰى قَوْلِهٖ ثُمَّ رَكِبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَفَاضَ اِلَى الْبَيْتِ فَصَلّٰى بِمَكَّةَ الظُّهْرَ فَاَتٰى عَلٰى بَنِىْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ يَسْقُوْنَ عَلٰى زَمْزَمَ فَقَالَ انْزِعُوْا بَنِىْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَلَوْلَا اَنْ يَّغْلِبَكُمُ النَّاسُ عَلٰى سِقَايَتِكُمْ لَنَزَعْتُ مَعَكُمْ فَنَاوَلُوْهُ دَلْوًا فَشَرِبَ مِنْهُ ـــــــــ رواہ مسلم

پھر (جب آپ ظہر و عصر کی نماز ایک ساتھ بلا فصل پڑھ چکے تو) اپنی ناقہ پر سوار ہو کر آپ میدان عرفات میں خاص "موقف" کی جگہ پر تشریف لائے اور اپنی ناقہ قصواء کا رُخ آپ نے اس طرف کر دیا جدھر پتھر کی بڑی بڑی چٹانیں ہیں اور پیدل مجمع آپ نے اپنے سامنے کر لیا اور آپ قبلہ رو ہو گئے اور وہیں کھڑے رہے یہاں تک غروب آفتاب کا وقت آ گیا اور (شام کے آخری وقت میں فضا جو زرد ہوتی ہے وہ) زردی بھی ختم ہو گئی۔ اور آفتاب بالکل ڈوب گیا تو آپ (عرفات سے مزدلفہ کے لیے) روانہ ہوئے اور اسامہ بن زید کو آپ نے اپنی ناقہ پر اپنے پیچھے سوار کر لیا تھا یہاں تک کہ آپ مزدلفہ آ گئے (جو عرفات سے قریباً تین میل ہے) یہاں پہونچ کر آپ نے مغرب اور عشا کی نمازیں ایک ساتھ پڑھیں ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ (یعنی اذان ایک ہی دفعہ کہی گئی اور اقامت مغرب کے لیے الگ کہی گئی اور عشا کے لیے الگ کہی گئی) اور ان دونوں نمازوں کے درمیان بھی آپ نے سنت یا نفل کی رکعتیں بالکل نہیں پڑھیں۔ اس کے بعد آپ لیٹ گئے اور لیٹے رہے یہاں تک کہ صبح صادق ہو گئی اور فجر کا وقت آ گیا تو آپ نے صبح صادق کے ظاہر ہوتے ہی اذان اور اقامت کے ساتھ نماز فجر ادا کی اسکے بعد آپ مشعر حرام کے پاس آئے (راجح قول کے مطابق یہ ایک طبہ ٹیلہ سا تھا مزدلفہ کے حدود میں، اب بھی یہی صورت ہے اور وہاں نشانی کے طور پر ایک عمارت بنا دی گئی ہے) یہاں آ کر آپ قبلہ رو کھڑے ہوئے اور دعا اور اللہ کی تکبیر و تہلیل اور توحید و تمجید میں مشغول رہے۔ یہاں تک کہ خوب اُجالا ہو گیا، پھر طلوع آفتاب سے ذرا پہلے

آپ وہاں سے منیٰ کے لیے روانہ ہوگئے اور اس وقت آپ نے اپنی ناقہ کے پیچھے فضل بن عباس کو سوار کر لیا اور چل دیئے یہاں تک کہ جب وادی محسّر کے درمیان پہونچے تو آپ نے اونٹنی کی رفتار کچھ تیز کردی، پھر اس سے نکل کر اس درمیان والے راستے سے چلے جو بڑے جمرہ پر پہونچتا ہے پھر اس جمرہ کے پاس پہونچ کر جو درخت کے پاس ہو آپ نے اس پر رمی کی، سات سنگ ریزے اس پر پھینک کے مارے جن میں سے ہر ایک کے ساتھ آپ تکبیر کہتے تھے، یہ سنگ ریزے خذف کے سنگریزوں کی طرح کے تھے (یعنی چھوٹے چھوٹے تھے جیسے کہ انگلیوں میں رکھ کر پھینکے جاتے ہیں جو قریباً چنے اور مٹر کے دانے کے برابر ہوتے ہیں) آپ نے جمرہ پر یہ سنگ ریزے (جمرہ کے قریب والی) نشیبی جگہ سے پھینک کے مارے، اور اس رمی سے فارغ ہو کر قربانگاہ کی طرف تشریف لے گئے وہاں آپ نے ۶۳ اونٹوں کی قربانی اپنے ہاتھ سے کی پھر جو باقی رہے وہ حضرت علی کے حوالے فرما دیے ان سب کی قربانی انھوں نے کی اور آپ نے اُن کو اپنی قربانی میں شریک فرمایا، پھر آپ نے حکم دیا کہ قربانی کے ہر اونٹ میں سے گوشت کا ایک پارچہ لے لیا جائے، یہ سارے پارچے ایک دیگ میں ڈال کے پکائے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی دونوں نے اس میں سے گوشت کھایا اور شوربا پیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ناقہ پر سوار ہو کر طواف زیارت کے لیے بیت اللہ کی طرف چل دیئے اور ظہر کی نماز آپ نے مکہ میں جا کر پڑھی، نماز سے فارغ ہو کے (اپنے اہل خاندان) بنی عبدالمطلب کے پاس آئے جو زمزم سے پانی کھینچ کھینچ کر لوگوں کو پلا رہے تھے تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ دوسرے لوگ غالب آ کر تم سے یہ خدمت چھین لیں گے تو میں بھی تمہارے ساتھ ڈول کھینچتا، ان لوگوں نے آپ کو بھر کے ایک ڈول زمزم کا دیا تو آپ نے اس میں سے نوش فرمایا۔

(صحیح مسلم)

(تشریح) حج کے سلسلے کا سب سے بڑا عمل اور رکن اعظم "وقوف عرفہ" ہے یعنی ۹ ذی الحجہ کو عصر کی نماز پڑھ کے میدان عرفات میں اللہ کے حضور میں کھڑا ہونا، اس حدیث سے معلوم

سول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وقوف کتنا طویل فرمایا تھا ـــــ ظہر و عصر کی نماز آپ نے ظہر کے شروع
قت ہی میں پڑھ لی تھی اور اس وقت سے لے کر غروب آفتاب تک آپ نے وقوف فرمایا اور
اس کے بعد سیدھے مزدلفہ چل دیئے اور مغرب و عشا آپ نے وہاں پہونچ کر ایک ساتھ ادا فرمائیں
اور جیسا کہ گزر چکا یہی اس دن کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔

مزدلفہ کی اس رات میں آپ نے عشا سے فارغ ہو کر فجر تک آرام فرمایا اور اس رات تہجد بھی
ناغہ کیا، دو رکعتیں بھی نہیں پڑھیں (حالانکہ تہجد آپ سفر میں بھی ناغہ نہیں کرتے تھے) اسکی وجہ غالباً
یہی تھی کہ نویں کے پورے دن آپ سخت مشغول رہے تھے۔ صبح کو منیٰ سے چل کر عرفات پہونچے، جہاں
پہلے خطبہ دیا، پھر ظہر و عصر کی نماز پڑھی اور اس کے بعد سے مغرب تک مسلسل وقوف فرمایا پھر اسی وقت
عرفات سے مزدلفہ تک کی مسافت طے کی، گویا فجر سے لے کر عشا تک مسلسل حرکت اور مشقت، اور
اگلے دن ۱۰ ذی الحجہ کو بھی اسی طرح مشغول رہنا تھا یعنی صبح کو مزدلفہ سے چل کر منیٰ پہونچنا، وہاں
جا کر پہلے رمی کرنا اس کے بعد صرف ایک دو یا دس بیس نہیں بلکہ ساٹھ سے بھی اوپر اونٹوں کی قربانی
اپنے ہاتھ سے کرنا، اس کے بعد طواف زیارت کے لیے منیٰ سے مکہ جانا اور وہاں سے پھر منیٰ واپس
آنا۔ بہرحال نویں اور دسویں ذی الحجہ کا پروگرام چونکہ اس قدر بھرا ہوا اور پُر مشقت تھا۔ اس لیے
ان دو دنوں کی مزدلفہ والی درمیانی رات میں پوری طرح آرام فرمانا ضروری تھا، جسم اور جسمانی
قوتوں کے بھی کچھ حقوق ہیں اور اُن کی رعایت خاص کر ایسے عام مجمعوں میں ضروری ہے تاکہ سہولت
اور رعایت کا پہلو بھی عوام کے علم میں آئے اور وہ شریعت کے صحیح اور معتدل مزاج کو سمجھ سکیں۔
واللہ اعلم۔

اس حدیث میں صراحۃً مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترسٹھ اونٹ اپنے ہاتھ
سے قربان کیے، یہ غالباً وہی ترسٹھ تھے جو آپ مدینہ طیبہ سے اپنے ساتھ قربانی کے لیے لائے تھے۔
باقی سینتیس جو حضرت علی یمن سے لائے تھے وہ آپ نے انہی کے ہاتھ سے قربان کرائے، ترسٹھ
کے عدد کی یہ حکمت بالکل کھلی ہوئی ہے کہ آپ کی عمر شریف ترسٹھ سال تھی گویا زندگی کے ہر سال کے
شکر میں آپ نے ایک اونٹ قربان کیا۔ واللہ اعلم۔

آپ نے اور حضرت علی مرتضیٰ نے اپنی قربانی کے اونٹوں کا گوشت پکوا کے کھایا، اور شوربا

پیا۔ اس سے یہ بات سب کو معلوم ہوگئی کہ قربانی کرنے والا اپنی قربانی کا گوشت خود بھی کھا سکتا ہے اور اپنے اعزہ کو بھی کھلا سکتا ہے۔

۱۰ ذی الحجہ کو قربانی سے فارغ ہونے کے بعد آپ طواف زیارت کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے مسنون اور بہتر یہی ہے کہ طواف زیارت قربانی سے فارغ ہونے کے بعد ۱۰ ذی الحجہ ہی کو کرلیا جائے، اگرچہ تاخیر کی بھی اس میں گنجائش ہے۔

زمزم کا پانی کھینچ کھینچ کے حجاج کو پلانا یہ خدمت اور سعادت زمانۂ قدیم سے آپ کے گھرانے بنی عبدالمطلب ہی کے حصہ میں تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طواف زیارت سے فارغ ہونے کے بعد زمزم پر تشریف لائے وہاں آپ کے اہل خاندان ڈول کھینچ کھینچ کے لوگوں کو اس کا پانی پلا رہے تھے، آپ کا بھی جی چاہا کہ اس خدمت میں کچھ حصہ لیں لیکن آپ نے بالکل صحیح سوچا کہ جب آپ ایسا کریں گے تو آپ کے اتباع اور تقلید میں آپ کے سارے رفقاء بھی اس سعادت میں حصہ لینا چاہیں گے اور پھر بنی عبدالمطلب جن کا یہ قدیمی حق ہے وہ محروم ہو جائیں گے اس لیے آپ نے اپنے اہل خاندان کی دلداری اور اظہار تعلق کے لیے اپنی دلی خواہش کا اظہار تو فرمادیا، مگر ساتھ ہی وہ مصلحت بھی بیان فرمادی جس کی وجہ سے آپ نے اپنی اس دلی خواہش کے قربان کر دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

جیسا کہ شروع میں ذکر کیا گیا تھا حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث حجۃ الوداع کے بیان میں سب سے زیادہ طویل اور مفصل حدیث ہے لیکن پھر بھی بہت سے واقعات کا ذکر اس میں چھوٹ گیا ہے۔ یہاں تک حلق اور دسویں تاریخ کے خطبہ کا بھی اس میں ذکر نہیں آیا ہے جو دوسری حدیثوں میں مذکور ہے۔

حضرت جابر کی اس حدیث کے بعض راویوں نے اسی حدیث میں یہ اضافہ بھی نقل کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی اعلان فرمایا کہ

نَحَرْتُ هٰهُنَا وَمِنًى كُلُّهَا مَنْحَرٌ فَانْحَرُوا فِي رِحَالِكُمْ وَوَقَفْتُ

میں نے قربانی اس جگہ کی ہے لیکن منیٰ کا سارا علاقہ قربانی کی جگہ ہے اسلئے تم سب

هٰهُنَا وَعَرَفَةُ كُلُّهَا مَوْقِفٌ وَ وَقَفْتُ هٰهُنَا وَجَمْعٌ كُلُّهَا مَوْقِفٌ

رواہ مسلم

لوگ اپنی اپنی جگہ قربانی کر سکتے ہو، اور میں نے عرفات میں وقوف یہاں (پتھر کی بڑی بڑی چٹانوں کے قریب کیا ہو) اور سارا عرفات وقوف کی جگہ ہے (اس کے جس حصہ میں بھی وقوف کیا جائے صحیح ہو) اور میں نے مزدلفہ میں یہاں (مشعر حرام کے قریب) قیام کیا اور سارا مزدلفہ موقف ہو (اس کے جس حصہ میں بھی اس رات میں قیام کیا جائے صحیح ہے)

عَنْ جَابِرٍ قَالَ نَحَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ نِسَائِهِ بَقَرَةً فِي حَجَّتِهِ ______ رواہ مسلم

حضرت جابر بن عبداللہ رضی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حج میں اپنی ازواج مطہرات کی طرف سے گائے کی قربانی فرمائی۔ (صحیح مسلم)

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ اَمَرَنِي رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اَقُوْمَ عَلٰى بُدْنِهِ وَاَنْ اَتَصَدَّقَ بِلَحْمِهَا وَجُلُوْدِهَا وَاَجِلَّتِهَا وَاَنْ لَا اُعْطِيَ الْجَزَّارَ مِنْهَا قَالَ نَحْنُ نُعْطِيهِ مِنْ عِنْدِنَا۔

______ رواہ البخاری ومسلم

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ آپ کی قربانیوں کا انتظام و انصرام کروں اور ان کا گوشت اور کھالیں اور جھولیں صدقہ کردوں اور قصاب کو (بطور اجرت اور حق المحنت کے) ان میں سے کوئی چیز نہ دوں آپ نے فرمایا کہ ہم ان کو اجرت الگ اپنے پاس سے دیں گے۔

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتٰى مِنًى فَاَتَى الْجَمْرَةَ

فَرَمَاهَا ثُمَّ اَتَى مَنْزِلَهُ بِمِنًى وَنَحَرَ نُسُكَهُ ثُمَّ دَعَا بِالْحَلَّاقِ وَنَاوَلَ الْحَالِقَ شِقَّهُ الْاَيْمَنَ فَحَلَقَهُ ثُمَّ دَعَا اَبَا طَلْحَةَ الْاَنْصَارِيَّ فَاَعْطَاهُ اِيَّاهُ ثُمَّ نَاوَلَ الشِّقَّ الْاَيْسَرَ فَقَالَ اِحْلِقْ فَحَلَقَهُ فَاَعْطَاهُ اَبَا طَلْحَةَ فَقَالَ اِقْسِمْهُ بَيْنَ النَّاسِ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (۱۰ ذی الحجہ کی صبح کو مزدلفہ سے) منیٰ تشریف لائے تو پہلے جمرۃ العقبیٰ پر پہونچکر اس کی رمی کی پھر آپ اپنے خیمہ پر تشریف لائے اور قربانی کے جانوروں کی قربانی کی پھر آپ نے حجام کو طلب فرمایا اور پہلے اپنے سر مبارک کی داہنی جانب اسکے سامنے کی، اُس نے اس جانب کے بال مونڈے، آپ نے ابوطلحہ انصاری کو طلب فرمایا اور وہ بال اُن کے حوالے کر دیئے، اس کے بعد آپ نے اپنے سر کی بائیں جانب حجام کے سامنے کی اور فرمایا کہ اب اس کو بھی مونڈ دو اس نے اس جانب کو بھی مونڈ دیا تو آپ نے وہ بال بھی ابوطلحہ ہی کے حوالے فرما دیئے اور ارشاد فرمایا کہ ان بالوں کو لوگوں کے درمیان تقسیم کر دو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(**تشریح**) حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی مندرجۂ بالا مفصل حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر منڈوانے کا یہ واقعہ ذکر سے چھوٹ گیا ہے حالانکہ یہ حج کے سلسلہ کے دسویں ذی الحجہ کے خاص اعمال اور مناسک میں سے ہے۔

جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا حلق یعنی سر منڈوانے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ پہلے داہنی جانب کے بال صاف کرائے جائیں پھر بائیں جانب کے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر اپنے بال ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کو عطا فرمائے یہ ابوطلحہ آپ کے خاص محبین اور فدائیوں میں سے تھے۔ غزوۂ اُحد میں حضور کو کافروں کے حملہ سے بچانے کے لیے انھوں نے اپنا جسم تیروں سے چھلنی کرا لیا تھا۔ اسکے علاوہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راحت و آرام اور آپ کے ہاں آنے والے مہمانوں کا بھی یہ بڑا خیال رکھتے تھے، الغرض اس قسم کی خدمتوں میں ان کا اور ان کی بیوی اُمّ سُلیم

(والدہ انس ؓ) کا ایک خاص مقام تھا، غالباً ان کی انہی خصوصی خدمات کی وجہ سے آپ نے سر مبارک کے بال ان کو مرحمت فرمائے اور دوسروں کو بھی انہی کے ہاتھوں سے تقسیم کرائے۔

یہ حدیث اہل اللہ اور صالحین کے تبرکات کے لیے بھی واضح اصل اور بنیاد ہے۔

بہت سے مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو "موئے مبارک" بتائے جاتے ہیں ان میں سے جن کے بارے میں قابل اعتماد تاریخی ثبوت اور سند موجود ہے غالب گمان یہ ہے کہ وہ حجۃ الوداع کے تقسیم کیے ہوئے انہی بالوں میں سے ہوں گے ـــــ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوطلحہ نے لوگوں کو ایک ایک دو دو بال تقسیم کیے تھے اس طرح ظاہر ہے کہ وہ ہزاروں صحابۂ کرام کے پاس پہونچے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اور ان کے انتقال کے بعد اُن کے اخلاف نے اس مقدس تبرک کی حفاظت کا کافی اہتمام کیا ہوگا اس لیے اُن میں سے بہت سے اگر اب تک بھی کہیں کہیں محفوظ ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن قابل اعتماد تاریخی ثبوت اور سند کے بغیر کسی بال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا "موئے مبارک" قرار دینا بڑی سنگین بات اور گناہ عظیم ہے اور بہر حال (اصلی ہو یا فرضی) اس کو اور اس کی زیارت کو ذریعۂ تجارت بنانا جیسا کہ بہت سی جگہوں پر ہوتا ہے بدترین جرم ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ اَللّٰهُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِيْنَ قَالُوْا وَالْمُقَصِّرِيْنَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَللّٰهُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِيْنَ قَالُوْا وَالْمُقَصِّرِيْنَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَالْمُقَصِّرِيْنَ ـــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں فرمایا اللہ کی رحمت ہو ان پر جنھوں نے یہاں اپنا سر منڈوایا حاضرین میں سے بعض نے عرض کیا یا رسول اللہ رحمت کی یہی دعا بال ترشوانے والوں کے لیے بھی فرما دیجئے۔ آپ نے دوبارہ ارشاد فرمایا کہ "اللہ کی رحمت ہو سر منڈوانے والوں پر"۔ اُن لوگوں نے پھر وہی عرض کیا تو تیسری دفعہ آپ نے فرمایا کہ "اور ان لوگوں پر بھی اللہ کی رحمت ہو جنھوں نے یہاں بال ترشوائے۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) عادت یا ضرورت کے طور پر بال منڈوانا یا ترشوانا کوئی عبادت نہیں ہے
حج اور عمرہ میں جو بال منڈوائے یا ترشوائے جاتے ہیں یہ بندہ کی طرف سے عبدیت اور تذلل
کا ایک اظہار ہے اس لیے خاص عبادت ہے اور اسی نیت سے منڈانا یا ترشوانا چاہیے۔
عبدیت اور تذلل کا اظہار سر منڈانے میں زیادہ ہوتا ہے اس لیے وہی افضل ہے اور اسی لیے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعائے رحمت میں اس کو ترجیح دی۔ واللہ اعلم

عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ خَطَبَنَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمَ النَّحْرِ قَالَ اِنَّ الزَّمَانَ اسْتَدَارَ کَھَیْئَتِہٖ یَوْمَ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ السَّنَۃُ اِثْنَا عَشَرَ شَھْرًا مِنْھَا اَرْبَعَۃٌ حُرُمٌ ثَلٰثٌ مُتَوَالِیَاتٌ ذُوالْقَعْدَۃِ وَذُوالْحِجَّۃِ وَالْمُحَرَّمُ وَرَجَبُ مُضَرَ الَّذِیْ بَیْنَ جُمَادٰی وَشَعْبَانَ وَقَالَ اَیُّ شَھْرٍ ھٰذَا قُلْنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ فَسَکَتَ حَتّٰی ظَنَنَّا اَنَّہٗ سَیُسَمِّیْہِ بِغَیْرِ اسْمِہٖ قَالَ اَلَیْسَ ذَا الْحِجَّۃِ قُلْنَا بَلٰی قَالَ فَاِنَّ دِمَاءَکُمْ وَاَمْوَالَکُمْ وَاَعْرَاضَکُمْ عَلَیْکُمْ حَرَامٌ کَحُرْمَۃِ یَوْمِکُمْ ھٰذَا فِیْ بَلَدِکُمْ ھٰذَا فِیْ شَھْرِکُمْ ھٰذَا وَسَتَلْقَوْنَ رَبَّکُمْ فَیَسْئَلُکُمْ عَنْ اَعْمَالِکُمْ اَلَا فَلَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ ضُلَّالًا یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰی مِنْ سَامِعٍ

رواہ البخاری ومسلم

ابو بکرہ ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع
میں) دسویں ذی الحجہ کو خطبہ دیا جس میں فرمایا، زمانہ گھوم پھر کر اپنی اس اصلی ہیئت پر
آگیا ہے جس پر وہ زمین وآسمان کی تخلیق کے وقت تھا ـــــ سال پورے بارہ مہینوں
ہی کا ہوتا ہے، ان میں سے چار مہینے خاص طور سے قابل احترام ہیں۔ تین مہینے
مسلسل، ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور چوتھا وہ رجب جو جمادی الاُخریٰ اور
شعبان کے درمیان ہوتا ہے اور جس کو قبیلہ مُضَر زیادہ مانتا ہے ـــــ اسکے

آپ نے فرمایا بتاؤ یہ کون مہینہ ہے؟ ہم لوگوں نے عرض کیا کہ اللہ و رسول ہی کو زیادہ علم ہے؛ اس کے بعد کچھ دیر آپ خاموش رہے یہانتک کہ ہم نے خیال کیا کہ اب آپ اس مہینہ کا کوئی اور نام مقرر کریں گے (لیکن) آپ نے فرمایا کیا یہ "ذی الحجہ" کا مہینہ نہیں ہے! ہم نے عرض کیا بے شک یہ ذی الحجہ ہی ہے۔ اسکے بعد آپ نے فرمایا بتلاؤ یہ کون شہر ہے؟ ہم لوگوں نے عرض کیا کہ اللہ و رسول ہی کو زیادہ علم ہے۔ آپ کچھ خاموش رہے، یہانتک کہ ہم نے خیال کیا کہ اب آپ اس شہر کا کوئی اور نام مقرر کریں گے۔ (لیکن) آپ نے فرمایا کیا یہ "بلدہ" نہیں ہے! (مکہ کے معروف ناموں میں ایک "بلدہ" تھا) ہم نے عرض کیا بے شک "ایسا ہی ہے۔ اسکے بعد آپ نے فرمایا یہ کون دن ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ اللہ اور اسکے رسول ہی کو زیادہ علم ہے۔ آپ نے فرمایا کیا آج "یوم النحر" نہیں ہے! (یعنی ۱۰ ذی الحجہ جس میں قربانی کی جاتی ہے) ہم نے عرض کیا بے شک آج یوم النحر ہے۔ اسکے بعد آپ نے فرمایا تمھارے خون اور تمھارے اموال اور تمھاری آبروئیں حرام ہیں تم پر (یعنی کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ناحق کسی کا خون کرے یا کسی کے مال پر یا اس کی آبرو پر دست درازی کرے۔ یہ سب تم پر ہمیشہ کے لیے حرام ہے، جیسا کہ آج کے مبارک اور مقدس دن میں خاص اس شہر اور اس مہینہ میں تم کسی کی جان لینا یا اس کا مال یا اسکی آبرو لوٹنا حرام سمجھتے ہو، بالکل اسی طرح یہ باتیں تمھارے واسطے ہمیشہ کے لیے حرام ہیں ـــــ اسکے بعد آپ نے فرمایا) اور عنقریب (مرنے کے بعد آخرت میں) اپنے پروردگار کے سامنے تمھاری پیشی ہوگی اور وہ تم سے تمھارے اعمال کی بابت سوال کرے گا۔ دیکھو میں خبردار کرتا ہوں کہ تم میرے بعد ایسے گمراہ نہ ہو جانا کہ تم میں سے بعض بعض کی گردنیں مارنے لگیں ـــــ (اسکے بعد آپ نے فرمایا) بتاؤ کیا میں نے اللہ کا پیام تم کو پہونچا دیا؟ سب نے عرض کیا کہ بیشک آپ نے تبلیغ کا حق ادا فرمادیا۔ (اسکے بعد آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر کہا) "اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ" (اے اللہ تو گواہ رہ!) (اس کے بعد آپ نے حاضرین سے فرمایا) جو لوگ یہاں حاضر اور موجود ہیں (اور انھوں نے میری بات سنی ہے) وہ ان لوگوں کو پہونچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ بہت سے وہ

لوگ جنکو کسی سننے والے سے بات پہنچے اس سننے والے سے زیادہ یاد رکھنے والے ہوتے ہیں اور وہ اس علم کی امانت کا حق زیادہ ادا کرتے ہیں) • (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(**تشریح**) اس خطبۂ نبوی کے ابتدائی حصہ میں زمانہ کے گھوم پھر کے اپنے اصلی ابتدائی ہیئت پر آجانے کا جو ذکر ہو اس کا مطلب سمجھنے کیلئے یہ جاننا ضروری ہو کہ جاہلیت میں اہل عرب کا ایک گمراہانہ دستور اور طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنی خاص مصلحتوں کے تحت کبھی کبھی سال تیرہ۱۳ مہینہ کا قرار دیتے تھے اور اسکے لیے ایک مہینہ کو مکرر مان لیتے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مہینوں کا سارا نظام غلط اور حقیقت کے خلاف تھا، اسلیے حج جو اُن کے حساب سے ذی الحجہ میں ہوتا تھا وہ اصل ذی الحجہ میں نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جاہلیت کے پچاسوں یا سینکڑوں برس کے چکّر کے بعد ایسا ہوا کہ اُن اہل عرب کے حساب سے مثلاً جو محرم کا مہینہ تھا وہی اصل آسمانی حساب سے بھی محرم کا مہینہ تھا اسی طرح جو اہل عرب کے حساب سے ذی الحجہ کا مہینہ تھا وہی اصل آسمانی حساب سے ذی الحجہ کا مہینہ تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کے ابتدائی حصہ میں یہی بات فرمائی ہو اور یہ بتلایا ہو کہ یہ ذی الحجہ جس میں یہ حج ادا ہو رہا ہو وہ اصل آسمانی حساب سے بھی ذی الحجہ ہی ہو اور سال بارہ ہی مہینہ کا ہوتا ہو اور آئندہ صرف یہی اصلی اور حقیقی نظام چلے گا۔

خطبہ کے آخر میں آپ نے خاص وصیت و ہدایت اُمت کو یہ فرمائی کہ میرے بعد باہم جدال و قتال اور خانہ جنگی میں مبتلا نہ ہو جانا اگر ایسا ہوا تو یہ انتہائی گمراہی کی بات ہوگی ـــــ اسی خطبہ کی بعض روایات میں "ضُلَّالاً" کے بجائے "كُفَّاراً" کا لفظ آیا ہو جس کا مطلب یہ ہوگا کہ باہم جدال و قتال اور خانہ جنگی اسلام کے مقاصد اور اس کی رُوح کے بالکل خلاف کافرانہ رویہ ہوگا اور اگر اُمت اس میں مبتلا ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے اسلامی رویہ کے بجائے کافرانہ طرز عمل اختیار کر لیا۔

اُمت کو یہ آگاہی آپ نے بہت سے اہم خطبوں میں دی تھی اور غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ پر کسی درجہ میں یہ منکشف ہو چکا تھا کہ شیطان اس امت کے مختلف طبقوں کو باہم لڑانے اور بھڑکانے میں بہت کچھ کامیاب ہوگا ـــــ وَكَانَ ذَالِكَ قَدَرًا مَقْدُورًا۔
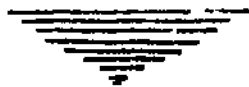
تجلیاتِ مجدد الف ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

ترجمہ:- ـــــــــ از:- مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب (۲۴۲) خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ کے نام

بعد الحمد والصلوٰۃ وتبلیغ الدعوات ـــ واضح ہو کہ تم نے جو مکتوب ملّا فتح اللہ کے ہاتھ بھیجا تھا ملا ـــ چونکہ وہ مکتوب، محبت واخلاص اور حرارت واشتیاق کے مضامین پر مشتمل تھا، اس لیے اس نے فرحت بخشی ـــ تمہارے مکتوب کے مطالعے کے وقت تمہاری نورانیت کی فراخی ووسعت ان اطراف (تمہارے علاقے) میں بہت زیادہ نظر آئی اور (اس چیز نے بہت کچھ) امیدوار کیا ـــ اس پر اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کرتا ہوں ـــ اور زیادہ کیا لکھوں محبت اطوارا! یہ معلوم نہ ہو سکا کہ سیادت مآب میر محمد نعمان نے (مجھ سے) جو خط وکتابت ترک روی اس کا باعث کیا ہے؟ اگر ان کو یہ وہم ہے کہ میں ان سے کچھ ناراض ہو گیا ہوں تو اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ وہ میری طرف سے انتہائی صفائی قلب تصور کریں۔ فقیر تو میر محمد نعمان کی نگہداشت کی بہت فکر اور سعی کرتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو طالبانِ حق کے کام میں (ان کے اندر) کوئی سستی آجائے..... دو ماہ کے قریب ہوئے کہ فقیر کو ضعف عارض ہو گیا ہے ـــ مکتوب سابق میں جو سوالات تم نے کیے تھے فقیر ان کے جوابات کی تحریر سے عاجز ہے۔ اگر صحت ہوئی تو ان شاء اللہ تعالےٰ جوابات لکھوں گا ورنہ دوستوں سے التماسِ دعا وفاتحہ ہے

حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل ـ والسّلام علیکم وعلیٰ سائر اھل اللّٰہ

فرزندانِ گرامی کو دُعا۔

مکتوب (۴۳) خواجہ محمد سعیدؒ و خواجہ محمد معصومؒ کے نام [سلطانِ وقت (جہانگیر) کی محفل میں دینی مذاکرات کا بیان]

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ــــ اس طرف کے احوال و اوضاع لائق حمد ہیں۔ عجیب غریب صحبتیں حاصل ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امورِ دینیہ اور اصولِ اسلامیہ کے اظہار و بیان میں بال برابر بھی سستی اور مداہنت داخل نہیں ہوتی ہے۔ جس طرح اپنی خلوتوں اور خاص مجلسوں میں بیان کیا کرتا تھا اللہ کی توفیق سے بالکل اسی طرح سلطانی مجلسوں میں بھی بیان کرتا ہوں اگر ایک مجلس کی بھی روداد لکھی جائے تو ایک دفتر درکار ہے۔ خصوصاً آج کی رات جو ۱۷ رمضان مبارک کی رات ہے حسب ذیل مضامین و عنوانات پر خوب گفتگو کی گئی۔

بعثتِ انبیاء علیہم السلام، عدمِ استقلالِ عقل، ایمان بہ آخرت، ثوابِ آخرت، اثباتِ دیدارِ حق بروزِ قیامت، خاتمیتِ نبوتِ خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم، مجددِ ہر صدی، اقتدا بخلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، سنتِ تراویح، بطلانِ تناسخ، احوالِ جن و جنیاں اور ان کے لیے عذاب و ثواب وغیرہ وغیرہ ــــ بادشاہ نے بڑے غور سے تمام مضامین سُنے۔ اسی کے ضمن میں اقطاب، ابدال اور اوتاد کے احوال اور ان کی خصوصیات کا بھی تذکرہ ہوا۔ الحمد للہ کہ سلطانِ وقت (کا مزاج) ٹھیک حالت پر ہے اور کسی قسم کا تغیر (جو دینی باتوں سے بے تعلقی پر دلالت کرے) ان کے چہرے سے ظاہر نہیں ہوا ہے ــــ ان پیش آمدہ واقعات اور ان ملاقاتوں میں شاید اللہ تعالیٰ کی کچھ مصلحتیں پوشیدہ تھیں۔ الحمد للہ الذی ھدانا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ لقد جاءت رسل ربنا بالحق۔ (تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہیں جس نے ہم کو اس کی ہدایت کی۔ اور ہم راہ یاب نہ ہوتے اگر اللہ تعالیٰ ہم کو راہ یاب نہ کرتا بیشک ہمارے رب کے رسول حق بات لے کر آئے)

دوسرے نوشتہ یہ قابل تحریر ہے کہ میرے نے حفظ قرآن کو سورہ عنکبوت تک پہونچا

مجلسِ سلطانی سے واپس آتا ہوں تراویح میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ حفظِ قرآن کی یہ دولت ان اوقاتِ فرصت میں جو کہ اوقاتِ جمعیت قلب تھیں۔ حاصل ہوگئی ـــــ
الحمد للہ اولاً و آخراً

[قیامت کے دن دیدارِ باری تعالیٰ کا انکار کرنے والوں کے رد میں]

مکتوب (۴۴) میر عبدالرحمٰن ولد میر محمد نعمان کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ـــ منکرینِ رویتِ باری تعالیٰ اگر مسئلہ دیدار پر جو اعتراض کرتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جو دلیل وہ نفیٔ دیدار کے سلسلہ میں لاتے ہیں وہ یہ ہے کہ ان ظاہری آنکھوں سے دیکھنا اس بات پر موقوف ہے کہ دیکھنے والے اور دیکھی ہوئی چیز میں محاذات و مقابلہ ہو ـــ اور یہ بات واجب تعالیٰ کے حق میں مفقود اور غیر موجود ہے اس لیے کہ اس سے جہت و سمت لازم آتی ہے جو احاطہ و تحدید تک پہونچانے والی ہے اور اس احاطہ و تحدید سے نقص لازم آتا ہے جو منافیٔ الوہیت ہے ـــ اللہ تعالیٰ کی شان احاطہ و رویت بہت اونچی ہے" جواب اس اعتراض و دلیل کا یہ ہے کہ جو قادرِ مطلق اس دنیا میں ضعیف و فانی ان آنکھوں کو جو محض خود ادراک حس و حرکت سے بیٹھے ہیں۔ یہ قدرت دیتا ہے کہ بشرطِ مقابلہ و محاذات وہ احساس و دیدارِ اشیا کر لیتی ہیں وہی قادرِ مطلق کیوں نہیں کر سکتا کہ عالمِ آخرت میں جو کہ قوی و باقی ہے۔ انھیں آنکھوں کو یہ قوت عطا فرما دے کہ وہ بے شرطِ مقابلہ و محاذات کسی چیز کو دیکھ سکیں خواہ وہ چیز جہت میں ہو یا بے جہت ہو ـــ آخر اس مسئلہ رویت کو بعید سمجھنے کی وجہ کیا ہے؟ اور اس کو محال کیوں سمجھا جاتا ہے؟ درانحالیکہ فاعل جل سلطانہٗ قدرت و توانائی کے اعلیٰ مرتبے پر ہے اور قابل یعنی آنکھ جو اثرِ فاعل کو قبول کرنے والی ہے، ہمیں احساس اور دیکھنے کی استعداد رکھتی ہے ـــ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض زمان اور بعض مکان (یعنی دنیا) میں بعض حکمتوں اور مصلحتوں کی بنا پر آنکھوں کے دیکھنے کے لیے شرطِ محاذات و تعین کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور بعض مکان اور بعض زمان (یعنی عالمِ آخرت) میں اس شرط کو ملحوظ نہیں فرمایا گیا ہے بغیر اس شرط کے ہی رویتِ بصر کو مقرر کیا ہے ـــ ایک مقام

کو دوسرے مقام پر قیاس کرنا ــــ حالانکہ دونوں مقاموں میں بہت زیادہ اختلاف ہے ــــ انصاف سے دور ہے ــــ نیز اپنی نظر کو مکشوفاتِ عالمِ ظاہری تک محدود رکھنا اور خالقِ زمین و آسمان کے عالمِ ملکوت سے انکار کرنا ہے ــــ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرتِ حق سبحانہ و تعالیٰ (قیامت میں ان ظاہری آنکھوں سے) دکھائی دیں گے تو اس صورت میں ان کا ہماری بصر سے احاطہ کیا ہوا اور ادراک کیا ہوا ہونا لازم آئے گا ــ یہ بات مستلزم حد و نہایت ہے اور حد و نہایت سے اللہ تعالیٰ وراء الوراء ہے ــــ جواب یہ ہے کہ جائز و ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ دکھائی دے اور نظر کا احاطہ کیا ہوا اور ادراک کیا ہوا نہ ہو اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے (جس کا ترجمہ یہ ہے) "اللہ کا نظریں احاطہ و ادراک نہیں کر سکتیں البتہ وہ نظروں کا احاطہ و ادراک کرتا ہے اور وہ لطیف و خبیر ہے" ــ مومنین آخرت میں حق تعالیٰ کو دیکھیں گے اور یقینِ وجدانی سے یہ محسوس کریں گے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہیں اور وہ لذت جو دیدار پر مرتب ہوتی ہے اس لذت .... کو بھی انتہائی درجے میں اپنے اندر محسوس کریں گے لیکن جس ذات کو وہ دیکھ رہے ہیں اس کو احاطہ و ادراک نہ کر سکیں گے ــ اس ذات کا پورا پورا حصول نہ ہو سکے گا اور سوائے وجدانِ رویت اور لذتِ دیدار کے مرئی (دیکھی ہوئی شے) سے کوئی چیز ان کے لیے نقد وقت نہ ہوگی۔

ــه عنقا شکار کس نشود دام باز چیں کاینجا ہمیشہ باد بدست است دام را

(اس) رویت میں جو نفی متصور ہے وہ بس ذات کے احاطہ و ادراک کی ہے کہ وہاں احاطہ و ادراک نہ ہوگا لیکن محض ثبوتِ رویت بے جہت میں اور اس لذت میں جو دیکھنے والے کو اس ذات اقدس کے دیکھنے سے حاصل ہوگی ــ کوئی کمی اور نقصان نہیں ہے بلکہ یہ تو اس ذاتِ عالی کا کمالِ انعام و احسان ہے کہ وہ اپنے جمالِ پر کمال کو سوختگانِ آتشِ محبت کے سامنے جلوہ گر فرمائے اور شربت وصالِ دیدار سے ان کو لذت یاب اور

ـه ۔ عنقا کسی سے شکار نہیں ہوتا ہے اپنے جال کو اٹھا کر رکھ لے اس جگہ جال کے لیے سوائے ہوا کے اور کچھ حاصل نہیں ہے۔

سیراب کرے ۔ اس سے کوئی بھی نقص جنابِ قدس کی طرف عائد نہیں ہوتا اور کوئی جہت و اضافہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

از آنطرف نپذیرد کمال او نقصان — وزیں طرف شرفِ روزگارِ ما باشد

ہم یہیں کہ مقابلہ و محاذات اگر حصولِ رویت میں شرط ہے تو چاہیئے کہ جس طرح دیکھی ہوئی چیز میں شرط ہے دیکھنے والے کے لیے بھی شرط ہو اس لیے کہ مقابلہ تو ایک نسبت ہے جو دیکھی ہوئی چیز اور دیکھنے والے دونوں میں قائم ہے ۔ پس اس بات سے یہ لازم آیا کہ حضرت حق سبحانہ وتعالےٰ بھی اشیاء کو نہ دیکھیں اور ان کے لیے بھی رویتِ اشیاء کی صفت ثابت نہ ہو حالانکہ یہ بات مخالفِ نصوصِ قرآنی ہے ۔ نیز مستلزم نقص ہے اور اللہ تعالےٰ کے لیے صفت کاملہ کی نفی کرتا ہے ۔ قرآن میں ہے ۔ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (تم جو عمل کرتے ہو اللہ تعالےٰ اس کو دیکھنے والا ہے) وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے) وَسَیَرَی اللّٰہُ عَمَلَکُمْ (عنقریب اللہ تعالےٰ تمہارے عمل دیکھے گا) .....

حضرت حق سبحانہ وتعالےٰ (منکرینِ رویت کو) انصاف کی توفیق دیں کہ وہ اپنے توہمات و تخیلاتِ فاسدہ کی بنا پر نصوصِ قرآنی کا انکار اور احادیثِ صحاحِ نبوی کی تکذیب نہ کریں اس قسم کے احکام پر ایمان لانا اور ان احکام کی کیفیت کو علمِ حق تعالےٰ کے سپرد کرتے ہوئے ادراکِ کیفیت کے قصور کو اپنی طرف راجع و عائد کرنا چاہیئے یہ نہ ہو کہ اپنے ادراک کو مقتدیٰ بنا کر احکام کی نفی کی جائے ۔ ایسا کرنا سلامتی و صواب سے بعید ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ بہت سی چیزیں حقیقت میں صادق ہوں اور ہماری عقولِ ناقصہ کے ادراک سے بعید سمجھی جائیں ۔ اگر محض عقل کافی ہوتی تو شیخ بوعلی سینا جیسا شخص جو کہ مقتدائے اربابِ معقول ہے تمام احکامِ عقلیہ میں حق پر ہوتا اور غلطی نہ کرتا حالانکہ " الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد " (واحد سے ایک چیز سے زیادہ صادر نہیں ہوتی) اس قول اور اس مسئلے میں بوعلی سینا نے جس قدر غلطی کی ہے کہ ناظرِ منصف پر تھوڑے سے تامل سے واضح ہو جاتی ہے ۔ بوعلی سینا کے اس

ے (دیدار سے) اس جانب تو کمال میں کوئی نقصان پیدا نہیں ہوتا اور اس جانب یعنی ہمارے لیے باعث شرف ہوتا ہے

قول پر امام فخر الدین رازیؒ نے سخت اعتراض کیا ہے اور یوں فرمایا ہے کہ "تعجب ہے اس شخص پر جس نے اپنی تمام عمر اس علم (منطق) کی تعلیم و تعلم میں ضائع کی جس علم کو خطار فی الفکر سے بچانے کا آلہ کہا جاتا ہے — پھر جب وہ شخص مطلب اشرف واعلیٰ کی طرف متوجہ ہوا تو اس سے ایسی باتیں سرزد ہوئیں جن پر بچے بھی ہنسیں — علمائے اہل سنت جمیع امور شرعیہ کو قبول کرتے اور مانتے ہیں، چاہے وہ عقل میں آئیں یا نہ آئیں — ایسا نہیں کرتے کہ ان امور کی کیفیت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ان کی نفی کر دیں — عذاب قبر، سوال منکر نکیر، پل صراط، میزان عمل اور ان جیسے بہت سے امور ہیں جن کے ادراک سے عقول ناقصہ عاجز ہیں علمائے اہل سنت نے اپنا مقتدیٰ کتاب سنت کو بنا کر عقول کو کتاب کا تابع کیا ہے۔ اگر عقلیں ادراک کر سکیں تو اچھی بات ہے ورنہ وہ احکام شرعیہ کو قبول کرتے ہوئے اپنے عدم ادراک کو اپنے قصور فہم پر محمول کرتے ہیں — دوسروں کی طرح یہ نہیں کہ جس چیز کو ان کی عقلیں قبول کریں اور معلوم کرلیں اس چیز کو تو وہ قبول کرلیں اور جو چیز ان کی عقلوں کی دسترس سے باہر ہو اس کو قبول ہی نہ کریں۔ ان (عقل پرستوں) کو شاید معلوم نہیں کہ بعثت انبیاءؑ اسی وجہ سے ہوئی ہے کہ عقلیں بعض بلند حقائق کے سمجھنے سے قاصر ہیں — عقل اگرچہ حجت ہے مگر حجت کاملہ نہیں ہے — حجت کاملہ بعثت انبیا سے مکمل ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (ہم نہیں ہیں عذاب دینے والے یہاں تک کہ بھیجیں ہم رسول کو) ...... اس ذات بیچون و بیچگونہ کا دیدار بھی بیچون و بیچگونہ ہے اس لئے کہ چون و چرا کا اس ذات بیچون کے معاملے میں کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس دیدار بیچون کو مخلوق کی رویت پر جس کا تعلق دنیا کی چیزوں سے ہے — قیاس کرنا انصاف سے دور ہے — واللہ سبحانہ الموفق للصواب

مکتوب (۴۵) مولینا سلطان سرہندی کے نام

[قلب مومن کی بلندی مقام اور اس کو ایذا دینے کی ممانعت کے بیان میں]

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ محمد وآلہ اجمعین

بعد حمد و صلوٰۃ واضح ہو کہ قلب ہمسایۂ حق سبحانہ ہے اور قلب کی مانند کوئی چیز جناب قدس

یک تر نہیں ہے۔ پس قلب کے ستانے سے مطلقاً پرہیز کرو خواہ کوئی بھی ہو مطیع ہو یا عاصی۔
ں لیے کہ ہمسایے کی حمایت وحفاظت کی جاتی ہے اگرچہ وہ عاصی کیوں نہ ہو۔ پس ایذائے
ب ذرہ اور بہت ڈرو کیونکہ کفر کے بعد جو کہ باعثِ آزارِ حق تعالیٰ ہے۔ کوئی گناہ ایسا
یں ہے جو قلب کو تکلیف پہونچانے سے زیادہ ہو اس لیے کہ قلب ایک ایسی قریب ترین شے ہے
ں کے ذریعے حق تعالیٰ سے واصل ہوتے ہیں۔ تمام مخلوق بندگانِ خدا میں شامل ہے۔
ر یہ بات سب کو معلوم ہے کہ کسی کے غلام کو مارنا اور اس کی توہین کرنا اس کے آقا کی ایذا
، سبب ہے پس خیال کرنا چاہیئے اس آقائے حقیقی کی عظمتِ شان کا جو مالک علی الاطلاق ہے
ور اس کا لحاظ کر کے اس کی مخلوق میں تصرف نہ کرے مگر اسی قدر جس کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ
یہ تصرف داخل ایذا نہیں ہے بلکہ بجا آوری حکم ہے۔ جیسا کہ بے شادی شدہ زانی کی اسکی
سزا سو کوڑے ہیں پس اگر کوئی شخص ان سو پر زیادتی کرے گا تو یہ فعل ظلم اور داخل ایذا
ہو جائے گا نیز جاننا چاہیئے کہ قلب مخلوقات میں افضل واشرف ہے اور جس طرح انسان
مخلوقات میں افضل ہے اپنی اجمالیت اور شمولیت کی بنا پر کہ عالم کبیر میں جو کچھ موجود ہے
وہ اس کے اندر موجود ہے اسی طرح قلب بھی اپنے کمالِ عدم ترکب اور اجمالیت و شمولیت
یں افضل ہے یعنی انسان میں جو خصوصیت ہے وہ قلب میں بھی موجود ہے اور جب کوئی شے
از روئے اجمال قوی تر ہو اور از روئے جمعیت و شمولیت کثیر تر ہو تو وہ جنابِ قدس تعالیٰ
سے قریب تر ہوتی ہے ——

مکتوب (۴۷) سلطانِ وقت (جہانگیر بادشاہ) کے نام [اسرار دعا اور مدحت علماء صلحاء]

کمترین دُعا گویاں احمد عرض کرتا ہے اور اپنی شکستگی دنیا زمندی کا اظہار کرتے
ہوئے اس نعمتِ امن وامان کا شکر ادا کرتا ہے جو آپ کی بدولت عوام وخواص کو حاصل
ہے نیز ان اوقات میں جن میں دعا کی قبولیت کا گمان ہے اور اجتماع فقراء کے موقع
پر آپ کے لشکرِ ظفر پیکر کے لیے فتح ونصرت کی دعا کرتا ہے اس لئے کہ ع ←

ع ہر کے را بہر کارے ساختند (ہر ایک کو کسی نہ کسی کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے)
کارخانۂ خداوندی میں کسی چیز کا عبث و لغو ہونا محال ہے ۔۔۔ جو کام لشکرِ غزا و جہاد سے وابستہ ہے وہ پایۂ دولت قاہرۂ سلطنت کی تقویت و تائید ہے کیونکہ اسی سے شریعت روشن کی ترویج و اشاعت متعلق ہے ..... اور یہی کارِ جلیل الاعتبار اس لشکرِ دعا سے بھی تعلق رکھتا ہے جو اربابِ فقراء و اصحابِ مصیبت و بلا کا لشکر ہے ۔ فتح و نصرت دو قسم کی ہے ۔ ایک قسم وہ ہے جو اسباب سے مربوط کی گئی ہے اور وہ صورتِ فتح و نصرت ہے اس کا تعلق لشکرِ غزا و جہاد سے ہے ۔ دوسری قسم حقیقتِ فتح و نصرت ہے جو مسبب الاسباب کے پاس سے آتی ہے ۔ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ (نہیں ہے نصرت و مدد مگر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے) یہ آیت اسی (دوسری قسم) کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور اس کا تعلق فقط لشکرِ دعا سے ہے ۔۔۔ لشکرِ دعا اپنی عاجزی و انکساری کی بنا پر لشکرِ غزا سے سبقت لے گیا ہے اور اس نے سبب سے مسبب کی طرف رہنمائی کی ہے ۔

ع بردند شکستگاں ازیں میداں گوئے

(شکستہ دل اور ٹوٹے پھوٹے حال والے ہی اس میدان میں سبقت لے گئے)
نیز دعا ردِ قضا کرتی ہے ۔ چنانچہ مخبرِ صادق صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لَا یَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ یعنی قضا کو دعا کے علاوہ کوئی چیز نہیں رد کر سکتی ۔۔۔ سیفِ جہاد میں یہ قوت نہیں ہے کہ رد قضا کرے ۔۔۔ پس لشکرِ دعا ضعف و شکستگی کے باوجود لشکرِ غزا سے زیادہ قوی ہے نیز لشکرِ دعا لشکرِ غزا کے لیے مانند روح ہے اور لشکرِ غزا لشکرِ دعا کا جسم و قالب ہے پس لشکرِ غزا کو لشکرِ دعا کے بغیر چارہ کار نہیں کیونکہ جسم بے روح قابلِ تائید و نصرت نہیں ہوا کرتا ۔ اسی وجہ سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ فقرائے مہاجرین کے توسل سے فتح و نصرت طلب فرمایا کرتے تھے حالانکہ لشکرِ غزا موجود تھا اور محاربین و مجاہدین کو غلبہ بھی حاصل تھا ۔ پس فقراء جو کہ لشکرِ دعا ہیں کسی دن کام آجاتے ہیں باوجود اپنی خواری و زاری اور بے اعتباری کے کہ اَلْفَقْرُ سَوَادُ الْوَجْہِ فِی الدَّارَیْنِ (مفلسی و کم مائیگی دونوں جہان کی روسیاہی کا باعث

ہو جاتی ہے) اس جملے کو ان کے بارے میں کہا گیا ہے ___ اور اس بے اعتباری کے ہوتے اعتبار پیدا کر لیتے ہیں اور سب سے آگے ہو جاتے ہیں ___ مخبر صادق صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن خونِ شہداء کو علماء کی روشنائی کے ساتھ وزن کریں گے علماء کی روشنائی کا پلہ جھک جائے گا سبحان اللہ یہ سیاہی اور سیاہ رُوئی ان کے لیے باعثِ عزت و سرخروئی بن گئی اور اس نے ان کے مرتبے کو پستی سے بلندی تک پہونچا دیا۔

ع ۔ بتاریکی دروں آبِ حیاتست (آبِ حیات ' تاریکی کے اندر ہے) ایک شاعر نے (کیا اچھا) کہا ہے ۔

ے غلامِ خویشتنم خواند لالہ رخسارے سیاہ روئی من کرد عاقبت کارے[عہ]

ہرچند یہ کمترین اس قابل نہیں ہے کہ اپنے آپ کو شکر دعا کے افراد میں شمار کرے لیکن محض اسمِ نقر اور احتمال اجابت دعا کی بنا پر خود کو دعائے دولتِ قاہرہ سے فارغ نہیں رکھتا۔ اور زبان حال وقال سے دعائے سلامتی کے ساتھ تر زبان رہتا ہے رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

مکتوب (۵۰) خواجہ میر محمد نعمان کے نام

الحمد للہ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفےٰ ۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ بندوں کو النفس کا (اپنی ذات کا) علم حضوری ہوتا ہے اور آفاق کا (باہری چیزوں کا) حصولی' اور جب کامل المعرفت عارف حق تعالیٰ کی اقربیت (نہایت قرب) کے خاص الخاص مقام تک پہونچ جاتا ہے تو اس کے لیے اپنا نفس آفاقی کے حکم میں ہو جاتا ہے پھر اس کا اپنے نفس کا علم بجائے حضوری کے حصولی ہو جاتا ہے اور حق تعالیٰ کی اقربیت اس کے لیے خود اپنے نفس کے حکم میں ہو جاتی ہے اور وہ علم حضوری جو پہلے اپنے نفس سے متعلق تھا اس سے متعلق ہو جاتا ہے ___ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خود کو عین واجب محسوس کرنے لگتا ہے اور جو علم نفس کی اس کے نفس سے متعلق تھا وہ بعینہٖ متعلق بحق تعالیٰ ہو جاتا ہے۔ (ایسا ہرگز نہیں)

عہ ایک لالہ رخسار (محبوب) نے مجھے اپنا غلام کہا آخر کار میری سیاہی رخ نے میرا کام بنا دیا۔

حق تعالیٰ اس سے وراء الوراء اور بالاتر ہے ــــ یہ بذات خود توحید کا ایک حال اور مقام ہے اور اس کا تعلق مقامات قرب سے ہے کیونکہ "نہایت قرب" بھی ایک طرح کا اتحاد ہے یہ مقام اقربیت اور چیز ہے اور اس کا معاملہ دوسرا ہے ۔ اتحاد کے مقام سے آگے گزر جانا چاہئیے اور اثنینیت (دوئی) کے مقام پر آجانا چاہیئے تاکہ "اقربیت" مقصود ہو سکے ـــــ کسی کوتاہ فہم کو یہاں اثنینیت (دوئی) کے لفظ سے خواہ مخواہ کا وہم نہ ہو اور وہ اس کو "اتحاد" و "یگانگت" کے مقام سے نیچے کے درجہ کی چیز نہ سمجھ بیٹھے اصل بات یہ ہے کہ اثنینیت کا وہ مقام جو مقام اتحاد سے نیچے کے درجہ کا ہے وہ تو بیچارے عوام کالانعام کا مقام ہے ۔ اور یہ خاص مقام اثنینیت (جس میں یہاں کلام ہو رہا ہے) مقام اتحاد سے ہزاروں درجہ بالاتر ہے ۔ اور یہ انبیاء علیہم السلام کا مقام ہے ـــ اور یہ بات بالکل ایسی ہے کہ صحو جو سکر سے پہلے ہوتا ہے وہ عوام کا حال ہے اور جو سکر کے بعد آتا ہے وہ خواص بلکہ اخص الخواص کا مقام ہے اسی طرح اسلام جو "کفر طریقت" سے پہلے ہوتا ہے وہ عوام مسلمین کا اسلام ہے اور جو درجہ اسلام کا "کفر طریقت" کے بعد نصیب ہوتا ہے وہ خواص بلکہ اخص الخواص کا اسلام ہے ۔

بہرحال عجیب معاملہ ہے کہ (اس مقام اقربیت میں) عارف اگرچہ اپنے کو عین واجب تعالیٰ نہیں جانتا لیکن علم حضوری جو اس کے اپنے نفس سے متعلق تھا وہ واجب تعالیٰ سے متعلق ہو جاتا ہے اور اپنے نفس کا علم حضوری علم حصولی بن جاتا ہے (اور گویا اپنا نفس اسکے لیے غیر اور باہر کی چیز ہو جاتی ہے)

ع درعشق چنیں بو العجبیہا باشد[1]

ہماری عقل ان دقیق حقیقتوں کا سراغ بھی نہیں پاتی اور نارسائی سے اس قسم کی باتوں کو جمع ضدین قرار دیتی ہے اور حقیقت شناس عارف کہتا ہے کہ "عَرَفْتُ رَبِّیْ بِجَمْعِ الْاَضْدَادِ" (میں نے تو اس جمع اضداد ہی سے اپنے رب کو پہچانا ہے)

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً وَّھَیِّیْٔ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝ ۔ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی

[1] عشق میں ایسے ہی عجیب و غریب واردات آتے ہیں ۔

جدید تعلیم حاصل کرنے کا مسئلہ

از جناب وحید الدین خاں صاحب (اعظم گڑھ)

"علماء وقت کے تقاضوں کو نہیں پہچانتے، وہ قدامت پرست اور دقیانوسی ہیں"۔
یہ علماء کے اوپر جدید طبقہ کا ایک عام اعتراض ہے۔ ان کے نزدیک اس کی ایک بہت واضح مثال یہ ہے کہ علماء انگریزی اور جدید علوم کی تعلیم کو جائز نہیں سمجھتے جبکہ کسی زبان اور کسی علم میں کوئی خرابی نہیں، اور موجودہ زمانے میں تو یہ زبان اور یہ علم کسی قوم کی ترقی اور سربلندی کے لیے بالکل ضروری ہو گئے ہیں۔

یہ علماء کے بارے میں ایک عام بات ہے، مگر یہ بات جتنی عام ہے اتنی ہی غلط ہے، میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کوئی بھی واقعی عالم ایسا موجود نہیں ہے اور نہ کبھی موجود تھا جو نفس علوم جدیدہ یا نفس انگریزی زبان کی تحصیل کو حرام سمجھتا ہو۔ اگر کوئی شخص علماء کی طرف اس بات کو منسوب کرتا ہے کہ وہ علوم جدیدہ کی مجرد تحصیل کے مخالف ہیں تو یہ ایک سراسر غلط الزام ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ علماء کی مخالفت بہ اعتبار تعلیم نہیں بلکہ باعتبار انجام ہے۔ یعنی وہ اصلاً تعلیم جدید کے مخالف نہیں ہیں بلکہ اس انجام کے مخالف ہیں جو عموماً اس تعلیم کے بعد نوجوانوں میں پیدا ہو جاتا ہے اور پھر زندگی بھر قائم رہتا ہے، اسی عمومی انجام کو دیکھ کر انھوں نے مسلم نوجوانوں کو اس تعلیم سے روکنا شروع کر دیا۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ ہرگز اس سے روکنے کی ضرورت نہ سمجھیں، بلکہ اس کی ترغیب دلانے والے بن جائیں۔

مولانا شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے یہ سوال آیا کہ "تحصیل علم منطق و انگریزی مثلاً شخصے اشتغال آں وارد، بر جواز و عدم آں چہ حکم است"۔ آپ نے اس کا

جواب اس اُصول کی روشنی میں دیا کہ ــــــ لِلْاٰلَۃِ حُکْمُ ذِی الْاٰلَۃِ یعنی علم منطق کی حیثیت ایک آلہ کی ہے اور جو چیز آلہ کی حیثیت رکھتی ہو اس کی حلت وحرمت کا حکم اس کو استعمال کرنے والے کے اعتبار سے ہوتا ہے، چنانچہ آپ نے کہا کہ علم منطق کو اگر دین کی تقویت کے لیے استعمال کیا جائے تو عین جائز ہے اور دین کے خلاف استعمال کیا جائے تو حرام ہے۔ اسی طرح انگریزی زبان سیکھنے کے بارے میں آپ نے لکھا:

تعلم انگریزی یعنے آئین خط و کتابت و لغت و اصطلاح اینہا را دانستن باکے ندارد اگر بہ نیت مباح باشد زیرا کہ در حدیث وارد است کہ زید بن ثابت بحکم آنحضرت صلی اللہ علیہ و علی آلہ و اصحابہ وسلم روش خط و کتابت یہود و نصاریٰ و لغت آنہا را آموختہ بود برائے این غرض کہ اگر برائے آنحضرت صلعم خطے بایں لغت در رسم خط برسد جواب آں تواند نوشت و اگر بمجرد خوشامد آنہا و اختلاط باآنہا تعلیم این لغت نماید و بایں وسیلہ پیش آنہا تقرب جوید پس البتہ حرمت و کراہت دارد۔

مجموعہ فتاویٰ عزیزی۔ جلد دوم صفحہ ۱۹۵

انگریزی تعلیم یعنی اس کے لکھنے کا طریقہ جاننا اس کی زبان اور اصطلاح کو سمجھنا کوئی حرج نہیں رکھتا بشرطیکہ صرف مباح کی نیت سے ایسا کرے کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے موافق زید بن ثابت نے یہود و نصاریٰ کا خط وکتابت کا طریقہ اور ان کی زبان سیکھی تھی تاکہ اگر آنحضرت کی خدمت میں اس زبان اور رسم الخط میں کوئی مراسلہ آئے تو اس کا جواب لکھ سکیں اور اگر صرف ان کو خوش کرنے کی غرض ہے اور ان سے اختلاط رکھنے کے لیے اس زبان کو سیکھے اور اس ذریعہ سے ان کے یہاں تقرب حاصل کرنا چاہے تو البتہ اس میں حرمت وکراہت ہے۔

کسی علم میں بجائے خود کوئی خرابی نہیں ہوتی اور نہ کوئی زبان محض زبان ہونے کی حیثیت سے غلط ہوتی ہے تاہم ہر زبان اور ہر علم کسی نہ کسی انسانی گروہ سے وابستہ ہوتا ہے یہ انسانی گروہ اگر خیر پسند ہو تو اس کی زبان اور اس کے علوم پر خیر پسندی کی روح چھائی ہوئی ہوگی

اور اگر وہ شر پسند ہے تو اس کی زبان اور اس کے علوم بھی اپنے ساتھ اسی قسم کی فضا رکھتے ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں ہر زبان اور ہر علم اپنے ساتھ ایک تہذیب بھی رکھتا ہے۔ اگر زبان و علوم کو اس کی تہذیب سے الگ کرکے لیا جائے تو وہ خالص علمی چیز ہوگی۔ البتہ اگر علم کے ساتھ اس کے اندر لپٹی ہوئی تہذیب کو بھی قبول کر لیا جائے، تو گمراہ اقوام کی تہذیب ہونے کی صورت میں یہی چیز مضر اور قابل اجتناب بن جاتی ہے۔

زبان و علوم میں تہذیب کے اثرات مختلف راستوں سے داخل ہوتے ہیں۔ یہاں میں اس کی چند مثالیں دوں گا۔

کسی تہذیب کے حامل افراد جو زبان لکھتے اور بولتے ہیں اور جو ان کے زیر سایہ ترقی کرتی ہے۔ قدرتی طور پر اس کے اسالیب، اس کی ترکیبیں اور اصطلاحات ان کے مخصوص تصور میں رنگ جاتے ہیں۔ قدیم عربی زبان ایک ایسی قوم کی زبان تھی جو گھوڑے اور شراب کی رسیا تھی۔ چنانچہ اس کی زبان بھی اس رنگ میں رنگ گئی۔ اس کے بعد اسلام کے ماننے والوں نے جب اس زبان کو اپنایا تو صرف آدھی صدی میں اس کو اس طرح بدل دیا کہ اس کے لفظ لفظ میں گویا اسلام کی بو محسوس ہونے لگی۔ یہی موجودہ زبانوں کا حال ہے۔ یونانیوں اور رومیوں نے چاند کی تانیث کرکے اسے دیوی قرار دیا۔ ان کے نزدیک یہ دیوی سیلین (ملکہ شب) کے نام سے موسوم تھی۔ چنانچہ چاند کے جغرافیہ کے متعلق علم اب بھی سیلینو گرافی (SELENOGRAPHY) کہلاتا ہے۔ اسی طرح علمائے جدید اسلام کے لئے محمڈنزم (MOHAMMEDANISM) کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ یہ بھی ان کے مخصوص ذہن کی پیداوار ہے۔ کیونکہ جدید ذہن مذہب کا تصور ایک الہامی یا خدائی چیز کی حیثیت سے نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اس کو اسی طرح ایک شخص کی ذاتی تخلیق سمجھتا ہے جیسے شعر کسی شاعر کے اپنے ذہن کی تخلیق ہوتا ہے۔ اس مخصوص ذہن کے تحت جب اس نے اسلام کو ایک نام دینا چاہا تو خود لفظ اسلام اس کو ناکافی نظر آیا۔ کیونکہ اس میں تو صرف یہ مفہوم ہے کہ یہ دین اطاعت الٰہی کا دین ہے۔ چنانچہ اس کے تعارف کے لئے اس نے "محمڈنزم" کا نام اختیار کیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دین جس کو محمدؐ نے شروع کیا۔ بالکل ویسے ہی جیسے مارکسی اشتراکیت کو اس کے مصنف کی طرف منسوب کرتے ہوئے مارکسزم (MARXISM) کہا جاتا ہے۔

ہر تہذیب اسی طرح اپنے مخصوص تصورات کو اپنی زبان میں بھر دیتی ہے اور طویل مدت کے

عمل سے یہ تصورات اس طرح اس میں رچ بس جاتے ہیں کہ الگ سے انھیں دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے اور آدمی بے سوچے سمجھے ان کو اپنے ذہن میں اتارتا چلا جاتا ہے۔ آدمی شعوری طور پر واقف نہیں ہوتا کہ اس نے فلاں لفظ یا فلاں ترکیب کے ساتھ فلاں عقیدے کو بھی اپنے اندر نگل لیا ہے۔ مگر ذہن کی زمین بہرحال نئے تصورات کے لئے ہموار ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بالکل نئی زمین بن جاتی ہے اور اس کے باوجود آدمی اس غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہو کہ اس کا ذہن وہی ہے جو پہلے تھا۔

۲۔ تہذیب کا یہ طرز فکر جو الفاظ اور ترکیبوں میں ظاہر ہوتا ہے، وہی زیادہ واضح شکل میں خود علوم کی مختلف شاخوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ موجودہ زمانے کا ہر وہ علم اس کی مثال ہے جو بے خدا تہذیب کے زیر سایہ پرورش پاکر نکلا ہے۔ ایسے تمام علوم اپنے آغاز سے لے کر انجام تک اس طرح سفر کرتے ہیں کہ کہیں ادنیٰ شائبہ بھی اس بات میں جھلکتا کہ یہاں کوئی خدا ہے۔ یا کوئی دوسری زندگی ہے، یا کوئی علم بذریعہ الہام بھی انسان کے اوپر القا ہوا ہے۔ اس قسم کے تمام حقائق کو موجودہ علوم اس طرح نظر انداز کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں جیسے کوئی میل ٹرین اپنی تیزی میں چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو چھوڑتی چلی جارہی ہو۔ گویا کہ یہ اسٹیشن اسٹیشن نہیں ہیں بلکہ محض فرضی گھروندے ہیں اور ٹرین کو انھیں تسلیم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس کا نتیجہ فطری طور پر یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان علوم کو پڑھتے ہیں، وہ خواہ رسمی عقیدے کے طور پر خدا کو مانتے ہوں، مگر علمی اور شعوری حیثیت سے ان کا جو ذہن بنتا ہے وہ یہ ہوتا ہے کہ یہاں خدا کی کوئی ضرورت نہیں۔ زمین و آسمان کے کسی بھی مقام پر انھیں خدا کی کوئی جھلک نہیں ملتی۔ کائنات کا وجود ان کو اپنے مطالعہ میں ایک اتفاقی حادثہ کی پیداوار معلوم ہوتا ہے۔ دنیا کا سارا نظام ان کے علمی مشاہدہ میں اپنے آپ بالکل فطری قوانین کے تحت چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جب وہ تاریخ کو پڑھتے ہیں تو انھیں نظر آتا ہے کہ تاریخ محض انسانی ارادہ اور خارجی عوامل کے دو طرفہ اثرات کے تحت پیش آنے والا ایک واقعہ ہے۔ غرض کسی علم میں ان کو فوق الفطری قوتوں کے آثار نظر نہیں آتے۔ بلکہ ہر جگہ معلوم فطری قوانین کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔ حتیٰ کہ جب وہ سماجی علوم کا مطالعہ کرتے ہیں تو جدید تحقیقات انھیں بتاتی ہیں کہ مذہب کوئی خدائی یا الہامی چیز ہی نہیں۔ وہ تو محض ایک سماجی عمل ہے جس طرح بہت سی سماجی روایات سماج میں غیر آسمانی اسباب کے تحت پیدا ہوئیں اور شکلیں بدل بدل کر باقی رہیں۔ اسی طرح مذہب بھی ایک سماجی پیداوار ہے۔ اس سے زیادہ مذہب کی کوئی حقیقت نہیں موجودہ تعلیم کا

کی مثال سنیما ہال سے دی جاسکتی ہے جہاں نمائش کے وقت صرف پردہ پر تصویروں کو حرکت کرتا ہوا دکھایا جاتا ہے۔ اور بقیہ تمام روشنیاں بجھا دی جاتی ہیں جس کی وجہ سے آدمی ان انتظامات سے بالکل اندھیرے میں ہوجاتا ہے جس کے تحت پردہ پر نظر آنے والے واقعات ظاہر ہورہے ہیں۔ وہ واقعات کو دیکھتا ہے مگر ان انتظامات کو نہیں دیکھتا جو واقعات کے پیچھے کام کررہے ہیں۔ اسی طرح ہماری جدید تعلیم گاہوں میں "کیا ہورہا ہے" کا منظر دکھایا جاتا ہے اور وہ تمام روشنیاں گل کردی گئی ہیں جو "کیوں ہورہا ہے" کا منظر طالب علم کو دکھا سکتی تھیں۔ ان حالات میں ہمارے طالب علم کی مثال اس دیہاتی گنوار کی سی ہوگئی ہے جو پہلی بار سنیما ہال کے اندھیرے میں داخل ہو اور اپنی ناواقفیت اور محدود مشاہدہ کی وجہ سے سمجھ لے کہ پردہ پر نظر آنے والے واقعات خود بخود ہوتے چلے جارہے ہیں۔ ان کے پیچھے کوئی اور ہاتھ کام نہیں کررہا ہے۔ اس طرح جدید علوم، آدمی کو عملی طور پر بالکل بے دین بنا دیتے ہیں۔ اس کی زندگی میں مذہب کسی شکل میں باقی بھی ہو تو اس کی حیثیت چھنگلیا سے زیادہ نہیں ہوتی جسکو بعض خاص طبیعت کے لوگ لٹکائے پھرتے ہیں اور بعض غیر ضروری سمجھ کر اس کا آپریشن کرا دیتے ہیں۔

۲۔ اسی طرح ماحول بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تہذیب جس طرح الفاظ اور معانی میں اپنا رنگ بھرتی ہو اسی طرح وہ اپنے نظریات اور مزاج کے مطابق ماحول بھی بناتی ہے۔ جب ایک طالب علم داڑھی رکھنے کی وجہ سے اپنے کالج میں "مولوی جی" کا خطاب پاتا ہے اور جب ایک طالبہ کو گرلز اسکول میں دوپٹہ اوڑھ کر جانے کی بنا پر اس کی ہم سبق لڑکیاں "ملانی بی" کہہ کر چڑاتی ہیں، تو یہ دراصل ایک تہذیب ہوتی ہے جو ماحول کی زبان سے بول رہی ہوتی ہے۔ اسی طرح تہذیب پورے ماحول کو اپنے مخصوص مزاج کے مطابق ایک لباس[1] عطا کرتی ہے اور اس کو مختلف پہلوؤں سے اس طرح مزین کرتی ہے کہ اس کے دائرے میں صرف وہی ایک باوقعت لباس نظر آتا ہے اب جو شخص اس کے احاطہ میں کوئی مختلف لباس پہن کر داخل ہوتا ہے۔ وہ کچھ دن تک تو اپنی سابقہ عادت کو برقرار رکھتا ہے۔ مگر بہت جلد ماحول اسے محسوس کرا دیتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو کارٹون بنائے ہوئے ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زیادہ دن نہیں گزرتے پاتے کہ وہ اپنے سابق کا دقیانوسی لباس کو اتار کر اپنے ماحول کا لباس پہن لیتا ہے اور "مہذب" انسانوں کی طرح اس کے اندر رہنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ صورت حال اسقدر عام

---

[1] یہاں لباس کا لفظ مخصوص طور پر کپڑے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ پوری زندگی کے طور طریقوں کے بارے میں ہے۔

ہے اور بہ پرستی میں اس کی اتنی کثیر مثالیں موجود ہیں کہ اس پر کسی تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں ۔

۴۔ اس سلسلے میں یہاں میں ایک اور چیز کو شامل کروں گا جو مخصوص طور پر کسی تہذیب کا منطقی نتیجہ تو نہیں ہے مگر موجودہ تہذیب کے ساتھ کم از کم فی الحال وہ یقینی طور پر وابستہ ہے ۔ اس سے میری مراد آمدنی کی زیادتی ہے کسی عربی درس گاہ کا طالب علم اپنے مدرسہ میں اوّل آئے تو اس کو زبانی شاباش کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا جبکہ جدید علوم کا ایک طالب علم امتیازی نمبروں سے پاس ہو تو وہ فوراً قیمتی وظائف کا مستحق قرار پا جاتا ہے قدیم طرز کی درس گاہوں میں ریسرچ کے طلبا کو پچاس ساٹھ روپے مہینے پانا بھی مشکل ہے جب کہ جدید یونیورسٹیوں میں ریسرچ اسٹوڈنٹس کو سیکڑوں روپے ماہوار اور دیگر الاؤنس دئے جاتے ہیں پھر جب وہ کامیابی کے ساتھ اپنے تعلیمی مرحلے کو پار کر لے تو اسی کے لئے بیش قیمت بیرونی وظائف اور اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں ۔

جدید تعلیم کے ساتھ اس مادی پہلو کے الحاق نے اسکو زبردست فتنہ بنا دیا ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ جو شخص اس میدان میں کامیاب ہوا، فوراً اس کا معیار زندگی بڑھ جاتا ہے، زندگی کے تعیشات اس کے لئے ضروری ہو جاتے ہیں، ترقی کے امکانات کی موجودگی کی وجہ سے ہمیشہ اس کی بہترین توجہ ایسے سراغ ڈھونڈھنے میں لگی رہتی ہے جس سے وہ اور زیادہ بڑی تنخواہ یا اور زیادہ اونچا منصب حاصل کرے ۔ وہ دیکھتے دیکھتے دنیا پرست بنجاتا ہے ۔ وہ عیش اور سہولت کا عادی ہو جاتا ہے، وہ دولت کو سب سے بڑی چیز سمجھنے لگتا ہے، دنیا کے ساز و سامان کے ہجوم میں آخرت کا خیال اس کے ذہن سے یا تو نکل جاتا ہے یا کم از کم دھندلا پڑ جاتا ہے۔ وہ ان سطحی آدمیوں کی طرح بن کر رہ جاتا ہے جو بس مادی ظواہر میں لپٹے رہتے ہیں اور لطیف حقیقتوں کی انھیں کوئی خبر نہیں ہوتی بلکہ وہ اس سے اتنا زیادہ ناآشنا ہو جاتے ہیں کہ ان کا مذاق اڑانے لگتے ہیں، گویا کہ ایسی حقیقتیں سرے سے موجود ہی نہیں۔

جدید تعلیم کے ساتھ قباحت کے یہی پہلو ہیں جو اس طرف سے لوگوں کو متوحش بنا دیتے ہیں۔ اگر یہ مجرد تعلیم ہوتی اور اس کے ساتھ تہذیب کی خرابیاں لپٹی ہوئی نہ ہوتیں تو اس سے روکنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ وہ واحد چیز جس نے اس سے قطع تعلق کا ذہن پیدا کیا وہ اس کا یہی پہلو ہے۔ یہ پہلو اگرچہ اضافی ہے مگر وہ اس کے ساتھ اس طرح شامل ہو گیا ہے کہ ہم دونوں کو الگ نہیں کر سکتے ۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے لئے امید کی کوئی صورت نہیں۔ کیا لازماً اس تعلیم سے الگ رہنا ہی ہمارے لئے ایک صحیح رویہ ہے اور اس سے وابستگی کی کوئی صحیح شکل نہیں ہو سکتی۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے لئے امید کی

صورت موجود ہے۔ اور وہ یہ کہ اگرچہ اس تعلیم کو فی الحال ہم اس کے اپنے دائرے میں تہذیب سے الگ نہیں کرسکتے، مگر اپنے ذہن میں یقینی طور پر اس کو الگ کرسکتے ہیں اور اس وقت ہم کو یہی کرنا چاہیئے۔

ہماری قوم کے نوجوان اگر پہلے اپنے دین کو جان چکے ہوں، اس کو سختی سے پکڑ لیں اور لینے کے لئے نہیں بلکہ دینے کے جذبے کے تحت جدید اداروں میں گھسیں تو یقیناً ان کا تحصیل علم نہایت مبارک ہوگا اور خود دین کے لئے بےحد مفید ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان نوجوان جدید علم کو پڑھ پڑھ کر جس انجام سے دوچار ہوئے، اس کا سبب کالجوں اور یونیورسٹیوں سے بڑھ کر خود ان کے اپنے اندر ہے۔ ان کی سطحیت اور دین سے بےتعلقی نے یہ نتائج اس شدت کے ساتھ پیدا کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنے دین کی عظمت کو سمجھتے اور سطحی چیزوں سے متاثر ہونے کے بجائے اعلیٰ مقاصد پر ان کی نگاہ ہوتی تو وہ فرعون کے گھر سے موسیٰ بن کر نکلتے۔ اور یہی مسلمان کی اصلی شان ہے۔

قوم کے نوجوانو! مغربی زبانیں سیکھو مگر شاہ عبدالعزیز صاحب کے الفاظ میں اسلام کی ترجمانی کرنے کے لئے یورپ اور امریکا جاؤ مگر وہاں متاع ایمان لٹانے کے لئے نہیں بلکہ گمراہ دنیا کو حق کا پیغام پہنچانے کا شدید احساس حاصل کرنے کے لئے، زندگی کے ہر شعبے میں گھسو اور ہر بلندی پر پہونچو مگر سچا اور پکا مسلمان ہونا تمھاری نمایاں ترین خصوصیت ہو، جدید علوم حاصل کرو مگر عبدالماجد دریابادی اور ڈاکٹر حمید اللہ کی زندگیاں تمھارے سامنے ہوں، اعلیٰ مناصب پر فائز ہو مگر صدیق حسن بن کر رہو، تہذیب کے مرکزوں میں جاؤ مگر محمد علی اور اقبال بن کر لوٹو۔ تمھارا صرف ماضی شاندار نہیں ہے بلکہ آج بھی اعلیٰ ترین مثالیں تمھارے درمیان موجود ہیں۔ تم ایک ایسے دین کے حامل ہو جو سارے نظاموں اور تہذیبوں سے برتر ہے، پھر تم کیوں اپنے آپ کو کھوتے جارہے ہو۔ تم نے زندگی کا ایک ایسا اعلیٰ مقصد وراثت میں پایا ہے جس کے آگے ساری دنیا ہیچ ہے پھر دنیا کی سطحی کاوشوں میں کیوں کھوئے جارہے ہو۔ جدید علوم کا شکار ہونے کے بجائے خود جدید علوم کے میدان کو اپنا شکار بناؤ، دنیا سے متاثر ہونے کے بجائے خود دنیا پر چھا جانے کا ذہن پیدا کرو، زمانے کے رنگ میں رنگنے کے بجائے زمانے کو اپنے رنگ میں رنگ ڈالو۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

جدید علوم کے ساتھ گمراہ اقوام کی تہذیب کے وہ ناخوش گوار پہلو جن کا میں نے اوپر ذکر کیا، وہ ایسے [illegible] علوم کو الگ کرنا ممکن نہیں۔ اگر ایک من نمک میں ایک سیر شکر ملا کر ڈال دیں تو حقیقی

کو چن لے گی اور نمک کو چھوڑ دے گی۔ پھر جو چیز چیونٹی جیسے حقیر جاندار کے لئے ممکن ہے وہ کیا انسان کے لئے ممکن نہیں ہو سکتی۔

الف۔ زبان اور اسالیب بیان کی قسم کے جو اثرات ہیں، ان کو معمولی غور و فکر سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اور اگر آدمی کا ذہن بیدار ہو تو ان کو سمجھ لینا ہی ان کے مضر اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے کافی ہو۔ المنجد موجودہ زمانے میں عربی کا ایک مشہور ترین مختصر لغت ہے جو جدید طرز ترتیب کا حامل ہونے کی وجہ سے مسلم طلبہ میں بے حد مقبول ہوا ہے۔ اس لغت کا مصنف ایک عیسائی ہے۔ چنانچہ اس نے کتاب کے مختلف مقامات پر عیسائیت کے مخصوص عقائد کو لغت میں ٹھونسنے کی کوشش کی ہے مثلاً لفظ عذراء کی تشریح میں یہ الفاظ درج ہیں :

لقب السيدة مريم والدة الاله المتجسد — عذرا حضرت مریم کا لقب ہے جو والدہ ہیں خدائے جسمانی کی

اسی طرح لفظ مسیح کے تحت لکھا ہوا ہے۔

لقب الرب يسوع ابن الله المتجسد — مسیح خدائے یسوع کا لقب ہے جو اللہ کے بیٹے ہیں جسمانی۔

ایک طرف تو بیان لغت کے پردے میں ادنیٰ ادنیٰ مناسبتوں کو ڈھونڈ کر خالص فنی کتاب میں عیسائی عقائد کا پرچار کیا گیا ہے۔ اور دوسری جانب یہ حال ہے کہ لفظ احمد اور محمد کا ذکر آتا ہے تو صرف لغوی ترجمہ کر کے آگے بڑھ جاتا ہے اور اس کا ذکر تک نہیں آتا کہ یہ لفظ دنیا میں کسی ہستی کا نام بھی ہے۔

یہ کتاب کم از کم چوتھائی صدی سے عربی درسگاہوں میں کثرت سے استعمال ہو رہی ہے مگر مسلم طلبہ کے عقائد میں اس کی وجہ سے ادنیٰ نقصان بھی نہیں ہوا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ لغت مسلمانوں میں عموماً ایسے لوگ استعمال کرتے ہیں جو اسلام اور غیر اسلام سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی علوم کے ان طلباء کو اس طرح کے بیانات صرف مضحکہ خیز نظر آتے ہیں وہ کسی طرح ان کو متاثر کرنے کا باعث نہیں بنتے۔ اسی طرح جدید علوم کے طلبہ اگر دین سے واقفیت کا اہتمام کر لیں اور اس کے بارے میں پہلے سے باشعور ہوں تو یقینی طور پر وہ زبان و بیان میں نفوذ کی ہوئی گمراہیوں سے بچ سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ اس طرح کی چیزوں کو پڑھ کر حقارت کے ساتھ انھیں رد کر دیں گے۔ نہ یہ کہ ان سے متاثر ہوں۔

ب۔ یہی صورت علمی نظریات کے سلسلے میں پیش آرہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا کا کوئی بھی واقعہ بذات خود مذہب کی تردید نہیں کرتا۔ یہ صرف واقعات کی خودساختہ توجیہات ہیں جنھوں نے سارے علوم کو مذہب سے بیگانہ بنا دیا ہے۔ چند مثالیں لیجئے۔

"کچھ سنا آپ نے، روس کا بنایا ہوا راکٹ چاند پر پہونچ گیا۔"

"ہاں، میں نے بھی آج ہی یہ خبر پڑھی ہے۔"

"اب مذہب کا کیا ہوگا، اب تو خدا و مذہب کے تصورات پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔"

ستمبر ۱۹۵۹ء کے وسط میں جب اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ روس نے ۱۲ ستمبر کو جو راکٹ (لونک نمبر۲) خلا میں چھوڑا تھا، وہ سات ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل کر ۳۴ گھنٹے میں چاند پر پہونچ گیا تو بہت سے "قدامت پرستوں" کو "جدت پسندوں" کی زبان سے اس قسم کے فقرے سننے پڑے۔ منکرین کے نزدیک خدا کی تردید کا اتنا بڑا ثبوت تھا کہ ماسکو ریڈیو نے اعلان کیا کہ ہمارا راکٹ چاند تک گیا مگر اس کو کہیں خدا نہیں ملا۔ اس طرح کی باتوں سے بہت سے سادہ لوح متاثر ہو گئے۔ حالانکہ راکٹ کا چاند تک یا کسی اور سیارہ تک جانا سائنسی نقطہ نظر سے صرف نظام فطرت کے ایک امکان کو استعمال کرنا ہے۔ یہ امکان نیوٹن کے زمانے ہی میں معلوم ہو گیا تھا۔ مگر اس کے لئے اس حد تک کوشش کہ اس کو قابل عمل بنایا جائے، مخصوص اسباب کے تحت اب ہو سکی ہے، اس طرح راکٹ کی اڑان کی حقیقت صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جو امکانات رکھ دئے ہیں اور جن کو ہمارے لئے اس طرح مسخر کر دیا ہے کہ ہم ان کو استعمال میں لا سکیں، ان کو انسان استعمال میں لایا ہے۔ یہ صرف سخر لکم ما فی السماوات والارض کی ایک تصدیق ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

جو شخص ٹامس ہارڈی (۱۸۴۰ - ۱۹۲۸) کی کہانیاں خالی الذہن ہو کر پڑھے گا وہ بلاشبہ کہنے لگے گا کہ اس دنیا میں آدمی بے رحم قسمت کے ہاتھ میں محض کھلونا ہے۔ کائنات پرکشش تو ہے مگر وہ کسی معنی میں ہماری ہمدرد نہیں ہے۔ فطرت کے ساتھ فرد کی جدوجہد ایک نہایت غیر مساوی فریق کے ساتھ افسوسناک جنگ کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر خدا کی قسم کی کوئی چیز یہاں موجود ہے تو وہ بالکل بے اعتنائی کے ساتھ بے بس انسان کی مصیبتوں کا محض خاموش تماشا دیکھ رہا ہے۔ مگر دنیا کے بارے میں یہ بھیانک تصور صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم آخرت کو نہ مانیں۔ آخرت کو ماننے کے بعد صورت حال بالکل

مطالعہ

قرآن کی قسمیں

جناب وحید الدین خاں صاحب (اعظم گڑھ)

مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ اس دور میں علوم قرآنی کے بے مثال عالم تھے۔ موصوف نے اپنے پیچھے مسودات کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے جن میں سے اکثر نا تمام ہونے کی وجہ سے ابھی تک شائع نہیں کیے جا سکے اور کچھ چیزیں جو مکمل تھیں وہ دائرہ حمیدیہ کی طرف سے شائع کردی گئی ہیں۔ انھیں شائع شدہ تصنیفات میں سے ایک ــــ امعان فی اقسام القرآن ہے جو موصوف کی دوسری تصانیف کی طرح اصلاً عربی زبان میں تھی اور دائرہ حمیدیہ نے اس کو عربی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع کر دیا ہے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کتاب میں قرآن کی قسموں پر بحث کی گئی ہے۔ مولانا فراہی نے قرآن اور اس کے متعلق موضوعات پر جو کچھ لکھا ہے، اس سلسلے میں آپ کے پیش نظر خاص طور پر یہ چیز رہی ہے کہ ان مسائل پر تحقیق کی جائے جو سابق علماء اور مفسرین کی قابل قدر کوششوں کے باوجود ابھی تک تشنہ رہ گئے ہیں۔ قرآن کی قسموں کا معاملہ بھی انھیں مسائل میں سے ایک ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ قسم ایسی چیز کی کھائی جاتی ہے جو عظیم و برتر ہو۔ قسم کے اس تصور کے تحت قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنی مخلوقات کی قسم کیوں کھائی ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کے سوا جو کچھ بھی اس کائنات میں ہے وہ ذات باری تعالیٰ کے مقابلہ میں حقیر ہی ہے۔ پھر خدا کی طرف سے ان چیزوں کی قسم کھانے کا کیا مطلب۔

مفسرین نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر عام طور پر جو جوابات دیئے گئے ہیں ان سے قسم کی ان مختلف نوعیتوں کی حکمت واضح نہیں ہوتی جو قرآن میں آئی ہیں۔ اکثر

جوابات گویا اس بات کا اعتراف ہیں کہ جہاں کوئی قسم آئی ہے وہاں اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے حتیٰ کہ اگر اس قسم کو اپنی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو کلام میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔

مولانا فراہی نے اپنی اس گراں قدر تصنیف میں یہ ثابت کیا ہے کہ کسی شے کی قسم کھانے کا مطلب دراصل اپنی بات کے لیے اُس شے کی گواہی پیش کرنا ہوتا ہے نہ کہ اس کی تعظیم کو بیان کرنا۔ گویا جہاں والقرآن المجید کہا گیا ہے وہاں اصل میں کہنا یہ تھا کہ قرآن کا غیر معمولی انداز بیان اور اس کی اعلیٰ تعلیمات اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ یہ ایک برتر ہستی کا کلام ہے۔ مگر اسی کو یوں فرمایا ——— "قرآن مجید کی قسم" یہ کلام کو مدلل و مؤثر بنانے کا ایک اسلوب ہے۔ چنانچہ قرآن میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے، وہ بالعموم وہی ہیں جن کو دوسرے مقام پر قسم کے بغیر براہ راست دلیل اور آیت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہو۔ قرآن کہیں کہتا ہے کہ ——— "میں قسم کھاتا ہوں اس چیز کی جس کو تم دیکھتے ہو اور اس چیز کی جس کو تم نہیں دیکھتے۔" (الحاقہ۔ ۳۸۔ ۳۹) اور دوسرے مقامات پر انھیں تمام موجودات کا ذکر کر کے کہتا ہے کہ یہ عالم گواہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ بات دونوں جگہ ایک ہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایک جگہ جو بات سادہ اسلوب میں کہی گئی تھی۔ اُس کو دوسرے مقام پر قسم کے انداز میں بیان کر دیا گیا ہے۔

قسم کی اس توجیہ کے بعد قرآن کی تمام قسمیں بامعنی ہو جاتی ہیں۔ وہ استدلال کے اس سلسلے کا ایک اہم جزو بن جاتی ہیں جن سے قرآن اپنی دعوت کو مدلل اور مؤثر بنانے میں مدد لیتا ہے اور اس کی روشنی سے طالب قرآن کے سامنے بھی ایک ایسی راہ کھل جاتی ہے جس سے وہ قرآن کی قسموں کا مطالعہ کرتے ہوئے صحیح نقطۂ نظر سے اپنے غور و فکر کا آغاز کر سکتا ہے۔

جیسا کہ مولانا فراہی نے خود واضح کیا ہے، قرآن کی قسموں کے متعلق یہ تصور بالکل مولانا کا طبع زاد نہیں ہے بلکہ پچھلے علماء نے بھی اسی قسم کے خیالات ظاہر کیے ہیں:

مما ذکرنا من اقوال العلماء فی	علماء کے اقوال جو ہم نے نقل کیے ہیں
الفصول السابقة نری ان هذا	اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قسم کا یہ مفہوم
المعنی للقسم لیس ببدع	بالکل نیا نہیں ہے۔

(امعان فی اقسام القرآن (قاہرہ ۱۳۴۹ھ) صفحہ ۴۵)

سابق مفسرین، قسم کی بحث میں دوسری توجیہات کے ساتھ اس کا ذکر بھی کرتے ہوئے ہیں مثلاً صاحب تفسیر کبیر نے سورۂ ذاریات کی قسموں کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

انها کلها دلائل اخرجها فی صورة الایمان.	یہ سب دراصل دلیلیں ہیں جو قسم کی شکل میں بیان کی گئی ہیں۔

مگر مولانا فراہی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اس سلسلے میں قدیم مفسرین کا ذہن پوری طرح صاف نہیں تھا۔ وہ قسم کی اس صحیح توجیہ کے ساتھ بہت سی دوسری کمزور توجیہات بھی اختیار کر لیتے ہیں (امعان، صفحہ ۴۵) چنانچہ امام رازی جو سورۂ ذاریات کی قسموں میں دلیل و شہادت کی جھلک دیکھتے ہیں سورۂ تین کی قسموں میں انجیر و زیتون کے فضائل بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ گویا ایک جگہ ان کے نزدیک قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ اس سے اپنے دعوے پر دلیل قائم کرنی مقصود تھی اور دوسری جگہ اس لیے قسم کھائی کہ وہ چیز قابل عظمت تھی یا بجائے خود کوئی اہمیت رکھتی تھی۔

یہ کتاب ایک علمی تحقیقی کارنامہ ہے جس کا اعتراف ہر وہ شخص کرے گا جو اس موضوع سے واقفیت رکھتا ہو اور پھر اس کتاب کو پڑھے۔ البتہ ایک چیز جو میری سمجھ میں نہیں آئی اور کافی غور و خوض کے بعد بھی جس پر میرا ذہن مطمئن نہ ہو سکا ــــــ اس کو یہاں درج کرتا ہوں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، مولانا فراہی نے اس تصور کی تردید کی ہے کہ جب کسی چیز کی قسم کھائی گئی ہو تو اس سے مقسم بہ (جس چیز کی قسم کھائی جائے) کی تعظیم مقصود ہوتی ہے۔ یہاں تک بات بالکل واضح ہے، مگر اس سے آگے بڑھ کر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مقسم بہ قسم کا کوئی ضروری جزو نہیں ہے۔ یہ گویا ان کے نزدیک قسم برائے تعظیم ہونے کی ایک مزید تردید ہے۔ کیونکہ اگر قسم برائے تعظیم ہوتی تو مقسم بہ کا ذکر ضروری ہوتا کیونکہ کسی چیز کی تعظیم کے لیے اس کی قسم کھانا اور پھر اس چیز کا ذکر نہ کرنا ایک بے معنی بات ہے۔ لکھتے ہیں:

فتبین مما ذکرنا فی هذا الفصل	پچھلی تفصیلات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی
والذی قبله ان القسم لایلزمه	کہ مقسم بہ کی تعظیم کا مسئلہ تو درکنار قسم کیلئے

المقسم بہ فضلاً عن تعظیمہ۔　　مقسم بہ خود کوئی ضروری چیز نہیں ہے۔

صفحہ ۲۱

اس لیے مولانا اس عام خیال کے مخالف ہیں کہ جہاں قسم کے ساتھ کوئی مقسم بہ مذکور نہ ہو وہاں وہ محذوف ہوتا ہے:

ان القسم لیس الا التاکید ولا　　قسم کی حقیقت صرف تاکید ہے اسی لیے ہر
یحتاج الی تقدیر المقسم بہ فی　　جگہ مقسم بہ محذوف ماننے کی کوئی ضرورت
کل موضع　　صفحہ ۱۹　　نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ بہت سے قسمیہ فقروں میں مقسم بہ مذکور نہیں ہوتا لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ وہاں مقسم بہ محذوف بھی نہیں ہے تو سوال یہ ہے کہ اس میں تاکید کس پہلو سے پیدا ہوئی۔ مولانا نے خود نہایت تفصیل سے یہ ثابت کیا ہے کہ قسمیہ فقروں میں کسی چیز کو بطور شہادت پیش کر کے کلام کو مؤکد کیا جاتا ہے:

ان القسم بالشیٔ اصلہ الاستشہاد　　کسی چیز کی قسم کھانے کا مطلب دراصل اپنی
بہ۔　　صفحہ ۲۲　　بات کے حق میں اس چیز کی شہادت پیش کرنا ہے۔

قسم تاکیدی وہ قسم ہے جس میں کسی چیز کو بطور شہادت پیش کر کے کلام کو مؤکد کیا جاتا ہے۔ پھر جب آدمی صرف اتنا کہے کہ "میں قسم کھاتا ہوں" یعنی صرف لفظ قسم بولے اور اس چیز کا ذکر نہ کرے جس سے شہادت کا پہلو پیدا ہوتا ہوتا ہے تو آخر اس کی بات میں قسم والی تاکید کیونکر آجائیگی اور شہادت کیسے پیدا ہوگی۔ قسم کی تعریف کے مطابق ضروری ہے کہ قسم مقسم علیہ (جس بات کو مؤکد کرنے کے لیے قسم کھائی گئی ہے) پر دلیل ہو۔ لیکن اگر مقسم بہ کو ختم کر دیا جائے تو کیا چیز دلیل بنے گی۔ کیا محض لفظ قسم۔ حقیقت یہ ہے کہ قسم برائے تعظیم جس طرح تقاضا کرتا ہے کہ اس کے لیے کوئی مقسم بہ ہو۔ اسی طرح قسم برائے استدلال کا بھی تقاضا ہے کہ مقسم بہ موجود ہو۔ اسکے بغیر استدلال و شہادت کی بات مکمل نہیں ہوتی۔

مولانا فراہی کی تشریح کے مطابق قسم ایک تاکیدی کلمہ ہے جو کوئی شخص اپنے دعوے کے موقع پر استعمال کرتا ہے۔ یہ تاکید کبھی مقسم بہ کا حوالہ دے کر پیدا کی جاتی ہے۔ ان کے نزدیک

"مقسم بہ والی قسموں کی حقیقت بس یہ ہے کہ قسم کھانے والا اپنے ساتھ اپنے دعوے کے گواہ کے طور پر مقسم بہ کو ملا لیا کرتا ہے۔" (صفحہ ۲۲) اور کبھی یہ تاکید مقسم بہ کے بغیر محض لفظ قسم بول کر پیدا کی جاتی ہے یعنی آدمی کسی متعین چیز کی قسم نہیں کھاتا بلکہ اس طرح کی کسی چیز کا صراحۃً یا کنایۃً حوالہ دیئے بغیر صرف یہ کہتا ہے کہ میں قسم کھاتا ہوں:

ربما یکون مجرداً عن المقسم بہ	کبھی قسم مقسم بہ کے بغیر ہوتی ہے۔ ایسے
وحینئذ لا یراد بہ الا التاکید	مواقع پر قسم کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں
والجزم المحض۔ صفحہ ۲۱	ہوتا کہ مجرد تاکید اور عزم کا اظہار کیا جائے۔

مگر میری رائے ناقص میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ تاکید کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مجرد لفظی تاکید اور دوسرے قسمیہ تاکید۔ لفظی تاکید میں بے شک، ہرگز اور یقیناً وغیرہ الفاظ بول کر کلام کو موکد بنایا جاتا ہے اور قسمیہ تاکید کی صورت میں کسی ایسی چیز کا حوالہ دیا جاتا ہے جو کسی پہلو سے آدمی کی صداقت کا ثبوت بن سکتی ہو۔ اسی دوسرے طریق تاکید کا نام قسم ہے۔

قسمیہ تاکید کی دو صورتیں ہیں۔ ایک وہ جس کو مصنف مرحوم نے "دینی قسم" کہا ہے (صفحہ ۲۱) اور دوسری وہ جس کو "استدلالی قسم" کہا جا سکتا ہے، دینی قسم کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے دعوے کے ثبوت کے لیے ایسی ہستی کا حوالہ دے جو اس کے نزدیک نافع و ضار ہے۔

مثلاً ایک شخص میرا محسن ہے اس کو یہ اندیشہ پیدا ہو رہا ہے کہ میں اس کے احسانات کو بھول گیا ہوں اور اس کے ساتھ غداری کر رہا ہوں اب ایسے موقع پر اگر میں کہوں کہ:

"میں ہرگز تم سے غداری نہیں کر سکتا۔"

تو یہ لفظی تاکید ہے۔ لیکن اگر اسی بات کو اس طرح کہا جائے کہ:

"خدا کی قسم میں تمھارے ساتھ غداری نہیں کروں گا۔"

تو یہ دینی قسم کی مثال ہوگی جس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں کیسے تمھارے ساتھ غداری کر سکتا ہوں جبکہ خدا میرے اور تمھارے درمیان ہے جو برا عمل کرنے والے کو اس کی برائی کی سزا دیتا ہے۔ قسم کی یہی وہ صورت ہے جس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو قسم کھائے اللہ کی قسم کھائے، ورنہ خاموش رہے۔"

کیونکہ اس طرح کی قسموں میں کسی غیر اللہ کا حوالہ دینا اس کو حاضر و ناظر اور نافع و ضار ماننا ہے جو شرک ہے۔

تیسری شکل یہ ہے کہ میں اس طرح کہوں :

"تمھارے احسانات کی قسم میں تم سے غداری نہیں کر سکتا"

یہ استدلالی قسم ہوگی جس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے جو احسانات میرے اوپر کیے ہیں وہ خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ ایسا ممنون احسان شخص اپنے محسن کے ساتھ غداری نہیں کر سکتا ــــ قرآن کی قسمیں اسی استدلالی نوعیت سے تعلق رکھتی ہیں۔

قسم کی اس تشریح کے مطابق ہر حال میں اس کے لیے مقسم بہ ہونا ضروری قرار پاتا ہے۔ یہ واقعہ اس کے خلاف دلیل نہیں بن سکتا کہ بہت سی قسموں میں مقسم بہ مذکور نہیں ہوتا۔ کیونکہ جہاں قسم کے ساتھ مقسم بہ مذکور ہے، وہ اس بات کا قرینہ ہے کہ جہاں وہ مذکور نہیں ہے وہاں وہ محذوف ہے۔

مقسم بہ کو غیر ضروری قرار دینے کے لیے مولانا فراہی نے جو استدلال کیا ہے، وہ مجھے اثبات مدعا کے لیے کافی نظر نہیں آتا۔ مثلاً مولانا نے قرآن اور کلام عرب سے ایسی مثالیں پیش کی ہیں جن میں مقسم بہ مذکور نہیں ہے یہ ان کے نزدیک اس بات کا ثبوت ہے کہ اگر قسم کے ساتھ مقسم بہ ضروری ہوتا تو ان قسموں میں وہ بھی موجود ہوتا، مگر کم از کم ان مثالوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پیش کردہ کلام میں فی الواقع کوئی مقسم بہ موجود نہیں تھا۔ ان تمام مثالوں میں ایک ہی خلا پایا جاتا ہے۔ اس کو واضح کرنے کے لیے میں دو مثالیں یہاں نقل کروں گا۔

ربطہ سلمیہ کا شعر ہے :

فاقسمت لا انفک احدر عبرة　　تجود بها العینان منی لتسجما

(میں نے قسم کھائی کہ برابر میری دونوں آنکھیں کثرت سے آنسو بہاتی رہیں گی)

دوسری مثال سورۂ اعراف کی ایک آیت ہے جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے :

"کیا یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم نے قسمیں کھائی تھیں کہ خدا کی رحمت میں ان کے لیے کوئی حصہ نہیں ہے۔　　اعراف - ۴۹

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

انتخاب

خاتم النبیینؐ کے بعد کسی دوسری نبوت کی ضرورت نہیں

(مولانا محمد اسحٰق سندیلوی)

ابرِ رحمت اس وقت برستا ہے جب زمین کے لبِ خشک صدائے العطش بلند کرتے ہیں۔ بادِ بہاری چمن کے لیے حیاتِ تازہ کا پیام اس وقت لاتی ہے جب وہ بیدادِ خزاں سے عاجز آکر سراپا فریاد والغیاث بن جاتا ہے۔ مہرِ عالم افروز اپنا رخِ انور اس وقت بے نقاب کرتا ہے جبکہ تیرگیٔ شب حد سے گذر جاتی ہے اور ردائے ظلمت میں دنیا کا دم گھٹنے لگتا ہے، دنیا کے حوادث و تغیرات پر غور کرو، تم دیکھو گے کہ ان میں سے کوئی بھی بغیر احتیاج و ضرورت کے وجود میں نہیں آتا تو کیا عقلِ سلیم یہ باور کر سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی نبی و رسول اس خاکدانِ عالم میں اس وقت آیا ہوگا یا آسکتا ہے جب اس کی کوئی احتیاج و ضرورت نہ ہو۔؟

مقامِ نبوت، انسانیت کی آخری معراج اور ارتقاءِ انسانی کی اعلیٰ ترین منزل ہے، اس اعلیٰ منزلت کی شخصیت ایسے وقت اور ایسے ظروف و احوال میں بھیجی جائے جبکہ اس کی کوئی احتیاج و ضرورت نہ ہو یہ بات بالکل عقل و فہم کے خلاف ہے۔

کیا خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو تاجِ نبوت سے سرفراز فرمایا گیا ہے یا قیامت تک اس کا امکان ہے کہ کسی کو یہ خلعتِ اکرام عطا فرمایا جائے؟ یہ دونوں مسئلے سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے جب تک یہ نہ ثابت کر دیا جائے کہ سید المرسلین کے تشریف لانے کے بعد دنیا کے لیے کسی نبی کی احتیاج و ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کا بارِ ثبوت منکرینِ ختمِ نبوت پر ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس بابِ

ہم نے یہ اسلوب نہیں اختیار کیا ہے یہاں ہم ان اسباب کو بیان کرتے ہیں جن کا وجود یقینی طور پر کسی نبی کی آمد و بعثت کی ضرورت کو معدوم کر دیتا ہے۔ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ انبیاء علیہم السلام ہدایت خلق اللہ کے لیے مبعوث ہوتے ہیں۔ ان کی تشریف آوری کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ وہ بندوں کا تعلق ان کے معبود حقیقی کے ساتھ قائم اور مستحکم کر دیں۔

انبیاء علیہم السلام اس مقصد کو تین طریقوں سے حاصل کرتے ہیں۔

- کتاب الٰہی کی تعلیم و تشریح سے
- خود اپنے اعمال و افعال سے
- اپنی شخصیت عظیمہ سے۔

انبیاء علیہم السلام کتاب الٰہی کا مفہوم اور اس کے مقاصد واضح فرماتے ہیں۔ اسکے کلیات کو جزئیات پر منطبق فرما کر اور جزئیات سے کلیات اخذ فرما کر نہج استنباط و اجتہاد روشن فرماتے ہیں۔ اپنے اقوال و افعال سے کتاب الٰہی کے احکام کی عملی شکل متعین فرماتے ہیں، مجموعی طور پر کتاب الٰہی جس طرز زندگی کا مطالبہ کرتی ہے اس کا عملی نمونہ پیش فرماتے ہیں، انھیں اقوال و اعمال کے مجموعہ کا نام سنت ہے۔ ان کی شخصیت و ذات کا اصل فائدہ ان لوگوں کو پہونچتا ہے جو نبی کی شاگردی کا شرف براہ راست حاصل کرتے ہیں اس طرح انبیاء ایک ایسا گروہ تیار کر دیتے ہیں جو ان کے علوم و معارف کا حامل ہو کر آئندہ نسلوں تک انھیں منتقل کر سکے۔ ایک ایسی جماعت تیار کرنے کے بعد انبیاء کا کام ختم ہو جاتا ہے اور وہ اس امانت الٰہیہ کو اپنے صحابہ کے سپرد کر کے بحکم الٰہی اس عالم دنیا سے سفر کر جاتے ہیں، تاریخ پر نظر ڈالو، ان برگزیدہ ہستیوں کے متعلق حق تعالیٰ کا یہی طرز عمل پاؤ گے اور معاند سے معاند بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی زمانہ کے بکثرت بلکہ اکثر ایسے حصے ہیں جو نبی کی شخصیت سے بالکل خالی ہیں اور ان میں ہدایت عالم کا ذریعہ صرف کتاب و سنت ہی ہیں اگر کتاب و سنت کی موجودگی ناکافی ہوتی اور شخصیت نبی کا موجود ہونا ہر زمانہ میں ناگزیر ہوتا تو یقیناً کوئی زمانہ بھی ایسی شخصیت سے خالی نہ ہوتا۔ اسکے علاوہ یہ بھی دیکھئے کہ کیا نبی کے زمانۂ حیات میں بھی ہر شخص ان کی شخصیت عظیمہ سے براہ راست استفادہ کرتا ہے یا کر سکتا ہے؟ کیا بنو اسرائیل کے لاکھوں افراد میں ہر فرد حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما الصلوٰۃ والسلام

کا حاشیہ نشین اور اُن کے نفوسِ قدسیہ سے براہ راست مستفید ہوا تھا؟ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس زمانہ میں اسلام پورے عرب پر چھا چکا تھا اس کی سرعت رفتار کا اندازہ حق تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہو سکتا ہے :-

وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجاً۔ (النصر) اور آپ لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہو رہے ہیں۔

مسافت کے لحاظ سے اسلام کی رفتار دو سو میل یومیہ سے زائد تھی مگر کیا عرب کا ہر مسلم باشندہ شرف صحابیت حاصل کر سکا تھا؟ یا معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بلا واسطہ زانوئے تلمذ تہ کر سکا تھا؟ سچ تو یہ ہے کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں، اگر کتاب و سنت کا وجود ہدایت کے لیے کافی نہ ہوتا بلکہ نبی کی شخصیت سے براہِ راست وابستگی لازم ہوتی تو دور اول ان لوگوں نیز مابعد کی نسلوں کا اسلام ہی صحیح نہ ہوتا، اگر ایسا نہیں ہے تو یہ لازم تھا کہ ہادی حقیقی کی طرف سے اس قسم کا کوئی انتظام ہوتا کہ کم از کم نبی کے دورِ حیات میں ہر شخص ان کی شخصیتِ عظیمہ سے براہ راست مستفید ہو سکتا۔

ان بدیہی دلائل سے صراحتہً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کتاب و سنت موجود و محفوظ ہو تو ہدایت اور قربِ الٰہی حاصل کرنے کے لیے نبی کی شخصیت کی کوئی احتیاج باقی نہیں رہتی، صراط مستقیم کو معلوم کرنے کے لیے یہ دو ذریعے کتاب و سنت تو مستقل ہیں اور تیسرا ذریعہ یعنی نبی کی شخصیت غیر مستقل بالفاظ دیگر محضر، رشد و ہدایت کے لیے تعلیمات نبوی ناگزیر اور کافی ہیں، جب تک یہ موجود ہوں اس وقت تک ان سے ہر زمانہ میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے خواہ خود نبی موجود ہوں یا نہ ہوں یہ ایسا واقعہ ہے جس کا ثبوت مشاہدہ ہے اس کے ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ ذات نبوی سے وابستگی بھی اس وقت تک مفید نہیں ہو سکتی جب تک تعلیم نبوی پر عمل نہ کیا جائے اگر کوئی شخص کسی نبی کو دیکھنے پر بھی ایمان نہ لائے اور اس کی دعوت و تعلیم کو ٹھکرا دے تو کیا نبی کی خدمت میں حاضری اور انکی زیارت اسے ذرہ برابر بھی فائدہ پہونچا سکتی ہے؟ بخلاف اس کے جو شخص احکام نبوی کے سامنے سر تسلیم خم کرے اور ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو خواہ نبی کی زیارت سے مشرف ہوا ہو یا نہ ہوا ہو یقیناً ہدایت یافتہ اور فائز المرام ہے۔

الحاصل جس پہلو سے بھی غور کیجئے یہ حقیقت روز روشن سے بھی زیادہ روشن ہو جاتی ہے کہ ہدایت و رشد کا پائدار و مستقل ذریعہ کتاب و سنت یا بالفاظ دیگر نبی کی تعلیم ہوتی ہے خود نبی کی موجودگی کی ضرورت اُس وقت تک رہتی ہے جب تک ایک جماعت ایسی نہ پیدا ہو جائے جو اسی کے علم و طریق کو علماً و عملاً محفوظ کرلے اور اسے دوسروں تک منتقل کرنے کا کام کر سکے، ایسی جماعت تیار کرنے کے بعد نبی کا کام ختم ہو جاتا ہے چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام عموماً اس کام کی تکمیل کے بعد دنیا سے اٹھا لیے گئے۔

یہاں بحث یہ ہے کہ خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کی بعثت کی ضرورت ہے یا نہیں؟

اوپر کی سطروں میں ہم نے ایک عام اصول بیان کیا ہے ملے اس خاص اور جزئی مسئلہ پر منطبق کیجئے، آفتاب نصف النہار کی طرح یہ بات واضح ہو جائے گی کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کسی نبی کی بعثت کی ضرورت نہیں ہے۔

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تیئیس سال تک اپنے وجود مسعود اور انفاس قدسیہ سے اس عالم تیرہ و تار کو منور فرماتے رہے اس کے بعد اس عالم دنیا سے عالم آخرت میں اپنے رب کریم کے حضور میں تشریف لے گئے، اپنے ترکہ میں تین چیزیں آپ نے چھوڑیں، اللہ کی نورانی کتاب یعنی قرآن کریم، اپنی سنت سنیہ یعنی اپنے اقوال و افعال و تقریرات[1]، تیسری چیز جماعت صحابہ یعنی ایک لاکھ سے زائد ایسی منور، ربانی اور پاکیزہ شخصیتیں جو براہ راست معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم سے مستفید ہوئی تھیں اور اُن کے علوم عالیہ کی حامل و محافظ اور اُن کا عملی نمونہ تھیں، یہی نہیں بلکہ اس امانت نبویہ کو دوسروں تک پہونچانے کی حریص تھیں۔ قرآن کریم سینوں اور سفینوں میں اس طرح محفوظ رہا کہ اس کا ایک ایک حرف ایک ایک شوشہ آج تک محفوظ ہے اور اس کی حفاظت کے جو اسباب حق تعالیٰ نے مہیا فرمائے ہیں اور جو طریقے مقرر فرما دیئے ہیں انھیں دیکھ کر ہر شخص یقین کرنے پر مجبور ہے کہ اللہ کا یہ کلام تا قیام قیامت محفوظ اور ہر قسم کی تحریف سے پاک رہے گا، اس کی حفاظت

---

[1] تقریرات تقریر کی جمع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کام آنحضور کے سامنے کیا گیا ہو اور آپ نے اس سے منع نہ فرمایا ہو۔ ۱۲ منہ

ایسی ہوگی کہ معاند سے معاند غیر مسلم بھی اس حقیقت کے تسلیم کرنے پر مجبور ہوں کہ قرآن مجید ہر قسم کی تحریف سے مبرا ہے نہ اس میں کمی ہوئی نہ زیادتی، نہ اس کے الفاظ یا آیتوں کی ترتیب میں کوئی فرق پڑا ہے۔ اس کا ایک ایک حرف وہی ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اور جو آنحضور نے قبل از وفات اُمت کے سپرد فرمایا تھا، قرآن مجید کا ایک ایک حرف متواتر ہے، سنت کو اگرچہ یہ بات حاصل نہیں ہے مگر مجموعی طور پر سنت بھی متواتر ہے اگرچہ اس کے سب اجزاء متواتر نہیں ہیں تاہم یہ یقینی ہے کہ سنت نبوی بھی محفوظ ہے اور تعامل، پریس کی قوت اور دیگر اسباب نے اسے قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔

کتاب وسنت کی اسی موجودگی کی صورت میں کسی نبی کی بعثت کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ رشد و ہدایت کے یہ دو سرچشمے موجود ہیں اور سارے عالم کو سیراب کرنے کے لیے بالکل کافی ووافی ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ کسی نبی کی بعثت کی بھی ضرورت ہے ایک سفیہانہ بات ہے۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ یہ دین قیامت تک باقی رہے گا، ظاہری اسباب بھی یہی بتاتے ہیں کہ اسلام دائمی و ابدی دین ہے اور کتاب وسنت ہدایت کے ایسے سرچشمے ہیں جو کبھی خشک نہیں ہو سکتے آب حیات کے ان لافانی اور ابدی چشموں کے ہوتے ہوئے کسی نبی کے وجود کی پیاس جھوٹی پیاس ہے جو دل و دماغ کی بیماری اور عقل وفہم کی خطرناک علالت کی علامت ہے۔

اگر ہم کسی نئے نبی کی بعثت فرض کریں تو فطرتاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس کا کام کیا ہوگا؟ وہ شریعت محمدیہ علیہ الف الف تحیۃ کو منسوخ کر کے کسی نئی شریعت کی تعلیم دے گا؟ یا اسی شریعت کا اجراء کرے گا؟ کسی نئی کتاب اور نئی بعثت سے قرآن مجید اور سنت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منسوخ کرے گا یا اسی کتاب اور اسی سنت کی تشریح وتفصیل کرے گا؟ اگر پہلی صورت فرض کی جائے تو پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی ضرورت کیا ہے؟ قرآن وسنت سراپا ہدایت ہیں، ان میں کیا کمی ہے جس کی تکمیل کسی نئی کتاب اور نئے نبی کے ذریعے کی جائے۔[1]

---

[1] شیعہ تحریف قرآن کے قائل ہیں اور اسے ناقص سمجھتے ہیں، اہل سنت کے ذخیرۂ احادیث کو صحیح نہیں تسلیم کرتے۔
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جو شخص بھی اسلام کا مدعی ہے ہرگز یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ قرآن وحدیث ہدایت کے لیے ناکافی ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کسی غیر مسلم کے لیے بھی یہ بات کہنا مشکل ہے، جو شخص ایسا کہتا ہے اس کے ذمہ ہے کہ وہ قرآن وحدیث کو ہدایت کے لیے ناکافی یا ناقص ثابت کرے کوئی مشکل سے مشکل مسئلہ جس کا تعلق دین کے ساتھ ہو قرآن مجید اور حدیث نبوی کے سامنے پیش کر دو، تم دیکھو گے کہ وہ مشکل کیسی آسان ہو جاتی ہے اور مسئلہ کا کیا عمدہ واعلیٰ حل نکل آتا ہے، البتہ فہم سلیم اور علم صحیح کی احتیاج ہے۔

دوسری شق اختیار کرنے پر بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی تشریح وتفصیل کے لیے کسی نبی ہی کے آنے کی کیا حاجت ہے، اگر اُمتی اس بیان وتشریح سے عاجز وقاصر ہیں تو ہر زمانہ میں کسی نہ کسی نبی کا وجود لازم ہے، حالانکہ یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے جس کی غلطی مشاہدے سے ثابت ہے۔

علاوہ بریں نبی کی موجودگی کی صورت میں عادتاً بھی یہ ناممکن ومحال ہو کہ وہ ہر شخص کے سامنے پیش آنے والے ہر جزئی مسئلہ کے متعلق قرآن وحدیث کا بیان اور اس کی تشریح پیش کریں، ذرائع خبر رسانی کی اتنی ترقی کے باوجود ایک شخص کے لیے یہ ناممکن ہے کہ کروڑوں سوالات کا جواب روزانہ دیتا رہے، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں بہت سے مسائل وجزئیات کے متعلق مسلمانوں کو اجتہاد کرنا پڑتا تھا اگرچہ اس قسم کے مسائل کی تعداد قلیل ہے مگر پھر بھی تھا ہی ہے۔ جن میں صحابۂ کرام نے خود اجتہاد کیا ہے اور نصوص کا بیان اپنی فہم سے کیا ہے، یہ صرف صحابۂ کرام کا فعل ہی نہیں ہے بلکہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریق کار کی تعلیم دی ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے وقت آنحضورؐ نے نص صریح کی عدم موجودگی کی صورت میں اسی اجتہاد واستنباط کی ہدایت فرمائی تھی، اس سے ظاہر ہے کہ ہر جزئی مسئلہ کی

(حاشیہ برصفحہ گزشتہ)
لیکن اول تو ان کا دعویٰ اسلام قابل تسلیم نہیں ہے اس لیے ان کے کسی قول وفعل کی ذمہ داری ہمارے اوپر عائد نہیں ہوتی، دوسرے وہ بھی اپنے عقیدۂ تحریف ونقص قرآن کو چھپاتے ہیں اور برملا اس کے اظہار کی جرأت نہیں کرتے۔ ۱۲ منہ

تذکرہ مجدد الف ثانی
مجدد الف ثانی نمبر الفرقان کا تازہ کتابی ایڈیشن
الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر میں پہلی بار یہ حقیقت سامنے آئی تھی کہ امام ربانی
شیخ احمد سرہندی قدس سرہ وہ کون سا امتیازی کارنامہ ہے جس کی وجہ سے آپ کو کسی ایک
صدی کا نہیں بلکہ الف ثانی یعنی پورے دوسرے ہزار سالے کا مجدد امت نے
مان لیا ہے۔ الفرقان کے اس نمبر کی اشاعت پر اکیس برس گزر چکے ہیں، اس عرصہ میں عالم
اسلامی دنیا کے حالات میں بہت کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں ان تبدیلیوں کو اور دور کے دینی
تقاضوں کو دیکھ کر یہ یقین بڑھ جاتا ہے کہ واقعۃً حضرت موصوف پورے الف ثانی کے
مجدد ہیں اور ہمارے اس دور کیلئے بھی انکے تجدیدی کام میں پوری رہنمائی موجود ہے
یہ حقیقت آپ پر اس کتاب کے مطالعے سے کھلے گی جس میں
مجدد الف ثانیؒ کے ذاتی حالات بھی ہیں اور انکے تجدیدی
کام کی تفصیلات بھی، نیز آپ کے تمام مشہور خلفاء کا تذکرہ بھی۔
صفحات ۳۵۰ ، سائز متوسط ، قیمت
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

سنہ آغاز
۱۹۳۳ء

مرتب

عتیق الرحمن سنبھلی

مسئول

محمد منظور نعمانی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

یہ کتاب
اسی صورت حال کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے

| جلد ۳۲ | بابتہ ماہ ربیع الثانی ۱۳۸۴ھ مطابق ستمبر ۱۹۶۴ء | شمارہ (۴) |

اگر اس دائرے میں ○ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ اکتوبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:- اپنا چندہ سکریٹری اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں، ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:- براہ کرم خط وکتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت الفرقان ہر انگریزی مہینہ کی پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

منیجر الفرقان لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر اڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

سالانہ چندہ

ہندوستان سے ۶/-

پاکستان سے ۷/-

ششماہی

ہندوستان سے ۳/۵۰

پاکستان سے ۴/-

| جلد ۳۲ | بابتہ ماہ ربیع الثانی ۱۳۸۴ھ مطابق ستمبر ۱۹۶۴ء | شمارہ (۴) |

اگر اس دائرے میں ○ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ اکتوبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں، ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت الفرقان ہر انگریزی مہینہ کی پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں، اس کی اطلاع ۲۸ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

منیجر الفرقان لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از ـــــــــ محمد منظور نعمانی

اب تک کے حالات اور بعض سامنے کے تجربات پر نظر کرتے ہوئے ایک ڈر سا لگتا ہے کہ کسی پہلے ہی امید آفریں قدم پر مستقبل کے سنہرے خواب دیکھ لیے جائیں۔ لیکن اگر خدا کی رحمت سے مایوسی نہیں ہے تو دست بدعا ہو کر امید کرنی ہی چاہیے کہ ۹ راگست ۱۹۶۴ء کو مسلمانانِ ہند کے مختلف نمائندہ عناصر نے اجتماعیت کی طرف جو پہلا قدم مشاورتی کاؤنسل کی تشکیل کے فیصلے کی صورت میں سرزمین لکھنؤ پر ثبت کیا ہے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا قافلہ آئندہ سے اب اسی مبارک قدم کے رُخ پر چلے گا، اور امید کا جو چراغ قوم کے مایوس دلوں میں بڑی تمناؤں کے بعد روشن ہوا ہے اسے اب کسی مایوس کن طرزِ عمل کا منہ دیکھنا نہیں پڑے گا۔

یہ ہماری دُعا ہے، امید ہے اور ــــ تمنا ہے۔ اور ہم بلا کسی شک و تردّد کے سمجھتے ہیں کہ یہ پوری قوم کے ہر مخلص خاص و عام کے دل کی صدا ہے۔

لیکن اپنی امید کے اس چراغ کی حفاظت (جو ایک ٹھوس اور سنجیدہ فیصلے سے روشن ہوا ہے) صرف ان نمائندہ اشخاص ہی کا کام نہیں جنھوں نے اس فیصلے پر دستخط ثبت کیے ہیں بلکہ یہ ذمہ داری پوری قوم کی ہے، اور در اصل اسی کے احساسِ ذمہ داری اور خطرات سے ہوشیاری کے ذریعہ اس چراغ کی حفاظت ہو سکتی ہے۔

اجتماعیت کی راہ کے اس پہلے قدم تک پہونچنے میں جیسی جیسی مشکلات کام کرنے والوں کو پیش آئیں وہ کوئی راز نہیں ہے۔ الفرقان (ماہ جون) کے ان صفحات ہی میں پہلی مرتبہ اس عاجز کے قلم سے بس ایسی چند سطروں کا نکلنا تھا جن سے لوگوں کو محسوس ہوا کہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں اور مکاتبِ فکر کے عمائد و اکابر کا

کوئی نمائندہ مشاورتی اجتماع واقعۃً ہونے والا ہو گو مسلمانوں ہی کے ایک خاص ذہن و فکر رکھنے والے طبقہ کی طرف سے یلغار شروع ہو گئی۔ الفرقان کی ان سطروں سے لوگوں نے قیاس کیا کہ اس اجتماع کی تحریک اور اسکے لیے جدوجہد میں محمد منظور اور انکے ہر کام کے رفیق مولانا ابو الحسن علی کا خاص حصّہ ہے۔ چنانچہ اس طبقہ کے دو طاقتور اخباروں نے سب کام چھوڑ چھاڑ کے اپنی ساری توپ ان دو رفیقوں کی ایسی ہیئت جیسی پر لگا دی جس سے لوگوں میں یہ احساس پیدا کیا جا سکے کہ یہ محض قیادت کی ہوس کا کھیل ہے اور اسکے پیچھے کوئی سنجیدہ عزم اور ٹھوس فکر بھی نہیں ہے کہ مسلمانوں کا کچھ بھی بھلا ہو سکے۔

پھر جلد ہی جب یہ صورت حال ان لوگوں کے سامنے آئی کہ جمعیۃ علماء جسے یہ اپنے ذہن و فکر سے قریب اور ہم دونوں سے بعید سمجھتے تھے، اسکے عمائد و قائدین بھی اس اجتماع کے تخیل سے متفق ہیں تو پورا زور ایسی فضا پیدا کرنے پر لگا دیا گیا جس سے اہل جمعیۃ کی راہ میں ایسی ذہنی اور نفسیاتی مشکلات کھڑی ہو جائیں کہ اس اجتماعی قافلہ میں شرکت کی جس "غلطی" پر وہ آمادہ ہو چکے تھے اس سے باز رہ سکیں ـــــ لیکن خدا کو منظور تھا کہ یہ خطرناک کوشش بھی کچھ کارگر نہ ہو سکی اور اس اجتماع میں ایسا کوئی خلا پیدا نہ کیا جا سکا جسکی بدولت اسکی نمائندہ حیثیت پر کوئی قابل لحاظ اعتراض اٹھایا جا سکتا۔ اسمیں ایک طرف جماعت اسلامی اور مسلم لیگ تھی، دوسری طرف جمعیۃ علماء اور وہ اس سے باہر کے وہ کانگریسی مسلمان جو مسلمانوں کیلئے صرف کانگریس کے دائرہ ہی میں رہ کر نہیں سوچتے۔ اسی طرح ایک طرف دیوبندی عمائد اسمیں تھے تو دوسری طرف بریلی اور فرنگی محل کے نمائندہ بھی۔ اور اسکے علاوہ وہ غیر جماعتی افراد بھی جو مسلمانانِ ہند کے اس وقت کے خاص مسائل سے عملی دلچسپی رکھتے ہوئے کسی عمومی یا خصوصی اثر کی طاقت بھی مسلمانوں میں رکھتے ہیں۔

ان مختلف عناصر کی شرکت اور نمائندگی کا مرحلہ بخیر و خوبی طے ہو گیا تو بروقت رخنہ اندازی کا ایک منصوبہ عین اجتماع کی تاریخوں میں بے نقاب ہوا۔ لکھنؤ کے بالکل قریب سے نکلنے والا ایک مسلم روزنامہ جو اپنے ایک خاص مزاج کی وجہ سے مسلم عوام میں کافی پڑھا جاتا ہے اور اجتماع کے بارے میں حیرت انگیز طور پر بالکل سکوت کی پالیسی پر چل رہا تھا یکایک ۲ اگست سے اس نے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا جسمیں خاص ہدف اور نشانہ اجتماع کے داعی اور صدر ڈاکٹر سید محمود صاحب کو بنایا، ان کو اپنوں اور پرایوں کی نگاہ میں بے وقار اور بے اعتبار کرنے اور گرانے کی کوشش کی۔ اور بغیر ثبوت بہم پہنچائے ہوئے پوری قوت سے مسلمانوں میں یہ تاثر پھیلانا چاہا کہ یہ اجتماع کانگریس نواز ہے۔ اور اسی سلسلہ کے درمیان میں اگلے روز عین ٹھیک اجتماع کے آغاز کے دن یہ شعلہ چھوڑا کہ لوگ کہتے ہیں کہ محمد منظور نعمانی نے کلکتہ ریلیف فنڈ کا جو تقریباً اسی ہزار روپیہ بڑی دردمندانہ اپیلوں کے ذریعہ مسلمانوں سے جمع کیا تھا وہ بڑی حفاظت سے آج تک اسکی تجوری میں رکھا ہوا ہے۔ لہٰذا مسلم مشاورتی اجتماع کو چاہیے کہ

اس معاملہ میں احتساب کرے اور تمام روپیہ اپنی تحویل میں لے کر مستحقین پر خرچ کیے جانے کا معقول انتظام کرے۔

محمد منظور بہر حال اسی دنیا کا ایک انسان ہے جسے دن رات ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، لیکن اس کا عقلی امکان تو بہر حال ہے کہ اس نے بھی سپید بالوں کی عمر میں پہونچ کر یہ یاہی لگائی ہو، لیکن اس کے انکشاف کا یہی موقع کیوں تھا، یہ کام چار دن پہلے اور چار دن بعد بھی ہو سکتا تھا، اور اگر فی الواقع کسی کو غلط فہمی یا شک و شبہ تھا تو وہ زبانی یا خط لکھ کر یا اخبار ہی کے ذریعہ شریفانہ طریقہ پر بھی پوچھ سکتا تھا۔ لیکن اس اجتماع میں انتشار اور بدانجامی پیدا کرنے کا مقصد ٹھیک یہی دن اور اس کام کے لیے یہی سنسنی خیز طریقہ چاہتا تھا۔[1]

بہر حال یہ ہیں وہ چیزیں جو ملت اسلامیہ ہند کی اجتماعیت کی ان کوششوں کی راہ میں پے بہ پے آئیں جن کا نتیجہ خدا کے فضل سے ایک مبارک فیصلے کی شکل میں ہمارے سامنے آچکا ہے، مشکلات اور رکاوٹوں کی یہ تفصیل ہرگز نہ بیان کی جاتی اگر اس کا خطرہ نہ ہوتا کہ اس طرح کی فتنہ آرائیاں اور رخنہ اندازیاں آئندہ بھی جاری رہیں گی! اور مختلف محرکات کے ماتحت چھپی اور کھلی، ذاتی اور فرمائشی، بھدی اور ستھری، شائستہ اور ناشائستہ ہر نوع کی سر توڑ کوششیں اس اجتماعیت اور وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے کی جائیں گی جو دراصل برسوں کی محنت کے بعد وجود میں آئی ہے۔ ان نامبارک کوششوں کا مقابلہ جہاں اس اجتماعیت میں شریک ہونے والے تمام نمائندہ عناصر پر اپنے واضح طرز عمل اور قول و قرار پر مخلصانہ استقامت اور پختگی سے کرنا فرض ہے وہاں قوم کے ان تمام افراد کا بھی جو اپنی تمام جماعتوں کے اتحاد کے خواہاں اور ان کی وحدت کے لیے دعا گو تھے یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنی ہر ممکن طاقت سے ان بُری کوششوں کا مقابلہ کریں وہ اپنے نمائندہ عناصر کے طرز عمل کی بھی نگرانی کریں کہ کوئی بات اجتماعیت کی اسپرٹ سے ہٹ کر تو نہیں کی جا رہی ہے اور معترض عناصر کے بارے میں بھی چوکنا رہیں کہ وہ قوم کو خواہ مخواہ تو کسی بدگمانی یا مایوسی میں ڈالنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل نعم المولیٰ ونعم النصیر۔

---

[1] اسّی ہزار روپئے کے اس قصے کی حقیقت کیا ہے؟ اسکی تفصیل کا تو یہ موقع نہیں۔ لیکن جب ذکر آگیا ہے تو اتنا بتا دینا مناسب ہے کہ ---- مظلومین کلکتہ کی امداد کے لئے محمد منظور نے تو نہیں ہاں ٹرسٹ مذکور نے (جس کے سات ارکان میں سے وہ بھی ایک ہے) اپیل کی تھی جس کے نتیجہ میں صرف اسّی ہزار نہیں بلکہ ایک لاکھ سے بھی اوپر روپیہ ٹرسٹ کے پاس آیا جس کی تفصیل ٹرسٹ کے اخبار ندائے ملت میں شائع ہوتی رہی ہے اور فیم ٹرسٹ کی اجمالی رپورٹ قریب ہی کی اس کی دو اشاعتوں میں شائع ہوئی ہے۔ ۱۲

کتاب الحج

معارف الحدیث

مسلسل

[حجۃ الوداع کے سلسلہ میں حج کے قریباً سارے ہی اعمال و مناسک کا ذکر واقعہ کی شکل میں آچکا ہے، اب اُسکے اہم افعال وارکان کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی ہدایات اور آپ کا طرزِ عمل معلوم کرنے کے لئے مندرجہ ذیل حدیثیں پڑھیئے۔]

مکہ میں داخلہ اور پہلا طواف:۔

مکہ معظمہ کو اللہ تعالیٰ نے کعبۂ مکرمہ کی نسبت سے جو خاص شرف بخشا ہے اور اس کو بَلَدُ اللہ الحرام اور مرکزِ حج قرار دیا ہے اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس میں داخلہ اہتمام اور احترام کے ساتھ ہو اور اُس کے بعد کعبۂ مقدسہ کا حق ہے کہ سب سے پہلے اس کا طواف کیا جائے، اور پھر اسی کعبہ کے ایک گوشہ میں جو ایک خاص مبارک پتھر (حجر اسود) لگا ہوا ہے (جس کو اللہ تعالیٰ سے اور جنت سے خاص نسبت ہے) اس کا حق ہے کہ طواف کا آغاز ادب اور محبت کے ساتھ اُس کے استلام سے کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معمول تھا اور صحابہ کرام نے آپ سے یہی سیکھا تھا۔

عَنْ نَافِعٍ قَالَ اِنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ لَا يَقْدِمُ مَكَّةَ اِلَّا بَاتَ بِذِي طُوًى حَتّٰى يُصْبِحَ وَيَغْتَسِلَ وَيُصَلِّيَ فَيَدْخُلُ مَكَّةَ نَهَارًا

وَ اِذَا نْفَرَ مِنْهَا مَرَّ بِذِی طُوًی وَبَاتَ بِهَا حَتّٰی یُصْبِحَ وَیَذْکُرُ
اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَفْعَلُ ذَالِكَ ــــ

رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے خادم نافع سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر جب بھی مکہ آتے تو اس میں داخلہ سے پہلے رات ذی طوی میں گزارتے (جو مکہ کے قریب ایک بستی تھی) یہاں تک کہ صبح ہونے پر غسل کرتے اور نماز پڑھتے اور اس کے بعد دن کے وقت میں مکہ معظمہ میں داخل ہوتے اور جب مکہ معظمہ سے واپس لوٹتے تو بھی ذی طوی میں رات گزار کے صبح کو وہاں سے روانہ ہوتے اور عبداللہ بن عمر بتاتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور بھی یہی تھا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ جَابِرٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
لَمَّا قَدِمَ مَکَّۃَ اَتَی الْحَجَرَ فَاسْتَلَمَہٗ ثُمَّ مَشٰی عَلٰی یَمِیْنِہٖ
فَرَمَلَ ثَلٰثًا وَمَشٰی اَرْبَعًا ــــ رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ پہنچے تو سب سے پہلے حجر اسود پر آئے اور اس کا استلام کیا پھر آپ نے داہنی طرف سے طواف کیا، جس میں پہلے تین چکروں میں آپ نے رمل کیا اور اس کے بعد چار چکروں میں آپ اپنی عادی رفتار سے چلے۔ (صحیح مسلم)

(**تشریح**) ہر طواف حجر اسود کے استلام سے شروع ہوتا ہے، استلام کا مطلب ہے حجر اسود کو چومنا، یا اس پر اپنا ہاتھ رکھ کر یا ہاتھ اس کی طرف کر کے اپنے اس ہاتھ ہی کو چوم لینا، بس یہ استلام کر کے طواف شروع کیا جاتا ہے اور ہر طواف میں خانہ کعبہ کے سات چکر لگائے جاتے ہیں۔

رَمَل ایک خاص انداز کی چال کو کہتے ہیں جس میں طاقت و قوت کا اظہار ہوتا ہے روایات میں ہے کہ ۷ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ عمرہ کے لئے مکہ معظمہ پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے آپس میں کہا کہ یثرب یعنی مدینہ کی

آب وہوا کی خرابی اور بخار وغیرہ وہاں کی بیماریوں نے ان لوگوں کو کمزور اور دُبلا پتلا کر دیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ بات پہنچی تو آپ نے حکم دیا کہ طواف کے پہلے تین چکروں میں رَمَلْ کی چال چلی جائے، اور اس طرح طاقت و قوت کا مظاہرہ کیا جائے، چنانچہ اسی پر عمل کیا گیا ——— لیکن اللہ تعالیٰ کو اس وقت کی یہ ادا ایسی پسند آئی کہ اس کو مستقل سنت قرار دے دیا گیا۔ اب یہی طریقہ جاری ہے کہ حج یا عمرہ کرنے والا جو پہلا طواف کرتا ہے جس کے بعد اس کو صفا، مروہ کے درمیان سعی بھی کرنی ہوتی ہے اس کے پہلے تین چکروں میں رمل کیا جاتا ہے اور باقی چار چکر اپنی عادی رفتار سے کئے جاتے ہیں۔

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ اَقْبَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَخَلَ مَكَّةَ فَاَقْبَلَ اِلَى الْحَجَرِ فَاسْتَلَمَهُ ثُمَّ طَافَ بِالْبَيْتِ ثُمَّ اَتَى الصَّفَا فَعَلَاهُ حَتّٰى يَنْظُرَ اِلَى الْبَيْتِ فَرَفَعَ يَدَيْهِ فَجَعَلَ يَذْكُرُ اللّٰهَ مَا شَاءَ وَيَدْعُوْ ——— رواہ ابو داؤد

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو مکہ میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے حجر اسود کے قریب پہنچکر آپ نے اس کا استلام کیا، پھر آپ نے طواف کیا، پھر صفا پہاڑی پر آئے اور اس کے اتنے اوپر چڑھ گئے کہ بیت اللہ نظر آنے لگے پھر آپنے ہاتھ اٹھائے (جس طرح دعا میں اٹھائے جاتے ہیں) اور پھر جتنی دیر تک آپنے چاہا آپ اللہ کے ذکر و دعا میں مشغول رہے۔

(سنن ابی داؤد)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ طَافَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ عَلٰى بَعِيْرٍ يَسْتَلِمُ الرُّكْنَ بِمِحْجَنٍ ———

رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے اونٹ پر سوار ہو کر بیت اللہ کا طواف کیا، آپکے ہاتھ میں ایک خمدار چھڑی تھی اسی سے آپ حجر اسود کا استلام کرتے تھے ——— (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) اوپر صحیح مسلم کے حوالہ سے حضرت جابر کی جو روایت نقل کی گئی ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طواف کے بارہ میں یہ صریح الفاظ ہیں " ثُمَّ مَشٰی عَلٰی یَمِیْنِہٖ فَرَمَلَ ثَلٰثًا وَمَشٰی اَرْبَعًا " (آپ حجر اسود کا استلام کرنے کے بعد اپنی جانب کو چلے (اور طواف شروع کیا) پھر تین چکروں میں تو آپ نے رمل کیا اور چار چکر آپ نے اپنی عادی رفتار سے لگائے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے طواف اپنے پاؤں پر چل کر کیا تھا اور حضرت ابوہریرہ کی اس روایت میں اونٹ پر سوار ہو کر طواف کا تذکرہ ہے لیکن ان دونوں بیانوں میں کوئی تضاد نہیں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد پہلا طواف پیادہ پا کیا تھا، حضرت جابر نے اسی کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد دسویں ذی الحجہ کو منیٰ سے مکہ آ کر جو طواف کیا تھا وہ اونٹ پر کیا تھا، تاکہ سوالات کرنے والے آپ سے سوالات کر سکیں، گویا آپ کی اونٹنی اس وقت آپ کے لئے منبر بنی ہوئی تھی، اور غالباً اپنے عمل سے اس کا اظہار بھی مقصود تھا کہ خاص حالات میں سواری پر بھی طواف کیا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم

عَنْ اُمِّ سَلَمَۃَ قَالَتْ شَکَوْتُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنِّیْ اَشْتَکِیْ فَقَالَ طُوْفِیْ مِنْ وَرَاءِ النَّاسِ رَاکِبَۃً فَطُفْتُ وَرَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُصَلِّیْ اِلٰی جَنْبِ الْبَیْتِ یَقْرَءُ بِالطُّوْرِ وَکِتَابٍ مَّسْطُوْرٍ ـــــ

رواہ البخاری ومسلم

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ (حجۃ الوداع میں) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا مجھے بیماری کی تکلیف ہے (میں طواف کیسے کروں؟) آپ نے فرمایا کہ تم سوار ہو کر لوگوں کے پیچھے پیچھے طواف کر لو، تو میں نے اسی طرح طواف کیا اور اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کی جانب کھڑے نماز پڑھ رہے تھے اور اس میں سورہ طور تلاوت فرما رہے تھے۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ خَرَجْنَا مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

لَا نَذْكُرُ إِلَّا الْحَجَّ فَلَمَّا كُنَّا بِسَرِفَ طَمِثْتُ فَدَخَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنَا أَبْكِي فَقَالَ لَعَلَّكِ نَفِسْتِ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَإِنَّ ذَالِكِ شَيْءٌ كَتَبَهُ اللهُ عَلَى بَنَاتِ آدَمَ فَافْعَلِي مَا يَفْعَلُ الْحَاجُّ غَيْرَ أَنْ لَا تَطُوفِي بِالْبَيْتِ حَتَّى تَطْهُرِي ———— رواه البخاری ومسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم لوگ (حجۃ الوداع والے سفر میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ سے چلے، ہماری زبانوں پر بس حج ہی کا ذکر تھا، یہاں تک کہ جب (مکہ کے بالکل قریب) مقام سرف پہنچے (جہاں سے مکہ صرف ایک منزل رہ جاتا ہے) تو میرے وہ دن شروع ہوگئے جو عورتوں کو ہر مہینے آتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (خیمہ میں) تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ میں بیٹھی رو رہی ہوں، آپ نے فرمایا شاید تمھارے ماہواری ایام شروع ہوگئے ہیں؟ ———— میں نے عرض کیا کہ ہاں یہی بات ہے، آپ نے فرمایا (رونے کی کیا بات ہے) یہ تو ایک ایسی چیز ہے جو اللہ نے آدم کی بیٹیوں یعنی سب عورتوں کے ساتھ لازم کردی ہے تم وہ سارے عمل کرتی رہو جو حاجیوں کو کرنے ہوتے ہیں سوائے اس کے کہ بیت اللہ کا طواف اس وقت تک نہ کرو جب تک کہ اس سے پاک صاف نہ ہو جاؤ ————

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الطَّوَافُ حَوْلَ الْبَيْتِ مِثْلُ الصَّلٰوةِ إِلَّا أَنَّكُمْ تَتَكَلَّمُونَ فِيهِ فَمَنْ تَكَلَّمَ فِيهِ فَلَا يَتَكَلَّمَنَّ إِلَّا بِخَيْرٍ ————

رواہ الترمذی والنسائی والدارمی

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیت اللہ کا طواف نماز کی طرح کی عبادت ہے بس یہ فرق ہو کہ طواف

میں تم کو باتیں کرنے کی اجازت ہے تو جو کوئی طواف کی حالت میں کسی سے بات کرے تو نیکی اور بھلائی ہی کی بات کرے (لغو وفضول یا ناجائز باتوں سے طواف کو مکدر نہ کرے)۔ (جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن دارمی)

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ مَسْحَهُمَا (الرُّكْنَيْنِ اليمانى) كَفَّارَةٌ لِّلْخَطَايَا وَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ مَنْ طَافَ بِهٰذَا الْبَيْتِ اُسْبُوْعًا فَاَحْصَاهُ كَانَ كَعِتْقِ رَقَبَةٍ وَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ لَا يَضَعُ قَدَمًا وَلَا يَرْفَعُ اُخْرٰى اِلَّا حَطَّ اللّٰهُ عَنْهُ بِهَا خَطِيْئَةً وَكَتَبَ لَهُ بِهَا حَسَنَةً۔

رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ حجر اسود اور رکن یمانی ان دونوں پر ہاتھ پھیرنا گناہوں کے کفارہ کا ذریعہ ہے۔ اور میں نے آپ سے یہ بھی سنا آپ فرماتے تھے کہ جس نے اللہ کے اس گھر کا سات بار طواف کیا اور اہتمام اور فکر کے ساتھ کیا (یعنی سنن وآداب کی رعایت کے ساتھ کیا) تو اس کا یہ عمل ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ہوگا۔ اور میں نے آپ سے یہ بھی سنا آپ فرماتے تھے کہ بندہ طواف کرتے ہوئے جب ایک قدم رکھے گا اور دوسرا قدم اٹھائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم کے بدلہ ایک گناہ معاف کرے گا اور ایک نیکی کا ثواب اس کے لئے لکھائے گا۔

(جامع ترمذی)

(تشریح) حدیث کے لفظ "مَنْ طَافَ بِهٰذَا الْبَيْتِ اُسْبُوْعًا" کا ترجمہ ہم نے سات بار طواف کرنا کیا ہے۔ شارحین نے لکھا ہے کہ اس میں تین احتمال ہیں اوّل طواف کے سات چکر (اور یہ بات پہلے ذکر کی جاچکی ہے کہ ایک طواف میں بیت اللہ کے سات چکر کئے جاتے ہیں) اور دوسرا احتمال ہے پورے سات طواف جس کے انچاس چکر ہوں گے۔ اور تیسرا احتمال ہے بلا ناغہ سات دن طواف ۔ لیکن بظاہر پہلا مطلب راجح ہے۔ واللہ اعلم۔

حجر اسود:۔

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی الْحَجَرِ وَاللّٰہِ لَیَبْعَثَنَّہُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ لَہٗ عَیْنَانِ یُبْصِرُ بِھِمَا وَلِسَانٌ یَنْطِقُ بِہٖ یَشْھَدُ عَلٰی مَنِ اسْتَلَمَہٗ بِحَقٍّ۔

رواہ الترمذی وابن ماجۃ والدارمی

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجر اسود کے بارہ میں فرمایا خدا کی قسم قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو ایسی زندگی دے کر اس طرح اٹھائے گا کہ اُس کے دو آنکھیں ہوں گی جن سے وہ دیکھے گا اور زبان ہوگی جس سے وہ بولے گا اور جن بندوں نے اُس کا استلام کیا ہوگا ان کے حق میں سچی شہادت دے گا۔

(جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی)

(**تشریح**) حجر اسود دیکھنے میں پتھر کا ایک ٹکڑا ہے لیکن اس میں ایک روحانیت ہے اور وہ ہر اُس شخص کو پہچانتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی نسبت سے اَدب اور محبت کے ساتھ اس کو بلاواسطہ یا بالواسطہ چومتا ہے اور اس کا استلام کرتا ہے، قیامت میں اللہ تعالیٰ اس کو ایک دیکھنے اور بولنے والی ہستی بنا کر کھڑا کرے گا اور وہ اُن بندوں کے حق میں شہادت دے گا جو اللہ کے حکم کے مطابق عاشقانہ اور نیازمندانہ شان کے ساتھ اُس کا استلام کرتے تھے۔

عَنْ عَابِسِ بْنِ رَبِیْعَۃَ قَالَ رَاَیْتُ عُمَرَ یُقَبِّلُ الْحَجَرَ وَیَقُوْلُ اِنِّیْ لَاَعْلَمُ اِنَّکَ حَجَرٌ مَا تَنْفَعُ وَلَا تَضُرُّ وَلَوْلَا اَنِّیْ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُقَبِّلُ مَا قَبَّلْتُکَ۔

رواہ البخاری ومسلم

عابس بن ربیعہ تابعی سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا وہ حجر اسود کو بوسہ دیتے تھے اور کہتے تھے میں یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے (تیرے اندر کوئی خدائی صفت نہیں ہے) نہ تو کسی کو نفع پہنچا

سکتا ہے نہ نقصان، اور اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے چومتے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے نہ چومتا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات بالاعلان اور علی رؤس الاشہاد اس لئے کہی کہ کوئی نا تربیت یافتہ نیا مسلمان حضرت عمر اور دوسرا کابر کلین کا حجر اسود کو چومنا دیکھ کر یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ اس پتھر میں کوئی خدائی کرشمہ اور خدائی صفت اور بناؤ بگاڑ کی کوئی طاقت ہے اور اس لئے اس کو چوما جارہا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے ایک اصولی اور بنیادی بات یہ معلوم ہوئی کہ کسی چیز کی جو تعظیم و تکریم اس نظریہ سے کیجائے کہ اللہ و رسول کا حکم ہے وہ تعظیم برحق ہے لیکن اگر کسی مخلوق کو نافع اور ضار اور بناؤ بگاڑ کا مختار یقین کر کے اسکی تعظیم کی جائے تو وہ شرک کا ایک شعبہ ہے اور اسلام میں اسکی گنجائش نہیں ـــــ

طواف میں ذکر اور دعا:۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ السَّائِبِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا بَيْنَ الرُّكْنَيْنِ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ـــ

رواہ ابوداؤد

حضرت عبداللہ بن السائب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (طواف کی حالت میں) رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان (کی مسافت میں) یہ دعا پڑھتے ہوئے سنا " رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ "

(سنن ابی داؤد)

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وُكِّلَ بِهٖ سبعون مَلَكًا (یعنی الرکن الیمانی) فَمَنْ قَالَ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ رَبَّنَا

اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ قَالُوْا اٰمِیْن ـــــ رواہ ابن ماجہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رکن یمانی پر ستر فرشتے مقرر ہیں جو ہر اس بندے کی دعا پر آمین کہتے ہیں جو اس کے پاس یہ دعا کرے ـــ کہ

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔	اے اللہ میں تجھ سے دنیا اور آخرت میں معافی اور عافیت مانگتا ہوں۔ اے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی اور دوزخ کے عذاب سے ہم کو بچا۔! (سنن ابن ماجہ)

وقوف عرفہ کی اہمیت اور فضیلت :۔

حج کا سب سے اہم رکن نویں ذی الحجہ کو میدان عرفات کا وقوف ہے اگر یہ ایک لحظہ کے لئے بھی نصیب ہو گیا تو حج نصیب ہو گیا اور اگر کسی وجہ سے حاجی ۹ ذی الحجہ کے دن اور اس کے بعد والی رات کے کسی حصہ میں بھی عرفات میں نہ پہنچ سکا تو اس کا حج فوت ہو گیا۔ حج کے دوسرے ارکان و مناسک طواف، سعی، رمی جمرات وغیرہ اگر کسی وجہ سے فوت ہو جائیں تو ان کا کوئی نہ کوئی کفارہ اور تدارک ہے لیکن اگر وقوف عرفہ فوت ہو جائے تو اس کا کوئی تدارک نہیں ہے۔

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ يَعْمَرَ الدِّيْلِیِّ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَلْحَجُّ عَرَفَةُ مَنْ اَدْرَكَ عَرَفَةَ لَيْلَةَ جَمْعٍ قَبْلَ طُلُوْعِ الْفَجْرِ فَقَدْ اَدْرَكَ الْحَجَّ ـــ اَيَّامُ مِنًى ثَلٰثَةٌ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ يَوْمَيْنِ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ ـــ رواہ الترمذی وابو داؤد والنسائی وابن ماجہ والدارمی

عبدالرحمٰن بن یعمر دُئلی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا آپ فرماتے تھے حج (کا خاص الخاص رکن جس پر حج کا دارومدار ہے) وقوف عرفہ ہے، جو حاجی مزدلفہ والی رات میں (یعنی ۹، اور ۱۰ ذی الحجہ کی درمیانی شب میں) بھی صبح صادق سے پہلے عرفات میں پہنچ جائے تو اُس نے حج پالیا اور اس کا حج ہوگیا ــــــ (یوم النحر یعنی ۱۰ ذی الحجہ کے بعد) منیٰ میں قیام کے تین دن ہیں (جن میں تینوں جمروں کی رمی کی جاتی ہے ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذی الحجہ) اگر کوئی آدمی صرف دو دن میں یعنی (۱۱، ۱۲ کو رمی کرکے) جلدی منیٰ سے چلدے تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے اور اگر کوئی ایک دن مزید ٹھیر کے (۱۳ ذی الحجہ کی رمی کرکے) وہاں سے جائے تو اس پر بھی کوئی گناہ اور الزام نہیں ہے (دونوں باتیں جائز ہیں)۔

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی)

(تشریح) چونکہ وقوف عرفات پر حج کا دارومدار ہے اس لئے اُس میں اتنی وسعت رکھی گئی ہے کہ اگر کوئی آدمی نویں ذی الحجہ کے دن میں عرفات نہ پہنچ سکے (جو وقوف کا اصلی وقت ہے) وہ اگر اگلی رات کے کسی حصّہ میں بھی وہاں پہنچ جائے تو اُس کا وقوف ادا ہوجائے گا اور وہ حج سے محروم نہ سمجھا جائے گا۔

یوم العرفہ کے بعد ۱۰ ذی الحجہ کو یوم النحر ہے جس میں ایک جمرہ کی رمی اور قربانی اور حلق وغیرہ کے بعد احرام کی پابندیاں ختم ہوجاتی ہیں اور اسی دن مکہ جاکر طواف زیارت کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد منیٰ میں زیادہ سے زیادہ تین دن اور کم سے کم دو دن ٹھیر کے تینوں جمروں پر کنکریاں مارنا مناسک میں سے ہے ــــــ پس اگر کوئی شخص صرف دو دن ۱۱، ۱۲ ذی الحجہ کو رمی جمرات کرکے منیٰ سے چلا جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور اگر کوئی ۱۳ کو بھی ٹھیرے اور رمی کرے تو یہ بھی جائز ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ يَوْمٍ اَكْثَرَ مِنْ اَنْ يُّعْتِقَ اللّٰهُ فِيْهِ عَبْدًا مِّنَ النَّارِ مِنْ يَوْمِ عَرَفَةَ وَاِنَّهٗ لَيَدْنُوْ ثُمَّ يُبَاهِيْ بِهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ فَيَقُوْلُ

مَا اَرَادَ هٰؤُلَاءِ ــــــــ (رواہ مسلم)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی دن ایسا نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ عرفہ کے دن سے زیادہ اپنے بندوں کے لئے جہنم سے آزادی اور رہائی کا فیصلہ کرتا ہو (یعنی گنہگار بندوں کی مغفرت اور جہنم سے آزادی کا سب سے بڑے اور وسیع پیمانہ پر فیصلہ سال کے ۳۶۰ دنوں میں سے ایک دن یوم العرفہ میں ہوتا ہے) اُس دن اللہ تعالیٰ اپنی صفت رحمت و رافت کے ساتھ (عرفات میں جمع ہونے والے) اپنے بندوں کے بہت ہی قریب ہوجاتا ہے اور اُن پر فخر کرتے ہوئے فرشتوں سے کہتا ہے "مَا اَرَادَ هٰؤُلَاءِ" دیکھتے ہو میرے یہ بندے کس مقصد سے یہاں آئے ہیں؟ (صحیح مسلم)

(تشریح) عرفات کے مبارک میدان میں ذی الحجہ کی نویں تاریخ کو جو رحمتوں اور برکتوں کے نزول کا خاص دن ہے جب ہزاروں یا لاکھوں کی تعداد میں اللہ کے بندے فقیروں محتاجوں کی صورت بنا کر جمع ہوتے ہیں اور اُس کے حضور میں اپنے اور دوسروں کے لئے مغفرت اور رحمت کے لئے دعائیں اور آہ و زاری کرتے ہیں اور اس کے سامنے روتے اور گڑگڑاتے ہیں تو لامحالہ ارحم الراحمین کی رحمت کا اتھاہ سمندر جوش میں آجاتا ہے اور پھر وہ اپنی شان کریمی کے مطابق گنہگار بندوں کی مغفرت اور جہنم سے رہائی و آزادی کے وہ عظیم فیصلے فرماتا ہے کہ شیطان بس جل بھن کے رہ جاتا ہے اور اپنا سر پیٹ لیتا ہے۔

عَنْ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ كَرِيْزٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا رُئِيَ الشَّيْطَانُ يَوْمًا هُوَ فِيْهِ اَصْغَرُ وَلَا اَدْحَرُ وَلَا اَحْقَرُ وَلَا اَغْيَظُ مِنْهُ فِيْ يَوْمِ عَرَفَةَ وَمَا ذَالِكَ اِلَّا لِمَا يَرٰى مِنْ تَنَزُّلِ الرَّحْمَةِ وَتَجَاوُزِ اللّٰهِ عَنِ الذُّنُوْبِ الْعِظَامِ ــــــــ رواہ مالک مرسلاً

طلحہ بن عبید اللہ بن کریز (تابعی) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان کسی دن بھی اتنا ذلیل، اتنا خوار، اتنا دھتکارا اور پھٹکارا ہوا

اور اتنا جلا بھنا ہوا نہیں دیکھا گیا جتنا کہ وہ عرفہ کے دن ذلیل و خوار رو سیاہ اور جلا بھنا دیکھا جاتا ہے اور یہ صرف اس لئے کہ وہ اس دن اللہ کی رحمت کو (موسلا دھار) برستے ہوئے اور بڑے بڑے گناہوں کی معافی کا فیصلہ ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ (اور یہ اس لعین کے لئے ناقابل برداشت ہے)

(موطا امام مالک مرسلاً)

رمی جمرات:۔

منیٰ میں کافی فاصلہ سے تین جگہوں پر تین ستون بنے ہوئے ہیں۔ انہی ستونوں کو جمرات کہا جاتا ہے ان جمرات پر کنکریاں پھینکنا بھی حج کے اعمال اور مناسک میں سے ہے، دسویں ذی الحجہ کو صرف ایک جمرہ پر سات کنکریاں پھینکی جاتی ہیں اور ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذی الحجہ کو تینوں جمروں پر سات سات کنکریاں پھینکی جاتی ہیں ــــ ظاہر بات ہے کہ کنکریاں پھینکنا بذات خود کوئی نیک عمل نہیں ہے لیکن اللہ کے حکم سے ہر عمل میں عبادت کی شان پیدا ہو جاتی ہے، اور بندگی یہی ہے کہ بے چون و چرا اللہ کے حکم کی تعمیل کی جائے، علاوہ ازیں اللہ کے بندے جب اللہ کے حکم سے اُس کے جلال و جبروت کا دھیان کرتے ہوئے اور اس کی کبریائی کا نعرہ لگاتے ہوئے شیطانی خیالات و عادات اور نفسانی خواہشات و معصیات کو عالم تصوّر میں نشانہ بنا کر ان جمروں پر کنکریاں مارتے ہیں اور اس طرح گمراہی اور معصیت کو سنگسار کرتے ہیں تو اُن کے قلوب کی اس وقت جو کیفیت ہوتی ہے اور ان کے ایمان والے سینوں کو جو انشراح اور سرور و انبساط اُس سے نصیب ہوتا ہے اس کا ذائقہ بس وہی جانتے ہیں ــــ بہر حال اللہ کے حکم سے اور اس کا نام لے کر جمروں پر کنکریاں پھینکنا بھی اہل بصیرت کی نگاہ میں ایک ایمان افروز عمل ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا جُعِلَ رَمْيُ الْجِمَارِ وَالسَّعْيُ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ لِاِقَامَةِ ذِكْرِ اللّٰهِ ــــ

رواہ الترمذی والدارمی

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جمرات پر کنکریاں پھینکنا اور صفا مروہ کے درمیان سعی کرنا اور پھیرے لگانا (لہو ولعب کی باتیں نہیں ہیں بلکہ) یہ ذکر اللہ کی گرم بازاری کے وسائل ہیں۔

(جامع ترمذی، سنن دارمی)

عَنْ جَابِرٍ قَالَ رَمٰى رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْجَمْرَۃَ یَوْمَ النَّحْرِ ضُحًى وَاَمَّا بَعْدَ ذٰلِکَ فَاِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ۔

رواہ البخاری ومسلم

حضرت جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دسویں ذی الحجہ کو جمرۂ عقبہ کی رمی چاشت کے وقت فرمائی اور اس کے بعد ایام تشریق میں جمرات کی رمی آپ نے زوال آفتاب کے بعد کی۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) یہی سنت ہے کہ ۱۰ ذی الحجہ کو جمرۃ العقبہ کی رمی دوپہر سے پہلے کرلی جائے اور بعد کے دنوں میں زوال کے بعد۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّہٗ اِنْتَھٰى اِلَى الْجَمْرَۃِ الْکُبْرٰى فَجَعَلَ الْبَیْتَ عَنْ یَسَارِہٖ وَمِنًى عَنْ یَمِیْنِہٖ وَرَمٰى بِسَبْعِ حَصَیَاتٍ یُکَبِّرُ مَعَ کُلِّ حَصَاۃٍ ثُمَّ قَالَ ھٰکَذَا رَمَى الَّذِیْ اُنْزِلَتْ عَلَیْہِ سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃِ ـــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ رمی کے لئے جمرۂ کبریٰ کے پاس پہنچے، پھر اس طرح اس کی طرف رخ کرکے کھڑے ہوئے کہ بیت اللہ یعنی مکہ اُن کے بائیں جانب تھا اور منیٰ داہنی جانب اس کے بعد انھوں نے اُس جمرہ پر سات کنکریاں ماریں ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہتے تھے اس کے بعد فرمایا کہ اسی طرح رمی کی تھی اس مقدس ہستی نے جس پر سورۂ بقرہ نازل ہوئی تھی (جس میں حج کے احکام اور مناسک کا بیان ہے۔) (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رمی کرنے کے طریقہ کو تفصیل سے یاد رکھا تھا اور اسی کے مطابق عمل کرکے لوگوں کو دکھایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن پر اللہ نے حج کے احکام نازل کئے تھے اس طرح رمی کیا کرتے تھے۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْمِيْ عَلَى رَاحِلَتِهٖ يَوْمَ النَّحْرِ وَيَقُوْلُ لِتَأْخُذُوْا مَنَاسِكَكُمْ فَإِنِّيْ لَا أَدْرِيْ لَعَلِّيْ لَا أَحُجُّ بَعْدَ حَجَّتِيْ هٰذِهٖ۔

رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (۱۰ ذی الحجہ کو) اپنی ناقہ پر سے رمی کرتے ہوئے دیکھا، آپ اس وقت فرماتے تھے کہ تم مجھ سے اپنے مناسک سیکھ لو میں نہیں جانتا کہ شاید اس حج کے بعد میں کوئی اور حج نہ کروں (اور پھر تمہیں اس کا موقع نہ ملے)

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) دسویں ذی الحجہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ناقہ پر مزدلفہ سے روانہ ہو کر منیٰ پہنچے تو اُس دن آپ نے ناقہ پر سوار ہونے ہی کی حالت میں جمرۂ عقبہ کی رمی کی تا سب لوگ آپ کو رمی کرتا ہوا دیکھ کر رمی کا طریقہ سیکھ لیں اور آسانی سے مسائل اور مناسک پوچھ سکیں، لیکن دوسرے اور تیسرے دن آپ نے رمی پاپیادہ کی ۔۔۔ بہرحال رمی سوار ہو کر بھی جائز ہے اور پاپیادہ بھی۔

یہ اشارہ حجۃ الوداع میں آپ نے بار بار فرمایا کہ اہل ایمان مجھ سے مناسک اور شریعت کے احکام سیکھ لیں شاید اب اس دنیا میں میرا قیام بہت زیادہ نہیں ہے۔

عَنْ سَالِمٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّهٗ كَانَ يَرْمِيْ جَمْرَةَ الدُّنْيَا بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ يُكَبِّرُ عَلٰى إِثْرِ كُلِّ حَصَاةٍ ثُمَّ يَتَقَدَّمُ حَتّٰى يُسْهِلَ فَيَقُوْمُ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ طَوِيْلًا وَيَدْعُوْ

وَيَرْفَعُ يَدَيْهِ ثُمَّ يَرْمِي الْوُسْطَى بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ يُكَبِّرُ كُلَّمَا رَمَى بِحَصَاةٍ ثُمَّ يَأْخُذُ بِذَاتِ الشِّمَالِ فَيُسْهِلُ وَيَقُومُ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ ثُمَّ يَدْعُو وَيَرْفَعُ يَدَيْهِ وَيَقُومُ طَوِيلًا ثُمَّ يَرْمِي جَمْرَةَ ذَاتِ الْعَقَبَةِ مِنْ بَطْنِ الْوَادِي بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ يُكَبِّرُ عِنْدَ كُلِّ حَصَاةٍ وَلَا يَقِفُ عِنْدَهَا ثُمَّ يَنْصَرِفُ فَيَقُولُ هٰكَذَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْعَلُهُ ـــ رواہ البخاری

سالم بن عبد اللہ اپنے والد ماجد حضرت عبد اللہ بن عمر کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ رمی جمرات کے بارہ میں اُن کا معمول اور دستور تھا کہ وہ پہلے جمرہ پر سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری پر اللہ اکبر کہتے، اس کے بعد آگے نشیب میں اتر کے قبلہ رو کھڑے ہوتے اور ہاتھ اٹھا کے دیر تک دعا کرتے، پھر درمیان والے جمرہ پر بھی اسی طرح سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری پر تکبیر کہتے پھر بائیں جانب نشیب میں اتر کے قبلہ رو کھڑے ہوتے اور دیر تک کھڑے رہتے اور ہاتھ اٹھا کے دعا کرتے۔ پھر آخری جمرہ (جمرۃ العقبہ) پر بطن وادی سے سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہتے اور اس جمرہ کے پاس کھڑے نہ ہوتے بلکہ واپس ہو جاتے اور بتاتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

(صحیح بخاری)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے اور دوسرے جمروں کی رمی کے بعد قریب میں قبلہ رو کھڑے ہو کر دیر تک دعا کرتے تھے اور آخری جمرہ کی رمی کے بعد بغیر کھڑے ہوئے اور دعا کئے واپس ہو جاتے تھے۔ یہی سنت ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے زمانہ میں اس سنت پر عمل کرنے والے بلکہ اس کے جاننے والے بھی بہت کم ہیں۔

قربانی ـــــ قربانی کی عام فضیلت اور اُس کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی عام ہدایات کتاب الصلوٰۃ میں عیدالاضحیٰ کے بیان میں ذکر کی جا چکی ہیں اور حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے دست مبارک سے ۶۳ اونٹوں کی اور آپ کے حکم سے حضرت علی مرتضیٰ نے ۳۷ اونٹوں کی جو قربانی کی تھی اس کا ذکر حجۃ الوداع کے بیان میں گزر چکا ہو یہاں قربانی کے بارہ میں صرف دو تین حدیثیں اور پڑھ لی جائیں۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ قُرْطٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَعْظَمَ الْاَیَّامِ عِنْدَ اللّٰہِ یَوْمُ النَّحْرِ ثُمَّ یَوْمُ الْقَرِّ (قَالَ ثَوْرٌ وَھُوَ الْیَوْمُ الثَّانِیْ) قَالَ وَقُرِّبَ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَدَنَاتٌ خَمْسٌ اَوْ سِتٌّ فَطَفِقْنَ یَزْدَلِفْنَ اِلَیْہِ بِاَیَّتِھِنَّ یَبْدَأُ ——— رواہ ابوداؤد

عبداللہ بن قرط رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عظمت والا دن یوم النحر (قربانی کا دن یعنی ۱۰ ذی الحجہ کا دن) ہے (یعنی یوم العرفہ کی طرح یوم النحر بھی بڑی عظمت والا دن ہے) اس کے بعد اس سے اگلا دن یوم القر (۱۱ ذی الحجہ) کا درجہ ہے (اسلئے قربانی جہاں تک ہوسکے ۱۰ ذی الحجہ کو کرلی جائے اور کسی وجہ سے ۱۰ ذی الحجہ کو نہ کی جاسکے تو ۱۱ کو ضرور کرلی جائے اس کے بعد یعنی ۱۲ ذی الحجہ کو اگر کی جائے گی تو ادا تو ہوجائے گی لیکن فضیلت کا کوئی درجہ ہاتھ نہ آئے گا۔ حدیث کے راوی عبداللہ بن قرط (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرنے کے بعد اپنا یہ عجیب وغریب مشاہدہ) بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ پانچ یا چھ اونٹ قربانی کے لئے رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے قریب لائے گئے تو ان میں سے ہر ایک آپ کے قریب ہونے کی کوشش کرتا تھا تاکہ پہلے اسی کو آپ ذبح کریں۔

(سنن ابی داؤد)

(تشریح) اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے کہ وہ جانوروں میں بلکہ مٹی، پتھر جیسے جمادات میں حقائق کا شعور پیدا کردے۔ یہ ۵ - ۶ اونٹ جو قربانی کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے قریب کئے گئے تھے اُن میں اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ شعور پیدا فرما دیا تھا کہ اللہ کی راہ میں اور اُس کے محبوب اور برگزیدہ رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے قربان ہونا ان کی کتنی بڑی خوش بختی ہے اس لئے ان میں سے ہر ایک اس خواہش کے ساتھ آپ کے قریب ہونا چاہتا تھا کہ پہلے آپ اُسی کو ذبح کریں۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف
بہ امید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَكْوَعِ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ ضَحّٰى مِنْكُمْ فَلَا يُصْبِحَنَّ بَعْدَ ثَالِثَةٍ وَفِي بَيْتِهِ مِنْهُ شَيْءٌ فَلَمَّا كَانَ الْعَامُ الْمُقْبِلُ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَفْعَلُ كَمَا فَعَلْنَا الْعَامَ الْمَاضِيَ قَالَ كُلُوْا وَاَطْعِمُوْا وَادَّخِرُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ الْعَامَ كَانَ بِالنَّاسِ جَهْدٌ فَاَرَدْتُّ اَنْ تُعِيْنُوْا فِيْهِمْ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک سال عیدالاضحیٰ کے موقع پر) ہدایت فرمائی کہ تم میں سے جو کوئی قربانی کرے تو (اُس کا گوشت بس تین دن تک کھا سکتا ہے) تیسرے دن کے بعد اس کے گھر میں اس قربانی کے گوشت میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہنا چاہئے ——— پھر جب اگلا سال آیا تو لوگوں نے دریافت کیا کہ کیا ہم اس سال بھی ایسا ہی کریں جیسا کہ گزشتہ سال آپ کی ہدایت کے مطابق ہم نے کیا تھا تو آپ نے فرمایا (نہیں اس سال تین دن والی وہ پابندی نہیں ہے بلکہ اجازت ہے کہ جب تک چاہو) کھاؤ، کھلاؤ اور محفوظ رکھو، گزشتہ سال وہ ہدایت اس لئے دی گئی تھی کہ عوام کو (غذا کی کمی اور تنگدستی کی وجہ سے) کھانے پینے کی تکلیف تھی اس لئے میں نے چاہا تھا کہ قربانی کے گوشت سے تم ان کی پوری مدد کرو (اس لئے میں نے عارضی اور وقتی طور پر وہ حکم دیا تھا۔ اب جب کہ وہ ضرورت باقی نہیں رہی تم

لئے کھانے کھلانے اور محفوظ رکھنے کی پوری گنجائش ہے۔) (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ نُبَيْشَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّا كُنَّا نَهَيْنَاكُمْ عَنْ لُحُومِهَا أَنْ تَأْكُلُوهَا فَوْقَ ثَلٰثٍ لِكَيْ تَسَعَكُمْ جَاءَ اللّٰهُ بِالسَّعَةِ فَكُلُوا وَادَّخِرُوا وَاتَّجِرُوا أَلَا وَإِنَّ هٰذِهِ الْأَيَّامَ أَيَّامُ أَكْلٍ وَشُرْبٍ وَذِكْرِ اللّٰهِ۔

(رواہ ابوداؤد)

نُبَیشَہ ہُذَلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (عید الاضحیٰ کے موقع پر فرمایا) پہلے ہم نے قربانیوں کے گوشت تین دن سے زیادہ کھانے کی ممانعت کر دی تھی اور یہ پابندی اس لئے لگائی گئی تھی کہ سب لوگوں کو گوشت اچھی طرح ملجائے اب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے (وہ تنگدستی اور فقر و فاقہ والی بات اب نہیں رہی ہے بلکہ) اللہ کے کرم سے لوگ اب خوشحال ہیں اس لئے (اب وہ پابندی نہیں ہے) اجازت ہے لوگ کھائیں اور محفوظ رکھیں اور (قربانی کا ثواب بھی حاصل کریں ـــــ یہ دن کھانے پینے کے اور اللہ کی یاد کے ہیں۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) جیسا کہ ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا قربانی کے گوشت کے بارہ میں اجازت ہے کہ جتنک چاہیں کھائیں اور رکھیں اور آخری حدیث کے آخری جملہ سے معلوم ہوا کہ ایام تشریق میں بندوں کا کھانا پینا بھی اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے گویا یہ دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی ضیافت کے دن ہیں لیکن اس کھانے پینے کے ساتھ اللہ کی یاد اور اسکی تکبیر و تحمید تقدیس و توحید سے بھی زبان تر رہنی چاہیئے ـــــ اسکی آمیزش کے بغیر اللہ کے بندوں کے لئے ہر چیز بیمزا ہے۔

اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔

تجلّیاتِ مجدّد الف ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

(ترجمہ: از، مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

مکتوب (۴۵) خان جہاں کے نام [اتباع شریعت اور سرکوبی اعدائے دین کے بیان میں]

حق سبحانہٗ وتعالیٰ آپ کو اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرما کر سلامت اور معزز و محترم رکھے۔

گوئے توفیق وسعادت درمیاں افگندہ اند[1]
کس بمیدان در نمی آید سواراں راچہ شد

دنیائے فانی کے تلذذات اور تنعمات اُس وقت خوش گوار اور قابل ہضم ہوتے ہیں جبکہ اُن کے ضمن میں شریعتِ منوّرہ کے تقاضوں پر بھی عمل ہو اور آخرت کو بھی اُنکے ساتھ شامل کر لیا گیا ہو۔ ورنہ یہ دنیا کی لذتیں شکر میں ملے ہوئے اُس زہر قاتل کا حکم رکھتی ہیں جس سے کسی بیوقوف کو (با سانی) فریب دیا جا سکے۔ اگر اس زہر کا علاج، حکیم مطلق جلّ شانہٗ کے تریاق سے نہ کیا جائے اور اس (زہریلی) شیرینی کی تلافی اوامر نواہیِ شرعیّہ کی تلخی سے نہ کی جائے تو بڑے خسارے اور بڑے افسوس کی بات ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بموافقِ شریعت ـــــ جس کا دار و مدار سہولت پر ہے ـــــ

---

[1] توفیق وسعادت کی گیند قضاو قدر نے میدان میں پھینکدی ہے۔ شہسواروں کو کیا ہو گیا ہے ان میں سے کوئی بھی میدان میں نہیں آتا (اور توفیق وسعادت کو حاصل نہیں کرتا)

تھوڑی سی جد و جہد سے ملک ابدی حاصل ہوتا ہے اور تھوڑی سی غفلت اور بے پروائی سے یہ دولت جاودانی ہاتھ سے نکل جاتی ہے ــــ عقل دور اندیش کو کام میں لایا جائے اور (نادان) بچوں کی طرح معمولی چیزوں کو (اس دولت جاودانی کا) بدل اور عوض نہ ٹھہرایا جائے ــــ یہی ڈیوٹی جو آپ سے متعلق ہے اگر اس کو شریعت مصطفویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی ادائیگی کے ساتھ ملائیں تو کار انبیاء انجام دیں گے اور دین متین کو منوّر و معمور کر دیں گے ہم فقیر اگر سالہا سال جان کھپائیں تب بھی اس عمل میں آپ جیسے شاہبازوں کی گرد کو نہ پہونچ سکیں گے۔

گوئے توفیق و سعادت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں درنمی آید سواراں راچہ شد

اے اللہ تو ہم کو توفیق دے اس کام کی جس کو تو پسند کرتا ہے اور جس سے تو راضی ہوتا ہے ......

مکتوب (۵۵) مربزخاں افغان کے نام ــــــ

[فقر سے غنا کی طرف متوجہ ہونے کی مذمت میں]

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی ــــ برادرم میاں مربزخاں فقر کی تنگیوں سے بھاگ کر اغنیا کے پاس اپنی التجا لے گئے اور تلذذات و تنعمات سے ساز باز کرلی ہے۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون ــــ انھوں نے اس سلسلے میں اچھی طرح غور نہیں کیا ہے اگر وہ صحبت اغنیاء میں رہ کر بہت ترقی کریں گے تو ہزاری ہو جائیں گے راجہ مان سنگھ سے اونچے نہیں ہو سکتے جو کہ پنجہزاری یا ہفت ہزاری منصب رکھتا تھا ــــ اور بالفرض تم مان سنگھ والے منصب پر بھی پہونچ گئے تو سوچو اور غور کرو تم نے کیا کارنمایاں انجام دیا اور کونسی بزرگی حاصل کرلی؟ ــــ کیا فقیری کی حالت میں روٹی نہیں ملتی تھی؟ ــــ اب (زیادہ سے زیادہ) یہ ہوگا کہ گھی سے تر کی ہوئی روٹی کھا رہے ہو وہ حالت بھی گذر گئی، یہ حالت بھی گذر جائے گی لیکن تصور تو کرو کہ کیا چیز تمھارے ہاتھ سے نکل گئی اور برابر نکلتی جا رہی ہے اور تم پہلے سے زیادہ مفلس ہو رہے ہو ــــ جو شخص اپنے

نقصان پر راضی ہو وہ شفقت و ہمدردی کا مستحق نہیں ہوتا ہے ـــــ اب جبکہ تم اِس حالت میں مبتلا ہو ہی گئے ہو تو اس امر کی کوشش کرو کہ طریق استقامت اور التزام شریعت کا دامن تمھارے ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اور شغل باطن میں بھی کوئی خلل نہ واقع ہو ـــــ ہر چند دنیا کے ساتھ اس بات کا جمع کرنا مشکل ہے اسلئے کہ یہ تو ضدین کا جمع کرنا ہے ـــــ بس اتنا ہے کہ یہ وضع اور حالت جو تم نے اختیار کرلی ہے اور یہ کار خدمت جس کی جانب تم اب متوجہ ہو اگر اس میں صحیح نیت کرلی جائے گی تو داخل جہاد ہو کر عمل نیک بن جائے گا ـــــ لیکن تصحیح نیت سے مشکل کام ـــــ آج تو تمھارے سپرد یہ خدمت ہے جو فی الجملہ اچھی ہے کل کو شاید کوئی اور ڈیوٹی لگادی جائے جو عین وبال ہو ـــــ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مشکل کام ہے ہشیار رہیں ـ خبر کرنا شرط ہے ـــ والسلام ـــ

مکتوب (۵۶) حضرت خواجہ عبد اللہؒ خلف حضرت خواجہ باقی باللہؒ اور خواجہ جمال الدین حسینؒ خلف خواجہ حسام الدین احمدؒ کے نام ـــــ

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور میرے کانوں کی مسرت! یعنی خواجہ عبد اللہ اور خواجہ جمال الدین حسین دونوں ـــ اطمینان صوری و معنوی سے ہم آغوش اور آراستہ رہیں ـ تم دونوں نے عجیب تغافل اور نامہربانی کا معاملہ اختیار کر رکھا ہے کہ باوجود ڈیڑھ دس میں رہنے کے سرہند نہیں پہونچے اور اس غریب کا حال دریافت نہیں کیا نیز حقوق آشنائی بجا نہ لائے ـــ خواجہ محمد افضل کا کیا گلہ کروں وہ تو تم دونوں سے زیادہ دوستی کے معاملے میں دور ہیں بلکہ (یوں کہا جائے کہ) وہ ہماری دوستی سے ہراساں ہیں ـــ میر منصور بیگ کے متعلق کیا کہوں کہ وہ ہمیشہ آرزوئے ملاقات کرتے رہتے ہیں اور وہ آرزو قوت سے فعل میں نہیں آتی ـــــ فقہائے عظام کا قول ہے کہ "جو شخص خود اپنے ضرر پر راضی ہو وہ شفقت و ترحم کا مستحق نہیں ہوتا" ـــــ لشکر شاہی ہر چند ایک دریائے ظلمات ہے مگر آب حیات بھی اُسی کے اندر ہے ـــ اس جگہ اللہ تعالیٰ کی عنایت

گو بطریق ندرت ہی سہی مگر وہ گوہر (مضمون) ہاتھ آتا ہے کہ دوسری جگہوں میں اگر اس گوہر کی صورت ہی میسر آجائے تو غنیمت ہے ـــــ جس سپاہی نے بھی اپنی قیمت پیدا کی ہے غلبۂ اعداء کے وقت میں کی ہے ـــ ہر چند کہ گوشے میں سلامتی ہے، لیکن دولتِ غزا و شہادت تو میدان میں ہے کُنج وزاویہ عورتوں اور ضعیفوں کے لئے مناسب ہے ـــ حدیث شریف میں آیا ہے کہ " مومن قوی، مومنِ ضعیف سے بہتر ہے ـ قوی اور طاقتور مردوں کا کام جنگ اور معرکۂ کبریٰ ہے ـــ قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ـــــــــ
کہدیجئے کہ ہر شخص اپنے طریقے پر کام کرتا ہے پس تمھارا پروردگار خوب جانتا ہے اُس شخص کو جو زیادہ راہ یاب ہے) رخصت کی مدت ختم ہوجانے کے بعد جب میں لشکرِ شاہی کی طرف متوجہ ہوا تو فرزندی محمد سعید کو بضرورت، مکان پر چھوڑ گیا ـــ جب میں نے اُن فیوض و برکات اور علوم و معارف کو دیکھا جو محمد سعید کی مفارقت کے بعد ظہور میں آئے تو میں ان کو ساتھ نہ رکھنے پر پچھتایا اور فرصت کو غنیمت سمجھ کر اُن کو اپنے پاس بلا لیا . . . .

سید سلیمان ندوی

شخصیت و ماحول

سید ذوالفقار حسین بخاری ایم ، اے (اسلامیہ کالج لائلپور)

سید صاحبؒ (۱۸۸۴ - ۱۹۵۳) کی شخصیت کا تجزیہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے علمی ، مذہبی ، سیاسی اور ادبی ماحول کا سرسری جائزہ لیا جائے ، جس میں انھوں نے آنکھیں کھولیں اور اس کے اثرات ان کے دل و دماغ پر مرتسم ہوئے۔

سید صاحب دلیسنہ ضلع پٹنہ (صوبہ بہار) کے رہنے والے ہیں۔ صوبہ بہار کا یہی خطہ جس میں صادق پور اور عظیم آباد واقع ہیں ، حضرت سید احمد شہیدؒ کے جاں نثاروں اور راہ خدا کے جانبازوں کا مرکز تھا۔ جنگ آزادی اوّل ۱۸۵۷ء سے قبل اور بعد ان بستیوں کے مکینوں پر انگریزوں نے جس طرح کی سختیاں کیں ، ان پر بغاوت کے سنگین مقدمات چلائے ، انھیں ملک بدر کیا اور ان کے لئے سزائے موت اور حبس دوام کے احکام صادر کئے ان سب کی روداد کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خطہ کے مسلمان دینی و سیاسی شعور اور راہ حق میں قربانی کے جذبہ کے لحاظ سے بہت ممتاز تھے۔ اسی ماحول میں سید صاحب کا خاندان پرورش پاتا ہے مگر جب سید صاحب آنکھیں کھولتے ہیں اس وقت ہندوستان میں انڈین نیشنل کانگرس وجود میں آچکی ہوتی ہے۔ بقول علامہ عبداللہ یوسف علی۔

> "۱۸۸۵ء سے ہندوستان کی تمدنی تاریخ میں ایک خاص دور کا آغاز ہوتا ہے کیونکہ اس سال انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد ڈالی گئی اور اس وقت سے ہندوستانی دماغ میں اپنی سیاسی حیثیت کا احساس پیدا ہو گیا۔"[1]

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر

سیاست کے بارے میں مسلمان اس دور میں زبردست ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ایک طرف تو علمائے کرام میں بعض اہم شخصیتیں کانگریس کی حمایت میں تھیں۔ اور انہی کے ساتھ ساتھ بعض معزز، باثر مسلمان مثلاً بدرالدین طیب جی اور صوبہ بمبئی اور مدراس کے مسلمان اس کی موافقت کر رہے تھے۔ دوسری طرف بنگال میں سید امیر علی کانگریس کی مانند محمڈن نیشنل کانفرنس قائم کرنا چاہتے تھے اور پنجاب میں مسلمان ایک علیحدہ انجمن بنانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ادھر سرسید جیسی بارسوخ اور متحرک وفعال شخصیت مذکورہ تمام جماعتوں کی مخالفت کر رہی تھی۔ ایسے میں سرسید کے ایک رفیقِ خاص مولانا شبلی نعمانی سرسید کے برعکس کانگریس کے حامی ہو جاتے ہیں، بقول شبلی نعمانی :-

> "رائے میں ہمیشہ آزاد رہا۔ سرسید کے ساتھ ۱۶ برس رہا، لیکن پولیٹکل مسائل میں ہمیشہ اُن سے مخالف رہا، اور کانگریس کو پسند کرتا رہا، اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں۔"[۵]

سید صاحب کے خاندان نے سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ وہ علم وادب، مذہب وحکمت اور تصوف کی طرف مائل رہے۔ سید صاحب جب ندوۃ العلماء میں تعلیم کی خاطر آئے تو وہاں علامہ شبلی بھی کچھ عرصہ کے بعد تشریف لے آئے۔ سید صاحب کا سیاسی ذوق شبلی ہی کا رہینِ منت ہے۔ فرماتے ہیں :-

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، "انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ" گیارہواں باب صفحہ ۳۲۳ تا ۳۵۴

[۲] علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب نے لکھا ہے طیب جی نے ۱۸۸۵ء میں مدراس کانگریس میں اور مسٹر رحمت اللہ سیانی نے ۱۸۹۶ء میں کلکتہ کانگریس میں اس موضوع پر فصیح اور بلیغ تقریریں کیں (انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ۳۲۱)

[۳] عبداللہ یوسف علی صاحب نے اس کا نام "سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن" بتایا ہے جو اس وقت مسٹر امیر علی کے زیر ہدایت مسلمانوں کی نمائندہ تھی (انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ) صفحہ ۳۲۲

[۴] تفصیل کے ملاحظہ ہو "مسلمانوں کا روشن مستقبل" مولفہ سید طفیل احمد منگلوری، باب ہشتم یعنی ۱۸۸۵ء تا ۱۹۱۰ء کی سیاست صفحہ ۲۷۵ تا صفحہ ۳۱۰ - [۵] حیات شبلی صفحہ ۲۹۵

" میرا سیاسی ذوق بھی مولانا شبلی مرحوم کا فیض ہے۔ وہ اٹھارہ برس سرسید کے ساتھ رہنے کے باوجود ان کے سیاسی خیالات کے سخت مخالف تھے، پھر طرابلس کی لڑائی، مسجد کانپور کا ہنگامہ اور بلقان کی جنگ نے اس نشہ کو اور تیز کیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے جو خود بھی مولانا شبلی کی صحبتوں سے متاثر تھے، جب ۱۹۱۱ء میں اپنا اخبار " الہلال" نکالا تو میں اس کے اسٹاف میں شامل ہوگیا۔[۱]

پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:-

" سید صاحب نے شروع سے سیاست میں حصہ لیا۔ اور جنگ بلقان سے لے کر تقسیم ہندوستان تک ہر طرح کی سیاسی اور قومی تحریکوں کی نیچ اونچ میں شریک رہے کم خوش نصیب ایسے ہوں گے جنھوں نے سید صاحب کی طرح سیاست میں مسلسل حصہ لیا ہو اور سیاست کی آلائشوں سے پاک رہے ہوں۔ سیاست کے وسیلہ سے کبھی کسی منصب پر پہنچنے کے درپے نہ ہوئے۔ انھوں نے اپنے لئے جو بلند سطح پہلے دن اختیار کرلی تھی۔ اسی پر آخری دم تک قائم رہے۔ یہ سید صاحب کا پہلا بڑا کارنامہ ہے۔[۲]

اصل بات یہ ہے کہ سید صاحب کی فطرت اور ان کا مزاج اصلاً سیاسی نہیں بلکہ دینی، علمی، اور تصنیفی تھا، اور سیاسی خیالات یا سیاسی تحریکوں سے تعلق وقت کے شدید تقاضوں کا نتیجہ تھا نہ اپنی فطرت کے لحاظ سے وہ اس میدان کے آدمی نہیں تھے، وہ خود فرماتے ہیں:-

" پولیٹکس بڑی گندی چیز ہے، میں نے کبھی اس خرقۂ مے آلود کو از خود نہیں پہنا۔ کبھی محمد علی نے پہنا دیا، کبھی شوکت علی نے، اور جب کبھی کسی نے پہنا یا بھی تو میں نے فوراً اتار پھینکا۔

حافظ بخود نہ پوشید ایں خرقۂ مے آلود
اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا[۳]

---

[۱] "جن سے میں متاثر ہوا" معارف جولائی ۱۹۵۰ء ص ۹

[۲] ہم نفسان رفتہ ص ۳۹ و ص ۴۰ [۳] تذکرہ سلیمان ص ۲۳۶

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے انکے مزاج کی صحیح تشخیص فرمائی اور ٹھیک لکھا ہے کہ :۔

"سید صاحب فطرۃً مطالعہ و تصنیف اور ذہنی اور تعمیری کاموں کے لئے پیدا کئے گئے تھے اور اسی قسم کا مزاج اور طبیعت لے کر آئے تھے وہ میدانی اور ہنگامہ خیز زندگی اور سیاسی تحریکات کے لئے بالکل موزوں نہ تھے"[1]

وہ ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے ایک رکن کی حیثیت سے جب یورپ گئے تو وہاں بھی انھوں نے اپنی اس حیثیت کو بڑی وضاحت اور صراحت کے ساتھ خود ہی بیان کر دیا انھوں نے لندن سے اپنے ایک خط میں لکھا تھا :۔

میں نے مسئلہ خلافت اور مقامات مقدسہ کی مذہبی حیثیت ظاہر کرنے کی خاطر ان سے کہا کہ میں کوئی پولیٹیکل آدمی نہیں، مذہبی اور علمی آدمی ہوں۔ اور علماء کی جماعت کا قائم مقام ہوں، میرا اس وفد میں شریک ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ ہم جن مطالبات کو پیش کرتے ہیں وہ سراسر مذہبی ہیں۔[2]

پھر سید صاحب نے جس حد تک بھی سیاست میں حصہ لیا اعتدال اور توازن کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور کبھی غلو میں مبتلا نہیں ہوئے جس سے بچنا اس راہ کے راہیوں کے لئے حقیقۃً بہت ہی مشکل ہے۔

دراصل سید صاحب مسلمانوں کے اندر بلکہ انسانوں کے اندر محبت پیدا کرنے کے حامی تھے۔ ان کا کہنا ہے :۔

"محبت، اعتماد اور رواداری ہمارا دستور العمل ہے چنانچہ اس وقت تک اس میں کامیابی ہوئی ہے جس دن یہ بات نہیں رہے گی میں نہیں رہوں گا"[3]

---

[1] روزنامہ قومی آواز لکھنؤ ۲۰ نومبر ۱۹۵۳ء [2] مکتوبات سلیمانی حصہ اوّل ص ۱۳۸

[3] مکاتیب سلیمانی ص ۱۱۳ سید صاحب گویا جگر کے الفاظ میں یہ کہہ رہے ہیں :۔

ان کا جو فرض ہے اہل سیاست جانیں — میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

سید صاحب کے اس اصول اور معتدل روش کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان کے زمانے کی مختلف سیاسی ادبی، علمی اور مذہبی مسلک و مذہب کی حامل معروف ترین شخصیات سے ان کے کسی نہ کسی درجہ کے تعلقات تھے، بلکہ بعض کے ساتھ تو نہایت گہرے مراسم تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ ملکر دینی سیاسی یا قومی تحریکات اور سرگرمیوں میں برابر حصہ لیتے رہے۔ مثلاً مولانا سید انور شاہ کشمیری مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا محمد الیاس کاندھلوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی، نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مولانا حکیم سید عبدالحی، نواب عماد الملک، سید حسین بلگرامی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا عبداللہ غازی پوری، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا سلیمان اشرف، اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر اقبال، مولانا ظفر علی خاں، گاندھی جی موتی لال، جواہر لال نہرو، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالماجد بدایونی، سر فضل الحق، سید کرامت حسین اکبرآبادی، نواب سر مزمل اللہ، سر راس مسعود، قاضی سلیمان منصور پوری مولانا ثناء اللہ امرتسری، خان بہادر ظفر حسین خاں (پرنسپل شیعہ کالج لکھنؤ) حسرت موہانی جگر مرادآبادی، ڈاکٹر عظیم الدین احمد، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا عبدالباری ندوی، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی وغیرہ۔

دین کے معاملے میں بھی اُن کا مسلک اعتدال اور حق پرستی پر مبنی تھا اور مولانا اشرف علی تھانویؒ ایسے اعتدال پسند اور حق پرست بزرگ کے ساتھ تعلق ہونے کے بعد یہ وصف اور بھی ترقی کر گیا، اس کا بین ثبوت وہ بیان ہے جو جنوری ۱۹۴۳ء کے معارف میں "رجوع و اعتراف" کے نام سے شائع کیا ... کہ وہ ... دینی مسائل میں جمہور سے الگ تھے۔ اب اس سے رجوع کرتے ... انھوں نے اپنے شاگرد ... صاحب ندوی نگرامی کو جو نصیحت کی ہے اس سے سید صاحب کے مزاج ... پوری روشنی پڑتی ہے۔ مولانا نگرامی لکھتے ہیں:

"اس موقع پر حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کی ایک

نصیحت بار بار یاد پڑتی ہے۔ دارالمصنفین کے زمانۂ قیام میں ایک دن مجھ سے
ارشاد فرمایا کہ میں اپنے پچاس سالہ تصنیفی تجربہ کے بعد آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ
کسی مسئلہ میں جمہور امت سے الگ نہیں ہونا چاہیئے۔ اور سلف صالحین کا دامن
ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیئے اہل علم کے کچھ تفردات ہوتے ہیں مگر ان تفردات
میں او مفاسد سے قطع نظر ایک بڑا نقص یہ ہے کہ نظم ملت میں خلل پڑتا ہے۔
یہ تفردات امت میں حسن قبول نو پاتے نہیں البتہ تفرقہ ضرور پیدا کرتے ہیں[1]

مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی استاد و شاگرد (شبلی اور سید سلیمان) کی شخصیت
کا تقابل کرتے ہوئے ایک مقام پر لکھتے ہیں:-

" اس میں شبہ نہیں کہ مولانا شبلی کی شخصیت بڑی جامع اور ہمہ گیر تھی۔ انھوں
نے مجتہدانہ طور پر علمی کام بھی کئے اور عملی بھی۔ انھوں نے نثر کے میدان میں بھی
گوہر لٹائے اور نظم کے سبزہ زار میں حسن تخیل، لطافت بیان اور جذبات واثر
کے پھول کھلائے .... بہرحال یہ ماننا پڑے گا کہ بعض خاص اسباب کی
بنا پر جن میں سے بعض کا تعلق ضرور مولانا کی اپنی طبیعت اور افتاد مزاج سے تھا۔
مولانا شبلی کو نہ قدیم علماء کا پورا اعتماد حاصل ہوسکا، اور نہ انگریزی تعلیم یافتہ
طبقہ کا ..... رہا تعلیم جدید کا گروہ! تو چونکہ یہ گروہ سرسید کے زیر اثر تھا
اور مولانا شبلی سرسید کی سیاسی بلکہ ایک حد تک تعلیمی پالیسی کے مخالف تھے۔
اور اس مخالفت کا برملا اظہار بھی کرتے تھے۔ اس بنا پر ظاہر ہے کہ مولانا کو اس
طبقہ کا پورا اعتماد حاصل نہیں ہوسکتا تھا .... ان حالات اور اس
ماحول میں مولانا شبلی کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ ان کو مولانا سید سلیمان
ندوی کی شکل میں ایک ایسا شاگرد مل گیا، جو وسعت مطالعہ، ذوق تحقیق،

---

[1] مجلہ الفرقان لکھنؤ مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی مضمون کچھ امام ابن تیمیہؒ کے متعلق جمادی الاولیٰ
۱۳۷۱ھ حاشیہ ص ۳۵-۳۶

دقیقہ رسی اور علم و فضل میں استاد کا صحیح جانشین تھا اور ساتھ ہی اپنے اندر بہت سی ایسی خوبیاں اور کمالات رکھتا تھا جو اسی کا اپنا حصہ تھے۔ اس کا قلم بجائے گرم مزاج ہونے کے نرم رَو اور سُبک خرام تھا، جو تنقید کے نازک سے نازک موقع پر بھی جادۂ احتیاط و اعتدال سے منحرف نہیں ہوتا تھا، اس کی طبیعت میں متانت و سنجیدگی اور حلم و بردباری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، جس کی وجہ سے اسکے خامۂ گوہر فشاں کی پیشانی پر کبھی بھی جھنجھلاہٹ اور غیظ و غضب کے تیور ظاہر نہیں ہوئے تھے .... پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اسکے مزاج میں استقلال، طبیعت میں صلح پسندی، مزاج میں سکنت تھی۔ نکر پر بجائے عقلیت اور تفلسف کے اشعریت بلکہ سلفیت غالب تھی، اور ان خداداد اوصاف و کمالات کے باعث وہ جس محفل میں بیٹھا صدر بزم ہو کر رہا۔ جس انجمن میں شرکت کی شمع انجمن کہلایا۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے یہ وہ ذاتی اوصاف و کمالات تھے جن کے باعث جہاں مولانا شبلی کامیاب نہ ہو سکے، وہ کامیاب ہوئے اور جو عام اور ہمہ گیر اعتماد اُن کو حاصل ہوا، وہ اُن کے استاد کو حاصل نہ ہو سکا۔"[۱]

سید صاحب کی کامیابی کا یہ ثبوت ہے کہ جمعیۃ علمائے ہند اور جمعیۃ العلمائے اسلام، مسلم یونیورسٹی پنجاب یونیورسٹی، ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور، آل انڈیا ہسٹری کانگریس اور آل پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس اپنے اپنے اجلاسوں میں انھیں بلایا کرتی تھیں۔ دارالعلوم دیوبند[۲] اور جامعہ ملّیہ کے ساتھ ان کے روابط تھے۔
دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیمی تھے۔ مسلم یونیورسٹی کا انھیں ڈاکٹری کی ڈگری پیش کرنا، علامہ اقبال اور مولانا محمد علی جوہر اور سر راس مسعود وغیرہم، انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کا سید صاحب کے ساتھ عقیدت و مودّت رکھنا ان کی مقبولیتِ عامہ کو ظاہر کرتا ہے۔

---

[۲] حضرت سید صاحب دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ (اگزیکیٹو) کے رکن بھی تھے جو دارالعلوم کا سب سے بڑا با اختیار اور ذمہ دار ادارہ ہے۔ (الفرقان)

[۱] معارف سلیمان نمبر ص ۱۶۱

اُن کے دل میں اپنے استاد علامہ شبلی کی والہانہ محبت تھی۔ اس کا عملی اظہار انھوں نے اس طرح کیا کہ ان کی ایک ایک تحریر شائع کی۔ ان کی سیرت النبی کی آرزو پوری کی۔ اُن کے بنائے ہوئے خاکے پر ایک اکیڈمی کو بنایا۔ اور ترقی دی۔ آخر میں ان کی سوانح حیات لکھ کر حقِ شاگردی کی تکمیل کر دی۔ مولانا سید مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں :۔

"مکاتیب میں حضرت استاذ نے بارہا استاذ الاساتذ مولانا شبلی سے اپنی وفاداری وفا شعاری کا تذکرہ فرمایا ہے اور واقعی یہ سید صاحب قبلہ کا ایسا وصف ہو جس میں سید رضا مصری (ف۔ ۱۳۵۴ھ) کے سوا کوئی ان کا مثیل نہیں۔ سید رضا اور حضرت الاستاذ دونوں علم و فضل میں اپنے اساتذہ شیخ محمد عبدہ (ف۔ ۱۳۲۳ھ) اور مولانا شبلی (ف ۱۳۳۲ھ) سے کہیں بڑھے ہوئے تھے مگر دونوں نے ان شخصیتوں میں اپنے فضل و کرم کو جس طرح گم کرنے کی کوشش کی وفا شعاری کی تاریخ میں زرّیں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔"[1]

استاد کا اتنا احترام تھا کہ بقول سید صاحب :۔

"نومبر ۱۹۱۴ء میں مصنف کی وفات کے بعد جب سیرت کا مسودہ مصنف کی وصیت کے مطابق اس ہیچمدان کے ہاتھ میں آیا تو اس عقیدت کی بنا پر جو ایک شاگرد کو اپنے استاد کے ساتھ ہونی چاہیئے، استاد کے مسودہ پر انگلی رکھتے ہوئے بھی ڈر معلوم ہوتا تھا۔ اگر کبھی بضرورت گستاخی کرنی پڑتی تو خواب میں بھی ڈر جاتا تھا۔"[2]

اس عقیدت و الفت کے باوصف سید صاحب استاد کے مقلد محض ہو کر نہیں رہ گئے۔ ڈاکٹر محمد زبیر صاحب رقم طراز ہیں :۔

سید صاحب کا طریق تحقیق عموماً وہی تھا جو اُن کے استاذ مولانا شبلی کا تھا، لیکن ایک حد تک وہ آزادانہ اپنے خیال کا اظہار فرماتے تھے۔ چنانچہ بعض مسائل میں انھوں نے مولانا شبلی سے اختلاف بھی کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سید صاحب

---

[1] تقریب مکاتیب مولانا سید سلیمانؒ ص۱۳ [2] دیباچہ سیرت النبی جلد اوّل طبع چہارم۔

قید فکر کے اس جنجال سے جو گذشتہ دو تین صدیوں سے مسلمانوں میں پھیل گیا تھا، بہت باہر نکل آئے تھے۔"[۵]

سید صاحب کی شخصیت کے اس پہلو کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ وہ محض علمی و تصنیفی کاموں ہی کے لئے مخصوص ہو کر نہیں رہ گئے بلکہ خالص علمی اور تحقیقی کاموں کے ساتھ ساتھ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی، قومی، تعلیمی اور سیاسی تحریکات میں بھی شریک رہے۔

ان کی شخصیت کا ایک عجیب پہلو یہ رہا ہے کہ شروع شروع میں ان کی صلاحیتوں کا اندازہ لگانا آسان نہیں[۶] تھا انھوں نے طلب علم کے زمانے میں اساتذہ کو یہ تاثر دیا کہ وہ زندگی میں کوئی بڑا کام سرانجام نہیں دے سکتے[۷]، بلکہ بعض کو تو شبلی کے انتقال کے

بقیہ حاشیہ ص۳۴

[۴] شیخ محمد اکرام صاحب نے موج کوثر میں سید صاحب کے اس وصف کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔ "بالخصوص ایک وصف ایسا ہے جو ان کے استادوں میں نہ تھا۔ یہ وصف وفاداری ہے۔" ص۲۰۳

[۵] معارف سلیمان نمبر ص۳۱۲

[۶] علامہ شبلیؒ پہلے شخص تھے جنھیں سید صاحب کی ذات میں ایک ایسی شخصیت کی جھلک نظر آرہی تھی جو مستقبل کی ایک درخشندہ ہستی بن کر نمودار ہونے والی تھی۔ شبلی کے بعد معدودے چند لوگ ایسے تھے جنھیں ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکا۔ انہی میں مولانا عبدالماجد دریابادی ہیں جنھوں نے ان کے ایام طلب علم میں ہی یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ کسی دن بڑی شخصیت کے روپ میں ظاہر ہوں گے، مقالات ماجد جلد اوّل مضمون بہار کی بہار ص۱۹۴، ۱۹۵۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو سید صاحب کی اصل اور بہترین صلاحیتوں کا اندازہ اس وقت ہو گیا تھا جب سید صاحب مئی ۱۹۱۳ء میں الہلال کے اسٹاف میں شامل ہوئے اور کچھ ماہ تک مولانا آزاد کے ساتھ رہے۔

سید صاحب کا یہ وہ دور ہے کہ ابھی ان کی تمام صلاحیتیں بروئے کار نہیں آئی تھیں اس لئے مولانا ابوالکلام کی فراست اور بصیرت کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے تھوڑے ہی (باقی حاشیہ ص۳۶)

وقت تک اس بات میں شبہ تھا کہ سید صاحب ان کے کام کو احسن طریقے سے پورا کر سکیں گے۔

شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں:۔

" اس زمانے میں ان کی استعداد رہنمائی پر شبہ ظاہر کرنے والے کئی تھے کہ وہ اپنے استاد کی بہت سی خوبیوں سے محروم ہیں۔ لیکن جس کامیابی سے انھوں نے دار المصنفین کو چلایا ہے اس کی توقع اُن کے ریاب طبع استاد سے نہ ہو سکتی تھی۔ ان کی رہنمائی میں اعظم گڑھ قوم کا سب سے بڑا تصنیفی مرکز اور معارف سب سے با اثر علمی رسالہ ہو گیا ہے۔ سیرت النبی کا معیار اس قدر بلند نہیں جس کا دعویٰ شبلی نے مقدمہ میں کیا تھا لیکن بہرکیف کام جاری ہے۔ بلکہ اصل کام تو مدت ہوئی ختم ہو گیا۔ شبلی کی تمام تصنیفات بلکہ ان کے منتشر مضامین کو صفائی اور خوبی کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اور اگرچہ شبلی کی وفات کو آج تیس سال ہوئے لیکن ان کی آواز برابر قائم ہے۔ حالانکہ علی گڑھ میں علمی اور تصنیفی لحاظ سے ایک سناٹا چھایا پڑا ہے"[1]

(باقی)

---

[1] موج کوثر ص ۲۷۴ و ۲۷۵۔ مولانا سید احمد انصاری صاحب (دفتر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام پنجاب یونیورسٹی لاہور) نے ایک گفتگو میں راقم الحروف سے فرمایا کہ "سید صاحب نہ ہوتے تو دار المصنفین کو شبلی کا کوئی اور شاگرد اس طرح نہ چلا سکتا۔" نومبر ۱۹۶۱ء۔ یہاں یہ بات مد نظر رہے کہ شیخ محمد اکرام اور مولانا سعید انصاری سید صاحب کے معترفین میں سے نہیں بلکہ معترضین میں سے ہیں انکی زبانی سید صاحب کی یہ تعریف!

بقیہ حاشیہ ص ۳۵

حرصے میں گوہر نایاب کا سراغ لگا لیا چنانچہ سید صاحب جب "الہلال" کے ادارہ کو ترک کر کے چلے جاتے ہیں تو ابو الکلام انھیں بار بار اپنے پاس بلاتے ہیں۔ لکھتے ہیں "آپ نے پونا میں پروفیسری قبول کر لی حالانکہ خدا نے آپ کو درس و تعلیم مدارس سے زیادہ عظیم الشان کاموں کے لئے بنایا ہے۔ خدا کے لئے میری سنیئے اور مجھے اپنا ایک مخلص بھائی تصور کیجئے...... کیا حاصل اس سے کہ آپ نے چند طالب علموں کو فارسی و عربی سکھلا دی۔ آپ میں وہ قابلیت موجود ہے کہ آپ لاکھوں نفوس کو زندگی سکھا سکتے ہیں۔ مکتوبات سلیمانی ص ۱

خدمتِ دین کی مشکلات

ایک تقریر

ضیاء الدین خاں صاحب (اعظم گڑھ)

برادران اسلام! ———

پندرہ سال پہلے کا ایک واقعہ مجھے یاد آرہا ہے۔ بستی کے باہر ایک باغ میں مسلمانوں کا اجتماع ہو رہا تھا۔ ظہر کا وقت تھا۔ اذان ہو چکی تھی، ایک بڑے درخت کے نیچے فرش بچھا ہوا تھا جہاں کچھ لوگ سنتیں پڑھ رہے تھے اور کچھ نماز کے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک حادثہ پیش آیا۔ اجتماع کے بالکل قریب ایک بڑا سا گڑھا تھا جس کے عین کنارے سے راستہ گزرتا تھا۔ اس راستہ پر ایک بیل گاڑی جا رہی تھی۔ جیسے ہی وہ گڑھے کے کنارے پہنچی اس کا ایک طرف کا پہیہ پھسل گیا اور پوری گاڑی کروٹ ہو کر گڑھے میں اس طرح گر گئی کہ ایک پہیہ اوپر کھڑا تھا اور دوسرا نیچے دبا ہوا تھا۔ جیسے ہی ہم میں سے کچھ لوگوں کی نظر اس پر پڑی، وہ فوراً اس کی مدد کے لئے دوڑ پڑے۔ گاڑی سامان سے لدی ہوئی تھی۔ بیل بھی اسی کے ساتھ جوئے میں کھنچے ہوئے تھے۔ بظاہر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ چند لوگ کیسے اس مسئلہ کو حل کر سکیں گے۔ مگر یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا، بلکہ فی الفور اقدام کرنے کا وقت تھا۔ آنے والے فوراً اپنے کام میں لگ گئے۔ کچھ نے نیچے سے زور لگایا اور کچھ نے اوپر سے پکڑ کر گاڑی کو اٹھانا شروع کیا۔ میں ان خوش نصیبوں میں تھا جو گاڑی کو نیچے سے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس کے بعد ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ یکایک ہم نے دیکھا کہ گاڑی اٹھا کر اوپر رکھ دی گئی ہے۔ واقعی ایسا ہی ہوا۔ جو چند آدمی اس کام میں لگے تھے۔ ان سب کا متفقہ احساس تھا کہ گاڑی ہم نے نہیں اٹھائی ہے، بلکہ وہ تو کسی اور نے اٹھا کر کھڑی کر دی ہے۔ پیچھے سے دھکا دینے والوں کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اوپر سے کوئی اس کو کھینچے چلا جا رہا ہے۔ اور جو لوگ آگے تھے ان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا گاڑی نیچے سے اٹھتی چلی آ رہی ہے۔

یہ واقعہ جو پچھلے پندرہ سال سے میری یاد داشت کا بہترین سرمایہ رہا ہے، اس کو محض قصہ خوانی کے طور پر آپ کے سامنے پیش نہیں کیا ہے، خدا مجھ کو اس سے بچائے کہ میں قصہ خوانی کو اپنا طریقہ بناؤں اور قصے سنانے میں آپ کا وقت ضائع کروں۔ میں نے اس کو صرف اس لئے بیان کیا ہے کہ آپ اس پر غور کریں۔ کیونکہ اس کے اندر ہمارے لئے بڑی عبرت کا سامان ہے، یہ واقعہ ہمارے لئے اس بات کا پیغام ہے کہ خدا انسانوں کی مدد کرتا ہے، ہمارے لئے خدا کی مدد کا ایک ذاتی تجربہ ہے۔ تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات ہم پڑھتے ہیں مگر یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو ہماری اپنی زندگی میں پیش آیا ہے جس کا ہم نے براہ راست تجربہ کیا ہے۔ لدی ہوئی اور پھنسی ہوئی گاڑی کا محض چند آدمیوں کے ہاتھ لگانے سے دم بھر میں اٹھ کر کھڑی ہو جانا، یقیناً خدا کی مدد کی وجہ سے تھا۔ اگر ہم کو وہ آنکھیں حاصل ہوتیں جن سے غیر مادی حقیقتوں کو دیکھا جا سکے تو ہم دیکھتے کہ عین اس وقت جب کہ چند کمزور آدمی محض خدا کے بھروسہ پر، بالکل حسبتہً للہ ایک نیک کام کے لئے دوڑ پڑے تو اسی وقت آسمان سے فرشتوں کی بھی ایک فوج اتر آئی۔ اور اس نے آن کی آن میں وہ کام کر دیا جو ہمارے کمزور ہاتھوں سے نہیں ہو سکتا تھا۔

دوستو! اسی طرح سے ایک اور گاڑی پھنسی ہوئی ہے۔ یہ دین کی گاڑی ہے۔ اسلام کی گاڑی چلتے چلتے حالات میں پھنس گئی ہے۔ پاسبانوں کی غفلت سے باطل اس پر حملہ آور ہو گیا ہے۔ زمین کی خرابی سے اسکے پہیے اپنی جگہ سے ہٹ گئے ہیں۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ آپ اس کے لئے دوڑ پڑیں۔ آپ اس کو اٹھانے کے لئے اپنے وجود کو لگا دیں۔ آپ کی زندگی کا بہترین مصرف، آپ کے اوقات کا اعلیٰ ترین استعمال اس وقت اگر

ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ آپ خدا کے دین کی گاڑی کو اٹھانے میں لگے ہوئے ہوں۔ اس زمین
پر انسان کے لئے اس سے بڑی اور کوئی سعادت نہیں۔ خدا کے دین کا مظلوم ہونا ہمارے لئے
سعادت و کامرانی کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے۔ یہ اگرچہ دین اور اہل دین کے لیے انتہائی سخت
حالت ہے، مگر انھیں سخت حالات میں ہمارے لئے اُس سب سے بڑی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے
جس کی اس دنیا میں کوئی شخص تمنا کر سکتا ہے۔

انسان کے لئے اس سے بڑی اور کوئی سعادت نہیں کہ وہ خدا کے کام میں لگا ہوا ہو۔
ہمارا عاجز اور کمزور وجود خدا کی خدمت میں مصروف ہو۔ کیا اس سے بڑی بھی کوئی بات ہو سکتی
ہے جس کی ہم آرزو کریں۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی اس سے بڑی بات یہ ہے کہ خدا کی مدد
کے لئے اٹھنا خود ہم کو خدا کی مدد کا مستحق بناتا ہے۔ جب بندہ خدا کے کام میں مصروف ہوتا ہے
تو وہ تنہا نہیں ہوتا، بلکہ خود خدا بھی اسکے ساتھ ہو جاتا ہے۔ خدمت دین وہ بہترین وقت ہے
جب بندے کو خدا کی معیت حاصل ہوتی ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ لمحات کس قدر قیمتی
ہیں جب بندہ خدا کے ساتھ چل رہا ہو، جب وہ خدا کے سایہ میں سفر کر رہا ہو، جب خدا کے
فرشتے اسکے ہم رکاب ہوں، جب وہ براہ راست خدا کی نگرانی میں آگیا ہو۔۔۔ آپ جانتے
ہیں کہ ایک معمولی آدمی کو اگر کلکٹر کی ہمدردیاں اور اسکی معیت حاصل ہو جائے تو وہ پھولا
نہیں سماتا۔ پھر خدا کی معیت اور اسکی مدد، اللہ اکبر! اسکی عظمت کا کیا ٹھکانا۔

دین آج جس چیز کا تقاضا کر رہا ہے، اسے آپ ہی کو پورا کرنا ہے۔ یہ کام آپ کو انجام دینا
ہے۔ خدا کی طرف سے آپ کو ایمان کی توفیق ملنا اور آخری رسُول کی امت میں شامل کیا جانا
گویا خدا کی طرف سے آپ کو اس کام پر مقرر کیا جانا ہے۔ آپ کا ایمان، اس کام پر آپ کے
تقرر کا نشان ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب کسی شخص کو کسی کام پر مقرر کیا جاتا ہے تو اس کے لئے
اس ڈیوٹی کے مطابق تمام انتظامات بھی کر دیئے جاتے ہیں۔ ایک شخص کو حکومت کی طرف
سے خط ملے کہ تم کو فلاں جنگلی علاقے میں فارسٹ افسر بنایا گیا ہے، تم وہاں جا کر اپنی ڈیوٹی
سنبھالو۔ تو اس کے ذہن میں فوراً چند سوالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس وقت وہ سرکاری
ملازمتوں کے متعلق حکومت کے شائع شدہ قواعد و ضوابط رجوع کرے تو وہ دیکھے گا کہ

وہاں اسکے سارے سوالات کا پیشگی جواب لکھ دیا گیا ہے۔" گھر سے ڈیوٹی کے مقام تک جانے کی صورت کیا ہوگی؟" جواب یہ کہ تم کو پوری مسافت کے لئے معقول سفرخرچ دیا جاتا ہے۔" پر وہاں جاکر کس جگہ رہوں گا؟" اس کا جواب یہ ہوگا کہ وہاں تمھارے رہنے کے لئے سرکاری بنگا موجود ہے۔" جنگل میں اپنی حفاظت کے لئے میں کیا کروں گا؟" حفاظتی دستہ تمھارے ساتھ موجود رہے گا۔" گھر کے اخراجات کے لئے کیا ہوگا؟" تم کو ماہانہ تنخواہ کے طور پر ایک معقول رقم دی جائے گی؟" اسی طرح ملازم کے ہر سوال کا ایک اطمینان بخش جواب حکومت کے پاس موجود ہوگا۔ ہر تقرر لازماً یہ چاہتا ہے کہ جس کو مقرر کیا جائے، اسکی ضروریات اور مشکلات کا بھی اس میں پورا لحاظ کیا گیا ہو۔

اسی طرح خدا نے جب آپ کو ایک کام پر مقرر کیا ہے تو اسی کے ساتھ اس نے یقینی طور پر آپ کی ہر ضرورت کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ خدا تمام مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے اس کے ہاتھ میں زمین و آسمان کا اقتدار ہے۔ ذرائع و وسائل کا سارا خزانہ اس کی مٹھی میں ہے۔ ناممکن تھا کہ وہ اپنے عاجز اور حقیر بندوں کو ایک کام پر مقرر کرے اور پھر ان کی ضروریات کا لحاظ نہ کرے۔ یہ اس کی صفت رحمیت کے خلاف ہے۔ یہ اس کی شان قدرت کے منافی ہے۔ بلاشبہ اس نے خادمان دین کی تمام ضروریات کا اس دنیا میں مکمل انتظام کر دیا ہے۔ ایسا انتظام کہ آخرت میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ دین کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ مگر دشواریوں اور مشکلوں کی وجہ سے وہ ایسا نہ کرسکا۔

یہ انتظام کیا ہے اور ہم کس طرح اسے جانیں، اس کی میں نہایت آسان صورت آپ کو بتاؤں۔ آپ خدمت دین کے کام کا ارادہ کیجئے اور اس کے بعد سوچئے کہ اس میں آپ کی کیا کیا ضرورتیں ہوسکتی ہیں۔ جتنی معقول ضرورتیں اور واقعی مسائل آپ کی سمجھ میں آئیں، ان سب کی ایک فہرست بنا ڈالئے اور اس کے بعد خدا کی کتاب کھول کر اس کو ابتدا سے پڑھنا شروع کیجئے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک ملازم سرکار اپنی ملازمت کے مسائل کے متعلق جاننے کے لئے حکومت کے قواعد و ضوابط کا مطالعہ کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب آپ ایسا کریں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ خدا کی کتاب آپکے ہر معقول مطالبے کا

ر یقینی جواب دیتی چلی جا رہی ہے۔ کسی بھی ایسی حقیقی ضرورت کا آپ تصور نہیں کر سکتے جس کا
را کی کتاب ذمہ نہ لے رہی ہو۔ اس معاملے میں ہرگز آپ کتاب الٰہی کو خاموش نہ پائیں گے۔
ں کے بعد مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ خدا کی کتاب میں ہماری کسی ضرورت کے بارے میں
یاب یقین دہانی کا مل جانا اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ ہم اس پر بھروسہ کریں۔ ایمان کا مطلب
ہما پر توکل ہے اور ایمان کے لفظی معنی بھروسہ اور اعتبار ہی کے آتے ہیں۔ (یوسف ــــ ۱۱)
ملا پر اور قرآن پر ایمان لانے کا اصل مطلب یہی ہے۔ اس لئے اگر ہم خدا کی کتاب میں ایک
قینی دہانی پالینے کے باوجود اس پر اعتماد نہ کریں تو یہ خود ہمارے ایمان کے خلاف ہوگا۔ ایسی
ورت میں ہم کو خود اپنے ایمان پر نظر ثانی کرنی چاہئیے نہ کہ ہم قرآن کے الفاظ پر شبہ کریں۔

ا۔ آئیے ہم اس حیثیت سے قرآن کا ایک مختصر مطالعہ کریں۔ موجودہ زمانے میں دین کی
رمت کرنے کا ارادہ ہم سے کن ضرورتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک داعی کے
لمنے سب سے پہلا سوال جو آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ بڑا مشکل کام ہے اور میں نہایت کمزور ہوں۔
ص طور پر اس کے لئے زبان و قلم کی زبردست طاقت درکار ہے اور مجھے اس پر قدرت نہیں۔
ں کا آغاز زبان و قلم ہی سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس اعتبار سے اپنی بے مائیگی کا احساس اور
لات کی نا مساعدت کی وجہ سے پست ہمتی ـــــ یہ دو چیزیں سب سے پہلے موجودہ زمانے
، دعوتی کام کی بات سوچنے والے پر طاری ہوتی ہیں۔

یہ مسئلہ ذہن میں رکھ کر جب ہم قرآن کے صفحات پر نظر ڈالتے ہیں تو بنی اسرائیل کی تاریخ
ایک واقعہ ہمارے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کے ایک مرد صالح کو اللہ تعالیٰ
طور پر بلا کر اس کو پیغمبری عطا کرتا ہے اور اس کو یہ خدمت سونپتا ہے کہ وہ فرعون اور
مر کی قبطی قوم کے پاس جا کر اس کو خدا کا پیغام پہنچائے۔ حضرت موسیٰ محکوم فرقہ سے تعلق رکھتے
، اور ان کو ملک کی حکمراں قوم کو خطاب کرنے کا کام سونپا جا رہا تھا۔ اس تقرر کو سن کر وہ
، اختیار کہہ اٹھے کہ خدایا میں اپنے اندر اس کی ہمت نہیں پا رہا ہوں اور میری زبان میرا ساتھ
یتی ہوئی نظر نہیں آتی۔

رب انی اخاف ان یکذبون   خدایا مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے۔

ویضیق صدری ولا ینطلق لسانی میرا سینہ تنگ ہو رہا ہوا اور میری زبان نہیں چلتی

شعراء ۱۲-۱۳

خدا کی طرف سے جواب ملتا ہے کہ تم درست۔ تمہاری ضرورت کی سب چیزیں تم کو ہماری طرف سے دیدی گئیں۔

قد اوتیت سؤلک یاموسیٰ (طہ - ۳۶)

یہ مانگنے اور دیئے جانے کا واقعہ جو قرآن میں نقل کیا گیا ہے، وہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے ایک واقعہ کی شکل میں ہماری اسی قسم کی مانگ کا جواب ہے۔ امت محمدیہ کے افراد جو ختم نبوت کے بعد نبوت کے کام پر مامور کئے گئے ہیں اور جن کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل (میری امت کے اہل علم اپنی ذمہ داری کے لحاظ سے بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں) ان کے لئے بنی اسرائیل کے پیغمبر کا یہ واقعہ ایک پیشگی بشارت ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ اگر تم ہمارے دین کی دعوت دینے کے لئے اٹھو تو ہم تم کو زبان دیں گے جس سے تم بولوگے اور ہم تمہاری ڈھارس بندھائیں گے جس کے بعد تم بڑے بڑے مواقع پر کسی ہچکچاہٹ کے بغیر ہماری آواز پہنچا سکوگے۔ مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اگر آج کسی بندۂ خدا کے اندر حقیقۃً داعی بننے کا جذبہ ابھر آئے اور وہ بیتابانہ اپنے رب کو پکار اٹھے کہ میں یہ کام کرنا چاہتا ہوں مگر:

اللھم یضیق صدری ولا ینطلق لسانی خدایا میرا سینہ تنگ ہو رہا ہوا اور میری زبان چلتی نہیں۔

تو یقیناً کلام الٰہی اس کو دوبارہ آواز دے کر کہے گا کہ جاؤ ہم نے تم کو وہ چیز دیدی جس کی تمہیں ضرورت تھی۔ وہی خدا آج بھی اس دنیا کا خدا ہے جس نے کوہ طور پر حضرت موسیٰ کو خطاب کیا تھا۔ وہ آج بھی وہی کچھ کرسکتا ہے جو اس نے ہزاروں برس پہلے اپنے ایک بندے کے ساتھ کیا تھا۔ وہ چاہے تو گونگے کو ناطق بنادے اور بولتے ہوئے شخص کو گونگا کردے، کمزوروں کو ہمت دیدے اور ہمت والے کو پست کرکے بٹھادے۔ وہ سب کچھ کرسکتا ہے پھر ہم کیوں نہ اس کے اوپر بھروسہ کریں۔

۲۔ دوسری ضرورت جس کا اس سلسلے میں سوال پیدا ہوتا ہے، وہ معاش کا مسئلہ ہے

ن جب دین کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اٹھتا ہے تو ظاہر ہے کہ اسکی اپنی ضروریات
م نہیں ہو جاتیں۔ اس کے جسمانی تقاضے، اس کا گھر، اس کا خاندان، اس سے بہت سی
یں مانگتے ہیں۔ اگر وہ دین کے کام کی طرف جھکے تو ذاتی کاموں میں کمی ہوتی ہے اور
ن ضروریات میں اپنی توجہ صرف کرے تو دین کا خانہ خالی رہ جاتا ہے۔ یہ دوسرا سوال ہے
ہر داعی کے سامنے لازماً پیش آتا ہے۔

یہ سوال لے کر ہم قرآن پڑھنا شروع کرتے ہیں تو بہت سے مقامات ہم کو ملتے ہیں جہاں
معاملے میں ہم کو خدا کی مدد کا یقین دلایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ہم قرآن کی سترھویں
رہ میں پہنچ جاتے ہیں اور وہاں یہ الفاظ لکھے ہوئے پاتے ہیں:۔

ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا — جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا تو اللہ
ویرزقہ من حیث لا یحتسب — اس کے لئے کشادگی پیدا کر دے گا اور
اس کو ایسی ایسی جگہوں سے رزق پہنچائے
طلاق — ۲ — گا جہاں اس کا گمان بھی نہیں جا سکتا۔

یک بہت بڑی یقین دہانی ہے یہ ایک عظیم انشورنس ہے جو خدا کی طرف سے اہل ایمان کو
ئی ہے۔ آج کا انسان سمجھتا ہے کہ صرف اس کا کھیت، اس کی دکان اور اس کی ملازمت
حد ذریعے ہیں جو کسی کو رزق دیتے ہیں۔ اس کو خدا کے عظیم سرچشمے کی سرے سے خبر ہی نہیں
س کو معلوم ہی نہیں کہ یہاں ایک اور خزانہ ہے جو تمام معلوم خزانوں سے زیادہ بھرا ہوا ہے یہاں
سب اور دینے والا ہے جو تمام دینے والوں کو زیادہ دے سکتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ خدا کے خزانے کو چھوڑ کر انسانی
زانوں کے سامنے دامن پھیلائے کھڑے ہیں۔ وہ چھوٹے ذریعہ کو پا کر خوش ہیں حالانکہ وہ اس سے بڑا ذریعہ
ی حاصل کر سکتے تھے۔ موجودہ انسان کی مثال اس بے صبرے نوجوان کی سی ہے جس کو گھر
باپ کی وراثت میں معقول زمین ملی ہو۔ مگر دیہات کے خشک ماحول سے گھبرا کر وہ بمبئی بھاگ
ئے اور وہاں واشنگ فیکٹری میں کلرکی حاصل کر کے سمجھے کہ میں نے اپنے رزق کا ذریعہ
اصل کر لیا۔ حالاں کہ بمبئی کی اس ملازمانہ زندگی میں وہ جو کچھ حاصل کر رہا ہے، اس سے
بت زیادہ خود اپنے گھر پر اپنے کھیتوں اور باغوں میں کام کر کے آزادانہ طور پر حاصل کر سکتا تھا۔

۳۔ اب تیسری ضرورت کا تصور کیجئے جو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب داعی مشکلات میں پھنس گیا ہو۔ جب حالات سے اس کا ٹکراؤ شروع ہو گیا ہو، جب باطل طاقتیں اس کو کچلنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی ہوں۔ یہ مدد کے احتیاج کا نازک ترین وقت ہوتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب داعی کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اس صورت حال کا احساس لے کر جب ہم قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بار بار نازک اوقات میں اہل ایمان کی مدد کی ہے۔ بلکہ ایسے وقت میں مدد کے لئے پہنچنا، اس نے اپنے اوپر اہل ایمان کا حق قرار دیا ہے۔

وکان حقا علینا نصر المؤمنین　　اہل ایمان کی مدد کرنا ہمارے اوپر اہل ایمان کا حق ہے۔
(روم - ۴۷)

بندے کے لئے احتیاج کا انتہائی وقت، آقا کے لئے بھی اس کی طرف متوجہ ہونے کا انتہائی وقت ہوتا ہے، حتیٰ کہ نازک اوقات میں وہ بیان کیا گیا ہے کہ اپنی مخصوص فوج کو اہل ایمان کی کمک کے لئے روانہ کر دیتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:۔

اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم　　جب تم اپنے رب سے مدد مانگ رہے
انی ممدکم بالف من الملائکة　　تھے تو اللہ نے جواب دیا کہ میں ہزار
مردفین۔ (انفال - ۹)　　فرشتے بھیج کر تمہاری مدد کروں گا۔

یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا کے خادم پر خدا کے دشمن حملہ آور ہوں، انھوں نے اس کا نرغہ کر لیا ہو۔ اور خدا بس دور سے اس کا تماشا دیکھتا رہے، یہ بالکل ناقابل تصور ہے۔ ایسے موقع پر تو خدا کی غیرت وحمیت دوسرے مواقع کے مقابلے میں اور زیادہ شدت کے ساتھ بھڑک اٹھتی ہے۔ مگر مدد کا یہ معاملہ صرف ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو حقیقی خادم اور سچے وفادار ہوں۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں جب تیز پور میں چینی حملے کا خطرہ بہت بڑھ گیا تھا، حکومت ہند کا ایک اعلیٰ افسر وہاں سے ڈر کر قبل از وقت بھاگ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے اس کو ملازمت سے برخاست کر دیا۔ اس کے برعکس اگر وہ جرأت اور وفاداری کے ساتھ اپنے مقام پر ڈٹا رہتا، تو ہو سکتا تھا کہ خطرہ پیش آنے کی صورت میں حکومت کا خاص ہوائی جہاز

بھیجا جاتا کہ وہاں جا کر افراد اس کے خاندان کو شہر سے نکال لائے۔

یہ چند مثالیں یہ سمجھنے کے لئے کافی ہیں کہ کس طرح خدا نے اپنے دین کے خادموں کی تمام ضروریات و مسائل کا ذمہ لیا ہے۔ مگر یاد رکھئے قرآن میں ہماری ضرورتوں کے بارے میں یہ جو یقین دہانیاں کی گئی ہیں اس کا مطلب لازمی طور پر یہ نہیں ہے کہ خدا کے فرشتے صبح و شام آسمان سے خوان لے کر اتریں گے اور ہمارے سامنے بچھا دیا کریں گے۔ اگرچہ ایسا بھی ہو سکتا ہے مگر عام حالات میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ نہیں ہے۔ ہماری احتیاجات کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ کی مدد کا مطلب دراصل یہ ہے کہ وہ حالات کو اس طرح ہمارے موافق بنائے گا کہ ہم بآسانی اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ وہ ایسے امکانات پیدا کرے گا جن کو استعمال کر کے ہم اپنی کاربراری کر سکتے ہوں۔ وہ لوگوں کے دلوں میں ہمارے متعلق ایسے خیالات ڈالے گا کہ وہ ہمارے کام آسکیں، وہ ہمارے ذہن کو ایسی تدبیروں کی طرف لے جائے گا جس کے بعد مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ وہ ایمان کی برکت سے ذہنی و نفسیاتی صلاحیتوں کو ایسی جلا دے گا کہ کم صلاحیت والے بہتر صلاحیت والوں سے زیادہ کام کر سکیں گے، مقابلے کے وقت وہ ہمارے دل کو مضبوط کرے گا اور دشمن کو مرعوب کر کے شکست کو آسان بنا دے گا۔ مختصر یہ کہ ہمارے کام بھی انھیں ظاہری حالات کے اندر ہوں گے جیسے سب کے ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایمان کی برکت اور اللہ تعالیٰ کی توجہ کی بنا پر حالات میں کچھ ایسا غیر معمولی پن آجائے گا کہ کم تر وسائل سے ہم زیادہ کام لے سکیں گے۔ اور معمولی ساز و سامان کے باوجود زیادہ نتائج حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

دوستو! یہ باتیں جو میں نے آپ کے سامنے عرض کی ہیں، یہ کوئی جذباتی نعرہ نہیں ہے اور نہ شاعری ہے۔ یہ ایک مسلّم حقیقت کا اظہار ہے۔ اگر اس دنیا میں کوئی چیز ممکن ہے تو سب سے بڑا ممکن یہ ہے کہ بندہ جب خدائی مدد کا محتاج ہو تو خدا اس کی مدد کرے۔ اس زمین و آسمان میں ہر دوسرے امکان کے بارے میں مجھے شبہ ہو سکتا ہے، مگر یہ امکان میرے لئے ہر شبہ اور تردد سے بالاتر ہے کہ خدا اپنے ان بندوں کی مدد کرتا ہے جو اس کے دین کی مدد کے لئے اٹھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ بندے کے اندر کوئی ذاتی طاقت ہے۔ بعض مذاہب کی طرح

میں اس نظریئے پر کوئی عقیدہ نہیں رکھتا کہ انسان اپنی ریاضت سے خدا کو یا فطرت کی برتر طاقتوں کو مسخر کر لیتا ہے۔ میرے نزدیک یہ بالکل لغو بات ہے۔ خدا کی مدد کو میں سب سے زیادہ قطعی اس لئے قرار دے رہا ہوں کہ یہ خدا کی اپنی صفت ہے۔ خدا کا رحیم اور قادر ہونا، اس کا خالق اور مالک ہونا لازمی طور پر تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے عاجز اور محتاج بندوں کی مدد کرے۔ یاد رکھئے یہ خدا کی شانِ خدائی کے بالکل خلاف ہے کہ وہ بندوں کو عاجز و مجبور کی حیثیت سے پیدا کرے۔ اور جب بندوں کا عجز کسی ضرورت کا محتاج ہو تو وہ ان کی مدد نہ فرمائے۔ یہ خدا کی شان کے خلاف ہے، اس لئے یہ قطعاً ناممکن ہے۔

دوستو! اگر آپ کے پاس سننے کے لئے کان ہوں تو خدا کی کتاب پکار رہی ہے ـــــ مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ (کون ہے جو خدا کے کام میں اس کا مددگار بنے) اور اسی کے ساتھ اس میں یہ ضمانت بھی موجود ہے کہ ـــــ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ (اگر تم خدا کی مدد کے لئے اٹھوگے تو خدا تمھاری مدد کرے گا) خدا آپ کو ایک ایسے کام کے لئے پکار رہا ہے جس میں وہ خود آپ کا مددگار ہے۔ دین کی خدمت خدا کی معیت کا راستہ ہے اس کی مدد سے ہم کنار ہونے کا راستہ ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جو آپ کو جنّت کی طرف لے جاتا ہے، اگر ایک ایسے کام کے لئے بھی آپ نہیں اٹھیں گے تو اور کس کام کے لئے اٹھیں گے۔ اور اس خدمت کے بغیر مر گئے تو خدا کا سامنا کس طرح کریں گے۔

اُٹھئے کہ اس سے بڑا کوئی کام نہیں، اُٹھئے کہ اس سے بڑی کوئی سعادت نہیں ہو سکتی۔

انتخاب

ختمِ نبوّت کی ضرورت و مصلحت

(مولانا محمد اسحٰق سندیلوی ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

نبوّت کی برکت کا اقرار کرنے کے بعد ختمِ نبوت کی برکتوں سے ناواقفیت درحقیقت خود نبوت کی برکتوں سے جہالت کے مرادف ہے۔ نبوت و رسالت منبع برکات و انوار، مگر ختمِ نبوت اس کا تمام و کمال ہے، اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو اس کے معنی یہ تھے کہ برکاتِ نبوت کبھی کمال کو نہ پہونچتے اور نوعِ انسانی کبھی اس کے اعلیٰ مدارج کو نہ پاسکتی۔

اگر عالم دائمی اور ابدی نہیں ہے، اور یقیناً نہیں ہے، اگر اس خاکدان کا خاک میں ملنا لابدی ہے اور قطعاً لابدی ہے، اگر قیامت کا آنا برحق ہے، اور بےشک برحق ہے تو، نبوت کا ختم ہونا بھی یقینی، لابدی اور ناگزیر ہے، کوئی احمق ہی یہ بات کہہ سکتا ہے کہ جب حضرت اسرافیل علیہ السلام کو صور پھونکنے کا حکم دیا جائے گا اس وقت بھی کوئی نبی مبعوث ہوگا، اس وقت سے پہلے جس نبی کو فرض کروگے کیا اُسے خاتم النبیین نہ کہوگے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ ختمِ نبوت ایک ناگزیر شئے ہے جس کا ہونا اسی طرح لازم اور ضروری ہے جس طرح آج کے بعد کل کا، منکرین ختمِ نبوّت کو بھی بالآخر ختمِ نبوّت کا قائل ہونا پڑے گا، مگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ ختمِ نبوت یعنی نبوت کے اعلیٰ ترین درجہ کے برکات و انوار سے فائدہ اٹھانے والا کوئی نہ ہو یا ہوں تو بہت قلیل اشخاص، بخلاف اس کے ہم چاہتے ہیں کہ اس نعمتِ عظمیٰ اور حق تعالیٰ کی رحمتِ کاملہ سے فائدہ اُٹھانے والے نوعِ انسانی کے کثیر سے کثیر افراد ہوں، یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین تسلیم کیا جائے، ارحم الراحمین کی رحمت کا تقاضہ یہی ہے کہ نوعِ انسانی کے کثیر افراد کو ایک طویل مدت تک نبوّت و رسالت کے اعلیٰ ترین برکات سے فیضیاب ہونے کا موقع

دیا جائے۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم نہیں ہوجاتی تو اس کا موقع دنیا کو کس طرح اور کب ملتا؟ اور نوع انسانی کا یہ انتہائی عروج روحانی عملی صورت میں کیسے جلوہ گر ہوتا؟

نوع انسانی کے ارتقاء روحانی کی آخری منزل "نبوت" ہے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو جو شرف عطا فرمایا گیا تھا وہ ان کی ذات کے لیے محدود نہ تھا بلکہ ان کے واسطے سے اور طفیلی کی حیثیت سے پوری نوع انسانی بحیثیت مجموعی اس شرف سے مشرف ہوئی، اس شرف و عظمت کو سمجھنے کے لیے اس مثال پر غور کیجئے کہ کسی قوم میں چند ناموروں کا پیدا ہوجانا پوری قوم کے وقار میں اضافہ کردیتا ہے اور اسے نامور قوم بنا دیتا ہے. کیا جرمنی کا ہر شخص آئنسٹائن ہوتا ہے؟ لیکن اس قسم کے چند جرمن نژاد اعلیٰ پایہ کے سائنس دانوں نے جرمنی کی سائنسدانی کا شہرہ آفاق میں پھیلا دیا ہے اور پوری جرمن قوم کو نامور اور ممتاز بنا دیا ہے۔

اسی طرح انبیاء و مرسلین کی ذوات قدسیہ ہیں جنھوں نے اپنے وجود سے پوری نسل انسانی کے سر پر تاج کرامت رکھا، وہ انسانیت کا جوہر اور نوع انسانی کا شرف ہیں. اس فیض رسانی اور تقسیم شرف و کرامت میں سب انبیاء شریک و سہیم ہیں. ہر نبی انسانیت کا تاج ہے اور اسکی حیات حقیقی کا منبع ہے، لیکن کتاب الٰہی ناطق ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ ان رسولوں میں ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔

اس لیے تسلیم کرنا پڑے گا کہ عظمت و فضیلت کے لحاظ سے ان کامل انسانوں اور عظیم شخصیتوں میں باہم فرق مراتب ہے اور اسی فرق کے تناسب سے ان کی فیض رسانی کے دائرے میں بھی فرق کرنا پڑے گا مراتب و مدارج کا یہ فرق اشارہ کر رہا ہے کہ جس طرح نوع انسانی کے شرف کی تکمیل مرتبۂ نبوت سے کی گئی ہے اسی طرح کمال نبوت کا اعلیٰ ترین مرتبہ ختم نبوت کو بنایا گیا ہے، سارے نبی کامل تھے لیکن کمال نبوت کے سامنے بھی منازل ارتقاء تھے اور اسے ایک فرد اکمل تک پہونچنا تھا اور یہی فرد اکمل و اعظم خاتم النبیین کے نام سے موسوم ہے۔

ہم ثابت کرچکے ہیں کہ ختم نبوت ایک ناگزیر اور لازمی شئے ہے، سلسلۂ نبوت و رسالت کو لا انتہا نہیں فرض کیا جاسکتا. کسی نہ کسی کو تو خاتم النبیین تسلیم کرنا پڑے گا خواہ اسکی شخصیت جو بھی فرض کی جائے اور اسکے لیے عرصۂ عالم کا جو بھی حصہ تجویز کیا جائے۔

یہ بھی لازم ہو کہ جسے خاتم النبیین کہا جائے اسے کمالاتِ نبوت و رسالت کا اعلیٰ ترین فرد سمجھا جائے اور نوعِ انسانی کیلئے اسکے فیوض و برکات کو بہترین اور اعلیٰ ترین فیوض و برکات تصور کیا جائے، اسکے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ اس نبی اکمل کے ذریعہ سے نوعِ انسانی کو بحیثیت نوع جو کمالاتِ روحانیہ حاصل ہونگے انکی نظیر امم سابقہ میں مفقود ہوگی پھر کیا یہ ضروری نہیں ہو کہ ان بے نظیر کمالات سے نوعِ انسانی کے انتفاع و استفادے کی مدت طویل ہو تاکہ کثیر سے کثیر افراد ان کمالات سے مستفید ہو کر روحانیت و انسانیت کے اعلیٰ مدارج حاصل کر سکیں اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق اس حد تک قربِ الٰہی کے منازل ارتقاء طے کر سکیں جس حد تک کوئی امتی پہونچ سکتا ہے۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ سلسلۂ نبوت قیامت تک جاری رہے گا تو خاتم النبیین کو عمرِ عالم کے آخری حصہ میں فرض کرنا پڑے گا جس کے معنی یہ ہیں کہ بنی نوعِ انسان کی ایک بہت ہی قلیل تعداد اس نعمتِ عظمیٰ سے بہرہ یاب ہو سکے گی ظاہر ہے کہ یہ شے نوعِ انسانی کی مصلحت کے بالکل خلاف ہے اور ارحم الراحمین کی رحمت سے بعید ہے۔

بے شک عقل یہ بات بتانے سے بالکل قاصر ہے کہ فلاں وقت پر نبی کو مبعوث ہونا چاہیے لیکن نبی کی بعثت کے بعد عقل اس حقیقت کا ادراک کر سکتی ہے کہ فلاں نبی کی بعثت مناسب ترین وقت پر ہوئی تھی اور اس وقت کے انتخاب میں فلاں مصلحت تھی، اس قاعدے کے تحت ہم کہہ سکتے ہیں کہ عقلی طور پر خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایسے وقت پر ہوئی جو ختمِ نبوت کے لیے موزوں ترین وقت تھا، یہ وہ وقت تھا جب انسانیت عقلی اعتبار سے حالتِ بلوغ کو پہونچ چکی تھی بنو اسرائیل کی دینی امامت ختم ہو چکی تھی مگر انبیاء بنی اسرائیل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات نے انسان کی عقلِ معاد[1] میں ایسی صلاحیت پیدا کر دی تھی کہ وہ دینِ کامل کو سمجھ سکے اور اس پر عمل پیرا ہو سکے اور عقلِ معاش[2] بھی اس درجہ پر پہونچ چکی تھی جس کے بعد اس کی رفتارِ ارتقاء میں برابر تیزی پیدا ہوتی گئی اور جمود و توقف سے حرکت و تکمیل کی طرف مائل ہو رہی تھی اس وقت شدید ضرورت اس بات کی تھی کہ انسان کو دینِ کامل کی تعلیم دی جائے تاکہ عقلِ معاد عقلِ معاش کی رہنمائی کرتی رہے اور اسے حدود سے متجاوز ہونے سے محفوظ رکھے، اگر اس وقت نبوت ختم نہ ہو جاتی تو عقلِ معاد کمال کو نہ پہونچتی اور تیز رفتار عقلِ معاش کا ساتھ نہ

---

[1] عقلِ معاد: یعنی دینی امور اور آخرت کے متعلق مسائل کی فہم اور سمجھ ۱۲ منہ

[2] عقلِ معاش: یعنی دنیاوی امور کی سمجھ بوجھ ۱۲ منہ

دے سکتی، جب عقل معاش کی ترقی کا کوئی نیا دروازہ کھلتا تو عقل معاد ٹھٹک کر کھڑی ہو جاتی اور اس کا ساتھ دینے کے لیے کسی نبی کا انتظار کرتی۔

نئے مسائل کے معادی پہلو بالکل تاریک رہتے۔ اس تاریکی میں عقل معاش اس قدر دور نکل جاتی کہ عقل معاد اس کی رہنمائی کے بجائے اس کی اتباع پر مجبور ہو جاتی، یہ حالت انسانیت کے لیے کس قدر ہلاکت خیز ہوتی اس کے بیان کی ضرورت نہیں ہے، اس کے علاوہ اس وقت ختم نبوت کی وجہ سے کمالات ختم نبوت اور اس کے فیضان کے ظہور کے لیے انسان کے عقلی شباب و پیری کا پورا زمانہ ملتا ہے، ظاہر بات ہے کہ انسانی زندگی میں یہی دو زمانے بہت طویل ہوتے ہیں اور خاتم الرسل کے فیضان کے لیے ایسے طویل ہی زمانہ کی حاجت ہے، ابھی تو شباب بھی ختم نہیں ہوا، اس وقت ختم نبوت کے بارے میں شک کرنا بالکل ہی بے معنی ہے۔

ختم نبوت اور عقل معاش کا ارتقاء

حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تاریخ عالم میں دینی و مذہبی ابواب تو کثرت میں یہاں تک کہ (جیسا کہ باب اول میں ثابت کیا جا چکا ہے) باطل ادیان و مذاہب کی عقلاً جتنی صورتیں نکل سکتی تھیں وہ سب بعثت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم تک ختم ہو چکی تھیں اور عالم کو ایسے حق کا انتظار تھا جس کی روشنی ہر قسم کے باطل کی تاریکی دور کر دے جس کے معنی یہ ہیں کہ عقل معاد اپنے انتہائی عروج و کمال کی طالب تھی اور انسانیت کو اس کے کمال کی سخت احتیاج تھی۔

لیکن عقل معاش نے اس وقت تک موجودہ دور کے لحاظ سے بہت کم مدارج ارتقاء طے کیے تھے، یہ صحیح ہے کہ انسانیت دنیاوی فہم و فراست کے لحاظ سے بھی سن بلوغ کو پہونچ چکی تھی، لیکن یہ اس کے بلوغ کا بالکل ابتدائی دور تھا، دور شباب ابھی دور تھا، غور کیجیے کہ اٹھارویں صدی عیسوی سے بیسویں صدی عیسوی تک عقل معاش نے جس قدر ترقی کی ہے اس کا سواں حصہ بھی اس سے پیشتر نہ حاصل کر سکی تھی، ان دو ڈھائی صدیوں کے ارتقاء عقل معاش سے اس سے پہلے کی ترقی کی کوئی نسبت بھی ہے؟

نکتہ یہ ہے کہ علوم معاش کی رفتار ارتقاء اس وقت تک تیز نہیں ہو سکتی تھی جب

تک علومِ معاد اپنے عروج و کمال کو نہ پہونچ جائیں، جس طرح ایک انسانی فرد کی سب طبعی قوتیں متوازی طور پر ایک ساتھ ترقی نہیں کرتی ہیں، مثلاً پہلے انسان کا ذہنی نشوونما ایک خاص درجۂ کمال کو پہونچ جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی قوت تولید نسل ترقی کرتی ہے جسے عرفِ عام میں بلوغ کہتے ہیں، یہ بلوغ اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک قوائے ذہنیہ عقلیہ ایک درجہ تک ترقی نہ کر جائیں جس کے بعد وہ صرف معلومات و تجربات کی غذا سے ترقی کرتی ہیں خود ان کا ذاتی نشوونما رک جاتا ہے جب تک عقل اس درجہ تک پہونچ نہ جائے اس وقت تک اس میں قوت تولید نسل نہیں پیدا کی جاتی، اسی لیے بلوغ کو کمالِ عقل کی علامت سمجھا جاتا ہے اگر ایسا نہیں ہوتا اور بلوغ عقل سے پہلے بلوغ عرفی شروع ہو جاتا تو ایسا شخص عموماً فہم کی خامی اور عقل و خرد کی کوتاہی میں مبتلا ہوتا اور یہ کمزوری عمر بھر رفع نہیں ہوتی، اس قانونِ فطرت کا دوسرا منظر خود قوائے عقلیہ ہی کی ترقی کا فطری منہاج ہے، بچپن میں معلومات کی ساری غذا قوتِ حافظہ کے حصہ میں آتی ہے اور متخیلہ اپنی ترقی کے لیے شباب کا انتظار کرنے پر مجبور رہتی ہے، بلوغ کے بعد متخیلہ کا دورِ عروج شروع ہوتا ہے مگر یہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب حافظہ اپنے نقطۂ کمال پر پہونچ چکا ہو۔ اس قانون کے ماتحت انسان کا نوعی ذہن بھی اس کا محتاج تھا کہ پہلے اس کی عقلِ معاد اپنے عروج و کمال کو پہونچ جائے تاکہ اس کے بعد اس کی دوسری قوت یعنی عقلِ معاش کو ترقی کا موقع ملے۔

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت انسان کے ذہن نوعی میں پوری صلاحیت اس چیز کی پیدا ہو چکی تھی کہ وہ اعلیٰ علومِ معاد میں کمال حاصل کر سکے اور اس کی عقلِ معاد درجۂ کمال حاصل کرنے کے لیے بالکل تیار ہو چکی تھی، معلمِ اعظم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر اپنی تعلیم سے اسے درجۂ کمال عطا فرمایا اور ایسے علوم حقہ ربانیہ سے بھر دیا جس کی طلب و صلاحیت اس میں پورے طور پر پیدا ہو چکی تھی۔ ایک نابالغ بچہ ازدواجی تعلقات کے متعلق مسائل کو بالکل سمجھ نہیں سکتا، بلوغ کے بعد ان کے سمجھنے کی صلاحیت کاملہ پیدا ہو جاتی ہے، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اس موضوع کے متعلق طب یا حیاتیات یا نفسیات کے مسائل خود بخود سمجھنے لگتا ہے، بلکہ اس کی صلاحیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر اسے یہ مسائل سمجھائے جائیں تو

آسانی سے سمجھ سکتا ہو۔ اگر نہ سمجھائے جائیں تو ان سے ناواقف رہے گا۔

اس مثال سے مندرجہ بالا بیان عیاں ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ اقدس میں عقل معاد شباب کو پہونچ چکی تھی اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں پوری پوری صلاحیت معادی مسائل کو سمجھنے کی پیدا ہو گئی تھی جس کی وجہ سے وہ خاتم النبیین کے علوم ربانیہ کو خوب سمجھ سکتا تھا اگر انسان کی صلاحیت کامل نہ ہوتی تو وہ علوم ختم نبوت کو سمجھ نہ سکتا اور اس کا حامل نہیں بن سکتا تھا۔ اور اگر خاتم النبیین نہ تشریف لاتے تو عقل معاد کامل نہیں ہو سکتی تھی بلکہ علوم حقیقیہ سے محروم رہنا اس کے لیے لازم ہوتا اور حق یہ ہے کہ اگر انسانیت میں علوم ختم نبوت کی صلاحیتِ کاملہ موجود ہوتی تو خاتم النبیین کی بعثت ہی نہ ہوتی اور عقل معاش کی ترقی کا دور بھی شروع نہ ہوتا کیونکہ نوعِ انسانی اپنے نوعی ذہن کی ایک قوت کی تکمیل میں مصروف رہتی اور اس کی تکمیل کے بغیر وہ دوسری قوت یعنی عقل معاش کی تکمیل میں نہیں مصروف ہو سکتی تھی۔
اس نظریہ کی مزید وضاحت کے لیے اس تاریخی اور یقینی حقیقت پر غور کیجیے کہ بعثت محمدیہ علیہ الف الف تحیۃ سے پہلے بلکہ آنحضور کے زمانہ تک دُنیا کی صاحبِ فکر ذہین اور ترقی یافتہ قوموں میں سب سے زیادہ جس علم کا رواج اور چرچا ملتا ہے وہ الہیات اور اخلاقیات ہے خواہ وہ فلسفہ کی صورت میں ہو یا دینیات کی شکل میں، مابعد الطبعیات کو جو اہمیت دی گئی ہے اُس کی نصف بھی اس کی کسی شاخ کو حاصل نہ ہوئی، مگر باوجود دقیقہ رس عقل وفہم کے ان قوموں میں سائنس کا نام بھی نہیں ملتا، کیا یہ اس کی علامت نہیں ہے کہ نوعِ انسانی کی عقل معاد اپنی بالیدگی پر تھی تو اس کی عقل معاش کا نشو ونما رکا ہوا تھا۔ انسان حاوی علوم کا پیاسا تھا اور ان سے سیراب ہونا چاہتا تھا لیکن علوم معاش کی پیاس اس میں اس شدت کے ساتھ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ خاتم النبیین نے تشریف لا کر آبِ حیات سے اسے سیراب کیا جس نے پیا اس کی عقل معاد کمال کو پہونچی جس نے اس سے روگردانی کی اس کی عقل معاد سراب سے دھوکا کھا کر ہلاک ہوئی اور محروم کمال رہی، یہ تقسیم افراد کے اعتبار سے ہے ورنہ انسان بحیثیت نوع کی عقل معاد خاتم النبیین کی تعلیمات سے تربیت پا کر بامِ عروج وکمال پر پہونچی، اس کی تکمیل کے بعد نوع کی عقلِ معاش میں بھی نشو ونما اور بلوغ کے آثار پیدا ہوئے تا آنکہ اس کی رفتار ترقی

روز بروز تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ اگر ختم نبوت سے عقلِ معاد کی تکمیل نہ ہو گئی ہوتی تو عقلِ معاش ہرگز میدانِ ترقی میں گامزن نہ ہوتی۔

یہ بھاپ اور برق کی قوتوں کی دریافت، یہ بحر و بر کی تسخیر، یہ دوشِ ہوا کی سواری، یہ ذراتِ توانائی کے حیرت خیز آثار، یہ صوت و صورت کے محیر العقول شاہکار، یہ عجیب و غریب ایجادات و اختراعات عقلِ معاش کے تعجب خیز ارتقاء کے بدیہی آثار و دلائل ہیں، لیکن یہ سب درحقیقت ختمِ نبوت کے طفیل میں دنیا نے حاصل کیے ہیں، اگر نبوت ختم نہ ہوتی، اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی و رسول نہ ہوتے جن کی تعلیمات اور جن کے فیوض و برکات نے عقلِ معاد کی تکمیل فرمائی، علومِ معاد کو ان کے انتہائی عروج پر پہونچایا اور نوعِ انسانی کو اپنی دوسری قوت کی طرف متوجہ ہونے کے لیے اس طرف سے مطمئن و فارغ کر دیا تو ہرگز ہرگز ان ترقیات کا نام و نشان بھی نہ ہوتا، بے شک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور آپ کے بعد کسی نبی و رسول کی بعثت نہ ہوئی ہے نہ کبھی ہوگی۔

ابتلاءِ عظیم سے حفاظت

قرآنِ مجید نے امم سابقہ کے حالات کو عبرت و نصیحت کیلئے بیان فرمایا ہے، عاد و ثمود، اصحاب الایکہ، قومِ تبع وغیرہ بہت سی قومیں اور امتیں عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو کر صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح محو کر دی گئیں، کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ ان کی تباہی کا راز کیا تھا؟ شرک و کفر؟ نہیں! اس کی سزا کا مقام آخرت ہے، اور علیم و حلیم رب العالمین صدیوں تک اس جرم کی دنیا میں سزا نہیں دیتے۔ آج دنیا میں اس جرم کی کتنی کثرت ہے، مگر مجرم قومیں تباہی و بربادی اور مکمل استیصال سے محفوظ ہیں، پھر کیا فسق و فجور؟ یہ بھی نہیں! کیا آج فاسق و فاجر قومیں دنیاوی عیش و عشرت سے بہرہ یاب نہیں ہیں؟ اور صدیوں سے ارتکابِ جرائم کرنے کے بعد بھی ابھی تک مٹنے سے محفوظ ہیں، جس شخص کو حق تعالیٰ نے اپنی کتاب کا ذرا بھی ذوق عطا فرمایا ہے وہ بہت آسانی سے معلوم کر سکتا ہے کہ جن امم سابقہ پر ہلاکت و بربادی نازل ہوئی وہ وہی تھیں جنھوں نے انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کو دیکھا مگر ان کی دعوت کو ٹھکرایا، ان کی بات کو جھٹلایا، ان کی شان میں بے ادبیاں کیں اور ان کے دل کو توڑا۔

یہ واقعہ قرآنِ مجید کی عبرت خیز و حکمت آمیز قصص میں قدرِ مشترک کا درجہ رکھتا ہے اور اسی چیز کو روشن کر رہا ہے کہ بے شک انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کا تشریف لانا انسانیت کے لیے ہزاروں

رحمتوں اور برکتوں کا سبب ہے لیکن دوسری طرف سخت امتحان، شدید آزمائش اور ابتلائے عظیم بھی ہے۔

باران رحمت، مردہ زمین کی حیات اور روح شجر و نبات ہے، مگر اسی کے ساتھ کمزور پودوں کے لیے باعث ممات بھی ہے، نجوم ہدایت کا طلوع تزیین بصر و بصیرت کا سبب، مگر شپرہ چشموں کی خیرگی اور بیماردلوں کی موت کا بھی باعث ہے، نبی کا دیدار ایمان والوں کے لیے قرب الٰہی کا قریب ترین راستہ، مگر منکروں کے لیے حجت الٰہی کا تمام ہونا عذاب الیم کا پیام۔

اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت ختم نہ ہوگئی ہوتی اور سلسلۂ نبوت جاری رہتا جیسا کہ امم سابقہ میں رہا تو اُمت محمدیہ علیہ الف الف تحیہ ہر نبی کی بعثت کے وقت سخت امتحان و ابتلا کے دور سے گزرتی، بار بار اس کے سامنے ایمان اور کفر کا سوال پیدا ہوتا، کسی نبی سے انکار کے معنی سب انبیاء کے انکار کے ہیں، اس لیے بہت سے ایسے ہوتے جو ایک لمحہ میں عمر بھر کی اپنی دینی کمائی کھو بیٹھتے اور عبادات و ریاضات کے باوجود عذاب الٰہی کے مستوجب ٹھہرتے۔

حق تعالیٰ نے اپنی رحمت خاص سے رحمۃ للعالمین کی اُمت کو اس ابتلاء عظیم اور پرخطر امتحانوں سے محفوظ رکھا اور سید المرسلین علیہم الصَّلوٰۃ والتسلیم کو خاتم النبیین کا مرتبہ عطا فرما کر سلسلۂ نبوت کو آنحضور کے بعد بند فرما دیا، حق تعالیٰ کا یہ احسان عظیم اسی اُمت پر ہے جس کا زیادہ سے زیادہ شکر بھی کم سے کم ہے اور اسی کے شکر واجب کا کروڑواں حصہ ادا کرنا بھی طاقت انسانی سے باہر اور غیر ممکن ہے۔

منکرین ختم نبوت، احسان فراموش، ناقدرشناس اور کافران نعمت ہیں جو اس احسان عظیم کی قدر کرنے کے بجائے سلسلۂ نبوت جاری رکھنے کی تمنا رکھتے ہیں، گویا اس شدید امتحان و ابتلاء کے طالب ہیں جس سے رب رحیم نے انھیں ستثنیٰ و محفوظ فرما دیا ہے اور جس میں ناکامی کے معنی عذاب دائمی میں مبتلا ہونے کے ہوئے ہیں۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

(اقتباس از مسئلہ ختم نبوت")

"مسئلہ ختم نبوت، علم و عقل کی روشنی میں" از مولانا محمد اسحٰق صاحب سندیلوی، صفحات ۱۸۸ قیمت ۲/۲۵

کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

(فی کاپی آٹھ آنے)

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۔ ۔ ۔ ۶/-
پاکستان سے ۔ ۔ ۔ ۸/-
ششماہی
ہندوستان سے ۔ ۔ ۔ ۳/۵۰
پاکستان سے ۔ ۔ ۔ ۴/-

جلد ۳۲	بابتہ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۳ھ مطابق اکتوبر ۱۹۶۳ء	شمارہ ۵

اگر اس دائرے میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ راکتوبر تک آ جائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار :- اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں، ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری :- براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت :- الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۵ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں۔ اس کی اطلاع ۱۵ تاریخ کے اندر آ جانی چاہئے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان کچہری روڈ ۔۔۔ لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

اس حقیقت کو جس کا جی چاہے آج سمجھ لے اور جس کا جی چاہے کل کے انتظار پر رکھے ہندوستان میں بحیثیت ایک اقلیت کے مسلمانوں کے مسائل کے حل کی اولین شرط ان کا اتحاد ہے اس لئے کہ کوئی بھی اقلیت اپنے حقوق کا تحفظ اس وقت تک کر نہیں سکتی جب تک کہ اس تحفظ کے معاملہ میں اس کی ساری طاقتیں ایک مرکز کے تحت جمع نہ ہوں۔ اس سے انکار نہیں کہ یہ اتحاد اس وقت تک کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا جب تک کہ مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کے ذہن کی موجودہ گرہیں نہ کھلیں اور شکایت و منافرت کی وہ فضا نہ بدلے جس میں ہندو ذہن جارحیت اور حق ماری کے رجحان کو قبول کرنے میں آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ لیکن اس کی بھی کوئی صورت اس سے زیادہ مؤثر اور کارگر کیا ہو سکتی ہے کہ مسلمان ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک متفق ہو کر اٹھیں اور ملک کی ہر ہر آبادی میں ہندوؤں کے دلوں پر دستک دیں کہ ہم اعتماد اور محبت کے طلبگار ہیں ——— اور یہ صورت بھی بن سکتی ہے جبکہ مسلمان اس ذہن کی کسی ایک قیادت کی رہنمائی پر سرگرم عمل ہو جائیں۔

پس مسلمانانِ ہند کی اولین ضرورت ہے کہ وہ کسی ایسی قیادت کے گرد پورے عزم اور کامل یکجہتی کے ساتھ جمع ہو جائیں جو ان کے حقوق کے معاملہ میں پوری مضبوطی کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر بھی یقین رکھتی ہو۔

مسلمانوں میں کافی پرانی کل ہند جماعتیں اور تنظیمیں موجود ہیں ان میں سے ہر ایک یا بعض اپنے متعلق سوچ سکتی ہیں کہ وہ اس معیار پر پوری اترتی ہیں لہٰذا اس ذہن کے لوگوں کو ان سے تعاون کرنا چاہیئے اور کوشش کرنی چاہیئے کہ کل مسلمان فلاں تنظیم کی قیادت کو قبول کر کے اس کے اشاروں پر حرکت کریں۔

یہ مطالبہ حق بجانب ہو سکتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو کیا کیا جائے کہ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کسی بھی صحیح یا غلط وجہ سے ان موجودہ تنظیموں میں سے کسی کے ساتھ بھی وابستہ ہونے کو نہ اب تک تیار ہو سکی ہے نہ آئندہ ایسے آثار ہیں۔

ظاہر ہے کہ حقائق سے لڑا نہیں جا سکتا اور واقعات کا دھارا منطقی استدلال سے نہیں موڑا جا سکتا۔ مسلمانوں کی بہتری اگر مقصود ہو تو اس حقیقت کی رعایت کرنا ہو گی اور اپنی اپنی جماعتیں جو مقصد نہیں کام کا ذریعہ ہیں انھیں پر زور دیئے رہنے کے بجائے کوئی ایسی راہ سوچنا ہو گی جس سے مسلمانوں کے انتشار اور لامرکزیت کو اتحاد اور مرکزیت میں بدلا جا سکے ——

ایسی راہ کیا ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب اب غور و فکر کا محتاج نہیں ہے۔ ان تمام باقاعدہ تنظیموں اور متفرق با اثر حلقوں کے اہم اشخاص نے لکھنؤ کے "مسلم مشاورتی اجتماع" کے ذریعہ مسلمانانِ ہند کی عظیم اکثریت کے جذبات و افکار کی نمائندہ جس "مجلس مشاورت" کو وجود بخشا تھا اس کے ایک منتخب وفد کے پہلے ہی دورے نے اس حقیقت کو واشگاف کر دیا ہے کہ ان تمام حلقوں کی مشترکہ قیادت کا نظام مسلمانوں میں اتحاد اور ولولۂ کار کی روح پھونکنے کا ایک یقینی ذریعہ ہے۔ اس وفد نے بہار اور اڑیسہ کے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ ان ارکانِ وفد میں سے اکثر کے جماعتی یا غیر جماعتی دورے ان مقامات پر پہلے بھی ہوئے ہوں گے۔ مسلمانوں کے انھیں قومی مسائل کے سلسلہ میں بھی ہوئے ہوں گے جن کی مصیبتوں نے مسلمانوں کو بے چین کر رکھا ہے لیکن کہیں نہیں ہوا کہ شہر کا شہر ان کی بات سننے کے لئے امنڈ آیا ہو۔ لیکن یہی سب لوگ جب مشترک قیادت کے عنوان سے جمع ہو کر پہنچتے ہیں تو استقبال کے لئے شہر کے شہر امنڈ آتے ہیں، مسلمانوں کی افسردگی اور بے تعلقی کی جگہ جوش اور محبت کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے اور ان کی ساری مشغولیتوں پر ان رہنماؤں کی بات سننے کا جذبہ غالب آ جاتا ہے۔ یہ اس دورے کے ہر قدم کے وہ یکساں مناظر ہیں جنھیں دیکھ کر شرکاء وفد دنگ رہ گئے کہ —— ع

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی!

بہرحال خدا کی رحمت نے سترہ سالہ عقدۂ لاینحل کا سرا ہاتھ میں دے دیا ہے۔ اور حجت تمام کر دی ہے کہ مسلمانوں کو اگر افسردگی اور سراگندگی کے حال سے نکال کر اپنے اجتماعی مسائل کے لئے سرگرم عمل کرنا ہے تو اس کی راہ یہ ہے مسلمانوں کے تمام رہنما حلقوں کا مشترکہ وفاق۔

"مجلس مشاورت" کا دائرہ کار ابھی واضح نہیں ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے جب ارکانِ مجلس بیٹھیں گے تو ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اپنے تجربے کے اس پہلو کو سامنے رکھیں گے، اور جماعتی مصالح کی بڑی سے بڑی قربانی بھی گوارا کر کے ان تمام مسائل کو اپنے اس وفاق کے دائرہ کار میں لانے کی کوشش کریں گے جن کا حل مسلمانوں کی سرگرم اجتماعی جد و جہد کا طالب ہے۔

کتاب الحج

معارف الحدیث

(مسلسل)

طواف زیارت اور طواف وداع :-

حج کے اعمال و مناسک اور ان کی ترتیب سے جیسا کہ سمجھا جا سکتا ہے اس کا اہم مقصد بیت اللہ کی تعظیم و تکریم اور اس کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار ہے جو ملت ابراہیمی کا خاص شعار ہے ـــــ اس لئے جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے مکہ معظمہ میں حاضری کے بعد حج کا سب سے پہلا عمل طواف ہی کرنا ہوتا ہے، یہاں تک کہ مسجد حرام میں داخل ہو کر پہلے تحیۃ المسجد بھی نہیں پڑھی جاتی بلکہ طواف پہلے کیا جاتا ہے اور اور دو رکعت طواف اس کے بعد پڑھا جاتا ہے ـــــ حاجی کے اس پہلے طواف کا معروف اصطلاحی نام ہی "طوافِ قُدوم" ہے (یعنی حاضری کا طواف) اس کے متعلق احادیث پہلے گزر چکی ہیں۔

اس کے بعد ۱۰ ذی الحجہ کو قربانی اور حلق سے فارغ ہونے کے بعد ایک طواف کا حکم ہے۔ اس کا معروف اصطلاحی نام "طواف زیارۃ" ہے۔ یہ وقوف عرفات کے بعد حج کا سب سے اہم رکن ہے ـــــ پھر حج سے فارغ ہونے کے بعد جب حاجی مکہ معظمہ سے اپنے وطن واپس ہونے لگے تو حکم ہے کہ وہ آخری وداعی طواف کرکے واپس ہو اور اُس کے سفر حج کا آخری عمل بھی طواف ہی ہو، اس کا معروف اصطلاحی نام طوافِ وداع اور طوافِ رخصت ہے ـــــ ان دونوں طوافوں سے متعلق چند حدیثیں ذیل میں پڑھئے!

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمْ یَرْمُلْ فِی السَّبْعِ الَّذِیْ اَفَاضَ فِیْہِ ـــــ رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف زیارت کے سات چکروں میں رمل نہیں کیا۔ (یعنی پورا طواف عادی رفتار سے کیا)

(سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) پہلے گزر چکا ہے کہ حاجی جب مکہ معظمہ حاضر ہو کر پہلا طواف کرے (جس کے بعد اس کو صفا مروہ کے درمیان سعی بھی کرنی ہو گی) تو اس طواف کے پہلے تین چکروں میں وہ رمل کرے گا، حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تمام صحابہ نے ایسا ہی کیا تھا، اس کے بعد ۱۰ ذی الحجہ کو آپ نے منی سے مکہ معظمہ آ کر طواف زیارت کیا اس میں آپ نے رمل نہیں کیا جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں تصریح ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ وَابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَخَّرَ طَوَافَ الزِّيَارَةِ يَوْمَ النَّحْرِ اِلَى اللَّيْلِ ـــــــ

ـــــــ رواہ الترمذی و ابوداؤد وابن ماجہ

حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف زیارت کو مؤخر کیا (یعنی اس کی تاخیر کی اجازت دیدی) دسویں ذی الحجہ کی رات تک۔

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ)

(تشریح) حدیث کا مطلب یہ ہے کہ طواف زیارت کے لئے افضل دن یوم النحر (عید الاضحیٰ کا دن) ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہے کہ اس دن کے ختم ہونے کے بعد رات میں بھی وہ کیا جا سکتا ہے اور اس رات کا طواف بھی فضیلت کے لحاظ سے ۱۰ ذی الحجہ ہی کا طواف شمار ہو گا ـــــــ عام عربی قاعدہ کے مطابق رات کی تاریخ اگلے دن والی تاریخ ہوتی ہے اور ہر رات اگلے دن کے ساتھ لگتی ہے، لیکن حج کے مناسک اور احکام میں بندوں کی سہولت کے لئے اس کے برعکس قاعدہ مقرر کیا گیا ہے اور ہر دن کے بعد والی رات کو اس دن کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے اسی بنا پر جو طواف ۱۰ ذی الحجہ کا دن گزرنے کے بعد رات میں کیا جائے گا وہ ۱۰ ذی الحجہ ہی میں شمار ہو گا اگرچہ عام قاعدہ کے لحاظ سے وہ ۱۱ ذی الحجہ کی رات ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ النَّاسُ يَنْصَرِفُوْنَ فِي كُلِّ وَجْهٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَنْفِرَنَّ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ اٰخِرُ عَهْدِهٖ بِالْبَيْتِ اِلَّا اَنَّهٗ خُفِّفَ عَنِ الْحَائِضِ ــــــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگ (حج کرنے کے بعد) اپنے اپنے وطنوں کے رخ پر چلدیتے تھے (طواف وداع کا اہتمام نہیں کرتے تھے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک وطن کی طرف کوچ نہ کرے جب تک کہ اسکی آخری حاضری بیت اللہ پر نہ ہو (یعنی جب تک کہ طواف وداع نہ کرلے) البتہ جو عورت خاص ایام کے عذر کی وجہ سے طواف سے معذور ہو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے (یعنی اس کو طواف وداع معاف ہے)

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) جیسا کہ اس حدیث میں صراحۃً مذکور ہے پہلے لوگ طواف وداع کا اہتمام اور پابندی نہیں کرتے تھے۔ ۱۲ر یا ۱۳ر ذی الحجہ تک منیٰ میں قیام کرکے اور رمی جمرات وغیرہ وہاں کے مناسک ادا کرکے اپنے اپنے وطنوں کو چلدیتے تھے ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد کے ذریعہ گویا اس کے وجوب اور اہمیت کا اعلان فرمایا، چنانچہ فقہانے طواف وداع کو واجب قرار دیا ہے البتہ حدیث کی تصریح کے مطابق وہ مستورات جو اپنے خاص ایام کی وجہ سے طواف سے معذور ہوں وہ اگر طواف زیارت کر چکی ہیں تو بغیر طواف وداع کئے کہ معظمہ سے وطن رخصت ہوسکتی ہیں ـــــ ان کے علاوہ ہر بیرونی حاجی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ملک کی طرف روانہ ہونے سے پہلے وداع اور رخصت ہی کی نیت سے آخری طواف کرے اور یہی حج کے سلسلہ کا اس کا آخری عمل ہو۔

عَنِ الْحَارِثِ الثَّقَفِيِّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَجَّ هٰذَا الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلْيَكُنْ اٰخِرُ عَهْدِهٖ الطَّوَافُ بِالْبَيْتِ ــــــــــــ رواہ احمد

حارث ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص حج یا عمرہ کرے تو چاہیے کہ اس کی آخری حاضری بیت اللہ پر ہو اور آخری عمل طواف ہو ——— (مسند احمد)

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ أَحْرَمْتُ مِنَ التَّنْعِيمِ بِعُمْرَةٍ فَدَخَلْتُ فَقَضَيْتُ عُمْرَتِي وَانْتَظَرَنِي رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْأَبْطَحِ حَتّٰى فَرَغْتُ وَأَمَرَ النَّاسَ بِالرَّحِيلِ قَالَتْ وَأَتٰى رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْبَيْتَ فَطَافَ بِهٖ ثُمَّ خَرَجَ ———

——— رواہ ابوداؤد

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ (حجۃ الوداع کے سفر میں قیام مکہ کی اُس آخری رات میں جس میں مدینہ کی طرف واپسی ہونے والی تھی) میں نے مقام تنعیم جاکر عمرہ کا احرام باندھا اور عمرہ کے ارکان (طواف، سعی وغیرہ) ادا کئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (منیٰ اور مکہ کے درمیان) مقام ابطح میں میرا انتظار فرمایا جب میں عمرہ سے فارغ ہو چکی تو آپ نے لوگوں کو کوچ کرنے کا حکم دیا اور آپ طواف وداع کے لئے بیت اللہ کے پاس آئے اور طواف کیا اور اُسی وقت مکہ سے مدینہ کی طرف چل دیئے۔

(تشریح) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جب حجۃ الوداع کے سفر میں مدینہ سے روانہ ہوئی تھیں تو آپ نے تمتع کا ارادہ کیا تھا اور اس وجہ سے عمرہ کا احرام باندھا تھا لیکن جب مکہ معظمہ کے قریب پہنچیں تو (جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے) خاص ایام شروع ہوگئے جس کی وجہ سے وہ عمرہ کا طواف وغیرہ کچھ بھی ذکر سکیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق آپ نے عمرہ ترک کرکے ۸ ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھ لیا اور آپ کے ساتھ پورا حج کیا۔ ۱۳ ذی الحجہ کو جمرات کی رمی کرکے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ سے واپس ہوئے تو آپ نے ابطح میں قیام فرمایا اور رات وہیں بسر کرنے کا فیصلہ کیا، اسی رات میں آپ نے حضرت صدیقہ

کو اُن کے بھائی عبد الرحمٰن بن ابی بکر کے ساتھ بھیجا کہ حدودِ حرم سے باہر تنعیم جاکر وہاں سے عمرہ کا احرام باندھیں اور عمرہ سے فارغ ہو کر آجائیں، اس حدیث میں اسی واقعہ کا ذکر ہے حضرت عائشہؓ جب عمرہ سے فارغ ہو کے آئیں تو آپ نے قافلہ کو کوچ کرنے کا حکم دیا، قافلہ اٹھ کے مسجد حرام آیا آپ نے اور آپ کے اصحاب کرام نے سحر میں طواف وداع کیا اور اسی وقت مدینہ کے لئے روانہ ہو گئے ـــــــ حضرت صدیقہ کا یہ عمرہ اس عمرہ کی قضا تھا جو احرام باندھنے کے باوجود نہ کر سکی تھیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ افضل یہی ہے کہ طواف وداع اس وقت کیا جائے جبکہ مکہ معظمہ سے روانگی ہو، اگر طواف وداع کر لینے کے بعد کسی وجہ سے ایک دو دن ٹھیرنا پڑ جائے تو چاہیئے کہ روانگی کے قریب پھر بیت اللہ پر حاضر ہو اور طواف کرے۔

تجلیاتِ مجدد الف ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

(ترجمہ :۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

مکتوب (۵۷) مولانا حمید کے نام [حدوثِ عالم اور ردِّ عقل فعّال کے بیان میں]

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین اللہ تعالیٰ، "بذاتِ اقدس خود" موجود ہے اور اس کی ہستی، "بخودیٔ خود" ہے ــــ اللہ تعالیٰ جیسا ہے ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ عدم سابق اور عدم لاحق کا اسکی جناب میں کوئی راستہ نہیں ہے کیونکہ "وجوبِ وجود" اس کی درگاہِ مقدس کا ادنیٰ خادم ہے، اور "سلبِ عدم" اسکی بارگاہِ محترم کا معمولی خاکروب ہے ــــ اللہ تعالیٰ کے سوا ــــ جس کو عالَم کہتے ہیں ــــ چاہے وہ عناصر ہوں یا افلاک اور خواہ وہ عقول ہوں یا نفوس، بسائط ہوں یا مُرکّبات، سب کے سب اللہ تعالیٰ کے وجود بخشنے سے موجود ہوئے ہیں اور عدم سے وجود میں آئے ہیں ــــ قدامت ذاتی و زمانی صرف اسکے ہی لئے ثابت ہے اور حدوثِ ذاتی و زمانی اس کے غیر کے واسطے ہے۔ چنانچہ زمین کو دو روز میں اس نے ہی پیدا کیا ــــ زمین کو پیدا کرنے کے بعد، آسمانوں اور ستاروں کو دو روز میں عدم سے وجود میں وہی لایا ہے ــــ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ (زمین کو اس نے دو دن میں پیدا کیا)

فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ ـــــــ (اللہ نے سات آسمان دو روز میں بنائے) ـــــــ کوئی بیوقوف ہوگا بلکہ نص قرآنی کا منکر ہوگا کہ ماسوائے حق تعالیٰ کسی چیز کے بارے میں قدامت کا قائل ہو (مثلاً) آسمانوں اور ستاروں کو قدیم کہے یا بسائط عناصر کو قدیم جانے یا عقول و نفوس کو ازلی و قدیم تصور کرے ـــــــ

اجماع اہل ملت اس بات پر منعقد ہوا ہے کہ ماسوائے حق تعالیٰ سب کے سب حادث ہیں، اور سب نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ ماسوائے حق یعنی اشیاء ہیں سب عدم کے بعد وجود میں آئی ہیں ـــ چنانچہ امام حجۃ الاسلام (غزالیؒ) نے اپنے رسالہ "المنقذ عن الضلال" میں اس عقیدے کی تصریح اور جو جماعت بعض اجزائے عالم کی قدامت کا اعتقاد رکھتی ہے ـــ اسی بنا پر ـــ اس کی تکفیر کی ہے ـــ پس اشیاء ممکنہ میں سے کسی شے کی قدامت کا حکم لگانا ملت سے خروج ہے اور دائرہ فلسفہ میں داخل ہوتا ہے ـــ جس طرح ماسوائے حق کے لئے عدم سابق ثابت ہے، اسی طرح عدم لاحق بھی ماسوا کو دامنگیر ہے ـــ

(قیامت میں) ستارے آسمانوں سے بکھر جائیں گے، آسمان پارہ پارہ ہو جائیں گے، زمین اور پہاڑ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور عدم سے مل جائیں گے ـــ چنانچہ نص قرآنی اس پر ناطق ہے اور تمام اسلامی فرقے اس حقیقت پر اجماع کئے ہوئے ہیں حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ کلام مجید میں فرماتے ہیں ـــ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ (پس جب ایک صور پھونکا جائے گا اور جب زمین اور پہاڑوں کو اٹھا لیا جائے گا پھر یکبارگی ان کو توڑ پھوڑ دیا جائے گا پس اس دن واقع ہوگی قیامت اور آسمان پھٹ جائے گا پس آسمان اس دن بودا اور سست ہوگا) نیز حق تعالیٰ فرماتا ہے اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (جب سورج لپیٹ دیا جائے گا اور جب کہ ستارے تیرہ و تاریک ہو جائیں گے اور جب کہ پہاڑ چلائے جائیں گے) نیز فرماتا اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (جب کہ آسمان پھٹ جائے گا

اور جس وقت ستارے بکھر جائیں گے) نیز ارشاد فرمایا اِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ (جب کہ آسمان پھٹ جائے گا)
نیز ارشاد ربانی ہے — كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ — (سوائے
ذات خداوندی کے ہر چیز فانی ہے اسی کا حکم ہے اور اسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے) — اور بھی اس مضمون کی بہت
سی آیات، قرآن مجید میں آئی ہیں — کوئی جاہل ہی ہوگا جو ان اشیاء کی فنا کا انکار
کرے گا یا وہ سرے سے ایمان ہی قرآن پر نہ رکھتا ہوگا بلکہ وہ فلسفیوں کی ملمع کاری
پر فریفتہ ہوگا — حاصل کلام یہ ہے کہ ممکنات میں، عدم سابق کی طرح
عدم لاحق کا اثبات بھی ضروریات دین سے ہے اور اس حقیقت پر ایمان رکھنا لازم
ہے — اور بعض علماء نے جو یہ فرمایا ہے کہ سات چیزیں یعنی عرش و کرسی، لوح و قلم
بہشت و دوزخ اور روح — فنا نہ ہوں گی اور باقی رہیں گی" — اس کا
مطلب یہ نہیں کہ یہ چیزیں فنا قبول نہیں کرتی ہیں اور قابلیت زوال نہیں رکھتی ہیں
حاشا و کلّا — بلکہ قادر مختار جلّ شانہٗ اپنی حکمت و مصلحت کی بنا پر جس کو
چاہتا ہے بعد از وجود، فنا کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے —
يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيَحْكُمُ مَا يُرِيدُ (اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جس
امر کا ارادہ کرتا ہے اس کا حکم دیتا ہے) — اس بیان سے ظاہر ہوا کہ عالم اپنے
جمیع اجزاء کے ساتھ واجب تعالیٰ سے احتیاجی نسبت رکھتا ہے اور اپنے وجود و بقا
میں اسی کا محتاج ہے — اس لئے کہ بقاء، وجود کے برقرار رہنے کا نام ہے جس زمانے
تک بھی اللہ تعالیٰ برقرار رکھنا چاہے — اس وجود پر کسی امر زائد کا نام بقا نہیں
ہے — پس نفس وجود اور استقرار وجود دونوں کے دونوں ارادۂ خداوندی ہی
کے سپرد ہوں گے — عقل فعّال کون ہوتی ہے؟ کہ اشیاء کا انتظام کرے اور
حوادث اس کی طرف منسوب ہوں — عقل فعّال کے تو نفس وجود اور اسکے ثبوت
میں بھی ہزاروں کلام ہیں — اس لئے کہ اس عقل فعّال کا تحقق و حصول فلسفیوں
کے ان غلط اور فریب دہندہ مقدمات سے ہے جو اصول حقہ اسلامیہ کی رو سے ناتمام
اور نافرجام ہیں — کوئی بیوقوف ہوگا جو اشیاء کو قادر مختار جلّ شانہٗ سے الگ

رکھ کر عقل فعال جیسے معدوم موہوم کی طرف منسوب کردے بلکہ خود اشیاء کو بہت زیادہ ننگ و عار ہے اس بات سے کہ فلسفی کی گھڑی ہوئی عقل فعال سے وہ منسوب ہوں بلکہ اشیاء اپنے عدم پر راضی و خورسند ہوں گی اور ہرگز وجود کی رغبت نہ کریں گی اس بات کے مقابلے میں کہ ان کے وجود کی نسبت فلسفی کی من گڑھت چیز کی طرف کی جائے اور وہ قدرت قادر مختار جل سلطانہ کی طرف انتساب کی سعادت سے محروم کر دی جائیں۔
کَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا۔ (سخت ہے وہ بات جو اُن کے منھ سے نکل رہی ہے، وہ سوائے جھوٹ کے اور کچھ نہیں کہہ رہے)

مکتوب (۵۹) خواجہ شرف الدین حسین کے نام

[تمام حوادث کو ارادۂ خداوندی سے متعلق سمجھ کر اُن سے لذت یاب ہونا چاہیے]

اے فرزند عزیز باتمیز! حوادث یومیہ چونکہ بارادۂ واجب الوجود ہوتے ہیں اور اُسی کے فعل سے برقرار ہیں اس لئے اپنے ارادے کو تابع ارادۂ خداوندی کر کے حوادث کو اپنی مرادلت قرار دینا چاہیے اور ان سے لذت یاب ہونا چاہیے۔ اگر بندگی کا جذبہ ہے تو یہ نسبت پیدا کرنا چاہیے ورنہ پاؤں دائرہ بندگی سے باہر نکالنا اور اپنے آقائے حقیقی کا مقابلہ کرنا ہے۔ حدیث قدسی میں آیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "جو شخص راضی نہیں ہوا میرے فیصلے پر اور جس نے صبر نہیں کیا میری بھیجی ہوئی مصیبت و آزمائش پر اس کو چاہیے کہ وہ میرے علاوہ اپنا کوئی اور رب ڈھونڈھ لے اور میرے آسمان کے نیچے سے نکل جائے"۔ مردم فقراء و مساکین اور کمزور اشخاص تمہاری رعایت و حمایت میں آسودہ حال رہے ہیں۔ چونکہ وہ بھی اپنا ایک آقائے حقیقی رکھتے ہیں (اس لئے تمہاری حمایت کی چنداں ضرورت تو نہیں البتہ اس بہانے سے) تمہاری نیکنامی باقی رہی۔ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ تم کو دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے۔ والسلام۔

مکتوب (۶۰) پیرزادہ گرامی قدر حضرت خواجہ محمد عبداللہ معروف بخواجہ کلاںؒ کے نام [درمیان کا کچھ حصہ]

......حقیقتِ انسان اور اس کی ذات عدم ہے جو کہ حقیقتِ نفسِ ناطقہ ہے ابتداء میں اس نفس کو نفسِ امّارہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ہر انسان لفظ انا (میں) بول کر اسی نفسِ امارہ کی طرف اشارہ کرتا ہے پس ذاتِ انسان، نفسِ امّارہ ہے اور تمام لطائفِ انسان، نفسِ امارہ کے قویٰ و جوارح کی مانند ہوئے ——— چونکہ عدم اپنی ذات کے لحاظ سے شرِ محض ہوتا ہے ہوئے خیریت اس میں نہیں ہوتی اس لئے نفسِ امارہ بھی شرِ محض ہو اور اپنے اندر ہوئے خیریت نہیں رکھتا ——— یہ نفسِ امّارہ کی شرارت و جہالت ہی تو ہو کر وہ کمالاتِ منعکسہ جو اس کے اندر بطور ظلّیت، ظاہر ہوگئے ہیں ان کو وہ اپنی طرف سے سمجھتا ہے اور اُن کمالات کو جو اپنی اصل کے ساتھ قائم و ثابت ہیں یہ اپنی جانب منسوب کرکے خود کو ان کمالات کی بنا پر کامل و خیر جانتا ہے اور اسی وجہ سے اپنی سرداری کا دعویٰ کرتا ہے نیز اپنے آپ کو کمالات کے اندر خداوند کریم کا شریک بناتا ہے، حول و قوت کو اپنی جانب سے تصور کرتا ہے، خود کو متصرّف سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ سب اس کے تابع رہیں اور وہ کسی کا تابع نہ ہو وہ اپنے آپ کو ہی سب سے زیادہ دوست اور عزیز رکھتا ہے اور دوسروں کو اپنی ذاتی غرض سے دوست رکھتا ہے نہ کہ دوسروں کی مصلحت کے پیشِ نظر۔ انہیں تخیلاتِ فاسدہ کی وجہ سے وہ اپنے مولا جل سلطانہٗ سے عداوتِ ذاتی پیدا کرتا ہے اور اس کے نازل کئے ہوئے احکام کی طرف مائل نہیں ہوتا (بلکہ) اپنی خواہشات کی پیروی اور پرستش کرتا ہے۔

حدیث قدسی میں آیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ——— "تو اپنے نفس کو دشمن رکھ اسلئے کہ وہ میری مخالفت و دشمنی پر کمر باندھے ہوئے کھڑا ہے۔"

حضرت حق جل مجدہ نے اپنی کمال مہربانی و رحمت سے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا جو رحمتِ عالم ہیں ——— تاکہ وہ مخلوق کو حق تعالیٰ کی طرف دعوت دیں اور اس دشمن (نفسِ امّارہ) کا کارخانہ تباہ کریں نیز انسان کو اپنے خالق و مولا کی جانب راستہ دکھائیں اور جہالت و خباثت سے باہر لائیں اور اسکے نقص و شرارت سے مطلع کریں جو سعادتِ ازلی رکھتا تھا اس نے ان بزرگوں (انبیاء) کی دعوت کو قبول کرلیا اور اپنی

جہالت وخباثت سے باز آگیا اور نازل شدہ احکام کا تابع ومطیع بن گیا ....

مکتوب (۶۶) محمد مقیم قصوری کے نام

[المجاز قنطرۃ الحقیقۃ (مجاز، حقیقت کا پل ہے) کے بیان میں]

برادرم محمد مقیم نے دریافت کیا تھا کہ صوفیا نے المجاز قنطرۃ الحقیقۃ، کس معنی میں استعمال کیا ہے؟ جاننا چاہئیے کہ مجاز، ظلِ حقیقت ہے کہ اس نے ظل سے اصل کی طرف شاہراہ کھولی ہے شاید اسی بنا پر بزرگوں نے فرمایا ہے کہ "جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا"۔ بات یہ ہو کہ معرفتِ ظلِ معرفتِ اصل کو مستلزم ہے اس لئے کہ ظل اپنی اصل کی صورت میں موجود ہے پس ظل، انکشافِ اصل کا سبب ہوتا ہے کیونکہ صورت شے وہی ہے جس سے اصل شے ظاہر ہو۔ لیکن یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ المجاز قنطرۃ الحقیقۃ اس صورت میں ہے جب کہ مجاز میں گرفتار نہ ہوجائے بلکہ ایک نظر کے بعد دوسری نظر کی نوبت نہ آنے پائے (پس) نظرِ اوّل قنطرۃ الحقیقۃ ہے۔ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے " النظرۃ الاُولیٰ لک" فرمایا ہے۔ (یعنی پہلی نظر تیرے لئے ہے) گویا کہ لفظ لک سے اشارہ دولت حقیقت کے حصول کی طرف ہے اور اگر نعوذ باللہ مجاز میں گرفتار ہوگیا اور نظرۂ ثانیہ کی نوبت آئی تو وہ مجاز، راہِ وصولِ حقیقت کا مانع ہے قنطرہ (پل) کہاں سے ہوگا؟ بلکہ وہ تو ایک بت ہے جو کہ اپنی پرستش کی دعوت دیتا ہے۔ ایک دیو ہے جو حقیقت سے روگرداں کر رہا ہے۔۔۔ اسی لئے مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے نظرۂ ثانیہ کو مُضر جان کر "النظرۃ الثانیۃ علیک" (دوسری نظر تیرے لئے مُضر ہے) فرمایا۔۔۔ اس چیز سے زیادہ کونسی چیز مضر ہوگی جو حق سے باز رکھے اور باطل میں گرفتار کردے۔ جاننا چاہیئے کہ پہلی نظر بھی اس وقت نافع ہے کہ اپنے اختیار سے نہ ہو اپنے اختیار سے ہوگی تو وہ بھی دوسری نظر کا حکم رکھتی ہے۔۔۔ قرآن مجید کی یہ آیت اس مطلب کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔۔۔ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (آپ مومنین سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نظروں کو پست رکھا کریں)۔۔۔ بیوقوف صوفیائے خام نے المجاز قنطرۃ الحقیقۃ کے معنیٰ نہ سمجھ کر غلطی کی وہ حسین شکلوں میں گرفتار ہوکر ان کے عشوہ و ناز پر فریفتہ ہوجاتے ہیں اس طمع میں کہ اس گرفتاری و فریفتگی کو

حقیقت تک پہونچنے کا ذریعہ اور حصولِ مطلوب کا زینہ بنالیں مگر یہ بات ہرگز درست نہیں۔
یہ تو خود راہِ مطلوب میں رکاوٹ ڈالنے والی چیز ہے اور مقصود سے روکنے کے لئے زبردست
آڑ ہے ــــ ایک باطل ہے جو اُن کی نظر میں مزین ہو گیا ہے اور دھوکے میں آکر وہ اِس
کو حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں ـــــــ ان صوفیائے خام کی ایک جماعت ہے جو ان صورتوں
کے حسن و جمال کو حسنِ حق تعالیٰ سمجھ کر ان کے عشق میں مبتلا ہونے کو گرفتاری بجق جانتی ہے
اور ان صورتوں کے مشاہدے کو مشاہدۂ حق سمجھتی ہے ان میں سے بعض نے کہا ہے۔

امروز۱ چوں جمال تو بے پردہ ظاہر است
در حیرتم کہ وعدۂ فردا برائے چیست

اللہ تعالیٰ اُن کے اِن اقوال سے دور اور بالا ہے ــــ اللہ تعالیٰ کو یہ کوتاہ نظر
لوگ (نہ معلوم) کیا گمان کئے ہوئے ہیں اور اس کے حسن و جمال کا نہ جانے کیا تصور کئے
ہوئے ہیں ....

حق تعالیٰ کی ایک تجلی سے کوہِ طور کا پارہ پارہ ہو جانا اور حضرت کلیم اللہ علیہ السلام
کا باوجود قرب و منزلت کے اس تجلی سے بیہوش ہو کر گر پڑنا یہ تو نصِ قرآنی سے ثابت ہو
اور یہ لوگ اپنی اس بیوقوفی کے باوجود ہمہ وقت بے پردہ حق تعالیٰ کو دیکھنے والے ہیں
اور وعدۂ رویتِ اُخروی پر حیرت و تعجب کا اظہار کرتے ہیں ــــ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوا
فِي أَنفُسِهِمْ وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيرًا ـــــــ (انھوں نے اپنے گمان میں
اپنے آپ کو بڑا سمجھا اور بڑی سرکشی کی) ــــ علماء اہلِ سنت و جماعت نے ـــــ
اللہ تعالیٰ ان کی سعی کو قبول فرمائے ـــــ اپنی جانیں کھپائی ہیں اور براہینِ نقلی
سے مخالفین اہلِ سنت کے مقابلے میں اثباتِ رویتِ اُخروی کیا ہے کیونکہ اہلِ سنت
کے علاوہ جتنے مخالف فرقے ہیں ان میں سے کوئی بھی ــــ چاہے وہ کوئی ملت رکھتا ہو
یا نہ رکھتا ہو ــــ رویتِ حق تعالیٰ کا قائل نہیں ہے ــــ بلکہ اُس کو محالِ عقلی سمجھتا ہو

---

۱ جبکہ آج تیرا حسن و جمال بے پردہ ظاہر ہے تو مجھے حیرت ہے کہ پھر قیامت میں دیدار کا وعدہ کس لئے ہے؟

اور خود اہل سنت بھی رویت باری تعالیٰ کو بلا کیف ہی مانتے اور کہتے ہیں نیز آخرت کے ساتھ مخصوص رکھتے ہیں اور یہ بوالہوس (صوفیائے خام) ہیں کہ اسی دنیائے فانی میں اس دولت قاہرہ کے حصول کا خواب دیکھ رہے ہیں اور اپنے خیال میں مگن ہیں۔۔
رَبَّنَا اٰتِنَا مِن لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا (ہمارے رب ہم کو اپنی جانب سے رحمت عطا فرما اور ہمارے کام میں بہتری پیدا کر دے)
والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ والتزم متابعۃ المصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔۔

مکتوب (۶۹) قاضی موسیٰ کے نام ـــــــ (نصیحت)

بعد الحمد والصلوٰۃ وتبلیغ الدعوات ـــــــ اس طرف کے فقراء کے احوال مستوجب حمد ہیں۔ جو مکتوب تم نے رحم علی درویش کے ہاتھ ارسال کیا تھا پہونچ گیا۔ خوشوقت کیا ــــ خداوند کریم سلامت و با استقامت رکھے ــــ مکتوب میں نصائح کو طلب کیا تھا مخدوما! بس ایک نصیحت تو دین کے متعلق ہے (کہ دین پر پورے پورے عامل رہنا) دوسری نصیحت متابعت سید المرسلین کی کرتا ہوں.......... متابعت کی کئی اقسام ہیں ان میں سے ایک قسم یہ ہے کہ احکام شرعیہ کی ادائیگی کیجائے۔ باقی اقسام کا فقیر نے ایک مکتوب میں مفصل ذکر کر دیا ہے جس کو ایک دوست[1] کے نام لکھا ہے ــــ ان سے کہوں گا کہ اسکی نقل تم کو بھیج دیں ــــ بالجملہ اس طریقے میں افادہ و استفادہ کا دار و مدار صحبت پر ہے۔ کہنا اور لکھنا کافی نہیں ہے۔ حضرت خواجہ نقشبند نے فرمایا ہے کہ "ہمارا طریقہ صحبت ہے" ـــــــ اور اصحاب کرام صحبت خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت تمام اولیائے امت سے افضل ہیں کوئی ولی مرتبۂ صحابی تک نہیں پہونچ سکتا اگرچہ اویس قرنی کیوں نہ ہوں (جو کہ خیر التابعین ہیں) ــــ دوستوں سے دعائے سلامتی ایمان کی درخواست ہے ــــ "اے ہمارے رب ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما اور ہمارے کام کو بہتر و درست فرمادے"۔ رحم علی نے اپنے ورق زندگی کو پلٹ دیا ہے (محاسبۂ اعمال میں لگے ہوئے ہیں) اور اصلاح نفس کی طرف متوجہ ہیں ــــ اللہ تعالیٰ استقامت بخشے ــــ والسلام

[1] مکتوب (۵۴) بنام سید شاہ محمد ــــ در دفتر دوم

قسط نمبر ۲

سید سلیمان ندویؒ
شخصیت و ماحول

سید ذوالفقار حسین بخاری ایم۔ اے (اسلامیہ کالج لائلپور)

سید صاحب نے جس دینی اور علمی فضا میں پرورش پائی اُس نے اُن کی شخصیت کے بنانے میں بڑا اہم حصہ لیا ہے۔ گھر یلو ماحول، انداز تربیت اور اس کے اثرات کی ایک مثال خود سید صاحب کی زبانی سنیئے،

"قرآن پاک کے بعد مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تقویت الایمان میرے ہاتھ میں دین کی پہلی کتاب دی گئی۔ میں ان بہیوں کے بیچ میں بیٹھ کر تقویت الایمان کی ایک ایک بات پڑھتا تھا اور بھائی صاحب مرحوم پردہ کے پیچھے سے اس کے ایک ایک مسئلہ کی تشریح و تفسیر فرماتے اور جو وہ فرماتے وہ میرے دل میں بیٹھتا جاتا۔

یہ پہلی کتاب تھی جس نے مجھے دین حق کی باتیں سکھائیں اور ایسی سکھائیں کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ میں بیسیوں آندھیاں آئیں کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اُٹھے مگر اس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں اُن میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔ علم کلام کے مسائل، اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالی و رازی و ابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے

نگاہوں سے گزرے مگر اسمٰعیل شہید کی تلقین بہر حال اپنی جگہ قائم رہی۔[1]
جس زمانے میں ہوش و شعور کی آنکھ کھولی وہ بھی کچھ کم مردم ساز نہیں تھا۔ بڑی بڑی مؤثر تحریکیں اٹھ رہی تھیں اور طاقتور شخصیتیں قوم کی علمی و دینی تعمیر نو کے میدان میں اتری ہوئی تھیں۔ سید صاحب اپنے اس دور کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

انیسویں صدی ختم ہو رہی تھی تو میرے ہوش و تمیز کی آنکھیں کھل رہی تھیں، پندرہ سولہ برس کا سن ہوگا اس وقت قدیم و جدید کی کشمکش سے سارا ہندوستان خیالات کا دنگل بن رہا تھا۔ کانوں میں دو قسم کی تحریکوں کی آوازیں دم بدم آ رہی تھیں۔ ایک سرسید کی تحریک یعنی انگریزی تعلیم کی اشاعت اور مذہب میں عقل اور فطرت کی مطابقت کی کوشش اور دوسری علما کو نئے زمانے کے نئے خیالات اور فلسفہ سے آشنا کر کے پرانی عربی تعلیم کی از سر نو تنظیم کی تحریک جن کے لے کر چند روشن خیال علما اٹھے اور یہ عجیب بات تھی کہ اس تحریک کا مرکز بھی علی گڑھ کی ایک عربی درسگاہ تھی جو مولانا لطف اللہ صاحب کی ذات سے عبارت تھی۔ اس تحریک کا دوسرا مرکز دہلی تھا۔ جہاں مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی درس دیتے تھے، کانوں میں یہ دونوں آوازیں پڑیں مگر میرا خاندانی ماحول اسی دوسری تحریک سے متاثر تھا، اس لئے اس دوسری تحریک سے دلچسپی ہوئی۔ اور بڑھتی گئی اور پھیلتی گئی اور وہی میری زندگی کا جز دین گئی۔

اس تحریک کا پہلا اثر یہ تھا کہ علمائے قدیم و جدید کی آمیزش سے نئی عربی درسگاہ کے قیام کی کوشش کی .... اس کے بعد ندوۃ العلماء نے لکھنؤ میں دینا نیا مدرسہ کھولا میرے والد مرحوم نے مدرسہ احمدیہ میں بھیجنے کا ارادہ کیا مگر

---

[1] مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص۔ حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے اپنے ایک مضمون "سید الملت کی مکتبی زندگی" میں دیسنہ کے مشاہیر علما اور صلحا کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے اس ضمن میں سید صاحب کے خاندان کے اہل علم و اہل دل کا مختصر حال بھی لکھا ہے۔ اس سے سید صاحب کے خاندانی ماحول کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

میرے خاندان کے چند عزیزوں کا تعلق ندوۃ العلماء کی تحریک سے تھا۔ اس لئے
دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ کی تجویز میرے لئے مناسب بتائی گئی مگر ابھی
اس کے داخلہ میں کچھ تاخیر تھی تو چند ماہ بہار کے مشہور علمی و مذہبی حلقہ خانقاہ
پھلواری میں مجھے رکھا گیا یہاں خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی۔ اس کے اثر سے
اس قصبہ میں شعر و سخن کا خاصا چرچا تھا اور ہے۔ میں نے بھی اس فضا میں سانس
لی اور سب سے پہلے میں نے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول منصور موہن دیکھا اس
کا اثر یہ ہوا کہ جس وقت کتاب ختم کی خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا۔[۱]

اس کے بعد سید صاحب دربھنگہ میں رہے اور آخر میں کئی برس دارالعلوم ندوۃ العلماء میں رہے
اور یہیں سے دستار فضیلت لے کر نکلے۔

ندوہ میں ان کو مولانا شبلی جیسی شخصیت میسر آئی جس نے ان کی صلاحیتوں کو پہچانا، اور
وہ بھی پھر اس کے دامن اس طرح وابستہ ہوگئے، جسے لوگوں نے استاد کی شخصیت میں اپنے آپ
کو گم کر دینے سے تعبیر کیا۔

شبلی نے ان کے ادبی اور تصنیفی ذوق کو چمکایا، علم اور تحقیق کی پرپیچ راہوں سے
گزرنا سکھایا، اپنے سیاسی ذہن کا ورثہ بھی انھیں دیا، غرض شبلی کے پاس جو کچھ تھا وہ سید صاحب
کی جھولی میں ڈال دیا، لیکن خود سید صاحب کے احساس کے مطابق شبلی کا ان پر سب سے
بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے سیرت پاک علیہ الصلوٰت والتسلیمات کی خدمت میں سید صاحب
کو اپنا شریک بنایا اور دنیا سے جاتے وقت اس کارِ سعادت کی تکمیل بھی انھیں پر چھوڑ گئے،
سید صاحب راقم ہیں:-

"انھوں نے اپنی زندگی میں اور اپنی زندگی کے بعد بھی بشکل وصیت اس کو سرورِ کائنات
فخرِ موجودات، رحمت عالم، سید اولادِ آدم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرکارِ اقدس میں
جہاں وہ سب سے آخر میں پہنچے تھے، سب سے اول پہنچایا، یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم
کی سیرت مبارکہ کے مطالعہ، جمع، تنقید اور تالیف و تحقیق کی خدمت ابتدا ہی
میں سپرد فرمائی جو الحمدللہ یہاں اس کے لئے سعادت کا ذریعہ ہے اور ان شاء اللہ

[۱] جن سے میں متاثر ہوا صفحہ

وہاں اس کے لئے آخرت کا ذخیرہ ہوگی۔ اور اس کا نتیجہ ہے کہ قلم کی ہزار کج روی کے باوجود حجاز کی بجائے ترکستان جانے کی غلطی اس سے سرزد نہیں ہوئی اور ساری علمی وعملی کوتاہیوں کے باوجود بھی اس سایۂ رحمت کے دامن سے وہ ساری عمر لپٹا رہا اور اس طرح سرکار مدینہؐ سے اس کو محبت کا وہ خزینہ عطا ہوا جس سے وہ بزرگوں کی نگاہ قبول کے قابل ٹھہرا اور تلافی مافات کی توفیق سے بہرہ ور ہوا۔[1]

سید صاحب کی شخصیت نے بلندی کی جو منزلیں اپنے استاد کی حیات ہی میں طے کر لی تھیں پھر استاد کی جانشینی، سیرت النبی جیسے عظیم کام کی بطریقِ احسن تکمیل اور دارالمصنفین کی شہرۂ آفاق علمی کارگزاریوں نے ان کو جس رتبۂ بلند پر پہنچا دیا تھا اس کے بعد بھی اپنے اندر کسی کمی کا احساس، تکمیل مزید کی جستجو اور اس کے لئے نئے آستانے کی نیازمندی بظاہر بعید سی بات تھی لیکن سید صاحب کی گھٹی میں جو روحانی تشنگی پڑی ہوئی تھی اور جسے سیرت نگاری نے دو آتشہ کر دیا تھا اس نے سید صاحب کی شخصیت کو ایک آخری موڑ اور دیا ہے۔ یہ موڑ تھا حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ حق پرست پر بیعت، جس نے شخصیت کا رنگ ہی بدل دیا۔ اور یہ رنگ اضافۂ عمر کے ساتھ ساتھ گہرا ہی ہوتا چلا گیا، اس کی تفصیل[2] کا تو یہاں موقع نہیں، لیکن ایک شعر میں شاید اس کی تصویر کھینچی جا سکتی ہو۔

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ مجھے کام اپنے ہی کام سے
ترے ذکر سے، ترے فکر سے، تری یاد سے، ترے نام سے

دل کی اس نئی مشغولیت اور نئی لذت کا اثر آپ کے علمی اور تصنیفی کاموں پر پڑنا ناگزیر تھا لیکن یہ خیال حقیقت سے بہت دور ہے کہ تصوف نے سید صاحب کو علمی اور تصنیفی

---

[1] حیاتِ شبلی صفحہ ۱۲

[2] ہم "سوانح حیات" میں اس کی طرف تھوڑا سا اشارہ کر آئے ہیں۔ زیادہ تفصیل کے لئے تذکرۂ سلیمان، مرتبہ غلام محمد صاحب ملاحظہ فرمائیں۔

کام کا نہ رکھا، حقیقت میں وہ کچھ خاص حالات تھے اور کچھ تقاضائے عمر جس نے سید صاحب کو رفتہ رفتہ ان مشاغل سے یکسو کر دیا، ورنہ حیات شبلی تو بیعت کے بعد ہی منصۂ شہود پر آئی ہے رسالہ معارف میں بھی کچھ عرصہ تک آپ کا قلم حسب سابق گوہر لٹاتا رہا، علاوہ ازیں اگر تصوف کا یہی اثر ہوا کرتا تو حضرت شاہ ولی اللہ کے علمی کارنامے کیوں کر وجود میں آجاتے اور خود مرشد تھانوی کیونکر اس قدر تصانیف یادگار چھوڑتے؟

بیعت سے پہلے سید صاحب اپنے کو شبلی کہلانا پسند کرتے تھے، اصولی طور پر فقہ میں امام ابن تیمیہ اور امام ابن القیم کے مسلک کی طرف رجحان تھا۔ عملی طور پر تقریباً حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہم مسلک تھے۔ لیکن بیعت کے بعد پوری طرح حنفیت کی طرف میلان ہوگیا اور اپنے مرشد کے اتباع میں اپنے آپ کو ایک عامی مقلد کے درجہ پر رکھنے لگے۔

اب چند معاصرین کے بیانات میں علامہ سید سلیمان کی شخصیت کی جھلکیاں ملاحظہ فرمایئے:۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رقم زد ہیں:۔

"کسی فن میں کامل یا نامور ہونا اور بات ہے اور اس کا حقیقی ذوق اور اس میں شغف اور انہماک اور بات ہے۔ اپنی اس مختصر علمی زندگی میں اکثر یہ دیکھا کہ اکثر لوگ خاص احوال، خاص اوقات میں صاحب علم اور صاحب ذوق نظر آتے ہیں باقی اوقات میں ان میں کوئی علمی دلچسپی، شوق مطالعہ، جستجو اور کتابی ذوق نظر نہیں آتا، درحقیقت ان میں طالب علمانہ روح نہیں ہوتی۔ اس بارہ میں میں نے دو شخصیتوں کو مستثنیٰ پایا۔ ایک مولانا انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مولانا سید سلیمان ندوی اوّل الذکر کو کم دیکھا .... لیکن سید صاحب کو خوب دیکھا سفر و حضر میں رفاقت رہی اور کئی کئی دن مسلسل ساتھ رہنا۔ ان کا علمی ذوق ہر جگہ اور تقریباً ہر وقت قائم رہتا، مطالعہ، غور و فکر، علما و اہل فن سے تبادلۂ خیال اور بحث و نظر کا سلسلہ جاری رہتا، وہ فطرتاً طالب علم تھے اور ان کا لازمۂ زندگی

سلہ مکتوبات سلیمانی ص۱ سلہ ایضاً ص۱

تھا۔ بیماری میں بھی ان کا مطالعہ جاری رہتا، دیکھنے میں یہ معمولی بات ہے لیکن قدیم وجدید حلقوں میں اب جو علمی بے تعلقی و بے ذوقی بڑھتی جا رہی ہے اس کے پیش نظر کسی زمانہ میں یادگار بات ہوگی۔[۵۱]

سیّد صاحب کی ایک دوسری صفت کا اظہار بھی مولانا ئے موصوف نے ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"واقعہ یہ ہے کہ میں نے ہندوستان اور بیرون ہند کی سیاحت اور ممالک اسلامیہ سے قریبی واقفیت کے سلسلہ میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جیسا جامع اوصاف اور مولانا سید سلیمان ندوی جیسا جامع فنون اور متنوع الذہن نہیں دیکھا۔"[۵۲]

علمی انہماک کے باوجود ان کی طبیعت کی شگفتگی قائم تھی۔ عبدالمجید صاحب سالک لکھتے ہیں:۔

"جن لوگوں کو مولانا سے ملنے کا کم اتفاق ہوا ہے وہ سمجھتے ہوں گے کہ مولانا بالکل خشک ملّا ہوں گے اور اُن کے چہرے پر کبھی تبسم کی چمک نظر نہ آتی ہوگی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا نہایت شگفتہ مزاج بزرگ تھے۔ اُن کی ظرافت میں حسن و لطافت کا رنگ تھا۔"[۵۳]

مولانا محمد ادریس صاحب ندوی فرماتے ہیں:۔

"سید صاحب لطف و مزاح کی باتیں بھی خوب کرتے تھے۔"[۵۴]

سیّد صاحب میں اخلاق بھی کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ سالک صاحب لکھتے ہیں:۔

"ہرزہ گوئی سے اپنی زبان کو کبھی آلودہ نہیں کیا۔ اپنے دوستوں اور شاگردوں پر بے حد شفیق تھے حتی الامکان عمر بھر کسی کی دل آزاری نہیں کی۔ اختلاف کی صورت میں خلقِ محمدی سے کام لیتے اور سخت سے سخت بات نرم سے نرم الفاظ میں کہتے۔"[۵۵]

---

[۵۱] قومی آواز لکھنؤ، ۳۰ نومبر ۱۹۸۲ء [۵۲] ایضاً [۵۳] "ماہِ نو" جنوری ۱۹۵۴ء صفحہ ۲۰ سالک صاحب نے آگے سید صاحب کے لطیف مزاح کی مثالیں بھی دی ہیں۔ [۵۴] ریاض سید سلیمان ندوی نمبر صفحہ ۵۵ ادریس صاحب نے بھی . . . . . سید صاحب کی لطف و مزاح کے واقعات نقل کئے ہیں۔

[۵۵] "ماہِ نو" جنوری ۱۹۵۴ء صفحہ ۲۰

سیّد صاحب کے اخلاق و مروت، شرافت و وسیع القلبی اور عفو و درگذر کے بیسیوں واقعات ہیں۔ ہم یہاں چند واقعات نقل کرتے ہیں۔ حافظ محمود شیرانی صاحب نے سید صاحب کے محبوب استاد علامہ شبلی پر جس انداز سے تنقید کی اور سید صاحب کے ساتھ ان کی جس طرح علمی چشمک رہی اس کا اہل علم حضرات کو بخوبی علم ہے مگر سید صاحب کا ان کے ساتھ کیا سلوک تھا اس کا ایک واقعہ سے اندازہ لگائیے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب راوی ہیں:۔

"ایک مرتبہ شیرانی صاحب لکھنؤ تشریف لے گئے .... سید صاحب نے آپ کی اپنے خاص انداز میں پر تکلف دعوت بھی کی۔ جب لاہور واپس آئے شیرانی صاحب نے بسبیل تذکرہ اس دعوت کا حال سنایا۔ اس کے بعد اکثر میں نے شیرانی صاحب کو شعر العجم کی تنقید جاری رکھنے پر اکسایا مگر وہ یہی کہہ کر ٹال دیتے کہ یہ کیسے ہو ان (شیرانی) سیّد کی روٹیاں کھا آیا ہے اور ساتھ ہی ان کے اعلیٰ اخلاق کی تعریف بھی ہمیشہ کرتے ہیں"[۵۱]

شیرانی صاحب کی وفات پر اُن کے اوصاف کا سید صاحب نے ان الفاظ میں ذکر کیا:۔

"مرحوم نیک مزاج، کم آمیز، سادگی پسند اور خاموش طبع تھے۔ ان کی طبیعت میں تلاش، محنت، تحقیق و تدقیق کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا .... مرحوم کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کی شاندار روایات کا بڑا اثر تھا ...... حافظ قرآن تھے یہ خود ایک بڑی نعمت ہے اور وسیلۂ مغفرت"[۵۲]

شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں:۔

"سید الطائفہ کی دوسری بڑی خوبی ان کی علمی شرافت، وسیع القلبی ہے۔ ان کی علمیت کے خلاف سب سے مؤثر نشتر مہدی حسن کے خطوط میں ملیں گے لیکن آپ مکاتیب مہدی اٹھا کر دیکھئے ان خطوط کے شروع میں تعریفی دیباچہ سید سلیمان کا لکھا ہے۔ اسی طرح شبلی کے انداز طبیعت پر پہلی ضرب اور نکتہ پرور ضرب "شبلی اور حالی کی معاصرانہ

---

[۵۱] اردو ادب علی گڑھ دسمبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۹۶ مرتبہ آل احمد سرور۔
[۵۲] معارف سلیمان نمبر صفحہ ۲۰

چشمک" والے مضمون میں لگائی گئی لیکن یہ مضمون سب سے پہلے سید سلیمان نے معارف میں شائع کیا۔ سید صاحب کی سیرت میں ایک پاکیزگی اور درویشی ہے جو شبلی کے کیرکٹر کا خم و پیچ نہیں۔"[1]

سید صاحب اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود خط کا جواب دینا اپنا اخلاقی فرض جانتے تھے مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا مسعود عالم ندوی سے خط و کتابت شروع ہوئی[2] تو آخر تک قائم رہی۔ یہی حال دوسرے علما و ادبا سے تعلقات کا ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں:۔

"آپ ہمیشہ خط کا جواب نہایت پابندی سے دیتے خواہ کبھی حالات کے اعتبار سے دیر ہی کیوں نہ ہو جائے۔"[3]

سید صاحب کی شخصیت جن مختلف التنوع عوامل سے پروان چڑھی ان میں ایک بڑا عنصر اُن کے انسانی پہلو کا تھا۔ پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی لکھتے ہیں:۔

"شکل و صورت، وضع قطع، چال ڈھال، بات چیت ہر اعتبار سے سید صاحب کی شخصیت بڑی دلآویز اور قابلِ احترام تھی۔ اُن کو دیکھ اور پاکر ایک طرح کی تقویت محسوس ہوتی تھی کہ وہ شفقت کریں گے، رسوا نہ کریں گے۔ اور جب تک ساتھ رہیں گے زندگی میں بڑائی اور حلاوت محسوس ہوگی۔"[4]

سید صاحب کی شخصیت کے ایک اور رُخ کی طرف بھی رشید صاحب نے بڑا لطیف اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

"سید صاحب میں ایک خوبی ایسی تھی جس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں یعنی مہمان ہو کر وہ میزبان کے ذوق و غصب کرکے اپنی ضیافت و حکم برداری میں نہیں لیتے تھے جیسا کہ اکثر نہایت درجہ سرگرم اور مخلص مہمان کیا کرتے ہیں یعنی خود ہر کھانا میزبان کے سامنے پیش کرتا اور اصرار کرتا کہ وہ ضرور کھائے اور نہ کھائے تو وجہ بتائے تو یہ

---

[1] موجِ کوثر ص۲۰۲ [2] مولانا دریابادی سے مسلسل چالیس سال اور مولانا ندوی سے اٹھائیس سال تک مستقل خط و کتابت رہی۔ [3] اُردو ادب ۔۹۰ [4] ہم نفسانِ رفتہ ص۱۰۴۔

تعزیت کی ریزولیوشن پاس کریں یا کوئی چورن تجویز کریں .... میں کسی آدمی کی
سیرت اور شخصیت کا اس سے بھی اندازہ لگاتا ہوں کہ وہ میزبان یا مہمان کی ذمہ داریوں
سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے اور کس حد تک دسترخوان کے آداب ملحوظ رکھتا
ہے .... میں نے سید صاحب کو میزبان اور مہمان دونوں حیثیتوں سے برتا ہے
اور دونوں اعتبار سے وہ میری میزان پر پورے اترے ہیں سید صاحب کی جو بڑائی
میرے دل میں ہے اس میں سید صاحب کی اس خوبی کا خاصہ اونچا درجہ ہے۔[۱]

ایک اور خوبی کی طرف یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ:-

"لباس، بستر، ساز و سامان صاف ستھرا اور سجل رکھتے تھے۔"[۲]

سید صاحب نے اپنے استاد سے جس اخلاص اور وفاداری کا معاملہ کیا تھا قدرتی طور سے
اس کی توقع وہ اپنے شاگردوں اور دوستوں سے بھی کرتے تھے، چنانچہ مولانا مسعود عالم ندوی
کو لکھتے ہیں:-

"آپ کو معلوم ہے، میں نے استاد مرحوم کے ساتھ جس طرح ظاہری و معنوی خلافت
کی اور ان کی رائے کے آگے اپنی رائے کو فنا کر دیا تھا ایسی ہی توقع مجھے اپنے عزیزوں
اور رفیقوں سے بھی ہو تو تعجب نہیں۔"[۳]

شاہ معین الدین احمد ندوی کو تحریر فرماتے ہیں:-

"آپ سے ایک فرمائش کو جی چاہتا ہے جس طرح میں نے اور مولوی عبد السلام
صاحب نے حضرت الاستاذ کی ایک ایک تحریر کو زندہ کیا آپ صاحبان میرے
مضامین و مقالات کو بہ ترتیب جمع کرتے کہ اب میری زندگی ان ہی اوراق سے
عبارت ہے۔ ماہ صفر کو میری عمر قمری حساب سے انہتر سال کی ہوگی۔ رہے نام اللہ کا۔"[۴]

انہی شاہ صاحب کو ایک دوسرے گرامی نامہ میں لکھتے ہیں:-

---

[۱] ہم نفسانِ رفتہ صفحہ ۲۴۶، ۲۴۷ [۲] ایضاً صفحہ ۲۴۴ [۳] مکاتیب سید سلیمان ندوی صفحہ ۱۴۰
[۴] مکتوب نمبر ۳ معارف فروری ۱۹۵۵ء

"حقیقت یہ ہے کہ اس عمر میں جب قویٰ مضمحل ہو رہے ہوں خلف رشید کی طلب بہت بڑھ جاتی ہے اور اب وہ کیفیت سمجھ میں آتی ہے جو مولانا شبلی مرحوم اور مولانا حمید الدین مرحوم کی دیکھی تھی کہ بعد کے کام کے لئے صحیح جانشین کا تصور ان پر بہت غالب تھا"[1]

دیکھئے سید صاحب کے اخلاف واحباب ان کی یہ عزیز خواہش کب پوری کرتے ہیں؟

(تمام شد)

---

[1] مکتوب نمبر ۲ معارف فروری ۱۹۵۰ء
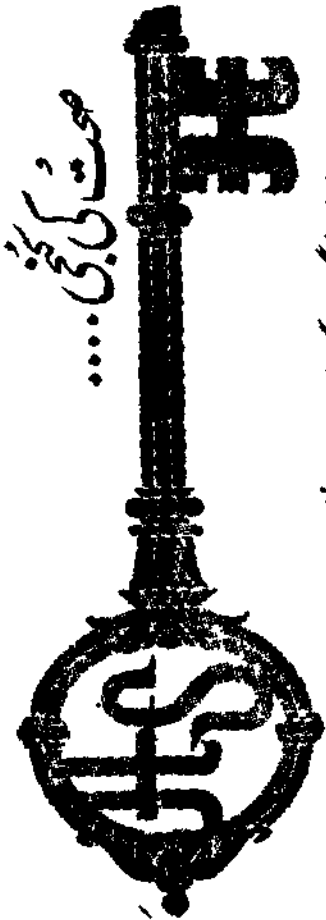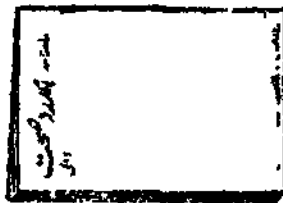
جب خدا کا کنبہ قحط سے دوچار ہو؟

اسلامی تاریخ اور اسلام کی تعلیم!

محمد منظور نعمانی

[آج ملک میں غذائی گرانی کا تقریباً وہی حال نظر آرہا ہے جو دوسری جنگ عظیم کے نتیجہ میں رونما ہوا تھا۔ ذیل کا مضمون اسی زمانہ کی یادگار ہے جس کی اس وقت مکرر اشاعت ۔ سب معلوم ہوئی ——— نعمانی]

اب سے قریباً چار ہزار برس پہلے جبکہ بظاہر ایک عجیب و غریب "اتفاق" ہی کے طور پر اور فی الحقیقت خداوند قادر و قدوس کی بیچون و چگون قدرت اور شانِ "فعال لما یرید" کی جلوہ فرمائی کے نتیجہ میں حکومت مصر کی باگ سیدنا یوسف صدیق علیہ وعلیٰ آبائہ الصلوات والتسلیمات کے ہاتھ میں آگئی تھی اور مصری حکومت جبکہ انہی کے تحت اقتدار تھی، تو سنا ہوگا کہ اس زمانہ میں مصر میں ایک شدید قحط پڑا تھا جو سات سال تک مسلسل رہا تھا، ان سات سالوں میں سرزمین مصر بارش اور پیداوار سے بالکل محروم رہی اور خشکی کا اثر یہاں تک پڑا کہ دودھ دینے والے جانوروں کے تھن بھی خشک ہوگئے، رسل و رسائل کے جو ذرائع اور حمل و نقل کے جو وسائل آج انسان کے ہاتھ میں ہیں جن کے ذریعہ ہر قسم کی ضروریاتِ زندگی اور سامانِ معیشت کی درآمد برآمد ایک ملک سے دوسرے ملک کو بہ آسانی ہو سکتی ہے۔ اس وقت انسان ان سے بھی تہی دست تھا۔ ایسی حالت میں جس ملک پر سات سال تک اتنا سخت قحط مسلط رہے وہاں کے آدمیوں پر جو کچھ بھی نہ گزر جائے اور جتنے بھی ان میں سے بھوکوں نہ مر جائیں بعید از قیاس نہ ہوگا ——— لیکن سیدنا یوسف صدیق کی خدا ترسی مخلوق خدا کی سچی ہمدردی اور رعیت کی راحت رسانی کے متعلق اپنی حاکمانہ ذمہ داریوں کے احساس کے ساتھ ان کی خداداد خوش تدبیری اور مآل اندیشی نے مل جل کر ایسا نظم قائم کیا کہ نہ صرف قلمرو مصر کے رہنے والوں کو، بلکہ آس پاس کے دوسرے قحط زدہ ملکوں کے باشندوں کو بھی بلا امتیاز ملک و نسل اور بلا لحاظ

مذہب و ملت خوش حالی اور رحمت کے سالوں کی طرح ہی غلہ ملتا رہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت صدیقی کے دور میں ایک دفعہ سخت قحط پڑا جس نے بہت سے بندگان خدا کو فقر و فاقہ کی مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ حضرت عثمان ذوالنورین اس وقت مدینہ کے درجہ اوّل کے تاجروں میں تھے اور آج کل کی اصطلاح میں سمجھئے کہ اس وقت کی چھوٹی سی اسلامی حکومت کے گویا وزیر مال بھی تھے، غلہ سے لدے پھندے آپکے ایک ہزار اونٹ شام سے آئے، مدینہ کے غلّہ فروشوں کو جیسے ہی اس مال کی آمد کی خبر ہوئی وہ خریداری کے لئے حضرت عثمان کی خدمت میں پہونچے بھاؤ تاؤ شروع ہوا، سبنے اپنی اپنی بولی بولی لیکن حضرت عثمان برابر یہی کہتے رہے کہ مجھے اس سے زیادہ ملتا ہے، آخر میں مدینہ کے ان سوداگروں نے کہا کہ مدینہ کے دوکاندار توسب یہاں موجود ہیں اور سب اپنی اپنی بولی بول چکے اور اپنے اپنے اندازہ کے مطابق سب ہی قیمت لگا چکے، آخر اس سے زیادہ دام کون لگا رہا ہے؟

حضرت عثمان نے کہا کہ وہ اللہ ہے جس کا وعدہ ایک کے بدلہ دس یا اس سے بھی زیادہ دینے کا ہے، تم سب گواہ رہو کہ میں نے یہ سارا غلہ اُس کے لئے اور اسی کے حساب میں ناداروں غریبوں اور حاجتمندوں کو دیدیا، نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عثمان کے ان ایک ہزار اونٹوں نے مدینہ کے غربا و فقرا کی ساری پریشانی اس وقت کی دور کردی۔

سیدنا فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں بھی ایک سال عرب بھر میں سخت قحط پڑا تھا جس کا نام ہی تاریخ میں "عام الرمادہ" ہے۔ حضرت عمر نے خلق خدا کو اس قحط کی مصیبت سے بچانے کے لئے ایک طرف تو شام اور مصر سے غلہ منگوانے کا انتظام کیا، (چنانچہ حضرت ابوعبیدہ نے جو اس وقت شام کے حاکم اعلیٰ تھے چار ہزار اونٹ غلّے سے لدوا کر بھیجے اور مصر کے حاکم اعلیٰ عمرو بن عاص نے غلہ کی بیس کشتیاں بحری راستہ سے روانہ کیں) دوسری طرف آپنے یہ کیا کہ بیت المال (سرکاری خزانہ) میں اس وقت جتنا کچھ روپیہ جمع تھا آپ نے وہ سب مدینہ کے ناداروں اور غریبوں میں تقسیم کرا دیا اور بیت المال کو بالکل خالی کر دیا جس کا نتیجہ

رہا کہ خلق خدا فاقوں مرنے کی مصیبت سے بچ گئی اور اللہ کے بندے قحط کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہے۔

یہ سب کچھ تو آپ نے عام پبلک اور عام رعایا کے لئے کیا، لیکن دُنیا حیرت میں رہ جائے گی جب اس کو یہ معلوم ہوگا کہ خود فاروق اعظم نے اس قحط کے زمانہ میں گھی، گوشت اور گیہوں تک کا استعمال قطعی ترک کر دیا تھا، کیونکہ اس وقت پبلک کے غریب طبقہ کو یہ چیزیں عام طور سے میسر نہ تھیں، اس زمانہ میں آپ کی اپنی غذا جَو کی روٹی ہوتی تھی جس کے ساتھ بجائے گھی کے کبھی کبھی زیتون کا تیل استعمال کیا جاتا تھا، طبیعت اس غذا کو آسانی سے قبول نہ کرتی تھی جس کی وجہ سے گاہ گاہ معدہ میں تکلیف بھی ہو جاتی تھی۔ ایک دن آپ نے اپنے نفس سے خطاب کر کے فرمایا کہ جب تک اللہ تعالیٰ اپنے عام بندوں سے اس قحط کو دور نہ فرما دے گا تجھ کو اس غذا کے سوا کچھ نہ مل سکے گا۔

ناقلین آثار کا بیان ہے کہ اس قحط میں فاقوں کی کثرت اور ناموافق غذا کے استعمال ہی سے آپ کا رنگ بھی سیاہ پڑ گیا تھا۔

بہرحال اپنے اوپر آپ نے ہر قسم کی مصیبت جھیلی اور اپنے معیار زندگی اور اپنی خوراک کو اپنے ادنیٰ درجہ کے غریبوں اور فقیروں کے درجہ پر اُتار لیا لیکن عام رعایا بالخصوص اس کے ناداروں اور غریبوں کو قحط کی تباہ کاریوں سے بچانے کے لئے سب کچھ کیا یہاں تک کہ سارا سرکاری خزانہ ہی ان پر تقسیم فرما دیا۔ ورنہ عرب جیسے غیر زرعی اور دنیا سے کٹے ہوئے خطہ کا ایسے سخت قحط میں جو حال ہوتا اور وہاں کے باشندوں پر جو کچھ گزرتی اس کا اندازہ ہر ایک کر سکتا ہے۔

یہ تین مثالیں ہیں اللہ کے صالح بندوں کے طرز حکومت اور ان کے طریقہ جہاں بانی کی۔ اور عوام کے غذائی مسئلہ کے بارہ میں ان کے احساس ذمہ داری کی۔

موجودہ صورت حال

خدا کے فضل سے ہمارے ملک میں اس وقت قحط نہیں ہے، پیداوار جیسی ہمیشہ ہوتی تھی بحمداللہ ویسی ہی یا اس سے کم و بیش گزشتہ چند سالوں میں بھی ہوتی رہی ہے۔ اسکے علاوہ لاکھوں ٹن غلہ

دوسرے ملکوں سے آتا رہا ہے اور آرہا ہے لیکن غلہ کی تجارت کے اجارہ داروں کی ہوس اور نظام حکومت کے ڈھیلے پن نے باہم مل کر صورت حال ہزار قحطوں سے بدتر کر دی ہے۔ اللہ کی پناہ مہینوں سے[1] گیہوں بازار میں قریباً ایک سیر مل رہا ہے قریب قریب یہی حال چاول کا ہے۔

ذرا سوچئے! ہم میں کتنے گھر ایسے ہیں جن میں میاں بیوی اور اللہ کے دیئے دو دو چار چار بچے بھی ہیں، اور آمدنی بس پچاس ساٹھ روپئے ماہوار یا اس سے بھی کم! ظاہر ہے کہ بحالت موجودہ ایسے گھرانوں میں دن رات کے آٹھ پہروں میں ایک وقت کے لئے بھی پورا کھانا نہیں جڑ سکتا ہوگا۔ اللہ ہی جانتا ہے۔ وہی جان سکتا ہے کہ ہمارے ہزاروں لاکھوں ایسے غریب بھائیوں کے دن رات آج کل کس طرح کٹتے ہوں گے، بھوک سے نڈھال بیوی کی اُداس صورت دیکھکر غیرتمند شوہروں پر کیا گزرتی ہوگی، پھر دن رات میں کئی کئی دفعہ معصوم بچوں کا بلکنا دیکھ دیکھ کر ماں باپ کے دلوں کا کیا حال ہوتا ہوگا، پھر ان المناک حالات سے کسی ایک کی ڈبڈباتی آنکھیں دوسرے کے دل پر کیا قیامت ڈھاتی ہوں گی؟

یقیناً ہمارے ناظرین میں سے اکثر کو اندازہ ہوگا کہ یہ کوئی افسانہ نہیں ہے بلکہ وہ تحقیقی حالات ہیں جن سے لاکھوں بندگان خدا آج دوچار ہو رہے ہیں، العظمۃ للہ! کیا سخت وقت ہے اُن بچارے شریف اور باغیرت غریبوں کے لئے جو اپنی فطری غیرت اور عزت نفس کے باعث کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہو سکتے، بلکہ کسی سے اپنی یہ حالت زار کہہ بھی نہیں سکتے۔

ان مصائب کا صحیح مداوا تو جب ہی ہو سکتا تھا کہ حکومت کا نظام کسی "یوسف" کسی "ابوبکر" کسی "عمر" یا کسی "عثمان" کے ہاتھ میں ہوتا لیکن اپنے اور دنیا کے موجودہ حالات میں تو اس کی آرزو کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ ــــــ اس لئے اب جو کچھ ذمہ داری ہے وہ ہم ہی جیسے لوگوں کی ہے جو اللہ کی عنایت سے خود زیادہ حاجتمند نہیں ہیں اور اپنے غریب ترُ بھائیوں کی کچھ تھوڑی بہت مدد کسی نہ کسی طرح سے کر سکتے ہیں۔

اس گئی گزری حالت میں بھی ہم میں بہت زیادہ نہ سہی، پھر بھی ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ابھی موجود ہے جن کے ذرائع آمدنی ان کی عام ضروریات سے زیادہ ہیں اور اسلئے انہیں

---

[1] یاد رہے کہ یہ تیس برس پہلے کا زمانہ ہے۔

بھی خاصی بسراوقات کے علاوہ ان کے پاس کم یا بیش کچھ فاضل سرمایہ بھی رہتا ہے ــــــ ان کے علاوہ ایک بہت بڑی تعداد ہم میں بحمد اللہ ابھی ایسے لوگوں کی بھی ہے جو اگرچہ اصطلاحی سرمایہ دار، دولتمند تو نہیں ہیں لیکن خوش حالی کے ساتھ گزارا کرتے ہیں اور ان کے حالات میں اتنی گنجائش ہے کہ اپنے مصارف میں کچھ تخفیف کرکے اپنے گزارہ سے کچھ بچا بھی سکتے ہیں۔

اس نازک وقت میں حسب حیثیت ان دونوں طبقوں کا خصوصی فرض ہے کہ ان کے عزیزوں، قریبوں، ان کے پڑوسیوں، اور ان کی بستی کے رہنے والوں میں جو بھی حاجتمند ان کے علم میں ہوں اور جن لوگوں کے متعلق بھی وہ یہ جانتے ہوں کہ ان کی آمدنی ان کے گزارہ کے لئے کافی نہیں ہو سکتی، جس طرح اور جتنی بن پڑے وہ ان کی مدد کریں اور ان کا کچھ بار اپنے ذمہ لیں۔

یوں تو ہر وقت اور ہر زمانہ کے صدقہ میں اللہ پاک کے یہاں بڑا اجر ہے لیکن بالخصوص ایسے سخت وقت میں تو اس کی قدر و قیمت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے جیسا کہ قرآن مجید کی آیت اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ سے معلوم ہوتا ہے۔

اس ناچیز کو تو یقین ہے کہ اس وقت اللہ پاک کی رضا حاصل کرنے، اس کے قہر و غضب سے بچنے، آتشِ دوزخ سے رہائی اور داخلۂ جنت کا استحقاق پیدا کرنے کا ایک بہترین ذریعہ اللہ کے حاجتمند اور نادار بندوں کی ہمدردی و غمخواری اور ان کی امداد و اعانت ہو۔ اس کارِ خیر کے لئے قرآن مجید اور احادیث نبوی کے ذخیرہ میں جو ہزارہا ترغیبات وارد ہوئی ہیں، اپنے ناظرین کی ترغیب کے لئے ان میں سے چند یہاں بھی درج کی جاتی ہیں۔ اللہ کرے کہ قارئین کرام کے دل ان آیات و احادیث سے متاثر ہوں اور اس باب میں اپنا فرض ادا کرنے کی توفیق ہم سب کو ملے۔

راہِ خدا میں دینے کی تاکید و ترغیب قرآن میں

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا	اے ایمان والو! ہمارے دیئے ہوئے دھن دولت میں
رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ	سے (نیکی کی راہوں میں) خرچ کرو اس یوم الفصل
لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ	اور یوم الجزا کے آنے سے پہلے جبکہ نہ کسی قسم کی
(بقرہ ۳۴)	

خرید و فروخت ممکن ہوگی اور نہ دوستی اور یعنی سفارش سے ہی کام چل سکے گا۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (منافقون ع ۲)

اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے (نیکی کی راہوں میں) خرچ کر لو اس سے پہلے کہ آدبائے تم میں سے کسی کو موت پھر اس وقت وہ حسرت و افسوس سے کہنے لگے کہ خداوندا! کیوں تو نے مجھے تھوڑی مہلت اور نہ دی کہ میں کچھ صدقہ و خیرات کرتا اور نیکوں میں ہو جاتا اور فیصلہ ہو چکا ہے کہ) اللہ ہرگز کسی کو (ایک لمحہ کی بھی) مہلت نہ دیگا جب اس کا وقت آجائے گا اور اللہ پاک خوب باخبر ہو تمھارے عملوں سے.

وعدہ و بشارت!

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (بقرہ ع ۳۶)

جو لوگ راہ خدا میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان (کے اس عمل) کی مثال ایک ایسے دانہ کی سی ہے جس سے سات بالیں پیدا ہوئی ہوں اور ہر بال میں سو سو دانے ہوں اور اللہ بڑھا دیتا ہے جس کے لئے چاہتا ہو وہ گنجائش و کشائش رکھنے والا ہے اور علیم کل ہے (تو اپنے کمال علمی سے وہ جانتا ہے کہ کون میری راہ میں صرف میرے ہی لئے اور اخلاص سے خرچ کرتا ہے ——— اور اس کی بے پناہ وسعت و گنجائش کی وجہ سے ایک دانہ کے بدلہ میں سات سو دانے دے دینا یا اس پر بھی اضافہ کر دینا اس کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں۔)

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (لیل ع ۱)

اور دوزخ کی آگ سے وہ پاکباز اور پرہیزگار بچایا جائیگا جو پاکیزگی کیلئے (راہ خدا میں) اپنا مال دیتا ہو۔

صدقہ و خیرات کرنے والے گویا خدا کو قرض دیتے ہیں

راہ خدا میں خرچ کرنے والوں کی ایک بہت بڑی فضیلت یہ ہے کہ اللہ پاک نے ان کے صدقات کو گویا اپنے اوپر قرض قرار دیا ہے اور خود کو ان کا مقروض بنا کر ان کا درجہ بلند کیا ہے یقیناً انسان کے لیے اس سے زیادہ کسی بلند مقام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ (حدید ع۲)

اللہ کے جو بندے اور بندیاں صدقہ کرتے ہیں اور اللہ کو قرض دیتے ہیں اُن کیلئے بہت کچھ بڑھایا جائیگا اور انکو عزت والا صلہ ملیگا۔

کہیں حکم کی صورت میں ارشاد ہے :۔

وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (مزمل ع۲)

اور اے اللہ کے بندو! اللہ کو قرض حسن دو۔

کہیں خود سوالی بن کر ترغیبی انداز میں صدا دی جاتی ہے :۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً (بقرہ ع ۳۲)

کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے تو اللہ اسکو بہت گنا کر کے دے گا۔

راہ خدا میں خرچ نہ کرنیوالوں کو نہایت دردناک اور لرزہ خیز عذاب کی وعید

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝ (توبہ ع ۵)

اور جو لوگ سونے اور چاندی (مال و دولت) کو سمیٹ سمیٹ کر رکھتے ہیں اور راہ خدا میں اس کو خرچ نہیں کرتے ہیں۔ اُن کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دی جائے جس دن کی اس مایہ کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا۔ پھر اس سے ان کی پیشانیاں ان کی کروٹیں ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی (اور

کہا جائے گا) یہ ہے تمھارا وہ مال جسکو تم نے
اپنے ہی لیے سینت سینت کے رکھا تھا، لو
اب اپنے اس اندوختہ کا مزہ چکھو۔

چند احادیث نبویہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ اَنْفِقْ یَا ابْنَ اٰدَمَ اُنْفِقْ عَلَیْکَ۔ (بخاری مسلم مشکوٰۃ)

حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہو کہ آدم کے فرزندو! تم میری راہ میں خرچ کرو میں تمکو وسعت سے عطا کیے جاؤنگا

حضرت انس سے مروی ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِیُٔ غَضَبَ الرَّبِّ وَتَدْفَعُ مِیْتَةَ السُّوْءِ (ترمذی مشکوٰۃ)

صدقہ اللہ کے غضب اور اسکے قہر و جلال کی آگ کو ٹھنڈا کرتا ہو اور بُری موت کو دور کرتا ہو۔ (یعنی صدقہ و خیرات کرنیوالا بندہ بری موت نہیں مرتا بلکہ موت کے وقت اس پر رحمت و مقبولیت کے آثار ہوتے ہیں اور یہ اس عاجز کا مشاہدہ بھی ہو)

مرثد بن عبداللہ بعض صحابۂ کرام سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے سنا۔

اِنَّ ظِلَّ الْمُؤْمِنِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ صَدَقَتُهٗ۔ (مسند احمد مشکوٰۃ)

قیامت کے دن مومن کے سر پر اس کے صدقہ کا سایہ ہوگا۔

ایک اور حدیث میں عقبہ بن عامر سے مروی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِیُٔ عَنْ اَهْلِهَا حَرَّ الْقُبُوْرِ وَاِنَّمَا یَسْتَظِلُّ الْمُؤْمِنُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْ ظِلِّ صَدَقَتِهٖ

صدقہ قبر کی گرمی کو ٹھنڈا کرے گا اور مومنین قیامت کے دن اپنے صدقہ ہی کے سایہ میں ہوں گے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ایما مسلم کسا مسلماً ثوباً علی عری

جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو کپڑا پہنائیگا

کساہ اللہ من خضر الجنۃ وایما مسلم اطعم مسلماً علیٰ جوع اطعمہ اللہ من ثمار الجنۃ وایما مسلم سقی مسلماً علیٰ ظمأ سقاہ اللہ من الرحیق المختوم۔ (رواہ ابوداؤد۔ مشکوٰۃ)	تو ڈھانکے گا اللہ تعالیٰ اس کو آخرت میں جنت کا سبز خلعت پہنائے گا، اور جو مسلمان اپنے بھوکے مسلمان بھائی کو کھانا کھلائے گا اللہ اس کو جنت کے میوے اور پھل عطا فرمائے گا، اور جو مسلمان کسی پیاسے مسلمان کو پانی پلائے گا اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی مہر بند شراب طہور سے سیراب فرمائے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

من کان فی حاجۃ اخیہ کان اللہ فی حاجتہ ومن فرج عن مسلم کربۃ فرج اللہ عنہ کربۃ من کربات یوم القیمٰۃ۔ (بخاری ومسلم۔ مشکوٰۃ)	جو شخص اپنے کسی بھائی کی کوئی حاجت پوری کرنے میں لگا رہے گا تو اللہ تعالیٰ اسکی ضروریات کی کفالت فرماتا رہیگا اور جو شخص اپنے بھائی کی کوئی مصیبت دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کی سخت ترین مصیبت اس سے دور فرمادیگا۔

ایک اور حدیث میں جو حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے وارد ہوا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

الراحمون یرحمھم الرحمٰن ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء (ابوداود۔ ترمذی۔ مشکوٰۃ)	دوسروں پر ترس کھانے والے اور رحم کرنے والے ہیں اللہ ان پر رحم کریگا۔ لوگو! تم زمین والوں پر رحم کرو تم پر رب السماء رحم فرمائے گا۔

ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے:۔

من لا یرحم لا یرحم	جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔

اللہ کے بندو!

اگر چاہتے ہو کہ رب العرش تم پر رحمت فرمائے اور اسکے غضب اور عذاب سے محفوظ رکھے جاؤ تو

(سکے دار رحمت (جنت) میں تم جگہ پاسکو تو بالخصوص اس سخت وقت میں کمزوروں، غریبوں
آفت رسیدوں پر رحم کھاؤ، ان کی امکانی مدد کرو، یقیناً انشاء اللہ خدا کی رحمت سے نوازے جاؤ گے
میرا اندازہ ہے کہ ہم میں سے جو شخص بھی آج تجسس کی نگاہ ڈالے گا تو اسکو معلوم ہوگا کہ ہمارے قریبی
قریبیوں اور دائیں بائیں رہنے والے پڑوسیوں میں اسوقت کتنے ہی ایسے ہیں جو از راہ عفت و غیرت
ہمارے سامنے دست سوال دراز نہیں کر سکتے ہیں، بلکہ اپنی مصیبت اور بپتا ہم سے چھپاتے ہیں
ہم انکی قابل رحم حالت سے واقف بھی نہیں ہو سکتے، حالانکہ ان کے بچوں پر مسلسل فاقے گزر جاتے
ہیں ـــــ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لیس المومن بالذی یشبع وجارہ	وہ شخص مومن نہیں ہے جو خود اطمینان سے پیٹ
جائع الی جنبہ (شعب الایمان، مشکوٰۃ)	بھر کے کھائے درانحالیکہ اس کا پڑوسی بھوکا
	ہو اور اس کے گھر میں فاقہ ہو۔

ہم میں سے جو صاحب اولاد ہوں وہ ذرا سوچیں کہ اگر خدانخواستہ ہماری اولاد پر ایسا برا وقت آپڑے
اور کوئی اللہ کا بندہ ان پر رحم کھا کے ان کی خبر لے اور ان کو فاقوں کی مصیبت سے بچالے
ہمارے دل میں اسکے لیے کتنی جگہ ہوگی ـــــ بلا تشبیہ جو لوگ اللہ کے غریب حاجت مند بندوں
و ساکین کی ایسے وقت میں خبر لیں، ان پر رحم کھائیں اور انکی مدد کریں یقیناً اللہ تعالیٰ ان کی قدر
کرے گا اور ان کے اس حسن عمل کا اچھا بدلہ دے گا۔

حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق	ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے تو جو شخص
الی اللہ من احسن الی عیالہ۔	اسکے کنبہ (یعنی اسکی مخلوق) کے ساتھ زیادہ
(شعب الایمان، مشکوٰۃ)	اچھا سلوک کرے وہی اس کو زیادہ پیارا ہے۔

اللہ کے غریب بندوں کو آج کل سب سے بڑی مصیبت بھوک کی ہے اور افضل ترین صدقہ بالخصوص
ان ایام میں بھوک کے مصیبت زدوں کو غلہ یا روٹی مہیا کر دینا ہے، حدیث میں وارد ہوا ہے:۔

افضل الصدقۃ ان تشبع کبداً	صدقات میں سب سے افضل یہ ہے کہ تم کسی بھوکے
جائعاً۔ (شعب الایمان، مشکوٰۃ)	کا پیٹ بھر وا دو۔

ایک ضروری ہدایت

اللہ پاک اپنے جن بندوں کو اس کارِ خیر کی توفیق دے ان کو یہ بات ضرور ملحوظ رہنی چاہیے کہ ان کی مدد اور ان کی خبرگیری کے سب سے زیادہ مستحق وہ شرم و حیا والے لوگ ہیں جو اپنی مصیبت اور فقر و فاقہ کو عام طور سے لوگوں پر ظاہر نہیں کر سکتے اور کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتے جو "فقیر" کہلانے والے گداگری کرتے ہیں اور مانگنا جن کا پیشہ ہو اُن کے متعلق تجربہ یہ یقین دلا چکا ہو کہ دراصل وہ حاجتمند نہیں ہوتے ہیں اور ان کو کبھی فاقہ کی نوبت نہیں آتی ہو۔ ایک حدیث میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے :-

ليس المسكين الذى ترده اللقمة واللقمتان والتمرة والتمرتان ولكن المسكين الذى لايجد غنى يغنيه ولا يُفطن به فيتصدق عليه ولا يقوم فيسأل الناس۔ (بخاری مسلم)	اصلی مسکین وہ نہیں ہو جو دروسے ایک لقمہ دو لقمے یا کھجور کا ایک دانہ دو دانے لے کر چلا جاتا ہے بلکہ حقیقی مسکین وہ ہیں جن کے پاس ان کی ضروریات پوری کرنے کے بقدر پیسے بھی نہیں، اور نہ ان کی ظاہری حالت ایسی ہو کہ آسانی سے کسی کو ان کی حاجتمندی معلوم ہو جائے اور ان کی مدد کر دی جائے۔ اور نہ وہ چل پھر کر لوگوں سے مانگ ہی سکتے ہیں (تو حقیقی مسکین ایسے ہی لوگ ہیں اور یہی ہماری امداد و اعانت کے اصلی مستحق ہیں)

اس لیے اپنی مدد و خبرگیری کے لیے ایسے ہی اللہ کے بندوں کی تلاش و جستجو کیجئے جو پیشہ ور سائل نہیں ہیں اور جو اپنی حاجات بھی ہر ایک سے نہیں کہہ سکتے۔

قرآن مجید میں ایسے باغیرت با عفت صحابہ حاجت کا ذکر بڑے پیار سے کیا گیا ہو، ارشاد ہے :-

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا۔	ان کے سوال نہ کرنے اور عفت کی زندگی گزارنے کی وجہ سے ناواقف ان کو ضرورتمند نہیں سمجھتا بلکہ انکو خوشحال گمان کرتا ہو مگر

تم ان کے چہروں میں افلاس و فاقہ زدگی کے آثار دیکھ کر ان کو پہچان سکتے ہو، وہ خود کسی کے

لگے (ہاتھ پھیلا کر اور اپنا حال زار بیان کر کے سوال نہیں کرتے ہیں۔

بہرحال مدد اور خبر گیری کے سب سے زیادہ مستحق اللہ کے ایسے ہی بندے ہیں اور آج کل اُجلے پوش شریفوں میں ایسے غریب حاجتمند بکثرت موجود ہیں، ہمارا فرض ہو کہ ہم انکی خبر لیں، اور اگر بالفرض ہم خود اس قابل نہیں ہیں تو کم از کم دوسروں سے اُن کی امداد کرانے میں سعی کریں، حدیث پاک میں ہے:۔

الساعی علی الارملۃ والمسکین کالمجاہد	بیوہ عورتوں اور حاجتمندوں کے لیے دوڑ
فی سبیل اللہ (بخاری مسلم مشکوٰۃ)	دھوپ کرنے والا ثواب میں راہ خدا میں جہاد

کرنے والے کے ہم رتبہ ہے۔

امید ہے کہ اللہ و رسول کے ارشاد ہی کی بنیاد پر یقین ہو کہ اس وقت اس سلسلہ میں جو فرض ہم آپ پر عائد ہوتا ہے اگر ہم سب نے اس کو ادا کیا اور اللہ کے کمزور و غریب بندوں کی مدد کی تو اللہ پاک ہماری آپ کی مدد کرے گا، آپ کے مصائب کو دور کرے گا، آپ پر دنیا و آخرت میں اپنی رحمت کے دروازے کھول دے گا۔ پھر پڑھیے اس آیت کو اور سنیے اللہ پاک کی اس اپیل کو:۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا	اے ایمان والو! ہم نے تم کو جو دولت دی ہے
رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ	اس میں سے ہماری راہ میں کچھ خرچ کرو قبل
لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ	اس کے کہ وہ یوم الحساب آجائے جبکہ نہ کوئی
وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔	خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی کام آئے

گی اور نہ کسی کی سعی سفارش سے ہی کام چل سکے گا اور خوب سمجھ لو کہ نہ ماننے والے ہی ظالم ہیں جو خود اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں جس کا برا نتیجہ وہ بھگتیں گے۔

آخر میں اس سلسلہ کی ایک حدیث قدسی اور پڑھ لیجئے:۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

ان اللہ تعالیٰ یقول یوم القیٰمۃ	اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بعض آدمیوں
یا ابن اٰدم مرضتُ فلم تعدنی	سے فرمائیں گے "اے ابن آدم! میں مریض
قال یا رب کیف اعودك و	ہوا تھا تو نے میری خبر نہیں لی، وہ عرض کرے گا
انت رب العٰلمین قال اما	آپ تو رب العالمین ہیں، آپ کی کیسی بیماری

عَلِمتَ ان عبدی فلانا مرض
فلم تعده اما عَلِمتَ انك لو عُدتَّه
لوجدتنی عنده یا ابن آدم
استطعمتك فلم تُطعِمنی قَال
یارَبِّ کیف اُطعِمك وانت ربّ
العٰلمین قال اَما عَلِمتَ انّه
استَطعَمَكَ عبدی فلان فلم تطعمه
اَما عَلِمتَ انك لو اطعمتَه لوجدتَّ
ذلك عندی یا ابن آدم استسقیتك
فلم تسقنی قال یا ربِّ کیف اسقیك
وانت رب العٰلمین قال استسقاك
عبدی فلان فلم تسقه اما انك
لو سقیته وجدت ذلك عندی
(رواہ مسلم۔ مشکوٰۃ)

اور کبھی میری عیادت وخبر گیری؟ ارشاد ہوگا
کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا
تھا تو نے اس کی خبر نہ لی، اگر تو اس کی عیادت
دیکھ بھال کرتا، خبر لیتا تو یقیناً مجھے وہاں
پاس پاتا، اور اے ابن آدم! میں نے تجھ
سے کھانے کا سوال کیا تھا تو نے مجھے کھانا
نہیں کھلایا" وہ عرض کرے گا آپ تو رب العالمین
ہیں آپ کو کھانا کھانے کی ضرورت کیا؟ اور
میں بھلا آپ کو کس طرح کھلا سکتا ہوں ارشاد
ہوگا "کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرے فلاں بندے
نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا تو نے اس کو
کھانا نہیں دیا، تجھے خبر نہیں کہ اگر تو اس کو
کھانا کھلاتا تو اپنے اس کھانے کو میرے
پاس پاتا اور میں تجھے اس کا بدلہ دیتا، پھر
ارشاد ہوگا اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا تو نے مجھے پانی نہیں پلایا" بندہ عرض کرے گا
خداوندا! آپ رب العالمین ہیں آپ کو پانی پینے کی کیا ضرورت) اور میں کس طرح آپ کو پلا سکتا
ہوں" ارشاد ہوگا "میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی طلب کیا تھا تو نے اسکو نہیں پلایا اگر
تو اس کو پلا دیتا تو اس کو میرے پاس پاتا"

مبارک اور خوش نصیب ہیں اللہ کے وہی بندے جو بیچارے بیماروں، آفت رسیدوں، اور
کھانے پینے کے حاجت مندوں کو دیکھ کر یہ حدیث پاک یاد کر لیا کریں اور اس کے مطالبہ کو پورا کرکے
اپنے اللہ کی رضا حاصل کریں!

وَبَشِّرْ عِبَادِيَ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ
وَأُولَٰئِكَ هُمْ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝

شمع نبوتؐ کا ایک پروانہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

ترجمہ ——— امۃ الرحمٰن کوثر

[حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا اتنا بڑا ذخیرہ اُمت کو بہم پہونچایا ہے کہ اس احسان کے بوجھ سے یہ اُمت کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ لیکن علم نبوت کے اس ذخیرہ کو جمع کرنے کی راہ میں حضرت ابوہریرہؓ نے کیا کیا مصیبتیں اٹھائی ہیں اس کا کچھ اندازہ ذیل کے مضمون سے کیا جا سکتا ہے جو مصری عالم عجاج الخطیب کی کتاب "ابوہریرہ ـ راویۃ الاسلام" سے ترجمہ کیا گیا ہے ——— مترجم]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حضورؐ کے اُن صحابہ میں سے تھے جن کی زندگی میں فقر و مسکنت کا پہلو بیحد نمایاں تھا لیکن فقر و عسرت کے سخت ترین لمحات میں بھی صبر کا دامن آپ کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا تھا۔ بعض اوقات بھوک کی شدت سے پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے۔ دن دن بھر اور رات رات بھر اس طرح بھوکے گزر جاتے کہ ایک دانہ بھی منھ میں نہ جاتا ——— اپنا حال بیان کرتے ہوئے خود فرماتے ہیں :۔

"میرا حال یہ تھا کہ جہاں کچھ میرے پیٹ میں پڑ جاتا حضور کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا (تاکہ آپ کے ارشادات سے مستفید ہو سکوں) یہی وجہ تھی کہ نہ میں خمیری روٹی کھا سکتا تھا، نہ عمدہ کپڑے پہن سکتا تھا، اور نہ ہی کوئی غلام یا باندی مجھے خدمت کے لیے میسر تھی (کیونکہ یہ باتیں کچھ کمانے کو چاہتی تھیں)۔

جب بھوک ستاتی تو اکثر یہ طریقہ اختیار کرتا کہ کسی صاحب سے قرآن کی کوئی آیت پڑھنے کی فرمائش کرتا، حالانکہ وہ آیت مجھے خود یاد ہوتی، مقصد یہ ہوتا تھا کہ اس طرح وہ صاحب مجھ سے اپنے ساتھ چلنے کو کہیں اور پھر شاید میری بھوک کا حال محسوس کرکے مجھ سے کھانے کو بھی کہیں (یعنی صاف صاف میں اپنی حاجت کسی کے سامنے نہیں رکھتا تھا)۔"

مزید فرماتے ہیں:-

"میں ان ستر اہل صفہ میں سے تھا جن میں سے کسی کے پاس پایا کاٹھا ایک چادر تک نہ ہوتی تھی۔ کوئی کملی یا ایک کپڑا جس کو وہ اپنی گردن میں باندھ لیتے تھے ان کا پورا لباس ہوتا، بھوک سے بھی پریشان رہتے تھے۔ نماز کے وقت کے علاوہ ان میں سے کوئی گھر سے نکل کر مسجد نبوی کا رخ کرتا تو اس کا واحد سبب بھوک ہوتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہاں اسی حال میں مبتلا کچھ اور لوگ مل جاتے تھے۔ ایک دن میں اسی حال میں نکل کر مسجد پہونچا تو کچھ لوگ ملے اور پوچھا ابوہریرہؓ! تم کو اس وقت کس چیز نے نکالا؟ میں نے کہا بس بھوک نے، کہنے لگے اللہ کی قسم ہم کو بھی بھوک ہی نے نکلنے پر مجبور کیا ہے (چنانچہ طے ہوا کہ چلو حضور کی خدمت میں چلیں) پس ہم سب اٹھ کر چلے اور حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے آپؐ نے دریافت کیا، اس وقت کیسے آئے ہو؟ عرض کیا یا رسول اللہ بھوک لائی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجوروں کا ایک طباق منگوایا، اور ہم میں سے ہر شخص کو دو دو کھجوریں دیں اور فرمایا:- یہ دو کھجوریں کھاؤ اور اس کے بعد پانی پیو۔ یہی دو کھجوریں تمھیں آج کے لیے کافی ہوں گی ـــــ (حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں) میں نے ایک کھجور کھالی اور دوسری اپنے دامن میں اٹھا کر رکھ لی حضورؐ نے دریافت فرمایا، ابوہریرہ! تم نے یہ کھجور کس کیلئے اٹھا کر رکھ لی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں نے یہ اپنی والدہ کے لیے رکھی ہے۔ آپ نے فرمایا، تم اس کو کھالو، ہم ان کے لیے بھی تم کو دو کھجوریں دیں گے۔ چنانچہ میں نے وہ کھجور بھی کھالی اور

حضورؐ نے مجھے والدہ کے لیے مزید دو کھجوریں عنایت فرمائیں "۔

اولاد بیشک ایسی ہی ہونی چاہیئے۔ سبحان اللہ، حضرت ابوہریرہ! آپ بحیثیت ایک بیٹے کے بھی کتنے اچھے تھے ——— آپ کو اکثر اتنی شدید بھوک کی تکلیف ہو جاتی تھی کہ منبر شریف اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے درمیان بیہوش ہو کر گر پڑتے تھے اور کوئی گذرنے والا آپ کو جنون زدہ سمجھ کر سینہ پر بیٹھ جاتا تھا، حضرت ابوہریرہ اس وقت سر اٹھا کر اس سے کہتے :-

" بھائی تم کو غلط فہمی ہوئی۔ یہ بھوک کی تکلیف ہے "

بعض وقت سیدھا بیٹھا نہ جاتا تو کہنی سے زمین پر ٹیک لگا کر نیم دراز ہو جاتے اور پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ :-

ایک دفعہ ایسے ہی میں بیٹھا ہوا تھا کہ ابو بکر گزرے تو میں نے ان سے قرآن کی ایک آیت کے متعلق کچھ معلوم کیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ اس بہانے اپنے ساتھ لے جائیں گے اور کچھ کھلا دیں گے۔ لیکن وہ یوں ہی گزر گئے، مجھے ساتھ نہیں لیا۔ ان کے بعد عمر گزرے انھوں نے بھی ایسا ہی کیا، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا، آپ نے میرے چہرے سے بھوک کا اندازہ فرما لیا، ارشاد ہوا ابوہریرہ! میں نے عرض کیا حضور حاضر ہوں۔ میں آپ کے ساتھ خانۂ اقدس میں پہونچا، آپ نے وہاں ایک پیالے میں دودھ رکھا ہوا پایا، اہل خانہ سے دریافت فرمایا یہ کہاں سے آیا ہے؟ جواب ملا کہ فلاں شخص نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔ مجھ سے فرمایا ابوہریرہ! اہل صفہ کے پاس چلے جاؤ اور سب کو بلا لاؤ ——— اہل صفہ اسلام ہی کے مہمان تھے۔ نہ ان کا گھر تھا اور نہ ان کے پاس مال تھا ——— جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی صدقہ آتا تو آپ اس کو ان کے پاس بھیج دیتے اور خود اس میں سے کچھ استعمال نہ فرماتے، اور جب آپ کے پاس کوئی ہدیہ آتا تو استعمال فرماتے اور اہل صفہ کو بھی شریک فرماتے ——— (حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں) اس وقت مجھے آپ کا ان لوگوں کو بلانے کے لیے بھیجنا کچھ گراں معلوم ہوا، میں نے سوچا میں تو اس

امید میں تھا کہ یہ دودھ مجھ ہی کو ملے گا، اور اسے پی کر کچھ جان آ جائے گی۔ یہ تھا سا دودھ تمام اہل صفہ میں بھلا کیا کرے گا ـــــ لیکن اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت تو ضروری ہی تھی، میں اہل صفہ کے پاس آیا (اور رسول اللہ کا پیغام پہونچایا) تمام اہل صفہ آ گئے ـ جب وہ سب بیٹھ گئے تو آپ نے فرمایا ابو ہریرہ! اس کو لو اور ان سب کو دو، میں ہر شخص کو دینے لگا، ان میں سے ہر شخص نے خوب سیر ہو کر پیا۔ حتیٰ کہ میں نے سب کو فارغ کر دیا، اور بقیہ رسول اللہ کے سامنے پیش کر دیا۔ آپ نے میری طرف سر اٹھا کر مسکراتے ہوئے فرمایا، اب ہم اور تم باقی رہے، میں نے عرض کیا جی ہاں حضرت! آپ نے فرمایا لو پیو، میں نے پیا۔ پھر فرمایا پیو، میں نے پھر پیا، آپ برابر فرماتے رہے کہ پیو اور میں پیتا رہا۔ یہاں تک کہ میں نے عرض کیا، قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، اب مزید گنجائش نہیں ہے۔ پس وہ باقی دودھ آپ نے لے لیا اور خود نوش فرمایا۔"

اس فقر و عسرت کے ساتھ ذرا حضرت ابو ہریرہ کی خودداری بھی دیکھئے ـــــ ایک مرتبہ کا واقعہ بیان فرماتے ہیں :-

"میں عمر بن خطاب کے پاس پہونچا۔ وہ نماز کے بعد کچھ تسبیحات پڑھ رہے تھے، میں ان کے پاس کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگا۔ جب وہ فارغ ہو گئے تو میں قریب گیا اور کہا مجھے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھا دیجئے (فرماتے ہیں) اس وقت میری اصل نیت کھانے کی تھی۔ انھوں نے مجھے آل عمران کی چند آیتیں پڑھا دیں۔ جب آپ گھر پہونچے تو مجھ کو دروازہ پر ہی چھوڑ کر اندر داخل ہو گئے۔ میں نے سوچا آپ شاید کپڑے بدلیں گے اور پھر میرے لیے کھانے کو کہیں گے۔ لیکن جب کافی دیر ہو گئی اور میں نے کچھ نہ پایا، تو واپس چل پڑا۔ سامنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے تھے۔ آپ نے مجھ سے کچھ گفتگو فرمائی اور پھر فرمایا ابو ہریرہ! یہ تمھارے منھ سے سخت بو کیسی ہے؟ میں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ میں بغیر افطار کے مسلسل روزے سے ہوں، اور کوئی

ایسی چیز میرے پاس نہیں ہے کہ میں اس سے افطار کرلوں. آپؓ نے فرمایا اچھا چلو.
میں گھر تک ساتھ چلا گیا. آپؓ نے اپنی ایک حبشن باندی کو پکارا، پھر ارشاد فرمایا. ذرا یہ
پیالہ اٹھاؤ. وہ پیالہ لے آئی. اس میں کچھ تھوڑا سا بچا ہوا کھانا تھا، شاید خود تھے
جس میں سے آپؓ نے تناول فرمایا تھا اور کناروں میں کچھ تھوڑا سا لگا ہوا رہ
گیا تھا. میں نے بسم اللہ کی اور سمیٹ سمیٹ کے کھانے لگا. یہاں تک کہ اسی سے
شکم سیر ہو گیا."

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اکثر فرماتے تھے:-

"میں نے یتیمی کی حالت میں پرورش پائی اور بحالت مسکینی ہجرت کی. میں بسرہ
بنت غزوان کے یہاں مزدوری کرتا تھا. میری اجرت کھانا اور سواری تھی. جب
میرے مالک کہیں ٹھہرتے تو میں ان کی خدمت کرتا اور جب سوار ہوتے تو حُدی
خوانی کرتا ___ پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ یہی بسرہ بنت غزوان میرے حبالۂ
عقد میں آگئیں."

امام التابعین سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ (۱۳ - ۹۴ھ) فرماتے ہیں کہ میں نے
حضرت ابوہریرہ کا یہ حال دیکھا کہ آپ بازار کا چکر لگاتے، پھر گھر واپس آتے اور فرماتے:
"کیا تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے" اگر گھر والے کہتے کہ کچھ نہیں ہے تو فرماتے بس میں
روزہ سے ہوں."

ان تنگ حالیوں کے باوجود آپ کا نفس کھانے کا حریص کبھی نہیں ہوا، اور کبھی آپ کے
نفس پر پیٹ کی طمع نے غلبہ نہیں پایا. ہمیشہ اتنے ہی پر اکتفا کرتے تھے جتنا کہ کم سے کم
آپ کے لیے کافی ہوتا. اگر آپ کے پاس پندرہ کھجوریں ایک ساتھ ہو جاتیں تو پانچ کھجوروں
سے افطار کرتے اور پانچ سحر میں کھاتے اور بقیہ پانچ کو افطار کے لیے رکھ لیتے. آپ پر فقر
کی آزمائشوں کا طویل زمانہ گزرا. یہاں تک کہ اللہ کی رحمت سے خوشحالی اور فارغ البالی کا دروازہ
آپ پر کھلا. اس وقت آپ پر شکر غالب ہوا، ہمیشہ اپنے ایام فقر کو یاد کرتے تھے. لوگوں کو اللہ کی
نعمتیں یاد دلاتے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے کی ترغیب دیتے تھے.

ایک دفعہ ایک جماعت کے پاس سے آپ کا گزر ہوا جن کے سامنے بھنی ہوئی بکری رکھی تھی۔ انھوں نے آپ کو کھانے کی دعوت دی تو آپ نے انکار فرما دیا اور کہا۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں دُنیا سے رخصت ہوئے تھے کہ جو کی روٹی بھی کبھی شکم سیر ہو کر نہیں کھائی تھی۔"

مضارب بن حزن کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ رات کو سفر کر رہا تھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک شخص تکبیر کہہ رہا ہے، جب میرا اونٹ اس کے قریب پہونچ گیا تو میں نے کہا یہ کون ہے ؟۔

جواب ملا۔ ابوہریرہ۔

میں نے کہا یہ تکبیر کیسی ؟۔

کہا شکر کی۔

میں نے کہا کس چیز پر ؟۔

کہا: "میں بسرہ بنت غزوان کا خادم تھا پھر ایسا زمانہ آیا کہ اللہ نے ان کے ساتھ میری شادی کرادی۔ اب وہ میری بیوی ہیں۔"

اس دور میں آپ کے یہاں جب کبھی مہمان آتے تو آپ اپنی والدۂ ماجدہ کے پاس آدمی بھیجتے کہ آپ کا بیٹا آپ کو سلام کہتا ہے اور عرض کرتا ہے کہ کچھ کھانے کے لیے بھیجیے۔ آپ کی والدہ طشت میں تین ٹکیاں رکھ کر اور تھوڑا سا روغن زیتون اور نمک ساتھ رکھ کر بھیجتیں جب آدمی ان مہمانوں کے سامنے اس کو رکھتا تو حضرت ابوہریرہ کے منھ سے تکبیر بلند ہوتی اور فرماتے:۔

"تعریف ہے اُس اللہ کے لیے جس نے یہ غذا بخشی۔ ایک وقت وہ تھا جب ہمارا کھانا صرف کھجور اور پانی ہوتا تھا۔"

اپنی خوشحالی کے زمانہ میں جب کبھی بڑھیا قسم کا لباس پہن لیتے تو اپنے آپ کو اٹھلاتا ہوا محسوس کرتے اور فوراً کہہ اٹھتے :۔ "واہ واہ! آج ابوہریرہ کتانی لباس میں اکڑ رہے ہیں حالانکہ میں نے اسے اس حال میں بھی دیکھا ہے کہ وہ منبر شریف اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے درمیان گر پڑتا اور کوئی آنے والا اسے دیکھ کر جنون زدہ سمجھتا ـــــ حالانکہ یہ صرف بھوک ہوتی تھی۔"

جزیرۂ قبرص میں اسلام کی سرگزشت

محمد خالد مسعود

قبرص کی سرزمین پر تاریخ اسلام کا سب سے پہلا قافلہ، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں اُترا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت فاروقؓ کے زمانے میں بازنطینی سلطنت کو جب پے درپے شکستیں ہوئیں اور بحیرۂ روم کا جنوبی حصہ اس کے قبضے سے جاتا رہا۔ تو اسے مشرقی حصے کی حفاظت کیلئے بحیرۂ روم کے شمالی علاقے کو زیادہ مستحکم کرنا پڑا۔ چنانچہ قسطنطنیہ پر اس کی پوری توجہ مرکوز ہوگئی۔ امیر معاویہؓ اس علاقے کے گورنر ہوئے تو انھیں بازنطینی حکومت کی اس جنگی پالیسی پر غور کرنے کا موقع ملا۔ اسلامی سلطنت کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے ضروری تھا کہ بحیرۂ روم کی طرف سے ہونے والے حملوں کا سدباب کیا جائے۔ قبرص کا جزیرہ بازنطینی سلطنت کا بہت اہم موثر حربہ تھا۔ امیر معاویہ نے حضرت عمرؓ سے قبرص پر حملے کی اجازت چاہی۔ لیکن آپ نے اجازت نہ دی۔ آخر حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ۲۸ھ میں ایک طاقتور بحری بیڑہ لے کر حملہ آور ہوئے۔

اس حملے میں حضرت امیر معاویہ کے ساتھ جہاں بہت سے جلیل القدر صحابہ ابوالدرداءؓ، ابوذر غفاریؓ، عبادہ بن الصامتؓ اور مقدادؓ شامل تھے وہاں عورتیں بھی کافی تعداد میں شرکت کررہی تھیں۔ جن میں حضرت عبادہ بن الصامت کی اہلیہ حضرت ام حرام بنت ملحان، حضرت معاویہ کی اہلیہ فاختہ بنت قرظہ اور ان کی بہن کنوہ بنت قرظہ کے نام معروف ہیں۔ حضرت ام حرامؓ اس وقت تک ضعیف العمری کو پہونچ چکی تھیں، لیکن بحری جہاد میں شرکت اور شہادت کی جو پیشگوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لیے فرمائی تھی اسے پورا کرنے کا جذبہ پیرانہ سالی کے باوجود کشاں کشاں لے گیا۔ جب جہاز کنارے پر لگا تو حضرت اُم حرام کے لیے نچر لایا گیا لیکن نچر

بک گیا اور آپ گرتے ہی شہید ہوگئیں۔ اسی جگہ آپ کو دفن کر دیا گیا۔ آپ کا مزار لارناکا کی خوبصورت نمکین جھیل کے کنارے موجود ہے جسے لوگ "حالا سلطان ٹیکے" (سلطان کی خالہ کا تکیہ) کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی حسین مسجد ہے جو سمندر میں دور سے ہی نظر آنے لگتی ہے۔ آج بھی بحیرۂ روم میں جہاز جب قبرص کے نزدیک پہونچتے ہیں تو مسلمان ملاح جھنڈے جھکا دیتے ہیں اور خود بھی فرطِ عقیدت سے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ حضرت کتوہ بنت قرظہ بھی اسی حملے میں شہید ہوئیں۔

جنگی مہموں میں عورتوں کی شرکت اس بات کا ثبوت ہے کہ عرب جہازرانوں کے لیے سمندر "بازی گاہ" تھے۔ بحری سفر کے شادمان کے شوق کو تیز کرتے تھے، موجوں سے آویزش اور طوفان سے کھیلنا ان کا معمول تھا۔ حبشہ کی طرف ہجرت کا سفر ہو یا قبرص کی جنگی مہم، عورتیں ان کی بحری مہمات میں برابر شریک ہوتی تھیں۔

قبرص فتح ہوا اور خراج کی شرط پر صلح ہوئی، معاہدہ طے پایا کہ قبرص بازنطینی اور اسلامی سلطنت کے درمیان غیر جانبدار رہے گا۔ لیکن سنہ ۳۲ھ میں انھوں نے مسلمانوں کے خلاف بازنطینیوں کی مدد کی۔ حضرت معاویہ اگلے سال پانچ سو جہازوں کا بیڑہ لے کر حملہ آور ہوئے قبرص نے صلح کی درخواست کی جسے حضرت معاویہ نے منظور کر لیا۔ مسلمانوں کی خاصی تعداد تقریباً (۱۲۰۰۰) شام سے یہاں آکر آباد ہوگئی۔ اور حضرت معاویہؓ نے فوج کا ایک دستہ بھی متعین کر دیا۔

حضرت معاویہ کی وفات کے بعد قبرص نے مطالبہ کیا کہ مسلمان فوج کو واپس بلا لیا جائے یزید بن معاویہ نے فوج کو واپس بلا لیا۔ فوج کے جاتے ہی قبرصی باشندوں نے مسلمان آبادی پر حملہ کر دیا۔ اس قتل و غارتگری میں مسلمانوں کی اکثریت شہید ہوئی۔ کچھ لوگ شام واپس آگئے اکثر مسجدیں گرا دی گئیں۔

عبدالملک خلیفہ ہوئے تو قبرص ابھی تک مسلمانوں کے خلاف سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ خلیفہ نے قبرص سے معاہدہ کی تجدید کا مطالبہ کیا۔ بازنطینی سلطنت قبرص کو غیر جانبدار رکھنے کے حق میں نہیں تھی چنانچہ بازنطینیوں نے پوری کوشش کی کہ قبرص کو مسلمانوں سے الگ کرا دیا جائے۔ لیکن یہ خواب پورا نہ ہو سکا اور قبرص نے خراج میں اضافہ منظور کرتے ہوئے صلح کر لی۔ ولید ثانی کے دور میں ۱۲۵ھ میں قبرص کا مستقل طور پر شام سے الحاق کر دیا گیا۔

اس زمانہ میں اُموی حکومت کا آفتاب روبہ زوال تھا۔ خانہ جنگیوں کی وجہ سے باہر کی طرف توجہ ختم ہوگئی۔ اُموی حکومت کے کھنڈرات پر عباسی سلطنت قائم ہوئی۔ لیکن جب تک اس کو استحکام حاصل ہوتا بازنطینی سلطنت اپنا قبضہ بحال کر چکی تھی۔ قسطنطنیہ اس کی قوت کا مرکز تھا۔ صقلیہ اور قبرص کو شطرنج کے مہروں کے طور پر استعمال کر رہی تھی۔ اس کی وجہ سے اسلامی سلطنت کی شمالی سرحدیں ہمیشہ خطرے میں رہتی تھیں۔

ہارون الرشید کے عہد میں حمید بن معیوف ہمدانی کو شام اور بحیرۂ روم کے علاقے کے فوجی اختیارات ملے تو اس نے حالات کا نئے سرے سے جائزہ لیا۔ اس کی نظریں بھی قبرص پر جا رکی گئیں۔ دارالخلافت سے اجازت پاکر اس نے ۸۰۶ء میں قبرص پر حملہ کیا۔ قلیل محاصرے کے بعد قبرص فتح ہوگیا۔ ان دنوں قبرص میں کلیسا کو کافی اقتدار حاصل ہو چکا تھا۔ اسقف گورنر کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اسقف نے صلح کے معاہدے کی پیش کش کی جسے ہارون الرشید نے منظور کر لیا۔

قبرص سارے عباسی دور میں غیر جانبدارانہ پالیسی پر قائم رہا اور کوئی بحران پیدا نہیں ہوا۔ عباسی سلطنت کے اواخر میں جب خلافت کمزور ہونے لگی تو بازنطینی اثر و رسوخ بحال ہوگیا اور اس جزیرے کی طرف اسلامی سلطنت کی توجہ بہت کم ہوگئی۔ مجموعی طور پر قرونِ وسطیٰ کی قبرصی تاریخ صلح و معاہدہ کی تاریخ ہے۔

(۲)

گیارھویں صدی سے تیرھویں صدی عیسوی تک، قبرص کا واسطہ زیادہ تر مملوک سلاطین سے رہا۔ رچرڈ اول شاہ انگلستان جب صلاح الدین ایوبی کے مقابلے میں صلیبی جنگوں میں شرکت کے لیے آیا تو راستے میں بازنطینی حکمراں سے جھڑپ ہوگئی۔ رچرڈ نے حملہ کر کے قبرص فتح کر لیا اور ۱۱۹۲ء میں اسے فرینک خاندان کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس طرح قبرص سے بازنطینی اقتدار کا خاتمہ ہوا۔ لیوسیناں (فرینک) دورِ حکومت میں پطرس اول کا زمانہ قابلِ ذکر ہے۔ اس نے اسلامی اثر و رسوخ ختم کرنے کی سر توڑ کوشش کی جس میں کسی حد تک وہ کامیاب بھی ہوگیا۔ اسی حوصلے پر پطرس اول کے جانشین شاہ جانوس نے مصر کے مملوک سلاطین کو مکمل طور پر ختم کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ چند ایک بحری جھڑپوں کے بعد ۱۴۲۶ء میں بارس بی، مملوک سلطان نے

۱۸۰ جہازوں کا بیڑہ لے کر قبرص پر حملہ کر دیا۔ لارناکا کے ضلع میں لڑائی ہوئی جس میں جانوس کو شکست فاش ہوئی۔ یہ تاریخ قبرص کی سب سے تباہ کن شکست تھی۔ جانوس گرفتار ہوا اور آٹھ ماہ مملوک سلطان کی قید میں رہا، آخر خراج کا وعدہ کر کے رہا ہوا۔ اس کے بعد مملوک کو قبرص کی طرف سے مکمل اطمینان رہا اور لیوسینان دور کے آخر تک کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔

پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ترک ابھر رہے تھے اور یورپ کی ساحلی سلطنتوں کے لیے بہت بڑا خطرہ بنتے جا رہے تھے۔ اس خطرے کو سب سے پہلے وینس کے حکمراں سینوری نے محسوس کیا۔ ترکوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لیے اس کی نظر بھی قبرص پر پڑی۔ قبرص کی کمزور حکومت کسی بھی وقت ترکوں کے ہاتھ میں جا سکتی تھی۔ سینوری نے مسلسل کوششوں سے قبرص پر تسلط حاصل کر لیا اور اس طرح وینس کے باشندوں کی حکومت کا آغاز ہوا۔ یہ صرف فوجی حکومت تھی جو یورپ کے ساحلی علاقے کو ترکوں کی ترکتازی سے محفوظ رکھنے کے لیے عمل میں آئی تھی۔ لیکن یہ بند ترکوں کے آگے زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکا۔

(۳)

ترکیہ میں عثمانیہ سلطنت کے استحکام کے بعد قریبی جزیروں کی طرف توجہ دی گئی۔ سلطان سلیم ثانی کے عہد میں لالا مصطفیٰ، جولائی سنہ ۱۵۷۰ء میں پچاس ہزار ترک لشکر کے ساتھ لارناکا میں اترے۔ اسی جگہ جہاں تقریباً ایک ہزار سال پہلے امیر معاویہ کا لشکر اترا تھا۔ ترک آگے بڑھتے گئے۔ دارالخلافہ نکوسیا کا محاصرہ کر لیا گیا۔ تقریباً دو ماہ کے محاصرے کے بعد نکوسیا فتح ہو گیا۔ اس کے ایک ہفتہ کے اندر سارا قبرص اسلامی سلطنت میں شامل ہو چکا تھا۔

قبرص تین سو سال تک سلطنت عثمانیہ کا جزو رہا۔ ترکوں کی بہت بڑی تعداد نے اسے وطن بنایا۔ عثمانیہ دور قبرص کی تاریخ کا شاندار عہد تھا جس میں قبرص کو صحیح معنوں میں ارتقاء حاصل ہوا۔ ترکوں نے یہاں بہت سی اصلاحات کا نفاذ کیا۔ جاگیرداری نظام ختم کر دیا گیا۔ عیسائی کلیسا کو پوری آزادی دی گئی۔ [illegible] حاصل تھے۔ ولیم ٹرنر اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ:

"قبرص پر اگرچہ ظاہری طور پر بے "حکمراں ہے، لیکن درحقیقت یہاں

یونانی اسقف اور اس کے ماتحت پادریوں کی حکومت ہے۔

۱۸۳۹ء میں ترکوں نے آئینی اصلاحات رائج کیں اور ایک قائم مقام مقرر کیا جس کی مدد کے لیے قبرص کے باشندوں کی ایک کونسل کا انتخاب ہوتا تھا۔ اس طرح قبرص کو اندرونی معاملات میں خودمختاری حاصل تھی۔

انیسویں صدی میں عالمی سیاست میں تبدیلیاں آنے لگیں۔ نہر سوئز کی وجہ سے یورپ کے لیے بحیرۂ روم کی اہمیت بڑھ گئی۔ اس علاقے کی طرف روس اور برطانیہ دونوں کی نظریں اٹھ رہی تھیں۔ روس درۂ دانیال اور بحیرۂ باسفورس پر قبضہ کرنا چاہتا تھا جس کے لیے اسے سلطنت عثمانیہ سے ٹکر لینا پڑتی تھی۔ اس نے قبرص کے جزیرے کو فوجی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہا، برطانیہ نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے دخل اندازی کی۔ اس نے ترکی کی مدافعت کا وعدہ کیا، چنانچہ جون ۱۸۷۸ء میں سلطان ترکی نے عارضی طور پر قبرص انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

پہلی عالمگیر جنگ کے بعد برطانیہ نے قبرص کو پوری طرح اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ سلطنت برطانیہ کی طرف سے یہاں ہائی کمشنر متعین ہونے لگا۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد قبرص میں انگریزوں کے خلاف بغاوتوں کا آغاز ہوا۔ یونان نے اس میں در پردہ مدد کی اور جنرل گریفاس مسلح جہاز لے کر یہاں کے قبرصی رہنما اسقف میکاریوس کی مدد کو پہونچ گیا۔ ترک اور یونان دونوں آزادی کے لیے لڑ رہے تھے لیکن یونانی انتہاپسندوں کے سامنے مقصد کچھ اور تھا انھوں نے برطانوی سپاہیوں کے ساتھ ساتھ ترکوں پر بھی حملے شروع کر دیے۔ ترک اقلیت کو اب اس تحریک آزادی کی حقیقت کا علم ہوا۔ قبرص کو کلیتاً یونان سے ملحق کرنے کے لیے ترکوں کو سرے سے ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہاں سے ترک اقلیت کے انتقام کا آغاز ہوا

(۴)

ترکوں اور یونانیوں کے ان اختلافات کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس تاریخی پس منظر کا جائزہ لینا ہے جس میں اس کشیدگی نے جنم لیا۔

قبرص ابتدائے تہذیب سے ہی اپنی معدنیات[1] اور جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے

---

[1] یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کاپر (تانبہ) یہاں کافی مقدار میں ملتا تھا اور یورپی زبانوں میں اس جزیرہ کا نام اسی سے کاپر پڑا۔

اہمیت کا حامل رہا ہے۔ زمانہ قبل مسیح میں یونانی قسمت آزما یہاں پہونچتے رہے۔ یونانی اساطیر میں قبرص کا ذکر بارہا آتا ہے۔ یونانی محبت کی دیوی افروڈائٹ (APHRODITE) قبرص ہی پیدا ہوئی اس لیے اسے محبت کا جزیرہ کہا جاتا ہے۔ (چنانچہ اسی نسبت کی وجہ سے انطونی نے قلوپطرہ کو یہ جزیرہ محبت کے تحفے کے طور پہ دیا تھا۔)

قبرص کے یونان سے الحاق کے حامیوں کے دلائل میں سب سے بڑی دلیل قبرص کا یونان سے یہی قدیم دیومالائی رشتہ ہے۔ لیکن محقق مورخین کو اس میں کلام ہے جارج ہل کے نزدیک قبرص کو یونان سے وابستہ کرنے کے لیے ایلیڈ (ILIAD) کی کہانیوں میں تبدیلیاں کی گئی ہیں تاکہ اس کی فنیقی ثقافت سے وابستگی ختم کی جاسکے۔

الحاق کے حامیوں کی دوسری دلیل زبان کا رشتہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یونان سے مسلسل ربط و ضبط کی وجہ سے یونانی زبان قبرص میں آئی اور آج بھی اکثریت کی زبان ہے۔ لیکن حقیقتاً یہ بازنطینی سلطنت کے قیام کے بعد کی بات ہے۔

سلطنت روما کے مشرقی حصوں کے نظم و نسق کے لیے قسطنطین نے ایشیائے کوچک کے علاقے کی طرف توجہ کی۔ یہاں بازنطیم نامی ایک قدیم شہر جسے بانا س نے ۶۵۷ ق م میں بسایا تھا، کے کھنڈرات پر ۳۳۰ء میں شہر بسایا گیا جس کا نام قسطنطنیہ (قسطنطین کا شہر) پڑ گیا۔ قدیم نام کی رعایت سے اس سلطنت کو بازنطینی سلطنت کہا گیا۔ یونانی دارالحکومت کی وجہ سے اب سلطنت روما میں لاطینی کے بجائے یونانی زبان کو عروج ہوا اور اس کے ماتحت علاقوں میں بھی اس کو قبول عام حاصل ہوا۔

پولوس نے عیسائیت کو یونانی ذہن کے لیے قابل قبول بنا دیا تھا۔ بازنطینی حکومت کا عیسائیت سے تعلق ہوا تو قبرصی عیسائیوں کے ذہن میں عیسائیت یونانیت اور بازنطینیت کی تثلیث پیوست ہو گئی جس نے اینوسس ENOSIS کا نام پایا۔

اینوسس کے لفظی معنی "الحاق" ہیں۔ یہ درحقیقت بازنطینی سلطنت کے احیاء کی تحریک ہے۔ قبرصی خواہ یونان سے اس کا کوئی خونی اور نسلی رشتہ نہ ہو لیکن اگر وہ کیتھولک مسیحی ہے تو وہ اپنے کو یونانی شمار کرتا ہے۔" (جارج ہل)

یہ تحریک انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں شروع ہوئی۔ اس کا مطالبہ تھا یونان سے الحاق اور قدیم بازنطینی سلطنت کا احیاء، اس تحریک کے حامیوں کا کہنا ہے کہ "یونانی زبان اکثریت کی زبان ہے" "قبرص یونان کا حصہ رہا ہے" اور اکثریت کا مطالبہ یونان سے الحاق ہے۔"

لیکن جارج ہل جیسے محقق تاریخ داں کو ان دلائل میں منطقی اور تاریخی ربط کے وجود سے انکار ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اسی فیصد آبادی اینوسس کے خلاف ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ قبرص کبھی یونان کا حصہ نہیں رہا۔ بازنطینی سلطنت میں یونان بھی اسی طرح اس سلطنت کے ماتحت تھا جیسے قبرص۔

اینوسس کی یہ تحریک بعد میں تشدد پسندی میں تبدیل ہوگئی اور ایک دہشت پسند تنظیم ایوکا EOKA کی تشکیل کی۔ اس وقت بیس ہزار افراد کو اس میں باقاعدہ رکنیت حاصل ہے۔ ایوکا کی دہشت پسند سرگرمیوں کا آغاز سنہ ۱۹۵۵ء سے ہوگیا تھا۔ یونان کی پشت پناہی جنرل گریفاس کی شرکت کی صورت میں حاصل رہی۔ اس کے علاوہ بہت سی تبلیغی مسیحی تنظیمیں اس بربریت پسند تنظیم کا ساتھ دے رہی تھیں، مسیحی مبلغ ہوں یا اسکول کے اساتذہ اور طلبہ، تمام کیتھولک اینوسس کے لیے حلف اٹھاتے تھے۔

قبرص کے موجودہ صدر میکاریوس جب اسقف بنے تو انھوں نے ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۵۰ء میں نکوسیا میں حلف اٹھایا۔

> "میں مقدس حلف اٹھاتا ہوں کہ میں قومی آزادی کے لیے زندگی وقف کردوں گا اور تاحیات پوری استقامت سے کوشش کروں گا کہ قبرص کا الحاق مادرِ وطن یونان سے ہو جائے۔"

میکاریوس اس حلف پر شدت سے قائم رہے سنہ ۱۹۵۵ء سنہ ۱۹۵۶ء میں ترک اقلیت پر شدید مظالم ڈھائے گئے۔ ترکوں کے نمائندہ لیڈر ڈاکٹر فاضل کوچک نے اس کے خلاف آواز اٹھائی چنانچہ سنہ ۱۹۵۹ء میں لندن میں تین طاقتیں مصالحت کے لیے جمع ہوئیں۔ برطانیہ (حکمراں طاقت) یونان (قبرصی یونانیوں کی اکثریت کے حقوق کی محافظت کی دعویدار سلطنت) اور ترکی (ترک اقلیت کی حفاظت کی دعویدار سلطنت) برطانیہ قبرص سے اپنا تعلق منقطع کرنے کے لیے

یار تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قبرص اپنے قدیم حکمران ترکی کے زیر اثر آجائے جس سے برطانیہ نے
علاقہ عارضی طور پر لیا تھا۔ طویل مذاکرات کے بعد تینوں طاقتوں کے مابین معاہدہ ہوا جس کی رو سے
قبرص کے آئین کا یہ ڈھانچہ طے پایا کہ صدر قبرصی یونانیوں میں سے اور نائب صدر قبرصی ترکوں
میں سے ہوگا اور کابینہ میں دونوں قومیتوں کو مساوی حقوق دیئے جائیں گے اس کے باوجود
اگر کوئی تنازعہ ہو تو برطانیہ، یونان اور ترکی تینوں کے درمیان گفت وشنید سے طے کیا جائے گا۔
۱۹۶۰ء میں قبرص آزاد ہوا اور میکاریوس پہلے صدر ہوئے۔ انھیں یہ آئین منظور نہیں تھا
اس لیے کہ اس میں قبرصی ترکوں کو قبرصی یونانیوں کے مساوی حقوق دیئے گئے تھے، چنانچہ
انھوں نے ترک نمائندوں کو مجبور کیا کہ وہ آئین میں آبادی کے تناسب سے حقوق کی تقسیم کے
لحاظ سے ترمیم وتبدیلی کو منظور کریں۔
ڈاکٹر فاضل کوچک نائب صدر تھے انھوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ مسئلہ
اکثریت واقلیت کا نہیں بلکہ دو قوموں کا ہے، یونانی ایک قوم ہیں ترک دوسری قوم۔ دونوں
قوموں کو مساوی آئینی حقوق ملنے چاہئیں۔ قبرص میں درحقیقت اکثر لحاظ سے وہی سیاسی صورت
حال ہے جو تقسیم سے پہلے برصغیر ہند وپاکستان میں مسلمانوں کو پیش تھی۔ جب میکاریوس کو گفت وشنید
میں کامیابی نہ ہوئی تو ایوکا کی دہشت پسند سرگرمیاں تیز ہوگئیں۔ ۲۱ر دسمبر ۱۹۶۳ء میں قبرص
میں ترکوں کے قتل عام کا آغاز ہوا۔ ایوکا کا خیال تھا کہ اس طرح دہشت پسندی پھیلانے سے
یا تو ترک آئین میں تبدیلیوں کو منظور کرلیں گے، ورنہ انھیں صفحۂ ہستی سے نیست ونابود کر دیا جائے گا۔
نکوسیا میں پانچ دن تک اخباری نامہ نگاروں کو داخل نہیں ہونے دیا گیا۔ ۲۶ر دسمبر کو جب
نامہ نگار ترک بستیوں میں پہونچے تو انھوں نے وہ خونیں مناظر دیکھے جو ایوکا کے دہشت پسندوں
نے اپنے ترک ہموطنوں کو کرسمس کی رات تحفے کے طور پر پیش کیے تھے۔
اس بربریت پر ساری دنیا نے افسوس کیا۔ معاہدۂ لندن ۱۹۵۹ء کی رو سے ترکی پر قبرصی
ترکوں کی حفاظت کی ذمہ داری پڑتی تھی۔ ترکی نے میکاریوس کی حکومت کو تنبیہ کی اور اقوام متحدہ
کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقوام متحدہ اور ترکی کی مصالحانہ
کوششوں کو ایوکا کے دہشت پسند کوئی اہمیت نہیں دے رہے ہیں ان کی سفاکی جاری ہے۔

ترکی نے مظلومین قبرص کی حفاظت کے لیے گفت وشنید پر اکتفا نہیں کی۔ حال ہی میں انہوں نے قبرص کے خلاف تادیبی کارروائی کر کے اس امید کو تقویت دی ہے کہ شہیدوں کا خون رنگ لائے گا اور قبرص کے ترک جو اکثریت کے مظالم کا نشانہ رہے ہیں امن و آزادی کا سانس لے سکیں گے۔

مآخذ

۱۔ بلاذری۔ "فتوح البلدان"۔ بریل (۱۸۶۶ء)

۲۔ صحیح بخاری، جزو الرابع، مطبع امیریہ (۱۳۱۲ھ)

۳۔ طبقات ابن سعد، بیروت (۱۹۵۸ء)

۴۔ تاریخ طبری، مطبع حسینیہ (ت۔ن)

5- Harry Luke, Cyprus, London (1957)

6. Background to Enosis, Royal Institute of International Affairs London, (1967)

7. Mangonten, Island of Cyprus, Nicosia, (1947)

8. Cyprus, Central Office of Information London (n.d).

9. Encyclopaedia of Islam "Cyprus."

10. Dr Fazil Khuchuk, The Cyprus Question.

11. Cyprus: Past, Present And Future Ankara (1964)

12. George Hill, The History of Cyprus.

(بشکریہ "فکر و نظر" کراچی)

Printed at Allahabad Oriental Press Lucknow.

مُرتّب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسئول

محمد منظور نعمانی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

تذکرہ مجدد الف ثانی
"مجدد الف ثانی نمبر الفرقان" کا تازہ کتابی ایڈیشن
الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر میں پہلی بار یہ حقیقت سامنے آئی تھی کہ امام ربانی
شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کا وہ کون سا "تجدیدی کارنامہ" ہے جس کی وجہ سے آپ کو کسی ایک
صدی کا نہیں بلکہ الف ثانی یعنی پورے دوسرے ہزار سال (از ۱۰۰۱ تا ۲۰۰۰) کا مجدد امت نے
مان لیا ہے۔ الفرقان کے اس نمبر کی اشاعت پر اکیس برس گزر چکے ہیں، اس عرصہ میں
اسلامی دنیا کے حالات میں بہت کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں ان تبدیلیوں کو اور ان کے دینی
نقصانوں کو دیکھ کر یہ یقین بڑھ جاتا ہے کہ واقعہ حضرت موصوف پورے الف ثانی کے
مجدد ہیں اور ہمارے اس دور کے لیے بھی ان کے تجدیدی کام میں پوری رہنمائی موجود ہے۔
یہ حقیقت آپ پر اس کتاب کے مطالعہ سے کھلے گی جس میں
مجدد الف ثانیؒ کے ذاتی حالات بھی ہیں اور ان کے تجدیدی
کام کی تفصیلات بھی، نیز آپ کے تمام مشہور خلفاء کا تذکرہ بھی۔
سائز متوسط
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ	ماہنامہ **الفرقان** لکھنؤ	سالانہ چندہ
غیر ممالک سے		ہندستان سے ۶/-
سادہ ڈاک ..... ۱۲ شلنگ		پاکستان سے ۷/-
ہوائی ڈاک .... ایک پونڈ		ششماہی
	فی کاپی .... ۶۰ پیسے	ہندستان سے ۳/۵۰
		پاکستان سے ۴/-

جلد ۳۲ | بابت ماہ جمادی الاخریٰ ۱۳۸۴ھ مطابق نومبر ۱۹۶۴ء | شمارہ ۶

اگر اس دائرے میں ○ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ نومبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغہ وی، پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:- اپنا چندہ سکریٹری اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں، اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیدیں ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:- براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:- الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۱۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ کے اندر آجانی چاہیئے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

منیجر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان سے شائع کیا۔

خریداران الفرقان سے

ایک معذرت

الفرقان جیسے دینی اور مقصدی رسالوں کے خریدار عام معنیٰ میں خریدار نہیں ہوتے وہ دراصل معاونین ہوتے ہیں، اسی لئے ادارہ کی طرف سے بھی اُن کے ساتھ تجارتی انداز کی معاملت نہیں برتی جاتی۔ کوئی اپنی استطاعت کی بنا پر رعایت کا طلبگار ہوتا ہے تو انکار نہیں کیا جاتا۔ کوئی چندہ کی ادائیگی میں مہلت مانگتا ہو تو بے تامل دیدی جاتی ہے، کوئی کسی نئے خریدار کے نام وعدہ پر پرچہ جاری کرنے کی فرمائش کرتا ہو تب پوری کر دیجاتی ہے اور پھر خریدار ہی اگر بروقت ادائیگی کی فکر نہ کرے تو دفتر سے عموماً سال بھر کے پہلے خبر نہیں لی جاتی۔ ان وعدوں میں بہت سوں پر کئی کئی سال کا چندہ بھی چڑھ جاتا ہے یا کسی سال کا چندہ کسی کئی سال تک چڑھا رہتا ہے۔ بعض افراد یا ادارے ہدایت کر دیتے ہیں کہ ان کو کبھی وی پی نہ کیا جائے تو نیا سال شروع ہونے پر چندہ کی وصولیابی کے انتظار میں اُن کا پرچہ موقوف نہیں کیا جاتا بلکہ متعارف ہونے کی صورت میں اگر کئی کئی سال بھی اس طرح گزر جاتے ہیں تو اس کو بھی برداشت کیا جاتا ہے۔ —

لیکن یہ تمام رعایتیں بہرحال ایک حد کے اندر ہی نباہی جا سکتی ہیں۔ یکسر ڈھیل چھوڑ دی جائے تو چند سال میں الفرقان کا کام ہی تمام ہو جائے۔

گزشتہ دو ڈھائی سال اتفاق سے ایسے ہی گزر گئے کہ بقایا چندوں کی وصولیابی کی کوئی فکر ہی نہیں کی جا سکی۔ اسکی خاص وجہ یہ تھی کہ اس عرصہ میں میں خود دفتر کے کام پر تفصیلی نظر بالکل نہیں رکھ سکا اور جن صاحب کے سپرد سارا کام ہوتا تھا وہ پورے بوجھ کو سنبھال نہیں سکے۔ اور نہ صرف یہ کہ بقایاجات بڑھتے رہے بلکہ جو چندے ان دنوں میں روزمرہ وصول ہوئے اُن میں سے بہت سوں کے اندراجات بھی مکمل نہیں ہوئے۔ اور اسی صورت حال میں وہ صاحب یکایک مستعفی ہو کر چلے بھی گئے۔ ان کے بعد جو ایک نئے کارکن نے دفتر سنبھالا تو یہ وہ وقت تھا کہ میں اس شدید بیماری کے حملوں کا شکار ہو چکا تھا جس سے اب تک سنبھل نہیں پایا ہوں (گو کہ صفر مطابق جولائی کے الفرقان میں میرے ہی قلم سے میری صحتیابی کی خبر پڑھنے والے اس طرف سے بالکل مطمئن ہو گئے ہیں لیکن حقیقت حال یہ ہو کہ اسی وقت چند دن کے بعد سے شکایت پھر عود کر آئی اور پھر اب تک بھی اُس کے ازالے کی شکل نہیں پیدا ہوئی ہے) بہرحال ان نئے کارکن

باقی صفحہ پر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

از ——— جناب وحید الدین خاں صاحب

کسی شخص نے کبھی یہ نہیں سنا ہوگا کہ سورج کی گرمی سے کاغذ جل گیا۔ حالانکہ سورج کی گرمی اتنی زیادہ ہے کہ کاغذ کیا پورا کا پورا پہاڑ بلکہ سارا کرۂ ارض اس طرح جل سکتا ہے جیسے کسی بھڑکتے ہوئے تنور میں ایک تنکا۔ مگر یہی سورج جس کی گرمی اتنی زیادہ ہے کہ بڑے بڑے جنگلوں اور پہاڑوں کو بھک سے اڑا دے وہ ایک تنکے کو بھی جلانے پر قادر نہیں ہے، ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ سورج کی شعاعیں لاکھوں کروڑوں میل کے دائرے میں بکھری ہوئی ہیں۔ اس انتشار کی وجہ سے کسی ایک چیز پر بیک وقت اس کی شعاعیں اتنی مقدار میں نہیں پڑتیں کہ وہاں وہ اتنی گرمی پیدا کرسکیں جو کسی چیز کو جلانے کے لیے ضروری ہے۔ حالانکہ یہی بکھری ہوئی شعاعیں اگر سمیٹ دی جائیں تو وہ خوفناک الاؤ کی شکل میں بھڑک سکتی ہیں۔

آفتابی چولھا سورج کی شعاعوں کے اسی قسم کے ارتکاز کا نام ہے۔ بکھری ہوئی شعاعوں کو ایک خاص دائرے میں سمیٹ دینے کی وجہ سے اس جگہ اتنی گرمی پیدا ہوجاتی ہے کہ کھانا پکنے لگتا ہے۔ آفتابی چولھا تو ابھی بہت کم رائج ہوسکا ہے مگر آتشیں شیشہ (BURNING GLASS) ایک ایسی چیز ہے جو اکثر اشخاص نے کبھی نہ کبھی دیکھا ہے۔ آتشیں شیشہ کیا ہے۔ یہ ایک محدب یا کروی عدسہ (CONVEX LENS) ہے جس سے کاغذ یا دوسری آتش پذیر چیزوں میں آگ لگائی جاسکتی ہے۔ عام حالات میں کاغذ پر سورج کی جو شعاعیں پڑتی ہیں وہ اتنی زیادہ گرمی نہیں پیدا کرسکتیں کہ اس میں آگ لگ جائے۔ مگر انھیں شعاعوں کو جب مجتمع کردیا جاتا ہے تو وہ شعلہ کی مانند بھڑک اٹھتی ہیں۔ کوئی بھی شخص تجربہ کرکے معلوم کرسکتا ہے کہ بس ان شعاعوں

کو طاقت ور بنانے کے لیے کیا کرتا ہے، جیسا کہ ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا۔

اس خاکہ میں درمیان میں آتشیں شیشہ ہے جس سے شعاعیں مڑکر نیچے ایک نقطہ پر جمع ہو رہی ہیں۔

اس نقشہ کے مطابق آتشیں شیشہ کا تمام تر عمل صرف یہ ہے کہ وہ ان شعاعوں کو جمع کرتا ہے جو اس کے پورے دائرے میں پڑ رہی ہیں اور ان کو اس طرح موڑ دے یا منعطف کر دے کہ وہ سب اکٹھا ہو کر ایک محدود رقبہ پر پڑنے لگیں۔ سورج کی شعاعوں کا یہ اجتماع اس محدود رقبہ میں آ حرارت پیدا کر دیتا ہے کہ کاغذ جلنے لگتا ہے۔

یہ مثال میں نے یہ واضح کرنے کے لیے دی ہے کہ انتشار اور اجتماع میں کیا فرق ہے۔ ایک ہی چیز اگر منتشر حالت میں ہو تو وہ بے وزن ہے۔ لیکن اگر اسے اکٹھا کر دیا جائے تو اتنی زبردست طاقت بن سکتی ہے جس کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ہندوستان کے مسلمان اس وقت جس کمزوری کی حالت میں اپنے آپ کو محسوس کرتے ہیں وہ حقیقۃً اتنے کمزور نہیں ہیں، یہ کمزوری دراصل ان کے انتشار کی پیدا کردہ ہے۔ اگر وہ اپنے درمیان اجتماعیت کا آتشیں شیشہ فراہم کر لیں اور انفرادی طور پر بکھری ہوئی شعاعوں کو ایک مقام پر مجتمع کر دیں تو یکایک وہ دیکھیں گے کہ جو شعاعیں الگ الگ ہونے کی صورت میں تنکا جلانے کے لیے بھی ناکافی نظر آتی تھیں، انھیں کی گرمی سے شہتیر بھڑک اٹھا ہے۔ ہماری موجودہ تعداد اور موجود

ذرائع و وسائل جو منفرد طور پر بالکل بے قیمت نظر آتے ہیں۔ یہی تعداد اور یہی ذرائع کروروں گنا زیادہ اہمیت اختیار کرلیں گے۔ آج ہر مسلمان اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے اس وقت ہر شخص اپنے کو ایک پوری قوم کی مانند سمجھنے لگے گا۔ اور جب ایسا ہوگا تو دوسرے بھی ہم کو اسی نظر سے دیکھیں گے جیسا کہ فی الواقع ہم اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ بتائی جاتی ہے یہ پانچ کروڑ افراد گویا پانچ کروڑ دھاگے ہیں، اگر وہ الگ الگ ہوں تو کوئی شخص بھی انھیں باری باری توڑ سکتا ہے۔ لیکن یہی پانچ کروڑ دھاگے اگر مل جائیں تو وہ اتنا مضبوط رسّا بن جائیں گے جنھیں ایک ہاتھ تو کیا سیکڑوں ہاتھ بھی توڑنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ جو چیز الگ سے دیکھنے میں محض ایک دھاگا ہے وہ اتحاد کی برکت سے موٹے رسے کا مقام حاصل کرلے گی۔ قطرہ سمندر میں ہو تو وہ سمندر ہے اور باہر ہو تو قطرہ کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہ اتحاد اور اجتماعیت موجودہ حالات میں مسلمانوں کی سب سے پہلی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر حالات کے سدھار کے لیے کسی بھی اسکیم کا آغاز نہیں کیا جا سکتا۔ اصلاح حال کی ہر تجویز سب سے پہلے یہ چاہتی ہے کہ مسلمان ایک نقطہ پر مجتمع ہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ ذرائع و وسائل اس کے لیے مہیا ہو سکیں زیادہ سے زیادہ حمایت کے ساتھ اس کو مؤثر بنایا جا سکے، جب وہ دنیا کے سامنے آئے تو لوگوں کو وہ زیادہ سے زیادہ وقیع اور باوزن معلوم ہو۔

اجتماعیت سے ہماری مراد کیا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام فرقے اور جماعتیں ختم ہو جائیں اور سارے ملک میں ایک تنہا جماعت قائم ہو جائے۔ ایسی اجتماعیت نہ ضروری ہے اور نہ ممکن۔ اس وقت ہم جس اجتماعیت کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ انفرادی اور گروہی سطح پر اپنے مخصوص امتیازات کو باقی رکھتے ہوئے قومی اور ملی سطح پر مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آجائیں، بالکل ویسے ہی جیسے آزادی سے پہلے ملک کے مختلف سماجی، سیاسی اور مذہبی گروہ اپنے علیحدہ وجود کو باقی رکھتے ہوئے ایک مشترک قومی مقصد کی خاطر کانگریس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے تھے۔

اس وقت حالات نے مسلمانوں کے لیے چند ایسے مسائل پیدا کر دیئے ہیں جو کسی ایک فرد یا فرقہ کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ مجموعی طور پر پوری امت کا مسئلہ ہے۔ مثلاً مخصوص اسباب نے

کو طاقت ور بنانے کے لیے کیا کرتا ہے، جیسا کہ ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا۔

اس خاکہ میں درمیان میں آتشیں شیشہ ہے جس سے شعاعیں مڑ کر نیچے ایک نقطہ پر جمع ہو رہی ہیں۔

اس نقشہ کے مطابق آتشیں شیشہ کا تمام تر عمل صرف یہ ہے کہ وہ ان شعاعوں کو جمع کرے جو لنس کے پورے دائرے میں پڑ رہی ہیں اور ان کو اس طرح موڑے یا منعطف کر دے کہ وہ سب اکٹھا ہو کر ایک محدود رقبہ پر پڑنے لگیں۔ سورج کی شعاعوں کا یہ اجتماع اس محدود رقبہ میں اتنی حرارت پیدا کر دیتا ہے کہ کاغذ جلنے لگتا ہے۔

یہ مثال میں نے یہ واضح کرنے کے لیے دی ہے کہ انتشار اور اجتماع میں کیا فرق ہے۔ ایک ہی چیز اگر منتشر حالت میں ہو تو وہ بے وزن ہے۔ لیکن اگر اسے اکٹھا کر دیا جائے تو اتنی زبردست طاقت بن سکتی ہے جس کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ہندوستان کے مسلمان اس وقت جس کمزوری کی حالت میں اپنے آپ کو محسوس کرتے ہیں وہ حقیقۃً اتنے کمزور نہیں ہیں، یہ کمزوری دراصل ان کے انتشار کی پیدا کردہ ہے۔ اگر وہ اپنے درمیان اجتماعیت کا آتشیں شیشہ فراہم کر لیں اور انفرادی طور پر بکھری ہوئی شعاعوں کو ایک مقام پر مجتمع کر دیں تو یکایک وہ دیکھیں گے کہ جو شعاعیں الگ الگ ہونے کی صورت میں تنکا جلانے کے لیے بھی ناکافی نظر آتی تھیں، انھیں کی گرمی سے شعلہ بھڑک اٹھا ہے۔ ہماری موجودہ تعداد اور موجودہ

ذرائع و وسائل جو منفرد طور پر بالکل بے قیمت نظر آتے ہیں۔ یہی تعداد اور یہی ذرائع کروروں گنا زیادہ اہمیت اختیار کرلیں گے۔ آج ہر مسلمان اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے اس وقت ہر شخص اپنے کو ایک پوری قوم کی مانند سمجھنے لگے گا۔ اور جب ایسا ہوگا تو دوسرے بھی ہم کو اسی نظر سے دیکھیں گے جیسا کہ فی الواقع ہم اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ بتائی جاتی ہے یہ پانچ کروڑ افراد گویا پانچ کروڑ دھاگے ہیں، اگر وہ الگ الگ ہوں تو کوئی شخص بھی انھیں باری باری توڑ سکتا ہے۔ لیکن یہی پانچ کروڑ دھاگے اگر مل جائیں تو وہ اتنا مضبوط رسا بن جائیں گے جنھیں ایک ہاتھ تو کیا سیکڑوں ہاتھ بھی توڑنے کی ہمت نہیں کرسکتے۔ جو چیز الگ سے دیکھنے میں محض ایک دھاگا ہے وہ اتحاد کی برکت سے موٹے رسے کا مقام حاصل کرلے گی۔ قطرہ سمندر میں ہو تو وہ سمندر ہے اور دریا باہر ہو تو قطرہ کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہ اتحاد اور اجتماعیت موجودہ حالات میں مسلمانوں کی سب سے پہلی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر حالات کے سدھار کے لیے کسی بھی اسکیم کا آغاز نہیں کیا جاسکتا۔ اصلاح حال کی ہر تجویز سب سے پہلے یہ چاہتی ہے کہ مسلمان ایک نقطہ پر مجتمع ہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ ذرائع و وسائل اس کے لیے مہیا ہوسکیں، زیادہ سے زیادہ حمایت کے ساتھ اس کو مؤثر بنایا جاسکے، جب وہ دنیا کے سامنے آئے تو لوگوں کو وہ زیادہ سے زیادہ وسیع اور باوزن معلوم ہو۔

اجتماعیت سے ہماری مراد کیا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام فرقے اور جماعتیں ختم ہوجائیں اور سارے ملک میں ایک تنہا جماعت قائم ہوجائے۔ ایسی اجتماعیت نہ ضروری ہے اور نہ ممکن۔ اس وقت ہم جس اجتماعیت کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ انفرادی اور گروہی سطح پر اپنے مخصوص امتیازات کو باقی رکھتے ہوئے قومی اور ملی سطح پر مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آجائیں، بالکل ویسے ہی جیسے آزادی سے پہلے ملک کے مختلف سماجی، سیاسی اور مذہبی گروہ اپنے علیحدہ وجود کو باقی رکھتے ہوئے ایک مشترک قومی مقصد کی خاطر کانگرس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئے تھے۔

اس وقت حالات نے مسلمانوں کے لیے چند ایسے مسائل پیدا کردیئے ہیں جو کسی ایک فرد یا فرقہ کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ مجموعی طور پر پوری امت کا مسئلہ ہے۔ مثلاً مخصوص اسباب سے

اسکے بعد ۴ فروری ۱۸۶۱ء کو مانٹ گومری (الباما) میں سات باغی ریاستوں کے نمائندوں کا اجتماع ہوا جس میں طے پایا کہ امریکا میں کنفڈریشن طرز کا نظام حکومت قائم ہوگا جسمیں ریاستوں کو اندرونی خودمختاری حاصل رہے گی ــــ یہ ایک سیاسی حیثیت کی مثال ہے۔ اس کو ہم اپنی غیر سیاسی نوعیت کی تنظیم میں اپنے حالات و مسائل کے اعتبار سے اختیار کر سکتے ہیں۔

جہانتک میں سمجھتا ہوں اس نتیجے تک پہونچنے میں اصلاً جو چیز حائل ہے وہ صرف یہ واقعہ ہے کہ ہمارے اختلافی گروہ اپنے اختلافات کو مقامی دائرہ میں محدود رکھنے کے بجائے پوری قوم اور سارے مسائل تک اسکو وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ کسی کا ایک فقہی مسلک ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ سارے مسائل کا حل بس اسی مخصوص فقہی مسلک کو اختیار کرنے میں ہے۔ کسی کا کوئی طریق کار ہے تو اس کا خیال ہے کہ بس یہی طریق کار سارے مرضوں کی دوا ہے۔ کسی کا ایک ڈھانچہ بن گیا ہے تو وہ سمجھ بیٹھا ہے کہ بقیہ تمام ڈھانچے عبث ہیں اور سب کو میرے ڈھانچہ میں ضم ہو جانا چاہیے۔ کسی کے کچھ مخصوص عقائد ہیں تو اسکو اصرار ہے کہ بس یہی عقیدہ دنیا و آخرت کا اصل مسئلہ ہے اور اسکو مانے بغیر میرا کسی سے سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ اس طرح ہمارے ان فرقوں اور جماعتوں کی مثال قوالی یا بھجن کی ان شبانہ مجالس کی سی ہو گئی ہے جو صرف اپنے کمرے میں اپنے ہم ذوق افراد کے درمیان قوالی اور بھجن کر کے مطمئن نہیں ہوتیں بلکہ تیز قسم کا لاؤڈ اسپیکر لگا کر پوری آبادی کو رات بھر اپنی آواز سنانا بھی ضروری سمجھتی ہیں خواہ بقیہ آبادی کو اس سے کوئی دلچسپی نہ ہو اور اسکو وہ دوسروں کی نیند خراب کرنے کا ایک مجرمانہ فعل ہی سمجھیں مجھے اس سے بحث نہیں کہ کسی کا جو مخصوص فکر ہے وہ حقیقۃً کیا قدر و قیمت رکھتا ہے۔ بالفرض وہ اتنا ہی اہم ہو جتنا اسکے ماننے والے سمجھتے ہیں، جب بھی حالات کی سنگینی تقاضا کر رہی ہے کہ مشترک اجتماعی دائرے میں اسکو منوانے پر اصرار نہ کیا جائے ــــ معیار پسندی بڑی اچھی بات ہے لیکن اگر معیار حاصل نہ ہو رہا ہو تو حقیقت واقعہ کا اعتراف بہترین عقلمندی ہے اور میں مسلم فرقوں اور جماعتوں کو یہی مشورہ دینے کی جرأت کر رہا ہوں۔

اجتماعی جدوجہد کے بغیر ہمارا کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اور اجتماعیت ایک ایسی چیز ہے جو عین ہمارے دائرۂ امکان میں ہے کسی بھی پہلو سے وہ ہمارے لیے ناممکن نہیں، اب اگر ایک ایسے امکان کو بھی ہم حاصل نہیں کرتے تو یاد رکھیے تاریخ ہم کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ مستقبل کا مورخ یقیناً ہم کو مجرم ٹھہرائے گا۔ خواہ اپنے دل میں ہم دوسروں کو اپنی مصیبت کا ذمے دار سمجھتے ہوں۔

کتاب الحج

معارف الحدیث

(مسلسل)

حرم مکہ کی عظمت

خانۂ کعبہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا مقدس بیت (گھر) قرار دیا ہے اور اسی نسبت سے شہر مکہ کو جس میں بیت اللہ واقع ہے بلد اللہ الحرام قرار دیا گیا ہے، گویا جس طرح دنیا بھر کے گھروں میں کعبۂ مکرمہ کو اللہ تعالیٰ سے خاص نسبت ہے اسی طرح دنیا بھر کے شہروں میں مکۂ معظمہ کو اللہ تعالیٰ کی نسبت کا خاص شرف حاصل ہے۔ پھر اسی نسبت سے اس کی ہر سمت میں کئی کئی میل کے علاقہ کو حرم یعنی واجب الاحترام قرار دیا گیا ہے اور اس کے خاص آداب و احکام مقرر کیے گئے ہیں اور ادب و احترام ہی کی بنیاد پر بہت سی ان باتوں کی بھی وہاں ممانعت ہے جن کی باقی ساری دنیا میں اجازت ہے، مثلاً ان حدود میں کسی کو شکار کی اجازت نہیں، جنگ اور قتال کی اجازت نہیں۔ درخت کاٹنے اور درختوں کے پتے جھاڑنے کی اجازت نہیں۔ اس محترم علاقہ میں ان سب چیزوں کو ادب و احترام کے خلاف گنہگارانہ جسارت قرار دیا گیا ہے۔

اس علاقۂ حرم کی حدود پہلے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے معین کی تھیں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں انہی کی تجدید فرمائی اور اب وہ حدود معلوم و معروف ہیں۔ گویا یہ پورا علاقہ بلد اللہ الحرام کا صحن ہے اور اس کا بھی ادب و احترام واجب ہے جو اللہ کے

مقدس شہر مکۂ معظمہ کا ــــــ اس بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند احادیث ذیل میں پڑھیے!

عَنْ عَيَّاشِ بْنِ أَبِي رَبِيعَةَ الْمَخْزُومِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَزَالُ هٰذِهِ الْأُمَّةُ بِخَيْرٍ مَا عَظَّمُوا هٰذِهِ الْحُرْمَةَ حَقَّ تَعْظِيمِهَا فَإِذَا ضَيَّعُوا ذَالِكَ هَلَكُوا۔

ــــــ رواہ ابن ماجۃ

عیاش بن ابی ربیعہ مخزومی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت جب تک اس حرم مقدس کا پورا احترام کرتی رہے گی اور اس کی حرمت وتعظیم کا حق ادا کرے گی خیریت سے رہے گی اور جب اس میں یہ بات باقی نہ رہے گی برباد ہو جائے گی۔ (سنن ابن ماجہ)

(تشریح) گویا بیت اللہ اور بلد اللہ الحرام (مکۂ معظمہ) اور پورے علاقہ حرم کی تعظیم و حرمت اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندگی کے صحیح تعلق اور سچی وفاداری کی علامت اور نشانی ہے جب تک یہ چیز اجتماعی حیثیت سے اُمت میں باقی رہے گی اللہ تعالیٰ اس امت کی نگہبانی فرمائے گا اور وہ دنیا میں سلامتی اور عزت کے ساتھ رہے گی۔ اور جب اُمت کا رویہ بحیثیت مجموعی اس بارہ میں بدل جائے گا اور خانہ کعبہ اور حرم مقدس کی حرمت وتعظیم کے بارہ میں اس میں تقصیر آجائے گی تو پھر یہ امت اللہ تعالیٰ کی حمایت ونگہبانی کا استحقاق کھو دے گی۔ اور اس کے نتیجہ میں تباہیاں اور بربادیاں اُس پر مسلط ہوں گی۔

ہمارے اس زمانہ میں سفر کی سہولتوں کی وجہ سے اور بعض دوسری وجوہ سے بھی اگرچہ حج کرنے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے لیکن وہاں ساری دنیا سے جو مسلمان آتے ہیں اُن کا طرز عمل بتاتا ہے کہ بیت اللہ اور حرم مقدس کے ادب واحترام کے لحاظ سے اُمت میں بحیثیت مجموعی بہت بڑی تقصیر آگئی ہے اور بلاشبہ یہ بھی ان اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے جن کی وجہ سے اُمت مشرق ومغرب میں اللہ تعالیٰ کی نصرت اور نگہبانی سے محروم کر دی گئی ہے۔

اَللّٰهُمَّ عَافِنَا وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا وَعَامِلْنَا بِمَا أَنْتَ أَهْلُهُ وَلَا تُعَامِلْنَا بِمَا نَحْنُ أَهْلُهُ۔

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمَ فَتْحِ مَکَّۃَ لَا ہِجْرَۃَ وَلٰکِنْ جِہَادٌ وَنِیَّۃٌ فَاِذَا اسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوْا وَ قَالَ یَوْمَ فَتْحِ مَکَّۃَ اِنَّ ھٰذَا الْبَلَدَ حَرَّمَہُ اللّٰہُ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فَھُوَ حَرَامٌ بِحُرْمَۃِ اللّٰہِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ وَاِنَّہٗ لَمْ یَحِلَّ الْقِتَالُ فِیْہِ لِاَحَدٍ قَبْلِیْ وَلَمْ یَحِلَّ لِیْ اِلَّا سَاعَۃً مِّنْ نَّھَارٍ فَھُوَ حَرَامٌ بِحُرْمَۃِ اللّٰہِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ لَا یُعْضَدُ شَوْکُہٗ وَلَا یُنَفَّرُ صَیْدُہٗ وَلَا یَلْتَقِطُ لُقْطَتَہٗ اِلَّا مَنْ عَرَّفَھَا وَلَا یُخْتَلٰی خَلَاھَا قَالَ الْعَبَّاسُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِلَّا الْاِذْخِرَ فَاِنَّہٗ لِقَیْنِھِمْ وَلِبُیُوْتِھِمْ فَقَالَ اِلَّا الْاِذْخِرَ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب ہجرت کا حکم نہیں رہا لیکن جہاد ہے۔ اور نیت! تو جب تم سے راہ خدا میں کوچ کرنے کو کہا جائے تو چل دو —— اور اسی فتح مکہ کے دن آپ نے یہ بھی اعلان فرمایا کہ یہ شہر مکہ اللہ نے اس کو اسی دن سے محترم قرار دیا ہے جس دن کہ زمین و آسمان کی تخلیق ہوئی (یعنی جب اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اسی وقت زمین کے اس قطعہ کو جس پر مکہ معظمہ آباد ہے اور اس کے آس پاس کے علاقہ حرم کو واجب الاحترام قرار دیا، لہٰذا اللہ کے اس حکم سے قیامت تک کے لیے اس کا ادب و احترام واجب ہے۔ اور مجھ سے پہلے اللہ نے اپنے کسی بندہ کو یہاں قتال فی سبیل اللہ کی بھی اجازت نہیں دی! اور مجھے بھی دن کے تھوڑے سے وقت کے لیے اس کی عارضی اور وقتی اجازت دی گئی تھی اور وہ وقت ختم ہو جانے کے بعد اب قیامت تک کے لیے یہاں قتال اور ہر وہ اقدام اور عمل جو اس مقدس جگہ کے ادب و احترام کے خلاف ہو حرام ہے، اس علاقہ کے خاردار جھاڑ بھی نہ کاٹے چھانٹے جائیں۔ یہاں کے کسی قابل شکار جانور کو پریشان بھی نہ کیا جائے، اگر کوئی گری پڑی چیز نظر پڑے

تو اس کو وہی اٹھائے جو قاعدہ کے مطابق اس کا اعلان اور تشہیر کرتا رہے اور یہاں کی سبز گھاس بھی نہ کاٹی اکھاڑی جائے ــــ (اس پر آپ کے چچا) حضرت عباس نے عرض کیا اذخر گھاس کو مستثنیٰ فرما دیا جائے۔ کیونکہ یہاں کے لوہار اس کو استعمال کرتے ہیں اور گھروں کی چھتوں کے لیے بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس کے اس عرض کرنے پر اذخر گھاس کو مستثنیٰ فرما دیا۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(**تشریح**) اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو اعلانوں کا ذکر ہے، جو آپ نے فتح مکہ کے دن خاص طور سے فرمائے تھے ــــ پہلا اعلان یہ تھا کہ "اب ہجرت کا حکم نہیں رہا" ــــ اس کا مطلب سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ فتح مکہ سے پہلے جب مکہ پر ان اہل کفر و شرک کا اقتدار تھا جو اسلام اور مسلمانوں کے سخت دشمن تھے اور مکہ میں رہ کر کسی مسلمان کے لیے اسلامی زندگی گزارنا گویا ناممکن تھا تو حکم یہ تھا کہ مکہ میں اللہ کا جو بندہ اسلام قبول کرے اس کے لیے اگر ممکن ہو تو وہ مکہ سے مدینہ ہجرت کر جائے جو اس وقت اسلامی مرکز اور روئے زمین پر اسلامی زندگی کی واحد تعلیم گاہ اور تربیت گاہ تھی، بہرحال ان خاص حالات میں یہ ہجرت فرض تھی اور اس کی بڑی فضیلت اور اہمیت تھی ــــ لیکن جب ۸ھ میں اللہ تعالیٰ نے مکہ معظمہ پر بھی اسلامی اقتدار قائم کرا دیا تو پھر ہجرت کی ضرورت ختم ہو گئی، اس لیے آپ نے فتح مکہ ہی کے دن اعلان فرمایا کہ اب ہجرت کا وہ حکم اٹھا لیا گیا ــــ اس سے قدرتی طور پر ان لوگوں کو بڑی حسرت اور مایوسی ہوئی ہو گی جن کو اب اسلام کی توفیق ملی تھی اور ہجرت کی عظیم فضیلت کا دروازہ بند ہو جانے کی وجہ سے وہ اس سعادت سے محروم رہ گئے تھے ــــ ان کی اس حسرت کا مداوا فرماتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہجرت کی فضیلت و سعادت کا دروازہ اگرچہ بند ہو گیا ہے لیکن جہاد فی سبیل اللہ کا راستہ اور اللہ تعالیٰ کے سارے اوامر کی اطاعت کی نیت اور بالخصوص اعلاء کلمۃ اللہ کی راہ میں ہر قربانی کے لیے دلی عزم و

آزادگی کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور بڑی سے بڑی سعادت اور فضیلت ان راہوں سے اللہ کا ہر بندہ حاصل کرسکتا ہے۔

دوسرا اعلان فتح مکہ کے دن آپ نے یہ فرمایا کہ یہ شہر مکہ جس کی عظمت و حرمت و تقدیم مسلم چلی آرہی ہے یہ محض رسم و رواج یا کسی فرد یا پنچایت کی تجویز نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ازلی حکم سے ہے اور قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اس کا خاص ادب و احترام کیا جائے۔ یہاں تک کہ اللہ کے لیے جہاد و قتال جو ایک اعلیٰ درجہ کی عبادت اور بڑے درجہ کی سعادت ہے یہاں اس کی بھی اجازت نہیں ہے، مجھ سے پہلے کسی بندہ کو اس کی اجازت قطعی طور سے کبھی نہیں دی گئی، مجھے بھی بہت تھوڑے سے وقت کے لیے اس کی اجازت اللہ تعالیٰ نے دی تھی اور وہ بھی وقت ختم ہونے کے ساتھ ختم ہوگئی، اب قیامت تک کے لیے کسی بندہ کو یہاں قتال کی اجازت نہیں ہے ——— جس طرح مخصوص سرکاری علاقوں کے خاص قوانین ہوتے ہیں اسی طرح یہاں کے خاص آداب اور قوانین ہیں اور وہ وہی ہیں جن کا آپ نے اس موقع پر اعلان فرمایا۔

قریب قریب اسی مضمون کی حدیث حضرت ابوہریرہ سے بھی مروی ہے۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَحِلُّ لِاَحَدٍ اَنْ يَّحْمِلَ بِمَكَّةَ السِّلَاحَ ——— رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے کہ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ مکہ میں ہتھیار اٹھائے (صحیح مسلم)

(تشریح) جمہور علماء امت کے نزدیک اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مکہ اور حدود حرم میں کسی مسلمان کو دوسرے کے خلاف ہتھیار اٹھانا اور اس کا استعمال کرنا جائز نہیں، یہ اس مقام مقدس کے ادب و احترام کے خلاف ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی کو ہتھیار ہاتھ میں لینے کی اجازت ہی نہ ہو۔ واللہ اعلم۔

عَنْ اَبِيْ شُرَيْحٍ الْعَدَوِيِّ اَنَّهٗ قَالَ لِعَمْرِو بْنِ سَعِيْدٍ وَهُوَ

يَبْعَثُ الْبُعُوثَ إِلَى مَكَّةَ ائْذَنْ لِي أَيُّهَا الْأَمِيرُ أُحَدِّثْكَ قَوْلًا
قَامَ بِهِ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْغَدَ مِنْ يَوْمِ الْفَتْحِ سَمِعَتْهُ
أُذُنَايَ وَوَعَاهُ قَلْبِي وَأَبْصَرَتْهُ عَيْنَايَ حِينَ تَكَلَّمَ بِهِ حَمِدَ اللهَ
وَأَثْنَى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ إِنَّ مَكَّةَ حَرَّمَهَا اللهُ وَلَمْ يُحَرِّمْهَا النَّاسُ
فَلَا يَحِلُّ لِامْرِءٍ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يَسْفِكَ بِهَا دَمًا
وَلَا يَعْضِدَ بِهَا شَجَرَةً فَإِنْ أَحَدٌ تَرَخَّصَ بِقِتَالِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى
اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيهَا فَقُولُوا لَهُ إِنَّ اللهَ قَدْ أَذِنَ لِرَسُولِهِ وَلَمْ
يَأْذَنْ لَكُمْ وَإِنَّمَا أَذِنَ لِي فِيهَا سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ وَقَدْ عَادَتْ
حُرْمَتُهَا الْيَوْمَ كَحُرْمَتِهَا بِالْأَمْسِ وَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَقِيلَ
لِأَبِي شُرَيْحٍ مَا قَالَ لَكَ عَمْرٌو؟ قَالَ قَالَ أَنَا أَعْلَمُ بِذَالِكَ
مِنْكَ يَا أَبَا شُرَيْحٍ إِنَّ الْحَرَمَ لَا يُعِيذُ عَاصِيًا وَلَا فَارًّا بِدَمٍ
وَلَا فَارًّا بِخَرْبَةٍ ـــــــ رواہ البخاری ومسلم

ابو شریح عدوی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے عمرو بن سعید سے
کہا جبکہ وہ (یزید کی طرف سے مدینہ کا حاکم تھا اور اس کے حکم سے عبداللہ بن الزبیرؓ
کے خلاف) مکہ پر چڑھائی کرنے کے لیے لشکر تیار کرکے روانہ کر رہا تھا کہ اے
امیر مجھے اجازت دیجیے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان بیان
کروں جو آپ نے فتح مکہ کے اگلے دن (مکہ میں) ارشاد فرمایا تھا میں نے اپنے کانوں
سے آپ کا وہ فرمان خود سنا تھا اور میرے ذہن نے اس کو یاد کرلیا تھا اور جس وقت
آپ کی زبان مبارک سے وہ فرمان صادر ہو رہا تھا اس وقت میری آنکھیں آپ
کو دیکھ رہی تھیں۔ آپ نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی اس کے بعد فرمایا تھا کہ مکہ
اور اس کے ماحول کو اللہ نے حرم قرار دیا ہے اس کی حرمت کا فیصلہ انسانوں نے
نہیں کیا ہے اس لیے جو آدمی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے
حرام ہے کہ وہ یہاں خوں ریزی کرے، بلکہ یہاں کے درختوں کا کاٹنا بھی منع ہو.

(آپ نے فرمایا) اور اگر کوئی شخص میرے قتال کو سند بنا کر اپنے لیے اس کا جواز نکالے تو اس سے کہو کہ اللہ نے اپنے رسول کو اجازت دی تھی اور تجھے اجازت نہیں دی ہے اور مجھے بھی اللہ نے ایک دن کے تھوڑے سے وقت کے لیے عارضی اور وقتی طور پر اجازت دی تھی اور اس وقت کے ختم ہونے کے بعد وہ حرمت لوٹ آئی اور اب قیامت تک کسی کے لیے اس کا جواز نہیں ہے ــــــ (اس کے ساتھ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ) جو لوگ یہاں موجود ہیں اور جنھوں نے میری یہ بات سُنی ہے وہ دوسرے لوگوں کو یہ بات پہونچا دیں (اس لیے اے امیر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں آپ کا یہ فرمان تم کو پہونچا دیا ہے)۔

ابو شریح سے کسی نے پوچھا کہ پھر عمرو بن سعید نے کیا جواب دیا، انھوں نے بتلایا کہ اُس نے کہا کہ ابو شریح! میں یہ باتیں تم سے زیادہ جانتا ہوں، حرم کسی نافرمان کو یا ایسے آدمی کو جو کسی کا ناحق خون کر کے یا کوئی نقصان کر کے بھاگ گیا ہو پناہ نہیں دیتا (یعنی ایسے لوگوں کے خلاف حرم میں بھی کارروائی کی جائے گی)

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح) اسلام کی پہلی ہی صدی میں سیاسی اقتدار کی ہوس رکھنے والوں نے اسلام کے ساتھ جو معاملہ کیا اور اس کے احکام کو اپنی اغراض کے لیے جس طرح توڑا مروڑا وہ تاریخ اسلام کا نہایت تکلیف دہ باب ہے۔ ابو شریح عدوی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے انھوں نے اموی حاکم عمرو بن سعید کے سامنے بر وقت کلمۂ حق کہہ کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سنا کے اپنا فرض ادا کر دیا ــــــ صحیحین کی اس روایت میں یہ مذکور نہیں ہے کہ عمرو بن سعید نے جو بات کہی ابو شریح نے اس کے جواب میں کچھ کہا یا نہیں ــــــ لیکن مسند احمد کی روایت میں ہے کہ انھوں نے فرمایا۔

قَدْ كُنْتُ شَاهِدًا وَكُنْتَ غَائِبًا وَقَدْ أَمَرَنَا أَنْ يُبَلِّغَ شَاهِدُنَا غَائِبَنَا وَقَدْ	فتح مکہ کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی تھی میں اس وقت وہاں حاضر اور موجود تھا اور تم

بَلَّغْتُكَ [1] وہاں نہیں تھے اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا تھا کہ جو یہاں موجود ہیں وہ میری یہ بات ان لوگوں کو پہونچا دیں جو یہاں حاضر نہیں ہیں ــــ میں نے اس حکم نبوی کی تعمیل کر دی اور تم کو یہ بات پہونچا دی۔

ابو شریح عدوی رضی اللہ عنہ کے اس جواب میں یہ بھی مضمر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مقصد و منشا سمجھنے کے زیادہ حقدار وہ لوگ ہیں جن کے سامنے آپ نے یہ بات فرمائی، اور جنھوں نے موقع پر حضور سے یہ بات سنی۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَدِيِّ بْنِ حَمْرَاءَ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاقِفًا عَلَى الْحَزْوَرَةِ فَقَالَ وَاللّٰهِ اِنَّكِ لَخَيْرُ اَرْضِ اللّٰهِ وَاَحَبُّ اَرْضِ اللّٰهِ اِلَى اللّٰهِ وَلَوْلَا اَنِّيْ اُخْرِجْتُ مِنْكِ مَا خَرَجْتُ۔ ــــــــ رواہ الترمذی وابن ماجۃ

عبد اللہ بن عدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ مکہ میں حَزْوَرہ (ایک ٹیلے) پر کھڑے تھے اور مکہ سے مخاطب ہو کر فرما رہے تھے خدا کی قسم تو اللہ کی زمین میں سب سے بہتر جگہ ہے اور اللہ کی نگاہ میں سب سے زیادہ محبوب ہے اور اگر مجھے یہاں سے نکلنے اور ہجرت کرنے پر مجبور نہ کیا گیا ہوتا تو میں ہرگز تجھے چھوڑ کے نہ جاتا۔

(جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

(تشریح) اس حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ مکہ معظمہ تمام روئے زمین میں سب سے افضل اور باعظمت اور اللہ کے نزدیک محبوب ترین جگہ ہے۔ اور ہونا بھی یہی چاہیے کیونکہ اس میں کعبۃ اللہ ہے جو حق تعالیٰ کی خاص الخاص تجلی گاہ اور قیامت تک کیلئے اہل ایمان کا قبلہ ہے جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی طواف کرتے تھے اور اسی کی

---

[1] فتح الباری کتاب المناسک، باب لا یعضد شجر الحرم الخ

(رات) رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے ــــ اسی مضمون کی حدیث قریب قریب انہی الفاظ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کی گئی ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَكَّةَ مَا اَطْيَبَكِ مِنْ بَلَدٍ وَاَحَبَّكِ اِلَيَّ وَلَوْلَا اَنَّ قَوْمِيْ اَخْرَجُوْنِيْ مِنْكِ مَا سَكَنْتُ غَيْرَكِ ــــ رواہ الترمذی

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تو کس قدر پاکیزہ اور دلپسند شہر ہے اور تو مجھے کتنا محبوب ہے اور اگر میری قوم نے مجھے نکالا نہ ہوتا تو میں تجھے چھوڑ کے کسی اور جگہ نہ بستا۔ (جامع ترمذی)

(تشریح) ان دونوں حدیثوں میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ یہ بات آپ نے کس موقع پر فرمائی شارحین نے حضرت عبداللہ بن عباس والی اس حدیث کی شرح میں ذکر کیا ہے کہ آپ نے یہ بات فتح مکہ کے سفر میں مکہ سے واپس ہونے کے وقت فرمائی تھی۔ واللہ اعلم۔

مدینۂ طیبہ کی عظمت اور محبوبیت

اکثر محدثین کا دستور ہے کہ وہ اپنی مؤلفات میں حج و عمرہ سے متعلق حدیثوں کے ساتھ "باب فضل مکۃ" کے تحت مکہ معظمہ کی عظمت و فضیلت کی حدیثیں اور انہی کے ساتھ "باب فضل المدینۃ" کے تحت مدینۂ طیبہ کی عظمت کی حدیثیں بھی درج کرتے ہیں۔ اسی طریقہ کی پیروی کرتے ہوئے یہاں بھی پہلے مکہ معظمہ سے متعلق احادیث درج کی گئی ہیں اور اب مدینۂ طیبہ سے متعلق درج کی جارہی ہیں۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ سَمَّى الْمَدِيْنَةَ طَابَةَ۔

ــــ رواہ مسلم

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ کا نام طابہ رکھا ہے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) طابہ، طیبہ اور طیّبہ ان تینوں کے معنی پاکیزہ اور خوشگوار کے ہیں اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ نام رکھا اور اس کو ایسا ہی کر دیا، اس میں روحوں کے لیے جو خوشگواری جو سکون و اطمینان اور جو پاکیزگی ہے وہ بس اسی کا حصہ ہے۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اِبْرَاہِیْمَ حَرَّمَ مَکَّۃَ فَجَعَلَہَا حَرَامًا وَاِنِّیْ حَرَّمْتُ الْمَدِیْنَۃَ حَرَامًا مَابَیْنَ مَازِمَیْہَا اَنْ لَا یُہْرَاقَ فِیْہَا دَمٌ وَّلَا یُحْمَلُ فِیْہَا سِلَاحٌ وَلَا تُخْبَطُ فِیْہَا شَجَرَۃٌ اِلَّا لِعَلَفٍ ـــــــ رواہ مسلم

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم نے مکہ کے "حرم" ہونے کا اعلان کیا تھا (اور اس کے خاص آداب و احکام بتلائے تھے) اور میں مدینہ کے "حرم" قرار دیئے جانے کا اعلان کرتا ہوں اس کے دونوں طرف کے دروں کے درمیان کا پورا رقبہ واجب الاحترام ہے، اس میں خونریزی نہ کی جائے کسی کے خلاف ہتھیار نہ اٹھایا جائے (یعنی اسلحہ کا استعمال نہ کیا جائے) اور جانوروں کے چارے کی ضرورت کے سوا درختوں کے پتے بھی نہ جھاڑے جائیں۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا، مدینہ طیبہ بھی سرکاری علاقہ کی طرح واجب الاحترام ہے اور وہاں ہر وہ عمل اور اقدام منع ہے جو اس کی عظمت و حرمت کے خلاف ہو۔ لیکن اس کے احکام بالکل وہ نہیں ہیں جو حرم مکہ کے ہیں۔ خود اسی حدیث میں اس کا اشارہ موجود ہے۔ اس میں جانوروں کے چارہ کے لیے وہاں کے درختوں کے پتے توڑنے اور جھاڑنے کی اجازت دی گئی ہے جب کہ حرم مکہ میں اس کی بھی اجازت نہیں ہے۔

عَنْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنِّىْ أُحَرِّمُ مَا بَيْنَ لَابَتَيِ الْمَدِيْنَةِ أَنْ يُّقْطَعَ عِضَاهُهَا أَوْ يُقْتَلَ صَيْدُهَا وَقَالَ الْمَدِيْنَةُ خَيْرٌ لَّهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ لَا يَدَعُهَا أَحَدٌ رَغْبَةً عَنْهَا إِلَّا أَبْدَلَ اللّٰهُ فِيْهَا مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِّنْهُ وَلَا يَثْبُتُ أَحَدٌ عَلٰى لَأْوَائِهَا وَجَهْدِهَا إِلَّا كُنْتُ لَهٗ شَفِيْعًا أَوْ شَهِيْدًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔

رواہ مسلم

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں حرم قرار دیتا ہوں مدینہ کے دونوں طرف کے سنگستانی کناروں کے درمیان کے علاقوں کو (یعنی اس کے واجب الاحترام ہونے کا اعلان کرتا ہوں، اور حکم دیتا ہوں کہ) اس کے خاردار درخت کاٹے نہ جائیں اور اس میں رہنے والے جانوروں کو شکار نہ کیا جائے ــــ اسی سلسلہ میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ (بعض اشیاء کی کمی اور بعض تکلیفوں کے باوجود) مدینہ لوگوں کے لیے بہتر ہے، اگر وہ اس کی خیر و برکت کو جانتے (تو کسی تنگی اور پریشانی کی وجہ سے اور کسی لالچ میں اس کو نہ چھوڑتے) جو کوئی اپنی پسند اور خواہش سے اس کو چھوڑ کے جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ اپنے کسی ایسے بندہ کو بھیج دے گا جو اس سے بہتر اور افضل ہوگا۔ (یعنی کسی کے اس طرح چلے جانے سے مدینہ میں کوئی کمی نہیں آئے گی بلکہ وہ جانے والا ہی اس کی برکات سے محروم ہو کر جائے گا) اور جو بندہ مدینہ کی تکلیفوں، تنگیوں اور مشقتوں پر صبر کرکے وہاں پڑا رہے گا میں قیامت کے دن اس کی سفارش کروں گا یا اس کے حق میں شہادت دوں گا۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) سفارش اس کی کہ اس کے قصور اور اس کی خطائیں معاف کردی جائیں۔ اور اس کو بخشدیا جائے، اور شہادت اس کے ایمان اور اعمال صالحہ کی اور اس بات کی کہ یہ بندہ تنگیوں تکلیفوں پر صبر کیے ہوئے مدینہ ہی میں پڑا رہا۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ

لَا يَصْبِرُ عَلَى لَأْوَاءِ الْمَدِينَةِ وَشِدَّتِهَا أَحَدٌ مِنْ أُمَّتِي إِلَّا كُنْتُ لَهُ شَفِيعًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ـــــــــ رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرا جو امتی مدینہ کی تکلیفوں اور سختیوں پر صبر کر کے وہاں رہے گا، میں قیامت کے دن اس کی شفاعت اور سفارش کروں گا۔ (صحیح مسلم)

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ النَّاسُ إِذَا رَأَوْا أَوَّلَ الثَّمَرَةِ جَاؤُا بِهِ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِذَا أَخَذَهُ قَالَ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي مَدِينَتِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَبَارِكْ لَنَا فِي مُدِّنَا اَللّٰهُمَّ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ عَبْدُكَ وَخَلِيلُكَ وَنَبِيُّكَ وَإِنِّي عَبْدُكَ وَنَبِيُّكَ وَإِنَّهُ دَعَاكَ لِمَكَّةَ وَأَنَا أَدْعُوكَ لِلْمَدِينَةِ بِمِثْلِ مَا دَعَاكَ لِمَكَّةَ وَمِثْلِهِ مَعَهُ ثُمَّ قَالَ يَدْعُو أَصْغَرَ وَلِيدٍ لَهُ فَيُعْطِيهِ ذَالِكَ الثَّمَرَ ـــــــــ رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں کا دستور تھا کہ جب وہ درخت پر نیا پھل دیکھتے تو اس کو لاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے، آپ اس کو قبول فرما کر اس طرح دعا فرماتے ـــــ "اے اللہ ہمارے پھلوں میں اور پیداوار میں برکت دے اور ہمارے شہر مدینہ میں برکت دے اور ہمارے صاع اور ہمارے مُد میں برکت دے! الٰہی ابراہیم تیرے خاص بندے اور تیرے خلیل اور تیرے نبی تھے اور میں بھی تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں انھوں نے مکہ کے لیے تجھ سے دعا کی تھی اور میں مدینہ کے لیے تجھ سے ویسی ہی دعا کرتا ہوں اور اس کے ساتھ اتنی ہی مزید ـــــ پھر آپ کسی چھوٹے بچے کو بلاتے اور وہ نیا پھل اس کو دے دیتے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) پھلوں اور پیداوار میں برکت کا مطلب تو ظاہر ہے کہ زیادہ سے زیادہ پیداوار ہو اور فصل بھرپور ہو۔ اور شہر مدینہ میں برکت کا مطلب یہ ہے کہ وہ خوب آباد ہو اور اس کے

بسنے والوں پر اللہ کا فضل ہو ____ اور صاع اور مُد دو پیمانے ہیں، اُس زمانہ میں غلہ وغیرہ کی خرید و فروخت ان پیمانوں ہی سے ہوتی تھی، ان میں برکت کا مطلب یہ ہے کہ ایک صاع یا ایک مُد جتنے آدمیوں کے لیے یا جتنے دنوں کے لیے کافی ہوتا ہے اُس سے زیادہ کے لیے کافی ہو۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم کی اُس دُعا کا ذکر ہے جو آپ نے اپنے بیوی بچہ کو مکہ کی غیر آباد اور بے آب و گیاہ وادی میں بسا کر اللہ سے اُن کے لیے کی تھی کہ اے اللہ تو اپنے بندوں کے دلوں میں ان کی محبت و مودّت ڈال دے اور ان کو ان کی ضرورت کا رزق اور پھل وغیرہ پہونچا۔ اور یہاں کے لیے امن اور سلامتی مقدر فرما!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور نظیر اس ابراہیمی دُعا کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ سے مدینہ کے لیے وہی دُعا بلکہ مزید اضافے کے ساتھ کرتے تھے ____ اس دُعا کا یہ ثمرہ بھی ظاہر ہے کہ دنیا بھر کے جن ایمان والے بندوں کو مکہ سے محبت ہے اُن سب کو مدینۂ طیبہ سے بھی محبت ہے اور اس محبوبیت میں تو اس کا حصہ مکہ سے یقیناً زیادہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دُعا میں حضرت ابراہیم کو اللہ کا بندہ اس کا نبی اور اس کا خلیل کہا اور اپنے کو صرف بندہ اور نبی کہا، حبیب ہونے کا ذکر نہیں کیا۔ یہ تواضع اور کسرِ نفسی آپ کا مستقل مزاج تھا۔

پاکل نیا اور درخت کا پہلا پھل چھوٹے بچہ کو بلا کر دینے میں یہ سبق ہے کہ ایسے موقعوں پر چھوٹے معصوم بچوں کو مقدم رکھنا چاہیے۔ اس کے علاوہ نئے پھل اور کم سن بچے کی مناسبت بھی ظاہر ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَنْفِیَ الْمَدِیْنَةُ شِرَارَهَا كَمَا یَنْفِی الْكِیْرُ خَبَثَ الْحَدِیْدِ ____ رواہ مسلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت اُس وقت تک نہیں آئے گی جب تک مدینہ اپنے فاسد اور خراب عناصر کو اس طرح باہر نہ پھینک دے گا جس طرح لوہار کی بھٹی لوہے کے میل کو

دور کر دیتی ہے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) یعنی قیامت آنے سے پہلے مدینہ کی آبادی کو ایسے خراب عناصر سے پاک صاف کر دیا جائے گا جو عقائد و افکار اور اعمال و اخلاق کے لحاظ سے گندے ہوں گے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اَنْقَابِ الْمَدِیْنَةِ مَلَائِكَةٌ لَا یَدْخُلُهَا الطَّاعُوْنُ وَلَا الدَّجَّالُ ــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مدینہ کے راستوں پر فرشتے مقرر ہیں اس میں طاعون اور دجال داخل نہیں ہو سکتا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) صحیحین ہی کی بعض دوسری حدیثوں میں مدینہ طیبہ کے ساتھ مکہ معظمہ کی بھی خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ دجال اس میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ یہ غالباً ان دعاؤں کی برکات میں سے ہے جو اللہ کے خلیل سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور اللہ کے حبیب حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں مقدس و مبارک شہروں کے لیے کی تھیں۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اسْتَطَاعَ اَنْ یَّمُوْتَ بِالْمَدِیْنَةِ فَلْیَمُتْ بِهَا فَاِنِّیْ اَشْفَعُ لِمَنْ یَّمُوْتُ بِهَا ــــــــ رواہ احمد والترمذی

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو اس کی کوشش کر سکے کہ مدینہ میں اس کی موت ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ (اس کی کوشش کرے اور) مدینہ میں مرے۔ میں ان لوگوں کی ضرور شفاعت کروں گا جو مدینہ میں مریں گے (اور وہاں دفن ہوں گے) (مسند احمد، جامع ترمذی)

(تشریح) ظاہر ہے کہ یہ بات کہ موت فلاں جگہ آئے، کسی کے اختیار میں نہیں ہے بلکہ اس کی آرزو اور دعا کر سکتا ہے اور کسی درجہ میں اس کی کوشش بھی کر سکتا ہے

بار جس جگہ مرنا چاہے وہیں جا کے پڑ جائے، اگر قضا و قدر کا فیصلہ خلاف نہیں ہے تو موت وہیں آئے گی ——— بہرحال حدیث کا مدعا یہی ہے کہ جو شخص یہ سعادت حاصل کرنا چاہے وہ اس کے لیے اپنے امکان کی حد تک کوشش کرے اخلاص کے ساتھ کوشش کرنے والوں کی اللہ تعالیٰ بھی مدد کرتا ہے۔

عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ جَالِساً وَقَبْرٌ يُحْفَرُ بِالْمَدِيْنَةِ فَاطَّلَعَ رَجُلٌ فِي الْقَبْرِ فَقَالَ بِئْسَ مَضْجَعُ الْمُؤْمِنِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِئْسَ مَا قُلْتَ قَالَ الرَّجُلُ اِنِّيْ لَمْ اُرِدْ هٰذَا اِنَّمَا اَرَدْتُّ الْقَتْلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا مِثْلَ الْقَتْلِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا عَلَى الْاَرْضِ بُقْعَةٌ اَحَبُّ اِلَيَّ اَنْ يَكُوْنَ قَبْرِيْ فِيْهَا مِنْهَا ثَلٰثَ مَرَّاتٍ ——— رواہ مالک مرسلاً

یحییٰ بن سعید انصاری تابعی سے بطریق ارسال روایت ہے (یعنی وہ صحابی کا واسطہ ذکر کیے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مدینہ کے قبرستان میں) تشریف فرما تھے اور (کسی میت کی) قبر کھودی جا رہی تھی۔ ایک صاحب نے قبر میں جھانک کر دیکھا اور ان کی زبان سے نکلا کہ مسلمان کے لیے یہ اچھی آرام گاہ نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ تمہاری زبان سے بہت بری بات نکلی، (ایک مسلمان کو مدینہ میں موت اور قبر نصیب ہوئی اور تم کہتے ہو کہ مسلمان کے لیے یہ آرام گاہ اچھی نہیں) اُن صاحب نے (بطور معذرت) عرض کیا حضور میرا مطلب یہ نہیں تھا (کہ مدینہ میں موت اور قبر اچھی نہیں) بلکہ میرا مقصد راہ خدا میں شہادت سے تھا (یعنی میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ یہ مرنے والے بھائی اگر بستر پر مرنے اور اس قبر میں دفن ہونے کے بجائے جہاد کے کسی میدان میں شہید ہوتے اور ان کی لاش وہاں خاک و خون میں تڑپتی تو اس قبر میں دفن ہونے سے یہ زیادہ اچھا ہوتا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا راہ خدا میں

شہید ہونے کے برابر تو نہیں (یعنی شہادت کا مقام تو بیشک بلند ہے، لیکن مدینہ میں مرنا اور اس کی خاک میں دفن ہونا بھی بڑی سعادت اور خوش نصیبی ہے) روئے زمین پر کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں اپنی قبر کا ہونا مجھے مدینہ سے زیادہ محبوب ہو ——

یہ بات آپ نے تین دفعہ ارشاد فرمائی۔ (موطا امام مالک)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ شہادت فی سبیل اللہ کی فضیلت و عظمت بیشک مسلم ہے اور بستر پر مرنا اور میدانِ جہاد میں اللہ کے لیے سر کٹانا برابر نہیں لیکن مدینہ میں مرنا اور یہاں دفن ہونا بھی بڑی خوش بختی ہے جس کی خود مجھے بھی چاہت اور آرزو ہے۔

امام بخاری نے اپنی جامع صحیح بخاری میں کتاب الحج کے بالکل آخر میں مدینۂ طیبہ کے فضائل کے سلسلہ کی حدیثیں ذکر کرنے کے بعد اس بیان کا خاتمہ امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی اس مشہور دعا پر کیا ہے کہ

"اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِیْ شَهَادَةً فِیْ سَبِیْلِكَ وَاجْعَلْ مَوْتِیْ فِیْ بَلَدِ رَسُوْلِكَ"

اے اللہ مجھے اپنی راہ میں شہادت بھی دے اور اپنے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک شہر (مدینہ) میں مرنا اور دفن ہونا بھی نصیب فرما!

اس دعا کا واقعہ ابن سعد نے صحیح سند کے ساتھ یہ روایت کیا ہے کہ عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ نے خواب دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے ہیں۔ انھوں نے یہ خواب حضرت عمر سے بیان کیا۔ حضرت عمر نے بڑی حسرت سے کہا۔

اَنّٰى لِیْ بِالشَّهَادَةِ وَاَنَا بَیْنَ ظَهْرَانَیْ جَزِیْرَةِ الْعَرَبِ لَسْتُ اَغْزُوْ وَالنَّاسُ حَوْلِیْ۔	مجھے شہادت فی سبیل اللہ کیسے نصیب ہو سکتی ہے جبکہ میں جزیرۃ العرب کے درمیان مقیم ہوں (اور وہ سب دار الاسلام بن چکا) اور میں خود جہاد نہیں کرتا اور اللہ کے بندے ہر وقت میرے آس پاس رہتے ہیں۔

پھر خود ہی کہا۔

"بِكَمْ يَاتِي بِهَا اللّٰهُ يَا شَاءَ"
(فتح الباری بحوالہ ابن سعد)

مجھے شہادت کیونکر نصیب ہو سکتی مگر
اللہ چاہے گا تو اسی حالات میں مجھے
شہادت سے نوازے گا۔

اس کے بعد آپ نے اللہ تعالیٰ سے وہ دعا کی جو اوپر درج کی گئی ہے۔ آپ کی زبان سے یہ دُعا سُن کر آپ کی صاحبزادی اُم المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ راہِ خدا میں شہید بھی ہوں اور موت مدینہ میں بھی ہو؟ آپ نے فرمایا اللہ چاہے گا تو یہ دونوں باتیں ہو جائیں گی۔

اس سلسلہ کی روایات میں یہ بھی ہے کہ لوگوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس عجیب غریب اور بظاہر ناممکن سی دُعا سے تعجب ہوتا تھا اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ دونوں باتیں کس طرح ہو سکتی ہیں۔ جب ابو لؤلؤ نے مسجد نبوی کی محراب میں آپ کو زخمی کیا تب سب نے سمجھا کہ دُعا کی قبولیت اس طرح مقدر تھی[۵]

بیشک جب اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو اس چیز کو واقع کر کے دکھا دیتا ہے جس کے امکان میں بھی انسانی عقلیں شبہ کریں۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

[۵] فتح الباری جزء رابع آخر کتاب الحج ۱۲

تجلیاتِ مجددِ الفِ ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

(ترجمہ ـــــ از ـــــ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

مکتوب (۷۰) مولانا محمد اسحٰق ولد قاضی موسیٰ کے نام ـــــ

[در ترغیب صحبت ماجدلان]

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی ـــــ ہم عکّی درویش کے ہاتھ جو مکتوب بھیجا تھا مل گیا۔ چونکہ وہ ذوق و شوق کی اطلاع دے رہا تھا اس لیے اس نے مسرت بخشی۔ ایک علحدہ کاغذ پر اپنا خواب بھی لکھا تھا اُس کے مطالعہ سے فرحت پر فرحت ہوئی۔ اس قسم کے واقعات (خواب) مُبشّرات ہیں۔ سعی کرنا چاہیئے کہ قوت سے فعل میں اور گوش سے آغوش میں آجائیں۔ آج جب کہ کوتاہیوں کا تدارک ممکن ہے فرصت کو غنیمت سمجھنا چاہیے اور (اس کارِ خیر میں) یہ کہہ کر کہ "عنقریب اس کو انجام دے لوں گا"۔ تاخیر او رٹال مٹول نہیں کرنی چاہیئے ـــــ

حضرت خواجہ عبید اللہ احرار قدس سرہٗ نے فرمایا ہے کہ ہم درویشوں کی ایک جماعت بیٹھی تھی۔ اس مجلس میں جمعہ کی اس ساعت کا ذکر چھڑا جس میں قبولیتِ دعا کی قوی اُمید ہوتی ہے ـــــ دورانِ گفتگو میں یہ بات بھی آئی کہ جمعہ کی وہ ساعتِ مقبولہ کسی کو میسّر آجائے تو حضرت حق سبحانہ وتعالےٰ سے کیا طلب کرنا چاہیئے؟ ہر ایک نے اپنی اپنی مطلوب چیز کو بتایا جب میرے بتانے کی نوبت آئی تو میں نے کہا کہ "(اس ساعت میں) صحبتِ اربابِ جمعیّت کو طلب کرنا چاہیئے اس لئے کہ اس کے ضمن میں تمام سعادتیں میسّر آجاتی ہیں" ـــــ بعض مکاتیب کو نقل کرا کے قاصد کے ہاتھ

بھیج رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اُن سے بہرہ ور فرمائے ـــــ برادر شیخ کریم الدین کچھ عرصے سے یہاں آئے ہوئے ہیں وہ اپنے حالات شاید خود ہی تم کو لکھ کر بھیجیں ـــــ دوستوں سے دُعا کی توقع ہے ـــــ رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْر (اے ہمارے رب ہمارے نور کو مکمل کردے اور ہمیں بخش دے بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے) والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ والتزم متابعۃ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ۔

مکتوب (۷۲) خواجہ حسام الدین احمدؒ کے نام ـــــ

[قیام لشکر کے کچھ حالات اور ایک استفسار کا جواب]

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ مکتوب گرامی جو از روئے کرم و شفقت آپ نے اس فقیر کو بھیجا تھا اُس کے مطالعے سے مشرف ہوا ـــــ اللہ کا شکر ہے کہ آپ صحت و عافیت سے ہیں اور اپنے دور افتادہ دوستوں کی پرسش احوال سے فارغ و بے فکر نہیں ہیں ـــــ اس طرف کے فقراء کے احوال و اوضاع لائق حمد ہیں۔ عین بلا میں عافیت ہے اور ایسی جگہ جہاں تفرقۂ قلب کا اندیشہ تھا ـــــ جمعیت قلب حاصل ہے ـــــ میرے فرزند اور احباب جو ہمراہ ہیں ان کے اوقات، اطمینان کے ساتھ گزر رہے ہیں ـــــ نیز اُن کے احوال، ترقی پر ہیں ـــــ اُن کے حق میں لشکر نے ایک خاص خانقاہ کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ لشکریوں کے رنگ برنگ حالات کی موجودگی میں ساتھیوں کو تمکین نصیب ہے اور مختلف و متفرق پھندوں کے اندر رہ کر جو کہ لشکر کے لوازم میں سے ہیں۔ ہمارے آدمی بس ایک ہی مطلب و مقصد میں گرفتار ہیں ـــــ نہ کسی لشکری کو ان سے سروکار نہ ان کو کسی سے ناگواری ـــــ ان سب باتوں کے باوجود (اختیار کچھ بھی نہیں رکھتے بلکہ) ہم مسلوب الاختیار ہیں اور (یک گونہ) حبس و قید کی حالت میں ہیں ـــــ یہ عجیب حبس ہے کہ اس سے رہائی کو ایک جَو کے عوض بھی نہ خریدیں اور عجیب قید ہے کہ اس سے آزادی کو ایک کوڑی کے بدلے بھی قبول نہ کریں ـــــ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اس نعمت پر بھی اور اسکی تمام بڑی بڑی نعمتوں پر ـــــ

مخدوما! قرۃ العینین (ہر دو صاحبزادگان حضرت مرشد خواجہ باقی باللہؒ) کو جو مکتوب بھیجا گیا تھا اُس سے مقصود صرف اظہارِ حسرت تھا بعض اُن نعمتوں کے فوت ہو جانے پر کہ دہلی کے پڑوس (سرہند) میں (ہماری قید و بند سے قبل) اُن نعمتوں کا حصول (صاحبزادگان کے لئے) متوقع تھا ـــــــ اب اُن کا لشکر میں آنا اور یہاں پر ہماری صحبت اختیار کرنا یہ آپ کی صوابدید پر موقوف ہے کیونکہ آپ "لشکر و لشکریاں" کے طور طریقوں کو خوب جانتے ہیں اور اس جگہ کے نفع و ضرر کو اچھی طرح سمجھتے ہیں ـــــ آپنے لکھا تھا کہ "اگر تم لکھو کہ صاحبزادگان (لشکر میں آکر) آفات سے محفوظ رہیں گے تو وہ (بغرض کسب فیض صحبت) لشکر میں آجائیں" ـــــــ غیب کا علم تو اللہ ہی کو ہے ـــــ لیکن اللہ کا شکر کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ باوجود فوجیوں سے کثرت اختلاط کے ہمراہیوں میں سے کسی شخص کو اس وقت تک کوئی ایسی بات پیش نہیں آئی جس کو آفت تفرقہ کہہ سکیں ـــــ (لشکر نے) میرے ہمراہیوں کو اُن کے مطلب حقیقی سے نہیں روکا ــــــــ دوسری بات مولود خوانی کے بارے میں آپنے لکھی تھی کہ ـــــ اُس کے اندر اچھی آواز سے قرآن پڑھنے اور قصائد نعت و منقبت پڑھنے میں کیا مضائقہ ہے؟ ممنوع تو یہ ہے کہ قرآن اس طرح پڑھیں کہ حروف قرآن میں تحریف و تغیر واقع ہو جائے اور موسیقی کی رعایت کرتے ہوئے آواز کو ...... گھمایا جائے اور اس طرح تو شعر پڑھنا بھی غیر مباح ہے چہ جائیکہ قرآن مجید۔ البتہ اگر قرآن مجید کو اس طرح پڑھا جائے کہ کسی قسم کا کوئی تغیر، کلمات قرآنی میں واقع نہ ہونے پائے تو کیا حرج ہے؟ اسی طرح قصائد نعت و منقبت کو اس طرح پڑھیں کہ اس میں مقاماتِ نغمہ کی رعایت نہ ہو اور تالی بجانا بھی نہ ہو اور نیت بھی صحیح ہو تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟

مخدوما! خاطرِ فقیر میں یہ بات آتی ہے کہ جب تک مطلقاً یہ دروازہ بند نہ کیا جائے گا بوالہوس لوگ باز نہیں آئیں گے اگر تھوڑی سی اجازت دیدی گئی تو بات بہت دور تک پہونچ جائے گی ـــــ قلیلہٗ یُفضی الیٰ کثیرہٖ (تھوڑا بہت تک پہونچاتا ہے) ـــــ والسّلام

مکتوب (۷۰) صاحبزادگان گرامی قدر (خواجہ محمد سعیدؒ و خواجہ محمد معصومؒ) کے نام۔

[اظہارِ اشتیاق و تذکرہ ثمرات و نتائج لشکر]

الحمد للہ والسلام علی رسول اللہ ــــــ فرزندانِ گرامی اگرچہ ہماری صحبت میں ہمیشہ رہنے کے مشتاق و خواہاں ہیں اور ہم بھی اُن کو اپنے پاس حاضر رکھنے اور اُن کی ملاقات کے آرزومند ہیں لیکن کیا کیا جائے تمام آرزوئیں پوری نہیں ہوا کرتیں۔

ع ــــ تجری الریاح بما لا تشتھی السفن [1]

میں تو لشکر کے طور وطریق کے ماتحت، بے اختیار اور بے خواہش و رغبت رہنا بہت ہی غنیمت سمجھتا ہوں اور اس مقام کی ایک ساعت کو دوسرے مقامات کی بہت سی ساعتوں سے بہتر تصور کرتا ہوں۔ اس جگہ (لشکر میں) وہ (بات) حقیقی طور پر میسر ہے جس کی ظاہری شکل بھی مجھے معلوم نہیں کہ دوسرے مقامات پر میسر ہو سکتی ہے ــــ اس مقام کے علوم و معارف بھی جدا ہیں، اس مجمع کے احوال و مقامات بھی علیحدہ ہیں جو رکاوٹ (اور نظر بندی) سلطان جہانگیر کی طرف سے ہے اس کو میں تو مولائے حقیقی کی انتہائی رافت و رضامندی کا دروازہ جانتا ہوں اور اس محبوسی کے اندر اپنی سعادت سمجھتا ہوں ــــ علی الخصوص اِن ایام اختلاف میں اور اِن "اوقات پر تفرقہ" میں عجیب و غریب معاملہ اور چشم و ابروئے محبوب حقیقی کے اشارات نیز اس کے ناز و ادا کے کرشمے (ظاہر ہو رہے) ہیں ــــ لیکن جو دولت تازہ و عجیب روز بروز (قلب پر) وارد ہو رہی ہے ــــ (اس کی وجہ سے) فرزندوں کی یاد میرے دل میں چٹکیاں سے رہی ہے اور اُن کی دوری اور نارسائی سے جگر، اضطراب میں رہتا ہے ــــ میں سمجھتا ہوں کہ میرا اشتیاق تمہارے اشتیاق سے بڑھا ہوا ہے اور یہ بات مُسلّم ہے کہ باپ جتنا بیٹے کو چاہتا ہے۔ بیٹا اتنا باپ کو نہیں چاہتا۔ اگرچہ

---

[1] بعض اوقات ہوائیں کشتیوں کی آرزوؤں کے برخلاف چلا کرتی ہیں یعنی کبھی ہوائیں کشتیوں کی سمت رفتار کے مخالف چلتی ہیں۔

اصالت و فرعیت کا معاملہ اس کے برعکس کا تقاضا کرتا ہے اس لئے کہ اصل کو احتیاج نہیں ہوتی اور فرع سراسر محتاج اصل ہے ــــ لیکن ازل سے کچھ ایسا ہی طے ہوا ہے اور اصل (باپ) کا شوق و اشتیاق، قوی تر ثابت ہو گیا ہے ــــ ہاں ٹھیک ہے ع

در خانہ اگر خدائے ماند ہمہ چیز

(گھر میں صاحبِ خانہ کے دم سے سب چیزیں برقرار رہتی ہیں) ــــ اگر (بسلسلہ قیام لشکر) دہلی میں ہوں تو تمہارا ہمسایہ ہوں اور آگرہ میں ہوں تب بھی بفضلِ خداوندی تم سے قریب ہوں۔		والسّلام۔

مکتوب (۷۹) خواجہ محمد معصومؒ کے نام ــــ

[ایک طویل مکتوب کے آخر کی چند سطریں]

...... شیخ محی الدین ابن عربی قدس سرہٗ وہ ہیں جنھوں نے سخنِ معرفت و عرفان کی بنیاد رکھی ہے اور اس کو شرح و بسط کا جامہ پہنایا ہے، وہی ہیں جنھوں نے توحید و اتحاد کے متعلق تفصیل سے بات کہی ہے اور تعدد و تکثر کے منشا کو بیان فرمایا ہے۔ وہی ہیں کہ تنزلاتِ خمسہ کو وجود کے لئے ثابت کیا ہے اور ہر مقام کے جُدا جُدا احکام پیش کئے ہیں۔ انھوں نے عالم کو عینِ حق جانا اور ہمہ اوست کہا ہے اس کے باوجود مرتبۂ تنزیہ حق سبحانہٗ کو وراء الوراء پایا ہے اور سب کی دید و دانش سے اللہ تعالیٰ کو منزہ و مبرّا لکھا ہے۔ ان سے پہلے جو مشائخ ہوئے ہیں انھوں نے اس توحید کے بارے میں اگر کوئی بات کہی ہے تو اشارات و رموز میں کہی ہے شرح و تفصیل میں مشغول نہیں ہوئے ہیں۔ جو مشائخ، شیخ اکبرؒ کے بعد ہوئے ہیں ان میں سے اکثر نے تقلیدِ شیخ اختیار کی ہے اور ان کی اصطلاح کے موافق گفتگو کی ہے۔ ہم پسماندگان نے بھی شیخ اکبرؒ کی برکات سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے اور اُن کے علوم و معارف سے بہت کچھ حصّہ لیا ہے اللہ تعالیٰ اُن کو ہماری جانب سے بہترین جزا دے ــــ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ بحکمِ بشریت خطا و صواب کے مقام چونکہ آپس میں مختلف ہو جایا کرتے ہیں اور انسان سے کبھی (کسی مسئلے میں) بےقصد خطا ہو جاتی ہے اور کبھی وہ صحت و صواب کی منزل پر گامزن ہوتا ہے ایسی صورت میں

ضروری ہوا کہ احکام سوادِ اعظم اہلِ حق کی موافقت کو معیارِ صحت و ثواب بنایا جائے اور اہلِ حق کے سوادِ اعظم کی مخالفت کو دلیلِ خطا سمجھا جائے ـــــ قائل کوئی بھی ہو اور مقولہ کچھ بھی ہو ـــــ مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے "تم اہلِ اسلام کے سوادِ اعظم کا اتباع کرو" ـــــ اور یہ بات بھی مسلّم ہے کہ فکرہائے مختلف کے مل جانے اور اختلافِ نظریات کے ذریعے تکمیلِ صناعت وجود میں آتی ہے ـــــ (دیکھو) سیبویہ کے متعلق ہر چند یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ بانئ احکامِ نحو ہے لیکن جس نحو نے متاخرین کے افکار کے باہم جمع ہو جانے اور ان کے نظریات کے اختلاف سے کمال و تنقیح کا درجہ حاصل کرلیا ہے اور ایک نئی زیب و زینت پالی ہے اُس نحو کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب وہ نوعِ دیگر ہوگئی ہے اور اس نے علٰحدہ احکام پالئے ہیں ـــــ

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ـــــ والسّلام۔

مکتوب (۸۲) صاحبزادگان گرامی قدر خواجہ محمد سعیدؒ و خواجہ محمد معصومؒ کے نام۔

[اظہارِ آلامِ فراق]

الحمد للہ وسلامٌ علی عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ فرزندانِ گرامی جمعیتِ صوری و معنوی کے ساتھ متصف رہیں ـــــ میں ان (لشکری) سفروں اور مشقتوں میں کوئی درد بھی تم دونوں عزیز فرزندوں کی مفارقت کے برابر نہیں محسوس کرتا۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تمہاری یاد سے فارغ ہوں ـــــ جس قدر منعمِ حقیقی جلّ شانہٗ کی نعمتوں کا حصول زیادہ ہے اُسی قدر دور افتادہ عزیزوں کی یاد بڑھ رہی ہے ـــــ احوالِ جدیدہ روزانہ مسودہ سے بیاض میں پہونچتے ہیں لیکن اُن کو سمجھنے والا اور اُن سے حصہ حاصل کرنے والا یہاں پر کون ہے؟ خواجہ محمد ہاشم (کشمی) بھی غنیمت ہیں جو ذوقِ فہمِ سخن رکھتے ہیں اور فی الجملہ لذت یاب ہوتے ہیں لیکن وہ اس سفرِ اجمیر میں شدّتِ مشقت کی وجہ سے اُن متخلفین میں سے ہوگئے ہیں جن کا عذر صحیح ہے ـــــ شاید وہ کچھ دنوں اور ہماری رفاقت میں رہیں ـــــ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ـــــ (بس اللہ ہم کو کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے) رفقاء بھی کم ہیں اور زادِ راہ بھی قلیل ہے ـــــ

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ ـــــــ (کیا اللہ اپنے بندے کو کافی نہیں ہے) کیوں نہیں وہ بیشک کافی ہے ــــــ دوسری بات یہ لکھنی ہے کہ تمہاری مفارقت سے مغموم ہوکر ایک رات بعد از نماز تہجد خواب میں دیکھتا ہوں کہ تم دونوں بھائی ہمارے دوستوں میں سے ایک دوست کے ساتھ ایک بادشاہ کے وکیل کے پاس گئے ہو تاکہ بادشاہ کے یہاں ملازم ہو جاؤ اور (بادشاہ کی طرف سے) ملازمت کی تجویز اس وکیل کے سپرد کر دی گئی ہے کہ وہ جس کسی کو نوکری کے قابل جانے اس کو نوکر رکھ لے اور جس کسی کو نوکر تجویز کرے ایک ورق پر اس کا حلیہ لکھے اور اس ورق کے کنارے پر لکھے کہ (اس کو) نوکر رکھ لیں" ــــــ ان تینوں اشخاص میں سے تم دونوں کا چہرہ وکیل نے لکھا ہے اور نوکری تجویز کر دی ہے اس تیسرے شخص کا نہ حلیہ لکھا نہ اس کو نوکر رکھا ــــ میں نے تم دونوں سے دریافت کیا ہے کہ (وکیل نے) اس تیسرے کا حلیہ کیوں نہ لکھا؟ تم نے کہا کہ حلیہ لکھتے وقت وکیل نے اپنے منہ کو اس تیسرے کے منھ کے قریب کیا اور بہت غور سے اس کو دیکھا اور کہا کہ یہ چہرہ سیاہی رکھتا ہے ــــ یا اسی کے مرادف کوئی لفظ کہا اور یہ کہہ کر چہرہ نہیں لکھا ــــ الحمدللہ کہ میرا دل تم دونوں کی جانب سے مطمئن ہو گیا کہ تم کو قبول کر لیا گیا ــــ لیکن اس تیسرے دوست کی طرف سے دل میں تشویش رہی کہ وہ نوکری کے لئے تجویز نہیں ہوا ــــ کاش اس کو نوکرانِ بادشاہ کی نوکری میں قبول فرمالیں ــــــ العَاقِبَۃُ بِالخَیر (انجام بخیر ہو) ــــ

مکتوب (۸۳) صاحبزادگانِ کبار کے نام ــــــ

[برکاتِ عسکر]

فرزندانِ گرامی، جمعیت قلب کے ساتھ رہیں ــــــ ہمارے آدمی ہماری مشقتوں کو پیشِ نظر رکھ کر اس تنگی (نظربندی) سے ہماری رہائی چاہتے ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ نامرادی و بے اختیاری اور ناکامی کے اندر کس قدر حسن و خوبی ہے ــــ بھلا کونسی نعمت اس نعمت کے مساوی ہے کہ کسی شخص کو بے اختیار اس کے اختیار سے نکال لیں اور خود اپنے ہی اختیار سے اس کو زندگانی دیں نیز اس کے امورِ اختیاری کو بھی تابع

بے اختیاری کرکے اُس کو دائرۂ اختیار سے باہر کردیں اور مردہ بدست زندہ کی مانند بنادیں۔
قیدِ اولیار کے زمانے میں بھی جب کبھی اپنی ناکامی و بے اختیاری کا مطالعہ کرتا تھا تو عجیب لطف اور طرفہ ذوق محسوس کرتا تھا ——— ہاں بات یہ ہے کہ راحت و آرام والے ذوقِ اربابِ بلا کو کیا جانیں اور جمالِ بلا کا کیا ادراک کریں؟ بچوں کو تو بس شیرینی ہی میں لذت محسوس ہوتی ہے اور جس نے تلخی سے حصہ لیا ہو وہ تو شیرینی کو ایک جو کے عوض میں بھی نہیں خریدے گا ——— ع

مُرغِ آتشخوارہ کے لذت شناسد دانہ را

(آگ کھانے والا پرندہ دانے کی لذت کیا جانے اُس کی خوراک تو آگ ہی ہے)

والسلام علی من اتبع الهدیٰ ———

مکتوب (۸۴) حافظ عبدالغفور کے نام ———

[آدابِ طریقہ]

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ——— اِس راہ کے طالب کو چاہئے کہ اہلِ حق کی صحیح رائے کے موافق، تصحیحِ عقائد کرنے کے بعد اپنے تمام اوقات کو ذکرِ الٰہی میں مشغول رکھے بشرطیکہ اس ذکر کو کسی کامل و مکمل سے اخذ کیا ہو ——— اس لئے کہ ناقص کے ذریعے کوئی کامل نہیں بنتا ——— اور اپنے اوقات کو ذکر سے اِس طرح معمور رکھے کہ سوائے ادائے فرائض و سنن موکدہ کے کسی چیز میں مشغول نہ رہے حتیٰ کہ (ذکر میں پختگی پیدا ہونے تک) تلاوتِ قرآن مجید اور عباداتِ نافلہ کو بھی (کچھ عرصے) موقوف رکھے ——— باوضو اور بے وضو ذکر کرے اور کھڑے، بیٹھے، لیٹے اسی میں مشغول رہے۔ نیز چلنے پھرنے اور کھانے اور سونے کے وقت بھی ذکر سے خالی نہ ہو۔

ذکر گو ذکر تا ترا جان است
پاکیٔ دل ز ذکرِ رحمٰن است

لہ جب تک تیری جان میں جان ہے ذکر کرتا رہ ۔ دل کی پاکی ذکرِ رحمٰن کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہے

یہاں تک کہ ماسوی، بطریق وسوسہ بھی اُس کے دل میں نہ گذرنے پائے ـــــ اور غیر کا وسوسہ تکلف کے ساتھ بھی دل میں لانا چاہے تو نہ لاسکے۔ بوجہ اُس نسیان کے جو دل کو غیر اللہ کی طرف سے ہوگیا ہو ـــــ اور یہ نسیان جو کہ دل کو تمام ماسوائے مطلوب سے حاصل ہوگیا ہے، حصول مطلوب کا صرف ایک مقدمہ و ذریعہ اور مطلوب کے وصول کا بشارت دہندہ ہے ـــــ رہا نفس حصولِ مطلوب اور وصولِ حقیقی بمقصود ـــــ اُس کے متعلق کیا لکھوں وہ تو وراء الوراء ہے ـ

کیفَ الوصول اِلیٰ سُعادَ و دُونہا
قُللُ الجِبالِ وَ دُونَھن خیوفُ

برادر عزیز پہلے اس سبق کو حسب ہدایت اللہ، انجام کو پہچا لیں تب اس کے بعد دوسرا سبق حاصل کریں ـــ اللہ تعالیٰ توفیق دینے والا ہے ـــــ والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ ـــــ

مکتوب (۸۵) صاحبزادگان گرامی قدر خواجہ محمد سعیدؒ و خواجہ محمد معصومؒ کے نام۔

[حفظِ اوقات کی نصیحت]

اس طرف کے احوال و اوضاع، لائق حمد ہیں ـــــ میں اللہ تعالیٰ سے تمہاری سلامتی اور استقامت کا خواستگار رہوں ـــ اگر اجمیر پہونچنا ہوا اور شر اندر راہ کی گھاٹیوں اور زمین گرمی سے نجات میسر ہوئی تو میں تم کو لکھوں گا اور اپنے پاس بلالوں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ ـــــ مطمئن رہیں اور اپنی تمامتر ہمت مرضی مولیٰ تعالیٰ میں مصروف رکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ بے فکری اور حفظِ نفس میں پڑ جاؤ اور اہل وعیال کے ساتھ بہت زیادہ اُنس و محبت پیدا کرکے کارخانۂ اہم میں فتور و خلل ڈالو ـــــ ایسا کیا تو سوائے محرومی و ندامت کے کوئی چیز نقدِ وقت نہ ہوگی اور کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ اس صحبت ذکر اور اس

---

۱ سعاد محبوبہ تک رسائی کیونکر ہو درآنحالیکہ اُس سے ورے پہاڑ کی چوٹیاں ہیں اور چوٹیوں سے پہلے بہت سی پہاڑی بلندیاں و پستیاں ہیں ـــ

دولتِ باطنی کو غنیمت جانیں اور اہم امور میں زندگی گزاریں ـــــ خیر شرط ہے۔
ہم نے اپنے معارفِ جدیدہ جو تم کو لکھے ہیں وہ تمھارے لئے ایک سبق کے بعد دوسرے سبق کی حیثیت رکھتے ہیں ـــــ سرسری طور پر ان سے نہ گزریں۔ اہتمام اور جد وجہد کے ساتھ ان کے مطالعے میں کوشاں ہوں ـــ ممکن ہے کہ ان معارف کے اندر سے کوئی دریچہ کھل کر سرمایۂ سعادت بن جائے ـــ تم دونوں کے بارے میں' میں نے جو بشارت پائی ہے اس کو ایک مکتوب میں لکھ کر خواجہ محمد ہاشم کے سپرد کر دیا ہے تاکہ وہ تم تک پہونچا دیں ـــــ
امید ہے کہ اللہ تعالے اپنے کرم سے، تم کو ضائع نہ کرے گا اور قبول فرمائے گا ـــ لیکن ترساں و لرزاں رہیں اور لہو ولعب میں زندگی نہ گزاریں ـــ ایسا نہ ہو کہ ہماری صحبت کی دوری تمھارے اندر کچھ اثر کر جائے ـــــ حضرت حق سبحانہٗ سے التجا اور تفرع وزاری کرتے رہیں اور اہلِ حقوق سے بقدر ضرورت اختلاط رکھیں اور ان کی دلجوئی کریں۔
گھر کی مستورات کو وعظ و نصیحت کرتے ہوئے زندگی بسر کریں اور ان کے حق میں امر معروف اور نہی منکر سے باز نہ رہیں، تمام اہلِ خانہ کو نماز کی اور صلاح وتقویٰ کی نیز تمام احکام شرعیہ کی ادائیگی کی ترغیب دیتے رہیں ـــ اس لئے کہ تم سے (از روئے حدیث) ان سب کے بارے میں اللہ تعالےٰ کے یہاں سوال کیا جائے گا ـــ اللہ تعالےٰ نے تم کو علم دیا ہے اس علم کے مطابق عمل بھی عطا فرمائے اور اس پر استقامت بخشے۔ (آمین)

معجزہ کی حقیقت

از افادات مولانا فراہی

ترجمہ ———— خالد مسعود صاحب

معجزہ سے مراد وہ کام ہے جو انسان کی قوت اور اس کی تدابیر کی حدود سے باہر ہو۔ اس اعتبار سے نشانیاں معجزہ بھی ہوتی ہیں اور امر رب پر دلیل بھی۔ معجزہ کا یہ مفہوم اس آیت سے واضح ہوتا ہے جس میں قرآن مجید نے انزال مائدہ کے بارے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کا قول نقل کیا ہے:۔

قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَ تَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (مائدہ۔۱۱۳)	انھوں نے کہا ہم چاہتے ہیں کہ اس مائدہ میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہو جائیں اور ہم جان جائیں کہ آپ نے ہمیں سچی بات کہی اور ہم اس پر گواہ بنیں۔

یعنی اگر خدا ہماری اس درخواست پر آسمانی خوان اتار دے گا تو ہم اس بات کا یقین کر لیں گے کہ اسی نے آپ کو رسول بنایا اور آپ جو پیغام خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں وہ واقعی اسی کا ہے۔ یہ معجزہ دیکھ کر ہم آپ کی حقانیت کی گواہی ان لوگوں کے سامنے دیں گے جو یہاں موجود نہیں۔

معجزہ اور شعبدہ میں فرق | شعبدہ اور معجزہ میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر محض لہو کے لیے اور ثانی الذکر نعمت و نقمت کے لیے ہوتا ہے۔

شعبدہ کا اثر انسان کے سفلی جذبات پر پڑتا ہے۔ اس کی نشو و نما تقویٰ کی بنیاد پر نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی شعبدہ باز نے نہ تو اپنی قوم کی قیادت کی اور نہ اس کو سربلند کیا ہے یہ لوگ ہمیشہ ذلیل و خوار رہے ہیں۔ قرآن نے اسی حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے۔

وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ — اور جادوگر جہاں جائے فلاح نہیں پائے گا۔ (طٰہٰ ۶۹)

اس کے برعکس معجزہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس سے نبی اپنے مشن کو ترقی دیتا اور اپنے دشمنوں کو مغلوب کرتا ہے۔

معجزہ کی ضرورت

زمرۂ انبیاء کا کوئی فرد جھوٹ سے متہم نہیں ہوتا کہ اس کی صداقت کے اثبات کے لیے معجزات اتارنے کی ضرورت ہو۔ بلکہ نبی جب اپنی قوم کو توحید اور آخرت کی حقیقت سمجھاتا ہے تو وہ اس کے صحیح ہونے میں شک کرتی ہے! اس مرحلہ میں نبی کی صداقت کا نہیں بلکہ توحید و معاد کا اثبات ضروری ہوتا ہے۔ اسی لیے ابتداء میں تو وحی کے ذریعے سے نبی کو صرف دلائل عطا ہوتے ہیں تاکہ مخاطبین کی عقل کی گرہیں کھلیں۔ معجزہ ظاہر کرنے سے اس وقت اجتناب کیا جاتا ہے لیکن معاملہ جب اتمام حجت کا ہو، اس وقت نبی کو معجزہ عطا کیا جاتا ہے اور اس کے بعد قوم کی ہلاکت مقدر ہو جاتی ہے۔

چونکہ انسان کی عقل کسی مثال کو دیکھ کر ایک حقیقت کو مانتی اور اس پر غور کرتی ہے۔ اس لیے معجزہ نبوت کی ایک دلیل بھی ہے۔ قرآن سے یہ ثابت ہے کہ معجزہ بطور دلیل بھی آتا ہے۔ فرمایا:-

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ	ہم نے موسیٰ کو کھلی نشانیاں عطا کیں،
بَيِّنَاتٍ فَاسْأَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ	بنی اسرائیل سے پوچھو کہ جب وہ ان کے
إِذْ جَاءَهُمْ فَقَالَ لَهُ فِرْعَوْنُ	پاس آیا تو اس سے فرعون نے کہا، موسیٰ
إِنِّي لَأَظُنُّكَ يَا مُوسَىٰ مَسْحُورًا	میں تو تمھیں سحر زدہ خیال کرتا ہوں، موسیٰ
قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا أَنْزَلَ هَٰؤُلَاءِ	نے جواب دیا تمھیں معلوم ہے کہ ان کو نہیں
إِلَّا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ	اُتارا مگر آسمانوں اور زمین کے رب نے

بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ○ (بنی اسرائیل ۱۰۱-۱۰۲)

نشانیاں بنا کر اور فرعون، میں سمجھتا ہوں کہ تم ہلاکت میں پڑنے والے ہو۔

معجزہ خدا کا فعل ہے

یہ دعویٰ کہ معجزہ نبی کا فعل ہوتا ہے شریعت کی رو سے بالکل بے بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معجزہ ظاہر کرنے والا خدا ہے وہ یا تو نبی کے ہاتھ سے معجزہ دکھاتا ہے یا اس کی نبوت کی شہادت کے طور پر خود اتارتا ہے۔ اس حقیقت کی تصریح قرآن کے علاوہ پہلے صحیفوں میں بھی ملتی ہے۔ قرآن میں ہے۔

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ (رعد-۳۸)

کسی رسول کا یہ کام نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نشانی لائے۔

دوسری جگہ فرمایا

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ یَدْعُوْكُمْ لِیَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَیُؤَخِّرَكُمْ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ قَالُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ○ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَمُنُّ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نَّاْتِیَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○

(ابراہیم ۱۰، ۱۱)

ان کے پیغمبروں نے کہا کیا خدا کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے! وہ تمھیں اس لیے بلاتا ہے کہ تمھارے گناہ بخشے اور تمھیں ایک مدت معینہ تک مہلت دیتا ہے۔ انھوں نے کہا تم ہماری ہی طرح کے انسان ہو اور چاہتے یہ ہو کہ ہمیں ان چیزوں سے روکو جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے رہے۔ اچھا لاؤ کوئی واضح نشانی۔ رسولوں نے ان سے کہا ہم تو تمھاری ہی طرح کے انسان ہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے احسان کرتا ہے۔ اور ہمارا یہ منصب نہیں کہ ہم اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نشانی لائیں۔ اور مومنوں کو تو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔

یہاں سلطان مبین سے مراد اس عذاب کی نشانیاں ہیں جس سے انبیاء کرام اپنی قوم کو متنبہ کرتے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ معجزہ نبی کا فعل نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ جس کا مقصود نبی کی رسالت کا اثبات ہوتا ہے۔ اگر معجزہ نبی کا فعل ہوتا تو یہ اس کی رسالت کی نہیں بلکہ الوہیت کی دلیل ہوتا۔ اسی لیے نبی پر یہ واجب کیا گیا ہے کہ وہ واضح طور پر یہ کہہ دے کہ معجزہ دکھانا اس کی قوت سے باہر ہے۔

فیصلہ کن معجزہ کا وقت معین ہوتا ہے

نبی کو جو معجزہ قوم پر اتمام حجت کے لیے دیا جاتا ہے اور جس کے بعد ایمان نہ لانے کی صورت میں ان کی ہلاکت مقدر ہو جاتی ہے، اس کا وقت خدا کے ہاں معین ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے سبب کسی اُمت کی مہلت میں اضافہ کر دیتا ہے تاکہ وہ معجزہ دیکھے بغیر ہی ایمان لائے۔ اس میں ایک حکمت یہ ہے کہ ہدایت اس فہم و بصیرت سے نشو و نما پاتی ہے جس کی تربیت نبی کے ہاتھوں ہوتی ہے، اس کے برعکس جو ایمان معجزہ دیکھ کر لایا جائے وہ محض مقلدانہ ایمان ہوتا ہے جس کے بعد نبی کے لائے ہوئے پیغام کے بارے میں کوئی بصیرت نہیں پیدا ہو سکتی۔ اس میں دوسری حکمت یہ ہے کہ فیصلہ کن معجزات کے ظہور کے بعد صرف عذاب باقی رہ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کو فیصلہ کن معجزات اسی وقت دیئے جاتے ہیں جب قوم کے اندر فکر و فہم کے ذریعہ سے ایمان لانے والا کوئی نہیں رہ جاتا اور جو لوگ معجزہ دیکھنے سے پہلے ایمان نہیں لاتے، وہ اسے دیکھنے کے بعد بھی کم ہی ایمان لاتے ہیں، جیسا کہ فرمایا:-

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهٖ رُسُلًا	پھر ہم نے اس کے بعد رسولوں کو اُن کی قوم
اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ	کی طرف بھیجا وہ ان کے پاس کھلی نشانیاں
فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا	لائے مگر لوگ جن باتوں کو پہلے جھٹلا چکے تھے
بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى	ان پر ایمان لانے والے نہ تھے۔ ہم حد سے
قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ○	بڑھ جانے والوں کے دلوں پر اسی طرح

(یونس ۷۴)　　مہر لگا دیا کرتے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:-

وَمَا تُغْنِي الْآيَاتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ ۝ فَهَلْ يَنْتَظِرُونَ إِلَّا مِثْلَ أَيَّامِ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ قُلْ فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِينَ ۝

(یونس ۱۰۱، ۱۰۲)

معجزات اور تنبیہات ان لوگوں کے کسی کام نہیں آتیں جو ایمان لانے والے نہیں ہوتے یہ لوگ بھی اسی طرح کے عذاب کے منتظر ہیں جس طرح کے عذاب پہلے لوگوں پر گزر چکے۔ کہو کہ انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔

پس معجزہ چونکہ قیامت کی مانند فصل و فرقان ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ اس کے ظہور کے وقت کو غیب میں رکھتا ہے اور نبی اس کا منتظر رہتا ہے۔ کبھی کبھی نبی کا دل لوگوں کے باطل پر اڑے رہنے سے تنگ ہوتا ہے تو وہ فیصلہ طلب کرنے میں جلدی کرتا ہے اور کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ نبی معجزہ کے بعد آنے والے عذاب کے اندیشے سے ان لوگوں پر غضبناک ہوتا ہے جو معجزہ طلب کرتے ہیں چنانچہ مسیح علیہ السلام نے فریسیوں سے یہی سلوک کیا۔

"پھر فریسیوں اور صدوقیوں نے پاس آکر آزمانے کے لیے اس سے درخواست کی کہ ہمیں کوئی آسمانی نشانی دکھا۔ اس نے جواب میں ان سے کہا شام کو تم کہتے ہو کہ کھلا رہے گا کیونکہ آسمان لال اور دھندلا ہے، تم آسمان کی حرارت میں تمیز کرنا جانتے ہو مگر زمانے کی علامتوں میں تمیز نہیں کر سکتے۔ اس زمانہ کے برے اور زناکار لوگ نشان طلب کرتے ہیں مگر یوناہ کے نشان کے سوا کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا۔ اور وہ ان کو چھوڑ کر چلا گیا" [۱]

متی ۱۶: ۱-۴

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین عذاب کی جو نشانیاں مانگتے تھے قرآن نے اس کا

---

[۱] مصنف علیہ الرحمہ نے یہاں بیاض چھوڑی ہے۔ بائبل کا یہ اقتباس ہم نے خود دیا ہے۔ مصنفؒ کا اشارہ بھی اسی اقتباس یا اس جیسی کسی اور عبارت کی طرف ہوگا　　ا۔ خ۔ م

جواب بڑی وضاحت سے دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ نشانیاں خدا کے پاس محفوظ ہیں اور نبی خود ان کے منتظر ہیں۔ فرمایا:-

وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ	وہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی جانب
آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا	سے نشانی کیوں نہیں اتاری گئی، کہو غیب کا
الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم	مالک اللہ ہے تم انتظار کرو میں بھی تمہارے
مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ ۝ (یونس ۲۰)	ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔

یعنی عذاب کی جن نشانیوں کا مطالبہ تم کر رہے ہو، وہ آئیں گی تو ضرور مگر خدا کے ہاں ان کے آنے کا وقت مقرر ہے، جس کا علم صرف خدا کو ہے۔ میں خود اس کا انتظار کر رہا ہوں۔

اسی طرح کی آیت یہ بھی ہے:-

قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي	کہو کہ میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح
وَكَذَّبْتُم بِهِ ۚ مَا عِندِي مَا	دلیل پر ہوں اور تم اس کو جھٹلاتے ہو۔
تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ ۚ إِنِ الْحُكْمُ	میرے پاس وہ چیز نہیں جس کے لیے تم
إِلَّا لِلَّهِ ۖ يَقُصُّ الْحَقَّ ۖ وَهُوَ	جلدی مچا رہے ہو، فیصلہ اللہ ہی کے اختیار
خَيْرُ الْفَاصِلِينَ ۝ قُل لَّوْ أَنَّ	میں ہے۔ وہ شدنی امر بیان کرتا ہے اور
عِندِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ	سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے، کہو کہ
لَقُضِيَ الْأَمْرُ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۗ	اگر وہ چیز میرے پاس ہوتی جس کے لیے تم
وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالظَّالِمِينَ ۝ وَ	جلدی مچا رہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان
عِندَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا	معاملہ طے ہو چکا ہوتا، اور اللہ ظالموں سے
يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ ۚ	خوب واقف ہے۔ غیب کی کنجیاں اسی کے
(انعام ۵۷-۵۹)	پاس ہیں جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

یہی مضمون آیت ذیل میں بھی بیان ہوا ہے:-

قُل لَّسْتُ عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ ۝	کہو کہ میں تمہارے اوپر داروغہ نہیں ہوں
لِّكُلِّ نَبَإٍ مُّسْتَقَرٌّ ۚ وَسَوْفَ	ہر خبر کا وقت معین ہے اور عنقریب تم

تَعْلَمُوْنَ ٥ (انعام ۶۶-۶۷)　　جان لوگے۔

معجزات کی اقسام | انبیاء کے مخاطبین جن معجزات کا مطالبہ کرتے تھے اُن کی دو قسمیں ہیں :-

معجزات کی ایک قسم وہ ہے جن کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا۔ یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو انسان کے حالی سے بلند ہوتے ہیں، مثلاً خدا کو آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ، یا یہ مطالبہ کہ ان پر آسمان سے ایک کھلی کتاب اتاری جائے، دوسرے وہ جن کا تقاضا نبی کی قوت کے بارے میں غلط گمان کی بنا پر کیا جاتا ہے، مثلاً یہ کہ نبی ان کے پاس وہ چیزیں لائے جو ان کو محبوب ہیں، اس کا ایک خزانہ ہو یا اس کے ہمراہ فرشتے نازل ہوں۔

دوسری قسم کے معجزات وہ ہوتے ہیں جن کے جواب میں تاخیر کی جاتی ہے۔ اس تاخیر میں دو مصلحتیں ملحوظ ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ فہم و تقویٰ رکھنے والے لوگ بصیرت کے ساتھ ایمان لائیں، دوسری یہ کہ ایمان نہ لانے والوں پر حجت تمام ہو جائے اور اس مرحلہ سے پہلے ان پر عذاب نہ نازل ہو۔

یہ چار اسباب ہیں جن کی وجہ سے نبی معجزہ دکھانے کا مطالبہ مسترد کر دیتا ہے۔ ہم نے یہاں ان اسباب کا ذکر مجمل طریقہ سے کیا ہے، قرآن میں یہ حقائق تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

قرآن کی جن آیات میں معجزات کے مطالبہ کو رد کیا گیا ہے اُن سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی معجزہ عطا نہیں ہوا۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں انھوں نے ان آیات کے موقع و محل کو نہیں سمجھا۔ ورنہ قرآن تو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں معجزات کے وقوع پر شاہد ہے۔ مثلاً فرمایا:-

وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ۝　　اور جب وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو
وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝　　مذاق اُڑاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو
(صافات ۱۴)　　کھلا ہوا جادو ہے۔

قرآن کا معجزہ | ہم مسلمانوں کا متفق علیہ عقیدہ ہے کہ قرآن اس شخص کیلئے

معجزہ ہے جو اس جیسی کتاب تصنیف کرنے کا دعویٰ کرے۔ لیکن علماء کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ قرآن کے اعجاز کا کیا پہلو ہے۔ میرے نزدیک اور بیشتر علماء کے نزدیک، قرآن کی فصاحت و بلاغت اس کا اعجاز ہے۔ جو لوگ اس پہلو کا انکار کرتے ہیں ان کے نزدیک قرآن کی ہدایت اس کا معجزہ ہے۔ ان کا استدلال اس آیت سے ہے۔

قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ عِندِ اللَّهِ	کہو کہ لاؤ کوئی کتاب اللہ کی طرف سے
هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا أَتَّبِعْهُ	جو ان دونوں (یعنی تورات و قرآن سے)
إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَإِن	زیادہ ہدایت دینے والی ہو، اگر تم سچے ہو۔
لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ	پس اگر یہ تمھیں کوئی جواب نہ دے سکیں تو
أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ	جان لو کہ یہ اپنی خواہشات کے پیچھے
(قصص ۴۹-۵۰)	لگے ہوئے ہیں۔

ان علماء کی تقریر ہمارے نقطۂ نظر کے خلاف نہیں ہے کیونکہ ہدایت اسی وقت اھدیٰ اور دلنشین کہلاتی ہے جب وہ ایک ایسے کلام میں پیش کی جائے جو فصاحت و بلاغت کی آخری حد پر ہو۔ پس قرآن کا معجزہ کی حد تک بلیغ ہونا اس کے اھدیٰ ہونے کے منافی نہیں ہے۔

(بشکریہ میثاق۔ لاہور)

پاکستان کی صدارت کی خاتون اُمیدوار

اور دو فتوے

(از عتیق الرحمن سنبھلی)

پاکستان کے صدارتی الیکشن میں بانی پاکستان مسٹر محمد علی جناح کی ہمشیرہ مس فاطمہ جناح کی امیدواری نے جہاں اور پہلوؤں سے اس الیکشن کو بیحد ہنگامہ خیز بنا دیا ہے وہاں ایک مسئلہ یہ بھی پیدا کر دیا ہے کہ کیا ازروئے شرع ایک عورت کو مملکت کی سربراہی کے لیے ووٹ دینا جائز ہے؟" ——— ہمارے لیے اس الیکشن کو موضوعِ بحث بنانے کا باعث بس یہی مسئلہ ہے!

ہم جہاں تک سمجھتے ہیں پاکستان کے انتخابی معرکہ میں یہ سوال بالکل بے معنی ہے۔ کیونکہ اسلام کو اگر معیار ٹھہرایا جائے گا تو اسی قسم کا سوال دوسرے امیدوار صدر ایوب خاں صاحب کے بارے میں بھی پیدا ہو جائے گا۔ وہ کب اس معیار پر پورے اُترتے ہیں جو اسلام نے سربراہِ مملکت کے لیے ملحوظ رکھا ہے؟ یہ معیار خالی مرد ہونا تو نہیں ہے، کچھ اور اوصاف بھی تو اس کے ساتھ لازم ہیں! کیا وہ اوصاف صدر ایوب خاں صاحب میں پائے جاتے ہیں؟ پھر ان کے بارے میں کیوں اسلامی معیار کا سوال نہیں اٹھایا گیا؟ اور ایک صدر ایوب خاں کیا، پاکستان کے روزِ اول سے کتنے کرسئ اقتدار پر آئے اور کتنے چلے گئے کسی کے بارے میں بھی کب یہ سوال اٹھا کہ وہ امارت کے اسلامی شرائط کو پورا کر رہے ہیں یا نہیں؟ وجہ صاف ہے کہ جب حکومت کا نظام اسلامی نہیں، شریعت کے مقرر کردہ مقاصد و فرائض حکومت کو انجام دینے نہیں تو حکمرانوں کو اسلام کے معیار پر جانچنے سے کیا حاصل؟۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مس فاطمہ جناح کے بارے میں یہ سوال اس لیے کھڑا ہو گیا کہ قیادت کے اور تمام غیر اسلامی نمونوں کے تو لوگ عرصہ سے عادی ہو چکے تھے لیکن یہ تجربہ اُن کے لیے بالکل نیا ہے کہ ایک عورت باقاعدہ رائے عامہ کے ذریعہ ایک مسلمان ملک کی سربراہی کیلئے منتخب ہونا چاہے، جس کی کوئی نظیر اسلام کی تاریخ میں نہیں ملتی، بظاہر یہی وجہ ہے کہ یہ نئی غیر اسلامیت بہت سے علماء کو ہضم نہیں ہو سکی اور انھوں نے صدر ایوب خاں کی حمایت کرتے ہوئے فتویٰ دے دیا کہ "عورت مسلمانوں کی سربراہ نہیں ہو سکتی" ـــــ لیکن ان علماء نے ایک بات نہیں سوچی کہ یہ نیا غیر اسلامی تجربہ جس کی وہ تاب نہیں لا سکے خود صدر ایوب خاں صاحب ہی کے عطا کیے ہوئے دستور ہی کی تو برکت ہے۔ اس دستور ہی کی رو سے پاکستانی عورتوں کو مردوں کے مساوی یہ حق ملا ہے کہ وہ ملک کا بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کر سکیں، ورنہ مس فاطمہ جناح اس صدارتی مقابلہ میں شامل کیسے ہو سکتی تھیں؛ پس اگر مس فاطمہ ایک غلطی کر رہی ہیں تو اسکی ذمہ داری سب سے پہلے صدر ایوب خاں پر ہے اور وہ اگر عورتوں کو پاکستان کی صدارت کے لیے منتخب ہونے اور منتخب کیے جانے کا حق دے کر صدارت کے لیے اہل دہ سکتے ہیں تو بیچاری مس فاطمہ جناح نے کیا قصور کیا ہے کہ وہ عورت ہونے کی بنا پر صدارت کے لیے نااہل قرار دے دی جائیں۔

افسوس ہمارے ان علماء نے کیا بہترین موقع ضائع کر دیا، وقت آیا تھا کہ پاکستان میں عورت کی مساوات کے فتنے کو خود فتنہ گروں اور ان کے سرپرستوں کے ہاتھوں ایک کاری ضرب لگ جاتی اور ع "جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا" کے ماتحت کم از کم یہ فتویٰ تو تجدد پسند حکمرانوں اور اُن کے حامی فلسفیان تجدد کی زبانوں پر جاری ہو ہی جاتا کہ اسلام میں عورت کی سربراہی جائز نہیں ہے۔ اور پھر اس سے اُن کے فلسفۂ مساوات کی جو گت بنتی وہ ظاہر ہے۔ لیکن ہائے یہ ہمارے نیک دل علماء! کہ انھوں نے یہ خدمت اپنے ذمہ لے کر اس طبقہ کو اس مشکل سے صاف نکل جانے کا موقع دے دیا۔ چنانچہ ایک چودھری خلیق الزماں نے تو باواز بلند پہلے پہل یہ فتویٰ سنایا تھا، لیکن اس کے بعد جونہی یہ خدمت علماء کی ایک جماعت نے اپنا فرض سمجھ کر سنبھال لی تو ہوشیار مدعی اب اس موضوع سے گویا غیر متعلق ہیں کہ جب کام دوسروں کے ذریعہ نکل رہا ہے تو کیوں اس کو اوڑھ کر اپنے نظریات کے لیے مصیبت پیدا

کریں ـــــ ع

طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا!

لیکن اس سحر کا اس سے بھی زیادہ دردناک منظر یہ ہے کہ پاکستان میں جو جماعت تجدد پسندوں کی اصل حریف بنی ہوئی تھی، اُس نے ایوب خاں صاحب کی ڈکٹیٹرشپ کے مقابلہ میں ایک خاتون کی سربراہی کو ترجیح دے کر مکمل شرعی زبان میں فتویٰ دے دیا ہے کہ پاکستان میں اس وقت جیسے حالات ہیں اُن میں مس فاطمہ جناح کو مملکت کی سربراہی کے لیے منتخب کرنا مسلمانوں کے لیے نہ صرف شرعاً جائز ہی ہے بلکہ تن من دھن سے ان کی حمایت کی جانی چاہیئے ـــــ یہ فتویٰ پاکستان کی جماعت اسلامی کا ہے!

ایوب خاں ہاریں تو بلا سے ہاریں، لیکن تجدد پسندی کو پاکستان میں اپنی جیت کے لیے اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے؟ ابھی تو برسوں نہیں، مدتوں بھی تجدد پسندی اور ترقی پسندی اپنی اس معراج کا خواب تک پاکستان میں نہیں دیکھ سکتی تھی کہ صنفِ نازک کی ایک فرد مملکت کی سربراہی کے لیے امیدواری کا حوصلہ کرے اور اس طرح مردوں کی مساوات سے بھی بڑھ کر اس کا قدم ایک ہی جست میں بالاتری کی سطح پر نظر آئے۔ اور کس شان سے! کہ ایک طرف اسکے جلو میں سُرخ سویرے کے پرستار مولانا بھاشانی ہوں تو دوسری طرف اسلام کے علمبردار مولانا مودودی بھی!!ـــ

ع۔　　آسماں کی نظر ننگ جائے

جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے اس معاملہ میں اپنے موقف کا اعلان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ :-

"شریعت میں جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں اُن میں سے بعض کی حرمت تو ابدی اور قطعی ہے جو کسی حالت میں حلت سے تبدیل نہیں ہو سکتی اور بعض کی حرمت ایسی ہے جو شدید ضرورت کے موقع پر ضرورت کی حد تک جواز میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اب یہ واضح ہے کہ عورت کو امیر بنانے کی ممانعت اُن

حرمتوں میں نہیں ہے جو ابدی اور قطعی ہیں بلکہ دوسری قسم کی حرمتوں ہی میں اسکا شمار ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہمیں ان حالات کا جائزہ لے کر دیکھنا چاہیے جن میں یہ مسئلہ ہمارے سامنے آیا ہے۔"

(اس کے بعد حالات کی وضاحت کی گئی ہے اور پھر ان الفاظ پر مجلس شوریٰ کی یہ قرارداد ختم ہوئی ہے کہ)

"مذکورۂ بالا وضاحت کی روشنی میں اس مجلس نے صدارتی انتخاب کے لیے موجودہ صدر کے مقابلہ میں محترمہ فاطمہ جناح کی تائید اور حمایت کا فیصلہ کیا ہے۔ اور یہ مجلس عوام سے اپیل کرتی ہے اور جماعت کے کارکنوں کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ جبر واستبداد سے نجات پانے کے اس آخری موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور اس مہم کو تن من دھن سے کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔"

جہاں تک جماعت اسلامی کا سوال ہے اس کے بارے میں ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے کہ جماعت اسلامی کو بھی اس مسئلہ میں شریعت کا معیار زیر بحث نہیں لانا چاہیے تھا کیونکہ وہ تو سیاست میں حصہ ہی محض اس بنیاد پر لیتی ہے کہ اس میدان میں بھی دین کے اصول و احکام غالب ہوں اور ملک کا اجتماعی نظام بھی تمام تر شریعت کے معیار پر قائم ہو۔ ایسے میں اگر وہ بھی شریعت کا معیار سامنے نہ رکھے تو اپنے عقیدہ کی رو سے اسی لمحے شرک اور کفر کی مرتکب ہو جائے گی۔ پس یہ بات تو جماعت نے عین اپنے اصول کے مطابق کی کہ امارت کے شرعی معیار کو فراموش نہیں کیا۔ لیکن یہ جو فیصلہ ہمارے سامنے آیا ہے، اگر اجازت ہو تو اسے دیکھ کر ایک بات پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ سیاست میں جماعت کی سعی اقامتِ دین کا حاصل آخر اس کے سوا بھی آج تک کچھ نکلا کہ جو غیر اسلامی باتیں لوگ اس میدان میں اسلام کا نام لیے بغیر یا کبھی کبھی اسلام سے منہ دیکھی ہی سہی معذرت کے ساتھ کر رہے تھے، اب انھیں باتوں کو نہایت شرعی طریقہ سے کرنے کا گر سیکھ جائیں؛ ہماری گنہگار آنکھیں تو اس اقامتِ دین کی جدوجہد میں بس ابھی تک یہی دیکھ رہی ہیں کہ کل ایک اسلامی حرمت کو ضرورت "شرعی" کی چھری سے ذبح کیا گیا تو آج دوسری کا نمبر لگا ہوا ہے۔ میدانِ جہاد میں جماعت قدم بعد میں رکھتی ہے پہلے کم از کم اپنا ایک عدد اسلامی اصول، اس کے ہاتھوں قربان ہو جاتا ہے۔ پتہ نہیں یہ اقامت دین کی کون سی

شکل ہے! اور ہدم دین کے اس عمل سے قیام دین کا نتیجہ کس اصول پر برآمد ہوگا!!

غالباً ۱۹۵۱ء میں پہلے پہل پاکستان میں کچھ محدود انتخابات ہوئے تھے اس میں جماعت اپنے تمام نظریات کی پابندی کا عزم لے کر میدان میں اتری لیکن نتیجہ میں انتہائی ناکامی رہی، حالانکہ اندر کے بعض لوگوں کی روایت کے مطابق کچھ بے اصولیاں بھی اس سے سرزد ہو گئی تھیں۔ اس تجربہ سے کچھ لوگ تو اس نتیجہ پر پہونچ گئے کہ اس راہ سے اقامت دین کا خیال محض فریب نفس ہے۔ ع

کیں راہ کہ می روی بترکستان است

یہاں اگر دینی جامہ سنبھالتے ہیں تو حریفوں پر فتح ممکن نہیں اور فتح دیکھتے ہیں تو اپنے ہی ہاتھوں دین کی خیر نہیں۔ لیکن غالب گروہ نے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا اور نتیجۃً اول الذکر گروہ نے جماعت کو خیر باد کہہ دیا۔

اندرونی اختلافات کی یہ صورت حال اس وقت سامنے آئی جب پاکستان میں ایک نئے انتخابی معرکے کے آثار پیدا ہونے لگے۔ یہ پاکستان میں ہونے والے وہ عام انتخابات تھے جنھیں ۱۹۵۸ء کا مارشل لا کھا لے گیا۔ بہر حال اختلافی نقطۂ نظر والا گروہ الگ ہو گیا تو جماعت نے اس نئے انتخابی معرکے میں اترنے سے پہلے اس مشکل پر غور کیا جو پچھلے انتخابی تجربہ میں اس کے سامنے آئی تھی یعنی یا اصول چھوڑ دیا جیت کا خیال دل سے نکال دو۔ اس مشکل کا حل قائد جماعت مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے "دین میں حکمت عملی" کے فلسفے سے نکالا کہ ضرورت داعی ہو تو ایک اہم تر مقصد کی خاطر نسبتاً کم اہم اصول کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ اور اس فلسفہ سے اولین مشکل یہ حل کی گئی کہ اسلام میں امیدوار اور خواہشمند کو چونکہ کوئی منصب نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے ابتک تو جماعت اسلامی نہ صرف یہ کہ امیدواری سسٹم سے اپنے نمائندے منتخب کرنے کی قائل نہ تھی بلکہ کسی بہتر سے بہتر جماعت یا فرد سے بھی انتخابی حمایت کا کوئی معاہدہ اس شرعی عیب کی صورت میں نہیں کر سکتی تھی کہ وہ جماعت امیدواری سسٹم سے اپنے نمائندے کھڑے کرے یا وہ فرد از خود آزادانہ امیدوار ہو، لیکن چونکہ یہ دیکھا جا چکا تھا کہ تن تنہا اپنے بل بوتے پر جماعت ذرا بھی کامیاب نہیں ہو سکتی اور جماعت کی کامیابی کے بغیر اقامت دین کا کوئی سوال نہیں۔ لہٰذا اب یہ طے کر دیا گیا کہ جماعت

اپنی حد تک امیدواری سسٹم نہیں اپنائے گی لیکن دوسری بہتر جماعتوں یا اچھے افراد سے اس شرعی عیب کی بنا پر اب مجتنب بھی نہیں رہے گی۔

خیر اس وقت تو یہ "حکمت عملی" عمل میں آئے بغیر صرف علمی بحث کا موضوع بن کر رہ گئی٭ کیونکہ انتخابات کی بساط ہی نہ بچھ سکی۔ لیکن اب پھر ایک نئے انتخاب کا وقت آیا تو پہلے ہی قدم پر ایک نئی اور بڑی مشکل سامنے آ گئی، یعنی متحدہ محاذ جس میں جماعت اسلامی جیسی شرعی جماعت کے ساتھ نہایت غیر شرعی جماعتیں بھی جمہوریت کی بحالی کے نام پر یکجا ہو گئی تھیں۔ اس میں سے جماعت اسلامی کے ماسوا سب نے مس فاطمہ جناح کو موجودہ صدر پاکستان جناب محمد ایوب خاں صاحب کے مقابلہ میں صدارتی امیدوار چن لیا۔ لیکن جماعت کے نمائندوں نے اس میں شرعی قباحت کے خیال سے اپنا فیصلہ محفوظ رکھا اور بعد میں پوری مجلس شوریٰ کے غور و فکر کے بعد وہ فیصلہ کیا گیا جس کا اوپر ذکر ہے۔

ہم نے اس فیصلہ کا پورا متن طوالت کی وجہ سے نقل نہیں کیا، اس کے لیے کئی صفحے چاہیے چاہیے تھے۔ لیکن اب اس کا تمہیدی ٹکڑا اور پڑھ لیجیے۔

> "جماعت اسلامی ابتدا سے اس ملک میں جمہوری اقدار کی بحالی کے لیے متحدہ محاذ قائم کرنے کی کوششوں میں برابر شریک رہی ہے اور آئندہ انتخابات کے لیے حزب اختلاف کو ایک متفقہ پروگرام پر جمع کرنے میں اس سے تعلق رکھنے والوں نے پورا پورا حصہ لیا ہے۔ لیکن جب صدارت کے لیے حزب اختلاف کی طرف سے ایک متفق علیہ امیدوار کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو ہم اس پیچیدہ صورت حال سے دوچار ہو گئے کہ چار جماعتوں نے محترمہ فاطمہ جناح کو منتخب کرنے پر اتفاق کر لیا جسے قبول کرنا ان شرعی احکام کی موجودگی میں ہمارے لیے مشکل تھا جن کی رو سے کوئی عورت مسلمانوں کی امیر نہیں ہو سکتی۔
> اسی بنا پر ہم نے صدارت کے مسئلہ میں حزب اختلاف کے ساتھ اتفاق یا ان سے علیحدگی کا کوئی اعلان نہیں کیا تاکہ مسئلے کے تمام پہلوؤں کا اچھی طرح جائزہ لینے اور اہل علم سے مشورہ کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔"

٭ اس حکمت عملی کے فلسفہ پر نہایت مفصل بحث الفرقان جلد ۲۵۔ شمارہ ۱۲ اور جلد ۲۶ شمارہ ۱، ۲، ۳ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ عتیق

ہمارے خیال میں اگر جماعت اسلامی اپنے اس فیصلہ کی توجیہ اسی حکمت عملی کے اصول سے کرتی تو اس تمہید کے بعد وہ مسئلہ یوں بیان کرتی کہ

متحدہ محاذ کے اس فیصلے کے بعد جماعت اسلامی کے سامنے دو راستے تھے کہ یا تو وہ اس فیصلہ کی تصدیق کرے اور یا خود کو محاذ سے الگ کرلے ظاہر ہو کہ دوسرا راستہ اختیار کرنے کے بعد متحدہ محاذ کے اس متوقع اقتدار میں جسکے لیے زمین ہموار کرنے میں جماعت اسلامی نے بڑا حصہ لیا تھا جماعت کا کوئی حصہ نہ رہتا اور پھر وہ اس اقتدار کو پاکستان میں اقامت دین کا ذریعہ بنانے کے قابل نہ رہ جاتی جو کہ بہت بڑا دینی نقصان تھا، لہذا مجبوراً اس نے فیصلہ کیا کہ ایک بہت بڑے دینی نقصان سے بچنے کے لیے نسبتاً ایک چھوٹے دینی اصول کی قربانی گوارا کرلی جائے۔ چنانچہ اب وہ متحدہ محاذ کے متفق علیہ امیدوار کی پوری حمایت کرے گی۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ادھر گزشتہ چند برسوں میں وہ فلسفۂ حکمت عملی کی سطح سے بھی ترقی کرکے بہت آگے جاچکی ہو۔ اب وہ صرف اپنے ہی اعلیٰ مقاصد کیلئے بدرجۂ مجبوری حرام کو حلال نہیں کرتی بلکہ کسی مجبوری یا شرعی قباحت کا خیال دل میں لائے بغیر بھی جو لوگ کسی حرام راستہ پر چلیں اُن کے فعل کو بھی سند جواز عطا کرنے میں بخل نہیں کرتی۔ جماعت کے جو نمائندے مس فاطمہ کو منتخب کرنے والی میٹنگ میں شریک تھے اُن پر خدا نے بڑا فضل کیا تھا کہ وہ اس فیصلہ کی ذمہ داری سے جماعت کو بچالے گئے اور اسکے بعد جماعت کو تائید ہی کرنا تھی تو وہ غلط یا صحیح ایک عذر کے ساتھ کرسکتی تھی لیکن معلوم ہوا کہ اب جماعت یہ سب تکلفات بھی برطرف کرچکی ہو۔ اب اس نے وہ فتویٰ دیا جس سے صرف اس کی ہی مشکل نہ حل ہو بلکہ اوروں کا بھی بھلا ہو۔ اور کوئی نہ کہہ سکے کہ متحدہ محاذ کی باقی چار جماعتوں نے مس فاطمہ جناح کو صدارت کے لیے انتخاب کرکے ذرا بھی شریعت کے خلاف کیا تھا ——— واقعی حق رفاقت ادا کیا جائے تو ایسا ہی کیا جائے۔ ورنہ فاطمہ جناح کو بھی شکایت ہوتی کہ مجھے مجبوراً گوارا کیا جارہا ہے اور دوسری جماعتیں بھی منہ بُرا کرتیں کہ اپنے لیے تو حلال کرلیا اور ہم پر حرام کا الزام چھوڑ دیا!۔

(باقی آئندہ)

بقیہ: معذرت

نے کام سنبھالا تو سب سے پہلے اُن کی نظر چندوں کے بقایاجات کی قابل فکر صورت حال ہی پر گئی اور ایک مستعد آدمی کی طرح انھوں نے دوسرے کاموں کو چستی سے کرنے کے ساتھ ساتھ اسکے تدارک کے لئے بھی سوچا اور مجھ سے اجازت چاہی کہ اس ڈھیل کو آئندہ کے لئے کسی ضابطہ کا پابند کیا جائے اور ایک کے چندے وصول کئے جائیں میں نے اس بنا پر کہ گزشتہ سالوں کے اندراجات بہت زیادہ قابل اعتماد نہیں ہوں گے انھیں بہت سی احتیاطوں کی تاکید کے ساتھ اسکی اجازت دی۔

لیکن افسوس ہے

کہ وہ اس سلسلہ کی تمام ضروری احتیاطوں کو ملحوظ نہیں رکھ سکے نتیجہ میں متعدد ایسے حضرات کو بھی مطالبہ کے خطوط چلے گئے جن کی طرف کوئی بقایا نہیں تھا بلکہ رجسٹروں میں اندراجات کی کوتاہی سے انکی طرف بقایا معلوم ہوتا تھا۔ اور پھر جن حضرات نے اپنی عدیم الفرصتی کی بنا پر خطوط کا جواب نہیں دیا انھیں خطوط کے نوٹس کے مطابق وی پی روانہ کر دیے گئے۔ اور میں جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اپنی علالت کی بنا پر اس صورت حال سے بالکل بے خبر رہا۔

مجھے اس صورت حال کا علم ابھی چند دن پیشتر ہوا جبکہ اکتوبر کے دوسرے ہفتے سے تھوڑا سا باقاعدہ وقت دفتر میں دینا شروع کیا تو ایک شکایت سامنے آئی۔ اور اسکے بعد احتیاطاً تھوڑی سی مزید کچھ بھال کی۔ اس قسم کے وی پی یہاں بہت واپس گئے واپسی پر خریداروں نے ازراہ مروت وصول بھی کر لئے شکایت تو ان ہی طرح کے حضرات کو ہوگی۔ میں ان سب ہی حضرات سے دفتر کی اس غلطی پر نہایت افسوس کے ساتھ معذرت خواہ ہوں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ ان میں سے کسی کو اس غلطی پر دانستہ بدمعاملگی کا گمان نہیں گزرے گا۔ اور غلطی کے اسباب کی اس وضاحت کے بعد وہ اس معذرت کے قبول کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں کریں گے۔

میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں یہ غلطی صرف ان لوگوں کے ساتھ ہوئی جنھوں نے دفتر کے نوٹس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اگر وہ دو لفظ جواب میں لکھ دیتے تو نہ اُن کو شکایت کا موقع ہوتا اور نہ دفتر کو ندامت کا۔ بہرحال دفتر کو ہدایت کی گئی ہے کہ ان وی پیوں کی واپسی کے نتیجہ میں جن لوگوں کے پرچے بند ہو گئے ہیں وہ از سر نو جاری کر دئے جائیں اِلّا یہ کہ وہ از خود منع کر دیں۔ اسی طرح جن لوگوں کے وی پیوں کے ذریعہ مکرر چندہ وصول ہو گیا ہو۔ اُس کو واپس کر دیا جائے، لیکن اس دفتر کام کے سلسلہ میں چھان بین کیلئے تھوڑا سا وقت درکار ہو جو امید ہے کہ ایک مہینے سے زیادہ نہیں ہوگا۔ انشاء اللہ ایک مہینے کے اندر ہی یہ پوری کارروائی ہو جائیگی۔ لہٰذا اگر کوئی صاحب اپنے مکرر چندہ کو آئندہ کیلئے جمع کرا دینا چاہیں تو وہ فوراً ہی دفتر کو لکھ دیں۔ از خود دفتر کی طرف سے ان میں سے کسی کا چندہ آئندہ کیلئے جمع نہیں کیا جائیگا ۔۔۔۔ والسلام

معذرت خواہ ۔۔۔۔ عتیق الرحمٰن سنبھلی

پاکستان سے چندہ سالانہ پانچ روپیہ ہے، رقم اس پتہ پر جمع کرکے رسید یہاں بھیجئے

عثمانیہ اسٹیشنری مارٹ ۳۲ پرانی انارکلی، لاہور

اُس نے جو بھی نقش کھینچا جاوداں بنتا گیا

بحضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

از ـــــ محشر رسول نگری

اُس نے چھیڑی تھی حدیثِ عشق تنہا ہی مگر — رفتہ رفتہ اک زمانہ ہم زباں بنتا گیا
راہرو ملتے گئے ہر گام پر پیہم اُسے — اسکی شخصیت کے گرد اک کارواں بنتا گیا
خلق تھا اُس قافلہ سالار کا خلقِ عظیم — جو ملا جس موڑ پر وہ ہم عناں بنتا گیا
پھونک دی سوزِ نفس سے اُس نے اک اک دل میں آگ — قافلہ کا قافلہ آتش بجاں بنتا گیا
کر گیا ذوقِ یقیں سے طے وہ اک اک مرحلہ — جو چلا اس کے جلو میں راہ داں بنتا گیا
لے لیا آغوش میں طوفان کو ہر موج نے — ایک دریا تھا کہ بحرِ بیکراں بنتا گیا
کفر کے سب قصر و ایواں بہ گئے خس کی طرح — جوششِ پنہاں سے وہ سیلِ رواں بنتا گیا
اہلِ باطل اپنے خرمن کو بچاتے ہی رہے — اک شرارا تھا کہ برقِ بے اماں بنتا گیا
دے سکا اسکو نہ جنبش کوئی سیلِ تند موج — عزمِ مستحکم سے وہ کوہِ گراں بنتا گیا
اُس نے دُنیا کو دیا انسانیت کا وہ پیام — جس کا اک اک حرف حق کا ترجماں بنتا گیا

اُس نے قوموں کو دیا عدل و اخوت کا سبق
اس کا دیں گہوارۂ امن و اماں بنتا گیا

عالمِ نَو، دَورِ نَو، آئینِ نَو، انسانِ نَو
اُس نے جو بھی نقش کھینچا جاوداں بنتا گیا

اُس کا فیضانِ نظر کیا انقلاب انگیز تھا
مردِ حق تقدیرِ حق کا رازداں بنتا گیا

بچ سکا اُس کے نہ تیرِ دلبری سے کوئی صید
ہر کوئی محکوم بے تیغ و سناں بنتا گیا

اُسکے در پر جھک گئیں دنیا کی ساری رفعتیں
اُس کا کوچہ کعبۂ صاحب دلاں بنتا گیا

قلب و جاں کا ہر خرابہ اُسکے فیضِ عشق سے
علم اور عرفان کا گنجِ نہاں بنتا گیا

اُسکی عفت نے لیا تقدیسِ حق سے بھی خراج
اُس کا دامن سجدہ گاہِ قدسیاں بنتا گیا

اہلِ دیں نے روند ڈالے قیصر و کسریٰ کے تاج
ہر غلام اُس شاہ کا صاحبقراں بنتا گیا

پڑ گیا جس پر بھی اُس کا پرتوِ حسنِ خرام
گلشنِ وحدت کا وہ سروِ رواں بنتا گیا

اُسکے آدابِ سحرخیزی کا اک اعجاز تھا
ہر گراں خواب آپ مرغِ صبح خواں بنتا گیا

رزمِ حق میں اہلِ ایماں کا گلوئے خشک بھی
از پئے تیغِ رضا سنگِ فساں بنتا گیا

ڈھل گیا اخلاقِ حق میں مردِ مومن سر بسر
رحمتِ باری کا خود ہی ارمغاں بنتا گیا

اُسکے فیضِ تربیت نے آئینوں کو دی جلا
ہر دلِ تاریک مہرِ ضوفشاں بنتا گیا

اک چراغِ عشق سے جلتے گئے کتنے چراغ
خاک کا ہر ذرہ ماہ و کہکشاں بنتا گیا

اُس نے اونچا کر دیا اور آدمیت کا مقام
جذبِ حق سے آدمی عرش آستاں بنتا گیا

اُسکی طاعت نے دیا سب کو شعورِ بندگی
خود بخود انسان حق کا پاسباں بنتا گیا

توڑ ڈالا اُس نے رنگ و نسل کا اک اک بُت
عالمِ انسانیت اک خانداں بنتا گیا

اک عمارت عدل کی بنیاد پر اُٹھتی گئی
ایک آئیں برتر از وہم و گماں بنتا گیا

آندھیوں کے رُخ پہ بھی جلتی گئی شمعِ حیات
بجلیوں کی زد پہ بھی اک آشیاں بنتا گیا

اس سے پہلے حق کا ایسا انقلاب آیا نہ تھا
یوں جہاں میں پرچمِ توحید لہرایا نہ تھا

دیہاتی مُعالج
دیہاتی مُعالج
اُردو، ہندی اور انگریزی
تینوں زبانوں میں موجود ہے
قیمت۔ حصہ اوّل
حصہ دوم
علاوہ محصول ڈاک
ہمدرد دواخانہ (وقف)
دہلی —— کانپور —— پٹنہ

ALFURQAN (Regd. N. L. 353) LUCKNOW

Printed at Allahabad Oriental Press, Lucknow.

الفرقان لکھنؤ

سنہ آغاز ۱۹۳۳

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

(مسئول)

محمد منظور نعمانی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟
تالیف — مولانا محمد منظور نعمانی
بلاشبہ قرآن مجید کی دعوت و تعلیم پوری انسانیت کے لئے آبِ حیات ہے،
لیکن ہماری دنیا اس سے ناآشنا ہے۔ یہاں تک کہ اس کو "کلامِ الٰہی" ماننے والی
امت کی غالب اکثریت بھی اس سے بیگانہ ہے
یہ کتاب
اسی صورتِ حال کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔
یہ قرآنی دعوت اور اس کی اہم تعلیمات کا ایک جامع خلاصہ ہے۔
جس میں سو عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور دل پذیر تشریحات کے ساتھ جمع کیا گیا ہے
خاص طور پر قرآن کی دعوتِ توحید کا بیان اس کتاب کا شاہکار ہے
بالکل ایک نئے طرز کی کتاب ہے، جو قرآن کی دعوت سے روشناسی کے ساتھ ساتھ قرآن کے اعجازِ بیان کا بھی لذت شناس کرتی ہے۔
نہایت اعلیٰ کتابت و طباعت، عمدہ کاغذ، ۲۰۰ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت -/۴
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندستان سے .... -/۶
پاکستان سے .... -/۷
ششماہی
ہندستان سے ،، ۳/۵۰
پاکستان سے .... -/۴

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

(فی کاپی آٹھ آنے)

شمارہ ۷	بابتہ ماہ رجب ۱۳۸۶ھ مطابق دسمبر ۱۹۶۶ء	جلد ۳۴

اگر اس دائرے میں ◯ سرخ نشان ہو، تو

اس کا مطلب ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہو، براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۳۰ر دسمبر تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی' پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں، ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۱۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں، اسکی اطلاع ۱۰ تاریخ کے اندر آجانی چاہیئے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

> یہ اداریہ ماہ گزشتہ کی اشاعت کے لیے لکھا گیا تھا۔ لیکن اس موضوع پر وحیدالدین خاں صاحب کا مضمون آنے کی وجہ سے اسکو روک لیا گیا تھا۔ ع ۔

گزشتہ اشاعت کے ان صفحات میں اس رائے کا اظہار کیا گیا تھا کہ بحیثیت ایک اقلیت کے ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کے حل کی اولین شرط یہ ہے کہ ان مسائل کے میدان میں وہ سب ایک جماعت بن کر سامنے آئیں۔ اور یہ ملّی اجتماعیت موجودہ حالات میں اگر بآسانی ممکن ہے تو صرف اس طرح کہ اس میدان میں کام کرنے والی تمام باقاعدہ جماعتیں اور ان مسائل سے دلچسپی رکھنے والے تمام مؤثر حلقے ایک وفاقی نظام میں منسلک ہو کر قیادت کا ایک مشترک پلیٹ فارم ترتیب دیں کیونکہ کسی ایک جماعت کی دعوت پر مسلمانوں میں اجتماعی جذبہ اور عملی ولولہ پیدا ہونے کے آثار دور دور تک نہیں ہیں۔

اس سلسلہ میں ہم نے اشارہ کیا تھا کہ ابھی ابھی تشکیل ہونے والی "مسلم مجلس مشاورت" کے تجربہ نے یہ حقیقت گویا آنکھوں سے دکھا دی ہے کہ یہ طرزِ عمل مسلمانوں میں اجتماعی حرکت پیدا کرنے کا ایک یقینی ذریعہ ہے اور پھر اسی بنیاد پر یہ درخواست کی گئی تھی کہ اسی مجلس مشاورت کو واضح طور پر ان تمام مسائل کے لیے جدوجہد کا واحد پلیٹ فارم بنا دینا چاہیے جن کا حل مسلمانوں کی سرگرم اجتماعی جدوجہد کا طالب ہے ـــــــ لیکن ہمارا احساس یہ ہے کہ یہ بات جتنی ضروری ہے اتنی ہی مشکل بھی ہے، آج ہم اس کی مشکلات ہی کے پہلو پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

مشترک مسائل میں اشتراکِ عمل اور اجتماعی جدوجہد کی آواز آج کوئی نئی نہیں ہے۔

۱؎ یعنی اکتوبر کی اشاعت ۱۲

ایک عرصہ سے یہ آوازِ وقت کی پکار بن کر اس ملک میں گونج رہی ہے اور حال یہ ہے کہ جس جماعت اور جس حلقے کے ذمہ داروں سے اس موضوع پر بات کیجیے بجز اتفاق اور تائید کے کوئی دوسرا جواب آپ کو نہیں ملے گا، گویا کہ یہی ہر ایک کے دل کی آواز ہے۔ لیکن اس اتفاق کے باوجود عمل میں اس کا وجود عنقا ہی بنا ہوا ہے۔ یہ کیوں؟ ہم نے گزشتہ دو ڈھائی سال کے عرصہ میں جتنا اس سوال پر سوچا ہے شاید کسی دوسرے موضوع پر سوچا ہو۔ اس سوچ بچار کے نتیجہ میں جو رائے ہم قائم کر سکے ہیں ہمارا خیال ہے کہ یہ رائے ہمیں بدلنا نہیں پڑے گی۔

ہمارے نزدیک اس عجیب و غریب صورت حال کا (کہ سب اشتراک و اتحاد چاہتے بھی ہیں کوئی عذر بھی کسی کی زبان پر نہیں ہے اور پھر بھی یہ بیل منڈھے نہیں چڑھتی) خاص سبب یہ ہے کہ جن مسائل کو آج مشترک مسائل کہا جاتا ہے جن جماعتوں کا اصل دائرۂ کار یہی مسائل ہیں اور انہی میں اپنی سرگرمیوں کی بنیاد پر وہ مسلمانوں کو تھوڑا یا بہت اپیل کرتی ہیں، یہ جماعتیں اگر انہی مسائل میں اپنی جداگانہ سرگرمیاں ترک کر کے سارا کام مشترک پلیٹ فارم سے کریں تو اپنے انفرادی وجود کے لیے عام مسلمانوں کی دلچسپیاں آخر کس بنیاد پر حاصل کر سکیں گی؟۔

یہ ہے وہ نفسیاتی گرہ جو آج تک مشترک پلیٹ فارم کے قیام کا راستہ روکے رہی ہے اور جب تک یہ گرہ نہیں کھلے گی صحیح معنیٰ میں کوئی مشترک پلیٹ فارم وجود میں نہیں آ سکے گا۔ یہ پلیٹ فارم جبھی بامعنیٰ ہو سکتا ہے جبکہ تمام مشترک مسائل اسی کے سپرد ہوں اور اس سلسلہ میں کوئی متوازی نمائندگی یا جداگانہ عملی جدوجہد شریک جماعتوں کی طرف سے نہ ہو، اور یہ بات ان جماعتوں کی شمولیت کے ساتھ جن کی زندگی کا بیشتر انحصار انہی مسائل پر ہے اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ایسی جماعتیں خود کھلے دل سے یہ فیصلہ نہ کر لیں کہ اگر وہ اپنا انفرادی وجود برقرار رکھنے کے لیے کوئی اور راہ نہ نکال سکیں تو اس راہ میں اس عظیم ایثار کے لیے بھی تیار ہیں! اور ہمیں یقین ہے، ایسا یقین جس پر شک اور شبہ کا کوئی سایہ نہیں، کہ اگر کسی جماعت کو یہ ایثار کرنا پڑا تو مشترک پلیٹ فارم کی ہیرو بھی وہی جماعت بنے گی۔

کہا جا سکتا ہے کہ مثلاً اس وقت مسلم مجلس مشاورت کا ہے اور اس میں جماعتیں نہیں جماعتوں کے

افراد شریک ہیں اور ایسا اسی لیے کیا گیا ہے تاکہ جماعتیں اپنی اپنی جگہ پر آزاد رہیں لہذا جماعتوں کے مسائل اور معاملات یہاں خارج از بحث ہونے چاہئیں۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے جو مسائل کسی جماعت کے دائرۂ کار میں داخل ہیں (خواہ اصلاً یا ضمناً) ان مسائل میں جدوجہد کے لیے ایسی جماعتوں کے افراد اپنے جماعتی نظام اور جماعتی پالیسی سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ بالخصوص جبکہ وہ ان جماعتوں کے اعلیٰ ترین عہدیدار بھی ہوں۔ بس اگر مجلس مشاورت کو مشترک مسائل میں جدوجہد کا ایک اتحادی پلیٹ فارم بنا لینا ہے تو یہ جبھی ہو سکتا ہے جبکہ یہ جماعتیں ان مسائل کو اس مشترک پلیٹ فارم کے سپرد کر دینے کی تجویز پاس کریں یا کم از کم ان کو اپنے دائرۂ کار سے خارج کر دیں۔ جماعتی اشخاص کی بھی اپنی انفرادی حیثیت بیشک ہوتی ہے اور اس حیثیت سے وہ بہت سے معاملات میں اپنی ذاتی رائے اور ذاتی ذمہ داری پر کام کرنے کے لیے آزاد ہوتے ہیں۔ مگر یہ وہی معاملات ہو سکتے ہیں جن سے جماعت کو سروکار نہ ہو۔ جو امور جماعت کے دائرۂ کار سے تعلق رکھتے ہیں ان میں فرد کی آزادیٔ عمل کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی جماعت اس حد تک آزادی کی اجازت دیتی ہے تو وہ جماعت نہیں مذاق ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مشترک پلیٹ فارم کچھ مسائل میں مشترک جدوجہد کے اصول پر بنے اور پھر اپنے ارکان کو اجازت دے کہ ان مسائل میں وہ اپنی اپنی جماعتوں کی سطح پر بھی جداگانہ جدوجہد جاری رکھ سکتے ہیں تو وہ اپنی تخریب کا خود ہی ذمہ دار ہوگا اور جماعتوں کا جذبۂ مسابقت و رقابت چار دن میں اس اشتراک کے تنکے بکھیر کر رکھ دے گا۔

پاکستان کے صدارتی انتخاب پر جو چند صفحے گزشتہ اشاعت میں لکھے گئے تھے ان کے ساتھ "باقی آئندہ" کا لفظ بعض ناظرین کو بہت شاق ہوا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس ماہ اس سلسلہ میں کچھ بھی نہیں لکھا جا سکا۔ یہ پورا مہینہ نزلہ زکام کے ایسے تسلسل میں گزر گیا کہ لکھنے کا کوئی کام بھی نہ ہو سکا۔ اب اگر آئندہ اشاعت تک ضرورت کا احساس باقی رہا اور صحت نے بھی ساتھ دیا تو انشاءاللہ اس کی تکمیل کر دی جائے گی ورنہ وہ اپنی جگہ کچھ نامکمل بھی نہیں ہے۔

معارف الحدیث

(بسلسلۂ کتاب الزکوٰۃ)

زکوٰۃ کے علاوہ مالی صدقات :-

[زکوٰۃ سے متعلق حدیثیں اب سے کافی عرصہ پہلے الفرقان کے اسی سلسلہ معارف الحدیث میں شائع ہو چکی ہیں لیکن زکوٰۃ کے علاوہ صدقہ و انفاق فی سبیل اللہ (یعنی راہِ خدا میں اس کے حاجت مند بندوں پر خرچ کرنے) کی عمومی ترغیب و تاکید کی حدیثیں (جن کو اکثر محدثین اپنی کتابوں میں "فضل الانفاق فی سبیل اللہ وکراہیۃ الامساک" کے زیر عنوان درج کرتے ہیں) اس وقت اس کے ساتھ شامل نہیں کی گئی تھیں، ارادہ تھا کہ کتابی اشاعت میں ان کو شامل کر دیا جائے گا لیکن اس وقت ہمارے ملک میں غلہ کی کمیابی اور عام ضروریات زندگی کی انتہائی گرانی نے ایسی صورت پیدا کر دی ہے کہ اللہ کے کروڑوں بندے سخت تکلیف و محتاجی اور فقر و فاقہ کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سلسلہ کی تعلیمات و ہدایات کی اشاعت وقتی ضرورت معلوم ہوئی ——— اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو توفیق دے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کی تعمیل کر کے اور اس وقت کے خاص حالات میں آخری امکانی حد تک اللہ کے ضرورت مند بندوں کی خدمت اور مدد کر کے دارین میں اس کے فضل و رحمت کے مستحق بنیں]

عَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِي الْمَالِ لَحَقًّا سِوَى الزَّكٰوةِ ثُمَّ تَلَا لَيْسَ الْبِرَّ

کے لیے کہے، لوگوں نے عرض کیا اگر وہ یہ بھی نہ کر سکے تو کیا کرے، آپ نے فرمایا کہ (کم از کم) شر سے اپنے کو روکے (یعنی اس کا اہتمام کرے کہ اس سے کسی کو تکلیف اور ایذا نہ پہونچے) یہ بھی اس کے لیے ایک طرح کا صدقہ ہے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں پر دولت اور سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی ان کو بھی صدقہ کرنا چاہیے، اگر روپیہ پیسہ سے ہاتھ بالکل خالی ہو تو محنت مزدوری کر کے اور اپنا پیٹ کاٹ کے صدقہ کی سعادت حاصل کرنی چاہیے۔ اگر اپنے خاص حالات کی وجہ سے کوئی اس سے بھی مجبور ہو تو کسی پریشان حال کی خدمت ہی کر دے، اور ہاتھ پاؤں سے کام نہ کر سکے تو زبان ہی سے خدمت کرے ـــــ حدیث کی روح اور اس کا خاص پیغام یہی ہے کہ ہر مسلمان خواہ امیر ہو یا غریب، طاقتور اور توانا ہو یا ضعیف اس کے لیے لازم ہے کہ دامے، درمے، قدمے، سخنے جس طرح اور جس قسم کی بھی مدد اللہ کے حاجتمند بندوں کی کر سکے ضرور کرے اور اس سے دریغ نہ کرے۔

صدقہ کی ترغیب اور اس کی برکات:۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی اَنْفِقْ یَا ابْنَ اٰدَمَ اُنْفِقْ عَلَیْكَ۔

ـــــــــــــــــــــــ رواہ البخاری و مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر بندہ کو اللہ کا پیغام ہے کہ اے آدم کے فرزند تو (میرے ضرورت مند بندوں پر) اپنی کمائی خرچ کر، میں اپنے خزانہ سے تجھ کو دیتا رہوں گا۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضمانت ہے کہ جو بندہ اس کے ضرورت مند بندوں کی ضرورتوں پر خرچ کرتا رہے گا اس کو اللہ تعالیٰ کے خزانۂ غیب سے ملتا رہے گا۔

—— اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں کو یقین کی دولت سے نوازا ہے ہم نے دیکھا کہ ان کا یہی معمول ہے اور اُن کے ساتھ ان کے رب کریم کا یہی معاملہ ہے، اللہ تعالیٰ ہم کو بھی اس یقین کا کوئی حصہ نصیب فرمائے۔

(فائدہ) پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ جس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے کوئی بات بیان فرمائیں اور وہ قرآن مجید کی آیت نہ ہو، اس حدیث کو "حدیث قدسی" کہا جاتا ہے۔ یہ حدیث بھی اسی قسم کی ہے۔

عَنْ اَسْمَاءَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْفِقِیْ وَلَا تُحْصِیْ فَیُحْصِیَ اللّٰہُ عَلَیْكِ وَلَا تُوْعِیْ فَیُوْعِیَ اللّٰہُ عَلَیْكِ اِرْضَخِیْ مَا اسْتَطَعْتِ —— رواہ البخاری ومسلم

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تم اللہ کے بھروسہ پر اس کی راہ میں کشادہ دستی سے خرچ کرتی رہو اور گنو مت، (یعنی اس فکر میں نہ پڑو کہ میرے پاس کتنا ہے اور اس میں سے کتنا راہ خدا میں دوں) اگر تم اس کی راہ میں اس طرح حساب کر کے دو گی تو وہ بھی تمہیں حساب ہی سے دے گا (اور اگر بے حساب دو گی تو وہ بھی اپنی نعمتیں تم پر بے حساب انڈیلے گا) اور دولت جوڑ جوڑ کے اور بند کر کے نہ رکھو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تمہارے ساتھ یہی معاملہ کرے گا (کہ رحمت اور برکت کے دروازے تم پر خدا نخواستہ بند ہو جائیں گے) لہٰذا تھوڑا بہت جو کچھ ہو سکے اور جس کی توفیق ملے راہ خدا میں کشادہ دستی سے دیتی رہو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا ابْنَ اٰدَمَ اَنْ تَبْذُلَ الْخَیْرَ خَیْرٌ لَّكَ وَاَنْ تُمْسِكَہٗ شَرٌّ لَّكَ وَلَا تُلَامُ عَلٰی كَفَافٍ وَابْدَءْ بِمَنْ تَعُوْلُ —— رواہ مسلم

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے آدم کے فرزند اللہ کی دی ہوئی دولت جو اپنی ضرورت سے فاضل ہو

اُس کا راہِ خدا میں صرف کر دینا تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا روکنا تمہارے لیے بُرا ہے اور ہاں گزارے کے بقدر رکھنے پر کوئی ملامت نہیں۔ اور سب سے پہلے ان پر خرچ کرو جن کی تم پر ذمہ داری ہے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) اس حدیث کا پیغام یہ ہے کہ آدمی کے لیے بہتر یہ ہے کہ جو دولت وہ کمائے یا کسی ذریعہ سے اس کے پاس آئے اس میں سے اپنی زندگی کی ضرورت کے بقدر تو اپنے پاس رکھے باقی راہِ خدا میں اس کے بندوں پر خرچ کرتا رہے اور اس میں پہلا حق اُن لوگوں کا ہے جن کا اللہ نے اس کو ذمہ دار بنایا ہے اور جن کی کفالت اس کے ذمہ ہے، مثلاً اس کے اہل و عیال اور حاجتمند قریبی اعزہ۔

جو راہِ خدا میں خرچ کر دیا جائے وہی باقی اور کام آنے والا ہے:-

عَنْ عَائِشَةَ اَنَّهُمْ ذَبَحُوا شَاةً فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا بَقِيَ مِنْهَا؟ قَالَتْ مَا بَقِيَ مِنْهَا اِلَّا كَتِفُهَا قَالَ بَقِيَ مِنْهَا غَيْرُ كَتِفِهَا۔ ـــــــــ رواہ الترمذی

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک بکری ذبح کی گئی (اور اس کا گوشت للہ تقسیم کر دیا گیا)، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ نے دریافت فرمایا کہ بکری میں سے کیا باقی رہا؟ حضرت عائشہ نے عرض کیا کہ صرف ایک دست اس کی باقی رہی ہے (باقی سب ختم ہو گیا) آپ نے فرمایا کہ اس دست کے علاوہ جو للہ تقسیم کر دیا گیا دراصل وہی سب باقی ہے اور کام آنے والا ہے (یعنی آخرت میں انشاء اللہ اس کا اجر ملے گا) (جامع ترمذی)

انفاق کے بارہ میں اصحاب یقین و توکل کی راہ:-

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كَانَ لِي مِثْلُ اُحُدٍ ذَهَبًا لَسَرَّنِي اَنْ لَا يَمُرَّ عَلَيَّ ثَلٰثُ لَيَالٍ

وَعِنْدِیْ مِنْہُ شَیْءٌ اِلَّاشَیْءٌ اَرْصُدُہٗ لِدَیْنٍ ـــــــ رواہ البخاری

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میرے پاس اُحد پہاڑ کے برابر سونا ہو تو میرے لیے بڑی خوشی کی بات یہ ہوگی کہ تین راتیں گزرنے سے پہلے اس کو راہ خدا میں خرچ کر دوں اور میرے پاس اس میں سے کچھ بھی باقی نہ رہے سوائے اس کے کہ میں قرض ادا کرنے کے لیے اس میں سے کچھ بچا لوں۔

(صحیح بخاری)

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ دَخَلَ عَلٰی بِلَالٍ وَعِنْدَہٗ صُبْرَۃٌ مِنْ تَمْرٍ فَقَالَ مَاھٰذَا یَابِلَالُ؟ قَالَ شَیْءٌ اِدَّخَرْتُہٗ لِغَدٍ فَقَالَ اَمَا تَخْشٰی اَنْ تَرٰی لَہٗ بُخَارًا فِیْ نَارِ جَہَنَّمَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَنْفِقْ یَابِلَالُ وَلَاتَخْشَ مِنْ ذِی الْعَرْشِ اِقْلَالًا ـــــــ رواہ البیہقی فی شعب الایمان

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن حضرت بلال کی قیام گاہ پر پہونچے اور دیکھا کہ ان کے پاس چھواروں کا ایک ڈھیر ہے آپ نے فرمایا بلال یہ کیا ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ میں نے اس کو آئندہ کے لیے ذخیرہ بنایا ہے (تاکہ مستقبل میں، روزی کی طرف سے ایک گونہ اطمینان رہے) آپ نے فرمایا بلال کیا تمھیں اس کا ڈر نہیں ہے کہ کل قیامت کے دن آتش دوزخ میں تم اس کی تپش اور سوزش دیکھو۔ اے بلال جو (تمھارے) پاس آئے اس کو اپنے پر اور دوسروں پر خرچ کرتے رہو اور عرش عظیم کے مالک سے قلت کا خوف نہ کرو (یعنی یقین رکھو کہ جس طرح اس نے یہ دیا ہے آئندہ بھی اسی طرح عطا فرماتا رہے گا اس کے خزانہ میں کیا کمی ہے، اس لیے کل کے لیے ذخیرہ رکھنے کی فکر نہ کرو)

(شعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) حضرت بلال رضی اللہ عنہ اصحاب صفہ میں سے تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والی متوکلانہ زندگی کا طریقہ اپنایا تھا اُن کے لیے مستقبل کے واسطے غذا

کا ذخیرہ کرنا بھی مناسب نہ تھا........ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ ہدایت فرمائی، اگرچہ عام لوگوں کے لیے یہ بات بالکل جائز ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض صحابہ کو بھی اس سے روکا تھا کہ وہ اپنا سارا مال راہ خدا میں خرچ کر دیں اور گھر والوں کے لیے کچھ نہ رکھیں۔ لیکن صحابہ میں سے جن حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب صفہ والی خالص توکل کی راہ اپنائی تھی اُن کے لیے اس طرز عمل کی گنجائش نہ تھی۔ ع

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

حدیث کے آخری فقرہ میں اشارہ ہے کہ اللہ کا جو بندہ خیر کی راہوں میں ہمت کے ساتھ صرف کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کی عطا میں کبھی کمی نہ پائے گا۔

جو دولتمند کشادہ دستی سے راہ خدا میں صرف نہ کریں بڑے خسارہ میں ہیں:۔

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ انْتَهَیْتُ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ جَالِسٌ فِیْ ظِلِّ الْكَعْبَةِ فَلَمَّا رَاٰنِیْ قَالَ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ فَقُلْتُ فِدَاكَ اَبِیْ وَاُمِّیْ مَنْ هُمْ قَالَ هُمُ الْاَكْثَرُوْنَ اَمْوَالًا اِلَّا مَنْ قَالَ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ وَعَنْ یَمِیْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ وَقَلِیْلٌ مَّا هُمْ۔

—————— رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ اس وقت کعبہ کے سائے میں اور اس کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے جب مجھے دیکھا تو فرمایا "ربِ کعبہ کی قسم وہ لوگ بڑے خسارہ میں ہیں"۔ میں نے عرض کیا "میرے ماں باپ آپ پر قربان کون لوگ ہیں جو بڑے خسارہ میں ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ لوگ جو بڑے دولتمند اور سرمایہ دار ہیں، اُن میں سے وہی لوگ خسارے سے محفوظ ہیں جو اپنے آگے پیچھے اور داہنے بائیں (ہر طرف خیر کے مصارف میں) اپنی دولت کشادہ دستی

کے ساتھ صرف کرتے ہیں۔ مگر دولتمندوں اور سرمایہ داروں میں ایسے بندے
بہت کم ہیں۔　　(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے فقر کی زندگی اختیار کر رکھی تھی اور اُن کے مزاج اور طبیعت کے لحاظ سے یہی ان کے لیے بہتر تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب وہ حاضر ہوئے تو آپ نے اُن کے اطمینان خاطر کے لیے بیان فرمایا کہ دولت مندی اور سرمایہ داری جو بظاہر بڑی نعمت ہے دراصل کڑی آزمائش بھی ہے اور صرف وہی بندے اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو اس سے دل نہ لگائیں اور پوری کشادہ دستی کے ساتھ دولت کو خیر کے مصارف میں خرچ کریں جو ایسا نہ کریں گے وہ انجام کار بڑے خسارہ میں رہیں گے

صدقہ کے خواص اور برکات :-

عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ وَتَدْفَعُ مِيْتَةَ السُّوْءِ۔

رواہ الترمذی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے اور بُری موت کو دفع کرتا ہے۔

(جامع ترمذی)

(تشریح) جس طرح دنیا کی مادی چیزوں جڑی بوٹیوں تک کے خواص و اثرات ہوتے ہیں اسی طرح انسانوں کے اچھے بُرے اعمال اور اخلاق کے بھی خواص اور اثرات ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ہی معلوم ہوتے ہیں، اس حدیث میں صدقہ کی دو خاصیتیں بیان کی گئی ہیں ایک یہ کہ اگر بندہ کی کسی بری لغزش اور معصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا غضب اس کی طرف متوجہ ہو تو صدقہ اس غضب کو ٹھنڈا کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے بندہ بجائے اللہ کے غضب اور ناراضی کے اس کی رضا اور رحمت کا مستحق بن جاتا ہے۔ اور دوسری خاصیت یہ ہے کہ وہ بری موت سے آدمی کو بچاتا ہے یعنی صدقہ کی برکت سے اس کا خاتمہ اچھا ہوتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس طرح کی

موت سے بچاتا ہے جس کو دنیا میں بُری موت سمجھا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

عَنْ مُرْثَدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ حَدَّثَنِي بَعْضُ أَصْحَابِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِنَّ ظِلَّ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ صَدَقَتُهُ ——— رواہ احمد

مرثد بن عبداللہ تابعی بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اصحاب کرام نے بیان کیا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی ہے کہ قیامت کے دن مومن پر اس کے صدقہ کا سایہ ہوگا۔ (مسند احمد)

(تشریح) حدیثوں میں بہت سے اعمال صالحہ کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن یہ اعمال سایہ کا ذریعہ بن جائیں گے۔ اس حدیث میں صدقہ کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت میں اس کی ایک برکت یہ ظاہر ہوگی کہ صدقہ کرنے والے کے لیے اس کا صدقہ سائبان بن جائے گا جو اُس دن کی تپش اور تمازت سے اس کو بچائے گا۔ اللہ تعالیٰ ان حقیقتوں کا یقین اور اس کے مطابق عمل نصیب فرمائے۔

صدقہ کرنے سے مال میں کمی نہیں آتی بلکہ برکت ہوتی ہے:-

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ وَمَا زَادَ اللّٰهُ بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ ——— رواہ مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ سے مال میں کمی نہیں آتی (بلکہ اضافہ ہوتا ہے) اور قصور معاف کر دینے سے آدمی نیچا نہیں ہوتا بلکہ اللہ اس کو سربلند کر دیتا ہے اور اس کی عزت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور جو بندہ اللہ کے لیے فروتنی اور خاکساری کا رویہ اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو رفعت اور بالاتری بخشے گا۔ (صحیح مسلم)

عَنْ أَبِي أُمَامَةَ قَالَ قَالَ أَبُو ذَرٍّ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ أَرَأَيْتَ الصَّدَقَةَ

مَا هِيَ قَالَ اَضْعَافٌ مُضَاعَفَةٌ وَعِنْدَ اللهِ الْمَزِيْدُ ـــــــ رواہ احمد

حضرت ابوامامہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوذر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضرت! بتلائیے کہ صدقہ کیا ہے؟ (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا کیا اجر ملنے والا ہے) آپ نے فرمایا کہ چند در چند (یعنی جتنا کوئی اللہ کی راہ میں صدقہ کرے اس کا کئی گنا اس کو ملے گا) اور اللہ کے ہاں بہت ہے۔

(مسند احمد)

تشریح) مطلب یہ ہے کہ جو اللہ کی راہ میں جتنا صدقہ کرے گا اس کو اس کا کئی گنا اللہ تعالیٰ عطا فرمائے گا۔ دوسری بعض احادیث میں دس گنے سے سات سو گنے تک کا ذکر ہے اور یہ بھی آخری حد نہیں ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا اس سے بھی زیادہ عطا فرمائے گا" وَاللهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ" ـــــــ اس کا خزانہ لا انتہا ہے۔

بعض حضرات نے اس حدیث کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ صدقہ کے عوض میں کئی گنا تو اللہ تعالیٰ اسی دنیا میں عطا فرماتا ہے اور اس کا صلہ جو آخرت میں عطا فرمایا جائے گا وہ اس سے بہت زیادہ ہوگا اللہ کے بندوں کا یہ عام تجربہ ہے کہ اللہ پر یقین اور اعتماد کرتے ہوئے وہ اخلاص کے ساتھ جتنا ان کی راہ میں اس کے بندوں پر صرف کرتے ہیں اس کا کئی گنا اللہ تعالیٰ ان کو اس دنیا ہی میں عطا فرما دیتا ہے۔ ہاں اخلاص اور یقین شرط ہے۔

ضرورتمندوں کو کھلانے پلانے اور پہنانے کا اجر و ثواب :-

عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
اَيُّمَا مُسْلِمٍ كَسَا مُسْلِمًا ثَوْبًا عَلٰى عُرْيٍ كَسَاهُ اللهُ مِنْ خُضْرِ الْجَنَّةِ
وَاَيُّمَا مُسْلِمٍ اَطْعَمَ مُسْلِمًا عَلٰى جُوْعٍ اَطْعَمَهُ اللهُ مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّةِ
وَاَيُّمَا مُسْلِمٍ سَقٰى مُسْلِمًا عَلٰى ظَمَاٍ سَقَاهُ اللهُ مِنَ الرَّحِيْقِ الْمَخْتُوْمِ۔

ـــــــ رواہ ابوداؤد والترمذی

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا جس مسلم نے کسی دوسرے مسلم بھائی کو جس کے پاس کپڑا نہیں تھا پہننے کو کپڑا دیا، اللہ تعالیٰ اس کو جنت کا سبز لباس پہنائے گا اور جس مسلم بھائی نے دوسرے مسلم بھائی کو بھوک کی حالت میں کھانا کھلایا اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے پھل اور میوے کھلائے گا اور جس مسلم نے پیاس کی حالت میں دوسرے مسلم بھائی کو پانی پلایا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی سربمہر شراب طہور پلائے گا۔

(سنن ابی داؤد، جامع ترمذی)

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ مَا مِنْ مُسْلِمٍ كَسَا مُسْلِمًا ثَوْبًا اِلَّا كَانَ فِيْ حِفْظِ اللّٰهِ مَادَامَ عَلَيْهِ مِنْهُ خِرْقَةٌ　——— رواہ احمد والترمذی

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے جس بندے نے کسی مسلم کو کپڑا پہنایا وہ یقیناً اس وقت تک اللہ کے حفظ و امان میں رہے گا جب تک کہ اس کے جسم پر اس کپڑے میں سے کچھ بھی رہے۔　(مسند احمد، جامع ترمذی)

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ لَمَّا قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ جِئْتُ فَلَمَّا تَبَيَّنْتُ، وَجْهَهُ عَرَفْتُ اَنَّ وَجْهَهُ لَيْسَ بِوَجْهِ كَذَّابٍ فَكَانَ اَوَّلُ مَا قَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اَفْشُوا السَّلَامَ وَاَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَصِلُوا الْاَرْحَامَ وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ۔

——— رواہ الترمذی وابن ماجۃ

حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کرکے مدینہ طیبہ آئے تو میں (آپ کو دیکھنے سمجھنے کے لیے) آپ کے پاس آیا، جب میں نے غور سے آپ کا روئے انور دیکھا تو پہچان لیا (اور بلا کسی شک و شبہ کے جان لیا) کہ یہ ہرگز کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں ہے، پھر آپ نے سب سے پہلی جو بات فرمائی وہ یہ تھی کہ "اے لوگو آپس میں

سلام کی خوب اشاعت کرو اور رواج دو (یعنی ہر ایک دوسرے کو سلام کیا کرے اس سے دل کی گرہیں کھلتی ہیں اور تعلق بڑھتا ہے) اور (اللہ کے بندوں کو خاص کر ان کو جو ضرورتمند ہوں) کھانا کھلاؤ، اور آپس میں صلۂ رحمی کرو (یعنی قرابت کے حقوق ادا کرو) اور رات کو جس وقت لوگ پڑے سوتے ہیں اللہ کے حضور میں نماز پڑھو ایسا کروگے تو سلامتی کے ساتھ جنت میں جاؤ گے۔

(جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

بھوکے پیاسے جانوروں کو کھلانا پلانا بھی صدقہ ہے :-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ غُفِرَ لِاِمْرَأَةٍ مُوْمِسَةٍ مَرَّتْ بِكَلْبٍ عَلٰی رَأْسِ رَكِیٍّ یَلْهَثُ كَادَ یَقْتُلُهُ الْعَطْشُ فَنَزَعَتْ خُفَّهَا فَأَوْثَقَتْهُ بِخِمَارِهَا فَنَزَعَتْ لَهٗ مِنَ الْمَاءِ فَغُفِرَ لَهَا بِذٰلِكَ قِیْلَ اِنَّ لَنَا فِی الْبَهَائِمِ اَجْرًا قَالَ فِیْ كُلِّ ذَاتِ كَبِدٍ رَطْبَةٍ اَجْرٌ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بدچلن عورت اس عمل پر بخشدی گئی کہ وہ ایک کنوئیں کے پاس سے گزری اور اُس نے دیکھا کہ ایک کتا زبان نکالے ہوئے ہے۔ (اور اس کی حالت ایسی ہے کہ) گویا وہ پیاس سے مرہی جائے گا، (اس عورت کے دل میں ترس آیا وہاں پانی نکالنے کے لیے رسی ڈول کچھ موجود نہیں تھا) اُس نے اپنا چمڑے کا موزہ پاؤں سے نکالا اور (کسی طرح اس کو) اپنی اوڑھنی سے باندھا اور (محنت مشقت کرکے) اسی کے ذریعہ کنوئیں سے پانی نکال کے اس کو پلایا، وہ عورت اپنے اسی عمل کی وجہ سے بخشدی گئی ——— کسی نے عرض کیا کہ۔ یارسول اللہ کیا جانوروں کے کھلانے پلانے میں بھی ثواب ہے؟ آپ نے فرمایا! ہاں ہر حساس جانور (جس کو بھوک پیاس کی تکلیف ہوتی ہو) اس کو کھلانے پلانے میں اجر و ثواب ہے۔　　(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَغْرِسُ غَرْسًا اَوْ يَزْرَعُ زَرْعًا فَيَاكُلُ مِنْهُ اِنْسَانٌ اَوْ طَيْرٌ اَوْ بَهِيْمَةٌ اِلَّا كَانَتْ لَهُ صَدَقَةٌ ۔ رواہ البخاری ومسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو مسلمان بندہ کوئی درخت لگائے یا کھیتی کرے تو اس درخت یا اس کھیتی سے جو پھل اور جو دانہ کوئی انسان یا کوئی پرندہ یا کوئی چوپایہ کھائے گا وہ اس بندہ کے لیے صدقہ اور اجر و ثواب کا ذریعہ ہوگا۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

اللہ کے بندوں کو زحمت سے بچانے کا صلہ جنت :-

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ رَجُلٌ بِغُصْنِ شَجَرَةٍ عَلٰى ظَهْرِ طَرِيْقٍ فَقَالَ لَاُنَحِّيَنَّ هٰذَا عَنْ طَرِيْقِ الْمُسْلِمِيْنَ لَا يُؤْذِيْهِمْ فَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ ۔

رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ اللہ کا کوئی بندہ کسی راستہ پر چلا جا رہا تھا بس پر کسی درخت کی ایک شاخ تھی (جس سے گزرنے والوں کو تکلیف ہوتی تھی) اس بندہ نے اپنے جی میں کہا کہ میں اس شاخ کو یہاں سے الگ کر کے راستہ صاف کر دوں گا تاکہ بندگانِ خدا کو تکلیف نہ ہو (پھر اس نے ایسا ہی کیا) تو وہ اپنے اس عمل کی وجہ سے جنت میں بھیج دیا گیا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح) بعض اعمال بظاہر بہت چھوٹے اور معمولی ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی وہ دل کی ایسی کیفیت اور ایسے خدا پرستانہ جذبہ کے ساتھ صادر ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں بڑا قیمتی اور بڑا محبوب ہوتا ہے، اس کی وجہ سے ارحم الراحمین کا دریائے رحمت جوش میں آجاتا ہے، پھر اس

ندے کے سارے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اور اس کے لیے مغفرت اور داخلۂ جنت کا فیصلہ فرما دیا جاتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ والی مندرجۂ بالا حدیث میں ایک پیاسے کتے کو پانی پلانے پر ایک بدچلن عورت کی مغفرت کی جو خوشخبری دی گئی ہے اور اس حدیث میں راستے سے ایک درخت کی صرف شاخ ہٹا دینے پر ایک آدمی کے داخلۂ جنت کی جو بشارت سنائی گئی ہے اُس کا راز یہی ہے۔ واللہ اعلم

کس وقت کے صدقہ کا ثواب زیادہ ہے :-

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَیُّ الصَّدَقَةِ اَعْظَمُ اَجْرًا قَالَ اَنْ تَصَدَّقَ وَاَنْتَ صَحِیْحٌ شَحِیْحٌ تَخْشَی الْفَقْرَ وَتَاْمُلُ الْغِنٰی وَلَا تُمْهِلْ حَتّٰی اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ قُلْتَ لِفُلَانٍ كَذَا وَلِفُلَانٍ كَذَا وَقَدْ كَانَ لِفُلَانٍ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ کس صدقہ کا ثواب زیادہ ہے، آپ نے فرمایا کہ زیادہ ثواب کی صورت یہ ہے کہ تم ایسی حالت میں صدقہ کرو جبکہ تمھاری تندرستی قائم ہو اور تمھارے اندر دولت کی چاہت اور اس کو اپنے پاس رکھنے کی حرص ہو، اس حالت میں (راہ خدا میں مال خرچ کرنے سے تمھیں محتاجی کا خطرہ ہو اور دولتمندی کی دل میں آرزو ہو۔ (ایسے وقت میں اللہ کی رضا کے لیے اپنا مال خرچ کرنا بھی خدا پرستی اور خدا طلبی کی دلیل ہے اور ایسے صدقہ کا ثواب بہت بڑا ہے) اور ایسا نہ ہونا چاہیے کہ تم سوچتے رہو اور ٹالتے رہو یہاں تک کہ جب موت کا وقت آجائے اور جان کھنچ کے حلق میں آجائے، تو تم مال کے بارے میں وصیت کرنے لگو کہ اتنا فلاں کو اور اتنا فلاں کو، حالانکہ اب تو مال (تمھاری ملکیت سے نکل کر) فلاں فلاں کا (یعنی وارثوں کا) ہو ہی جائے گا۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) انسانوں کی یہ عام کمزوری ہے کہ جب تک وہ تندرست و توانا ہوتے ہیں اور موت سامنے نہیں کھڑی ہوتی، وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بخل کرتے ہیں، شیطان ان کے دلوں میں

وسوسہ ڈالتا ہے کہ اگر ہم نے راہِ خدا میں خرچ کیا تو ہمارے پاس کمی ہو جائے گی، ہم خود تنگدست اور
محتاج ہو جائیں گے اس لیے ان کا ہاتھ نہیں کھلتا، لیکن جب موت سامنے آجاتی ہے اور زندگی کی
امید باقی نہیں رہتی تو انھیں صدقہ یاد آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ طرزِ عمل
ٹھیک نہیں ہے۔ اللہ کی نگاہ میں محبوب اور مقبول صدقہ وہ ہے جو بندہ تندرستی و توانائی کی ایسی
حالت میں کرے کہ اس کے سامنے اپنے مسائل اور اپنا مستقبل بھی ہو اس کے باوجود وہ اللہ کی رضا جوئی
کے لیے اور آخرت کے ثواب کی امید میں اور ربِ کریم کے وعدوں پر یقین و اعتماد کرتے ہوئے اسی
حالت میں ہاتھ کھول کے اللہ کی راہ میں اس کے بندوں پر خرچ کرے ـــــ ایسے بندوں کیلئے
قرآن مجید میں فلاح کا وعدہ ہے ـــ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

تجلیاتِ مجدد الفِ ثانیؒ
مکتوبات کے آئینے میں

ترجمہ از ——— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب (۵۶)۔ درویش حبیب، خادم کے نام —— [کثرت و قلت کرامات کے راز کے بیان میں]

(کھانے پینے اور پہننے میں) قدر ضرورت سے زیادہ کو اختیار کرنا (اور بقدر ضرورت پر اکتفا نہ کرنا) ظہور خوارق و کرامات کی قلت کا باعث ہے۔ خصوصاً جب کہ مباحات کا زیادہ استعمال حدِ مشتبہ تک پہونچا دے اور وہاں سے حرام کے آس پاس لے آئے ۔۔ پناہ بخدا ۔۔ (ایسی صورت میں) کرامات و خوارق کہاں؟ ——— جس قدر ارتکاب مباح کا دائرہ تنگ تر کر کے بقدر ضرورت پر اکتفا کیا جائے گا اسی قدر گنجائشِ کشف و کرامات زیادہ اور راہ ظہورِ خوارق کشادہ تر ہوگی (یہ بھی واضح رہے کہ) معجزہ کا ظہور شرط نبوت ہے اور کرامت کا ظہور، شرط ولایت نہیں ہے۔ اس لیے کہ نبی کے لیے نبوت کا اظہار واجب ہے بخلاف ولی کے کہ اس کے لیے ولایت کا اظہار واجب نہیں، بلکہ اس کو تو مخفی رکھنا اولیٰ ہے .... کسی ولی سے کرامات کا کثرت کے ساتھ ظاہر ہونا ان دوسرے اولیا پر اس کی افضلیت کی دلیل نہیں ہے جن سے اسقدر خوارق و کرامات ظہور میں نہ آئے ہوں، ——— بلکہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک ولی جس سے کوئی بھی کرامت ظاہر نہ ہوئی ہو وہ ان اولیاء سے افضل ہو جن سے خوارق و کرامات کا بکثرت ظہور ہوا ہو ——— چنانچہ شیخ الشیوخ (حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ) نے اپنی کتاب، عوارف المعارف میں اس حقیقت کو

بیان فرمایا ہے ـــــ جبکہ انبیاء علیہم السّلام کے اندر معجزات کا کم یا زیادہ ہونا، فاضلیت و مفضولیت کا باعث نہیں (حالانکہ معجزہ شرطِ نبوت ہے) تو پھر ولایت میں (جبکہ کرامت شرطِ ولایت بھی نہیں) کس طرح، خوارق و کرامات ایک دوسرے پر فضیلت کا باعث ہو جائیں گے؟ ـــــ ...... ریاضات و مجاہدات، درجاتِ قربِ الٰہی تک پہونچنے کے لیے اُس راہ میں درکار ہیں جو راہِ مُریداں کہلاتی ہے اور راہِ مُراداں، (اجتباء (برگزیدگی) ہے ـــــ مُرید، مشقت و محنت کے ساتھ اپنے پاؤں سے چلتے ہیں اور "مراد" کو ناز و نعم کے ساتھ کشاں کشاں خود لے جاتے ہیں اور اُن کی ریاضت و محنت کے بغیر درجاتِ قرب تک پہونچاتے ہیں ـــــ جاننا چاہیے کہ ریاضات و مجاہدات راہِ انابت و ارادت کے لیے شرط ہیں اور راہِ اجتباء میں مجاہدات شرط نہیں ہیں مگر ہاں نافع و سود مند ضرور ہیں ـــــ مثلاً ایک شخص ہے کہ اس کو کشاں کشاں لیے جا رہے ہیں اور وہ اس کشش کے باوجود اپنی سعی و مشقت کو بھی اپنے اس سفر کے اندر استعمال کر رہا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسا شخص بہت جلد منزلِ مقصود تک پہونچ جائے گا، بخلاف اس شخص کے جو اپنی سعی کو کار فرما نہیں کرتا ـــــ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی تنہا کشش جو زیادہ قوت والی ہو زیادہ کارآمد ہو اس کشش سے جو سعی و کوشش سے مرکب ہو ـــــ پس سعی و مشقت، راہِ اجتباء میں کمالِ وصول کی بھی شرط نہیں جیسا کہ نفسِ وصول کی شرط نہیں ـــــ ہاں سعی و مشقت، احتمالِ نفع ضرور رکھتی ہے اگرچہ بعض مقامات میں ہی کیوں نہ ہو ـــــ

ریاضت و مجاہدات کے ـــــ جو کہ بالفاظِ دگر، ضروریات پر اکتفا کا نام ہے ـــــ فوائد و منافع اجتباء والوں کے لیے ...... بہت سے ہیں مثلاً دوامِ جہادِ نفس اور دنیا کی آلودگیوں سے باطن کی طہارت و نظافت ـــــ جس قدر کہ حوائجِ ضروری سے ہو وہ داخلِ دُنیا نہیں ہے اور جو فضول (زائد) ہے وہ دُنیا میں داخل ہے ـــــ ایک دوسرا نفع ریاضت کرنے اور ضروریات پر اکتفا کرنے کا، قلتِ محاسبہ اور قلتِ مواخذۂ اُخروی بھی ہے نیز ریاضت و مشقت، درجاتِ اُخرویہ کے بلند ہونے کا بھی سبب ہے اس لیے کہ جس قدر دُنیا میں مشقت ہے اُس سے کئی گنی آخرت میں مسرت ہے ـــــ ...... پس واضح ہوا کہ ریاضات اور اقتصار بر ضروریاتِ مُباحہ اگرچہ راہِ اجتباء کے اندر شرطِ وصول نہیں مگر فی حدِّ ذاتہا محمود و مستحسن

ضرور ہیں بلکہ فوائد مذکورہ پر نظر کرتے ہوئے ضروری و لازم ہیں ——— رَبَّنَآ آتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ——— والسلام علی من اتبع الھدیٰ ———

مکتوب (۹) ـ قاضی اسمٰعیل فریدآبادی کے نام ——— [درمیانی حصہ شیخ اکبرؒ سے متعلق]

...... اس مسئلہ توحید (وجودی) کی متقدمین صوفیہ کے زمانہ میں اچھی طرح تنقیح و توضیح نہیں ہوئی تھی اس وجہ سے ان متقدمین میں سے جس پر غلبۂ حال ہو جاتا تھا اُس سے کبھی کبھی کوئی ایسا کلمہ صادر ہو جاتا تھا جو "اتحاد نما" ہوتا تھا اور وہ غلبۂ سکر و حال کی وجہ سے اُس کلمے کے راز تک نہیں پہونچتا تھا اور اس کی ظاہر عبارت میں حلول و اتحاد کا شائبہ رہتا تھا ——— جب شیخ بزرگوار محی الدین ابن عربی قدس سرہٗ کا زمانہ آیا تو انھوں نے کمال معرفت سے اس دقیق مسئلہ کو شرح کیا اور اس مسئلے کو باب باب اور فصل فصل کر کے واضح اور مرتب طور سے بیان کیا، نیز صرف و نحو کی طرح اس کی تدوین کی ـــ اس کے باوجود ایک جماعت صوفیہ نے ان کی بات نہیں سمجھی اور ان کو مطعون کیا ـــ اس مسئلۂ توحید میں اکثر تحقیقات کے اندر شیخؒ حق بجانب ہیں اور اُن پر طعن و اعتراض کرنے والے صحت و صواب سے دور ہیں ——— اس مسئلے کی تحقیق سے شیخ رحمہ کی عظمت اور اُن کے وفور علم کا احساس و ادراک ہونا چاہیئے نہ یہ کہ ان پر ردّ و طعن کیا جائے ـ یہ مسئلۂ توحید (وجودی) جس قدر آگے کو چلا ہے اُسی قدر افکار متاخرین کے باہم مل جانے کی وجہ سے واضح و منقح اور حلول و اتحاد کے شبہات سے دور تر ہوتا چلا گیا ہے ———

علم نحو جو اس فن کے متاخرین کے تلاحقِ افکار سے جس قدر واضح و منقح ہو چکا ہے سیبویہ اور اخفش کے زمانے میں اتنا واضح و منقح نہ تھا ہر فن کی تکمیل تلاحق افکار ہی سے ہوتی ہے ـ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ نے چھ ماہ تک مسئلۂ خلق قرآن میں باہم تبادلۂ خیال اور بحث و مباحثہ کیا، چھ ماہ کے بعد یہ تحقیق مکمل ہوئی کہ جو شخص قرآن کو مخلوق کہے گا کافر ہو جائے گا ——— اس وقت ان دو اماموں کے درمیان یہ طویل تبادلۂ خیال اور بحث مباحثہ اسی وجہ سے ہوا کہ مسئلہ اس وقت تک منقح نہیں ہوا تھا جب اتنے بحث مباحثہ اور غور و فکر کے

بعد مسئلہ منقح ہو گیا تو وہ ایک نتیجہ پر پہونچ سکے۔ اس وقت جب کہ تلاحق افکار سے یہ مسئلہ (خلق قرآن) منقح ہو گیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر محلِ نزاع حروف و کلمات ہیں جو کہ کلام نفسی پر دلالت کرتے ہیں تو اس میں شک نہیں ہے کہ یہ حروف و کلمات حادث و مخلوق ہیں اور اگر معانی مراد ہیں تو (بلاشبہ) قدیم و غیر مخلوق ہیں ــــــ یہ تنقیح، تلاحقِ افکار ہی کی برکات سے ہے....

مکتوب (۹۰) - خواجہ محمد ہاشم کشمی کے نام ــــــ [شرع کا کچھ حصہ دُنیا میں دیدارِ الٰہی سے متعلق]

تم نے دریافت کیا تھا کہ محققین صوفیاء میں سے بعض دنیا میں دیدۂ دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے دیدار کے قائل ہیں جیسا کہ شیخ عارف (حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ) اپنی کتاب عوارف المعارف میں فرماتے ہیں، موضع المشاہدۃ بصر القلب الخ (دُنیا میں مشاہدۂ حق تعالیٰ کا مقام دیدۂ قلب ہے) ــــــ اور شیخ ابو اسحٰق کلاباذی قدس سرہٗ جو کہ قدمائے صوفیاء اور اکابر مشائخ میں سے ہیں، کتاب تعرف میں فرماتے ہیں کہ "اجماعِ صوفیاء ہے اس امر پر کہ اللہ تعالیٰ کو دنیا میں نہ ابصار سے دیکھا جا سکتا ہے نہ قلوب سے اِلّا ایقان کی جہت سے دیکھا جا سکتا ہے" ــــــ تم نے پوچھا تھا کہ دونوں بزرگوں کی تحقیق میں تطبیق کس طرح ہو؟ اور میری رائے بھی اس کے بارہ میں دریافت کی تھی، نیز تم نے دریافت کیا تھا کہ جب اس مسئلہ میں اختلاف ہے تو پھر اجماع کے کیا معنی ہیں؟ - جاننا چاہیے ــــــ اللہ تعالیٰ تم کو رشد و ہدایت عطا فرمائے ــــــ کہ اس فقیر کے نزدیک اس مسئلے میں مختار و پسندیدہ قول، صاحبِ تعرف کا ہے۔ فقیر کا یقین یہی ہے کہ قلوب کو اس دُنیا میں سوائے ایقان کے حضرت حق جل سلطانہٗ سے اور کوئی حصہ نہیں ہے ــــــ اب اس ایقان کو رویت کہہ لو یا مشاہدہ! (اور یہ بھی واضح رہے) کہ جب (دنیا میں) قلب کو بھی رویت حاصل نہیں تو ابصار کو کیا حاصل ہو گی؟ اس لیے کہ ابصار تو اس دنیا کے اندر مشاہدۂ حق کے معاملے میں، محض بیکار و معطل ہیں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ لو کہ قلب کو معنیٔ ایقان جو حاصل ہو گیا ہے وہ معنیٔ ایقان عالمِ مثال میں بصورتِ رویت و دیدار ظاہر ہو جاتا ہے اور جس ذاتِ مقدس سے ایقان کا تعلق ہے وہ ذات دیکھی ہوئی شے کی صورت میں ظاہر ہو جاتی ہے - کیونکہ عالمِ مثال میں ہر معنیٰ کے لیے عالمِ شہادت (دنیا) کے مناسب

ایک صورت ہے اور چونکہ عالمِ شہادت میں کمالِ یقین، رویت کی صورت میں حاصل ہوتا ہے اس لیے یہ ایقان بھی عالمِ مثال میں بصورتِ رویت ظاہر ہو جاتا ہے، اور جب ایقان بصورتِ رویت ظاہر ہوا تو اُس کا متعلق جو کہ مُوقَن بِہٖ ہے ناچار بصورتِ مرئی (دیدہ شدہ) اس جگہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ سالک جب اس کو آئینہ مثال میں مشاہدہ کرتا ہے تو آئینے کے توسّط سے غافل ہو کر اور صورت کو حقیقت جان کر سمجھتا ہے کہ اس کو حقیقۃً رویت حاصل ہو گئی ہے اور مرئی نمودار ہو گیا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ وہ رویت اُس کے صورتِ ایقان کی رویت ہے اور وہ دیدہ شدہ اس کے مُوقَن بِہٖ (متعلق ایقان) کی صورت ہے ـــــ اور یہ ان امور میں سے ہے جن میں بہت سے صوفیوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے اور ان کے لیے صورتیں حقائق سے ملتبس ہو جاتی ہیں اور وہ مغالطہ کھا جاتے ہیں ـــــ یہی "دید" جب غالب آتی ہے اور باطن سے ظاہر میں نکلتی ہے تو کبھی کبھی سالک اس توہم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ رویتِ بصری بھی حاصل ہو گئی اور مطلوب گوش سے آغوش میں آ گیا وہ یہ نہیں جانتا کہ اس معنیٰ کا حصول جب کہ اصل تک میں یعنی بصیرت تک میں مبنی بر توہم و تلبیس ہے تو بصر جو کہ اس عالم میں بصیرت کی فرع ہے اس کی تو حیثیت ہی کیا ہے؟۔ بھلا (دنیا میں) بصر کو رویت کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ ـــــ رویتِ قلبی میں تو صوفیاء کا جمِّ غفیر توہم میں پڑ گیا ہے اور رویتِ قلبی کا حکم لگاتا ہے۔ مگر دنیا میں رویتِ بصری کے متعلق صوفیاء میں شاید کوئی ناقص ہی توہم میں پڑا ہو (کیونکہ دنیا میں ان آنکھوں سے حق تعالیٰ کا دیدار) اہلِ سنت و جماعت کے اجماع کے خلاف ہے ـــــ اللہ تعالیٰ ان کی سعی کو مشکور کرے ـــــ .... اور اجماع کے بارے میں جو تم نے دریافت کیا ہے (اس کا جواب یہ ہے کہ) ہو سکتا ہے اس وقت تک (صاحب تعرّف کے وقت تک) وہ اختلاف جو لائقِ اعتبار ہو ظہور میں نہ آیا ہو یا اپنے زمانے کے مشائخ کا اجماع مراد ہو ـــــ وَاللّٰہُ سُبْحَانَہٗ اَعْلَمُ بِحَقِیْقَۃِ الْحَالِ ـــــ

اسلام کا پیغام

عظیم جرمن قوم کے نام

(از ــــ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

[ہمارے محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، امسال دوسری مرتبہ اسلامک سنٹر جنیوا کی دعوت پر یورپ تشریف لے گئے۔ اس سفر میں آپ کا جرمنی بھی جانا ہوا۔ ۲۰ راکتوبر سنہ ۶۳ء کو برلن کی انجینئرنگ یونیورسٹی کے ایک جلسے میں جو یونیورسٹی کے عرب طلبا کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا، مولانا نے جرمن قوم کو مخاطب کرتے ہوئے مندرجۂ ذیل تقریر کی ــــ تقریر پہلے سے عربی میں لکھ لی گئی تھی، مقرر نے اس کے مندرجات اپنی زبانی تقریر میں بیان کیے۔ عربی تقریر کا جرمن ترجمہ پہلے سے تیار تھا جو ایک نومسلم جرمن نے پڑھ کر سنایا ــــ اس تقریر کا اردو ترجمہ مولوی محمد الحسنی مدیر "البعث الاسلامی" و "تعمیر حیات" نے کیا ہے جو ان کے شکریے کے ساتھ یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔]

حضرات! مجھے اس عظیم شہر برلن میں پہلی بار عظیم جرمن قوم سے خطاب کرنے اور اسلام کا پیغام پہونچانے کا موقع مل رہا ہے، یہ ایک خوشگوار اور قیمتی موقع ہے اور مجھے اس کی اہمیت اور نزاکت کا پورا احساس ہے۔

جرمن قوم زمانۂ قدیم سے شجاعت و مہم جوئی، سنجیدگی اور قوت عمل اور استقلال میں جدید میں ممتاز رہی ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس قوم میں ایسے اولوالعزم اور جاں فروش پیدا ہوئے جنھوں نے مغربی معاشرہ اور مغربی افکار پر گہرا اثر ڈالا۔ اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ تین اشخاص کا نام لوں گا جن

میں سے ہر ایک کا یورپ کے دل و دماغ پر زبردست اثر ہے اور ان میں سے ہر ایک مستقل مدرسۂ فکر کا بانی اور اپنے رنگ میں منفرد ہے پہلا شخص مارٹن لوتھر Martin Luther ہے جس نے اصلاح کلیسا، کتاب مقدس کی طرف رجوع اور پوپ پادریوں کے حد سے بڑھے ہوئے اقتدار کی حد بندی کی دعوت دی، اس نے مسیحی یورپ پر گہرا اثر چھوڑا اور ایک مذہب کا بانی قرار پایا جس کو پراٹسٹنٹ کہتے ہیں۔ دوسرا شخص کانٹ ہے جس نے یورپ کی عقل پرستی کی تردید کی اور اس کے حدود اور پیمانے متعین کیے، کانٹ جدید جرمنی کا سب سے بالغ نظر فلسفی سمجھا جاتا ہے، اس کا اور اس کی دو کتابوں "تنقید عقل خالص اور تنقید عقل عملی" کا مغربی فکر و فلسفہ پر گہرا اثر ہے۔

تیسری شخصیت نیٹشے کی ہے جو ایک ایسا سرپھرا مفکر تھا جس نے اخلاقیات، اجتماعیات اور مسیحی نظام کے خلاف ہمہ گیر بغاوت کا علم بلند کیا اور ساری عمر اپنے گرد و پیش کی دنیا اور افکار و عقائد سے لڑتا رہا۔

یہ تینوں شخصیتیں اور ان کے پیدا کیے ہوئے مدارس فکر، جرأت انقلاب اور جدت میں ممتاز تھے ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر انقلابی نقطۂ نظر کا حامل تھا جس کا اعتراف نہ صرف اس کے ملک جرمنی بلکہ پورے یورپ کو ہے۔

انقلاب، بغاوت اور ذہنی بے چینی جرمن قوم کے خمیر میں ہے، انقلاب پسندی، نفسیاتی خلش اور ذہنی بے چینی ہی تھی جو کارل مارکس کی شخصیت کے روپ میں اپنے پورے عروج کے ساتھ ظاہر ہوئی اور جس نے آخر کار دنیا کے ایک بہت بڑے رقبہ میں سب سے بے چینی پیدا کر دی اور موجودہ زمانہ کے قدیم اقتصادی نظاموں کے خلاف سب سے بڑی بغاوت کہلائی۔

یہ تحریکیں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا دراصل انقلابات اور بغاوتیں ہی تھیں، کبھی ان کا دائرہ وسیع تھا کبھی تنگ، کبھی ان کا اثر گہرا تھا اور کبھی ہلکا، جرمن قوم ہمت و جرأت، پیش قدمی، دنیا میں بلند مرتبہ حاصل کرنے کا شوق اور خود اعتمادی میں بھی ممتاز ہے، پہلی اور دوسری عالمگیر جنگیں (۱۹۱۴-۱۹۱۸) (۱۹۳۹-۱۹۴۵ء) بھی درحقیقت سیاست و حکومت کی دنیا میں دو بغاوتیں یا دو مہم جوئی کہی جا سکتی ہیں۔ یہ صرف اس کا نتیجہ تھا کہ اس عظیم قوم میں ایک جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا، اس کی صلاحیتیں، قوتیں یکایک ابھر گئیں اس میں حوصلہ مندی اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی اب بھی شرار زندگی

اس کی خاکستر میں پوشیدہ ہے، اب بھی وہ زندگی و نشاط اور تعمیر و ترقی کی زبردست صلاحیت سے بھر
اگر یہ بات نہ ہوتی تو جرمن قوم اس زبردست صدمہ کو برداشت نہ کر سکتی جس کی مثالیں تاریخ میں کم ملے
ہیں وہ اس قیامت کو سہار نہ سکتی جو ایک پوری قوم کی صلاحیت کو مفلوج کر دینے اور اس کو زندگی سے
مایوس کر دینے کے لیے کافی تھی اور دوسری جنگ میں اس کی تباہ شدہ عمارتوں اور کارخانوں کے ملبہ
پر تمدن و صنعت اور یہ نشاط اور قوت پیدا اور ظاہر نہ ہوتی اور جرمن قوم تازہ دم ہو کر نئی قوت او
ولولہ کے ساتھ اپنی زندگی کی دوڑ شروع کرنے کے قابل نہ ہو سکتی۔

لیکن اس عظیم قوم کے یہ تجربے اور مہم جوئیاں محدود بغاوتوں اور محدود قسم کے انقلابات
آگے نہ بڑھ سکیں، جس طرح کے انقلابات کا آغاز کلام میں میں نے اشارہ کیا ہے اور جن کی مغربی معاشرہ
اور مغربی دائرۂ فکر میں ایک خاص قیمت اور اہم حصہ ہے۔ اور جس نے جرمن قوم کو عظمت و ترقی اور
شہرت دوام عطا کی ہے لیکن وہ یورپ کے مذہبی اور فکری نظام کو یکسر تہ و بالا نہیں کر سکیں وہ ایک
نیا معاشرہ، اور ایک نئی دنیا پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں جو قدیم دنیا سے ہر چیز میں مختلف ہوتا۔
گزشتہ دونوں بڑی جنگیں اصول اور مقاصد کے لیے نہ تھیں وہ مسیحیت یا بلند اخلاقی، اقدار یا
انسانیت کے لیے نہیں لڑی گئی تھیں، ان کا مقصد اور نشانہ یہ نہیں تھا کہ قیادت ظالم اور پاپی ہاتھ
سے نکل کر رحمدل اور عدل نواز ہاتھ میں پہونچ جائے، وہ فسق و فجور، بے حیائی اور حیوانیت کو ختم
کرنے کے لیے نہیں چھیڑی گئی تھیں۔ آپ مجھے معاف کریں یہ درحقیقت حکومت و اقتدار حاصل کرنے
کے لیے تھیں اور زیادہ صاف لفظوں میں یہ جنگیں اس لیے کی گئیں کہ دونوں فریقوں میں سے ہر فریق یہ
چاہتا تھا کہ دنیا میں جو کچھ فساد، ظلم، زور دستی اور لوٹ کھسوٹ ہے وہ سب برقرار رہے، لیکن
اس کی تولیت اور ماتحتی میں ہو۔

عظیم جرمن قوم کا مقام و مرتبہ تو یہ تھا کہ وہ ان تمام بغاوتوں اور جنگوں اور انقلابات
سے زیادہ دور رس انقلاب دنیا کے سامنے پیش کرتی، ایسا انقلاب جو نہ صرف جرمنی اور یورپ
بلکہ نوع انسانی کے لیے مفید ہوتا اور اس کو حقیقی سکون و اطمینان سے ہم کنار کرتا، ایک ایسا انقلاب جو
جو اپنی انفرادیت، انقلاب آفرینی، جدت اور حوصلہ مندی اور اپنی تخلیقی صلاحیت میں ان تمام
انقلابات سے کہیں بہتر ہوتا جو جرمنی کے اولوالعزم رہنماؤں نے ماضی قریب یا ماضی بعید میں برپا کیے ہیں۔

آج بھی جرمنی مغربی قافلہ کا پوری طرح ساتھ دے رہا ہے بلکہ صنعت، کاریگری اور کثرت پیداوار میں بعض وقت اس سے آگے بڑھ جاتا ہے وہ وسائل، ایجادات اور مصنوعات اور زندگی کی سہولتوں میں برابر اضافہ کرتا آ رہا ہے۔ لیکن موجودہ تہذیب میں اس کا حصہ صرف صنعت، پیداوار، تجارت اور موقع شناسی کی حد تک ہے، اس معاملہ میں اس قوم کی ذہانت اور عبقریت، اس کا کمال فن اور اس کا ضبط و تحمل اچھی طرح آشکارا ہوگیا ہے اور وہ اس میدان میں اپنی بہت سی پڑوسی قوموں اور ملکوں سے آگے نکل گئی ہے اور دنیا کی قوموں میں اور تجارت کی منڈیوں اور بازاروں میں صف اوّل میں نظر آتی ہے۔

اس انقلاب پسند اور حوصلہ مند قوم سے اور اس ملک سے جو عرصہ سے انقلابیوں کا مسکن اور انقلابات کی آماجگاہ رہ چکا ہے اس کی توقع تھی کہ وہ اس تہذیب سے بغاوت کرتی جس نے انسان کو ایک گمراہ سرکش وجود اور ایک طاقتور تباہ کن ہستی بنا دیا ہے، اس نے اس کو ایک ایسی اندھی بہری مشین بنا دیا ہے جو نہ روح رکھتی ہے نہ دل، نہ عقیدہ، نہ ضمیر، اس نے پوری دنیا کو ایک قمارخانہ یا تھیٹر خانہ اور پوری زندگی کو خرید و فروخت اور لین دین کی ایک منڈی بنا دیا ہے۔ اس نے زندگی سے لذت، جدت، تنوع، گہرائی اور حرارت سلب کر لی ہے، اس تہذیب کے خلاف علم بغاوت بلند کرتی جس نے زندگی کو ایک نہ ختم ہونے والی مشکلات بنا دیا ہے ایک ایسی دوڑ میں تبدیل کر دیا ہے جس کی کوئی انتہا نہیں، ایک ایسی جد و جہد اور تگ و دو جس کا کوئی نتیجہ نہیں، اس نے عصر حاضر کے انسان کو کولہو کا بیل بنا دیا ہے جو مسلسل ایک دائرہ میں چکر کاٹتا رہتا ہے اس نے انسان سے اس کی سب سے بیش قیمت متاع چھین لی اس کو سب سے بڑی شرافت سے محروم کر دیا، اور وہ ہے ایمان و یقین، بے لوث اخلاص، پاکیزہ محبت اور درد و سوز کی دولت۔

اس کی توقع تھی کہ یورپ کی قوموں میں سے کوئی ایک قوم ان جھوٹے نظریات اور ان مصنوعی اقدار اور معیاروں سے بغاوت کرتی جن کو خود انسان تراشتا ہے اور پھر ان کی پرستش کرتا ہے۔ یہ جھوٹی اقدار، زندگی کے وہ مطالبات، زندگی کا وہ معیار اور نئے نئے فیشن ہیں اور وہ ساری پابندیاں ہیں جن کو سوسائٹی بلا وجہ انسانوں پر عاید کرتی ہے، وہ ٹیکس ہیں جو انسان کی پرسکون زندگی کو محکوم اور اس کی حقیقی آزادی کو سلب کر لیتے ہیں خاص طور پر

اس مومن قوم سے جس کی یورپ نے کوئی قدر نہیں کی اس بات کی امید تھی کہ وہ اس مبارک اور حقیقی انقلاب کی علمبردار ہوکر نہ صرف اپنے ملک بلکہ پوری دُنیا کے حالات کا رُخ تبدیل کردیتی اور اس کے ایک نئے باب کا آغاز کرتی۔

اس کے برعکس جرمنی جس مغربی خاندان کا ایک وفادار ممبر رہا جس نے اس کے ساتھ کبھی مساویانہ سلوک نہیں کیا اور ہمیشہ اس کو حسد کی نگاہ سے دیکھا وہ اسی رُخ پر چلتا رہا اسی ذہن و دماغ سے سوچتا رہا اور اپنی ذہانت اور مہارتِ کمال سے اس کو مدد پہنچاتا رہا، اس نے ان حدود سے آگے بڑھنے اور اس دائرے سے باہر قدم نکالنے کی کوئی کوشش نہیں کی جو اس نے متعین کردیا تھا، اس نے وہ عظیم جست نہیں لگائی جو اس کی تقدیر اور دُنیا کی تقدیر تبدیل کرسکتی اُس کو دنیا کی قیادت اور بقا و دوام بخشتی اور قوموں کی برادری میں اس کے مقام کو بلند اور اپنے پڑوسیوں کی نگاہ میں اس کی عزت دوچند کرسکتی ہے۔ یہ ایک ایسی جرأت مندانہ جست ہوتی جس کا مقابلہ یورپ کی کوئی اور قوم نہ کرسکتی۔ یہ اس مصنوعی اور تنگ حصار کو توڑ سکتی تھی جس میں یورپ صدیوں سے زندگی گزار رہا ہے۔ یہ جست قدیم و جدید، اور مشرق و مغرب سب کو فراموش کرکے دنیا کو مادیت، حیوانیت، درندگی اور اس المناک انجام سے محفوظ کرسکتی تھی جس کو سائنس نے بہت قریب کردیا ہو۔ یورپ کے مختلف حصوں میں اقتصادیات، اجتماعیات، اور سیاست کے میدانوں میں انقلابیوں نے جو چھلانگیں لگائی ہیں وہ اس عظیم جست کے مقابلے میں بچوں کے اچھل کود سے زیادہ کوئی حقیقت نہ رکھتیں۔

یہ ایک عجیب و غریب اور ناقابلِ فہم تضاد ہے کہ وہ یورپ جو زندگی اور نشاط سے بھرپور ہو اور متمدن دنیا کے سب سے وسیع رقبہ کی قیادت کررہا ہے جس نے کائنات کے اسرار سے پردہ اٹھایا اور مادی طاقتوں کو اپنا غلام بنایا، جو سستی، جمود، تعطل، اور بے عملی کے الفاظ سے ناواقف ہے، اس کی رہنمائی ایک ایسے مذہب کے ہاتھ میں ہے جو انسان اور اس کے خالق کے درمیان واسطہ حاصل کرنے پر مجبور ہے۔ جو انسان کے پیدائشی گنہگار رہنے اور حضرت مسیح کے نوعِ انسان کی طرف سے کفارہ بن جانے پر عقیدہ رکھتا ہے، وہ کفارہ جو انسان کو دوسرے پر بھروسہ کرنا سکھاتا ہے۔ اور اپنی صلاحیتوں اور اپنے ارادہ و عمل پر اس کے اعتماد کو ختم کردیتا ہے اور اس کے عمل کی قیمت اور جد و جہد کی ضرورت و افادیت کو خود اس کی نگاہ سے گراتا ہے۔ پھر لطف کی بات یہ کہ اس نے جب

نمائندے یورپ کے تجسس، حوصلہ مند اور سیماب وش انسان اور علم و عقل کے درمیان ایک طویل عرصہ تک دیوار بن کر حائل بھی رہے انھوں نے کتاب مقدس کے مفسرین اور اہلِ کلیسا کے بتائے ہوئے معلومات و نظریات سے سرتابی ان کے لیے حرام کر رکھی تھی چنانچہ جو شخص اپنے عقل و تجربہ پر بھروسہ کرتا تھا اور اپنے مشاہدہ اور نظریہ کا اعلان کرتا تھا، اس کو وہ سزائیں دی جاتی تھیں کہ مذاہب کی پوری تاریخ میں اس سے ہیبت ناک اور بہیمانہ سزاؤں کی مثال نہیں ملتی.

پھر وہ وقت بھی آیا کہ یورپ نے کلیسا کے اس بیجا جبر و استبداد اور تنگ نظری و کم عقلی کے خلاف بغاوت کر دی اور اس کی بیڑیاں اور زنجیریں توڑ ڈالیں اس نے وہ عظیم ترقی کی جس کی مثال جدید انسانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے. علم و تمدن اور طبیعاتی علوم میں بڑے بڑے مراحل طے کیے لیکن اس زبردست کشمکش نے جس نے اس کو بالکل خستہ اور شکستہ کر دیا اور اس کی ساری قوتوں اور صلاحیتوں کو نچوڑ لیا (حالانکہ اس دردسری کی اس کو کوئی ضرورت نہ تھی) اس کو اس توازن و اعتدال سے محروم کر دیا جو حقیقی سعادت کا سرچشمہ ہے اور اس پر وہ انتہا پسندی اور مادہ پرستی مسلط کر دی جو مرورِ زمانہ کے ساتھ مغربی تہذیب کا مزاج اور اس کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہے آج بھی یہ کھلا ہوا تضاد بہت سے مغربی ملکوں کی مغربی سوسائٹیوں پر حاوی ہے، آج بھی ایک یوروپین اپنے مذہب میں وہ رُخ اختیار کرتا ہے جس کا عقل و تدبر سے کچھ تعلق نہیں ہوتا، اور اپنی تہذیب و معاشرت میں وہ طرز اختیار کرتا ہے جس کا مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، یہ تضاد اس کی ہر ترقی ہر پیشقدمی اور ہر طرزِ ادا کے ساتھ لازم و ملزوم ہے.

اس سے بڑھ کر تضاد اور المیہ جس کو تاریخ بھول نہیں سکتی یہ ہے کہ اس کے برعکس یورپ اس توحید خالص اور واضح عقیدہ کے دین الاسلام سے محروم رہا جو اپنی وضاحت اور عملیت، سعی و عمل اور خود اعتمادی میں ممتاز ہے جس کے نزدیک ایک فرد کے عمل کی بڑی قیمت ہے جو دنیا و آخرت دونوں جگہ اعمال کے نتائج و اثرات پر ایمان رکھتا ہے، اور اس دُنیا کو آخرت تک پہنچنے کا ایک پُل سمجھتا ہے جو انسان میں مردانگی، اولوالعزمی، عالی ہمتی اور بلند نظری کے اوصاف پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ اس پیغام کے دوامی سے بالکل الگ رہا جس کے متعلق قرآن کے معجزانہ اور بلیغ الفاظ یہ ہیں

الرَّسول النّبیّ الامیّ الذی یجدونہ مکتوباً عندھم فی التوراۃ والانجیل یامرھم بالمعروف وینھاھم عن المنکر ویحلّ لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم۔

(پارہ۔ ۹)

(ترجمہ) جو رسول کی پیروی کریں گے جو نبی اُمی ہوگا اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی پائیں گے۔ وہ انھیں نیکی کا حکم دے گا۔ برائی سے روکے گا، پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا، گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا، اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے دبے ہونگے۔ ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے۔

اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے یورپ کو متوحش، بدظن اور دور کرنے میں صلیبی جنگوں، اہل کلیسا، مسیحیت کے مبلغین اور یورپ کے ان مصنفین کا بہت بڑا ہاتھ ہے جو علمی رجحان یا مذہبی رجحان کے حامل نہ تھے، انھوں نے اس دین اور اس کے عظیم پیغمبر کی بہت خوفناک اور کریہہ تصویر پیش کی اور یورپ میں پیغمبر اسلام کے متعلق طرح طرح کی من گڑھت کہانیاں اور بے سروپا داستانیں مشہور ہو گئیں، ان کے گرد مختلف کہانیوں، مثالوں اور کہاوتوں کا ایک سیاہ ہالہ قائم ہو گیا جس نے یورپ کو ان کی محبت، اور ان کی عظمت کے اعتراف سے باز رکھا آج بھی اس کے نمونے ان کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں جو قرون وسطیٰ اور اس کے بہت بعد تک لکھی جاتی رہیں اور آج بھی بہت سے پُرجوش مغربی مصنفین اسی بات کو دہراتے اور نئے نئے زاویوں سے پیش کرتے رہتے ہیں۔

اس کے علاوہ اس کا ایک بہت بڑا سبب اور تھا اور وہ یہ کہ یورپ اس دین کو ترکوں کے واسطے دیکھنے کا عادی رہا۔ جب وہ اس پر غور کرتا یا اس کا تصور کرتا تو اس کے سامنے عثمانی ترک کھڑے ہو جاتے جو یورپ کے بر اعظم میں اسلام کے تنہا سرکاری نمائندہ سمجھے جاتے تھے، وہ آزادانہ نگاہ سے اسلام کو نہیں دیکھتا تھا بلکہ عثمانیوں کے مذہب کی حیثیت سے اس پر غور کرتا تھا جو اس پر اکثر حملہ کرتے رہتے تھے اور اس کے بہت سے حصوں پر قبضہ بھی کر لیتے تھے جو کبھی کبھی غلطیاں بھی کرتے تھے اور کبھی کبھی ان سے تشدد سختی کا مظاہرہ بھی ہوتا تھا، یہ ساری باتیں اسلام کے صحیح اور پاکیزہ فہم سے مانع رہیں جو آزادانہ

غور و فکر اور براہِ راست مطالعہ پر مبنی ہوتا۔

اسلام سے یورپ کے بُعد کا انسانی سوسائٹی کی تاریخ اور تہذیب و ترقی کی رفتار پر بہت گہرا اور دور رس اثر پڑا، اگر یورپ یا اس کی کسی بڑی قوم نے اسلام کو اختیار کیا ہوتا اور اس دعوت کی علمبردار ہوتی تو نہ صرف یورپ بلکہ پوری دُنیا کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا، زندگی اس طرح بے معنی اور بے مقصد نہ ہوتی دین و اخلاق اس طرح بے دست و پا اور بے اثر نہ ہوتے، انسانی تہذیب کا رُخ تباہی و بربادی کی طرف نہ ہوتا اور مشرق بھی محض استحصال اور جبر و استعمار کی آماجگاہ نہ ہوتا جیسا آج ہے۔

دُنیا میں ایک ایسا عظیم خلا ہے جو صدیوں سے پُر نہیں کیا جا سکا اور وہ ایک ایسی قوم کا فقدان ہے جو اپنے ایمان و عقیدہ اور اپنے اخلاق و معاملات ہر چیز کے لحاظ سے طاقتور ہو جو صحیح دینی دعوت اور اس آخری آسمانی پیغام کی حامل ہو جو زندگی کے مسائل کا سامنا کرتا ہے اس سے گھبراتا نہیں، قافلۂ انسانی کی رہنمائی کرتا ہے اس سے بچھڑتا نہیں، ایسی قوم جو عصری ثقافت میں ممتاز، عبقریت اور تخلیقی صلاحیت کی حامل، زندگی و نشاط سے لبریز، اور مجسم جہد و عمل ہو، یہ وہ مطلوب قوم ہو جو دُنیا کا رُخ شر سے خیر کی طرف تخریب سے تعمیر کی طرف اور فساد سے اصلاح کی طرف پھیر سکتی ہے۔

ترکوں میں جن کی قیادت آلِ عثمان کر رہے تھے (پندرھویں صدی عیسوی میں) اسکی صلاحیت تھی کہ عالمی قیادت کے اس خلا کو پُر کر سکیں جو طویل عرصہ سے چلا آ رہا تھا، انھوں نے مشرق میں قیادت کے اس خلا کو ضرور پُر کیا، عالم اسلام کی قیادت کی اور اسکو ایک نئی زندگی اور نئی قوت عطا کی لیکن بہت سے اسباب کی بنا پر مثلاً جدید علوم، جدید تنظیم اور ترقیات و ایجادات کے شعبے میں ان کی پسماندگی، مغربی قوموں کی ان پر یورش اور جنگوں کے لامتناہی سلسلوں کی وجہ سے وہ مغرب کی قیادت نہ کر سکے اور اس نشأۃ ثانیہ کی سربراہی نہ کر سکے جو یورپ میں پروان چڑھ رہی تھی اور ایک نیا عہد وجود میں آ رہا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قافلہ سے بچھڑ گئے۔ یہ خلا ان کے بعد آج بھی باقی ہے اور وہ کسی ایسی مغربی یا مشرقی قوم کا منتظر ہے جو ایمان اور علم کی قوت، روح اور مادہ کی قوت، آسمانی پیغام کی ابدیت اور اس کی ازلی حقیقت، علم کی جدت اور عقل کی ترقی پذیری، جدید وسائل کے انبار اور صالح مقاصد کی دولت کو باہم جمع کر سکے وہ مقاصد جو آسمانی مذاہب عطا کرتے ہیں اور آخری آسمانی مذہب اسلام اس کا سب سے مکمل اور جامع

فائدہ ہو سو یہی قوم اس دنیا کی اصلی قائد اور رہنما ہو جو اس خلا کو پُر کر سکتی ہے' تاریخ کے دھارے کو موڑ سکتی ہو اور زمانہ کو ایک نیا راستہ اور نئی سمت اختیار کرنے پر مجبور کر سکتی ہے اور اس جی چھوڑتی کارو خودکشی دنیا کو زندگی کی ایک نئی قسط عطا کر سکتی ہے اور اس کو موت کے اُس غار سے بچا سکتی ہے، جس کی طرف وہ ایٹمی سرعت اور راکٹ کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔

اس کے لیے ایک جرأت مندانہ قیادت کی ضرورت ہو ایک ایسے انقلاب کی ضرورت ہو جو ان تمام انقلابات سے بڑھ جائے جو تیری سرزمین پر بڑے انقلابیوں اور آزادی و ترقی کے علمبرداروں نے ماضی یا حال میں کیے تھے اس کے لیے پوری قوم کے انقلاب اور تغیر حال کی ضرورت ہو۔ ایک ایسی جست "یا چھلانگ" کی ضرورت ہو جس میں خاصا خطرہ ہو، قربانی ہو' جست ایک زندگی سے دوسری زندگی کی طرف، ایک نظام سے دوسرے نظام کی طرف، ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف' یہ جست تجھ کو وہ قیادت و زعامت، وہ عزت و احترام وہ اثر و رسوخ وہ ہیبت و رعب اور وہ سکون و اطمینان اور روحانی آسودگی و خوشحالی عطا کر سکتی ہے جس کا خواب بھی تیرے ان خطرپسند دل جوانمردوں اور جنگجو رہنماؤں نے نہ دیکھا ہوگا جنھوں نے تجھ کو دو ہولناک جنگوں میں ڈھکیل دیا تھا۔

اس جست سے تو مادّی قوت، سیاسی اقتدار اور انسانیت کی صحیح رہنمائی اور صحیح نمونہ دونوں چیزوں کی جامع اور اللہ تعالیٰ کی ان ارشادات کی مصداق ہو سکتی ہے۔

وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ۔ پارہ ۲۰

وجعلناهم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا وكانوا بآياتنا يوقنون۔

(۱) اور ہم چاہتے ہیں کہ اپنا خاص فضل کریں ان بندوں پر جو ہماری زمین میں کمزور کر دیے گئے ہیں اور ہم ان کو سربراہ بنائیں اور انھیں کو زمین کا وارث بنائیں۔

(۲) اور ہم نے بنا دیا ان کو پیشرو کہ وہ رہنمائی کریں ہمارے حکم سے جبکہ انھوں نے صبر و ثبات کا ثبوت دیا اور وہ ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے۔

مذہب — جو پچاس سالہ اشتراکی قید کے باوجود زندہ ہے

از ——— جناب وحید الدین خاں صاحب

[مغربی جرمنی میں ایک تنظیم قائم ہے جس کا نام ہے، سوویت روس کے مطالعہ کا ادارہ (INSTITUTE FOR THE STUDY OF THE U.S.S.R) اس ادارہ کے ارکان وہ علماء و محققین ہیں جو پہلے اشتراکی مملکت کے شہری تھے اور اب وہاں سے ہجرت کر کے مغربی ملکوں میں آ بسے ہیں۔ اس ادارہ کے تحت کتابوں کے علاوہ مختلف زبانوں میں متعدد رسائل شائع ہوتے ہیں جن میں خالص علمی انداز میں اور براہ راست روسی حوالوں کی مدد سے اشتراکی روس کے معاملات و مسائل کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ انھیں میں سے ایک رسالہ بلیٹن (BULLETIN) بھی ہے۔ اس رسالہ کی جون ۱۹۶۴ کی اشاعت میں ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ جس کا عنوان ہے (RELIGION: A THORN IN THE PARTY'S SIDE) یعنی مذہب کمیونسٹ پارٹی کے لیے سوہان روح۔ ذیل میں اس مضمون کا خلاصہ درج کیا جا رہا ہے۔]

نومبر ۱۹۶۳ء کی ۲۵، ۲۶ تاریخ کو ماسکو میں روسی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا ایک اجتماع ہوا جس میں عہدہ دار، مختلف پبلک اداروں کے ذمہ دار، پارٹی کے نظریاتی ماہرین اور سائنس، کلچر، تعلیم، پریس، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نمائندے شریک ہوئے، اس اجتماع کا مقصد سوویت عوام کی "لا مذہبی تعلیم و تربیت" اور مذہب کے خلاف عملی تدابیر کے مسائل پر غور کرنا تھا۔ اس طرح یہ اجتماع ظاہر کرتا ہے کہ روس میں تقریباً آدھی صدی تک ایک مکمل طور پر با اختیار حکومت کی مسلسل اور ہمہ جہتی مخالفانہ جد و جہد کے باوجود مذہب ابھی ختم نہیں ہوا ہے حتیٰ کہ

نوجوان نسل جو عین لادینی اشتراکی سماج کے اندر پیدا ہوئی ہے وہ بھی مذہب کے اثر سے محفوظ نہیں ہے۔ جیسا کہ تعلیم و تربیت کے مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کرنے سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس اجتماع کی خاص چیز نظریاتی کمیشن کے چیرمین ایل۔ الیچوت (L. ILICHEV) کی طویل رپورٹ تھی جس کا عنوان تھا ـــــ "سائنسی نظریۂ کائنات کی تعمیر اور لامذہبی تعلیم و تربیت" یہ رپورٹ روسی کمیونسٹ پارٹی کے نظریاتی ترجمان (KOMMUNIST) میں سنہ ۱۹۶۴ء کی پہلی اشاعت میں شائع ہوئی ہے، نیز دوسرے روسی جرائد میں نقل کی گئی ہے۔ اس رپورٹ میں الیچوف نے لامذہبی تعلیم و تربیت کو "نظریاتی محاذ پر روس کا ایک انتہائی اہم مسئلہ" قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس وقت مذہبی عقائد کے خلاف لڑائی کے سوال نے ہمیشہ سے زیادہ اہمیت اختیار کر لی ہے۔ الیچوف کے نزدیک مذہب سائنسی اور سماجی ترقی کے لیے بریک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے وہ کسی بھی شکل میں سوویت سماج کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

رپورٹ کے مطابق روسی چرچ نے اپنے آپ کو نئے طرز پر ڈھال کر اشتراکی ڈھانچے کے اندر باقی رہنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے اور وہ دن بدن مضبوط ہو رہا ہے۔ کسی موقوفہ جائداد یا ریاستی امداد کے بغیر محض اپنے متبعین کی رضاکارانہ امداد کی بدولت روسی چرچ آج ایک خوش حال تنظیم کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اس قابل ہے کہ پادریوں کی ایک بڑی تعداد کی کفالت کر سکے، گرجاؤں کو اچھی حالت میں رکھ سکے اور وسیع پیمانے پر ضرورت مند اشخاص کی امداد کر سکے۔ حالانکہ روسی چرچ کے لیے چندہ وصول کرنا یا کسی خیراتی سرگرمی میں حصہ لینا قانونی طور پر ممنوع ہے۔ نیز اشاعتی پابندیوں کے باوجود وہ خطوط اور پیغامات کی نقلوں کے ذریعہ اپنی تبلیغ کا کام بھی جاری رکھتا ہے۔ قانونی بندش، گرفتاری، مقدمہ اور ہر قسم کے مظالم کے باوجود مسیحی مذہب نے روس میں اپنی موت قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

اسی طرح سوویت روس خاص طور پر وسطی ایشیا کی جمہوریتوں اور شمالی کاکیشیا میں اسلام از سر نو ابھر رہا ہے۔ چنانچہ روسی جریدہ (NAUKA-I-ZHIZN) نے "ملاؤں کی مسلسل سرگرمیوں پر سخت تنقید کی ہے جو مقدس مقامات کو اپنا مرکز بنائے ہوئے ہیں۔ الیچوف کی مندرجہ بالا رپورٹ کہتی ہے۔"

"تاجکستان اور دوسرے مقامات پر لامذہبیت سے متعلق سائنٹیفک کام کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ حالیہ تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۴۰ سوویت قانون کے سنگین انحراف کر رہے ہیں ـــــ ۲۹ رجسٹرڈ اماموں کے علاوہ بہت سے مذہبی اشخاص غیر قانونی طور پر ریاست کے اندر مصروف کار ہیں۔ بہت سی مسجدیں جو بند سمجھی گئی تھیں فی الواقع ان کے اندر مذہبی سرگرمیاں جاری ہیں، بند مزار اور دوسرے مذہبی مقامات کی زیارت کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ بعض عمارتیں "میوزیم" کے پردے میں مذہبی مرکز بنی ہوئی ہیں۔ تاجکستان میں ایسی بھی مسجدیں ہیں جو بظاہر چائے خانہ اور کلب ہیں مگر ان سے مسجد کا کام لیا جاتا ہے۔ مذہبی اعمال اور مخصوص مسلمانہ رسوم مسجدوں کے باہر گھروں اور حجروں میں بھی ادا کیے جاتے ہیں۔"

رپورٹ میں مزید صراحت ہے کہ تاجکستان میں بہت سی عمارتیں جو مذہبی مقاصد کیلئے استعمال ہوتی ہیں وہ ابھی حال میں باقاعدہ اجازت کے بغیر تعمیر کی گئی ہیں۔ الیوٹ کے خیال میں اس طرح کی تعمیر کول خوز (KOLKHOZES) کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ جنہوں نے باربرداری، سامان، عمارت اور انسانی مجمع کے ذریعہ ان کے ساتھ تعاون کیا۔ دوسرے لفظوں میں مقامی فرمانرواؤں کی تائید بھی ان ملاؤں کو حاصل ہے۔ رپورٹ میں اس امر پر اظہار حیرت کیا گیا ہے کہ متعدد موقعوں میں اسلامی رسوم مقامی ذمہ داروں کے سامنے ان کی موجودگی میں ادا کی گئیں۔

"پچھلے ایک سال سے روسی پریس کھل کر اس کا اظہار کر رہا ہے کہ نئی نسل تیزی سے مذہب کی طرف مائل ہے۔ ایسے واقعات شائع کیے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک روسی نوجوان نے مذہبی تبلیغ سے متاثر ہو کر اپنا کام چھوڑ دیا اور مذہبی طبقہ کے ساتھ شریک ہو گیا۔ بعض نوجوان محض اس مقصد کے تحت پالی ٹکنک اسکول میں داخل ہوئے کہ وہ چرچ تعمیر کرنے کے لیے فنی واقفیت حاصل کر سکیں۔ متعدد واقعات میں لامذہبیت کے علم بردار افراد کو مذہبی اشخاص سے مباحثہ میں شکست کھانی پڑی۔ مرکزی سیاسی ادارہ کے صدر جنرل الکسی اپیشیو (ALEKSEI EPISHEV) نے فوج کے نوجوانوں کی تربیت پر خصوصی زور دیا ہے۔ کیونکہ وہ "مذہب کی افیون سے متاثر ہو رہے ہیں۔"

مذہب روس کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی سرایت کر رہا ہے چنانچہ اکیوٹ کی رپورٹ کے مطابق ایسے بہت سے تعلیم یافتہ لوگ ہیں جو اپنی ڈیوٹی کے وقت تو لامذہبی بنے رہتے ہیں لیکن گھر پہونچ کر مذہبی رسوم ادا کرتے ہیں، چرچ جاتے ہیں اور اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم دیتے ہیں حتیٰ کہ لتھوانیا کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سکریٹری نے شکایت کی ہے کہ متعدد نمایاں درجہ کے سائنس داں مذہب کے خلاف مہم میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کرتے اور اس معاملے میں خاموش رہتے ہیں ان کا یہ رویہ مذہبی افراد کی سرگرمیوں کو تقویت دیتا ہے کیونکہ وہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ سائنس داں مذہب کے خلاف نہیں ہیں۔ خود کمیونسٹ پارٹی کے بہت سے باقاعدہ ارکان مذہب کے بارے میں مصالحانہ رویے کا مظاہرہ کرتے ہیں بلکہ اس کی بھی مثالیں ہیں کہ ایک کمیونسٹ باپ کی رضامندی سے اس کے بچہ کے عیسائی بنانے کی رسم ادا کی گئی اور وہ خود بھی اس رسم میں شریک رہا۔ بہت سے کارکن ایسے پائے گئے ہیں جو مذہبی تہواروں کے دن کام پر نہیں جاتے اور مذہبی تقریبات میں شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ پچھلی گرمیوں کے موسم میں اس قسم کی سختیاں کی وجہ سے تیس ہزار کام کے دنوں کا نقصان ہوا۔

ایک روسی اخبار نے روس میں لامذہبی پروپگنڈے کے تاریک امکانات کا ان الفاظ میں اقرار کیا ہے۔

"مذہبی تصورات، تعصبات اور توہمات جو کہ مختلف سماجی طبقوں کو متاثر کرتے ہیں، وہ بہت سخت جان ثابت ہوئے ہیں۔ مذہب کے خلاف ہماری لڑائی مخصوص سماجی اور نفسیاتی معلومات سے ناواقفیت کی وجہ سے غیر مؤثر ثابت ہو رہی ہے۔ اس رکاوٹ کو اس طرح دور کیا جا سکتا ہے کہ مذہب کے خلاف سائنٹفک کام کو تیز تر کر دیا جائے۔ مذہب کے خلاف کام کرنے والے کارکن اکثر اس بات کو ملحوظ نہیں رکھتے کہ مذہب کا جذباتی پہلو اور رسوم کی پرستش مذہبی لوگوں پر بہت زیادہ اثر ڈالتے ہیں۔ اس نفسیاتی اثر کی طاقت مذہبی افراد کو عقلی استدلال سے بے نیاز کر دیتی ہے اور مذہب کے خلاف سائنسی کام کا سابقہ گویا ایک ایسی دیوار سے ہونے لگتا ہے جو اندھی اور بہری ہے اور کچھ سمجھ نہیں سکتی۔"

روسی حکام کے نزدیک مذہب کے اس احیاء میں جن چیزوں کا دخل ہے اس میں وہ بیرونی عناصر بھی شامل ہیں جو مختلف طریقوں سے روسی باشندوں پر اثر انداز ہوتے ہیں مثلاً میڈیا کی نشریات، سیاحوں کی آمد، مذہبی تنظیموں کے بین الاقوامی تعلقات، نیز غیر قانونی ذرائع۔

روس میں چرچ اور مذہب کی پوزیشن کریملن کی اس پالیسی سے بھی مضبوط ہوئی ہے کہ وہ ویٹیکن اور مشرق اوسط (عیسائی اور اسلامی دنیا) سے دوستانہ تعلقات قائم کرے۔ جیسا کہ سابق پوپ جان اور پال کے نام خروشچوف کے تار اور خروشچوف کی لڑکی اور داماد کی پوپ سے ملاقات اور روسی پریس میں پوپ جان کی پالیسیوں پر تعریفی تبصروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح عرب دنیا سے خروشچوف نے نمایاں طور پر دوستانہ تعلقات بڑھائے ہیں جس کے نتیجے میں دونوں کے درمیان مسلسل وفود کے تبادلے ہوتے رہے ہیں اور باہر کی مسلم تنظیموں کے نمائندے وسط ایشیا کی روسی جمہوریتوں میں جاتے رہتے ہیں۔

روس کے انھیں حالات کا نتیجہ ہے کہ یہ ممکن ہو سکا کہ چرچ کی عالمی کونسل کی ایگزیکیٹو کمیٹی کا اجلاس فروری ۱۹۶۴ء میں اوڈیسا[1] میں ہوا۔ جس میں دیگر کارروائیوں کے ساتھ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے کمیشن کے سامنے مذہبی آزادی کے دفاع اور مذہبی رواداری کے بارے میں تجویز رکھی جائے۔ یہ فیصلہ اس واقعہ کے پیش نظر نہایت اہم معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے ملک میں کیا گیا جہاں مذہب کو ہمیشہ دبایا جاتا رہا ہے۔ مزید یہ کہ اس کے بعد ہی ایک پریس کانفرنس میں جرمن بشپ لل جی (LILJE) نے کہا کہ روس کی خلاف مذہب پالیسی میں ایک طرح کا تذبذب پایا جاتا ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ اشتراکی لیڈر اگر فی الواقع اپنی خلاف مذہب سرگرمیوں کو نظریاتی اور علمی بحثوں تک محدود رکھنا چاہتے ہیں تو وہ ذاتی طور پر روس میں چرچ کے مستقبل کے بارے میں کوئی اندیشہ نہیں رکھتے۔

---

[1] اوڈیسا۔ بحر اسود کے کنارے ایک روسی شہر۔

پاکستان کی صدارتی جنگ اور اسلام

(از مولانا امین احسن اصلاحی)

ہر واقف حال اس بات کو جانتا ہے کہ اس وقت صدر ایوب اور مس فاطمہ جناح میں جو جنگ ہو رہی ہے وہ نہ اسلام کے لیے ہو رہی ہے نہ جمہوریت کے لیے۔ ان دونوں ہی کے نزدیک نہ اسلام زیر بحث ہے نہ جمہوریت مابہ النزاع۔ مابہ النزاع جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ یہاں امریکی طرز کی جمہوریت چلے یا انگریزی طرز کی؟ ہر عاقل سمجھ سکتا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی کے قیام سے بھی اسلام کی راہ کھلنے والی نہیں ہے کہ اس کی حمایت کوئی ایسا دینی مسئلہ بن جائے کہ اس کے لیے اضطرار کی آڑ لے کر شریعت کے ایک حرام کو جائز کیا جائے۔ جمہوریت اسلام کے لیے تو جب سازگار ہو سکتی ہے جب جمہور کے مزاج میں اسلامیت پیدا کی جائے۔ اگر جمہور کے مزاج میں اسلامیت نہ ہو تو وہ خواہ انگریزی طرز کی ہو یا امریکی طرز کی، وہ بڑی آسانی کے ساتھ شہور مسخرے چارلی چپلن کو سیدنا مسیح علیہ السلام پر ترجیح دے دیتی ہے۔ آخر متحدہ محاذ کی جمہوریت کا پہلا تجربہ تو ہو ہی چکا کہ باوجودیکہ اس کی شریک پانچ پارٹیوں میں سے تین اسلام کی مدعی تھیں لیکن انھوں نے اسلام کے احکام کے خلاف اپنا سربراہ ایک عورت کو بنایا۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنے کی جرأت انھیں اسی وجہ سے ہوئی کہ انھیں اندازہ ہے کہ عوام کے ذہن پر اسلام کے حرام و حلال کا اتنا اثر نہیں ہو سکتا جتنا اس بات کا ہو سکتا ہے کہ صدر ایوب کا مقابلہ کرنے کے لیے قائد اعظم کی بہن اٹھی ہیں۔ اب فرض کیجیے کہ مس فاطمہ جناح کامیاب ہو جاتی ہیں تو ان کے وعدے کے مطابق صدارتی نظام کے بجائے یہاں پارلیمانی نظام آ جائے گا لیکن اسلامی نظام کدھر سے آ جائے گا۔

بہرحال اس وقت ہمارے صدرین میں جو جنگ ہے اس میں اصل مسئلہ پارلیمانی نظام اور صدارتی نظام کا ہے۔ اس میں سے کسی کے حق میں بھی وحی نہیں اتری ہے کہ اس کے قیام سے اسلام کے قیام کو وابستہ کر دیا جائے۔ ان پر اگر بحث ہو سکتی ہے تو ان کی صلاحیت کار کے پہلو سے ہو سکتی ہے اور ہمارے نزدیک ان کا حسن و قبح دونوں اضافی نوعیت کا ہے۔ جس ملک میں وحدتِ فکر ہو، تعلیم عام ہو، عوام کے جذبات و رجحانات ہموار ہوں، سیاسی جماعتوں اور لیڈروں میں جمہوریت کے حقوق کے ساتھ ساتھ اس کی ذمہ داریوں کا بھی احساس ہو، وہاں پارلیمانی نظام کامیاب ہو جاتا ہے لیکن جہاں یہ چیزیں موجود نہ ہوں وہاں اس سے انتشار اور ابتری پھیل جانے کا اندیشہ رہتا ہے، اور جمہوریت انارکی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ صدارتی نظام میں یہ خوبی ہے کہ یہ جمہوریت کے ساتھ ساتھ ملک کے استحکام کا بھی ضامن ہے اور ملک کا استحکام ایک ایسی چیز ہے جس کے لیے پارلیمانی نظام تو درکنار دین کے سوا دنیا کی ہر چیز قربان کی جا سکتی ہے۔ ہم پارلیمانی نظام کی بے آبروئیوں کا نہایت تلخ تجربہ کر چکے ہیں۔ اور آئندہ اگر اس کا مزید تجربہ کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کا نتیجہ ملک کی تباہی کے سوا کچھ اور نہیں نکل سکتا۔ یہاں عوام کے سیاسی شعور کا عالم یہ ہے کہ بہتوں کے لیے یہ فرق کرنا بھی مشکل ہو رہا ہے کہ اس وقت یہاں ملت کے لیے ماں کا انتخاب ہو رہا ہے یا ریاست کے لیے صدر کا۔ انگریزی دور کا یہ ذہن ابھی ہمارا بدلا نہیں ہے کہ جو اقتدار پر ہو اس کو شیطان سمجھو اور جو اقتدار سے محروم ہو اور لوگوں سے بے سروپا وعدے کر سکے اس کو فرشتہ قرار دو۔ ملک میں مرکز گریز طاقتیں ہی نہیں بلکہ ملک دشمن عناصر بھی ہر حصے میں مصروفِ سازش ہیں جو پختونستان قائم کرنے اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ سیاسی کردار کی بے اعتباری کا یہ عالم ہے کہ چودھری محمد علی صاحب جیسے لوگ حصولِ اقتدار کی طمع میں عواقب و نتائج سے آنکھیں بند کر کے "مادرِ ملت" کے نام سے ان تمام عناصر کو صلائے عام دے دیتے ہیں جن کے درمیان ایوب دشمنی کے سوا اور کوئی بھی قدرِ مشترک نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کو بھی چودھری صاحب "مادرِ ملت" کے جھنڈے کے نیچے جمع کر رہے ہیں جن کی آزردگی کے باعث ون یونٹ قائم کر کے چودھری صاحب خود ہٹے ہیں۔ مذہبی بے ضمیری کا یہ عالم ہے کہ جو لوگ کل تک گلی گلی میں لوگوں کو پیغمبر کا یہ قول سناتے پھر رہے تھے کہ عورت کی حکومت میں جینے سے زیرِ زمین دفن ہو جانا بہتر ہے وہ "مادرِ ملت" کا جھنڈا اٹھائے

اور ان کا نعرہ لگاتے پھر رہے ہیں اور بے شرمی کا یہ عالم ہے کہ اس کو اقامتِ دین کا جہاد قرار دے رہے ہیں جس ملک میں ایسے انتشار پسند اور ناقابلِ اعتماد عناصر کارفرما ہوں وہاں جمہوریت کی کوئی شکل کامیاب ہو سکتی ہے جو ایک مضبوط مرکز کے نظم و ضبط میں ہو۔

لیکن اس وقت ہمیں مسئلے کے سیاسی پہلو سے بحث نہیں ہے! اس پر ضرورت ہوگی تو ہم آئندہ بحث کریں گے۔ اس وقت ہم صرف اس کے اسلامی پہلو سے بحث کرنا چاہتے ہیں کہ محترمہ مس فاطمہ جناح کی صدارت اور متحدہ محاذ کی حمایت میں اسلام کی بہبود کا پہلو کیا ہے؟ یہ حضرات بڑی قوت کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ بعض علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر اسلام کی مصلحت ہو تو عورت کو حکمران بنایا جاسکتا ہے؟ چلیے ہم نے مانا کہ بنایا جاسکتا ہے لیکن وہ اسلامی مصلحت کیا ہے جس کے لیے مس فاطمہ جناح کا انتخاب کیا گیا ہے؟ ہم ان کے ذاتی تقویٰ و تدین اور ظواہرِ شریعت کے احترام سے کوئی بحث نہیں کرتے اس لیے کہ ان چیزوں کو اندھے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ہم صرف یہ پوچھتے ہیں کہ ہے کوئی ثقہ شہادت اس بات کی موجود کہ انھوں نے اپنی ساری زندگی کی کسی تقریر یا بیان میں کبھی اسلام کا بھی نام لیا ہو یا کبھی کوئی چھوٹا یا بڑا کام دینی نوعیت کا بھی کیا ہو؟ اس معاملے میں ان کی وضعداری کا تو یہ عالم ہے کہ الیکشن کے زمانے میں بھی جس میں رندانِ قدح خوار بھی زاہدانِ شب زندہ دار بن جاتے ہیں کبھی یہ غلطی نہیں کرتیں کہ بھول کر ہی اسلام کا نام لے جائیں اور اس کی شکایت ہم سے زیادہ خود ان ہی حضرات کو پہلے تھی اور دبی زبان سے اب بھی ہے لیکن اب مادرِ ملت کی وفاداری کا جوش اس زور سے ابھرا ہے کہ اس ملک میں اسلام کا قیام تنہا اب ان ہی کے دم سے وابستہ ہو کر رہ گیا ہے۔

اسلامی مصلحت کے زاویہ سے ذرا ایک نظر متحدہ محاذ کے عجائب گھر پر بھی ڈال لیجیے! اس میں مولانا بھاشانی ہیں جو شروع سے ہی بے داغ سوشلزم یا کمیونزم کے علمبردار ہیں۔ ان کی شخصیت محاذ میں اس پہلو سے سب سے زیادہ موثر ہے کہ محاذ کی جتنی کچھ بھی کامیابی کی توقع ہے وہ دراصل مشرقی پاکستان ہی سے ہے۔ اس میں محمود علی قصوری صاحب ہیں جو ابتدا سے لادینی نظام کے بڑے زبردست داعی ہیں اور اشتراکیت پسندانہ رجحانات رکھنے کی وجہ سے ہر انتشار اور ہر انتشار پسند

کے لیے ان کی آغوش کشادہ رہتی ہے۔ اس میں چودھری محمد علی صاحب ایسے ہیں جو یوں تو اسلامی نظام کے علمبردار ہیں لیکن سنتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے لیے وہ اضطرار ان ہی نے پیدا کیا جس کے تحت انھیں مس فاطمہ جناح کی صدارت کی حمایت میں اللہ رسول کو چھوڑنا پڑا۔ اس کے ایک رکن اعظم جنرل اعظم خاں بھی ہیں جو کل تک ختم نبوت کا نعرہ لگانے والوں کو پھانسیاں دیتے تھے جن میں جماعت اسلامی کے امیر بھی شامل تھے لیکن اب اقامت دین کا مستقبل ان کی ذات سے بھی وابستہ ہو گیا ہے۔ جماعت اسلامی کے لوگوں نے ایک زمانے میں جتنی گالیاں ان کو دی ہیں شاید ہی اس ملک میں کسی اور کو دی ہوں لیکن اب جماعت کے شیوا بیان نامہ نگاروں کے قلم سے ان کا ذکر جمیل پڑھیے تو ایسا محسوس ہوگا کہ اسلاف میں سے کسی مجاہد اعظم کا ایمان افروز تذکرہ ہے۔ خواجہ صاحب مرحوم کا ذکر ہم اس لیے نہیں کرتے کہ اب وہ اپنے رب کے پاس پہنچ چکے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان سب میں دیندار اور شریف وہی تھے۔ یہ متحدہ محاذ ہے جس کو اب جماعت اسلامی اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کا ذریعہ سمجھتی ہے۔ اس محاذ نے پہلا اسلامی کارنامہ جو انجام دیا ہے وہ صدارت کے لیے مس فاطمہ جناح کی نامزدگی ہے۔

(میثاق ماہ رجب ۱۳۸۴ھ سے انتخاب)

مُطَالَعَہ

آسٹرین نومسلم مغربی تہذیب کے مقابلے میں

(از جناب وحید الدین خاں صاحب)

اسلام چوراہے پر (ISLAM AT THE CROSS ROADS) مشہور آسٹرین نومسلم لیوپولڈ اسد کی مشہور کتاب ہے۔ یہ کتاب پہلی بار اپریل ۱۹۳۴ میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اور اس قدر مقبول ہوئی کہ چھ مہینے کے اندر اس کے تین اڈیشن شائع کرنے پڑے، اور جب سے اب تک اس کے متعدد اڈیشن نکل چکے ہیں۔ ہمارے سامنے اس وقت کتاب کا ساتواں اڈیشن (۱۹۵۵) ہے۔

اسد صاحب نے ۱۹۲۶ء میں اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد انھوں نے خاص طور پر عربی سیکھی تاکہ اسلام اور اس کی تاریخ کو براہ راست اس کے مستند ماخذ سے سمجھ سکیں۔ نیز پانچ سال انھوں نے حجاز اور نجد میں اس مقصد سے گزارے کہ اس اصل ماحول کو سمجھیں جہاں نبی عربی نے اسلام کی تبلیغ کی تھی (صفحات ۲-۵) اس مطالعہ کے بعد ایک طرف اسلام کے اصولوں نے انھیں شدت کے ساتھ متاثر کیا۔ خاص طور پر اسلام کا یہ پہلو انھیں بہت پسند آیا کہ وہ اخلاقی تعلیمات اور عملی زندگی کے پروگرام کا غیر معمولی طور پر مرتب ڈھانچہ پیش کرتا ہے۔ (صفحہ ۵) دوسری طرف انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی موجودہ زندگی اسلام کی واقعی تعلیمات سے بہت دور ہو (۲) حتیٰ کہ اسلام سے دوری نے انھیں فرقہ پرستی کی انتہا تک پہونچا دیا ہو (۱۵) مگر اس تضاد نے انھیں اسلام سے برگشتہ نہیں کیا جیسا کہ بعض نومسلموں کے سلسلے میں پیش آیا ہو بلکہ انھوں نے وہی رویہ اختیار کیا جو ایسے موقع پر ایک عقلمند آدمی کو اختیار کرنا چاہیے۔ انھوں نے مسلمانوں کی زبوں حالی کو اسلام کی طرف منسوب کرنے کے بجائے خود مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیا اور اپنی تمام توجہ اسلام کے احیاء (REGENERATION

کے لیے وقف کردی۔ (۱۶)

دیباچہ کو چھوڑ کر یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ مصنف نے آج کل کے مقبول نظریے کے مطابق اس کو یہ رنگ نہیں دیا ہے کہ غیر جانبدارانہ گفتگو سے آغاز کر کے قاری کو ایک جانبدارانہ نتیجے تک پہونچانے کی کوشش کریں۔ دیباچہ کے آخر میں اپنی کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

IT DOES NOT PRETEND TO BE A DISPASSIONATE SURVEY OF AFFAIRS; IT IS THE STATEMENT OF A CASE: THE CASE OF ISLAM VERSUS WESTERN CIVILISATION.

ISLAM AT THE CROSS ROADS, P. 6

یعنی اس کتاب میں مصنوعی طور پر غیر جانبدارانہ سروے کا طریقہ اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ اس کا انداز ایک مقدمہ جیسا ہے۔ اسلام کا مقدمہ مغربی تہذیب کے نام۔

اس طرح کے غیر جانبدارانہ سروے کا طریقہ موجودہ زمانے میں سب سے بہتر علمی طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ وہ مصنوعی ہے۔ اس نفسیاتی بحث سے قطع نظر کہ غیر جانبدارانہ سروے کسی انسان کے لیے کس حد تک قابل عمل ہے، خود متعلقہ تصنیف لکھنے والے کے لیے کوئی ایسا میدان نہیں ہوتی جس میں وہ پہلی بار تلاش و جستجو کے لیے نکلا ہو بلکہ وقت تصنیف وہ خود ایک نتیجہ پر پہونچ چکا ہوتا ہے اور اسی کو ناظرین کے سامنے رکھنا چاہتا ہے۔ گویا کسی کتاب کا غیر جانبدارانہ سروے محض ایک انداز ترتیب ہے نہ کہ فی الحقیقت غیر جانبدارانہ سروے۔

اسد صاحب کی کتاب کا پہلا باب اسلام کی صراط مستقیم (THE OPEN ROAD OF ISLAM) کے عنوان سے شروع ہوتا ہے اس میں مصنف نے دکھایا ہے کہ سائنس صرف جزوی مطالعہ کا نام ہے۔ وہ ہم کو صرف محسوسات کے بارے میں باخبر کرتی ہے جبکہ مذہب، محسوسات اور غیر محسوسات دونوں کے مکمل مطالعہ کا نام ہے۔ مذہب ایک ایسی نظر دیتا ہے جس سے آدمی پورے مجموعہ کے بارے میں رائے قائم کر سکے۔

"اس حد تک" مصنف لکھتے ہیں "تمام مذاہب یکساں ہیں" مگر اسلام اس نظریاتی تشریح سے آگے جاتا ہے۔ اسلام وہ عملی طریقہ ہے جس سے آدمی اپنی زندگی اور شعور میں نظریہ اور عمل کا اتحاد قائم کر سکے۔ (۱۸) اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہماری زندگی کو روحانیت اور مادیت کے دو خانوں میں تقسیم نہیں ہونا

چاہیے بلکہ چاہیے شعور اور ہمارے عمل میں انھیں ایک عامد عنصر کی طرح سمجھا جانا چاہیے ہمارا یہ نقطۂ نظر ایک ہے اس کو زندگی کے مختلف پہلوؤں میں اتحاد کی صورت میں منعکس ہونا ضروری ہے۔ (۲۰ ہی) مصنف کے نزدیک اسلام کی اخلاقی بنیاد ہے۔ (۳۲)

کتاب کا دوسرا باب روح مغرب (THE SPIRIT OF THE WEST) ہے جس میں مصنف نے اسلام اور مغربی تہذیب کا فرق دکھایا ہے۔ انھوں نے دکھایا ہے کہ اسلام کی بنیاد ایک ماورائے مادہ حقیقت کے اقرار پر ہے۔ جبکہ مغربی تہذیب مادیت میں یقین رکھتی ہے۔ اس طرح دونوں کے درمیان بنیادی ٹکراؤ پایا جاتا ہے پھر دو ایک ساتھ کیسے چل سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے ان لوگوں کی غلط فہمی واضح کی ہے جو مسیحیت کو مغربی تہذیب کی بنیاد سمجھتے ہیں اور اس بنا پر خیال رکھتے ہیں کہ اسلام اور مغربی تہذیب میں کوئی بنیادی ٹکراؤ نہیں ہے۔ انھوں نے دکھایا ہے کہ مغربی تہذیب کے متعلق یہ سمجھنا بالکل غلط ہے۔ اس کے برعکس مغربی تہذیب کا ذہنی رشتہ دراصل رومی تہذیب سے ملتا ہے جو خالص مفاد پرستی اور مادیت پر ایمان رکھتی تھی یہ صحیح ہے کہ رومیوں کے یہاں دیوتاؤں کی پرستش کا رواج تھا مگر وہ یونانی دینیات کی بے روح نقل کے سوا اور کچھ نہیں۔ رومیوں نے حقیقی زندگی میں مذہب کا دخل کبھی تسلیم نہیں کیا چنانچہ

> "عام مغربی خواہ وہ جمہوری یا فاشسٹ، سرمایہ دارانہ معیشت کا حامی ہو یا اشتراکی معیشت کا، صرف ایک مذہب کو جانتا ہے اور وہ ہے مادی ترقیات کی پرستش۔ یہ عقیدہ کہ زندگی کی اس کے سوا کوئی منزل نہیں کہ موجودہ زندگی کو خوش حال بنایا جائے۔ اس مذہب کی عبادت گاہ عظیم فیکٹریاں، سینما ہاؤس، کیمیائی تجربہ گاہیں، رقص کے مراکز، بجلی کے کارخانے ہیں اور اس مذہب کے پروہت ہیں ـــــ بینکر، انجینیر، فلم اسٹار اور صنعتوں کے رہنما۔" صفحہ ۵۵-۶۰

ظاہر ہے کہ ایسی تہذیب کے ساتھ اسلام کا جوڑ کس طرح لگ سکتا ہے۔

تیسرے باب کا عنوان ہے صلیبی جنگوں کا سایہ (THE SHADOW OF THE CRUSADES) اس باب میں مصنف نے دکھایا ہے کہ مغرب کی اسلام دشمنی عام قسم کی دشمنی نہیں ہے بلکہ وہ نہایت گہری ہے۔ اس دشمنی کا آغاز صلیبی جنگوں سے ہوا۔ یہ اتفاق ہے کہ یہ یورپ کی تشکیل جدید کا عہد طفولیت تھا۔ جس طرح بچپن کے نقش زندگی بھر باقی رہتے ہیں اسی طرح قوموں کا معاملہ ہے۔ جب یوروپین تہذیب وجود میں آرہی تھی عین اسی کے آغاز میں صلیبی جنگ چھڑ گئی جس نے سارے یورپ کو اسلام کے خلاف متحد کر دیا اس

تجربہ ہوا کہ یورپ کے بہت سے لوگوں کا رخ اسلام دشمنی ہو گئی۔ یہ سب پروگرام اور منصوبہ دانشوروں کا مطالعہ کرتا ہے تو ان
میں اس کا خاص طور پر تحقیقی انداز باقی رہتا ہے مگر اسلام کا نام آتے ہی اس کا انداز بدل جاتا ہے۔

مصنف نے مزید لکھا ہے کہ موجودہ زمانے میں بعض جدید سائنسی اور فلسفیانہ رجحانات کو دیکھ کر کچھ
مسلمان یہ کہنے لگے ہیں کہ یورپ مذہب سے قریب آ رہا ہے اور اس لیے دوسرے لفظوں میں گویا اسلام
سے قریب آ رہا ہے کیونکہ اسلام مذہب کی بہترین شکل ہے۔ مگر یہ صرف ایک غلط فہمی ہے۔

"کہا جاتا ہے کہ جدید سائنس نے فطرت کے محسوس ڈھانچے کے پیچھے ایک عام تخلیقی قوت کو
تسلیم کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور یہ مغربی دنیا میں ایک نئے مذہبی شعور کی صبح طلوع ہونے
کی نشانی ہے۔ مگر یہ خیال یورپ کے سائنسی تصورات کے بارے میں محض غلط فہمی پر دلالت
کرتا ہے۔ کوئی سنجیدہ سائنس داں اس امکان سے انکار نہیں کر سکتا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ کائنات
اپنے آغاز میں کسی واحد محرک کے تحت وجود میں آئی ہو مگر اصل سوال یہ ہے اور یہی ہمیشہ سے
تھا کہ یہ سبب جس نے کائنات کا آغاز کیا اس کی خصوصیات (QUALITIES) کیا تھیں۔ تمام
فوق الطبیعی عقیدہ رکھنے والے مذاہب دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ ایک ایسی طاقت ہے جو کل شعور اور
بصیرت کی حامل ہے۔ یہ طاقت خود کسی قانون کی پابند نہیں۔ بلکہ وہ آزادانہ طور پر اپنے نقشہ اور
مقصد کے مطابق کائنات کی تخلیق کرتی ہے اور اس کی حکمراں ہے۔ ایک لفظ میں وہ خدا ہے۔ مگر
جدید سائنس یہاں تک نہیں جاتی۔ .... اس کا نقطۂ نظر کچھ اس قسم کا ہے کہ "ایسی کوئی
طاقت ہو سکتی ہے مگر وہ مجھے نہیں معلوم اور نہ میرے پاس ایسا کوئی سائنسی ذریعہ ہے جس سے اس کو جانا
جا سکے۔ مستقبل میں یہ فلسفہ کسی قسم کی تشکیکی وجودیت PANTHEISTIC AGNOSTICISM
کی شکل اختیار کر سکتا ہے جس میں روح اور مادہ، مقصود اور موجودات، خالق اور تخلیق سب
ایک ہو گئے ہوں۔ اب یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ اس قسم کا ایک عقیدہ اسلام کے تصور خدا کی طرف
پیش قدمی ہے۔ کیونکہ یہ مادیت کو خیر باد کہنا نہیں ہے بلکہ زیادہ عالی ذہنی سطح پر وہ مادیت ہی
کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔" صفحہ ۷۷-۷۸

چوتھے باب میں جدید تعلیم پر گفتگو ہے اور اس کا عنوان ہے ABOUT EDUCATION
مصنف لکھتے ہیں کہ جب مغربی تہذیب اور اسلام دونوں دو مختلف تصور حیات پر مبنی ہیں تو مغربی

ڈھنگ کی تعلیم مسلم نوجوانوں کے لیے کس طرح موزوں ہو سکتی ہے. بعض مخصوص غیر معمولی ذہن ممکن ہے اس تعلیم کے اندر چھپے ہوئے اثرات سے اپنے کو پاک رکھنے میں کامیاب ہو جائیں. مگر عام نوجوان اس کے تاثرات سے بچ نہیں سکتے.

مصنف نے مزید وضاحت کی ہے کہ اسلام بذات خود تحصیل علم کا مخالف نہیں ہے. بنو امیہ، بنی عباس اور اسپین کی عربی حکومت کی تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو علم اور تحقیق پر کتنی قوت سے ابھارا ہے. مگر علم کا وہ انداز جو ایک مخالف اسلام تہذیب کے زیر اثر بنا ہو، وہ اسلام کے لیے مفید نہیں ہو سکتا. یقیناً ہماری خواہش ہے کہ ہم علم اور ترقی میں اس مقام پر پہونچیں جس مقام پر آج یورپ ہے. مگر ایک چیز ایسی ہے جس کی مسلمان ہرگز خواہش نہیں کر سکتا. وہ ہو مغرب کی نظر سے دیکھنا، مغرب کے کان سے سننا اور مغربی افکار کے تحت سوچنا. اگر ہم مسلمان رہنا چاہتے ہیں تو ہم اسلام کی روحانی تہذیب کا مغرب کی مادی تہذیب سے تبادلہ نہیں کر سکتے. یہاں مصنف نے جدید مضامین خاص طور پر تاریخ کی مثال سے واضح کیا ہے کہ کس طرح تاریخ کا موضوع مغرب کے زیر اثر درس گاہوں میں محض مغربی تاریخ بن کر رہ گیا ہے.

مصنف لکھتے ہیں کہ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آج ہم تمام علوم کے لیے مغربی ذرائع سے مدد لینے پر مجبور ہیں. اس کا حل یہ ہے کہ ہم ان سے معلومات لے لیں مگر ان کا طرز فکر نہ لیں:

> علوم قطعیہ (EXACT SCIENCES) کا مطالعہ مغربی ڈھنگ سے کرنے میں ہمیں کوئی جھجک نہیں ہے. مگر ہم ان کے فلسفہ کو کسی طرح قبول نہیں کر سکتے." صفحہ ۹۲

مصنف کا خیال ہے کہ اسی تقسیم کے مطابق مسلم نوجوانوں کی تعلیم ہونی چاہیے:

> "اگر مجھے ایک ایسے تعلیمی بورڈ کو مشورہ دینا ہو جسے صرف اسلامی تقاضوں کے ماتحت کام کرنا ہو تو میں مشورہ دوں گا کہ مغرب کی تمام ذہنی ترقیات میں سے محض فطری علوم (NATURAL SCIENCES) اور ریاضی کو مسلم اسکولوں میں پڑھایا جانا چاہیے. اور مغربی فلسفہ، لٹریچر اور تاریخ کی تعلیم کو اس فوقیت کے مقام سے ہٹا دینا چاہیے جو اس وقت نصاب کا جزو بنے ہوئے ہیں." صفحہ ۹۵

مغربی تہذیب اسلامی ذہن پر جو برے اثرات ڈالے گی وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو مادی فوائد کی شکل میں وہ ہمیں عطا کرے گی. اس لیے ضروری ہے کہ مغربی علوم کو ان کی تہذیب سے الگ کر کے

یا جائے۔ یہاں مصنف نے مختلف علوم کے تجزیہ سے واضح کیا ہے کہ کس طرح وہ اسلام کے ساتھ جمع نہیں کیے جا سکتے۔

"مغربی زندگی کی تقلید شخصی یا اجتماعی حیثیت سے اسلامی تہذیب کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔" ان الفاظ کے ساتھ کتاب کا پانچواں باب شروع ہوتا ہے جس کا عنوان ہے تقلید (About Imitation)

مصنف بعض جدید تعلیم یافتہ افراد کی اس دلیل کو بالکل فضول قرار دیتے ہیں کہ اس کی کوئی حقیقی معنوی اہمیت نہیں ہے کہ ظاہری طور پر زندگی کس طرح گزاری جائے۔ خواہ ہم جدید مغربی لباس میں ملبوس ہوں یا اپنے باپ دادا والا لباس پہنیں، رسوم و آداب میں پرانا طرز اختیار کریں یا نیا، اس سے دین و مذہب میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

"یہ واقعہ ہے کہ اسلام میں کوئی تنگ نظری نہیں ہے۔" مصنف لکھتے ہیں۔ "مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ اسلام اور مغربی تہذیب دونوں کے رخ بالکل الگ الگ ہیں۔ اب کوئی بالکل سادہ لوح ہی یہ یقین کر سکتا ہے کہ ایسا ممکن ہے کہ کسی تہذیب کی محض اس کے ظواہر میں تقلید کی جائے اور اس کی اسپرٹ سے کوئی تاثر قبول نہ کیا جائے۔ تہذیب محض ایک سادہ خول کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک زندہ طاقت ہوتی ہے جس لمحہ ہم اس کے ظاہر کو قبول کرتے ہیں اسی لمحہ اس کے اندر کی مستور روح ہمارے اندر اپنا عمل شروع کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ غیر محسوس طور پر ہمارا پورا نقطۂ نظر تبدیل کر دیتی ہے۔"

مصنف کے نزدیک اس سے بڑی کوئی غلطی نہیں ہو سکتی کہ اس معاملہ میں اہم اور غیر اہم کی تقسیم کی جائے۔ مثال کے طور پر مغربی لباس کی مثال لے کر مصنف نے بہت خوبی سے اس مسئلہ کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس قسم کی تقلید محض مغرب کے مقابلے میں احساس کمتری کا نتیجہ ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

"اس کا مطلب یہ نہیں ہے۔" مصنف لکھتے ہیں۔ "کہ مسلمان بیرونی آوازوں سے اپنے کان بند کر لیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنی تہذیب کا پوری طرح پابند رہتے ہوئے خارجی تہذیب سے کچھ اثرات قبول کرتا ہے۔ اس کی ایک مثال یورپ کی نشاۃ ثانیہ ہے۔ یورپ نے ابتداً عربوں کے علوم سے متاثر ہو کر اپنی جدید زندگی کا آغاز کیا۔ مگر اس نے کبھی عربی تمدن کی نقل کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ اپنی ذہنی آزادی کو قربان کیا۔ اس نے عربی اثرات کو خود اپنی زمین پر ایک کھاد

کے طور پر استعمال کیا۔ جیسا کہ خود عربوں نے یونانی اثرات کے معاملے میں اپنے عروج کے وقت میں یہی کیا تھا۔ دونوں مثالوں میں نتیجۃً ایک نئی طاقتور تہذیب وجود میں آئی جو خود اعتمادی سے بھرپور تھی اور جسے اپنے اوپر فخر تھا۔" صفحہ ۱۰۸

یہ ایک نمونہ ہے جو اپنی تاریخ میں بھی ہمارے لیے موجود ہے اور غیروں کی تاریخ میں بھی۔

چھٹا باب حدیث اور سنت پر ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ اسلام کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے مختلف علاج تجویز کیے گئے، مگر سب بے فائدہ ثابت ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا علاج صرف پیغمبر اسلام کی سنت ہے۔ جس سنت نے تیرہ سو برس پہلے اسلام کو زندگی بخشی تھی، اسی سنت سے آج بھی ہم کو زندگی ملے گی۔ یہ دلی حقیقت جو اسلامی تاریخ کے ہر دور میں اہل علم تسلیم کرتے رہے ہیں وہ اب ہمارے درمیان اجنبی ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ محض مغربی تہذیب کا اثر ہے۔ "یہ ایک قطعاً غیر اسلامی فکر ہے کہ قرآن کی بہت سی ہدایات زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے لیے تھیں نہ کہ بیسویں صدی کے مہذب انسانوں کے لیے۔" مصنف اس قسم کے خیالات کو نقل کرتے ہوئے کسی قدر جوش کے ساتھ کہتے ہیں:

AT ITS ROOT LIES A STRANGE

UNDER-ESTIMATION OF THE PROPHETICAL

ROLE OF MUSTAFA ———— P. 115

یعنی اس کی تہ میں محمد مصطفےٰ کے پیغمبرانہ کردار کا ایک حیرت انگیز حد تک ناقص اندازہ چھپا ہوا ہے۔

مصنف کا یہ ایک فقرہ میرے نزدیک ان کی ساری کتاب کی جان ہے۔

موجودہ زمانے میں یہ عام فیشن ہو گیا ہے کہ احادیث کی مستند حیثیت کا انکار کیا جائے۔ کیا اس کے پیچھے کوئی علمی دلیل یا معقولیت ہے۔ مصنف نے تفصیل سے بتایا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ حدیث سے انکار کی بنیاد کوئی علمی دلیل نہیں بلکہ کچھ جذبات ہیں جو لوگوں کو اس سے انکار کی طرف لے جاتے ہیں۔

موضوع احادیث کی موجودگی کا حوالہ دے کر بہت سے مغربی ناقد تمام ذخیرۂ حدیث کو مشتبہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ مصنف کہتے ہیں کہ جب ہمارے پاس ایسے قطعی علمی ذرائع موجود ہیں جن سے کسی حدیث کی صحت یا موضوعیت کو معلوم کیا جا سکے تو اس طرح کی احادیث کی موجودگی ذرہ برابر بھی نفسِ حدیث کے استناد کو مشتبہ نہیں کرتی۔ اس قسم کا استدلال ایسا ہی ہے جیسے [illegible]

کہ ان الفاظ میں [illegible] سے منقول ہو سکے ایک تاریخی دستاویز کو غیر مستند ثابت کیا جائے۔

یہ باب مندرجہ ذیل الفاظ پر ختم ہوتا ہے۔

"تقلید مغرب WESTERNIZATION ہی سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر احادیث رسول اور
پورا مجموعہ سنت موجودہ زمانے میں غیر مقبول ہو گیا ہے۔ سنت اس قدر واضح طور پر مغربی تہذیب
کے خلاف ہے کہ جو لوگ مغربی تہذیب کے دلدادہ ہیں وہ اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں پاتے کہ
سنت کو غیر شرعی ثابت کریں۔ اس کے بعد یہ بہت آسان ہو جائے گا کہ قرآن کی تعلیمات کو
ایسی شکل دے دی جائے کہ وہ مغربی تہذیب کے مطابق نظر آنے لگیں۔" صفحہ ۱۳۰

ساتویں باب کا عنوان ہے سنت کی روح (THE SPRIT OF THE SUNNAH)
سنت کی پیروی کیوں اسلام کا ناقابل تقسیم جزو ہے۔ کیا سنت کے طویل روایتی نظام کے بغیر اسلام کی حقیقت
نہیں مل سکتی۔ مصنف نے بجا طور پر اس کا جواب نفی میں دیا ہے۔ اور اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے
کہ پیغمبر کی غیر مشروط اطاعت کے بغیر اسلام کے کوئی معنی نہیں۔

اس راہ میں عقلیت RATIONALISM بھی ایک خاص رکاوٹ ہے جس کی بنا پر بہت سے
جدید تعلیم یافتہ مسلمان اپنے کو پیغمبر کے حوالے کر دینے سے انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کی سنت کو
ہم اپنی عقل سے جانچیں گے اور اس کا جو جزو عقل کے معیار پر پورا اترے گا اسی کو لیں گے اور بقیہ کو چھوڑ
دیں گے۔ مگر مصنف کے الفاظ میں آج یہ ثابت کرنے کے لیے کسی کانٹ (KANT) کی ضرورت نہیں ہے
کہ انسان کی عقل اپنے امکانات کے اعتبار سے نہایت محدود ہے۔ ہمارا ذہن محض اپنی ساخت کی بنا
پر سارے حقائق کا ادراک کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ پھر عقل کی نارسائی کی یہی حقیقت جو ہم سائنس
کے مطالعہ میں تسلیم کرتے ہیں اسی کو مذہب کے معاملات میں کیوں تسلیم نہیں کرتے۔ صفحہ ۱۳۴

یہ باب مندرجہ ذیل الفاظ پر ختم ہوتا ہے:

"پیغمبر نے جو کچھ کیا یا کہا اس کی تعمیل اسلام کی تعمیل ہے۔ سنت کو چھوڑ دینا در اصل اسلام
کو چھوڑ دینا ہے۔" صفحہ ۱۴۹

اس کے بعد خاتمہ کا باب ہے جو نتیجہ فکر (CONCLUSION) کے عنوان سے شروع
ہوتا ہے اس میں مصنف نے دکھایا ہے کہ اسلام اس قسم کا کوئی کلچر نہیں ہے جو محض ایک درخت کی طرح

پیدا ہوا اور پھر ایک مدت مقررہ پر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ بلکہ وہ خدا کا دائمی حکم ہے اس لیے اس کو ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اسلام کے احیاء کی جدوجہد اصلاح مذہب (REFORM) کی تحریک کی نوعیت نہیں رکھتی جیسا کہ بعض مسلمان سمجھتے ہیں۔ ہم کو نئے زمانے کے مطابق اسلام کی اصلاح نہیں کرنی ہے بلکہ خود زمانے کو اسلام کے مطابق بنانا ہے۔

مصنف لکھتے ہیں کہ اسلامی دنیا نے ایک آزاد تمدنی عامل کی حیثیت سے اپنا مقام کھو دیا ہے۔ اس کا مطلب مسلمانوں کے زوال کا سیاسی پہلو نہیں ہے بلکہ ذہنی اور اجتماعی پہلو ہے۔ جو کہ ہماری موجودہ گری ہوئی حالت کی سب سے زیادہ افسوسناک تصویر ہے۔ ہمارے اندر کوئی ہمت باقی نہیں ہے۔ ہمارے اندر یہ احساس نہیں ہے کہ ہم خارجی اثرات سے اپنی سوسائٹی کو بچائیں۔ یہی مصنف کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو ہے۔

"مصنف کے نزدیک اصلاح حال کا پہلا قدم یہ ہے کہ یورپ کے مقابلہ میں معذرت خواہانہ انداز کو ختم کیا جائے جو کہ ذہنی شکست خوردگی (INTELLECTUAL DEFEATISM) کا دوسرا نام ہے۔ دوسرا قدم سنت کی پیروی کا عزم ہے۔ "خارجی تصورات کے مقابلے میں اسلام کی عاجزانہ سرنگندگی کے بجائے ہمیں ایک بار پھر اسلام کو اپنے ذہن میں یہ حیثیت دینی ہے جس سے دنیا کے بارے میں فیصلہ کیا جائے۔ "پھر ہمیں زندگی کے موجودہ احوال کے مطابق ایک نئی فقہ وجود میں لانی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے قدیم فقہ نے اپنے زمانے میں ارسطو اور نو فلاطونی فلسفہ کے پیدا کردہ مسائل کا جواب دیا تھا اور ان حالات میں اسلامی احکام کو منطبق کیا تھا جو اس وقت سماج میں پائے جاتے تھے۔ صفحہ ۱۵۹

"اسلام کی مثال آج ایک ڈوبتے ہوئے جہاز کی سی ہے۔ تمام ہاتھ جو اس کو بچانے والے ہیں ان کو بچانے کے لیے کمربستہ ہو جانا چاہیے۔ مگر اس جہاز کو بچانا اسی وقت ممکن ہو سکے گا جبکہ قرآن کی اس پکار کو سنیں اور سمجھیں۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (تمہارے لیے رسول خدا کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے) صفحہ ۱۶۰

یہ کتاب اگرچہ مغربی اثرات کے مقابلے میں اسلام کی علمی مدافعت کے طور پر لکھی گئی ہے مصنف کے الفاظ میں وہ مغرب کے خلاف اسلام کے مقدمہ کی وکالت ہے مگر اس کے مباحث عموماً بہت سادہ ہیں اور گہرا علمی تجزیہ بہت کم پایا جاتا ہے۔

تاریخ و سیرت

رحمۃ للعالمینؐ (کامل ۳ جلد)
(از قاضی سلیمان منصور پوریؒ)
قیمت -/-/۲

اسلام (آغاز و ارتقاء)
مرتبہ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی
قیمت ..... -/-/۳

رحمتِ عالمؐ
علامہ سید سلیمان ندویؒ کے قلم سے
قیمت -/۲۵/۱

اصح السیر:-
مولانا عبدالرؤف دانا پوریؒ کی نہایت مستند و معتبر سیرت نبویؐ
قیمت -/-/۱۰

مقالات سیرت
— از ڈاکٹر —
محمد آصف قدوائی ایم اے پی ایچ ڈی
یہ سیرت نبویؐ پر آٹھ گرانقدر مقالوں کا مجموعہ ہے
— جن کو —
مولانا سید ابوالحسن ندوی نے اپنے
مقدمہ میں
دل کھول کر داد تحسین پیش
— کی ہے! —
قیمت مجلد
-/۵۰/۴

...د حمیدی (۲ جلد)
...اریؒ کے استاذ امام حمیدیؒ
...ب کیا ہوا حدیث کا مجموعہ جو
...ح بخاری کا خاص ماخذ ہے۔
قیمت -/-/۱۸

...جان السنۃ
...رت مولانا بدر عالم صاحب (میرٹھی)
مقیم مدینہ طیبہ)
...ول .... -/-/۴
...وم .... -/-/۹
...وم .... -/۸/۱۰
...ی فی جلد -/-/۲ کا اضافہ)

...ابت حدیث
مؤلفہ
...ا سید مناظر شاہ رحمانی
...یت مجلد -/۲۵/۱

...دوین حدیث
از مولانا
...مناظر احسن گیلانیؒ
...ین مدینہ کی نہایت مفصل اور محققانہ تاریخ
...کے مطالعہ کے بعد اس میں
...ی شبہ باقی نہیں رہتا کہ احادیث
...و ذخیرہ ہم تک پہونچا ہے وہ اس
...ہ اطمینان بخش طریقہ پر پہونچا ہے
...کہ اس سے زیادہ
...اطمینان بخش طریقہ عالم امکان
— میں نہیں —
قیمت مجلد
-/۵۰/۹

عہد نبویؐ کے میدان جنگ
(از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب
جس میں
غزوات نبویؐ پر فن حرب و جنگی سائنس
کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔
متعدد جنگی میدانوں کے نقشے بھی شامل
کتاب ہیں!
قیمت -/۵۰/۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات و معاہدات
یعنی شاہان عالم، عرب کے حکمرانوں و قبائلی سرداروں سے آپؐ کی سیاسی خط و کتابت اور معاہدات
از سید محبوب رضوی
قیمت -/۲۵/۲

صدیق اکبرؓ:-
از مولانا سید احمد صاحب اکبر آبادی
صدر شعبۂ دینیات
(مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)
قیمت -/-/۸

حضرت ابو بکرؓ کے سرکاری خطوط
حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط کے بعد اسی مرتب کی دوسری قابل قدر پیش کش، اسی طرز پر
قیمت مجلد -/-/۵

کلمات اکابر
از مولانا محمد اسحٰق بنارسی
قیمت -/۵۰/۱

حضرت ابو بکرؓ و فاروق اعظمؓ
از (ڈاکٹر طٰہٰ حسین)
قیمت مجلد -/-/۵
دونوں ایک جلد میں [illegible]

تاریخ الخلفاء از علامہ سیوطیؒ
مترجمہ اقبال الدین احمد
خلفائے راشدینؓ سے مصر کے خلفاء تک کے دور کی مکمل تاریخ
قیمت -/-/۱۲

امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی
(از مولانا گیلانیؒ)
قیمت مجلد —— -/-/۳

امام ابو حنیفہ اور ان کی تدوین قانون اسلامی
(از ڈاکٹر حمید اللہ) قیمت -/۵۰/۱

سیرۃ النعمان:-
قیمت مجلد —— -/-/۴
غیر مجلد —— -/-/۳

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر
از مولانا ابوالحسن علی ندوی
قیمت —— -/۵۰/۴

تعبیر کی غلطی:-
(جماعت اسلامی کا جائزہ)
از وحید الدین خاں صاحب
قیمت —— -/-/۶

علمائے صادق پور
از مولانا سید محمد میاں صاحب
قیمت -/-/۴

تذکرہ مجدد الف ثانی
مجدد الف ثانی نمبر الفرقان کا تازہ کتابی ایڈیشن
الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر میں پہلی بار یہ حقیقت سامنے آئی تھی کہ امام ربانی
شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کا وہ کون سا امتیازی کارنامہ ہے جس کی وجہ سے آپ کو کسی ایک
صدی کا نہیں بلکہ الف ثانی یعنی پورے دوسرے ہزار سالے کا مجدد امت نے
مان لیا ہے۔ الفرقان کے اس نمبر کی اشاعت پر اکیس برس گزر چکے ہیں، اس عرصہ میں عالم
اسلامی دنیا کے حالات میں بہت کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں ان تبدیلیوں کو اور ان کے دینی
تقاضوں کو دیکھ کر یہ یقین بڑھ جاتا ہے کہ واقعۃً حضرت موصوف پورے الف ثانی کے
مجدد ہیں اور ہمارے اس دور کے لئے بھی ان کے تجدیدی کام میں پوری رہنمائی موجود ہے۔
یہ حقیقت آپ پر اس کتاب کے مطالعہ سے کھلے گی جس میں
مجدد الف ثانی کے ذاتی حالات بھی ہیں اور ان کے تجدیدی
کام کی تفصیلات بھی، نیز آپ کے تمام مشہور خلفاء کا تذکرہ بھی
کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
بحری ڈاک سے ۔۔۔ ۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

سالانہ چندہ
ہندستان سے ۔۔۔۔۔۔ ۶/-
پاکستان سے ۔۔۔۔۔۔ ۸/-
ششماہی
ہندوستان سے ۔۔۔۔۔۔ ۳/۵۰
پاکستان سے ۔۔۔۔۔۔ ۴/-

(فی کاپی ۶۰ پیسے)

جلد ۳۲ | بابتہ ماہ شعبان ۱۳۸۴ھ مطابق جنوری ۱۹۶۵ء | شمارہ ۸

نمبر شمار	مضامین	مضامین نگار	صفحہ
۱	نگاہِ اولیں	عتیق الرحمٰن سنبھلی	۲
۲	ایک مردِ مومن کی شہادت	محمد منظور نعمانی	۱۴
۳	معارف الحدیث	〃 〃 〃	۱۷
۴	تجلیاتِ مجددِ الفِ ثانیؒ	مولانا نسیم احمد فریدی امروہی	۲۷
۵	شریعت کا جادۂ قویمہ شاہ ولی اللہؒ کی نظر میں	مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی	۳۴
۶	روزہ ــــــــ	جناب وحیدالدین خاں صاحب	۴۷

اگر اس دائرے میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ جنوری تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ ڈاک خانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری: براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں، اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، اڈیٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

الفرقان
ترتیب
عتیق الرحمن سنبھلی
مسئول
منظور نعمانی
فی پرچہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

گزشتہ مہینے ہمیں راجستھان سے ایک مخلص کا خط موصول ہوا ہے جس میں اس مقصد کی تائید کرتے ہوئے جو دو تین مہینے سے ان صفحات کا موضوع گفتگو ہے، ایک خاص شبہ الفرقان کی پالیسی کے متعلق دیا گیا ہے۔ یہ شبہ چونکہ صاحب مکتوب کے تنہا اپنے احساسات وخیالات کا نتیجہ نہیں بلکہ اور بہت سے لوگوں کے احساسات کا حوالہ بھی اس ذیل میں دیا گیا ہے اس لیے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ الفرقان کے صفحات ہی میں اس مسئلہ پر گفتگو کی جائے تاکہ جن اصحاب کے ذہن میں بھی اس معاملہ میں کوئی خلش ہو ان کے سامنے ہمارا نقطۂ نظر پوری وضاحت کے ساتھ آجائے۔

مکتوب کا ضروری حصہ یہ ہے

"اس وقت عریضہ لکھنے کا محرک آپ کا وہ اداریہ ہے جو الفرقان کی دسمبر [illegible] کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ آپ کی یہ تجویز کس قدر مبارک ہے کہ اجتماعی میدان میں کام کرنے والی تمام جماعتیں اور ان مسائل سے دلچسپی رکھنے والے تمام مؤثر حلقے ایک 'وفاقی نظام' میں منسلک ہو کر قیادت کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم ترتیب دیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اس وقت ملک میں مسلمانوں کی کوئی واحد نمائندہ جماعت نہیں ہے اور نہ کوئی ایسی واحد شخصیت ہے کہ جس کی آواز پر اسلامیان ہند لبیک کہیں۔ اس وقت مجلس مشاورت کی شکل میں ایک امید کی جھلک نظر آئی ہے، خدا کرے آپ کی اس تجویز کا کہ مجلس مشاورت کو مشترک مسائل میں جد وجہد کا ایک "وفاقی پلیٹ فارم" بنا لیا جائے، ملک میں خیر مقدم ہو.....

میری ....

رائے میں اس تجویز کا خیر مقدم ہر جماعت اور ہر مؤثر حلقے سے ہونا چاہیے اور کوشش یہ کی جائے کہ جماعتیں قریب سے قریب تر آئیں۔ یہ جماعتیں جس قدر قریب ہوتی جائیں گی اور مجلس مشاورت طاقت پکڑتی جائے گی اسی قدر یہ جماعتیں خود بخود اپنے دائرہ عمل سے مجلس کے حق میں دست بردار ہوتی جائیں گی۔ انشاء اللہ..................

اسی سلسلہ میں آپ سے دوسری گزارش یہ ہو کہ اب الفرقان اور ندائے ملت کے صفحات میں ایسے مباحث اور خبروں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہونا چاہیے کہ جس سے جماعت اسلامی (پاکستان) کی تنقید، تنقیص یا تضحیک ہوتی ہو۔ بات یہ ہو کہ سوائے چند باخبر اصحاب کے ہر شخص اس بات سے ناواقف ہو کہ جماعت اسلامی ہند کا کوئی ربط یا تعلق جماعت اسلامی پاکستان سے نہیں ہو۔ نام کی مماثلت کی وجہ سے عام قارئین کا ذہن اس قسم کے مباحث یا خبروں سے ہندوستان کی جماعت کے بارے میں کافی متاثر ہوتا ہو۔ نچلی سطح پر جماعت کے مخالفین یا موافقین ان سے کافی متاثر ہوتے ہیں۔ جماعت کے مخالفین میں جماعت کے خلاف، اور جماعت کے موافقین میں آپکے اور پھر مجلس کے خلاف تاثرات پیدا ہوتے ہیں۔ اب ان حلقوں میں لاکھ کوشش کریں لیکن ذہن ضرور متاثر ہوتے ہیں اس وقت آپ صاحبان جس اتحاد اور اشتراک کی کوشش کر رہے ہیں اس جدوجہد میں یہ تاثر مانع آرہا ہو، اور ہم لوگوں کو صوبائی اور ضلعی سطح پر جن عام اور ناشعور حلقوں میں کام کرنا پڑرہا ہو وہاں یہ دشواریاں پیش آرہی ہیں ——— مثال کے طور پر الفرقان کی اسی ماہ کی اشاعت مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا مضمون جہاں اور جن حلقوں میں پڑھا جارہا ہو وہاں ہندستان کی یہ جماعت بیچاری بلاوجہ زیر بحث آرہی ہو، یہ لوگ مجھے خود کہتے ہیں کہ آپ جس مجلس مشاورت کے مدعی ہیں اس کے رکن رکین کے رسالہ میں مشاورت کی ایک رکن جماعت کے بارے میں امین احسن صاحب کا مضمون چھپا ہو۔ سمجھانے پر بھی مضمون نے جو تاثر موافق اور مخالف حلقوں میں پیدا کیا ہو وہ موجود ہے۔ حالانکہ آپ کا اداریہ بھی میں نے لوگوں کو بتلایا اور سنایا۔

اس لیے میری گزارش ہو کہ ملت کے اتحاد کی خاطر اب آپ ان مباحث کو اپنے موقر

جدیدہ میں جگہ نہ دیں، ہم ان کوششوں کے لیے سعی کریں جن کا واضح طور پر آپ نے اپنے اداریہ میں نقشہ کھینچا ہے اور پھر پاکستان کی اندرونی سیاست اور وہاں کی جماعت کے آپس کے تنازعات سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں رکھنا چاہیے۔ عورت صدر بنے یا مرد ہمیں کیا یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ ہمارا مسئلہ تو آپس کا اتحاد ہے۔ یہ اتحاد ہے تو ملت بھی ایک باعزت زندگی اس ملک میں پالے گی۔

امید ہے کہ میری ان گزارشات پر ہمدردانہ طور پر غور فرمائیں گے۔"

آپ کا خادم

....

جہاں تک ندائے ملت کا تعلق ہے، راقم سطور اپنی صحت کی بنا پر اس کی ادارت سے اب سبکدوش ہو چکا ہے۔ ویسے بھی الفرقان اور ندائے ملت کو ایک سمجھ کر گفتگو کرنا صحیح نہیں ہے، لیکن جب مراسلہ نگار نے اس کا ذکر کر دیا ہے تو اتنا کہہ دینا مناسب ہے کہ اب تک کی پالیسی کے اعتبار سے ندائے ملت اس طرح کے مسائل سے خود ہی دور رہتا ہے۔

لیکن الفرقان کا معاملہ اس سے مختلف ہے اس کا مقصد اشاعت دین حق کی اشاعت اور دینی فتنوں سے مسلمانوں کی حفاظت ہے۔ اس کا فرض ہے کہ جس بات کو دین میں حق جانے اسے حق کہے اور جس چیز کو باطل سمجھتا ہے اسے باطل کہہ کر رد کرے۔ اس کا نام ہی (الفرقان) اپنے مفہوم کے اعتبار سے اس کے اس فرض (حق کو باطل سے جدا کر کے دکھلانے) کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور وہ اگر کسی مصلحت کی خاطر اپنے اس فرض سے چشم پوشی کرتا ہے تو یہ بات خواہ دوسروں کی نظر میں کیسی ہی بھلی ہو، مگر اس کی اپنی نظر میں ایک جرم ہوگا۔

جہاں تک مشترک خطرات کے مقابلہ میں ملت کے اتحاد و اشتراک کا سوال ہے، الفرقان اسے ہندوستان میں نفس اسلام کی بقا کا ذریعہ سمجھتا ہے اور اس لیے اس کی تائید ہی نہیں اس کی دعوت و تلقین کو بھی اپنا فرض جانتا ہے اور اس فرض کو وہ اپنے امکان بھر انجام بھی دے رہا ہے۔ لیکن اس دعوت اتحاد کا یہ مطلب اس کے لیے ناقابل قبول ہے کہ کہیں دین کی تحریف دیکھے تو

اس پر بھی خاموش رہے اور دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہو اس سے آنکھیں بند کر کے بس اس پر نظریں جمائے رکھے کہ مجلس مشاورت کا قافلۂ اتحاد خیر و عافیت کے ساتھ اپنی منزل مقصود کو پہونچ جائے۔

مجلس مشاورت کی شکل میں رونما ہونے والا اتحاد بیشک الفرقان کو عزیز ہے مگر الفرقان تو اس کا یہ مطلب بھی نہیں سمجھتا کہ جو لوگ اس اتحاد میں شریک ہیں ان کی بھی کسی بات سے اختلاف نہ کیا جائے کیونکہ مجلس مشاورت کی بنیاد خود اس اصول پر نہیں ہے۔ مجلس مشاورت اپنے دائرے سے باہر اختلافات کے وجود کو تسلیم کرتی ہے اور اسکے ساتھ اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ وہ مشترک ملی مسائل جن میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے ان میں الگ الگ کام کرنے کے بجائے مل کر کام کیا جائے۔ پس اس لحاظ سے خود ان شرکائے اتحاد کے درمیان میں بھی اگر کچھ اختلافی دائرے ہیں تو یہ بات اس اتحاد کے خلاف نہ ہوگی کہ ان دائروں کے صحیح حدود کا خیال رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے اظہار اختلاف کیا جائے اور جو بات کسی کو غلط نظر آئے تو اس پر اپنے ضمیر کے مطابق تنقید کی جائے!

یہ محض ہمارا خیال نہیں ہے۔ اتفاق سے خود جماعت اسلامی ہند کے امیر مولانا ابو اللیث صاحب کے عمل کی نظیر ہمارے سامنے موجود ہے جو ہمیں پوری تائید بہم پہونچاتی ہے۔ مجلس مشاورت نے اپنی تاسیس کے بعد سب پہلا کام ملک کے مختلف فرقوں کے ممتاز لوگوں کے دستخطوں سے ایک بیان جاری کرنے کا کیا تھا جس میں ملک کے سب فرقوں سے اتحاد و یکجہتی اور رواداری کی فضا قائم کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔ اس پر دستخط مولانا ابو اللیث صاحب نے بھی کیے تھے لیکن اسکی اشاعت کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ اسکے بعض فقروں سے وحدت ادیان کی تائید نکلتی ہے سو معاملہ خود مجلس مشاورت کی اپیل کا تھا، مجلس مشاورت اور اس کے صدر محترم کے وقار کا تھا، جنھوں نے ہندوستان کے نہایت ممتاز غیر مسلموں کے دستخط اس پر کرائے تھے پھر صراحۃً وحدت ادیان کی کوئی تائید ان فقروں میں تھی بھی نہیں، لیکن مولانا نے ان سب پہلوؤں کے باوجود اپنی دینی ذمہ داری اور ایمانی ضمیر کا تقاضہ یہی محسوس کیا کہ اس لحاظ سے ان فقروں کو غلط کہیں اور ان کے موہوم مفہوم سے اپنی برأت کا علانیہ اظہار پبلک میں کریں چنانچہ مولانا کا یہ تردیدی بیان ، ۶ اکتوبر کے دعوت (دہلی) میں شائع ہوا ——— پس جب یہ پوزیشن ہے تو ہمارے لیے یہ بات ناقابل فہم ہے کہ جماعت اسلامی پاکستان جس کا نہ مجلس مشاورت سے کوئی واسطہ ہو نہ وہ مسلمانان ہند کی کوئی جماعت ہے، اسکی کسی بات پر تنقید کرنے میں مجلس مشاورت کا اتحاد کیوں مانع آئے؟

بیشک ہم اپنے ملک کے مسلمانوں کی یعنی خود اپنی مصلحت میں اس بات سے آنکھیں بند کر سکتے ہیں کہ پاکستان میں عورت صدر مملکت ہوتی ہو یا مرد۔ اور فی الواقع ہمیں مسئلہ کی اس نوعیت سے کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں کیونکہ یہ مسئلہ پاکستان کا اندرونی مسئلہ ہے۔ لیکن یہ رد یہ ہمارے لیے اس صورت میں کیسے جائز ہو سکتا ہے جب مسئلہ عورت کی صدارت کے شرعی جواز اور عدم جواز کا ہو اور ہم یہ دیکھ رہے ہوں کہ جماعتی سیاست کے مصالح پر اپنی آبرو کے ساتھ ساتھ شریعت کی آبرو بھی نثار کی جا رہی ہو! کیا دین اور شریعت کے معاملات پر گفتگو میں بھی ملکوں کی سیاسی اور جغرافیائی حد بندیاں حائل ہوتی ہیں؟ اور کسی مسلمان کے لیے یہ بات جائز ہو سکتی ہے کہ وہ شعور و اختیار رکھتے ہوئے بھی دنیا کے کسی حصہ میں شریعت کے نام پر ہویٰ پرستی کا تماشہ خاموشی کے ساتھ دیکھتا رہے؟ پھر جبکہ یہ تماشہ ہو بھی رہا ہو ایسے لوگوں کے ہاتھوں جن کی شہرت اقامت دین کے علمبرداروں کی حیثیت سے ہو، جن کے قول و فعل کے اثرات پاکستان کے اندر تک ہی محدود نہ ہوں۔ بلکہ خود ہمارے ملک کے لحاظ سے تو صورت یہ ہو کہ اُن کے ذہنی حلقۂ اثر کے اعتبار سے ہندوستان و پاکستان کے درمیان کوئی تفریق ہی مشکل ہو! کیونکہ پاکستان کی جماعت اسلامی اول سے آخر تک جس شخصیت کی فکری اور عملی قیادت کی آئینہ دار ہو وہ مولانا مودودی ہیں۔ اور مولانا مودودی صاحب کے فکری اثرات کے بارے میں کون ہندوستان و پاکستان کی تفریق کر سکتا ہو؟ وہ اپنے فکری حلقۂ اثر کے اعتبار سے جتنے پاکستانی ہیں بلاشبہ اتنے ہی ہندوستانی بھی ہیں۔

بہرحال جماعت اسلامی پاکستان اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی یہ خصوصیت ہندوستان کے کسی دینی رسالہ پر اور بھی زیادہ لازم کرتی ہو کہ وہ اگر اپنی سیاسی ضرورتوں کے ماتحت لوگوں کو احکام شریعت کے بارے میں مغالطے دینے لگیں تو سختی کے ساتھ اُس کا نوٹس لیا جائے۔

مولانا مودودی اور اُن کی جماعت کا جو مسلک سیاست میں عورتوں کے حصہ لینے کی قطعی مخالفت کا رہا ہو وہ ہر اُس شخص پر واضح ہو جس کو اُن کے لٹریچر کے مطالعہ سے کچھ بھی دلچسپی رہی ہو۔ لیکن ہم اسکے باوجود ان سے ہرگز کوئی تعرض نہ کرتے اگر صرف اتنی بات ہوتی کہ انھوں نے وقتی یا دائمی طور پر اپنے مسلک کو چھوڑ دیا۔ ہم کوئی خدائی فوجدار نہیں کہ کسی شخص یا جماعت کی صوابدید کے راستہ میں حائل ہوں۔ اور جس بات کو خود صحیح سمجھتے ہوں دوسروں کو بھی اس کے اختیار کرنے یا اختیار کیے رہنے پر مجبور کریں، ہر شخص کو اختیار ہو

گروہ اگر اپنے کل کے مسلک کو غلط سمجھنے لگا یا اس پر قائم رہنا اُسے مشکل نظر آنے لگا تو وہ آج اس مسلک میں تبدیلی کا اعلان کر دے یا خاموشی سے دوسری راہ اختیار کر لے اسی طرح پاکستان کی جماعت اسلامی بھی مس فاطمہ جناح کی حمایت میں کمر بستہ ہو جاتی تو صرف اس بات پر کم از کم ہم اس کا دامن نہ پکڑتے۔ زیادہ سے زیادہ مولانا دریابادی کی طرح اس کے مرحوم ہو جانے کا ماتم کر لیتے، لیکن اس کی جو چیز اس معاملے میں تنقید اور محاسبہ پر مجبور کرتی ہے وہ یہ ہو کہ وہ اپنی کمزوری یا مسلک میں تبدیلی کا اعتراف کرنے کے بجائے اپنے نئے موقف کی حمایت میں ایسے ایسے دلائل تراشنے اور ایسی عوام فریب باتیں کرنے پر تل گئی ہو کہ ان کو اگر آج چلنے دیا جائے تو نہ صرف اس مسئلہ میں لوگوں کے ذہن خراب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے بلکہ اور کتنی ہی چھوٹی بڑی اور اصولی و فروعی گمراہیاں لوگوں کے ذہنوں میں جڑ پکڑ کر رہ جائیں گی۔

جو شخص بھی اس مسئلہ میں کسی لاگ لپیٹ اور جنبہ داری کے بغیر گہری نظر سے جماعت اسلامی پاکستان کے موقف کا جائزہ لے گا وہ بلاشبہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ جماعت اسلامی کو کوئی بھی شرعی مجبوری مس فاطمہ جناح کی حمایت کے لیے پیش نہیں آئی تھی، وہ مجبوری دراصل اس کی اپنی سیاسی مجبوری تھی جسے اس نے شرعی مجبوری کے افسانے میں چھپایا اور پھر اس کے ماتحت تن من دھن سے مس فاطمہ جناح کی حمایت کا جواز ثابت کرنے کے لیے وہ ایمان سوز حربے، وہ عوام فریب باتیں اور وہ گمراہ کن دلائل تراش کر پھیلائے، بلکہ ان کا طومار لگا دیا، کہ ابتدائے اسلام سے آج تک کا ایک متفق علیہ مسئلہ آن کی آن میں اپنی آبرو کھو بیٹھا اور جتنے منہ اتنی باتیں اس کے متعلق ہونے لگیں۔

بالکل آنکھوں سے دیکھی ہوئی بات ہے کہ پاکستان کے متحدہ حزب اختلاف کی طرف سے جب مس فاطمہ جناح کی امیدواری طے کی گئی تو اس میں قطعاً یہ سوال سامنے نہیں آیا کہ وہ کونسی شرعی مجبوری یا مصلحت ہے جس کی بنا پر باوجود عورت ہونے کے انھیں مملکت کی سربراہی کے لیے کھڑا کرنا جائز ہوگا۔ اس متحدہ محاذ میں جماعت اسلامی پہلے دن سے شریک تھی اور اخبار بین طبقہ جانتا ہے کہ مس فاطمہ جناح کا نام کافی پہلے سے متحدہ محاذ کے امکانی امیدواروں کی فہرست میں آرہا تھا۔ ظاہر ہے کہ جماعت اسلامی نے بھی اس پر غور کیا ہوگا لیکن وہ کوئی شرعی مجبوری یا مصلحت اس نام کی تائید کے لیے اس عرصہ میں دریافت نہ کر سکی۔ حتیٰ کہ جس میٹنگ میں متحدہ محاذ نے یہ فیصلہ کیا اس میں جماعت کے نمائندوں نے اس

فیصلہ پر صاد نہیں کیا۔ بلکہ اپنے شرعی مسلک کا عذر کرکے فوری طور پر رائے دینے سے احتراز کیا کہ اس معاملہ میں اب اتفاق یا عدم اتفاق کا فیصلہ پوری جماعت ہی کر سکتی ہے! اب اس مرحلے کے بعد جماعت کی مجلس شوریٰ طلب ہوئی اور اس نے ایک شرعی فتوے کے ساتھ اس فیصلے کی تائید کا فیصلہ کیا ـــــ

سوال یہ ہے کہ اس فتوے میں جو وجوہ جواز پیش کیے گئے ہیں، کیا کوئی بھی منصف مزاج آدمی یہ باور کر سکتا ہے کہ یہ پہلے سے جماعت اسلامی کے اہل الرائے کی نظر میں نہیں تھے؟ دوسرے اہل علم سے مشورہ کرنے کے بعد ہی اپنے ملک کے یہ حالات اور صدر ایوب کے چھ سالہ دور کے یہ تمام کچھ ان حضرات پر کھلے! یا یہ کوئی غیبی خبریں تھیں کہ کوئی الہام والقا ہوا تو ان حالات کا پتہ چلا اور پھر یہ اہل علم کی خدمت میں برائے استفسار پیش کیے جا سکے؟ کوئی عقل سے کورا ہو تو دوسری بات ہے ورنہ جن حالات پر دھواں دھار تقریریں یہ حضرات عرصے سے کر رہے تھے، جن کے ذکر اور جن کی مذمت سے ان کے اخبارات و رسائل بھرے چلے آرہے تھے، کوئی نہیں مان سکتا کہ شروع میں جب فاطمہ جناح کا نام ان کے سامنے آیا تو یہ سب باتیں ان کے ذہن سے محو ہو گئی تھیں! پس اگر ان حالات کے وجود سے مس فاطمہ جناح کی تائید و حمایت کا جواز نکلتا تھا، تو ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس میں اس وقت تک تکلف سے کیوں کام لیا گیا جب تک متحدہ محاذ کی باقی سب جماعتوں نے اپنے طور پر فیصلہ کرکے مس فاطمہ جناح کی امیدواری کا اعلان نہ کر دیا؟ اگر یہ ایسی ہی شرعی ضرورت تھی کہ اس کے بغیر اسلام کی گاڑی پاکستان میں آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ تو پھر اس فیصلہ کی تائید ہی نہیں تحریک کا جماعت اسلامی سے بڑھ کر کس پر حق تھا۔ کیوں نہیں اس نے کہا کہ اس گاڑی کا راستہ چونکہ پاکستان میں صرف قائد اعظم کی بہن ہی کے ہاتھوں صاف ہو سکتا ہے، اس لیے ہم ان کا جھنڈا سب سے پہلے اٹھائیں گے اور پاکستان میں اس سعادت کا حقدار ہم سے زیادہ کوئی اور نہیں ہے!

الغرض مس فاطمہ جناح کی شخصیت کا وزن کوئی ڈھکی چھپی چیز تھی اور نہ دور ایوبی کے حالات کوئی پردہ راز میں تھے۔ لیکن اس کے باوجود جماعت اسلامی ان کے نام کی تحریک چھوڑ تائید کا فیصلہ بھی متحدہ محاذ کی باقی جماعتوں کے ساتھ نہیں کر سکی، تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ وہ کوئی گنجائش شرعاً اسکی نہیں سمجھتی تھی ـــــ اور ہمارے لیے یہ سمجھنے کی معقول وجہ موجود ہے کہ اس نے اندرونی طور پر اس کی مخالفت بھی کی ہوگی۔ کیونکہ اسی دور ایوبی کے اندر سنہ ۶۲ء میں کسی شخص نے مولانا مودودی

کی شرعی تائید مس فاطمہ جناح کی صدارت کے لیے حاصل کرنا چاہی تھی اور مولانا نے اپنے پچھلے موقف کے عین مطابق دلائل کے ساتھ اس پر انکار کر دیا تھا؎ ـــــــ لیکن جب بات اس کے قابو سے نکل گئی اور پوزیشن یہ ہو گئی کہ اب اگر متحدہ محاذ کے فیصلے کی توثیق نہیں کرتے تو گھر کے رہیں گے نہ گھاٹ کے، کیونکہ اپنی ساری سیاست کو تو اس نے متحدہ محاذ سے وابستہ کر دیا تھا تو ناچار اسے اپنی سیاسی مجبوری کے آگے سر جھکانا پڑا۔ اور دوسرے گمنام اہل علم کی گردن پر رکھ کر یہ فتویٰ اس نے راتوں رات تیار کیا کہ عورت کو امیر بنانا ہے تو شرعاً حرام، لیکن ایسا حرام نہیں ہے کہ کسی شدید ضرورت سے بھی حلال نہ ہو سکے۔ اور ادھر ملک کے جو حالات ہیں وہ اس بات کی شدید ضرورت ہی ظاہر کرتے ہیں کہ مس فاطمہ جناح کو بطور صدارتی امیدوار کے قبول کر لیا جائے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ یہ سخن سازی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ شدید ضرورت اس وقت کیوں نہیں یاد آئی جب مس جناح کا نام متحدہ محاذ کے زیر غور تھا، اور بعد میں کون سے ایسے حالات ملک میں رونما ہو گئے جو پہلے نہیں تھے؟ سوائے اس کے کہ متحدہ محاذ کے باقی سب شریکوں نے جماعت اسلامی کی رائے کی پرواہ نہیں کی۔ اور جماعت اسلامی اس پوزیشن میں اپنے آپ کو نہیں سمجھتی تھی کہ متحدہ محاذ کو چھوڑنے کے نتائج کا مقابلہ کر سکے۔ ناچار اس نے اپنی متاع دین بھی اس محاذ کے قدموں میں لاکر رکھ دی۔ اور پھر یہ ظاہر کرنے کی ہمت چوں کہ اس میں نہیں تھی کہ ہم اپنی مجبوری میں اپنے لیے یہ جائز سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اس منکر شرعی سے عارضی طور پر سمجھوتہ کر لیں۔ اس لیے اپنی کمزوری کی پردہ پوشی کیلئے اس نے پوری پاکستان قوم کے نام فتویٰ صادر کیا کہ جماعت اسلامی صرف اپنے ہی لیے اپنے مخصوص حالات کے ماتحت مس فاطمہ جناح کی حمایت جائز نہیں سمجھتی ہے بلکہ یہ جواز پوری قوم کے لیے ہے۔ اور جواز بھی ایسا جو وجوب کے معنیٰ رکھتا ہے کہ تن من دھن سے مس فاطمہ جناح کو کامیاب بنانے کی جد و جہد کرنا چاہیے ـــــــ یعنی

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

؎ یہ سوال و جواب معاصر المنبر (لائلپور، پاکستان) نے اپنی ۱۱ر دسمبر ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں مکمل حوالے کے ساتھ شائع کیا ہے۔

یہ ہے متعصبانہ بے دلیل اور سراسر سخن سازانہ فتویٰ بجائے خود کیا کم فتنہ تھا کہ جماعت اسلامی پاکستان کے جس اخبار میں ہم نے یہ فتویٰ پڑھا اس کی اگلی اشاعت کے اداریہ میں یہ الفاظ ہماری نظر سے گزرے کہ

"تعجب ہے محترمہ فاطمہ جناح کا نام صدارتی امیدوار کی حیثیت سے منظر عام پر آیا ہے بعض مذہبی حلقوں نے زور شور سے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ شریعت کی رو سے عورت صدر مملکت نہیں بن سکتی۔" (ہفتہ وار شہاب ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۴ء)

یہ جن الفاظ پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے اس میں ذرا پروپیگنڈے کا لفظ ملاحظہ فرمائیے۔ اسی کو ہم نے ایمان سوز حربے سے تعبیر کیا ہے اور خدا گواہ ہے کہ ان سطروں کا لکھنے والا اس لفظ کو پڑھ کر لرز گیا کہ اللہ اللہ! اب یہ نوبت آگئی کہ جماعت اسلامی مذہبی حلقوں کی اس بات کو پروپیگنڈا قرار دے کہ از روئے شریعت عورت صدر مملکت نہیں بن سکتی!

پھر اسی اخبار کی اسی اشاعت میں مولانا مودودی کا یہ چیلنج ہماری نظر سے گزرا کہ

"کوئی شخص یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ از روئے شریعت عورت کا سربراہ مملکت ہونا حرام ہے اور اس سلسلے میں استثنا کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔"

ہم چونکے کہ "حرام" تو سوائے جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے (جس میں مولانا مودودی شریک نہیں تھے) کسی نے نہیں کہا پھر یہ چیلنج مولانا کس کو فرما رہے ہیں! لیکن آگے دیکھا تو استثنا کی گنجائش کا سوال بھی لگا ہوا ہے تب سمجھ میں آیا کہ یہ مجلس شوریٰ کی غلطی نباہی جا رہی ہے یعنی ایسا ذو معنی چیلنج کیا ہے کہ آدمی پہلے ہی نہ کر سکے کہ مولانا کے چیلنج کا مقصد حرمت کا ہی انکار ہے یا صرف استثنا کا دعویٰ! خیر اس معمے کو چھوڑ کر آگے بڑھے تو نظر آیا کہ مولانا نے اپنی جماعت کے فیصلے کی حمایت کرتے ہوئے ملکہ سبا کے قرآنی قصہ کے حوالے سے یہ دلیل پیش کی کہ

"جس وقت وہ حضرت سلیمانؑ پر ایمان لے آئیں تو حضرت سلیمانؑ کو وحی نازل نہیں ہوئی کہ عورت کو سربراہ مملکت نہیں رہنا چاہیے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کے سربراہ مملکت ہونے میں حرج نہیں ہے۔" (شہاب ص۱۱)

یعنی دلیل میں مولانا اپنے والا نہماذ قائم نہیں رکھ سکے اور یہ بات کھل کر آگئی کہ وہ سرے سے حرمت ہی کا

انکار کرنا چاہتے ہیں۔ یا یوں یہ کہہ لیجئے کہ دلیل حسب مطلب مل سکی کیونکہ دلیل استثنائی نہیں کلی جوانکی ہے؛ بہرحال یہ وہ چیز ہے جس کے لیے ہم نے گمراہ کن دلائل کا لفظ استعمال کیا ہے۔

حد ہو گئی اپنی کمزوری کو چھپانے کی کہ اگر استثنار کی کوئی دلیل ہاتھ نہ آسکی تو ممکن جواز ہی نکال کر دکھا دیا اور یہ بھی خیال نہ آیا کہ اگر ملکہ سبا کے واقعہ سے یہی بات ثابت ہوتی ہے تو پھر اصل اسلامی حکم کا کیا بنے گا۔ جو جماعت اسلامی کی کتابوں میں بھی پورے دلائل کے ساتھ لکھا ہوا ہے اور جس کے متعلق آج تک کہا جا رہا ہے کہ ہم اب بھی اس پر قائم ہیں. لیکن اس دلیل کے بعد وہ حکم اور وہ مسئلہ کہاں رہ گیا؟

بہرحال اس وقت پورے مسئلہ پر کوئی سیر حاصل گفتگو ہمارے پیش نظر نہیں تھی بلکہ ہمیں جو جماعت اسلامی پاکستان کے سلسلہ میں اپنا موقف واضح کرنے کے لیے کچھ سخت الفاظ استعمال کرنا پڑے تھے ضروری تھا کہ اس کے اسباب کی طرف بھی کچھ اشارہ کر دیں۔ یہ تھوڑی سی تفصیل اسی بنا پر کرنا پڑی۔ ہمیں امید ہے کہ محترم مراسلہ نگار نے اور اُن کے ساتھ ان کے ہم خیال دوسرے لوگوں نے بھی ہمارے نقطۂ نظر کو سمجھ لیا ہوگا اور وہ ہمیں اس معاملہ میں معذور جانیں گے کہ جماعت اسلامی پاکستان پر کسی تنقید وغیرہ کو الفرقان کے صفحات میں جگہ نہ دیں۔ ہم اس جماعت پر کوئی تعریضاً تنقید نہیں کرتے اور نہ تعریضاً کسی تنقید کو نقل کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ دین کی حفاظت کا مسئلہ ہے۔ کیونکہ مولانا مودودی کی یہ جماعت جب اپنی سیاسی ضرورتوں کی خاطر (جن کی انتہا معلوم نہیں) دین کا حلیہ بگاڑ دینے پر تُل گئی ہے تو پھر ہندوستان اور پاکستان دونوں کے اندر دین کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں ہو سکتا۔ اور ہم ایسے فتنہ کے معاملہ میں کسی سے نہ مصالحت کر سکتے ہیں نہ کسی کی رعایت۔

ہاں یہ ہم بھی نہیں چاہتے کہ ہماری ان تنقیدوں کا جماعت اسلامی ہند پر اثر پڑے لیکن اگر واقعہ یوں ہی ہے کہ ان تنقیدوں سے یہاں کی جماعت کے خلاف بھی تاثر پیدا ہوتا ہے تو اس میں ہمارے بس کی کوئی بات نہیں بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اس میں زیادہ قصور ان تاثر لینے والوں کا بھی نہیں۔ جماعت اسلامی پاکستان اور جماعت اسلامی ہند بے شک ضابطہ میں بالکل ایک

دوسرے سے بے تعلق ہیں۔ لیکن دونوں کا فکری سرچشمہ تو ایک ہی ہے۔ ہندوستان کی جماعت اسلامی اگرچہ پاکستان کی جماعت اسلامی سے کوئی رابطہ نہیں رکھتی لیکن اس کے ارکان وہمدردان اور متفقین مولانا مودودی کے افکار سے ذہنی فیض تو آج بھی اسی طرح حاصل کرتے ہیں جیسے تقسیم سے ماقبل۔ اور نہ بھی وہ پہلے والی بات ہو بلکہ اب کہیں کہیں اختلاف رائے ہونے لگا ہو تب بھی یہ ذمہ داری تو تمام تر جماعت اسلامی ہند کے رسائل واخبارات ہی پر عائد ہوتی ہے کہ وہ ایک طرف تو ان کی تمام قابل تائید باتوں کی تائید بالواسطہ یا بلا واسطہ کرتے ہیں ان سے متعلق قابل ذکر باتوں کو خصوصیت سے پبلسٹی دیتے ہیں اور مختلف طریقوں سے ایک ہیرو اور آئیڈیل شخصیت کا تصور ان کے بارے میں دیتے ہیں۔ دوسری طرف ان کی جن باتوں کی تائید نہیں کر سکتے ان پر ایسی گہری خاموشی اختیار کر لیتے ہیں کہ چاہے ہند و پاکستان کی صحافتی دنیا میں ان پر ایک ہنگامہ برپا رہے مگر ان کی خاموشی کسی پہلو نہیں ٹوٹتی۔ اور لوگ ترس جاتے ہیں کہ کچھ تو لکھیں۔ مثال کے طور پر یہ عورت کی صدارت کا مسئلہ ہی لے لیجیے۔ ہندوستان و پاکستان کے سارے پریس کا اس وقت سب سے معرکہ آرا دینی مسئلہ یہی ہے۔ لیکن جماعت اسلامی ہند کے اخبارات ورسائل اچھے کسی اور دنیا میں نکل رہے ہوں۔

ہمارے خیال میں اگر ان باتوں میں جماعت اسلامی ہند کا پریس اپنا رویہ بدل دے تو جماعت کے مخالفوں کا ذہن بھی اس کے بارے میں بدل جائے گا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ جماعت اسلامی کے دوستوں کو اس بات کی تو شکایت پیدا ہو کہ لوگ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پاکستان کے گناہ ان کے سر کیوں ڈالتے ہیں۔ لیکن اس کی جرأت نہ کی جائے کہ ان گناہوں کو گناہ کہہ کر اپنی برات کا اظہار کر دیا جائے۔ اور یا اگر ان باتوں کو گناہ نہیں حق وصواب سمجھا جا رہا ہے تو سر اٹھا کر اس کا ساتھ دیا جائے۔ اور اس تائید حق اور شہادت حق کی خاطر ہر ملامت اور ہر نقصان کو گوارا کیا جائے۔

الغرض یہ مخالفوں کا تاثر تو جماعت اسلامی ہند کے پریس اور اہل قلم کی پالیسی کا نتیجہ ہے۔ یہ نہ الفرقان کا پیدا کردہ ہے اور نہ اس کو روکنا الفرقان کے بس کی بات ہو۔ جماعت اسلامی ہند

کی جو پالیسی اپنے کام اور اپنے نظریات کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں ادھر چند سال سے نمایاں طور سے بدلی ہے اس کا یہ کھلا ہوا نتیجہ ہے کہ ہمیں اس کے اصل نظریات سے اسی اختلاف کے باوجود جو جماعت اسلامی پاکستان یا مولانا مودودی سے ہمیں ہے اس سے کوئی تعرض کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ لیکن ہم یہ رویہ پاکستان کی جماعت اسلامی کے بارے میں تو نہیں اختیار کر سکتے۔ کیونکہ وہ بالکل دوسرے حال میں ہے۔ اب یہ جماعت اسلامی ہند کا کام ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس زد سے نکالے جو اس پر جماعت اسلامی پاکستان کی بدولت پڑ جاتی ہے اور جب تک وہ خود اپنی اس مشکل کو حل کرنے کے لیے کمر بستہ نہ ہو کسی کی بھی مدد اس معاملہ میں اس کے کام نہیں آ سکتی۔

ایک مردِ مومن کی شہادت

از
محمد منظور نعمانی

الفرقان کے ناظرین کو شاید یاد بھی ہو اب سے کوئی ڈیڑھ سال پہلے اپنے سفرِ حجاز کے تذکرہ کے سلسلے میں جدہ میں مقیم اپنے ایک بہت خاص اور مخلص دوست ارشد صاحب کا میں نے محرم ۸۲ھ (جون ۶۳ء) کے شمارہ میں ذکر کرتے ہوئے ان کے بارہ میں لکھا تھا کہ

ارشد صاحب پہلے پاکستان میں محکمۂ تار و ٹیلیفون کے افسروں میں تھے اب غالباً دو ڈھائی سال سے سعودی حکومت نے مستعاراً ان کی خدمات حاصل کر لی ہیں جدہ ہی میں[1] قیام رہتا ہے ..... یہ ہمارے ان خوش نصیب دوستوں میں سے ہیں جن پر بڑا ہی رشک آتا ہے، قریباً ۲۰ سال سے ان سے تعلق ہے، تبلیغی کام سے بڑا گہرا تعلق رکھتے ہیں، جہاں تک یاد آتا ہے اب سے قریباً ۲۰ سال پہلے میوات کے ایک تبلیغی اجتماع ہی میں ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، جہاں رہتے ہیں اپنے منصبی خدمات شاندار طور پر انجام دیتے ہیں لیکن ان کی اصل فکر دین کی فکر ہوتی ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ان کے ذریعہ اس کے کتنے بندوں کا تعلق اپنے مالک سے جڑا ہے، اب سے چند سال پہلے حکومت پاکستان کی طرف سے وہ جاپان بھیجے گئے تھے، ان کی دعوت کے نتیجہ میں اور ان کے ہاتھ پر سیکڑوں جاپانی مشرف باسلام ہوئے جن میں بعض بڑے فاضل اور بعض بدھ مذہب کے ممتاز راہب اور درویش بھی تھے۔ آج کل جدہ میں بھی ایک جاپانی نومسلم فاضل (عمر میتا) ان کے پاس مقیم ہیں یہ ان کو انگریزی کے ذریعہ قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ پڑھاتے ہیں اور وہ اس کو جاپانی زبان میں منتقل کرتے ہیں۔ قریباً دس پاروں کا ترجمہ مختصر وضاحتی نوٹوں کے ساتھ ہو چکا ہے[2]"

---

[1] جس وقت یہ سطریں لکھی گئی تھیں اس وقت تک ارشد صاحب کی رہائش جدہ ہی میں تھی اس کے بعد وہ مکۂ معظمہ منتقل ہو گئے تھے۔

[2] الحمد للہ جاپانی زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ اور وضاحتی نوٹوں کا یہ کام اب مکمل ہو گیا ہے۔ اس کام کی مالی کفالت "رابطۂ اسلامیہ" (مکۂ معظمہ) نے کی ہے اور اسی کی طرف سے ان شاء اللہ اس کی طباعت و اشاعت کا اہتمام ہوگا۔

یہ ارشد صاحب کا بہت ہی مختصر تعارف تھا۔ میں نے اس کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ ۱۳ اپریل ۱۹۶۳ء کو جب یہ ناچیز جدہ کے ہوائی اڈہ پر اُترا تو ارشد صاحب موجود تھے ــــ کسٹم وغیرہ کے قانونی مراحل کے بعد وہ مجھے اپنی کوٹھی پر لے گئے جہاں اسی دن یا ایک دن پہلے کے آئے ہوئے کئی پاکستانی اور کئی امریکن حجاج بھی مقیم تھے، ارشد صاحب کے بعض ساتھیوں نے مجھے بتایا کہ جب موسم حج شروع ہوتا ہے ان کی کوٹھی اسی طرح ان کے جاننے پہچاننے والے خاص کر تبلیغی کام سے تعلق رکھنے والے حجاج کا مسافر خانہ بنی ہوئی ہے، ہوائی یا بحری جہازوں کی آمد پر اکثر وہ خود جاتے ہیں اور اپنی موٹر پر بٹھا کے ان کو اپنے ہاں لے آتے ہیں، ان کی مہمانداری کرتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آخیر شب میں اپنے ہی موٹر پر ان کو مکۂ مکرمہ پہونچاتے ہیں اور وہاں مسجد حرام میں تہجد اور فجر پڑھ کے واپس ہوتے ہیں۔ اور صبح جدہ پہونچ کے اردو اور انگریزی میں قرآن مجید کا درس دیتے ہیں جس کی روشنی میں عمر بیتا جاپانی میں ترجمہ کرتے ہیں اور نوٹس لکھتے ہیں ــــ میں ارشد صاحب سے متاثر تو بہت پہلے سے تھا لیکن اس سفر میں قریباً ۲۰ گھنٹے جو ان کے ہاں ٹھہرنا ہوا اور ان کا معمول کا پروگرام اور دینی سرگرمیاں علم میں آئیں تو یہ تاثر کئی گنا بڑھ گیا۔

پھر اب سے ٹھیک ایک سال پہلے آخر دسمبر ۱۹۶۳ء میں وہ حجاز مقدس سے ایک چلہ کا وقت لے کر بھوپال کے تبلیغی اجتماع میں آئے، اجتماع کے بعد انھوں نے جماعت کے ساتھ ملک کے مختلف مقامات کا دورہ کیا اس سلسلہ میں لکھنؤ بھی دو دن قیام رہا، یہاں کی ان کی ایک تقریر کا خود مجھ پر اتنا اثر پڑا کہ عمر بھر میں شاید ہی کسی کی تقریر کا اتنا اثر ہوا ہو ــــ

اب اس کے ٹھیک ایک سال کے بعد پھر اسی ہفتہ (۲۶، ۲۷، ۲۸ دسمبر کو) بھوپال میں تبلیغی اجتماع ہوا۔ یہ عاجز ۲۶ کی صبح کو جب وہاں پہونچا تو تاج المساجد کے صحن میں قدم رکھتے ہی پہلی المناک خبر یہ سُنی کہ ارشد صاحب اسی ہفتہ ایک تبلیغی سفر میں مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ آتے ہوئے موٹر کے ایک حادثہ میں شہید ہو کر واصل بحق ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

حادثہ کی تفصیل جو حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کے نام آئے حجاز مقدس کے ایک تبلیغی کارکن کے خط سے اور بھوپال کے اجتماع کے لیے وہاں سے آنے والے ایک دوست سے معلوم ہوئی وہ یہ ہے۔

۱۳، ۱۴ شعبان (پنجشنبہ و جمعہ) کو مدینہ طیبہ میں تبلیغی اجتماع تھا، یہ حجاز مقدس میں اس طرح کا

پہلا اجتماع تھا جس طرح کے اجتماعات تبلیغی کام کے سلسلہ میں ہندوستان یا پاکستان میں ہوتے ہیں جن کے لیے مہینوں پہلے سے محنتیں کی جاتی ہیں، ارشد صاحب نے اس اجتماع کے لیے بہت پہلے سے بڑی محنت کی تھی۔ پھر جب اجتماع کے دن آئے تو وہ پورے اہتمام اور سرگرمی سے اجتماع کے کاموں میں لگے رہے اجتماع کے مختلف حلقوں میں کئی تقریریں خود بھی کیں، اس کے لیے خاص طور سے کوشش کرتے رہے کہ کچھ لوگ بھوپال کے اجتماع میں شرکت کے لیے ہوائی جہاز سے فوراً ہندوستان جانے پر آمادہ ہو جائیں، اللہ تعالیٰ نے اس میں ان کو کامیاب بھی کر دیا۔

۱۴ اور ۱۵ کی درمیانی شب میں مسجد نبوی میں تہجد کی نماز پڑھ کے اور روضۂ اقدس پر سلام عرض کر کے ایک جیپ کے ذریعہ وہ مکہ معظمہ کے لیے روانہ ہوئے ان کے ساتھ دو نومسلم جاپانی رفیق بھی تھے، ایک عمر میتا اور دوسرے محمد مصطفیٰ نامی جو حال ہی میں آئے تھے ــــ ان کے علاوہ دو پاکستانی مہمان بھی تھے ایک محمد حسن خطیب اور دوسرے شبیر حسین ہاشمی ــــ یہ شعبان کی پندرھویں شب مبارک تھی، ارشد صاحب نے روزہ کی نیت کر لی تھی اور عمرہ کا احرام بھی باندھ لیا تھا، گاڑی ارشد صاحب خود ہی چلا رہے تھے۔ رابغ پہونچ کر (جو مدینۂ طیبہ اور مکہ معظمہ کے قریباً وسط میں ہے) گاڑی میں پٹرول ڈلوایا، یہاں سے چلے تو ہاشمی صاحب نے گاڑی چلانا شروع کی۔ ابھی ۱۰-۱۵ منٹ ہی چلے ہوں گے کہ ایک موڑ پر جیپ پھسلی اور الٹ گئی۔ ارشد صاحب اور ہاشمی صاحب دونوں کے شدید ضربیں آئیں، باقی ساتھی بھی زخمی ہوئے مگر بہت زیادہ نہیں، ارشد صاحب تو حادثہ کے ۱۵-۲۰ منٹ بعد ہی روزہ اور احرام کی حالت میں اور راہ خدا میں جان بحق ہو گئے، اسی حال میں انھوں نے وصیت کی کہ ان کو مکہ معظمہ لے جا کے جنت المعلیٰ میں دفن کیا جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا مدرسۂ صولتیہ میں غسل دیا گیا، بعد عشاء حرم شریف میں نماز جنازہ پڑھی گئی، اور اپنی آرزو اور وصیت کے مطابق جنت المعلیٰ میں مرشد العالم حضرت حاجی امداد اللہ اور حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہم کے پہلو میں دفن کیے گئے ــــ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے راستے کے شہیدوں میں شامل فرمائے اور مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے ــــ ہاشمی صاحب جدہ کے ہسپتال میں داخل کیے گئے لیکن معلوم ہوا کہ دوسرے یا تیسرے ہی دن ان کا بھی انتقال ہو گیا، اللہ تعالیٰ ان کی بھی پوری پوری مغفرت فرمائے اور آخرت میں بھی ان کو ارشد صاحب کا رفیق بنائے اور دونوں

معارف الحدیث

(گزشتہ سے پیوستہ)

اپنے اہل و عیال کی ضروریات پر خرچ کرنا بھی صدقہ ہے:-

اپنے اہل وعیال کی ضروریات پر اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کم و بیش خرچ تو سب ہی کرتے ہیں لیکن اس خرچ کرنے سے لوگوں کو وہ روحانی خوشی حاصل نہیں ہوتی جو اللہ کے نیک بندوں کو دوسرے ضرورتمندوں اور مساکین و فقراء پر صدقہ کرنے سے ہوتی ہے۔ کیونکہ اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے کو لوگ کار ثواب نہیں سمجھتے بلکہ اس کو مجبوری کا ایک تاوان یا نفس کا ایک تقاضا سمجھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ اپنے اہل وعیال اور اعزہ و اقارب پر بھی لوجہ اللہ اور ثواب کی نیت سے خرچ کرنا چاہئے۔ اس صورت میں جو خرچ اس مد میں ہوگا وہ سب صدقہ کی طرح آخرت کے بنک میں جمع ہوگا بلکہ دوسرے لوگوں پر صدقہ کرنے سے زیادہ اس کا ثواب ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم سے ہمارے لیے خیر و سعادت کا ایک بہت بڑا دروازہ کھل جاتا ہے، اب ہم جو کچھ اپنے بیوی بچوں کے کھانے کپڑے پر حتیٰ کہ ان کے جوتوں پر جائز حدود میں خرچ کریں وہ ایک طرح کا "صدقہ" اور کار ثواب ہوگا، بس شرط یہ ہے کہ ہم اس ذہن سے اور اس نیت سے خرچ کریں۔

عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

اِذَا اَنْفَقَ الْمُسْلِمُ نَفَقَةً عَلٰی اَھْلِہٖ وَھُوَ یَحْتَسِبُھَا کَانَتْ لَہٗ

صَدَقَةٌ ــــــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی صاحب ایمان بندہ اپنے اہل و عیال پر ثواب کی نیت سے خرچ کرے، تو وہ اس کے حق میں صدقہ ہوگا (اور وہ عند اللہ ثواب کا مستحق ہوگا) (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَیُّ الصَّدَقَةِ اَفْضَلُ؟ قَالَ جُهْدُ الْمُقِلِّ وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ ــــ رواہ ابوداؤد

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ کون صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا وہ صدقہ افضل ترین صدقہ ہے جو غریب آدمی اپنی محنت کی کمائی سے کرے، اور پہلے اُن پر خرچ کرو جن کے تم ذمہ دار ہو (یعنی اپنے بیوی بچوں پر) (سنن ابی داؤد)

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عِنْدِیْ دِيْنَارٌ قَالَ اَنْفِقْهُ عَلٰی نَفْسِكَ قَالَ عِنْدِیْ اٰخَرُ قَالَ اَنْفِقْهُ عَلٰی وَلَدِكَ قَالَ عِنْدِیْ اٰخَرُ قَالَ اَنْفِقْهُ عَلٰی اَهْلِكَ قَالَ عِنْدِیْ اٰخَرُ قَالَ اَنْفِقْهُ عَلٰی خَادِمِكَ قَالَ عِنْدِیْ اٰخَرُ قَالَ اَنْتَ اَعْلَمُ ــــ رواہ ابوداؤد والنسائی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا کہ میرے پاس ایک دینار ہے (بتائیے کہ میں وہ کہاں خرچ کروں اور کس کو دے دوں) آپ نے فرمایا (سب سے مقدم یہ ہے) کہ اپنی ضرورتوں پر خرچ کرو، اُس نے کہا کہ اس کے لیے میرے پاس اور ہے۔ آپ نے فرمایا تو اس کو اپنی اولاد کی ضروریات پر خرچ کرو، اُس نے کہا کہ اس کے لیے میرے پاس اور ہے، آپ نے فرمایا تو اس کو اپنی بیوی کی ضروریات پر خرچ کرو،

اُس نے کہا کہ اس کے لیے میرے پاس اور ہے، تو آپ نے فرمایا کہ پھر اس کو اپنے غلام اور خادم پر صرف کردو، اُس نے کہا کہ اس کے لیے میرے پاس اور ہے تو آپ نے فرمایا کہ تم زیادہ واقف ہو کہ تمہارے اہلِ قرابت میں کون زیادہ ضرورتمند اور مستحق ہے)　　(سنن ابی داؤد وسنن نسائی)

(تشریح) غالباً ان صاحب کے ظاہری حال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اندازہ کیا تھا کہ یہ خود ضرورتمند اور تنگ حال ہیں اور ان کے پاس بس ایک دینار ہے اور یہ اس کو ثواب آخرت اور اللہ کی رضا کے لیے کہیں خرچ کرنا چاہتے ہیں اور ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ مومن بندہ جو کچھ اپنی ضرورتوں پر خرچ کرے یا اپنے بیوی بچوں اور غلاموں پر (جن کی اس پر ذمہ داری ہے) خرچ کرے وہ سب بھی صدقہ اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور ثواب کا وسیلہ ہے، اس لیے آپ نے ان کو بالترتیب یہ مشورہ دیا ـــــ عام اُصول اور حکم یہی ہے کہ آدمی پہلے اُن حقوق اور ان ذمہ داریوں کو ادا کرے جن کا وہ ذاتی اور شخصی طور پر ذمہ دار ہے اس کے بعد آگے بڑھے ـــــ ہاں وہ خاصانِ خدا جن کو توکل و اعتماد علی اللہ کا بلند مقام حاصل ہو اور اُن کے اہل وعیال کو بھی اس دولت میں سے حصہ ملا ہو اُن کے لیے یہ صحیح ہے کہ خود فاقہ سے رہیں، پیٹوں پر پتھر باندھیں اور گھر میں جو کھانا ہو وہ دوسرے اہلِ حاجت کو کھلا دیں ـــــ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خواص صحابہ کا حال اور طرزِ عمل یہی تھا ـــــ يُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ
(قرآن مجید الحشر)

اہلِ قرابت پر صدقہ کی خاص فضیلت:-

عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلصَّدَقَةُ عَلَى الْمِسْكِيْنِ صَدَقَةٌ وَهِيَ عَلَىٰ ذِي الرَّحِمِ ثِنْتَانِ صَدَقَةٌ وَصِلَةٌ ـــــ رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجہ والدارمی

سلیمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی اجنبی مسکین کو اللہ کے لیے کچھ دینا صرف صدقہ ہے اور اپنے کسی

عزیز قریب (ضرورتمند) کو اللہ کے لیے کچھ دینے میں دو پہلو ہیں اور دو طرح کا ثواب ہے، ایک یہ کہ وہ صدقہ ہے اور دوسرے یہ کہ وہ صلہ رحمی ہے (یعنی حق قرابت کی ادائیگی ہے) جو بجائے خود بڑی نیکی ہے۔

(مسند احمد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی)

عَنْ زَيْنَبَ امْرَأَةِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَصَدَّقْنَ يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ وَلَوْ مِنْ حُلِيِّكُنَّ قَالَتْ فَرَجَعْتُ إِلٰى عَبْدِ اللّٰهِ فَقُلْتُ إِنَّكَ رَجُلٌ خَفِيْفُ ذَاتِ الْيَدِ وَإِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ أَمَرَنَا بِالصَّدَقَةِ فَأْتِهِ فَاسْأَلْهُ فَإِنْ كَانَ ذٰلِكَ يُجْزِئُ عَنِّيْ وَإِلَّا صَرَفْتُهَا إِلٰى غَيْرِكُمْ قَالَتْ فَقَالَ لِيْ عَبْدُ اللّٰهِ بَلْ ائْتِيْهِ أَنْتِ قَالَتْ فَانْطَلَقْتُ فَإِذَا امْرَأَةٌ مِنَ الْأَنْصَارِ بِبَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَاجَتِيْ حَاجَتُهَا قَالَتْ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ أُلْقِيَتْ عَلَيْهِ الْمَهَابَةُ فَقَالَتْ فَخَرَجَ عَلَيْنَا بِلَالٌ فَقُلْنَا لَهُ ائْتِ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَخْبِرْهُ أَنَّ امْرَأَتَيْنِ بِالْبَابِ تَسْأَلَانِكَ أَتُجْزِئُ الصَّدَقَةُ عَنْهُمَا عَلٰى أَزْوَاجِهِمَا وَعَلٰى أَيْتَامٍ فِيْ حُجُوْرِهِمَا وَلَا تُخْبِرْهُ مَنْ نَحْنُ قَالَتْ فَدَخَلَ بِلَالٌ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَهُ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ هُمَا قَالَ امْرَأَةٌ مِنَ الْأَنْصَارِ وَزَيْنَبُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيُّ الزَّيَانِبِ قَالَ امْرَأَةُ عَبْدِ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَعَمْ لَهُمَا أَجْرَانِ أَجْرُ الْقَرَابَةِ وَأَجْرُ الصَّدَقَةِ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی زینب سے روایت ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک خطبہ میں خاص طور سے عورتوں کو مخاطب کرکے) فرمایا کہ اے خواتین تم کو چاہیے کہ راہ خدا میں صدقہ کیا کرو اگرچہ تم کو اپنے زیورات میں سے دینا پڑے (آگے زینب بیان کرتی ہیں کہ) میں نے جب حضور کا یہ ارشاد سُنا تو میں اپنے شوہر عبداللہ بن مسعود کے پاس آئی اور میں نے ان سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم عورتوں کو خاص طور سے صدقہ کی تاکید فرمائی ہے (اور میں چاہتی ہوں کہ میرے پاس جو کچھ ہے اُس میں سے راہ خدا میں خرچ کرنے کی سعادت حاصل کروں) اور تم بھی تنگ حال اور خالی ہاتھ ہو، اب تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کرو (کہ اگر میں تم کو ہی دے دوں تو کیا میرا صدقہ ادا ہو جائے گا ــــــ) اگر میرا تم کو دینا صحیح ہو تو میں تم ہی کو دے دوں گی ورنہ دوسرے ضرورتمندوں پر خرچ کر دوں گی ــــــ کہتی ہیں کہ عبداللہ بن مسعود نے مجھ سے کہا کہ تم خود ہی جاکر حضور سے دریافت کرو، تو میں خود گئی، وہاں پہونچی تو دیکھا کہ انصار میں سے ایک عورت آپ کے دروازہ پر کھڑی ہے اور اس کی غرض بھی وہی ہے جو میری غرض ہے (یعنی وہ بھی یہی مسئلہ معلوم کرنے کے لیے حاضر ہوئی تھی) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص ہیبت دی تھی (جس کی وجہ سے ہر ایک کو آپ سے دوبدو بات کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی اس لیے ہمیں خود آپ کے قریب پہونچ کر پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی) اتنے میں (آپ کے خاص خادم اور مؤذن) بلال باہر نکلے، ہم دونوں نے اُن سے کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیجئے کہ دو عورتیں دروازہ پر کھڑی ہیں اور آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہیں کہ اگر وہ اپنے ضرورتمند شوہروں اور اُن یتیموں پر جو خود ان کی گود میں پرورش پا رہے ہیں صدقہ کریں تو کیا یہ صدقہ ادا ہو جائے گا (اور ہم کو اس صدقہ کا ثواب ملے گا) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نہ بتانا کہ ہم کون دو عورتیں ہیں، ــــــ بلال آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان دونوں

عورتوں کا سوال آپ کی خدمت میں عرض کیا، آپ نے پوچھا کہ وہ کون عورتیں ہیں؟ بلال نے عرض کیا کہ ایک عورت تو انصار میں سے ہے اور دوسری زینب ہے آپ نے فرمایا کون سی زینب؟ بلال نے عرض کیا عبداللہ بن مسعود کی بیوی زینب! آپ نے فرمایا ہاں (اُن کا صدقہ ادا ہو جائے گا، بلکہ اس صورت میں) ان کو دوہرا ثواب ملے گا ایک صدقہ کا ثواب اور دوسرا صلۂ رحمی کا ثواب۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ اَبُوْ طَلْحَةَ اَكْثَرَ الْاَنْصَارِ بِالْمَدِيْنَةِ مَالًا مِنْ نَخْلٍ وَكَانَ اَحَبَّ اَمْوَالِهِ اِلَيْهِ بَيْرُحَاءَ وَكَانَتْ مُسْتَقْبِلَةَ الْمَسْجِدِ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْخُلُهَا وَيَشْرَبُ مِنْ مَاءٍ فِيْهَا طَيِّبٍ قَالَ اَنَسٌ فَلَمَّا نَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ٥ قَامَ اَبُوْ طَلْحَةَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ٥ وَاِنَّ اَحَبَّ مَالِيْ اِلَيَّ بَيْرُحَاءَ وَاِنَّهَا صَدَقَةٌ لِلّٰهِ تَعَالٰى اَرْجُوْ بِرَّهَا وَذُخْرَهَا عِنْدَ اللّٰهِ فَضَعْهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ حَيْثُ اَرَاكَ اللّٰهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَخٍ بَخٍ ذَالِكَ مَالٌ رَابِحٌ وَقَدْ سَمِعْتُ مَا قُلْتَ وَاِنِّيْ اَرٰى اَنْ تَجْعَلَهَا فِي الْاَقْرَبِيْنَ فَقَالَ اَبُوْ طَلْحَةَ اَفْعَلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَسَمَهَا اَبُوْ طَلْحَةَ فِيْ اَقَارِبِهٖ وَبَنِيْ عَمِّهٖ ——— رواہ البخاری ومسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کھجور کے باغات کے لحاظ سے مدینہ کے انصار میں سب سے زیادہ دولت مند حضرت ابوطلحہ انصاری تھے اور انھیں اپنے باغات اور جائدادوں میں سب سے زیادہ محبوب بیرحاء تھا (یہ ان کے ایک قیمتی باغ کا نام تھا) اور یہ مسجد نبوی کے بالکل سامنے تھا اور رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم اس میں تشریف لے جایا کرتے تھے اور اس کا نفیس پانی (شوق سے) نوش فرماتے تھے ــــ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ــــ جب قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" (نیکی اور مقبولیت کا مقام تم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنی محبوب چیزوں کو تم راہِ خدا میں خرچ نہ کرو) تو حضرت ابو طلحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" اور مجھے اپنی ساری مالیات میں سب سے زیادہ محبوب بیرحاء ہے اس لیے اب وہی میری طرف سے اللہ کے لیے صدقہ ہے، مجھے اُمید ہے کہ آخرت میں مجھے اس کا ثواب ملے گا اور وہ میرے لیے ذخیرہ ہوگا۔ لہٰذا آپ اسکے بارہ میں وہ فیصلہ فرمادیں جو اللہ تعالیٰ آپکے ذہن میں ڈالے (یعنی جو مصرف اس کا مناسب سمجھیں معین فرمادیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا واہ واہ یہ تو بڑی نفع مند اور کارآمد جائداد ہے، میں نے تمہاری بات سُن لی (اور تمہارا منشا سمجھ لیا) میں مناسب سمجھتا ہوں کہ تم اس کو اپنے ضرورتمند قریبی رشتہ داروں میں تقسیم کردو، حضرت ابو طلحہ نے عرض کیا یارسول اللہ میں یہی کروں گا، چنانچہ انھوں نے وہ باغ اپنے قریبی رشتہ داروں اور چچا زاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تشریح) بعض روایات میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ حضرت ابو طلحہ نے اپنا یہ باغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق اپنے خاص اقارب اُبی بن کعبؓ، حسانؓ بن ثابت، شدادؓ بن اوس اور نبیطؓ بن جابر پر تقسیم کر دیا تھا ــــ یہ باغ کسقدر قیمتی تھا اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ بعد میں حضرت معاویہ نے صرف حضرت حسان بن ثابت کا حصہ ایک لاکھ درہم میں خریدا تھا۔

(**فائدہ**) چونکہ آدمی کا زیادہ واسطہ اپنے عزیزوں قریبوں ہی سے رہتا ہے اور زیادہ تر معاملات انھیں سے پڑتے ہیں اس لیے اختلافات اور تنازعات بھی زیادہ تر اقارب ہی میں

ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اس دُنیا کی زندگی بھی عذاب بن جاتی ہے اور آخرت بھی برباد ہوتی ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم و ہدایت پر عمل کیا جائے اور لوگ اپنے قرابت داروں پر اپنی کمائی خرچ کرنا اللہ کی رضا کا وسیلہ سمجھیں تو دُنیا اور آخرت کے بڑے عذاب سے محفوظ رہیں، کاش دُنیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت کی قدر سمجھے اور اس سے فائدہ اُٹھائے۔

مرنے والوں کی طرف سے صدقہ :-

صدقہ کیا ہے؟ اللہ کے بندوں کے ساتھ اس نیت سے اور اس امید پر احسان کرنا کہ اس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور رحمت اور مہربانی نصیب ہوگی اور بلاشبہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا کرم و احسان حاصل کرنے کا خاص الخاص وسیلہ ہے ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی بتایا کہ جس طرح ایک آدمی اپنی طرف سے صدقہ کرکے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے ثواب و صلہ کی امید کر سکتا ہے اسی طرح اگر کسی مرنے والے کی طرف سے صدقہ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کا ثواب و صلہ اُس مرنے والے کو عطا فرمائے گا ـــــ پس مرنے والوں کی خدمت اور اُن کے ساتھ ہمدردی و احسان کا ایک طریقہ اُن کے لیے دُعا و استغفار کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ان کی طرف سے صدقہ کیا جائے یا اسی طرح ان کی طرف سے دوسرے اعمال خیر کرکے ان کو ثواب پہونچایا جائے۔ اس بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ ذیل حدیثیں پڑھیئے!

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ إِنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ أُمِّيْ أُفْتُلِتَتْ نَفْسُهَا وَأَظُنُّهَا لَوْ تَكَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ فَهَلْ لَهَا أَجْرٌ إِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْهَا؟ قَالَ نَعَمْ۔

ـــــــــــــ رواہ البخاری ومسلم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میری والدہ کا بالکل اچانک اور

دفعۃً انتقال ہوگیا اور میرا گمان ہے کہ اگر وہ موت واقع ہونے سے پہلے کچھ بول سکتیں تو وہ ضرور کچھ صدقہ کرتیں تو اب اگر میں اُن کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اس کا ثواب ان کو پہونچ جائے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہاں پہونچ جائے گا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ سَعْدَ بْنَ عُبَادَةَ تُوُفِّيَتْ اُمُّهٗ وَ هُوَ غَائِبٌ عَنْهَا فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اُمِّيْ تُوُفِّيَتْ وَ اَنَا غَائِبٌ عَنْهَا اَيَنْفَعُهَا شَيْئٌ اَنْ تَصَدَّقْتُ بِهٖ عَنْهَا قَالَ نَعَمْ قَالَ فَاِنِّيْ اُشْهِدُكَ اَنَّ حَائِطِيَ الْمِخْرَافَ صَدَقَةٌ عَلَيْهَا ــــــــ رواہ البخاری

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سعد بن عبادہ کی والدہ کا انتقال ایسے وقت ہوا کہ خود سعد موجود نہیں تھے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ میں گئے ہوئے تھے، جب ان کی واپسی ہوئی) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میری عدم موجودگی میں میری والدہ کا انتقال ہوگیا تو اگر میں اُن کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا وہ اُن کے لیے نفعمند ہوگا؟ (اور اُن کو اس کا ثواب پہونچے گا؟) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں پہونچے گا، انھوں نے عرض کیا تو میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنا باغ مخراف اپنی مرحومہ والدہ کے لیے صدقہ کردیا۔ (صحیح بخاری)

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ اَنَّ الْعَاصَ بْنَ وَائِلٍ نَذَرَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ اَنْ يَّنْحَرَ مِائَةَ بَدَنَةٍ وَاَنَّ هِشَامَ بْنَ الْعَاصِ نَحَرَ حِصَّتَهٗ خَمْسِيْنَ وَاَنَّ عَمْرًوا سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ذَالِكَ فَقَالَ اَمَّا اَبُوْكَ لَوْ اَقَرَّ بِالتَّوْحِيْدِ فَصُمْتَ وَتَصَدَّقْتَ عَنْهُ نَفَعَهٗ ذَالِكَ ــــــــ رواہ احمد

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے دادا عاص بن وائل نے زمانۂ جاہلیت میں سو اونٹ قربان کرنے کی نذر مانی تھی (جس کو وہ پورا نہیں کر سکے تھے) تو اُن کے ایک بیٹے ہشام بن العاص نے تو پچاس اونٹوں کی قربانی (اپنے باپ کی اس نذر کے حساب میں) کر دی اور دوسرے بیٹے عمرو بن العاص نے (جن کو اللہ نے اسلام کی توفیق دے دی تھی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارہ میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر تمہارے باپ ایمان لے آئے ہوتے اور پھر تم ان کی طرف سے روزے رکھتے یا صدقہ کرتے تو وہ ان کے لیے نفع مند ہوتا (اور اس کا ثواب اُن کو پہونچتا. لیکن کفر و شرک کی حالت میں مرنے کی وجہ سے اب تمہارا کوئی عمل ان کے کام نہیں آ سکتا) (مسند احمد)

(تشریح) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حدیثوں میں (اور ان کے علاوہ بھی بہت سی حدیثوں میں جو کتب حدیث کے مختلف ابواب میں مروی ہیں) یہ بات پوری صراحت کے ساتھ بیان فرمائی ہے کہ صدقہ وغیرہ جو قابل قبول نیک عمل کسی مرنے والے کی طرف سے کیا جائے یعنی اس کا ثواب اس کو پہونچایا جائے وہ اس کے لیے نفع مند ہوگا اور اس کو اس کا ثواب پہونچے گا، اس راستہ سے ہم اپنے ماں باپ اور دوسرے عزیزوں قریبوں اور دوستوں محسنوں کی خدمت ان کے مرنے کے بعد بھی کر سکتے ہیں اور اپنے ہدیے اور تحفے انکو برابر بھیج سکتے ہیں۔

آخری صفحہ

تجلیاتِ مجدّدِ الفِ ثانیؒ
مکتوبات کے آئینے میں

ترجمہ از ________ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

مکتوب ۹۱ :- مولانا طاہر بدخشی کے نام ________ [معرفت اور ایمان حقیقی کا فرق]

بعد الحمد والصلوٰۃ و تبلیغ الدعوات ____ واضح ہو کہ تمہارا مکتوب جو شیخ سجاول کے ہاتھ بھیجا تھا پہونچ گیا ____ الحمد للہ کہ تم سلامتی اور عافیت کے ساتھ ہو ____ اس مکتوب میں چند سوال تم نے کیے تھے اُن کا جواب جو کچھ معلوم ہو سکا لکھا جاتا ہے ____ اچھی طرح غور کرنا ____

ایک سوال یہ تھا کہ درمیان معرفت و ایمان حقیقی کیا فرق ہے؟ ____ اس کا جواب یہ ہے کہ معرفت (پہچان) اور چیز ہے اور ایمان، دیگر شے ہے ____ اس لیے کہ معرفت "شناختن" ہے اور ایمان "گرویدن" (مائل ہونا) ہے ____ ایک جگہ "شناختن" کا وجود ہوتا ہے مگر "گرویدن" کا وجود نہیں ہوتا ____ (چنانچہ) اہل کتاب کو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معرفت حاصل تھی اور وہ شناخت کرتے تھے کہ یہ پیغمبر ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَهُمْ (اہل کتاب پیغمبر آخر الزماں کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں) لیکن دشمنی و سرکشی کی وجہ سے چونکہ گرویدگی نہ تھی اس لیے ایمان

متحقق نہ ہو ـــ اور جس طرح ایمان کی دو قسمیں ہیں، صورتِ ایمان اور حقیقتِ ایمان اسی طرح معرفت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ (۱) صورتِ معرفت (۲) حقیقتِ معرفت ـــ صورتِ ایمان وہی ہے جس کو حضرت حق سبحانہ نے اپنی کمالِ رافت اور مہربانی سے شریعت کے اندر نجاتِ اُخروی کے لیے کافی قرار دے دیا ہے۔ یعنی صورتِ ایمان "گرویدنِ قلب" ہے، نفسِ امّارہ کے انکار و سرکشی کے موجود رہتے ہوئے ـــ اور صورتِ معرفت بھی اسی لطیفۂ قلب تک محدود ہے، نفسِ امّارہ کی جہالت کے ساتھ ساتھ، حقیقتِ معرفت یہ ہے کہ امّارہ جہالتِ جبلی سے باہر نکل آئے اور شناسائی کا مقام پیدا کر لے ـــ اور حقیقتِ ایمان بھی نام ہے امّارہ کی گرویدگی کا درجۂ شناسائی پر پہونچنے اور اپنی طبعی امّارگی و سرکشی سے نکل کر نفسِ مطمئنہ بننے کے بعد ـــ اگر سوال کریں کہ شریعت میں تصدیقِ قلبی کا اعتبار کیا گیا ہے۔ یہ گرویدن " وہی تصدیقِ قلبی ہے یا اُس کے علاوہ اور کوئی شے ہے؟ اگر یہ علاوہ تصدیق کے کوئی اور چیز ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ ایمان میں تین چیزیں معتبر منزلہ ہوں۔ (۱) اقرار (۲) تصدیق (۳) گرویدن ـــ حالانکہ یہ بات علماء کی مقرر کردہ بات کے خلاف ہے ـــ اس صورت میں عمل جس کو بعض علماء نے ایمان کے اندر اعتبار کیا ہے ایمان کا جزوِ چہارم ہو جاتا ہے ـــ جواب یہ ہے کہ "گرویدن" بالکل تصدیق ہی ہے اس لیے کہ تصدیق جو کہ حکم ہے اِذعان و یقین کے معنیٰ میں ہے، اسی کو "گرویدن" سے تعبیر کر لیا گیا ہے ـــ اگر دریافت کریں کہ جب اہلِ کتاب ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بعنوانِ نبوت جانتے تھے لامحالہ وہ آپ کی نبوت کا حکم بھی کرتے تھے اس طرح اِذعان اور گرویدن کا مقام ان کو بھی حاصل تھا اس لیے کہ اس تقدیر پر حکم، عینِ گرویدن ہے ـــ پس اُن کے حق میں ایمان کس لیے متحقق نہ ہوگا اور کس وجہ سے وہ دائرۂ کفر سے باہر نہ آئیں گے؟ ـــ جواب یہ ہے کہ وہ بعنوانِ نبوت تو جانتے پہچانتے تھے لیکن بوجہ تعصب و عناد اُن کے قلب کو اِذعان نہیں حاصل ہوتا تھا کہ وہ آپ کی نبوت پر حکم کریں فقط معرفت و تصور کا حصول تھا۔ اذعان حاصل نہیں ہوا تھا کہ تصدیق بن جاتا نیز ایمان تک پہونچاتا اور کفر سے نکالتا ـــ باریک فرق ہے۔ سنو اور

اپنے وجدانِ صحیح کی راہ پر گامزن ہو جاؤ ——

عناد و دشمنی کی موجودگی میں نبیُّ اللہ فَعَلَ کَذَا (نبی اللہ نے ایسا کیا) تو یہ کہا جا سکتا ہے لیکن جب تک اِذعان پیدا نہ ہو اِنَّہٗ نَبِیُّ اللہ (بیشک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی ہیں) یہ نہیں کہا جا سکتا —— اس لیے کہ پہلی صورت میں فقط تصور ہے اور معرفتِ مشہورہ (جو معرفت لوگوں میں مشہور ہے) کا حوالہ ہے اور دوسری صورت میں تصدیق ہے جو کہ اِذعان و گرویدن پر مبنی ہے۔ جب تک اِذعان نہ ہو تصدیق کہاں سے رونما ہوگی؟ نیز صورتِ اولیٰ میں مقصود، اثباتِ نبوت نہیں ہے، بلکہ نبی کے فعل کا اثبات ہے اور صورتِ ثانیہ میں مقصود، اثباتِ نبوت ہے جس کو جذبۂ عناد و دشمنی برداشت نہیں کر سکتا —— پس (پہلی صورت میں) اذعان کس طرح ہو سکتا ہے —— اور اگر فرض کر دو بے حصولِ اِذعان، تصدیق و حکم پیدا ہو جاتا ہے تو وہ بھی داخلِ تصورات اور (محض) صورتِ تصدیق ہے۔ جب تک اذعان نہ ہوگا اس وقت تک حقیقتِ تصدیق رونما نہ ہوگی اور ایمان حاصل نہ ہوگا —— یہ مسئلہ اصولِ مسائلِ کلام میں سے ہے اور بہت باریک مسئلہ ہے۔ بڑے بڑے علما، اس کے حل کرنے میں عاجز ہو گئے ہیں اُن میں سے بعض نے مجبوراً رکنِ ثالث کو ایمان میں بڑھایا ہے اور "گرویدن" کو زائد بر تصدیق قرار دیا ہے —— اور ایک دوسری جماعت نے بھی جس نے تصدیق کو عینِ گرویدن کہا ہے اس معمّا کو اچھی طرح حل نہیں کیا ہے اور اجمال پر اکتفا کر لیا ہے —— اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ (اللہ کی حمد ہے جس نے ہم کو اس کی ہدایت دی اگر اللہ ہم کو ہدایت نہ دیتا تو ہم راہ یاب نہ ہوتے) —— سُنو سُنو مُرکبِ اضافی جیسے نبیُ اللہ اور مُرکبِ توصیفی جیسے هٰذَا النَّبِیُّ یہ دونوں مُرکب ہر چند اس حکم کو متضمن ہیں کہ آپؐ اللہ کے نبی ہیں اور مشتمل ہیں عنوانِ نبوت کے ساتھ معرفت پر —— لیکن اس امر کی تصدیق کا حاصل ہونا کہ بیشک آپ نبی ہیں یہ اِذعان پر موقوف ہے جو کہ مُثبتِ ایمان ہے —— غلامُ زَیدٍ فَعَلَ کَذَا (زید کے غلام نے فلاں کام کیا) اور رَجُلٌ صالِحٌ حَکَمَ بِکَذَا (نیک مرد نے فلاں حکم لگایا) یہ دونوں

جلے ہے اذعان کے ثابت او صحیح ہیں اور دونوں میں عنوانِ غلامیت اور عنوانِ صلاحیت کی تعریف ثابت ہے لیکن ان میں اذعان نہیں ہے کہ ہر ایک کی غلامیت و صلاحیت کی تصدیق حاصل ہو جائے۔

مکتوب (۹۹) ۔ جناب سیادت مآب ارشاد پناہ میر محمد مومن بلخی کے نام۔

[اکابر ماوراء النہر عـــہ کے برکات کے بیان میں]

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللہَ (جس نے انسانوں کا شکریہ ادا نہ کیا اُس نے اللہ کا شکر نہیں کیا) حقوقِ علماء و مشائخ ماوراء النہر ـــــ اللہ تعالیٰ ان کی سعی مشکور کرے ـــــ ہم پسماندگان و دور افتادگان بلکہ تمام اہلِ اسلام ہندوستان کے اوپر اس قدر ہیں کہ احاطۂ تحریر و تقریر میں نہیں آسکتے ـــــ ہم نے اہلسنت و جماعت کے آرائے صحیحہ کے مطابق، درستی اعتقاد کو انھیں (ماوراء النہری) بزرگوں کی تحقیقات سے اخذ کیا ہے۔ مسلکِ علماء حنفیہ کے بموجب، صحتِ عمل کو بھی انھیں بزرگوں کی تدقیقات سے حاصل کیا ہے۔ نیز سلوکِ طریقۂ نقشبندیہ بھی اس ملک ہندوستان میں اسی سرزمین ماوراء النہر کی برکات سے ماخوذ ہے ـــــ اور مقام جذبۂ و سلوک، فناء و بقا، سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ کی تحقیق، کہ ولایت خاصہ اس سے وابستہ ہے ـــــ اسی مقام کے اکابر کے فیوض سے مستفاد ہے ـــــ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خواہ ظاہر کی اصلاح ہو یا باطن کی فلاح ہم کو اسی جگہ سے حاصل ہوئی ہے ؎ ـــــ

شکرِ فیضِ تو چمن چوں کند اے ابرِ بہار عـــہ
کہ اگر خار و اگر گل ہمہ پروردۂ تست

اللہ تعالیٰ اس علاقے کو اور یہاں کے رہنے والوں کو آفات و بلیات سے محفوظ رکھے۔ بحرمۃ سید السادات صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ

عـــہ چوں کہ ملک توران جس میں بلخ بھی ہے دریائے جیحون سے دوسری طرف واقع ہے اس لیے ایرانی ملک توران کو ماوراء النہر کہتے ہیں۔

عـــہ اے ابر بہار تیرا شکریہ چمن کس طرح ادا کر سکتا ہے۔ چمن کے خار ہوں یا گل سب تیرے ہی پرورش کیے ہوئے ہیں۔

اس فضیلت و برتری کے باوجود ـــــ وہ احباب جو اپنی بعض ضروریات کے سلسلے میں اُس دیار سے ہندوستان آتے ہیں وہاں کے بابرکت حضرات کے الطاف کریمانہ کا تذکرہ خصوصاً آنجناب کی عنایات کا جو اس احقر کے حال پر ہیں ـــــ ذکر کرتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ آنجناب کو مجھ سے حُسنِ ظن ہے اور میرے بعض علوم و معارف کو آنجناب نے مطالعہ کرکے پسند فرمایا ہے۔ بزرگوں کی اس قسم کی بشارت، باعثِ ازدیادِ امیدواری ہوجاتی ہے اور بعض اذواق و مواجید کے لکھنے کی ہمت دلاتی ہے ـــــ ان ایام میں شیخ ابوالمکارم صوفی وہاں سے آئے ہوئے ہیں انھوں نے بھی آنجناب کے الطاف اور طرح طرح کی عنایات کا اظہار فرمایا ہے ـــ بنا بریں جناب عالی کے اخلاقِ عالیہ کو پیشِ نظر رکھ کر چند کلمات کے ذریعے باعثِ دردِ سر بن کر خود کو آپ کی یادآوری کے حوالے کر رہا ہوں ـــــ اس فقیر کے بعض مسودات کی نقل برادرم خواجہ محمد ہاشم کشمی نے ـــ جو کہ فقیر کے دوستوں میں سے ہیں ـــــ صوفی ابوالمکارم مذکور کے سپرد کر دی ہے اس لیے اس پر اکتفا کرتا ہوں اور اس عریضے میں از قسم علوم و معارفِ صوفیہ، کوئی بات تحریر نہیں کر رہا ـــــ آپ حضرات کی عنایات و اشفاق سے امید ہے کہ خاص اوقات میں دعائے خیر اور دعائے سلامتی خاتمہ سے فراموش نہیں فرمائیں گے ـــــ

رَبَّنَا آتِنَا مِن لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا ؕ ـــــ

اس فقیر کی دعاہائے فقیرانہ، نجابت پناہ سید میرک شاہ، علامۃ الوریٰ مولانا حسن اور ناصر الشریعۃ حافظ الملۃ قاضی تولک ـــــ ادام اللہ تعالیٰ برکاتہم ـــــ کو پہنچا دیں ـــــ آنجناب کے صاحبزادوں سے بھی فقیر زادے التماسِ دعا کرتے ہیں ـــــ

مکتوب ۱۰۱۔ شیخ عبداللہ کے نام ـــ [مذاقِ فلاسفہ کے مطابق آیاتِ قرآن کی تفسیر و تاویل نہ کی جائے]

سلّمکم اللہ سبحانہٗ وعافاکم عن البلیات ـــــ کتاب تبصیر الرحمٰن[ع]

ع یہ کتاب علامہ علی ابن احمد شافعی مہائمی کی تصنیف ہے۔ اس کو تفسیر مہائمی بھی کہتے ہیں ـــ علامہ مہائمی اپنے زمانے کے اکابر علماء میں سے تھے اور عارف کامل تھے۔ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ ان کی اور بھی کئی تصانیف

(باقی اگلے صفحہ پر)

جو تم نے بھیجی تھی اُس کے بعض مواقع کا مطالعہ کرکے واپس بھیج دیا گیا ــــــ مکرما! ــــ اس کتاب کے مصنف، مسلک فلاسفہ کی جانب بہت میلان رکھتے ہیں۔ نزدیک ہے کہ وہ حکماء کو انبیاء علیہم السلام کے برابر کردیں ــــ (اس میں) سورۂ ہود کی ایک آیت پر نظر پڑی اس کی تفسیر بطرز حکماء مساوی کردیا ہے (وہ آیت اور تفسیر یہ ہے) "أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ باتفاق الانبیاء والحکماء الا النارُ الحسی اوالعقلی" الخ (آیت کا ترجمہ یہ ہے) یہ (کفار) وہ ہیں جن کے لیے آخرت میں سوائے نار کے کچھ نہیں ــــ تفسیر کا مفہوم یہ ہے کہ باتفاق انبیاء وحکماء اُن کے لیے آخرت میں کچھ نہیں ہے سوائے حسی یا عقلی آگ کے) ــــ اجماع انبیاء علیہم السلام کے بعد باتفاق حکماء لکھنے کی کیا گنجائش تھی؟ پھر عذاب اخروی کے سلسلے میں حکماء کے قول کا (کہ نار سے مراد نارِ حسّی نہیں بلکہ نارِ عقلی مراد ہے) کیا اعتبار ہے؟ علی الخصوص جبکہ حکماء کا قول، مخالف قول انبیاء علیہم السلام ہو ــــ فلاسفہ جو عذاب عقلی ثابت کرتے ہیں اس سے اُن کا مقصود، عذاب حسّی کا رد کرنا ہے۔ حالانکہ اجماع انبیاء، عذاب حسّی کے حق میں منعقد ہوا ہے ــــ (اس کتاب کے) دوسرے مواقع میں بھی آیتہائے قرآنی کی تفسیر موافق مذاقِ حکماء کی گئی ہے چاہے وہ اہل ملّی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو ـ ـ ـ اس کتاب کا مطالعہ (بغیر امتیازی استعداد کے) ضررہائے خفیہ

ــــــ حاشیہ صفحہ گذشتہ ــــــ

ہیں۔ غالباً معقولات کی آمیزش کی بنا پر حضرت مجددؒ کو اس تفسیر پر یہ تبصرہ کرنا پڑا۔ ورنہ اپنے رنگ میں یہ تفسیر ممتاز حیثیت رکھتی ہو۔ ربط آیات میں اس تفسیر کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ مولوی جمال الدین وزیر بھوپال کی مالی اعانت سے یہ کتاب مصر میں دو ضخیم جلدوں میں چھپ گئی ہے ــــ علامہ مہائمیؒ قوم نوائت سے تھے۔ یہ قوم حجاج بن یوسف کے زمانے میں اس کے ظلم سے تنگ آکر عرب سے ہندوستان آگئی تھی اور کوکن کے علاقے میں ساحل بحر پر آباد ہوگئی تھی اسی بنا پر اس کو کوکنی کہا جاتا ہے ــــ علامہ مہائمیؒ کی پیدائش [illegible] میں اور وفات ۲۲ جمادی الآخرہ [illegible] کو جمعہ کے دن ہوئی۔ آپ کی قبر مہائم علاقۂ بمبئی میں ہے ــــ

(نزہۃ الخواطر جلد ۳ ــــ وتذکرۂ علمائے ہند)

بلکہ مضر اثرات تخلیہ سے خالی نہیں ہے۔ اس حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتے ہوئے یہ چند کلمات لکھے گئے

مکتوب (۲۰۱) میر محمد نعمان اکبر آبادیؒ کے نام — [ترغیب مجاہدات و تربیت طالبان حق تعالیٰ کے بیان میں]

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ــــ اس طرف کے فقراء کے احوال و اوضاع لائق حمد ہیں ــــ لِلّٰہِ سُبْحَانَہٗ اَلْحَمْدُ وَالْمِنَّۃُ دَائِمًا وَعَلٰی کُلِّ حَالٍ ــــ عرصہ ہوگیا کہ تم نے اپنے احوال خیر مآل کی کوئی اطلاع نہیں دی۔ امید ہے کہ اپنی حالت میں (بہتر) تبدیلی کرلی ہوگی اور کاہلی سے عمل کی جانب اور فراغت سے مجاہدہ کی طرف متوجہ ہوگئے ہوں گے ــــ یہ وقت (نیکیوں کی) کاشتکاری کا ہے، ہوہم خور و خواب نہیں ہے ــــ آدھی رات سونے کے لیے رکھیں اور باقی آدھی رات طاعت و عبادت کے لیے مقرر کریں اگر اس کی ہمت نہیں کر سکتے تو تہائی رات کی بیداری کو لازم قرار دیں اور کوشش کریں کہ اس دولت کے حصول کی مداومت میں سستی نہ واقع ہو۔ مخلوق کے ساتھ بس اس قدر اختلاط و انبساط رکھیں کہ ان کے حقوق کی ادائگی ہو جائے۔ ضرورت کو بقدر ضرورت تک ہی رکھا جاتا ہے۔ مخلوق کے ساتھ قدر حاجت سے زیادہ تعلق رکھنا فضول بات ہے اور مالا یعنی (لغو) میں داخل ہے۔ بسا اوقات اس پر ضرر عظیم مرتب ہوتے ہیں اور یہ بات ممنوعات شریعت و طریقت میں داخل ہو جاتی ہے ــــ مرشد جب کہ مریدوں کے ساتھ حد سے زیادہ انبساط و اختلاط کا معاملہ رکھے گا یقیناً مریدوں کو عقیدت و ارادت کے دائرے سے باہر نکال دے گا اور ان کی طلب میں فتور پیدا کرے گا۔ میں اس سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں ــــ اس امر کی قباحت کو بھی طرح ذہن نشین کرکے طالبوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک رکھیں کہ ان کے انس و الفت کا سبب ہو نہ کہ ان کی نفرت کا باعث ــــ مخلوق سے یکسوئی ضروری ہے کیونکہ بغیر ضرورت مخلوق سے تعلق رکھنا سم قاتل ہے ــــ تم کو اللہ کی توفیق سے یہ بات بسہولت میسر ہے۔ بیچارے غریب و نادار کیا کر سکتے ہیں وہ تو (مجبوراً) برابر اوباش تو قد (ادھار) کے ساتھ جمع ہوتے ہیں ــــ اس نعمت کی قدر جانو اور طالبین کے حالات سے اچھی طرح خبردار رہو اور ظاہر و باطن سے ان کی تربیت کی جانب متوجہ رہو۔ زیادہ کیا لکھوں۔

شریعت کا جادۂ قویمہ شاہ ولی اللہؒ کی نظر میں

(جناب غلام مصطفیٰ صاحب قاسمی)

[حیدرآباد (پاکستان) سے الرحیم نامی ایک ماہوار مجلہ قریب دو سال سے نکل رہا ہے جس کا مقصد حضرت شاہ ولی اللہؒ کے علوم و معارف کی اشاعت ہے۔

ذیل کا مضمون اس کے فاضل مدیر کے قلم سے ہے رسالہ کی علمی افادیت کی بنا پر ہماری خواہش تھی کہ اس پر الفرقان میں تبصرہ کے ذریعہ اپنے ناظرین کو متعارف کرائیں۔ یہ تو نہ ہو سکا۔ البتہ اس مضمون کی اشاعت سے اس کے فی الجملہ تعارف کی تقریب بن رہی ہے۔

ادارہ]

شریعت کے لغوی معنی اگرچہ شاہراہ، منہاج اور پانی کا گھاٹ وغیرہ آئے ہیں لیکن اصطلاحی معنوں میں شریعت سے مراد وہ الٰہی احکامات ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ اتارا ہے تاکہ وہ لوگوں کو تاریکی سے نکال کر نور کی طرف لائے۔ اور ان کو صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرے۔

شریعت کے یہ احکامات دو قسم کے ہیں۔

۱۔ معتقدات یہ کیفیتِ اعتقاد سے تعلق رکھتے ہیں علم کلام کی تدوین ان احکام کے لیے ہوئی ہے۔

۲۔ وہ احکام جن کا تعلق کیفیتِ عمل سے ہے۔ احکام کی اس دوسری قسم کا نام فرعی اور عملی ہے۔ علم فقہ میں ان ہی احکام سے بحث کی جاتی ہے۔ احکام کی ان دو اقسام کی تفصیل میں اگرچہ اسلام کے مختلف طبقوں کا اختلاف رہا ہے لیکن اجمالی طور پر یہ سب فرقے اس

برشفق ہیں کہ شریعت نام ہے اس قانون الٰہی کا جس کو پیغمبر اسلام انسانیت کی دنیوی و اخروی فلاح و بہبود کے لیے اپنے پروردگار کی طرف سے لائے۔ اس لحاظ سے شریعت کے احکام کی اہمیت مسلم ہے۔ اور اکراہ و اضطرار کے علاوہ اس کے کسی ابدی حکم سے انحراف ناروا ہے۔

ائمہ فقہا کی طرف سے شریعت کے ماخذ اگرچہ چار بیان کیے گئے ہیں یعنی کتاب اللہ سنت، اجماع امت اور قیاس مگر سب نے اصل ماخذ کتاب اللہ کو ہی مانا ہے گویا نص صریح کے ہوتے ہوئے کسی بھی دوسری دلیل کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔ علمائے اسلام میں سے بعض محققین کی تو یہ رائے ہے کہ احادیث نبوی کا ایک حصہ خود قرآن مجید سے ہی مستنبط اور اس کے لیے بمنزلہ شرح کے ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ایک جگہ حدیث کے علوم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

ومن علومه تفسير القرآن والاستنباط منه وهو اعظم العلوم۔ دسنورد عليك منه كفافاً۔	اور حدیث کے علوم میں سے ایک علم قرآن کی تفسیر اور اس سے احکام کا استنباط ہے اور یہ بہت بڑا علم ہے۔ ہم اس سے یہاں کچھ ذکر کرتے ہیں۔
امر الله سبحانه باشياء مطلقة كالصلوٰة، والزكوٰة۔ وكقوله: سبح اسم ربك الاعلىٰ وسبح بحمد ربك وغير ذلك فوقتها رسول الله صلى الله عليه وسلم باوقات معينة۔ وامر الله بامور كقوموا وكبروا واتل ما اوحى اليك واركعوا واسجدوا فبين رسول الله صلى الله عليه	(مثلاً) اللہ پاک نے چند اشیاء کے متعلق اجمالی حکم فرمایا ہے جیسے نماز زکوٰۃ اور جیسے یہ قول باری تعالیٰ کہ تو اپنے بلند پروردگار کے نام سے تسبیح پڑھ اور اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کہہ اسی طرح دوسری کئی آیات ہیں۔ اسکے بعد پیغمبر علیہ السلام نے اسکے لیے اوقات معین فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے قیام تکبیر تلاوت قرآن، رکوع اور سجدہ کا حکم فرمایا ہے۔ پیغمبر علیہ السلام

وسلم انہا ارکان الصلوٰۃ۔	نے ان کو اس طرح بیان فرمایا کہ ان سب احکام کو نماز کے ارکان بتائے۔

اسی جگہ آیات قرآنی کی چند دوسری مثالوں کے ذکر کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

ونحن قد تتبعنا جمیع ما	اور کتاب الصلوٰۃ میں جتنی احادیث وارد
وصل الینا من الاحادیث	ہمیں ملی ہیں، ان میں غور و فکر کرنے
الواردۃ فی کتاب الصلوۃ	کے بعد ہمیں یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ سب
فوضح لنا انہا مستنبطۃ کلھا	احادیث حکمی استنباط کے ساتھ کتاب اللہ
من کتاب اللہ سبحانہ وتعالیٰ	سے ماخوذ اور مستنبط ہیں اور ہم اس موضوع
استنباطاً حکمیا وعسیٰ ان نخطہ	پر ایک جامع اور مستقل رسالہ لکھنے کا خیال
فی رسالۃ منفردۃ[1]	رکھتے ہیں۔

پہلی صدی ہجری کے اواخر اور دوسری صدی کے اوائل میں جب اسلامی حکومت کا دائرہ وسیع ہوا۔ اور اس کے ساتھ نئے واقعات و مسائل بھی درپیش آئے تو امت محمدیہ کا ایک طبقہ جن کو "مجتہدین" کہا جاتا ہے اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اپنی علمی کوششیں شروع کیں۔ ان کو احکام کی علل تلاش کرنا پڑیں جنھیں شارع علیہ السلام نے بصراحت یا بدلالت فرمایا تھا۔

اس سلسلہ میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

ان من جملۃ احکام الشرع	من جملہ احکام شریعت کے ایک یہ ہے
انہ صلی اللہ علیہ وسلم عھد	کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت
الی امتہ صریحا اودلالۃً انہ	کو بصراحت یا بدلالت یہ ارشاد فرمایا کہ
متی اختلف علیھم نصوصہ	جب ان میں آپ کے منصوص احکام
او اختلف علیھم معانی نص	کے بارے میں اختلاف ہو یا آپ کی نصوص
من نصوصہ فھم مامورون	میں سے کسی نص کے معنی میں وہ باہم
بالاجتھاد واستفراغ الطاقۃ	مختلف ہوں تو ان کو حکم ہے کہ اجتہاد

[1] الخیر الکثیر (عربی) ص۶۲ مطبوعہ مجلس علمی

فی معرفۃ ما ھو الحق من	کریں اور ان اختلافی احکام اور معانی
ذلک[1]	میں سے امر حق معلوم کرنے میں خوب
	طبیعت کا زور لگائیں۔

یہی وجہ ہے کہ جمہور علماء کی یہ متفقہ رائے ہے کہ جس حکم شرعی کو مجتہد اپنی کوشش اور اجتہاد سے استنباط کرتا ہے، وہ شارع علیہ السلام کی طرف منسوب ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مبارک سے لیا گیا ہو، یا وہ اس علت کی طرف منسوب ہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے ماخوذ ہے۔

شاہ صاحب کے الفاظ میں اسے یوں زیادہ صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔

کل حکم یتکلم فیہ المجتھد	جس حکم میں مجتہد اپنے اجتہاد سے گفتگو کرتا ہو، وہ
باجتھادہ منسوب الی صاحب	شارع علیہ الصلوات والتسلیمات کی طرف منسوب
الشرع علیہ الصلوۃ والتسلیمات	ہوتا ہو خواہ آپ کے الفاظ مبارک کی طرف منسوب
اما الی لفظہ او الی علۃ ماخوذۃ	ہو یا اس علت کی طرف جو آپ کے الفاظ
من لفظہ[2]	سے لی گئی ہے۔

جب ان مجتہدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مساعی جمیلہ سے شریعت کے مسائل اور احکام مدون ہو چکے، تو ان سے بلاضرورت باہر جا کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا فتنہ کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے۔ شاہ صاحب نے ان مجتہدین کے مذاہب اختیار کرنے کی تاکید اور ان کو چھوڑنے اور ان سے باہر جانے کی ممانعت کے بارے میں ایک جگہ ایک باب باندھا ہے جس کے شروع میں وہ فرماتے ہیں:۔

اعلم ان فی الاخذ بھذہ المذاہب	جاننا چاہیے کہ ان چاروں مذہبوں
الاربعۃ مصلحۃ عظیمۃ و	کے اختیار کرنے میں ایک بڑی مصلحت
فی الاعراض عنھا کلھا مفسدۃ	ہے اور ان سب کے سب سے روگردانی
کبیرۃ ونحن نبین ذلک	کرنے میں بڑا فساد ہے اور ہم اس بات

[1] عقد الجید تالیف شاہ ولی اللہ صفحہ ۳۰ مطبوعہ مجتبائی [2] عقد الجید صفحہ ۲۹

بوجوہ [1]   کو کئی وجہوں سے بیان کرتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے ان وجوہ کی تفصیل کے بعد علامہ ابن حزم اندلسی کے "تقلید کو حرام قرار دینے" پر مبسوط رد فرمایا ہے۔

اسلام کے اوائل دور سے لے کر تیسری اور چوتھی صدی تک شریعت کے بارے میں بڑا اہتمام رہا اور اس سلسلے میں اجتہادی رنگ کی تعلیم بھی جاری رہی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس اپنے صحابہ کو دینی مسائل کی علمی اور عملی تعلیم فرماتے تھے۔ آپ کے کچھ صحابہ تو ایسے عظیم مجتہد اور قانون شریعت کے بڑے عالم نکلے کہ آپ کے عہد مبارک میں بھی وہ فتویٰ دیا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اللہ کو پیارے ہو گئے تو دوسرے صحابہ ان فقہاء صحابہ ہی کی طرف شرعی مسائل میں رجوع کرتے تھے۔ پھر تابعین نے صحابہ سے شریعت کی تعلیم حاصل کی اور اس طرح یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا۔

مدینہ منورہ چونکہ مہبط وحی تھا۔ پھر تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کے آخری دور تک جمہور صحابہ کا مسکن اور مقر مدینہ طیبہ ہی رہا اس لیے مدینہ منورہ کے کئی تابعی بزرگوں نے فقہ و حدیث کے متعلق صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے جو متعدد روایتیں اور اقوال منقول تھے ان کو جمع کرنے کی کوشش کی۔ مدینہ منورہ میں سات فقہا ایسے ہوئے جنہوں نے فقہ میں عظیم مرتبہ حاصل کیا۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اگرچہ صحابی تھے لیکن اپنے والد بزرگوار فاروق اعظمؓ کے فیصلوں کے متعلق فقہائے سبعہ میں سے ایک فقیہ سعید بن مسیب سے دریافت کرتے تھے کیونکہ سعید بن مسیب کو صحابہ کے فیصلوں پر بڑی دسترس تھی [2]۔ ان سات فقہا کے علوم اور مسائل امام مالکؒ کے اساتذہ اور مشائخ تک پہونچے، جن کو امام دار الہجرہ مالک نے جمع کیا اور ترتیب دے کر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اس طرح یہ مذہب ان کی طرف منسوب ہوا جس کو بڑے بڑے علماء دلائل کی بنا پر قرناً بعد قرن مانتے آئے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

لانها دار المدينة) ماوىٰ   اور یہ اس لیے کہ مدینہ طیبہ ہر عہد اور

---

[1] عقد الجید ص۲۱ [2] مقالات الکوثری ص۱۲۰ مطبوعہ مصر

الفقہاء ومجمع العلماء فی	ہر زمانہ میں فقہائے اسلام اور علماء
کل عصر ولذلک تری	کا ملجا و ماویٰ اور مرکز رہا ہے اور یہی
مالکا یلازم مجتہدہم[1]	وجہ ہے کہ امام مالک ان کے طریق کو
	نہیں چھوڑتے۔

باقی مذاہب کو بھی اسی پر قیاس کر لیجیے۔ شلا کوفہ جس کی بنیاد حضرت فاروق اعظم نے رکھی اور ان کے ارشاد کے مطابق عرب کے مختلف قبائل وہاں بسائے گئے، اور جن کی تعلیم کے لیے فاروق اعظم نے حضرت عبداللہ بن مسعود کو کوفہ کی طرف یہ کہہ کر روانہ فرمایا۔ اے اہل کوفہ! عبداللہ بن مسعود جیسے فقیہہ کی تو مجھے بھی ضرورت تھی لیکن میں اپنے اوپر تمہیں ترجیح دے کر اسے تمہاری طرف بھیج رہا ہوں۔

جملہ کتب حدیث اور کتب طبقات عبداللہ بن مسعود کی عظمت شان سے مملو ہیں۔ آپ کے مخصوص تلامذہ میں سے علقمہ بن قیس، اسود بن یزید، عمرو بن میمون، ربیع بن خیثم اور مسروق شمار کیے جاتے ہیں۔ .... یہ سب بالعموم اور علقمہ بالخصوص حضرت ابن مسعود کے فیض صحبت سے بہت زیادہ مستفید ہوئے۔ بقول علامہ ذہبی یہ کسی دوسرے صحابی کو علم میں ان پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود خلافت فاروق اعظم سے لے کر حضرت عثمان کی خلافت کے آخری دور تک کوفہ میں فقہ اور شریعت کی تعلیم دیتے رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہر کوفہ فقہاء سے بھر گیا اور جب حضرت علیؓ نے اپنے دارالسلطنت کو کوفہ کی طرف منتقل کیا تو وہ کوفہ میں فقہا کی کثرت کو دیکھ کر بڑے خوش ہوئے اور فرمانے لگے۔

رحم اللہ ابن ام عبد (ابن	اللہ ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود)
مسعود) قد ملاء هذا القرية	پر رحمت فرمائے تحقیق اس نے اس
علما[2]	شہر کو علم سے مالا مال کر دیا۔

اس کے بعد سیدنا علیؓ کے علوم سے بھی اہل کوفہ مستفید ہوتے رہے۔ پھر تو یہ شہر کثرت فقہا،

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ صہ ۱۲۵ طبع مصر۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ا صہ ۱۲ طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن

محدثین و مفسرین اور علوم لغت عربیہ کے لحاظ سے جملہ بلاد اسلامیہ میں بے مثال شہرت کا مالک بن گیا، اور اس کے حضرت علیؓ کے دار الخلافت بننے سے بڑے بڑے فقہا نے اس میں سکونت اختیار کی، اور اس شہر کی علمی وقعت بہت بڑھ گئی۔ صرف کوفہ میں بروایت عجلی پندرہ سو صحابہ کرام نے سکونت اختیار فرمائی تھی۔ اور وہ صحابہ ان کے علاوہ ہیں جو کوفہ کے گرد و نواح یا عراق میں سکونت پذیر ہوئے۔

اب اگر سیدنا علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کے تلامذہ کی فہرست تیار کی جائے تو اس کے لیے ایک ضخیم دفتر چاہیے۔ یہ تو سب ائمہ حدیث کے ہاں مسلم ہے کہ صحابہ کرام عبداللہ بن مسعودؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے مشابہت رکھنے والے سمجھتے تھے۔ بالکل اسی طرح ابن مسعودؓ کے مخصوص شاگرد علقمہ کے متعلق تابعین کی یہ رائے تھی کہ وہ عبداللہ بن مسعودؓ کی سیرت کے حامل ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ان تلامذہ کی تعلیم اور تربیت سے ابراہیم نخعی، ابو اسحاق سبیعی، اعمش اور منصور جیسے ائمہ پیدا ہوئے۔

حافظ ذہبی، ابو داؤد سجستانی کے تذکرے میں بعض ائمہ سے نقل کرتے ہیں کہ ابراہیم نخعی سیرت میں علقمہ سے مشابہت رکھتے تھے۔ علقمہ عبداللہ بن مسعود سے اور عبداللہ بن مسعودؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہت رکھتے تھے۔ نقادان حدیث نے تو ابراہیم نخعی کے مراسیل کو بھی صحیح مانا ہے۔ امام شعبی کے متعلق حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ رائے بھی سن لیجیے۔

ھو احفظ لھا منی وان کنت	یعنی شعبی مغازی کو مجھ سے زیادہ یاد رکھنے
قد شھدتھا مع رسول اللّٰہ	والا ہے اگرچہ میں ان مغازی میں آنحضرت
صلی اللّٰہ علیہ وسلّم	صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا۔

اس جماعت فقہا کی صحبت اور تربیت سے امام ابو حنیفہ پیدا ہوئے۔ ان فقہا کے آثار کو امام ابو حنیفہ کے دو بڑے شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد نے جمع کیا اور کچھ آثار مصنف ابن ابی شیبہ میں مدون ہوئے۔ امام ابو حنیفہ نے اس طریقہ میں ایک اور تحقیقی اضافہ کیا اور وہ یہ کہ ان ائمہ فقہاء کے آراء اور علوم کو چالیس تلامذہ (جو کہ بذات خود بہت بڑے فقہا تھے) کی مجلس شوریٰ کے سامنے بحث و تمحیص کے لیے رکھا اور بحث و تحقیق کے بعد جو رائے متفقہ یا کثرت آراء

سے منظور کی جاتی تھی اس کو مدون کیا جاتا تھا. اور پھر یہ سب آراء امام محمدؒ کی کتب ظاہر الروایۃ میں مدون ہو گئیں. خطیب بغدادی ابن کرامہ کی سند سے لکھتے ہیں کہ ہم ایک دن وکیع کے ہاں بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے کسی مسئلے کے متعلق یہ کہا کہ ابوحنیفہ نے اس میں خطا کی. یہ سن کر وکیع فرمانے لگے کہ ابوحنیفہ کیسے خطا کر سکتے ہیں. حالانکہ ان کے پاس ابو یوسف اور زفر جیسے قیاس کے ماہر تھے یحییٰ بن ابی زائدہ اور حفص بن غیاث جیسے حفاظ حدیث تھے قاسم بن معن جیسے لغت عربیہ کے ماہر تھے، اور داؤد طائی اور فضیل بن عیاض جیسے زاہد اور متورع تھے جس شخص کے اس قسم کے ہم نشین ہوں وہ خطا نہیں کریں گے اور اگر خطا کرتے تو یہ سب اس کی تردید فرماتے۱؎ امام ابوحنیفہ کے بعد امام شافعیؒ آتے ہیں. انھوں نے مدینہ طیبہ اور کوفہ کے علوم کے ساتھ مکہ مکرمہ کے علوم کو ملا دیا. امام شافعی نے مکہ کے علوم کو مسلم بن خالد سے حاصل کیا. انھوں نے ابن جریج سے اور ابن جریج نے عطاء سے اور عطاء نے ابن عباس سے یہ علوم حاصل کیے. یہاں تک تو ائمہ اہل سنت کے مذاہب فقہ کے متعلق مختصر عرض کیا گیا. ظاہر ہے کہ جملہ مذاہب فقہ قرآن و سنت سے استدلال کرتے ہیں اور اجتہادی مسائل میں ہر ایک امام کا طرز استنباط دوسرے سے الگ ہے. اس میں طبائع اور خطوں کے اختلاف کو بھی بڑا دخل ہے، جس کی علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ تاریخ میں تصریح فرما دی ہے لیکن آج کا دور ان اختلافات اور امت کے تشتت و افتراق کا متحمل نہیں ہو سکتا، چاہے ہم نئے دور کے تقاضوں سے کتنی ہی چشم پوشی کریں اور ان سے آنکھیں بند کر لیں اور کوشش کریں کہ انھیں نہ دیکھیں لیکن حقیقت اپنی جگہ حقیقت ہو گی اور ہماری اس چشم پوشی سے قوم کا نوجوان طبقہ کبھی مطمئن نہیں ہو گا. یہی وجہ ہے کہ طبقہ علماء میں سے بصیرت اور غائر نظر رکھنے والے علماء نے اس ضرورت کو محسوس کیا ہے، ہمارے بزرگ دوست اور وقت کے محدث مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے اس سلسلے میں پہل فرمائی ہے. جزاہ اللہ خیر الجزاء.

شاہ ولی اللہ صاحب کی مولفات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ موصوف اپنے دور میں ان اختلافات سے خوش نظر نہیں آتے اور جیسے موصوف نے تصوف کے مختلف مشارب میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش فرمائی. اسی طرح فقہی اختلافات کو کم کرنے کے بھی وہ بڑے کوشاں تھے.

۱؎ تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۴۷

آپ کی تصنیفات میں تطبیق کا یہ پہلو اکثر نظر آئے گا۔ اس لیے آپ کو شریعت کے "جادۂ قویمہ" کے تعین کے لیے بھی سوچنا پڑا اور آپ نے اس سلسلہ میں اپنی مشہور تالیف تفہیمات الٰہیہ میں جو تحقیق فرمائی ہے اس کو ہم قارئین کے لیے پیش کرتے ہیں یہاں طوالت سے اجتناب کرتے ہوئے اصل عبارت کو چھوڑ کر صرف ترجمہ پر اقتصار کیا جاتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

"دنیا کا مختلف طرق اور مذاہب میں بٹ جانا اور امت کا گروہ در گروہ ہونا ایک ایسا بڑا سانحہ ہے جس نے امت کے عوام اور خواص دونوں کو ڈرا دیا ہے۔ بعض اہل اللہ پر فقہائے اسلام کے ہر قول کا ارتباط شریعت محمدیہ سے منکشف تو ہوا لیکن اس کے لیے اس جادۂ قویمہ کا انکشاف نہ ہوا جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے منکشف کیا اور اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوئے۔ (اصل میں) جس کو یہ طریقہ ہاتھ آیا اس نے حظ وافر پایا اور جس نے اس کو نہ پایا وہ اس حظ وافر کے حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ اگرچہ تکلیف اٹھانے کی وجہ سے وہ بھی ماجور ہوگا۔ اس قسم کے اہل اللہ فقہا کے بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دینے کے بارے میں خاموش رہے اور مختلف اقوال کے درمیان تطبیق دینے کی یہ صورت نکالی کہ اختلاف کو عزیمت اور رخصت پر حمل کیا (اور یہ کہا کہ) جو شخص عزیمت کی ادائیگی پر قوت رکھتا ہے تو عزیمت پر عمل کرے اور جس کی قوت جسمانی یا قوت روحانی اس کا تحمل نہیں کر سکتی تو وہ رخصت کو اختیار کرے۔ شعرانی نے (اپنی کتاب) میزان میں اس کو مفصل بیان کیا ہے۔ اور شعرانی سے پہلے اس اصل اور قاعدے کی طرف شیخ محی الدین محمد بن علی بن عربی نے سبقت فرمائی ہے۔

کچھ اہل اللہ ایسے بھی گزرے ہیں کہ ان کو شریعت کا وہ جادۂ قویمہ نظر آیا جو کہ ظاہر شریعت کی طرف رہنمائی کرتا ہو اور وہ طریقہ جس کو جمہور مسلمانوں نے کبار تابعین سے اور تابعین نے کبار صحابہ سے اور صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح حاصل کیا ہے جیسے کوئی چیز ہاتھ کے ذریعہ لی جائے۔ یا اگرچہ وہ بعینہ متوارث نہ ہو لیکن متوارث سے قوی مشابہت رکھتی ہو اور ایسے شخص کو اہل الرائے کے مذاہب کناروں کی طرح نظر آئے پھر اس بحث کنندہ متکلم دین کی نصرت اور اس سے مدافعت کا خیال کرتے ہوئے (اپنے زعم میں) راجح کو ترجیح دیتے رہے۔ یہ طریقہ اکثر محدثین کا ہے، انھوں نے اس میں بڑی سعی فرمائی۔

کچھ اہل اللہ ایسے بھی ہیں جن کو (مذکورہ) دونوں باتوں پر اطلاع ہوئی۔ انھوں نے سب مذاہب کو اس طرح مانا کہ سب شریعت کے دائرہ میں داخل ہیں اور ان پر عمل کرنے کی دین میں گنجائش ہے مگر ان میں سے فضیلت جادۂ قویمہ کو ہے۔ اور یہی طریقہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کامل طور پر مرضی اور پسندیدہ ہے۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: میرے اوپر اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ ہے کہ مجھے اس نے تیسری جماعت میں سے بنایا۔ اور میرے لیے شریعت کی اصل اور تبیان کو منکشف فرمایا۔ یہ تبیان وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لتبین للناس ما نزل الیھم یعنی تم لوگوں سے اس کو بیان کرتے رہو جو کہ لوگوں کی طرف اترا ہے۔

اس کی مثال اس طرح سمجھیے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اقیموا الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ یعنی نماز قائم کرو۔ اور زکوٰۃ دیا کرو۔ اقامت کا لفظ "قامت السوق" کے عربی محاورے سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں بازار لگ گیا۔ یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب بازار میں خرید و فروخت شروع ہو جائے۔ اس سے یہاں مقصد ہے رواج اور اشاعت۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقصد ترویج کو اس طرح بیان فرمایا کہ اوقات نماز کی تعیین فرمائی۔ رکعات نماز کے عدد بتلائے صفت (یا ہیئت) نماز کی تعلیم فرمائی۔ اذان کو مشروع فرمایا۔ جماعت سے نماز پڑھنے کی تاکید فرمائی۔ مساجد کی تعمیر اور ان میں حاضر ہونے کو مستحب قرار دیا۔ یہ تمام چیزیں "اقامت صلوٰۃ" کی تبیان اور تفسیر ہیں۔ اگر اس طرح واضح اور مفصل بیان نہ ہوتا تو ہم اس کو کبھی سمجھ نہ سکتے اسی طرح زکوٰۃ دینے کو اس طرح بیان فرمایا کہ نصاب کی تعیین کی اور مقدار واجب، جنس واجب اور دوسری چیزوں کو واضح فرمایا۔

اس کے بعد پھر اس تبیان اور تفسیر کی وضاحت اور تفسیر صحابہ اور تابعین کی طرف سے ہوئی۔ اسی کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح اشارہ بھی فرمایا۔ اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر۔ یعنی میرے بعد ابوبکرؓ اور عمرؓ کی پیروی کریں اور یہ فرمایا: اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم۔ میرے صحابہ ستاروں کی طرح (روشن) ہیں جس کسی کی پیروی کرو گے تو راستہ پاؤ گے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

سفر میں نماز کو قصر فرمایا۔ سفر ہمارے ہاں مبہم چیز تھی، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے عمل سے اس کی وضاحت ہو گئی کہ وہ چار برد یا منازل سے عبارت ہے۔

اس کے بعد پھر قدمائے مجتہدینؒ کے ہاتھوں اس کی وضاحت اور اس کے اصول اور فروع کی تدوین ہوئی۔ جس کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

اذا قمتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق الاٰیۃ

اس آیت میں صرف تین اعضاء کے دھونے اور چوتھے کے مسح کا ارشاد ہے۔ یعنی چہرہ ہاتھ کہنیوں تک اور پاؤں کو ٹخنوں تک دھویا جائے اور سر کا مسح کیا جائے۔ اب مجتہدین نے اس میں اس طرح بحث کی کہ غسل کے معنی ہیں صرف پانی کا بہانا یا اس میں دلک بھی شرط ہے اور وجہ یا چہرے کی حد فلاں جگہ سے فلاں تک ہے۔ اور "الی المرافق" کے معنی ہیں "مع المرافق" یعنی کہنیوں کے ساتھ۔ اور مسح میں صرف مسح کا نام کافی ہے، اگرچہ ایک یا دو بال پر ہی ہو یا ربع راس (چوتھائی سر) پورے سر کا مسح ضروری ہے۔ (اس طرح یہ مذاہب وجود میں آئے اسکے بعد ہر مذہب کے پیروکار متاخرین فقہا نے ائمہ مذاہب کے قواعد کو سامنے رکھ کر ان سے دوسرے مسائل کی تخریج کی اور ان مذاہب کی شرح بیان فرمائی۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ میرے لیے یہ تمام چیزیں جس طرح نفس الامر میں اپنی ترتیب سے واقع ہیں، اس طرح واضح کی گئی ہیں جیسے کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، اور دین میں جو بھی کچھ کہا گیا ہے اس کو میں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اصل شریعت میں پایا۔ مذاہب کے اس اختلاف کے متعلق یہ گفتگو کتنی صادق آتی ہے کہ اس کی مثال ایک درخت کی ہے جس سے بڑی بڑی ٹہنیاں پھوٹیں۔ پھر ان ٹہنیوں سے دوسری چھوٹی ٹہنیاں نکلیں اور ٹہنیوں پر پتے اور پھول نکل آئے۔ یا اس کی مثال ایک ایسے پانی کے چشمے کی ہے جس سے بڑی نہریں نکلیں اور بڑی نہروں سے دوسری چھوٹی چھوٹی نہریں نکلیں اور ان چھوٹی نہروں سے برتنوں کو بھرا گیا۔ اور اس سے زمین بھی سیراب ہو گئی۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں (کہ جادۂ قویمہ کے سلسلہ میں) میرے لیے شاہراہ اور وسط طریق کا بھی انکشاف ہوا (جس کی رات بھی) اس کے دن کی طرح روشن ہے۔ اس کا اول آخر کی طرح ہے اور ان مخفی اور مٹے ہوئے آثار کے راستے بھی معلوم ہوئے۔ جن پر چل کر آنحضرت صلعم

اور ان کے صحابہ کے راستے تک کبھی رسائی نہیں ہوتی۔ جب تک رائے سے کام نہ لیا جائے اور
اوہام اور ایسے شخص کی تقلید کے بارے آزاد نہ ہو جو خطا اور ثواب کا حامل ہے اور اس کے
صحیح اور غلطی قول سے تخریج ہوتی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ جب رائے سے کام لیا جائے اور اوہام اور
ایسے شخص کی تقلید کا بوجھ اٹھایا جائے جو خطا اور ثواب کا صاحب ہو اور پھر معیب اور غلطی
کے قول پر تخریج کا بوجھ اٹھانا پڑے۔

ہمارے لیے اس رائے کی حقیقت بھی حکشف کی گئی جس کی سلف نے مذمت کی ہے اور
چند فقہاء کو اس کی طرف منسوب کیا ہے۔

روزہ

ایک تقریر جو گزشتہ رمضان میں کی گئی تھی

از جناب وحید الدین خاں صاحب

رمضان کا مہینہ روزے کا مہینہ ہے۔ اس مہینے کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ "یہ ایک ایسا مہینہ ہے جس کا پہلا حصہ رحمت ہے، اس کا دوسرا حصہ مغفرت ہے اور اس کا آخری حصہ آگ سے نجات دیتا ہے" اس وقت ہم اسی مبارک مہینے سے گزر رہے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کے لیے موقع ہے کہ وہ اس مہینے کی سعادتوں کو حاصل کرے۔ خوش نصیب ہے وہ جس کے حق میں حدیث کے یہ الفاظ پورے ہوں، اور اس مہینے کی رحمتوں اور برکتوں میں اس کو پورا پورا حصہ ملے! ایسا شخص حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق عنقریب اُن سے اس طرح نکلے گا کہ دوزخ، اس پر حرام کر دی گئی ہوگی اور جنت اس کے لیے واجب ہو چکی ہوگی۔ اللہ ہم سب کو اپنے ان خوش نصیب بندوں میں شامل فرمائے۔

روزہ کے لیے اسلام میں "صوم" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ صوم کے معنی ہیں ٹھہرنا، رک جانا۔ عربی میں کہتے ہیں صامت الریح (ہوا رک گئی)، ماء صائم (ٹھہرا ہوا پانی) لغت کے ایک عالم لکھتے ہیں:۔

الصوم ۔ فی الاصل الامساک عن الفعل	صوم کا اصل مطلب ہے رکنا۔ خواہ یہ رکنا
مطعما کان او کلاما او مشیا ولذلک	طعام سے ہو یا کلام سے یا چلنے پھرنے سے
قیل للفرس الممسک عن السیر او العلف	چنانچہ جس گھوڑے کا چارہ اور سفر
صائم، قال الشاعر	(برائے تربیت) روک دیا جائے تو اس
خیل صیام واخری غیر صائمة	کو صائم گھوڑا کہتے ہیں۔

شریعت کی اصطلاح میں روزہ ایک ایسے عمل کا نام ہے جب بندہ خدا کے حکم سے صبح صادق سے غروب آفتاب تک کھانا پینا اور بعض دوسری اپنی خواہشات مطلقاً ترک کر دیتا ہے۔ چھوڑنے اور ترک کرنے کا یہ عمل کس لیے ہے، اس کا مقصد قرآن مجید میں یہ بتایا گیا ہے:-

کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین	اے مسلمانوں تم پر روزے فرض کیے گئے
من قبلکم لعلکم تتقون۔	جس طرح وہ پچھلی امتوں پر فرض کیے گئے تھے
بقرہ ۱۰۳	ــــــ تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ روزہ کی عبادت اس لیے مقرر کی گئی ہے تاکہ ہم میں تقویٰ کی صفت پیدا کی جائے۔ تقویٰ کے معنی ہیں بچاؤ، پرہیزگاری، اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ان چیزوں سے بچ کر زندگی گزاری جائے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں، جو اللہ کو غضبناک کرتے ہیں، جو اللہ سے دور کرنے والے ہیں ایسے اعمال سے پرہیز کرنے کا نام تقویٰ ہے۔ یہاں میں ایک روایت نقل کروں گا جس سے تقویٰ کی حقیقت سمجھنے میں مدد ملتی ہے:-

عن عمر بن الخطاب رضی اللہ	حضرت عمر فرماتے ہیں کہ انھوں نے حضرت ابی
انہ سأل ابی بن کعب عن	بن کعب سے پوچھا، تقویٰ کیا ہے؟ انھوں نے
التقویٰ فقال لہ اما سلکت طریقا	جواب دیا کیا آپ ایسے راستہ سے نہیں گزرے
ذاشوک؟ قال بلیٰ، قال فما	ہیں جہاں کانٹے دار جھاڑیاں ہوں، فرمایا،
عملت، قال شمرت واجتھدت،	ہاں گزرا ہوں، انھوں نے پوچھا پھر اس وقت
قال ذلک التقویٰ۔	آپ نے کیا کیا، فرمایا میں نے اپنے کپڑے
تفسیر ابن کثیر جلد اول صفحہ ۴۰	سمیٹ لیے اور اس سے بچتا ہوا گزر گیا۔ انھوں
	نے کہا، اسی کا نام تقویٰ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا کا یہ راستہ جس سے گزر کر ہمیں اپنے رب تک پہونچنا ہے، اس میں ہر طرف ہمارے امتحان کے لیے حرام اور ناجائز چیزوں کی جھاڑیاں اپنے کانٹے اور شاخیں پھیلائے ہوئے ہیں، ہماری بہترین عقلمندی یہ ہے کہ ہم ان جھاڑیوں سے بچتے ہوئے اس راستے سے گزر جائیں۔ اگر ہم ایسا کر سکے تو گویا کہ ہم نے تقویٰ کی زندگی پالی۔

اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ روزہ ہمیں کس طرح رکھنا چاہیے۔ روزہ رکھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ کھانا پینا چھوڑنے کے ساتھ ہم نے تمام غلط باتیں بھی چھوڑ دی ہوں جس طرح ہم روزہ توڑنے والی چیزوں سے بچتے ہیں اسی طرح ہم ان چیزوں سے بچیں جو ایمان خراب کرنے والی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے:۔

من صام رمضان وعرف	جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کی حدود
حدوده وتحفظ مما ينبغي له	کو پہچانا اور ان باتوں کا لحاظ رکھا جن کا اسے لحاظ
ان يتحفظ كفر ما قبله	رکھنا چاہیے اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے
(ترغیب وترہیب)	جائیں گے۔

جس طرح رمضان میں ایک مہینے کے لیے اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے کہ آپ دانہ پانی منھ میں نہ ڈالیں اسی طرح سال بھر اور ساری عمر کے لیے اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ آپ برے کام اور غلط کارروائیاں نہ کریں ــــــ کچھ الفاظ ہیں جن کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ آپ ان کو اپنی زبان سے نہ نکالیں، کچھ مناظر کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ آپ اسے اپنی آنکھ سے نہ دیکھیں، کچھ آوازوں کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ آپ اسے اپنے کان سے نہ سنیں، کچھ چیزوں کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ آپ کے ہاتھ ان کو نہ چھوئیں، کچھ راستوں کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ آپ کے پاؤں ان پر نہ چلیں، کچھ باتوں کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ آپ کے دل و دماغ میں جگہ نہ پائیں ــــ غرض آپ کے ہر عضو اور پورے وجود سے وہ کچھ چیزوں کا روزہ رکھوانا چاہتا ہے۔ اور رمضان میں آپ کا کھانے پینے کا روزہ اسی وقت مکمل ہوگا جب آپ دوسرے مہینوں کے دوسرے روزے بھی رکھ رہے ہوں۔ جو سال بھر روزہ دار رہتا ہے وہی رمضان کے روزے کو پاتا ہے، جو دوسری منع کی ہوئی چیزوں سے رکا رہتا ہے، اسی کا کھانے پینے سے رکنا مقبول ہوتا ہے۔

روزہ اولاً اسی قسم کی نیچ بچاؤ والی زندگی کی تربیت ہے۔ ایک مہینہ کے لیے چند عادی اور ضروری چیزوں کو محدود وقت میں اللہ کی رضا کے لیے چھڑا کر ہمیں یہ سبق دیا جاتا ہے کہ اسی طرح ہم ساری زندگی میں ان تمام چیزوں کو چھوڑ دیں جو ہم کو خدا کی ناراضی کی طرف لے جانے والی ہوں۔ وہ تمام چیزیں جن کو خدا نے حرام قرار دیا ہے یا ان سے منع فرمایا ہے، مسلمان کو ان سے عمر بھر کے لیے روزہ رکھ لینا ہے۔ اور کبھی ان کے قریب نہیں جانا ہے۔ ایسا شخص جس نے روزہ رکھ کر کھانا پینا چھوڑ دیا ہو، مگر اسی کے

ساتھ وہ بری عادتیں نہ چھوڑی ہوں، جن کے لیے خدا کی شریعت میں کھلی مخالفت موجود ہے، تو اس نے گویا روزہ رکھا ہی نہیں۔ حدیث میں آیا ہے:

لیس الصیام من الاکل والشرب انما الصیام من اللغو والرفث۔	روزہ صرف کھانا اور پینا چھوڑنے کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ لغو اور بیہودہ گوئی کو بھی چھوڑنے کا نام ہے۔

دوسری حدیث ہے:

من لم یدع قول الزور والعمل به فلیس للہ حاجۃ فی ان یدع طعامہ وشرابہ۔	جس نے جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے۔

ایک شخص اگر ایک طرف روزہ رکھتا ہے اور اسی کے ساتھ جھوٹ، گالی، غیبت، چوری اور دوسرے برے کاموں میں بھی پڑا رہتا ہے تو ایسا شخص حقیقۃً روزہ دار نہیں ہے۔ اس قسم کا روزہ حدیث کے الفاظ میں "خدا کی جائز کی ہوئی چیز سے روزہ رکھنا اور اس کے بعد خدا کی حرام کی ہوئی چیز سے افطار کر لینا ہے" چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک بار آپ نے دیکھا کہ روزے کے زمانے میں ایک شخص پچھنے لگانے والے سے پچھنے لگوا رہا ہے۔ دونوں روزہ رکھے ہوئے تھے۔ اور اسی کے ساتھ دونوں کسی کی غیبت کر رہے تھے۔ آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا:

افطر الحاجم والمحجوم	دونوں شخصوں نے اپنا روزہ توڑ دیا۔

ایسے ہی روزوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ صرف بھوک و پیاس کا دوسرا نام ہے۔

رب صائم لیس له من صیامه الا الجوع۔	کتنے روزہ دار ایسے ہیں جن کو اپنے روزہ سے بھوک کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔

اگر ہم اپنے روزے کو واقعی روزہ بنانا چاہتے ہیں، وہ روزہ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ الصوم لی وانا اجزی به (روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔) تو اس کی سب سے پہلی ضروری شرط یہ ہے کہ ہم ان تمام چیزوں کو چھوڑ دیں جن کے متعلق ہمیں معلوم ہو کہ خدا نے ان سے منع کیا ہے۔ ہم عمر بھر کے لیے ایک ایسی زندگی گزارنے کا فیصلہ کریں جس میں ہم تمام غلط اور

ناجائز باتوں سے روزہ رکھے ہوئے ہوں۔ اس کے بغیر روزہ رکھنا اپنے آپ کو صرف بھوک پیاس کی مشقت میں مبتلا کرنا ہے کیونکہ ایسی زندگی کے ساتھ روزہ رکھنے کا وہ فائدہ ہرگز نہیں ہوسکتا جس کے لیے روزہ ہمارے اوپر فرض کیا گیا ہے۔

۲۔ مگر "چھوڑنے" کا یہ عمل صرف انھیں چیزوں تک محدود نہیں رہتا جن سے منع کیا گیا ہے۔ بلکہ وہ ان چیزوں تک پہونچ جاتا ہے جن سے روکا نہیں گیا۔ جس طرح روزہ میں آپ دیکھتے ہیں کہ براہ راست جن چیزوں سے روکا گیا ہے وہ تو صرف تین ہیں ـــــ کھانا، پینا، ازدواجی تعلقات۔ اور یہ بھی صرف دن بھر کے لیے۔ مگر دن کا یہ عمل رات پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور چند چیزیں چھوڑنے کی وجہ سے بقیہ چیزیں بالواسطہ طور پر اس کی زد میں آجاتی ہیں ـــــ نیند میں فرق پڑجاتا ہے، معمولات بگڑجاتے ہیں، آرام لینے کا موقع نہیں ملتا، صحت کمزور ہوجاتی ہے۔ پہلے کی طرح آزادی باقی نہیں رہتی۔ اور اس طرح تقریباً پوری زندگی اس کی لپیٹ میں آجاتی ہے۔ یہی حال دینی تقاضوں کا ہے۔ خدا کا دین ہم سے دو قسم کی قربانیاں مانگتا ہے۔ ایک حرام چیزوں سے بچنا اور دوسرے خدا کے دین کے مطابق ٹھیک ٹھیک زندگی گزارنے اور خدا کے کام میں اپنا پورا حصہ ادا کرنے کے لیے اپنے جائز حقوق اور جائز خواہشوں میں کمی کرنا۔ اس دوسرے عمل کے بغیر کسی بھی راہ میں پوری طرح اپنا فرض انجام نہیں دیا جاسکتا۔ روزہ جس طرح پہلی قسم کی چیزوں کے "ترک" کا سبق ہے۔ اسی طرح وہ دوسری قسم کی قربانی کی مشق ہے۔ روزے میں آدمی کو ان چیزوں کے بارے میں مشقت میں ڈالنا جو اس کا جائز اور فطری حق ہیں، یہ گویا اسی دوسری طرح کی قربانی کا سبق دینا اور اس کا تجربہ کرانا ہے۔ روزہ اس بات کی علامت ہے کہ خدا کی راہ میں آدمی کو صرف ناجائز چیزیں نہیں چھوڑنی ہیں بلکہ اس راہ میں اسے جائز چیزوں سے بھی دست بردار ہونا ہے کھانا پینا، لذت اور آرام، یہ سب انسان کے لیے بالکل جائز چیزیں ہیں مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ [illegible] چیزیں بھی خدا کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں اس وقت ضروری ہوتا ہے کہ مومن اپنی ان واقعی ضرورتوں کو بھی چھوڑ کر آگے بڑھ جائے۔ جیسے ایک کامیاب تاجر بعض اوقات اپنی مصروفیتوں میں اتنا منہمک ہوتا ہے کہ شیو کرنا بھول جاتا ہے۔ بروقت کھانا کھانے کا اسے موقع نہیں ملتا، بستر پر جانے کی نوبت نہیں آتی، تفریحات چھوٹ جاتی ہیں۔ وغیرہ، وغیرہ۔ جو شخص قانونی قسم کی حرام چیزوں کو چھوڑنے کے

بعد یہ سمجھ لے کہ اب جو کچھ ہے وہ سب ہمارے لیے جائز ہی جائز ہے۔ وہ کبھی خدا کے دین پر ٹھیک ٹھیک قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کھانے کے معاملے میں صرف اس بات کا لحاظ رکھے کہ فلاں چیز زہر ہے، اس کو نہیں کھانا چاہیے اور فلاں چیز انسان کی غذا ہے، اس کو کھانا چاہیے۔ اور یہ بھول جائے کہ چیزوں کی مقدار، ان کی نوعیت، موسم اور مزاج کے ساتھ ان کی مطابقت کا لحاظ بھی ناگزیر طور پر ضروری ہے۔ اگر ان باتوں کا لحاظ نہ رکھا جائے تو بہترین غذا بھی کسی وقت آدمی کو اسی قسم کا نقصان پہونچا سکتی ہے جو کسی زہر کے کھانے سے اسے پہونچتا۔

روزہ میں اور دین کے اس دوسرے تقاضے میں بہت گہرا تعلق ہے۔ اسی لیے روزہ کے مہینہ کو شھر الصبر (صبر کا مہینہ) کہا گیا ہے اور روزہ کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ الصیام نصف الصبر (روزہ آدھا صبر ہے)۔ صبر کے معنی ہیں برداشت کرنا، مشکلوں کے باوجود اپنی جگہ جمے رہنا۔ گویا روزہ اس بات کی تربیت ہے کہ حق کی راہ میں کبھی کھانا پینا چھوڑنے کا موقع آئے تو وہ کھانا پینا بھی چھوڑ دے۔ لذت اور آرام کے تقاضے ایک طرف کھینچ رہے ہوں اور خدا کا دین دوسری طرف بلا رہا ہو تو وہ لذت اور آرام کی خواہش کو دبا کر خدا کے دین کی طرف بڑھ جائے دین کا کام ٹھیک طور پر انجام دینے کے لیے اپنے معمولات میں فرق کرنا پڑے تو بخوشی اسے گوارا کرے نہ کہ عادات و معمولات کے اوپر دین کو قربان کر دے۔ روزہ اس بات کا نام ہے کہ آدمی صبر اور برداشت کے ساتھ ہر اس چیز کو قبول کرے جو دین کی راہ میں اسے پیش آئیں۔ خواہ وہ اپنی ناگزیر ضرورتوں کو چھوڑنے کا معاملہ ہو یا راحت و آرام کو چھوڑنے کا معاملہ۔

بڑی دکان، اونچی ملازمت، پھیلا ہوا کاروبار ـــــ یہ سب انسان کے لیے بالکل جائز ہیں۔ لیکن ان چیزوں میں پھنسنے کی وجہ سے اگر ایسا ہو کہ آدمی وقت پر دلجمعی کے ساتھ نماز ادا نہ کر سکے، اس کے پاس خدمت دین اور تلاوت قرآن کے لیے وقت نہ رہے تو ایسی حالت میں ضروری ہے کہ وہ قناعت کی راہ اختیار کرے، وہ اپنے دنیوی کام کو گھٹائے اور آخرت کے نقصان کو گوارا نہ کرے۔ عمدہ مکان، بہترین لباس، اعلیٰ فرنیچر اور شاندار سواری، یہ سب جائز چیزیں ہیں، ان میں سے کسی چیز کو بھی اللہ نے حرام نہیں کیا ہے۔ لیکن ان کی موجودگی کے معنی اگر یہ ہوں کہ آدمی کے گھر میں بجائے خدا کے انھیں چیزوں کا چرچا ہونے لگے، وہ خدا کی یاد سے آدمی

کو غافل کر دیں، وہ بڑائی اور کامیابی کا جھوٹا احساس آدمی کے اندر پیدا کرنے لگیں، تو اس وقت یہ سارا سامان بھی بت بن جاتے ہیں اور ضروری ہو جاتا ہے کہ انھیں توڑ کر آدمی اپنے آپ کو ان کے فتنہ سے بچائے۔ دنیا کے علوم حاصل کرنا اور اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلا کر ان کے معاشی مستقبل کو بہتر بنانا بالکل جائز کام ہیں لیکن اگر اس تعلیم کی قیمت یہ ہو کہ بچوں کو سر سے پیر تک "مغربی" بنا دینا پڑے، ان کے عقائد متزلزل ہونے لگیں، ان کی عبادات چھوٹ جائیں۔ اسلامی شعائر اور اسلامی آداب سے وہ عاری ہو جائیں، تو ایسی تعلیم شیطان کی شاگردی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی جس سے مسلمان بچوں کو دور رکھنا ضروری ہے۔ دنیا کی لذتیں اور دنیا کے ساز و سامان بالکل جائز ہیں لیکن اگر ان کے درمیان اپنے کو رکھنے کی وجہ سے آدمی کا دل سخت ہونے لگے، وہ رقت اور خشیت سے خالی ہو جائے، تو اس وقت ان چیزوں کی حیثیت اکاس بیل کی ہو جاتی ہے اور ضروری ہوتا ہے کہ درخت کی زندگی بچانے کے لیے اسے کاٹ دیا جائے۔

یہ دوسرا سبق ہے جو روزے سے ہمیں ملتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ اگر دین کا تقاضا ہو تو تمھیں چاہیے کہ نعمتوں کا دسترخوان سامنے ہوتے ہوئے بھی تم ان سے روزہ رکھ لو۔

۳۔ روزہ کی تیسری حیثیت یہ ہے کہ وہ دلوں میں نرمی اور گداختگی پیدا کر کے اس کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ تقویٰ اور تعلق باللہ کی لطیف روحانی کیفیت کا حامل بن سکے۔ انسان کا وجود دو چیزوں سے مرکب ہے۔ مادیت اور روحانیت، مگر وہ خدا جس کو ہمیں پانا ہے وہ ایک خالص غیر مادی وجود ہے۔ اس لیے اس کو پانے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے وجود کا مادی حصہ زیادہ سے زیادہ دب گیا ہو اور اس کا روحانی حصہ زیادہ سے زیادہ ابھر آیا ہو۔ روزہ ہماری مادی خوراک کو گھٹا کر ہمارے ساتھ یہی عمل کرتا ہے۔ وہ ہماری روحانیت کو بڑھاتا ہے۔ وہ ہماری مادیت کو کم کر کے ہماری حسی قوتوں کو بیدار کرتا ہے۔ وہ ہمارے اندر وہ استعداد پیدا کرتا ہے جس کے بعد ہمارے اوپر خالص روحانی تجلیات کا نزول ہو سکے۔

اسی لیے حدیث میں روزے کو زکوٰۃ الجسد کہا گیا ہے۔ یعنی روزہ وہ عمل ہے جس سے جسم کو پاک کیا جاتا ہے۔ اور قرآن مجید میں اسی چیز کو "تیسیر" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے نزول قرآن کے مہینے میں روزہ رکھنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:۔

یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (بقرہ) خدا تمہارے لیے یُسر فراہم کرنا چاہتا ہے، تم کو عُسر میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

"یُسر" کے معنی آسانی کے ہیں یعنی کسی کام کو سہل الحصول بنا دینا اور "عُسر" اس کا ضد ہے۔ روزہ بظاہر ایک سختی کا حکم ہے کیونکہ اس میں آدمی کو بھوک پیاس اور بے آرامی کو برداشت کرنا ہوتا ہے مگر یہ سختیاں دراصل سختیاں نہیں ہیں کیونکہ یہ ہماری حسّی قوتوں کو بیدار کرکے ہم کو اس قابل بناتی ہے کہ ہم تعلق باللہ کی دولت کو پا سکیں۔

نزول قرآن کے مہینے کو روزہ کا مہینہ قرار دینے کی مصلحت بھی یہی ہے۔ قرآن بظاہر آج ایک ایسی کتاب ہے جو لفظوں میں لکھی ہوئی ہر گھر میں موجود ہے اور ہر شخص جب چاہے اسے پڑھ سکتا ہے مگر محض اسی طرح الفاظِ قرآن کو دہرا لینے سے کوئی شخص قرآن کو نہیں پا جاتا۔ قرآن وہ عظیم ترین حقیقت ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اگر اس کو پہاڑ پر اتارا جاتا تو وہ بھی کانپ اٹھتا اور پھٹ جاتا۔ ایسی حقیقت سے آشنا ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ محض ایک کتاب پڑھ کر اس کے مطالب کو جان لینا نہیں، بلکہ یہ خدا کے کلام کا بندے کے دل میں جگہ پانا ہے۔ جو کچھ اللہ کے رسول پر اترا تھا، اس کو دوبارہ اپنے قلب پر اتارنا ہے۔

بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے اوپر اپنے احکام نازل کرنے کا فیصلہ فرمایا تو انھیں ہدایت کی کہ وہ پہاڑ پر جا کر ایک مہینہ تک روزہ رکھیں اور اور عبادت کریں۔ (بعد کو یہ مدت چالیس روز کر دی گئی) اس کا مقصد دراصل ان کے اندر کلام الٰہی کا حامل بننے کی استعداد پیدا کرنا تھا۔ ٹھیک یہی صورت ہمارے ساتھ بھی اختیار کی گئی ہے۔ قرآن مجید جس مہینے میں اترا، اس کو اللہ تعالیٰ نے تمام امت کے لیے روزے اور عبادت کا مہینہ قرار دے دیا۔ یہ حضرت موسیٰ کی طرح ہماری تیس روزہ عبادت ہے تاکہ ہم قرآن کو اخذ کرنے کے قابل ہو سکیں۔ یہ قرآن کی زبان میں ہمارے لیے "تیسیر" کا انتظام ہے۔ اس میں دراصل اس بات کا اشارہ ہے کہ جو لوگ اللہ سے اس درجہ تعلق قائم کرنا چاہیں کہ ان پر اللہ اپنے کلام کے ساتھ اتر آئے۔ وہ اس سے حقیقی طور پر آشنا ہو جائیں ان کو اپنے جسم کو مشقت اور بے آرامی میں ڈال کر اس کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا ہوگا، اپنے وجود کے مادی عنصر کو مغلوب کرنا

اور اس کے روحانی عنصر کو ابھارنا وہ ناگزیر عمل ہے جس کے بعد وہ اپنے کو اس کے قابل بنا سکتے ہیں۔

یہ ہے روزہ کی حقیقت۔ یہ ایک مخصوص عمل ہے جس کے ذریعہ ہم دینی حقیقتوں کا تجربہ کرتے ہیں۔ روزہ کی حالت اپنے اوپر طاری کرکے ہم اپنے آپ کو اسکے لیے تیار کرتے ہیں کہ ہم دینی تقاضوں کو ٹھیک ٹھیک انجام دے سکیں۔ اب جو شخص اس سے بے خبر ہے کہ روزہ کی حقیقت کیا ہے اور دین کے تقاضوں سے اس کا کیا تعلق ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی کامیاب دکاندار کو دیکھے کہ خرید و فروخت اور حساب کتاب کی مشغولیت میں بعض اوقات اس کا کھانا پانی چھوٹ جاتا ہے، اور یہ سمجھ کر کہ بس "کھانا پانی چھوٹنا" ہی اس کی کامیابی کا راز ہے۔ وہ مصنوعی طور پر بھوکا رہنا شروع کردے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی نقالی سے کوئی شخص کامیاب دکاندار نہیں بن سکتا۔ ایک کامیاب دکاندار کے لیے فاقہ کی نوبت آنا محض ایک علیحدہ عمل نہیں ہے بلکہ اس کی اصل زندگی سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو الگ سے لاکر مصنوعی طور پر اس کے اوپر چپکادی گئی ہو بلکہ وہ اس کے حقیقی وجود اور اس کی واقعی سرگرمیوں کا براہ راست ظہور ہے۔ اسی طرح روزہ وہی روزہ ہے جو آدمی کی اصل زندگی کے ساتھ پوری طرح متعلق ہو گیا ہو۔ جو اس کی اندرونی حالت کا ایک خارجی اظہار ہو، اس کے بغیر محض صبح سے شام تک بھوکا پیاسا رہنا، روزہ نہیں، بلکہ روزہ کی نقل ہے۔ وہ مصنوعی روزہ ہے نہ کہ حقیقی روزہ۔

معارف الحدیث

جلد سوم

معارف الحدیث کی دو جلدیں پہلے تیار ہو چکی ہیں

اب خدا کے فضل سے تیسری بھی تیار ہو گئی ہے جس کا مدت سے انتظار تھا

معارف الحدیث اردو ترجمہ و تشریح کے ساتھ، حدیث نبوی کا ایک جدید مجموعہ ہے جو

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کے قلم سے ترتیب پا رہا ہے

اس کی تشریحات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ دور حاضر کی ذہنی اور فکری کیفیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے ــــ دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ مؤلف کی خاص کوشش پوری کتاب میں یہ رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے جو اثرات صحابہ کرامؓ کے قلوب پر پڑتے تھے کسی درجہ میں قارئین کے دلوں پر بھی وہی اثرات مرتب ہوں۔

جلد اول۔ ایمان اور آخرت کے بیان سے متعلق حدیثیں صفحات ۲۰۰ قیمت مجلد ۵/۵۰ غیر مجلد ۴/۵۰

جلد دوم۔ تزکیۂ نفس اور اصلاح اخلاق کی حدیثیں، صفحات ۲۴۰ " ۵/۵۰ " ۴/۵۰

جلد سوم۔ طہارت اور نماز کے تمام ابواب کی حدیثیں، صفحات ۵۰۰ " ۸/- " ۷/-

ناشر:- کتب خانہ الفرقان، کچہری روڈ لکھنؤ

Printed at Allahabad Oriental Press, Lucknow.

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۶/-
پاکستان سے ۷/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

فی کاپی ۶۰ پیسے

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۱۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

جلد ۳۲ | ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ مطابق فروری ۱۹۶۵ء | شمارہ ۹

اگر اِس دائرے میں ◯ سُرخ نشان ہے، تو

اِس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہِ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ فروری تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:- اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں، اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دیدیں۔ ڈاکخانہ کی رسید بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:- براہِ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔

تاریخ اشاعت:- الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۲۰ تاریخ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں، اسکی اطلاع ۲۸ تاریخ کے اندر آجانی چاہئے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر، اڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

پاکستان کے صدارتی انتخاب میں جن لوگوں نے مس فاطمہ جناح کی حمایت یہ کہہ کر کی، کہ کم از کم بعض خاص حالات میں تو عورت کو سربراہِ مملکت بنا لینے کا جواز شریعت میں ہے ہی، انھوں نے اپنے اس قول کی تائید میں جتنے معتبر علمار کے بھی فتوے اور فیصلے پیش کئے اُن سب میں کم و بیش یا تو غلط بیانی تھی یا زبردستی کی مطلب برآری، سوائے ایک فتوے کے، جو دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی جناب مولانا سید مہدی حسن نے اسی زمانہ میں بعض لوگوں کے سوال پر دیا تھا ——— اس فتوے میں اگرچہ پردے وغیرہ کی بعض شرطیں ایسے صاف الفاظ میں مذکور تھیں جن کے بعد مس فاطمہ جناح جیسی عورتوں کے مسئلے میں اس فتوے کو دلیل جواز بنانا کسی دیندار آدمی کو زیب نہیں دے سکتا، لیکن نفس اس مسئلہ میں کہ کسی عورت کو سربراہِ مملکت بنانے کی شریعت میں اصولی طور پر کوئی گنجائش ہے یا نہیں؟ — یہ فتویٰ اُن لوگوں کی پوری تائید کرتا تھا جو گنجائش کے مدعی تھے۔ اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہمارے نزدیک اس نوعیت کا یہ تنہا فتویٰ تھا۔ اِسکے علاوہ جو فتوے اور عبارتیں قابلِ لحاظ علمار کی اِس معاملہ میں پیش کی گئیں وہ محض فنکاری اور سیاسی پروپیگنڈے کا درجہ رکھتی تھیں۔

دارالعلوم دیوبند ہماری مادرِ علمی ہے، اُسکے دارالافتاء سے ایسے فتوے کا اجرا ہمارے لئے بہت ہی حیرت انگیز اور موجبِ اضطراب تھا۔ اپنی مسلسل علالت کی وجہ سے طبیعت خط و کتابت کی کم متحمل نہ تھی۔ انتظار رہا کہ شاید دارالعلوم سے کوئی وضاحت آوے اور معلوم ہو کہ فتوے کی اصل نوعیت

، اور تھی جسے پاکستان میں کچھ لوگوں کی سیاسی ضرورتوں نے اُسی طرح بالکل غلط رنگ دے دیا جیسے دوسر
ت سے فتووں اور عبارتوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر بہت ہی مایوسی ہوئی کہ دارالعلوم دیوبند
، دفتر سے جو وضاحت اس بارے میں شائع ہوئی وہ کوئی معنیٰ ہی اپنے اندر نہیں رکھتی تھی۔ اس وضاحت
ں کہا گیا کہ فتوے کے آخر میں یہ شرط بھی درج تھی (جسے اخبارات میں حذف کردیا گیا ہے) کہ عورت کو
بسی دینی مصلحت کے لئے) صرف اُسی وقت سربراہِ مملکت بنا لینا جائز ہے جب اِس ذریعہ سے اُس
صلحت کا حصول یقینی ہو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہمارے خیال میں نہ اِس شرط کے کوئی
معنیٰ تھے اور نہ اس وضاحت کے کوئی معنیٰ! ۔ اور جن لوگوں نے اسکے جواب میں یہ کہا کہ پیشگی یقین کس طرح
حاصل کیا جاسکتا ہے؟ مستقبل کے معاملات میں زیادہ سے زیادہ ظن غالب ہی انسان قائم کرسکتا ہے'
انھوں نے بالکل ٹھیک کہا[۲] ۔ بہرحال اِس مرحلہ پر ہم نے حضرت مفتی صاحب (مولانا سید مہدی حسن صاحب) کو
ایک مفصل خط لکھا' اور ایک طالب علمانہ ذہن سے جو جو اشکالات اس فتوے پر عائد ہوتے تھے پوری
صراحت کے ساتھ وہ سب حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کردیئے۔

ہمیں بیحد مسرت ہے کہ ہمارے بزرگ مفتی صاحب نے بغیر اس خوف کے کہ اُن کی علمی شان پر کوئی
حرف آئے گا، اور بغیر اسکے کہ اس میدان میں اُن کے مخاطب کی کیا حیثیت ہے بلا تاویل و بلا تامل اپنے
فتوے سے رجوع فرمالیا، اور پوری صراحت کے ساتھ رجوع فرمایا ــــــــــ حضرت مفتی صاحب کے
گرامی نامہ کی نقل حسب ذیل ہے: ــــــــــ

عزیزی مولوی عتیق الرحمٰن صاحب سلمکم اللہ تعالیٰ و بارک فی علمکم!

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللہِ وَبَرَکَاتُہٗ

آپ کا کرم نامہ بلکہ ہدایت و سوالنامہ دیوبند سے ہوتا ہوا ۱۰/۹/۸۴ھ کو شاہجہانپور مجھ کو ملا،
میں دو ماہ سے بوجہ علالت کے وطن میں ہوں، اُٹھنے بیٹھنے کی دشواری ہے، دُعا کا طالب ہوں۔
آپ کی طویل تحریر بدقت پڑھی، اگرچہ میدانِ تحریر وسیع ہے اور کچھ نہ کچھ تقلب و توریث
ہی کی صورت ہو[۱] لکن الحق احق ان یتبع ۔ کتابوں کی ورق گردانی اور مطالعہ مفاہیم و

---

[۱] اس جملہ کا مطلب سمجھنے میں شاید دقت ہو آگے اس کی شرح کردی جائے گی ۔ ع س
[۲] مس فاطمہ جناح کے معاملے میں یہ بات ناممکن سی تھی۔

صراحت نصوص سے یہی ثابت ہے کہ عورت اسلامی نظریہ کے ماتحت صدرِ مملکت اور سربراہِ سلطنت نہیں ہوسکتی، اُس کا حاکم ہونا مردوں پر جائز نہیں ہے۔ اس بنا پر میں اپنے پہلے جواب سے جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے رجوع کرتا ہوں اور اسی کا قائل ہوں کہ شرعاً عورت حکمران با اختیار نہیں ہوسکتی۔ جواب میں بیشک خامی اور کوتاہی مجھ سے واقع ہوئی اللہ معاف فرمائیں۔ حق کی طرف رجوع کرنے اور اپنی غلطی کا اقرار کر لینے میں مجھے کوئی باک نہیں۔ مخدومی مولانا منظور صاحب کی خدمت میں سلام مسنون کے بعد طلبِ دُعا کی درخواست ہے۔ جواب میں اختصار کا راستہ اختیار کیا ہے طبیعت بھی ناساز ہے اور سوال وجواب کی طوالت سے بھی فریقین کو نجات حاصل ہے۔ والسلام (دستخط)

سید مہدی حسن عفی عنہ

جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلق ہے اُس میں مفتی صاحب کا یہ مکتوب کسی شرح وبیان کا محتاج نہیں، البتہ شروع میں "تغلب وتوریث" کے الفاظ جس جملہ میں آئے ہیں اُسکے سمجھنے میں شاید عام طور پر قارئین کو دقت ہو۔ اس جملہ کی شرح یہ ہے کہ مفتی صاحب کا جو فتویٰ پاکستان میں استعمال کیا گیا (جو ایک پاکستانی مستفتی کے جواب میں تھا) اسکے علاوہ خود ہندوستان میں بھی کسی صاحب کے جواب میں مفتی صاحب نے جواز ہی کا فتویٰ کچھ مختلف الفاظ میں دیا تھا۔ وہ الفاظ یہ تھے :۔

"ایسی عورت جو با پردہ رہتی ہو، نظم ونسق سلطنت اور امورِ مملکت سے بخوبی واقف ہو، اور اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہ اور نجری ہو، ضرورت اور مجبوری کی صورت میں وہ صدر وزیر بن سکتی ہے۔ ہندوستان میں ایسے نظائر موجود ہیں۔"

ہم نے اس کو بھی سامنے رکھتے ہوئے مفتی صاحب کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ ہندوستان میں جو ایسے نظائر موجود ہیں اُن کے بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ شریعت میں کس اصول سے معتبر ہوں گے؟ اور پھر دوسری بات یہ کہ وہ نظائر تو پاکستانی مسئلہ سے (جس کے متعلق مستفتی کا سوال تھا) مختلف نوعیت رکھتے ہیں۔ یہاں تو صدر کو اپنی مرضی سے منتخب کرتا ہے جبکہ اُس دور میں حکمراں یا وراثۃً بن جاتا تھا یا تغلباً (زبردستی قبضے سے) اور ان دونوں صورتوں میں یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ فتنہ وفساد سے بچنے کے لئے فاسق کی طرح عورت کی سربراہی بھی گوارا کر لینا جائز ہے، مگر اُس عورت اور اُسکے معاونین کے فعل کو تو جائز نہیں کہا جاسکتا۔

پھر آخر میں ہم نے یہ گزارش کی تھی کہ شاید آپ کے ذہن میں برطانوی عہد کی دیسی ریاستوں کے بعض نظائر رہے ہوں گے، اور اُن کی حد تک آپ کے ارشاد میں کوئی کلام نہیں ہے۔ کیونکہ اوّلاً تو وہ "حکومتیں" نہیں تھیں، چند نمائشی اختیارات اور القاب و آداب کے کھلونے تھے، اور وہ بھی انگریز کے دیئے ہوئے، اور ہر وقت اُنھی کے رحم و کرم پر۔ پھر وہاں مجبوری بھی واقعی معنیٰ میں ہوتی تھی کہ ذکور میں سے کوئی بھی وارثِ ریاست نہیں ہے، اور مزید برآں یہ کہ اس صورت میں عورت اگر گدی کو لات ہی مار دے تو صرف اپنا ہی نقصان نہ کرے۔ بلکہ ریاست کے مسلمانوں کو جو تھوڑی بہت آزادی اپنے معاملات میں اس گدی کی بدولت حاصل تھی وہ بھی جاتی رہے۔ چنانچہ ان سب باتوں کے لحاظ سے ایسی صورت میں کوئی کلام ہی نہیں ہو سکتا۔

ہماری اس گزارش کے بعد مفتی صاحب کو موقع تھا کہ وہ اپنے فتوے کا محل ایسی ہی نام نہاد حکومت کو قرار دیتے اور اسکے الفاظ میں جو وسعت نظر آتی تھی اُس کی نفی فرما دیتے، یا تغلب و وراثت کی شکل سے مخصوص کر کے اپنے الفاظ کی کوئی تاویل فرما لیتے۔ جملہ ذرا اُلجھا ہوا ہے لیکن ہم اپنے عریضے کی روشنی میں اس کا مطلب یہی سمجھے ہیں کہ مفتی صاحب نے اس جملہ میں ازراہِ حق پرستی تاویل وغیرہ کی گنجائش سے فائدہ اٹھانے اور لوگوں کے لئے کسی غلط فہمی یا حیلہ سازی کی گنجائش چھوڑ جانے سے انکار کیا ہے۔ اللہ اُن کو اس بلند کرداری کی بیش از بیش جزا دے۔ انھوں نے حق کے آگے اپنے کو پست کر دینے کا بہت ہی اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے ——— ہماری حقیر دُعا ہے اور ناظرین کرام سے بھی دُعا کی درخواست ہے کہ خداوند موصوف کو علالت کی شکایت سے نجات دیکر صحت ارزانی فرمائے۔

مفتی صاحب کے فتوے کا وقتی طور پر جو اثر پڑنا تھا وہ تو بیشک پڑ چکا اور اس لحاظ سے یہ رجوع اور اس کے لئے کوشش کچھ پہلے ہوتی تو بہتر تھا لیکن اس کا دوسرا اچھا پہلو یہ ہے کہ اُس وقت یہ رجوع کسی سیاسی اثر یا مصلحت سے متہم ہو سکتا تھا، اب الحمدللہ اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور اسی کے ساتھ ہم یہ بھی واضح کر دیں کہ ہم نے مفتی صاحب کی خدمت میں محض علمی سوالات اور اشکالات پیش کئے تھے، کسی خاص جماعت یا کسی خاص گروہ کے فائدہ اُٹھانے کا سوال سامنے رکھ کر نہیں درخواست کی تھی کہ وہ اپنے فتوے پر نظرِ ثانی فرمائیں۔ مفتی صاحب کے اس رجوع کے بعد کچھ ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ ہم اپنا عریضہ بھی سامنے لائیں، اب تو اس کی اشاعت نری خود نمائی ہوگی، ورنہ ہم اس کو بھی ناظرین

کے سامنے پیش کر دیتے ۔

مفتی دارالعلوم دیوبند کے اس فتوے کے علاوہ جو دوسرے علماء اور ائمہ کرام کے اقوال کا حوالہ عورت کی امارت کے جواز میں دیا گیا ہے اُن کا جائزہ ہم اپنے ایک مستقل مضمون میں لے رہے ہیں، جو اسی اشاعت میں شامل ہے، اور اس جائزے سے ان شاء اللہ یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ یہ حوالے یا تو بالکل افتراء اور بہتان ہیں اور یا ان سے زبردستی اپنا مطلب نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ یہ پورا مضمون اسی اشاعت میں آجائے لیکن کچھ امکان اس کا بھی ہے کہ دو قسطوں میں کرنا پڑے۔

ناظرین کے علم میں ہے کہ اللہ کے فضل سے "معارف الحدیث" کی تیسری جلد بھی کتابی شکل میں تیار ہو گئی ہے۔ ادارۂ الفرقان کے لئے وہ دن بیحد ہی مسرت اور شکر کا ہوگا جب اس مبارک سلسلے کی تمام جلدیں تکمیل کو پہونچ جائیں گی۔ اہل نظر کو آج بھی اندازہ ہو اور ان شاء اللہ العزیز کتاب کی تکمیل اسے اور بھی ثابت کر سکے گی کہ اللہ نے وقت کے مطابق دین اور اُمت کی ایک بڑی خدمت کی توفیق ادارۂ الفرقان اور اس کے محترم بانی کو عطا فرمائی ہے۔ اس جلد کے تقریباً پانچ سو صفحات ہیں۔ عمدہ سفید کاغذ اور نہایت اعلیٰ درجہ کی کتابت و طباعت ـــــــ آئندہ صفحات میں جہاں "معارف الحدیث" کی قسط جایا کرتی تھی، اس دفعہ اس نئی جلد کا دیباچہ ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے، تا کہ الفرقان کے صفحات میں بھی اس جلد کی فی الجملہ تکمیل ہو جائے ـــــــ یہ دیباچہ اس جلد کی کتابت و طباعت وغیرہ کا بعینہٖ نمونہ بھی ہے۔

چند قیمتی کتابیں جو خاص کر علماء و طلبۂ علم دین کے کام کی ہیں

لغات القرآن

از مولانا عبد الرشید نعمانی و مولانا عبد الدائم جلالی
قرآنی الفاظ کے معانی و مصداق صرف عام لغت کی کتابوں سے نہیں متعین کیے جا سکتے اسی لیے عربی میں بھی علمائے سلف نے صرف لغات القرآن پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ یہ اردو میں اسی نوعیت کی نہایت مبسوط اور مفصل کتاب ہے۔ چھ ضخیم جلدوں میں مکمل سٹ ۳۷/۵۰ مجلد غیر مجلد ۳۱/۵۰

لغات الحدیث

از مولانا وحید الزماں مرحوم
قرآن پاک کی طرح حدیث کے الفاظ و معانی کا علم بھی علماء اسلام کی توجہ کا مستقل موضوع رہا ہے۔ یہ کتاب اردو میں اس علم کا ایک قابل اعتماد ذخیرہ ہے طالبان علم حدیث کے لیے نادر ہے۔ مکمل چھ جلدوں میں (مجلد) فی جلد ۱۵/۰

مسند حمیدی (عربی)

یہ کتاب ہندوستان میں پہلی بار شائع ہوئی اہل علم کے لیے ایک نادر تحفہ ہے۔ یہ امام بخاری کے استاذ امام ابو بکر حمیدی کے مرتب کردہ مجموعۂ حدیث کا پہلا ایڈیشن ہے جس کے قلمی اجزاء دنیا بھر میں صرف چند کتب خانوں کی زینت تھے ہمارے ملک کے نامور عالم حدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے ملکوں کی خاک اور جستجو کے بعد تمام اجزاء کو اپنے گرانقدر حواشی کے ساتھ ایک مکمل کتاب کی شکل دی اور مجلس علمی نے اس کی طباعت کا انتظام کرایا۔ انتہائی نایاب علمی ملے صرف انتالیس روپے میں۔

جامع ترمذی (اردو)

ترمذی شریف حدیث کی ان چھ کتابوں میں سے ہے جو صحیح ستہ مانی جاتی ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ امام ترمذی حدیث کا مرتبہ بھی بیان کر دیتے ہیں کہ کس پایہ کی ہے۔ اور جو فقہی مسئلہ حدیث سے نکلتا ہے اس میں ائمہ کا اختلاف بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ دو جلدوں میں چھپا ہے قیمت مکمل ۱۶/۰

انتخاب صحاح ستہ

(اردو ترجمہ مع اصل عربی)
صحاح ستہ کا مطلب وہ حدیث کی چھ کتابیں ہیں جو سب سے مستند ہیں۔ اس کتاب میں ان کی آٹھ سو حدیثوں کا ایک انتخاب کر دیا گیا ہے۔ مجلد ۵/۰

فتاویٰ رشیدیہ

علماء دیوبند میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کا جو مقام ہے وہ مخفی نہیں ہے۔ وہ دراصل مسلک دیوبند کے بانیوں میں سے ہیں اور اس مسلک کی سب سے بہتر ترجمان یہ کتاب آپ ہی کے فتووں کا مجموعہ ہے۔ غیر مجلد ۹/۰ مجلد ۹/۵۰

فتاویٰ دار العلوم دیوبند

مکمل مبوب
دار العلوم دیوبند کی مسند افتاء پر بڑی بڑی علمی ہستیاں رونق افروز رہی ہیں یہ مفتیوں کے قلم سے ہزاروں مسائل پر شرعی احکام مجموعہ ۹ جلدیں غیر مجلد -/۲۱

امام ابو حنیفہ

شیخ محمد ابو زہرہ (مصری) اس وقت عالم اسلام کے ممتاز عالموں میں سے ہیں۔ اسلامی قانون فقہ ان کا خاص موضوع ہے۔ اسلامی فقہ کے ائمہ پر ان کی کتابیں ہر طرف خراج تحسین پا چکی ہیں اور دو میں بھی برابر ان کے ترجمے ہو رہے ہیں۔ یہ امام اعظم ابو حنیفہ پر ان کی گرانقدر کتاب کا ترجمہ ہے جو پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ قیمت مجلد -/۱۵

الجمال والکمال

(تفسیر سورۂ یوسف)
(از قاضی محمد سلیمان منصور پوری)
قاضی سلیمان صاحب اردو کے ایک معروف سیرت نگار نبوی ہیں۔ ان کی یہ کتاب گویا قرآن کی بیان کردہ سیرت یوسفی کا عطر جمیل ہے۔ یہ بھی پاکستان کی مطبوعہ ہے۔ قیمت مجلد ۶/۰

نور الدرایہ شرح ہدایہ

(فقہ حنفی کی مشہور درسی کتاب ہدایہ کی شرح)
ہدایہ کی شرح عین الہدایہ کو سامنے رکھ کر یہ اردو شرح مولانا محمد نعیم صاحب استاذ دیوبند نے لکھی شروع کی ہے۔ فی الحال چھ حصے۔ قیمت فی حصہ ۵/۰

مصباح اللغات

عربی الفاظ کے اردو ترجمے کے لیے ایک بے نظیر ڈکشنری۔ جو مقبول ہے۔ قیمت مجلد -/۱۶

چند مفید علمی، دینی اور تاریخی کتابیں

وحیِ الٰہی

(از مولانا سعید احمد اکبرآبادی)

وحی کی حقیقت پر ایک محققانہ کتاب، جسکے مطالعہ سے وحی کی صداقت کا یقین دل و دماغ پر طاری ہو جاتا ہے۔ اور ذہنی تعلیم کے پیدا کردہ شکوک ایک ایک کر کے صاف ہو جاتے ہیں۔ قیمت غیر مجلد -/۳ مجلد -/۴

فہم قرآن

قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں؟ اور قرآن کا صحیح منشا معلوم کرنے کے لیے رسول پاک کے اقوال و افعال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے؟ یہ کتاب اسی طرح کے اہم مباحث پر مشتمل ہے۔ تصنیف مولانا اکبرآبادی۔

قیمت غیر مجلد ۲/۲۵، مجلد ۳/۲۵

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق

از مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم

علم اخلاق پر ایک فاضلانہ کتاب جس میں تمام قدیم و جدید اخلاقی نظریوں کو سامنے رکھ کر اصول اخلاق اور انواع اخلاق پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور مقابلہ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ اسلام کا نظام اخلاق سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ قیمت غیر مجلد ۶/۵۰ مجلد

اسلام کا نظامِ حکومت

(از مولانا حامد الانصاری غازی)

اسلام کسی حکومت کا داعی ہے اور اس نے اس شعبۂ زندگی میں دنیا کو کیا خاص پیغام دیا۔ مسئلہ کے تمام علمی اور عملی پہلوؤں پر مفصل کلام۔ قیمت غیر مجلد -/۹، مجلد -/۱۰

مسلمانوں کا نظم مملکت

(از ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن (مصری))

مسلمانوں نے صدیوں دنیا کے اکثر حصے پر جو حکومت کی اس حکومت کا عملی نظام کیا تھا؟ اور حکومت کے جتنے شعبے ہوتے ہیں مسلمانوں نے ان کی تنظیم کس طرح کی۔ فن سیاست و جہانبانی میں مسلمانوں کے انمٹ نقوش کا ایک علمی مرقع۔ مترجمہ مولانا علیم اللہ صدیقی۔ قیمت غیر مجلد ۴/۵۰، مجلد ۵/۵۰۔

مسلمانوں کا عروج و زوال

(از مولانا سعید احمد اکبرآبادی)

مسلمانوں کے سیاسی عروج کے کیا اسباب تھے؟ اور کن عوامل نے انھیں زوال پذیر کیا؟ ایک علمی اور تاریخی جائزہ جو بصیرت افروز بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔ قیمت غیر مجلد -/۴ مجلد -/۵

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

(از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

مسلمانوں کے عروج و زوال کی تاریخ نہیں بلکہ ایک بالکل نئے زاویۂ نظر سے اس عروج و زوال کے دنیا پر اثرات کا جائزہ۔ ایک ایمان آفریں اور پیغام عمل دینے والی کتاب۔

قیمت مجلد ۴/۵۰

تاریخ دعوت و عزیمت

یہ کتاب مولانا علی میاں ندوی کی اہم ترین تصنیف ہے جو ان اکابر اسلام کے کارناموں کو تفصیل سے سامنے لاتی ہے جنھوں نے ہر ضرورت کے موقع پر اسلام کی صحیح ترجمانی اور مسلمانوں کی اصلاح کے لیے کام کیا۔ تین جلدوں میں مکمل جلد اول -/۶ دوم ۶/۵۰ سوم -/۵

سوانح قاسمی

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کے قلم سے بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی علمی، عملی اور عرفانی زندگی کی تفصیل تین ضخیم جلدوں میں۔ مکمل -/۱۵

نقش حیات

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی خود نوشت سوانح حیات جو بتاتی ہے کہ ایسی عظیم شخصیتیں کس طرح بنتی ہیں جو بقول شاعر "در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق" کے مصداق ہوں۔ مکمل دو جلدوں میں۔ ۸/۵۰

طوفان سے ساحل تک

نو مسلم جرمن فاضل محمد اسد صاحب کی قبول اسلام کی مکمل سرگزشت کا مختصر ترجمہ، جس کا خاص پیغام یہ ہے کہ مغربی تہذیب کی لائی ہوئی ہلاکتوں سے نجات اسلام ہی کی آغوش میں مل سکتی ہے۔ قیمت مجلد ۵/۰

محصول ڈاک بذمہ خریدار

دیباچہ

از مؤلف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلحَمدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِینَ اصطَفٰی

اسلام میں بلکہ کسی بھی مذہب میں ـــــ جس کو مذہب کہا جا سکتا ہو ـــــ نبی اور رسول کے بغیر ہدایت کا کوئی تصوّر ہی نہیں۔ نبی اور رسول ہی پر براہِ راست ہدایت کا نزول ہوتا ہے، وہی بندوں کو اللہ کی ہدایت پہونچاتا ہے، وہی اسکے اصولوں کی تشریح کرتا اور احکام کی عملی تشکیل بتاتا ہے، پھر اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے ضروری سوالات کا وہی جواب دیتا ہے۔ اسلئے ہدایت کے نظام میں رسول ہی کی حیثیت مرکزی اور بنیادی ہے، اور وہی انسانوں کے لئے ہدایت کا ماخذ ہے، اور اسی لئے اُس پر ایمان لانا اور اُس کو اللہ کا مقرر کیا ہوا راہنما ماننا نجات اور سعادت کی بنیادی شرط ہے ـــــ ہمارے اس دَور کے لئے بلکہ چھٹی صدی عیسوی سے اس دُنیا کے آخری دن یعنی قیامت تک کے لئے اور پورے عالم انسانی کے لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی و رسول ہیں۔ اُن کے خاتم النبیین ہونے کا یہی مطلب ہے کہ اب قیامت تک انہی کی نبوت و رسالت کا دَور ہے، اب اللہ کی رضا اور اُس کا قُرب حاصل کرنے کی راہ صرف وہی ہے جس کی طرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے رہنمائی فرمائی ـــــ قرآن مجید میں خود آپ کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے: ـــــ

"قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ ۝" ـــــ (آل عمران۔ ع ۴)

(اے پیغمبر!) تم صاف صاف بتادو کہ اے لوگو! اگر تم خدا کو چاہتے ہو اور اس کی رضا و رحمت اور اُس کے پیار کے طلبگار ہو تو اس کا راستہ صرف یہ ہے کہ تم میری پیروی کرو اور میری بتائی ہوئی

راہ پر چلو، صرف اسی طرح تم اُس کی بخشش اور اُسکے پیار سے حصّہ پاسکو گے ــــــ اے رسُول! تم کہدو کہ اے لوگو اللہ اور اُسکے رسُول کی یعنی میری فرمانبرداری کرو، اگر وہ نہ مانیں تو اللہ کی محبت اور اس کا پیار کبھی حاصل نہیں ہوگا نہ ماننے والوں کو)۔

جب آپ پر ایمان لانا اور آپ کا اتباع اور آپ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی قیامت تک پیدا ہونے والے سارے انسانوں کے لئے نجات اور رضائے الٰہی کی شرط قرار دی گئی تو ضروری تھا کہ یا تو آپ کو اس دُنیا کے خاتمہ تک زندہ رکھا جاتا تاکہ ہدایت و رہنمائی کے لئے بہ نفس نفیس آپ کی طرف رجوع کیا جاسکتا یا آپ کی پوری تعلیم و ہدایت اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو اس طرح محفوظ کر دیا جاتا کہ بعد میں آنے والے بھی پورے علمی اعتماد اور قلبی اطمینان کے ساتھ اُسی طرح آپ سے تعلیم و ہدایت لے سکتے جس طرح سے اور جس اعتماد و اطمینان کیساتھ آپ کے زمانہ کے لوگ لیتے تھے۔

قیامت تک آپ کو زندہ و باقی رکھنا حکمتِ الٰہی کے خلاف تھا، اسلئے دوسرا بندوبست فرمایا گیا۔ آپ کی لائی ہوئی ہدایت کا ایک حصّہ جو اساسی قانون اور بنیادی دستور کی حیثیت رکھتا ہے جس کے الفاظ بھی آسمانی اور الہامی ہیں یعنی قرآن مجید، اُس کو تو اللہ تعالیٰ نے لفظ بہ لفظ محفوظ کرا دیا۔ تاریخ سے واقفیت رکھنے والے غیر مسلم بھی جانتے ہیں کہ اس کا لفظ لفظ محفوظ ہے ــــــ اسکے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق آپ کی تفصیلی ہدایات، آپ کے راہنما ارشادات و خطبات، آپ کے اعمال و افعال اور اخلاق و عادات گویا آپ کی پوری زندگی جو در اصل قرآن مجید کی تشریح و تفسیر اور اسکی ہدایت و تعلیم کی عملی تصویر ہے، اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کی اُمت سے حدیث کی تدوین اور حفاظت کا معجزانہ کام لیکر ایسا محفوظ کرا دیا کہ قریباً چودہ سو برس گزر جانے کے باوجود آپ کی پوری پیغمبرانہ زندگی کا ریکارڈ اس طرح موجود اور محفوظ ہے کہ گویا اپنی خصوصیات کے ساتھ آپ خود اس دُنیا میں رونق افروز ہیں ــــــ اگر کسی باتوفیق بندے کی حدیث کے ذخیرے پر نظر ہو اور اس کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمانی رابطہ بھی نصیب ہو تو وہ محسوس کرے گا کہ گویا حدیث کے آئینہ میں اس کی نظر کے سامنے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کی عکسی تصویر ہے، وہ آپ کو اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، ہنستے بولتے، نماز پڑھتے، لوگوں کے سامنے خطبہ دیتے، اللہ کے حضور میں دعا کرتے، اس میں زار زار روتے اور آنسو بہاتے، احرام باندھے حج کرتے، حج میں طواف اور سعی کرتے، قربانی کرتے اور حلق کراتے، مسجد کے صحن میں نزاعات کا تصفیہ کرتے،

مجرموں کے لئے سزاؤں کے احکام جاری فرماتے اور میدانِ جنگ میں مجاہدین کی صفوں کی قیادت کرتے دیکھے گا، اپنے دل کے کانوں سے آپ کے ارشادات سُنے گا۔ جلوت اور عام مجالس کے علاوہ خلوت کی آپ کی ایسی بہت سی باتیں بھی اُسکے علم میں آئیں گی جو اپنے قریب ترین عزیزوں دوستوں حتیٰ کہ اپنے ماں باپ کی بھی وہ نہ جانتا ہوگا۔

ابھی چند دن پہلے کی بات ہے اپنے مُلک کے ایک مشہور و معروف غیر مسلم فاضل سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور آپ کی زندگی کے محفوظ ہونے ہی کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اُن کی بعض غلط فہمیوں اور عقلی اُلجھنوں کو دُور کرنے کے لئے مجھے کہنا پڑا تھا کہ: "میرے والد ماجدؒ کا انتقال جس وقت ہوا اُس وقت میری عُمر تقریبًا پینتالیس ۴۵ سال کی تھی، گویا میں فہم و شعور کے ساتھ تقریبًا ۴۰ سال اپنے والد ماجدؒ کے زیرِ سایہ رہا ہوں، لیکن میں قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں کہ حدیث کے ذریعہ جتنا کچھ میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جانتا ہوں اتنا اپنے والد ماجدؒ کے بارے میں نہیں جانتا"۔ الحمدللہ مجھے اطمینان ہے کہ یہ بات میں نے غلط نہیں کہی تھی۔

صحابۂ کرامؓ جن کو دولتِ ایمان کے علاوہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشق کی نسبت بھی نصیب تھی، جو کچھ آپ سے سُنتے تھے اور جو کچھ آپ کو کرتے دیکھتے تھے اس کو یاد رکھتے تھے اور ذوق و شوق کے ساتھ اُسکے تذکرے کرتے تھے۔ یہ ایمان اور عشق و محبت کا قدرتی تقاضا بھی تھا اور وہ اس کو اپنی اہم ذمہ داری، بڑی سعادت اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب کا وسیلہ بھی سمجھتے تھے ــــــ بعض صحابہ مثلاً عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ آپؐ کے ارشادات خود آپؐ کی اجازت سے قلمبند بھی کرتے تھے[۱]

پھر جن لوگوں کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ نصیب نہیں ہوا، اور انھوں نے آپ کے فیضیافتہ صحابۂ کرامؓ کو پایا انھوں نے معلومات و محفوظات کا وہ سارا ذخیرہ اُن سے حاصل کیا۔ اس دَور میں (یعنی دَورِ تابعین میں) خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خاص توجہ اور تحریک سے کتابی شکل میں صحابۂ کرام کی روایت سے احادیث کی جمع و تدوین کا کام شروع ہوا[۲]۔

---

[۱] صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کا یہ بیان موجود ہے کہ عبداللہ بن عمرو حدیثیں لکھا کرتے تھے۔ اور مسند احمد اور سنن ابی داؤد میں خود عبداللہ بن عمرو بن العاص کا بیان مروی ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے اس کی اجازت چاہی تھی اور آپ نے مجھے اس کی اجازت دی تھی۔ ۱۲

[۲] عمر بن عبدالعزیزؒ نے مدینۂ طیّبہ کے اپنے امیر اور قاضی (بقیہ صفحہ ۴۲ پر)

چنانچہ ابن شہاب زہری اور ہمام بن منبہ جیسے علماءِ تابعین نے اس کام کا آغاز کیا، پھر ان کے تلامذہ میں اس کا عام رواج ہوگیا۔

اس دَور کی مرتب کی ہوئی کتابوں میں سے امام مالکؒ کی مؤطا آج تک متداول ہے، اسکے علاوہ جو بہت سے مجموعے اس دَور میں مرتب ہوئے تھے وہ مستقل صورت میں اگرچہ آج سامنے نہیں ہیں لیکن بعد کے تیار شدہ مجموعوں میں وہ پورا علمی سرمایہ محفوظ ہوگیا ہے۔

اس دور کے بعد امام عبدالرزاق، امام ابن ابی شیبہ، امام احمد، اور حافظ الحدیث حُمیدی جیسے سیکڑوں حضرات نے اپنے اپنے انداز پر اس کام کو آگے بڑھایا۔

ان کے بعد امام بخاری، امام مسلم اور اصحاب سنن کا زمانہ آیا، انھوں نے اس سلسلہ میں وہ کام کیا جو اُن کی مرتب کی ہوئی کتب صحاح کی شکل میں آج ہمارے سامنے ہے۔

ان کے بعد انہی کے طرز پر حدیث کے سیکڑوں مجموعے تیار ہوئے اور حدیث کی روایت اور تدوین وحفاظت کا یہ کام کئی صدی مسلسل اسی طرح ہوتا رہا۔ ساتھ ساتھ راویوں کی تنقید اور جرح وتعدیل کا کام بھی خاص اہتمام سے ہوتا رہا، اور اسکے نتیجہ میں چالیس ہزار سے زیادہ راویانِ حدیث کے احوال سے متعلق اسماء الرجال کے عنوان سے ایک مستقل فن اور ایک پورا کتب خانہ تیار ہوگیا۔

اسی کے ساتھ احادیث سے اصول واحکام کے استخراج واستنباط کا کام بھی برابر ہوتا رہا، جس کا ابتدائی نمونہ امام مالک، امام ابو یوسف، امام محمد اور امام شافعی کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے، اور امام بخاری کے تراجم ابواب تو اس کی بہترین مثال ہیں۔

بعد کی صدیوں میں ہر دَور کے علماءِ اُمت نے احادیث کے ان مجموعوں یا انہی سے مرتب ہونے والی دوسری مؤلفات کو اپنی خدمت اور توجہ کا مرکز بنایا، اور ہر زمانہ میں اس کی ضرورت اور اہلِ زمانہ کے مذاق کے مطابق اُن کی شرحیں لکھی گئیں، اور یہ سلسلہ ابتک جاری ہے۔

(صلا کا بقیہ حاشیہ)

ابوبکر بن حزم کو لکھا تھا:۔ انظر ما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاکتبہ فانی خفت دروس العلم وذھاب العلماء۔ (صحیح بخاری)۔

ہمارے اس زمانہ کی غالباً سب سے اہم ایک خصوصیت یہ ہے کہ مغربی علوم و نظریات کی ترقی اور اشاعت نے پوری انسانی دنیا کے طرزِ فکر اور علمی مزاج کو بہت زیادہ متأثر کیا ہے، اسلئے تعلیماتِ محمدیؐ کے آج کے امینوں کی یہ خاص ذمہ داری ہے کہ وہ اس ذہنی و فکری تبدیلی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس بیسویں صدی کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت کو پیش کریں۔

اللہ تعالیٰ نے اب سے دو سو سال پہلے ٹھیک اُس وقت جبکہ ان مغربی علوم و افکار کی ترقی کا آغاز ہو رہا تھا اِس کام کی بنیاد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں سے رکھوا دی تھی۔ اُن کی بے نظیر کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں اس کام کے کرنے والوں اور اس راہ پر چلنے والوں کیلئے پوری روشنی موجود ہے۔ اس عاجز کا خیال ہے کہ حدیث و سنّت کے بارے میں ہمارے اس دَور کے ذہنوں کو مطمئن کرنے کا جیسا سامان اس کتاب میں ہے ایسا پورے اسلامی کتب خانہ کی کسی دوسری کتاب میں نہیں ہے۔

اِس ناچیز نے چونکہ بیسویں صدی کے ذہن اور اس دَور کی خصوصیات کو سامنے رکھ کر اُردو میں شرحِ حدیث کا یہ سلسلہ شروع کیا تھا جس کی یہ تیسری جلد اَب شائع ہو رہی ہے اسلئے اس میں دوسری شروحِ حدیث کی بہ نسبت زیادہ استفادہ "حجۃ اللہ البالغہ" ہی سے کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کے مقاصد و مطالب کی وضاحت اور اس کی حکمت کے بیان میں جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کی ایک خصوصیت تو یہی ہے کہ اُس سے اِس دَور کے ذہن بھی پوری طرح مطمئن ہو سکتے ہیں۔ اسکے علاوہ دوسری بڑی اور اہم خصوصیت اس کی یہ ہے کہ اس کی روشنی میں اُمّت کے فقہاء و مجتہدین کے فقہی و اجتہادی اختلافات کی واقعی نوعیت سامنے آجاتی ہے، اور ایسا نظر آنے لگتا ہے کہ ان ائمہ کے یہ تمام فقہی مسالک ایک درخت کی قدرتی شاخیں یا ایک بڑے دریا سے نکلنے والی نہریں ہیں، ان سب کا سرچشمہ ایک ہی ہے، اور ان میں کوئی تضاد اور حقیقی اختلاف نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری درسگاہوں میں ابھی تک یہ ولی اللّٰہی طریقہ رواج نہیں پا سکا، حالانکہ ہمارے اِس دَور کے لئے اللہ تعالیٰ کی یہ خاص الخاص نعمت ہے۔

معارف الحدیث کی یہ تیسری جلد ابوابِ طہارت اور ابوابِ صلوٰۃ پر مشتمل ہے۔ اس میں بہت سی حدیثیں اُن مسائل سے متعلق بھی ناظرین کرام پڑھیں گے جن میں فقہا کے مسالک مختلف ہیں، اِس عاجز نے

ان کی تشریح میں حضرت شاہ صاحبؒ ہی کے اصولی طریقے کی پیروی کی ہے۔

اِس جلد سے متعلق کچھ ضروری باتیں

معارف الحدیث کی پہلی جلد میں ایمان اور آخرت سے متعلق، اور دوسری میں تزکیۂ قلب و نفس اور اصلاحِ اخلاق سے متعلق احادیث مرتب کر کے پیش کی گئی تھیں، اس تیسری جلد میں اسلام کے پورے نظامِ عبادت یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور اذکار و دعوات کے ابواب کی حدیثیں جمع کر کے نذرِ ناظرین کرنے کا ارادہ تھا، لیکن صرف نماز اور طہارت کے ابواب کے صفحات پانچ سو کے قریب ہو گئے اسلئے اِس جلد کو اسی پر تمام کر دینا پڑا، باقی حصہ انشاءاللہ چوتھی جلد میں پیش ہو گا، اندازہ یہ ہے کہ اُس کی ضخامت بھی اتنی ہی ہو جائیگی۔

پہلی جلد ۱۳۷۳ھ میں شائع ہوئی تھی، دوسری اُسکے ۲ سال بعد ۱۳۷۶ھ میں شائع ہو گئی تھی، یہ تیسری جلد بعض خاص رکاوٹوں کی وجہ سے قریباً ۱۰ سال کے وقفے سے اب شائع ہو رہی ہے، لیکن اسکے بعد والی جلد کے بارے میں اُمید ہے کہ وہ انشاءاللہ آنے والے سال ہی میں ناظرین کی خدمت میں پیش کی جاسکے گی۔

طہارت چونکہ بہت سی عبادات کے لئے خاص کر نماز کے لئے شرط قرار دی گئی ہے، اسلئے عام محدثین کا یہ دستور ہے کہ وہ اپنی مؤلفات میں نماز اور دوسری عبادات کی حدیثوں سے پہلے ابواب طہارت کی حدیثیں ذکر کرتے ہیں، اسی طریقے کی پیروی میں اِس جلد میں بھی پہلے ابواب طہارت کی حدیثیں درج کی گئی ہیں جن کی تعداد صرف ستر ہے، اُسکے بعد ابواب نماز کی حدیثیں ہیں جن کی تعداد ۳۵۱ ہے —— ان حدیثوں کے انتخاب اور ترتیب کا کام بہت غور و فکر سے کیا گیا ہے۔ حدیث پر نظر اور دورِ حاضر کے علمی و دینی تقاضوں کی خبر رکھنے والے حضرات اگر غور فرمائیں گے تو محسوس کرینگے کہ ترجمہ اور تشریح سے قطع نظر یہ انتخاب و ترتیب بجائے خود ایک کام ہو گیا ہے۔

اس سے پہلی دو جلدوں کی طرح اِس جلد میں بھی احادیث کے ترجمہ و تشریح میں اصل مطمح نظر یہ رہا ہے کہ ہمارے اِس دَور کے ذہن رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی عظمت اور

قدر و قیمت کو سمجھیں اور اُن کے اندر اُسکے اتباع کا جذبہ پیدا ہو اور اُس نور اور روشنی سے وہ بھی حصّہ لے سکیں جس سے آپ کی اس تعلیم و ہدایت کے ذریعہ صحابۂ کرامؓ کو حصّہ ملا تھا اسلئے خالص علمی و فنّی اور درسی بحثوں سے دانستہ بچا گیا ہے اور اپنی بساط بھر آسان اور مؤثر انداز میں احادیث کا بس مقصد و پیام واضح کرنے اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے طریقے پر حسبِ ضرورت اس کی رُوح اور حکمت و مصلحت بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

آمین اور رفع یدین جیسے اختلافی مسائل کے بارے میں ناظرین کو ذہنی انتشار اور پریشاں دماغی سے بچانے کے لئے جہاں کچھ لکھنا پڑا ہے تو امکان بھر اس کی کوشش کی گئی ہے کہ مناظرانہ بحث کی شکل نہ بنے ـــــــ اب اس میں جو صحیح اور صواب ہے وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہے، اور جو غلط ہے وہ اِس ناقص العلم کے علم و فہم کا قصور ہے۔

پہلی دونوں جلدوں کی طرح اِس جلد کی حدیثیں بھی زیادہ تر "مشکوٰۃ المصابیح" سے لی گئی ہیں اور تخریج میں اسی پر اعتماد کیا گیا ہے۔ نیز اسی کی پیروی میں یہ طریقہ بھی اختیار کیا گیا ہے کہ جو حدیث صحیح بخاری یا صحیح مسلم سے لی گئی ہے وہ حدیث کی اگرچہ دوسری کتابوں میں بھی ہو لیکن حوالہ صرف صحیح بخاری یا صحیح مسلم ہی کا دیا گیا ہے، کیونکہ کسی حدیث کا ان میں سے کسی ایک میں ہونا بھی اس کی صحت کی کافی ضمانت ہے ـــــــ بعض حدیثیں "جمع الفوائد" سے بھی لی گئی ہیں اور چند "کنز العمال" سے بھی، لیکن اُن کے لئے کنز العمال کا حوالہ التزاماً دیا گیا ہے ـــــــ بعض حدیثیں براہِ راست صحاح کی کتابوں صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد وغیرہ سے بھی لی گئی ہیں، یہ وہی حدیثیں ہیں جو ان الفاظ کے ساتھ مشکوٰۃ یا جمع الفوائد میں مذکور نہیں ہیں۔

جیسا کہ پہلی دونوں جلدوں کے دیباچہ میں بھی لکھا جا چکا ہے چونکہ اس سلسلہ (معارف الحدیث) کا اصل مقصد دعوت اور تذکیر و تفہیم ہے اسلئے متن حدیث کے ترجمہ میں نحوی ترکیب اور لفظی ترجمہ کی پابندی ضروری نہیں سمجھی گئی ہے، بلکہ حدیث کے مقصد اور پیام کو واضح کرنا پیشِ نظر رکھا گیا ہے، اور اسی نقطۂ نظر سے کسی حدیث کو مقدم یا مؤخر کیا گیا ہے۔

اپنے باتوفیق ناظرین سے آخری گزارش یا وصیت

پہلی دونوں جلدوں کے دیباچہ میں بھی یہی کی گئی تھی، اور اب بھی یہی ہے ——— کہ

حدیثِ نبویؐ کا مطالعہ صرف اضافۂ معلومات کے لئے اور علمی سیر کے طور پر ہرگز نہ کیا جائے، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے ایمانی تعلق کو تازہ کرنے کے لئے اور رشد و ہدایت حاصل کرنے اور عمل کرنے کی نیت سے کیا جائے، نیز درس و مطالعہ کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت کو دل میں بیدار کیا جائے اور اس طرح ادب اور توجہ سے پڑھا یا سنا جائے کہ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں ہم حاضر ہیں اور آپ فرما رہے ہیں اور ہم سن رہے ہیں ——— اگر ایسا کیا گیا تو قلب و روح کو ان انوار و برکات اور ایمانی کیفیات کا کچھ نہ کچھ حصہ انشاء اللہ ضرور نصیب ہوگا جو عہدِ نبویؐ کے اُن خوش نصیبوں کو حاصل ہوتی تھیں جن کو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست روحانی و ایمانی استفادہ کی دولت عطا فرمائی تھی ———

آخری کلمہ اللہ کی حمد ہے، اور اس خدمت کے اتمام کیلئے حسنِ توفیق کی

استدعا ——— اور

غلطیوں اور گناہوں کی معافی کی التجا!

اللہ کی رحمت اور اُسکے بندوں کی دعاؤں کا محتاج و طلبگار

عاجز و گنہگار بندہ

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

یکم رمضان ۱۳۸۴ھ ——— ۵ جنوری ۱۹۶۵ء

آخری قسط

تجلیاتِ مجددِ الفِ ثانیؒ
مکتوبات کے آئینے میں

ترجمہ ——— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

[الحمد للہ کہ یہ سلسلہ جو صفر ۱۴۰۰ھ میں شروع ہوا تھا۔ اس قسط پر بخیر و خوبی تمام ہو رہا ہے۔ گزشتہ اشاعت کی قسط پر غلطی سے آخری قسط لکھ گیا تھا امید ہے کہ ناظرین نے تصحیح فرمالی ہوگی ——— ادارہ]

مکتوب (۱۰۳)۔ شیخ حمید اجمیری کے نام:-

[تحصیل کمال و تکمیل کی ترغیب میں]

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ——— برادرم شیخ حمید کا مکتوب گرامی پہونچا۔ خوش وقت کیا ——— اس زمانۂ پُرفتن میں یہ کتنی بڑی نعمت ہے کہ کسی شخص کی صحبت سے ایک جماعت و گروہ کو جناب قدس خداوندی جلّ سلطانہٗ سے رغبت ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کے ماسویٰ سے لوگوں کے دل سرد ہو جائیں اور اس کے باوجود وہ شخص اس دولت پر مغرور نہ ہو اور اپنے کام سے بے فکر نہ رہے ——— کیونکہ مثل مشہور ہے ہنوز دہلی دور است (ابھی دہلی دور ہے) معلوم نہیں کہ سَو میں سے ایک کام بھی انجام پاگیا ہے یا نہیں؟ اور یہ حالات جو طالبوں کو ابتدا میں ظاہر ہو جاتے ہیں اور ذوق و لذت بخشتے ہیں یہ تو بالکل ایسے ہیں جیسے بچوں کو الف، ب کا سبق پڑھائیں۔ اصل کام یہ ہے کہ حروف تہجی سے آگے درجۂ مولویت (فاضلیت) پر فائز ہوں اور اذواق و اشواق کے ذریعہ درجۂ ولایت خاصہ

میں داخل ہو جائیں۔

ہنوز ایوانِ استغنا بلند است ؎ ترا فکرِ رسیدن ناپسند است

چاہیئے کہ اپنے اوقات کو آباد رکھیں اور شریعت و طریقت سے ظاہر و باطن دونوں حیثیتوں سے آراستہ رہیں ــــ دوسرے کی تکمیل اپنے کمال کی فرع ہے اور کمال، درجۂ ولایتِ خاصہ میں ہے ــــ لیکن جب کہ تمھاری صحبت میں طالبوں کے اندر رشد و ہدایت ظاہر ہوتی ہے اور احوال و مواجید رونما ہوتے ہیں اگرچہ وہ احوال بحد فنا و بقا نہ ہوں ــــ غنیمت ہے ــــ اور اس زمانہ میں (اپنی کمیابی کی بنا پر) یہ چیز بھی کبریتِ احمر (اکسیر) کا حکم رکھتی ہے۔ اس (تعلیم طریقت کے) کام کو بھی کرو لیکن مناسب بلکہ لازم یہ ہے کہ جس کسی کو تعلیم طریقت دو بعد استخارہ و توجہ تعلیم دو ــــ اور اس عمل سے ترساں و لرزاں بھی رہو، ایسا نہ ہو کہ اس (پیری مریدی) کے راستے سے شیطان کا غلبہ تم پر ہو جائے ــــ ہم اللہ سے پناہ مانگتے ہیں شیطان کے شر سے ــــ جو تعداد (ذکر کے سلسلے میں) تم کو بتائی گئی تھی اگر اسکو پورا کر دیا ہے تو اُس سے دوگنی تعداد کو پورا کرو اس کے بعد خبر کرو تاکہ مناسب حال ہدایت کی جائے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اُن دوستوں کو جو تم سے وابستہ ہیں میری دُعا پہونچا دو۔ سید یحییٰ نے جو صحیفۂ شریفہ بھیجا تھا وہ بھی پہونچ گیا ــــ اللہ کا شکر ہے کہ اس زمانے میں جو کہ کمالِ قربِ قیامت اپنے اندر رکھتا ہے اور حدیث میں آیا ہے "قیامت قائم نہ ہوگی مگر بُرے لوگوں پر" (یعنی جب نیک آدمی مر جائیں گے اور صرف بد لوگ باقی رہیں گے اس وقت قیامت ہو جائے گی اور جب تک نیکوں کا وجود دُنیا میں ہے قیامت نہ آئے گی) ــــ ایسے وقت قربِ قیامت میں بھی لوگوں کے دل حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ کی طرف کھنچ رہے ہیں اور وہ اس درگاہِ اقدس کے والہ و شیدا ہیں ــــ احباب سے توقع ہے کہ خیریت کی حالت میں دُعائے سلامتیٔ خاتمہ کرتے رہیں گے ــــ رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر ــــ والسلام اوّلاً و آخراً۔

عہ ابھی ایوان استغنا بہت اونچا ہے اور تجھے رسائی کی فکر ناپسند ہے۔

مکتوب (۱۰۵): شیخ حسن برکی کے نام — [ترغیب بر احیائے سنت و تہدید از بدعت]

صحیفۂ شریفۂ برادرم شیخ حسن ۔ احسن اللہ آمالہ ـــ پہونچا ـــ خوشوقت کیا ـــ اس میں علوم و معارف مندرج تھے اُن کے مطالعے نے فرحت پر فرحت بڑھائی ـــ الحمد للہ کہ علوم صحیحہ اور معارفِ صادقہ ہیں کتاب و سنت کے مطابق اور عقائد فرقۂ ناجیہ (اہلسنت) کے موافق ہیں ۔ حضرت حق سبحانہ استقامت نصیب فرمائے اور مقاصد علیہ کی انتہا تک پہونچائے ـــ بدعتوں کے دور کرنے اور مٹانے کے بارے میں بھی تم نے کچھ لکھا تھا ۔ کتنی بڑی نعمت ہے کہ اس طرح کی ظلمات بدعت میں کوئی خوش نصیب بدعتوں میں سے کسی ایک بدعت کو مٹانے کی توفیق پائے اور سنتوں میں سے کسی ایک سنت کو زندہ کرے ۔ احادیثِ صحاح میں آیا ہے کہ جو کوئی ایک سُنّت کو زندہ کرے گا درانحالیکہ اس سنت پر عمل ترک کر دیا گیا ہو تو اس سنت کو زندہ کرنے والے کو سَو شہیدوں کا ثواب ہے ۔ اس مقام سے اس عمل کی عظمت کا اندازہ لگائیں ـــ لیکن اتنا ملحوظ رکھیں کہ کوئی فتنہ کھڑا نہ ہونے پائے اور ایک حسنہ، ظہور ہزار سیئہ کا باعث نہ بن جائے اس لیے کہ آخر زمانہ ہے اور ضعف اسلام کا وقت ہے ـــ

رسالہ جو بھیجا تھا اُس کے مطالعے سے بھی مسرّتیں حاصل ہوئیں ۔ الحمد للہ کہ تم کو علوم میں اس فقیر سے بہت مناسبت ہے اور کشف میں بھی مطابقت ہے ، نیز نظر بھی بہت بلند ہے ۔ تمہارا خط جو کہ حالات اور علوم و استفسارات پر مشتمل تھا میں نے خواجہ محمد ہاشم کشمی کے سپرد کر دیا تھا کہ جوابات لکھنے کے وقت اس کو میرے سامنے پیش کر دیں اتفاقاً انھوں نے اس کو گم کر دیا اس بنا پر جوابات کی تفصیل میں توقف ہوا جو بات یاد رہ گئی تھی اُس (کے جواب) کو لکھ دیا گیا ۔ مجملاً یہ ہے کہ احوال ، پسندیدہ ہیں اور صحت علوم حاصل ہے ـــ دوسری بات یہ لکھنا ہے کہ مغفرت مآب مولانا احمد (برکی) کے بچوں کی تعلیم و تربیت میں سعئ بلیغ کو ملحوظ رکھیں اور ان کو آدابِ ظاہر و باطن کی ہدایت کریں ۔ تمام دوستوں کو بلکہ وہاں کے جمیع اہلِ اسلام کو شریعت اور التزامِ سنت کی راہ دکھائیں ۔

اور بدعت کے ارتکاب سے ڈراتے رہیں اللہ تعالیٰ توفیق دینے والا ہے۔ مکاتیب جلد ثالث میں سے بعض مکتوبات خواجہ محمد ہاشم نے لکھوا کر تمہیں بھیجے ہیں ان سے نفع حاصل کروگے ــــ اوقاتِ فقیر مختلف ہیں، بعض اوقات علوم و معارف کی تحریر کی جانب بے اختیار رغبت ہوتی ہے اور بعض دوسرے اوقات میں باوجودیکہ عجیب و غریب اسرار کا ورود ہوتا ہے مگر لکھنے سے طبیعت بھاگتی ہے یہاں تک کہ ہاتھ میں قلم پکڑنا اچھا معلوم نہیں ہوتا ــــ اسی وجہ سے تمہارے مکتوبات کے جواب کی تفصیل میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے اور تکلف سے کچھ لکھ نہیں سکتا ــــ باقی حالات مستوجب حمد ہیں ــــ ہمراہی لشکر سے بعنایت خداوندی خلاصی و رہائی نصیب ہو گئی ہے۔ حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ استقامت سے رکھے۔ اس جگہ کے تمام دوستوں کے لیے دعوات مخصوصہ ہیں۔ والسّلام ــــ

مکتوب ۱۰۶ :۔ صاحبزادگان گرامی قدر (حضرت خواجہ محمد معصومؒ اور حضرت خواجہ محمد سعیدؒ) کے نام ــــ [آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب میں لکھنا]

فرزندانِ گرامی کا مکتوب پہونچا ــــ اللہ کا شکر ہے کہ صحت و عافیت سے ہو ــــ ایک تازہ مناجی بشارت آج نمودار ہوئی ہے لکھتا ہوں۔ غور سے سنیں ــــ گزشتہ رات جو کہ شنبے کی رات تھی، مجلس سلطان جہانگیر میں گیا تھا۔ ایک پہر رات گزرنے کے بعد واپس آگیا۔ تین پارے حافظ سے سُنے۔ دو پہر رات گزر گئی تھی کہ نیند میسر آئی ــــ حلقۂ صبح کے بعد ــــ چونکہ رات کی ماندگی تھی ــــ سو گیا ــــ خواب میں دیکھتا ہوں کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم فقیر کے لیے اجازت نامہ تحریر فرما رہے ہیں جس طرح کہ مشائخ کا طریقہ ہے اپنے خلفاء کو اجازت نامہ لکھا کرتے ہیں ــــ ایک دوست بھی اس وقت موجود ہے ــــ اس اثنا میں یہ بات ظاہر ہوئی کہ گویا اجازت نامے کے اجراء میں کچھ تاخیر ہے۔ تاخیر کی وجہ بھی اس وقت تعین کے ساتھ معلوم ہو گئی ہے۔ وہ دوست جو اس کام کے سلسلے میں پیش کار کی حیثیت سے ہے گویا کہ دوسری مرتبہ اس اجازت نامے کو خدمت اقدس سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم میں لے جاتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجازت نامے کی پشت پر ایک اور اجازت نامہ خود تحریر فرمایا، کہ

یا دوسرے کو لکھنے کے لیے حکم فرمایا ہے یہ بات تعین کے ساتھ نہ معلوم ہو سکی ـــ لیکن اس اجازت نامے کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت ہونا معلوم و متعین ہے ـــ لکھنے یا لکھوانے کے بعد اپنی مُہر مبارک سے اس کو مزین فرمایا ہے۔ اس اجازت نامے کا مضمون و مفہوم یہ ہے کہ اجازت نامۂ دنیا کی جگہ اجازت نامۂ آخرت دیا گیا ہے اور مقام شفاعت سے حصہ عنایت فرمایا گیا ہے

کاغذ بھی طولانی ہے اور سطریں بھی بہت زیادہ تحریر فرمائی گئی ہیں، میں اس وقت سے دریافت کر رہا ہوں کہ پہلا اجازت نامہ کون سا ہے اور بعد کو جو اجازت نامہ تحریر فرمایا گیا ہو وہ کون سا ہے؟ ـــ میں اس وقت یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک جگہ ہیں اور جس طرح بیٹا باپ کے ساتھ گزر بسر کرتا ہے میں بھی اسی طرح زندگی بسر کر رہا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہلبیت میرے حق میں اجنبی نہیں ہیں (بلکہ مجھ سے واقف ہیں) میں اس کاغذ کو لپیٹ کر اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے فرزندانِ محرم کی طرح داخلِ حرم شریف ہو گیا ہوں۔ عظیم المرتبت اُمہات المومنین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں مجھ سے بعض خدمات کے متعلق اہتمام کے ساتھ فرما رہی ہیں اور ارشاد فرما رہی ہیں کہ ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ یہ یہ امور انجام دیئے جائیں ـــ اسی اثنا میں آنکھ کھل گئی .....

ان ایام میں معارف غریبہ اور علوم عجیبہ ظاہر ہو رہے ہیں .... لڑکے دور ہیں اور خاتمۂ عمر نزدیک آپہونچا دیکھو کیا ہوتا ہے؟ ـــ "اللہ جو کرتا ہے اسی میں خیر ہے" یہ کہتا ہوں اور صبر کرتا ہوں ـــ رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ ـــ

مکتوب (۱۷۰): خواجہ محمد اشرف کے نام ـــ [نسبت رابطہ اور لذت طاعات میں خلل کس طرح واقع ہوتا ہے]

بعد الحمد والصلوٰۃ و تبلیغ الدعوات ـــ تمہارا مکتوب پہونچا ـــ الحمد للہ کہ صحت و عافیت سے ہو۔ تم نے دریافت کیا تھا کہ کیا وجہ ہے کہ جب نسبتِ رابطہ میں خلل واقع ہوتا ہے تو تمام طاعات کی ادائیگی میں لذت محسوس نہیں ہوتی؟ جاننا چاہیے کہ جو چیز نسبت رابطہ میں نقصان و خلل کا باعث ہوئی ہے وہی مانعِ لذت طاعات ہے ـــ کبھی ایسا

ہوتا ہے کہ بسبب خللِ رابطہ، قبض (انبساط و کشادگی قلب کا نہ ہونا) ہوتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لغزشوں کے ارتکاب کے باعث چاہے لغزشیں تھوڑی سی ہوں ـــــ قلب پر کدورت طاری ہو جاتی ہے ـــــ پہلی صورت بُری نہیں ہے بلکہ سلوک کے لوازم میں سے ہے اور دوسری صورت کے طاری ہونے پر توبہ و استغفار کے ذریعے تدارک کرنا چاہیے۔ تاکہ اللہ کے کرم سے اس کا اثر زائل ہو جائے ـــــ چونکہ قبض اور کدورت کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہوتا ہے اس لیے بہر حال توبہ و استغفار فائدہ مند ہے، حق تعالیٰ استقامت کے ساتھ رکھے ـــــ والسلام ـــــ

مکتوب (۱۱۲)۔ قاضی اسلم[ع] کے نام ـــ [صفاتِ باری تعالیٰ نہ عینِ ذات ہیں نہ غیرِ ذات]

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ـــــ علمائے اہل سنت وجماعت نے ـــــ اللہ تعالیٰ ان کی سعی کو مشکور فرمائے ـــــ واجب الوجود کی آٹھوں صفاتِ حقیقیہ کے بارے میں کیا اچھی بات فرمائی ہے کہ "نہ وہ عینِ ذات ہیں اور نہ غیرِ ذات" ـــــ یہ معرفت عقل کے طور و انداز سے ماوراء ہے اس حقیقت کو انھوں نے نورِ فراست سے ـــــ پایا ہے ـــــ عقلاء و حکماء اس قولِ مذکور کو ارتفاعِ نقیضین سمجھ بیٹھے (اور اسی وجہ سے لا عین و لا غیر کو نہیں مانتے) انھوں نے یہ نہیں سمجھا کہ حصولِ تناقض کے لیے اتحادِ مکان اور اتحادِ زمان بھی شرط ہے اور جب اس ذاتِ اقدس کے لیے مکان و زمان کی گنجائش ہی نہیں ہے تو پھر تناقض کس طرح متصور ہوگا؟ ـــــ اور وہ جو (بعض) علماء نے تناقض کو دفع کرنے کے لیے لفظِ غیر

ع میر محمد اسلم ہروی، میرزا و صاحب رسالہ کے والد ماجد ہیں۔ خواجہ کوہی جو کہ سرخیل مشائخ خراسان تھے ان کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ ہرات میں پیدا ہوئے لاہور کے علماء سے استفادہ کیا۔ بعد تکمیل علم آگرہ گئے۔ سلطان جہانگیر نے ان کو کابل کا قاضی بنایا۔ بعدہٗ عسکر سلطانی کا قاضی بنایا۔ بعد وفات جہانگیر عہدۂ سابق پر بحال ہوئے شاہ جہاں کو ان کا بہت اکرام کرتے تھے۔ لیکن بوجہ علالت ۱۰۴۱ھ میں مستعفی ہو کر لاہور چلے گئے وہیں وفات ہوئی اور وہیں دفن ہوئے (مرجانات قلمی مولفہٗ مولانا حکیم فخر الدین حسنی رائے بریلوی) نزہۃ الخواطر جلد پنجم میں مآثر الامراء کے حوالے سے تاریخ وفات ۱۰۶۱ھ اور مقام دفن کابل نقل کیا ہے۔ سبحۃ المرجان میں علامہ آزاد بلگرامی نے ان کا مدفن لاہور لکھا ہے۔

میں تاویل کی ہے (کہ غیر کے معنی مُبائن اور منفک کے ہیں یعنی صفات باری، باری تعالیٰ سے جُدا نہیں ہیں) اور لفظ غیر کے ایک خاص معنیٰ چاہے ہیں ــ اس تاویل کی چنداں ضرورت نہیں ہے بلکہ نظر کشفی اس خاص معنیٰ کے نکالنے کو منع کرتی ہے اور غیریت کی نفی کرتی ہے، خواہ غیریت کسی معنیٰ میں ہو...... اور یہ جو کہا گیا کہ یہ معرفت) طورِ عقل کے ماوراء ہے اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ عقل اس معرفت تک راہ یاب نہیں ہوتی اور اس کے ادراک سے عقل قاصر ہے یہ بات نہیں ہے کہ عقل اس کے برخلاف حکم کرتی ہے ــ اس کے برخلاف کس طرح حکم کرے گی؟ جب کہ اس کا تصور تک نہیں کر سکتی بلکہ وہ (معرفت) اس کے احاطۂ ادراک سے باہر ہے پھر بھلا (بیچاری عقل) اثبات و نفی کا حکم کیسے لگا سکتی ہے ــ ربنا اٰتنا من لدنک رحمۃً وھیّئ لنا من امرنا رشدا ــ

مکتوب (۱۱۹): خواجہ ابوالمکارم کے نام ــ [ترغیب خدمتِ خلق]

حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ تم کو حدِ اعتدال اور مرکزِ عدالت پر استقامت نصیب فرمائیں ــ کتنی بڑی دولت ہے یہ کہ خداوند تعالیٰ کسی بندے کو بعض فضائل کے ساتھ مخصوص کر کے اپنے بندوں کے حوائج کی کنجی اس کے دستِ تصرف میں دے دے اور اس شخص کو ان لوگوں کا ملجا و ماویٰ بنا دے ــ کتنی بڑی نعمت ہے کہ مخلوق کی ایک جماعت کو ــ کہ اپنے کمالِ کرم سے اس کو اپنا عیال فرمایا ہے ــ اس شخص سے متعلق کر دے اور اس جماعت کی تربیت و پرورش کو اس کے سپرد کر دے ــ وہ سعادت مند ہی ہو گا جو اس دولت پر حمد پروردگار کرے اور وہ دانشمند ہی ہو گا جو اس نعمت پر شکرِ خدا بجا لائے اور حق تعالیٰ کے عیال (مخلوق) کی خدمت گاری کو اپنی سعادت تصور کرے نیز اپنے مولائے حقیقی کے بندوں اور بندیوں کی تربیت کو اپنا شرف سمجھے ــ الحمد للہ کہ آپ کے علاقے کے لوگ آپ کے ذکرِ خیر سے تر زبان ہیں اور آپ کے کرم و احسان کا تذکرہ کیا کرتے ہیں۔

مکتوب (۱۲۰): میر منصور کے نام ــ

الحمد للہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ ــ تمہارے مکتوبات

یکے بعد دیگرے پہونچے ـــــ خوشوقت کیا ـــــ اللہ کا شکر ہے کہ بے مناسبتی فقراء کے اسباب موجود ہوتے ہوئے بھی فقراء سے محبت وارتباط کا جو معاملہ رکھتے تھے ـــــ اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا اور کسی قسم کی منافات یا کوتاہی رونما نہیں ہوئی بلکہ ارتباط سابق میں اور پختگی پیدا ہوگئی ـــــ اللہ تعالیٰ اس طائفۂ صوفیہ کی محبت میں استقامت عطا فرمائے کیونکہ یہ چیز سرمایۂ سعادت ہے ـــــ شفقت شعارا! اس زمانے میں یکسو رہنے کا شوق غالب آگیا ہے اور گوشہ نشینی اختیار کرلی ہے اور (فی الحال) سوائے جمعہ کے مسجد میں نہیں جاتا ـ جماعت پنجوقتی خانقاہ ہی میں منعقد ہوتی ہے ـــــ (عام طور پر) لوگوں سے ملاقات بھی بند ہے ـ اوقات، جمعیت قلب کے ساتھ بسر ہورہے ہیں اور تمام عمر کی آرزو اب میسر آئی ہے ـــ حمد اللّٰہِ سُبحانہ علیٰ ذٰلِکَ ـــ باقی احوالِ صوری بھی عافیت سے مقرون ہیں اور "فرزندان و متعلقان" بھی جمعیت خاطر کے ساتھ گزر بسر کررہے ہیں ـــ جناب خواجہ عبداللہ (صاحبزادہ حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ) ماہ مبارک رمضان سے پہلے دہلی تشریف لے گئے ـــ الحمد للہ کہ خواجہ عبداللہ نے یہاں آکر بہت فوائد حاصل کرلیے اور ان کو ترقی تمام میسر ہوئی نیز غلبات توحید سے دریائے تنزیہہ میں غوطہ زن ہوکر دریائے تنزیہہ کی گہرائی کی طرف متوجہ ہیں اور ظاہر سے باطن بلکہ باطن کے باطن کی طرف چل رہے ہیں۔ حافظ بہاء الدین جو کہ وہاں جارہے ہیں یہاں کے احوال شاید تفصیل سے بیان کریں ـــــ

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۲)

ساری احادیث کو جمع کرنے کی ضرورت ہوگی اور یہ اس دور میں بڑا مشکل ہے۔ اس کے جواب میں 'میں (شاہ صاحب) کہتا ہوں کہ اس میں زیادہ دردسری کی ضرورت نہیں ہے' (کتب حدیث میں سے) صرف موطا، صحیحین (صحیح بخاری اور صحیح مسلم) سنن ابوداؤد اور جامع ترمذی کی طرف لوٹنا چاہیے۔ یہ کتابیں مشہور و معروف ہیں اور قلیل مدت میں ان پر دسترس ہوسکتی ہے لیکن ان کتابوں میں جادۂ قویمہ کی معرفت نور باطن کی محتاج ہے اور یہ نور اللہ تعالیٰ ہی عطا کرتا ہے' پس اگر تیرے قلب میں یہ نور باطن نہ ہو اور تیرے بھائیوں میں سے کسی نے اس کی طرف سبقت کی ہو اور اس نے تجھے ایسی زبان میں سمجھا دیا جس کو تم سمجھتے ہو تو اس کے بعد (جادۂ قویمہ کے خلاف جانے میں) تجھے معاف نہ کیا جائے گا۔[1]

[1] تفہیمات الٰہیہ۔ ج ۱ ص ۱۵۲-۱۵۱

شریعت کا جادۂ قویمہ شاہ ولی اللہ کی نظر میں

مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی

شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ انھیں شارع علیہ السلام کی جانب سے امت مرحومہ کے اختلافات دور کرنے کا روحانی القا ہوا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ جہاں تک فقہی فروعات کا تعلق ہے آپ، آپ کی اولاد اور آپ کے تربیت یافتہ تلامذہ سب کے سب ان امور میں امام ابوحنیفہؒ کے پیرو تھے، لیکن اس ضمن میں ان کے طریقے میں وہ جمود نہیں تھا، جو آج کل پایا جاتا ہے، اور یہ کہ شاہ صاحبؒ کے بتائے ہوئے جادۂ قویمہ پر ان کا عمل تھا، میرے اس مدعا کے پہلے جزو کے اثبات کے لیے فیوض الحرمین کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

إن النبي صلى الله عليه وسلم نفخ إلي نفخة أخرى فبين أن مراد الحق فيك أن تجمع شملا من شمل الامة المرحومة بك وإياك أن تخالف القوم في الفروع[1]	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے (ایک روحانی سوال کے جواب میں) ایک اور خوشبو آئی اور ظاہر ہوا کہ یہ حق تعالیٰ کی مراد ہے کہ تیرے ذریعہ امت مرحومہ کے تشتت کو دور کرے اور خبردار فروع میں کبھی قوم کا مخالف نہ ہونا۔

شاہ صاحبؒ حنفی مذہب فقہ کی تقلید میں جمود کے امکان کو اپنے تجویز کردہ جادۂ قویمہ کے ذریعہ ختم کرنے کی کوشش فرماتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ایک مکاشفے میں فقہ حنفی کے

---

[1] فیوض الحرمین صفحہ ۶۲ طبع احمدیہ متعلق مدرسہ عزیزیہ دہلی۔

ساتھ سنت کی تطبیق کا ایک نمونہ پیش کرکے فقہی تقلید کے حامیوں کے لیے غور و فکر کا دروازہ کھول دیتے ہیں، فرماتے ہیں۔

ثم کشف لی أنموذجا ظھر لی	پھر میرے لیے ایک اور نمونے کا انکشاف کیا
منه تطبیق السنة بفقه الحنفیة	جس سے فقہ حنفی سے سنت کی تطبیق کا راستہ
من الاخذ بقول احد الثلاثة	کھل گیا (جو یہ ہے) کہ ائمہ ثلاثہ (امام
وتخصیص عموماتهم والوقوف	ابو حنیفہ ابو یوسف اور محمد) میں سے کسی
علی مقاصدهم والاقتصار علی	ایک کے قول کو اختیار کیا جائے۔ اور ان کے
ما یفهم من لفظ السنة ولیس	عمومات کی تخصیص، اور ان کے مقاصد پر توقف
فیه تاویل بعید و لا ضرب	کے بعد سنت کے ظاہر الفاظ سے جو مفہوم
بعض الاحادیث بعضا ولا رفضا	ہوتا ہے، اس پر اقتصار کیا جائے۔ اس
لحدیث صحیح بقول احد من	میں نہ تو بعید تاویل کی ضرورت پڑتی ہے، اور
الائمة وهذه الطریقة ان	نہ بعض احادیث کا بعض سے ٹکراؤ ہوتا ہو
أتمها الله واکملها فهی الکبریت	اور نہ کسی ایک امام کے قول کے لیے صحیح
الاحمر والاکسیر الاعظم [1]	حدیث کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اس طریقے کو اگر
	اللہ تعالیٰ پورا اور کامل کرے تو کبریت
	احمر اور اکسیر اعظم ہے۔

اس تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہ احناف میں سے جس امام کا قول صحیح حدیث کے موافق ہو، اس کو اختیار کیا جائے، اور اسے اپنا فقہی مذہب قرار دیا جائے۔ اس طرح کسی امام کے قول کے لیے صحیح حدیث نہیں چھوڑنی پڑے گی۔

فقہی تقلید کے سلسلے میں شاہ صاحبؒ اپنے زمانے کے عوام کی حالت بیان کرتے ہوئے تفہیمات الٰہیہ میں فرماتے ہیں۔

[1] فیوض الحرمین صفحہ ۶۲-۶۳

آج کل تمہیں عوام کی یہ حالت دیکھنے میں آئے گی کہ انھوں نے متقدمین کے مذاہب فقہ میں سے کسی ایک امام کے مذہب سے اپنے آپ کو ایسا وابستہ کر رکھا ہے کہ اگر کوئی اس (مخصوص) مذہب کو اس کی تقلید کے بعد چھوڑ دے چاہے وہ چھوڑنا ایک مسئلے ہی میں کیوں نہ ہو، اس کو وہ دین واسلام سے نکلنے کے مرادف خیال کرتے ہیں! اس سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس کی تقلید کی جا رہی ہے وہ (ان کے خیال میں) ان کی طرف ایک نبی مرسل ہے جس کی اطاعت ان پر فرض کی گئی ہے۔

چوتھی صدی ہجری سے قبل امت کے اولیں لوگ (فقہاء میں سے) کسی ایک مذہب کے پابند نہ تھے۔ ابو طالب قوت القلوب میں لکھتے ہیں کہ کتابوں کے مجموعے سب نئی چیزیں ہیں، لوگوں کے اقوال کو (سند میں) پیش کرنا، ان میں سے کسی شخص واحد کے قول پر فتوے دینا ہر شے میں اس کے قول کو حجت جان کر اس کو نقل کرنا اور اس کے مذہب پر تفقہ حاصل کرنا، یہ پہلے لوگوں کا طریقہ نہ تھا۔ پچھلے دور کے عوام کا یہ دستور تھا کہ وضو، غسل، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، نکاح، بیع اور دوسرے روزمرہ کے پیش آنے والے امور کے احکام کو اپنے آباؤ اجداد اور اپنے شہر کے اساتذہ سے سیکھتے تھے، اور جب کوئی نیا واقعہ ان کو پیش آتا تھا تو مفتیوں کی طرف رجوع کرتے تھے، چاہے وہ مدینہ کے مفتی ہوں یا کوفہ کے۔ وہ ان کے فتووں پر عمل کرتے تھے۔ (باقی) ان میں سے خواص لوگ جو کہ حدیث کے اصحاب، حامل تھے اور جاننے والے تھے، وہ ان مسائل میں جو احادیث اور آثار سے واضح طور پر معلوم ہوتے تھے، صرف شارع علیہ السلام کی تقلید کرتے تھے، اور جہاں ان کے بارے میں انھیں واضح حدیث نہ ملتی تھی وہ ان میں دوسرے ائمہ کے اقوال اور آراء کی اس وقت تک پیروی کرتے جب تک ان کو حدیث سے ان کے متعلق کوئی واضح دلیل نہ مل جاتی۔ خواص میں سے جو لوگ تخریج مسائل کے اہل ہوتے تھے، وہ فقہا میں سے کسی فقیہہ کے قول منصوص یا بصورت عدم قول منصوص، اس کے بتائے ہوئے قواعد پر مسائل کی تخریج کرتے تھے۔

بعض اہل کشف ایسے بھی گزرے ہیں کہ جب لوگوں نے (فقہا کے) مذاہب کی تقلید کو اختیار کیا تو وہ کسی ایک مذہب کی پابندی کے خلاف تھے، جیسے کہ شیخ ابن عربی، انھوں

نے فتوحات مکیہ اور اپنی دوسری تالیفات میں لکھا ہے کہ بندہ اپنے (فکری) ارتقا کے دوران ان لوگوں کے مقامات سے گزرتا ہے جو فقہا میں سے کسی ایک مذہب کی پابندی کرتے ہیں، وہ اپنے اس ارتقا میں اس منبع اور سرچشمہ کو پالیتا ہے جہاں سے اس مقلد کے امام نے اپنے اقوال حاصل کیے تھے۔ وہاں وہ دیکھتا ہے کہ جمیع ائمہ کے اقوال اس ایک ہی سمندر سے چلو بھرتے ہیں۔ (ایسی حالت میں) اس سے کسی ایک مخصوص مذہب کی پابندی اور تقلید چھوٹ جاتی ہے اور وہ اپنی سابقہ راشے کے خلاف سب مذاہب کو یکساں اور مساوی خیال کرتا ہے (اہل مکاشفہ میں سے) بعض اس لیے (کسی خاص فقہی مذہب کی) پابندی کرتے ہیں تاکہ عوام میں اختلافات پیدا نہ ہوں یا انھیں خواب میں بعض مذاہب کے متعلق کچھ جہات مرجح نظر آتے ہیں، اس لیے وہ اس کی تقلید کو اختیار کر لیتے ہیں۔

بعض نقاد علماء ایسے بھی گزرے ہیں کہ اپنے عمل میں یا دوسروں کے لیے فتاویٰ دینے میں کسی خاص مذہب کے پابند نہ تھے جیسے کہ ابو محمد جوینی، انھوں نے محیط نامی ایک کتاب لکھی ہے جس میں انھوں نے کسی ایک مذہب کے اقوال کا التزام نہیں کیا۔ اس روایت کو شیخ جلال الدین سیوطی اور شیخ عبد الوہاب شعرانی نے ایک ایسی جماعت سے نقل کیا ہے جس کا احصا مشکل ہے۔ لیکن ظاہر اور مشہور یہی ہے کہ اکثر فقہا کسی ایک مذہب کے پابند ہوتے تھے۔

بہرحال علماء کے اس قسم کے (فقہی) اختلاف نے قوم کو خوف زدہ کر دیا اور بعض کو بعض کے اقوال کے انکار پر اکسایا اور پھر اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صریح حکم بھی مروی نہیں جس کی طرف کہ رجوع کیا جائے۔

یہ لکھنے کے بعد شاہ صاحبؒ تحدیث نعمت کے طور پر فرماتے ہیں:۔

میرے اوپر اللہ کی بڑی نعمتوں سے ایک بڑی نعمت یہ ہے کہ مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ شارع علیہ السلام نے ہمیں ایسے دو علم عطا فرمائے ہیں جو احکام کے لحاظ سے ایک دوسرے سے متمایز اور مراتب میں متغایر ہیں۔ ایک علم مصالح و مفاسد اور دوسرا علم شرائع و حدود۔ اور میں ان دونوں کو گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ وہ صاحب شرف علم ہے جس کی طرف مجھ سے پہلے کسی نے سبقت نہیں کی اور نہ کسی نے اس کے اصول اور فروع کو بیان کیا، اور نہ

اس نے مسائل کو حل کو کیا۔

میرے اوپر اللہ کی بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ جادۂ قویمہ کے ضبط و ترتیب کے بعد مجھ پر فقہاء کے اختلاف کے اسباب کا بھی انکشاف ہوا۔ جادۂ قویمہ کی طرف بعض ایسی تفاصیل اور تفریعات میں اشارہ کر چکا ہوں جو کہ مقدمات کلیہ میں محصور اور مضبوط ہیں جس نے ان کو سمجھا اور ان پر یقین کیا، وہ مواضع اختلاف کے سمجھنے میں لیت و لعل نہیں کرے گا اور جادۂ قویمہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے مستقل طور پر متمثل پائے گا۔ وہ تفاصیل کو ایک ضروری امر خیال کرے گا۔ کہ طریقہ نبوت و ملت، کو اس کے ماخذ اور منبع سے لینے والوں کے فہم کے اختلاف سے (تفاصیل کا) یہ اختلاف پیدا ہوا ہے۔

بعد ازاں شاہ صاحبؒ اسی کتاب میں اختلاف کے چار منازل کو اس طرح بیان فرماتے ہیں۔ میرے لیے یہ علم منکشف ہوا کہ اختلاف کے چار منازل ہیں۔

۱۔ اختلاف مردود، جس کے قائل اور پیروکار کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ فقہ کے مدونہ مذاہب اربعہ میں یہ اختلاف قلیل الوجود ہے۔

۲۔ اختلاف ...... اس کے قائل کو تب تک معذور سمجھا جائے گا جب تک کہ اس اختلاف کے خلاف اس کو کوئی صحیح حدیث نہ پہونچی ہو۔ صحیح حدیث پہونچنے کے بعد بھی (اگر وہ اس پر اڑا رہا) وہ معذور نہیں ہے۔

۳۔ اختلاف مقبول، جس میں شارع علیہ السلام نے دونوں باتوں کا اختیار دے رکھا ہو، جیسے قرآن مجید کو سات حروف سے پڑھنا۔

۴۔ ایسا اختلاف جس کے بارے میں ہم نے شارع علیہ السلام کے بعض اقوال سے اجتہاد اور استنباط کے طور پر سمجھ رکھا ہے کہ اس کے دونوں اطراف مقبول ہیں اور انسان کو ان میں سے کسی ایک پر عمل کرنے کے لیے مکلف بنایا گیا ہے لیکن یہ بھی اپنے حکم میں مطلق نہیں ہے بلکہ اجتہاد اور ظن تاکیدی اس کی تقلید کے لیے ضروری ہے۔

اس قسم کے کئی علوم پر سے میرے لیے پردہ اٹھایا گیا۔ اور مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ ہر ایک (فقہی) مذہب میں ظاہر اور شاذ دونوں ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے مذہب میں

ظاہر الروایۃ وہ ہے جس کو اصول خمسہ نے جمع کیا ہو اور امام محمد نے بصراحت یہ کہا ہو کہ یہ امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے یا اس پر ان کا اعتماد رہا ہے۔ امام مالکؒ کے مذہب کا ظاہر الروایۃ ہے جس کی ابن قاسم نے صراحت کی ہو یا مدونہ میں (اس کے متعلق) یہ رائے پائی جائے کہ یہ امام مالکؒ کا وہ قول ہے جس پر ان کا اعتماد رہا ہے۔ امام شافعیؒ کے مذہب کا ظاہر الروایۃ وہ ہے جس پر شیخین یعنی رافعی اور نووی دونوں نے اعتماد ظاہر کیا ہو اور یہ صراحت کی ہو کہ یہ شافعی کا مذہب ہے اور ان کا مشہور اور معمول بہ قول ہے۔ ان کے سوا اگر کوئی روایت غیر مشہور لوگوں سے یا ایسے لوگوں سے ملے جو ان ائمہ کے مذاہب پر عبور نہیں رکھتے تو وہ شاذ روایت کہلائے گی۔

اسی طرح شریعت مصطفویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات کی دو قسمیں ہیں۔ ظاہر اور شاذ۔ ظاہر شریعت کے لیے چند مراتب ترتیب دیئے گئے ہیں۔ ۱۔ اقویٰ یعنی سب سے قوی تر تو وہ ہے جو قرآن مجید کی نص میں اس طرح پائی جائے کہ اس کے سمجھنے میں کوئی خفا نہ ہو۔ ۲۔ دوسرے مرتبے پر ظاہر شریعت وہ ہے جو احادیث مستفیضہ صحیحہ سے ماخوذ ہو اور یہ احادیث صحیح بخاری، صحیح مسلم نیشاپوری اور موطا امام مالک میں اس طرح مروی ہوں کہ ان میں تعارض نہ ہو اور روایات کے الفاظ اختلاف فاحش سے مبرا ہوں۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ان میں چار شرائط پائے جائیں۔ وہ اپنے معنی اور مراد میں واضح ہوں۔ اہل لسان پر ان کا مطلب پوشیدہ نہ ہو۔ اور وہ مشہور روایت ہوں جنہیں صحابہؓ میں سے تین یا تین سے زیادہ نے روایت کیا ہو۔ پھر ہر طبقے میں ان کے راوی بڑھتے گئے یہاں تک کہ حفاظ حدیث اور نقاد فقہا کا طبقہ آگیا۔ اور وہ ان سے راضی ہوئے اور ان کے قائل ہوئے اور وہ احادیث ان تین کتابوں میں مروی ہوں کیونکہ ان تینوں کتابوں کی اسلام میں وہ شان ہے جو دوسری کتابوں کی نہیں ہے اور علمائے حدیث و فقہ کے ہاں ان کتابوں کی وہ مقبولیت ہے جو دوسری کتب کی نہیں اور ان کتابوں کی وہ صحت ہے کہ اس جیسی صحت دوسری کتابوں میں نہیں دیکھی گئی۔

کتب حدیث کی ان تینوں کتابوں کے ساتھ قوم کا جو اہتمام رہا وہ دوسری کتابوں

کے ساتھ نہیں رہا۔ ان کتابوں کی شرح غریب، ضبط مشکل، تخریج فقہ اور راویوں کے بیان پر خاص زور دیا گیا یہ ایسی بات ہے جس سے صرف وہ ناآشنا ہو سکتا ہے، جو قوم کے مدارک سے اجنبی ہو۔ مزید یہ کہ احادیث نبویہ میں تعارض نہ ہو، ان کتابوں میں خاص طور پر آپس میں کوئی ٹکراؤ نہ ہو۔ امام مالکؒ سے (کسی مسئلہ میں) اس طرح منقول ہونا کہ یہ بڑے بڑے صحابہ اور تابعین کا مذہب ہے، جس پر زمانہ نبوت سے لے کر ان (امام مالک) کے زمانہ تک اہل مدینہ عمل کرتے آئے ہیں۔ (یہ بھی مذکورہ کتب کی روایت کے حکم میں ہے) پھر اس پر شافعی، احمد بخاری اور ان جیسے حدیث اور فقہ کے (ائمہ) جامعین نے کوئی تعقب نہیں کیا بلکہ اس کو پسند کیا اور اس کے قائل ہوئے۔ اور اس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی صحیح یا حسن حدیث سے بصراحت تائید رہو، اگرچہ یہ آحاد اخبار سے ہی کیوں نہ ہو، یا اخبار کی دلالت یا اشارت سے تائید ہو۔ یا (اس سلسلے میں) صحابہ اور تابعین کی ایک بڑی جماعت کے آثار کو پیش کیا گیا ہو یا کسی واضح قیاس اور صحیح استنباط سے اس کو قوی بنایا گیا ہو۔

سفیان ثوری کی روایت بھی امام مالکؒ سے منقول روایت کے حکم میں ہے۔ لیکن امام مالک سے (کسی روایت کا) منقول اور مروی ہونا بیشتر اوثق ہوتا ہے۔ دوسروں سے منقول روایات کا یہ پایہ نہیں۔ مشہور کتب حدیث میں اگر کوئی صحیح یا حسن حدیث مروی ہو، اور اسے جس طرح روایت کیا گیا ہے، اس سے حجت قائم ہوئی اور فقہا کی ایک جماعت کا اس پر عمل رہا۔ یا وہ حدیث صحیح اور قوی استنباط ہے اور اس کی صحت کی ایک جماعت نے شہادت دی تو یہ بھی اس امام مالک کی روایت کے حکم میں ہے۔

یہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہر شریعت اور آپ کے سنن کا جادۂ قویمہ ہے جس کا صاحب رشد و ہدایت ہونا اس قدر ظاہر و باہر ہے کہ جو بھی اس کا مخالف ہوگا۔ اس کا قول مردود سمجھا جائیگا۔ پس اگر وہ اس حالت میں نص قرآنی یا مشہور حدیث کی مخالفت کر رہا ہو، یا اجماع اور جلی قیاس کے خلاف جا رہا ہو تو وہ معذور نہ ہوگا اور اگر کسی دوسری دلیل کی مخالفت کر رہا ہو تو وہ اس وقت تک معذور سمجھا جائیگا جب تک کہ اس کو کوئی صحیح حدیث نہ پہونچے اور حجاب نہ اٹھ جائے جنا اور حجاب کے اٹھ جانے کے بعد اس قول کے مقلد اور پیروکار کو معاف نہیں کیا جائیگا۔ اس مقلد کو یہ کہنے کا حق نہیں پہونچتا کہ میں حدیث پر عمل نہیں کرونگا اور اپنے امام کے

قول پر عمل کروں گا چاہے اس کے خلاف کوئی صحیح دلیل ہی کیوں نہ ہو۔

اب تجھ پر لازم ہے کہ جب شریعت کے احکام اس طرح تیرے پاس ثابت ہو کر آجائیں تو تم ان میں اچھی طرح غور کرو تاکہ تم ان کو ان کے غیر سے جدا کر سکو اور وہ تیری آنکھوں کے سامنے متمثل اور تیرے دل میں منقش ہوں پھر تجھے ان کو مضبوطی سے پکڑنا اور اپنے ہاتھوں سے مضبوط تھامنا چاہیے۔ اس میں اگر کوئی مخالف بھی ہو تو اس سے ہوشیار رہیں اور اس کی بات کی طرف کان نہ لگائیں۔ اس جادۂ قویمہ کے اثبات کے بعد بعض اسباب کی بنا پر اگر کبھی اختلاف ہو تو ایسی حالت میں وہ قول جو کہ ماخذ کے قریب ہو اور اس میں ظاہراً کوئی کوتاہی نہ پائی جائے اس کا ہرگز انکار نہ کیا جائے۔ بلکہ ایسا قول قبول کرنا چاہیے۔ اس طرح جادۂ قویمہ کو ایک مذہب بنائیں۔ اس سلسلے میں مختلف اقوال سے چشم پوشی کریں اور شریعت محمدیہ کے جادۂ قویمہ سے ایک رتی بھی باہر نہ جائیں۔ اس جادۂ قویمہ سے نکلنے کی مثال ہے وضو میں پاؤں پر مسح کرنا، نکاح متعہ کو جائز تصور کرنا، مسکر شراب کے قلیل مقدار کو حلال سمجھنا، گدھوں کو حلال جاننا اور یہ کہنا کہ وقت ظہر سایہ اصلی کے نکلنے کے بعد دو مثل ہے۔

جادۂ قویمہ کو تسلیم کرنے کے بعد اختلاف کرنے کی مثال علما کا روزوں میں زوال کے بعد مسواک کرنے کا اختلاف ہے، یا یہ کہ نماز کو سبحانک اللہم سے شروع کیا جائے۔ یا وجہت وجہی سے یا ان دونوں میں سے کسی سے بھی نہیں۔ اور تشہد میں ابن مسعودؓ کی تشہد پڑھنی چاہیے یا ابن عباسؓ کی یا ابن عمرؓ کی۔

پھر اگر تمہاری ہمت بلند ہے اور تم تقویٰ میں قوی ارادہ رکھتے ہو، تو ان تفاصیل کو واضح کتاب، ظاہر سنت اور اہل علم کے عمل اور قیاس قوی پر پیش کرو۔ مختلف احادیث میں تطبیق کرو، محدثین کی کتابوں میں جو اخبار صحیحہ، حسنہ یا ضعیفہ مروی ہیں ان کا تمہیں تتبع کرنا چاہیے اور ان میں سے اقویٰ اور احوط کو اختیار کرنا چاہیے۔ ورنہ تمہارا درجہ ایک عام مسلمان سے اوپر نہیں ہوگا۔

اگر یہاں یہ سوال اٹھایا جائے کہ جو کچھ ذکر کیا گیا وہ بالتحقیق شریعت مصطفویہ کا جادۂ قویمہ ہے لیکن اس کی اس کے غیر سے کیونکر تمیز ہو سکتی ہے؟ اس کے لیے تو بہت
(باقی صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ کیجئے)

عورت کی سربراہی کی حمایت

دینی محاذ کا ایک حادثہ اور لادینیت کے لیے نوید فتح

از ——— عتیق الرحمٰن سنبھلی

پاکستان کے صدارتی انتخاب کا ہنگامہ ختم ہوگیا۔ اور جس نتیجہ پر ختم ہوا، ہماری دعا ہے کہ وہی پاکستان کے حق میں بہتر ثابت ہو، لیکن افسوس ہے کہ اس ہنگامہ نے اسلامی نظام سیاست کے ایک ایسے اہم اصول میں انتشار فکر کو جنم دے دیا ہے جس پر اہل دین میں کبھی دو رائیں نہیں تھیں، جس کی قطعیت کے بارے میں مسلم عوام آج تک کبھی تذبذب میں نہیں پڑے اور جس میں انتشار و تذبذب کی کیفیت کا پیدا ہو جانا آج کے خاص حالات میں جبکہ مسلم معاشرہ کے اندر دین اور لادینیت کی ایک شدید کشمکش برپا ہے، دینی محاذ کے لیے ایک ایسی چوٹ کے معنی رکھتا ہے جس کے بعد کامیابی کی امید رکھنے کے کوئی معنی نہیں!

آج مسلم معاشرہ کے اندر دین اور لادینیت کی جو جنگ برپا ہے اس کا اصل میدان ہمارے عقائد نہیں، ہمارے اوضاع و اطوار اور ہمارا معاشرتی نظام ہے۔ عقائد کی جنگ کا زمانہ گزر گیا اور اب اس معاملہ میں درحقیقت لادینی محاذ کے اندر دم نہیں رہ گیا ہے، گو بل باقی ہیں جو رسی جل جانے کے بعد بھی رہ جاتے ہیں، اب تو لادینیت کا سارا زور معاشرتی تجدد پر اور زندگی کے نقشے کو مغربیت کے اصولی سانچے میں ڈھال لینے پر ہے، جس کا ایک اہم رکن ہے عورت اور مرد کی مساوات یعنی کاروبار حیات میں ان دونوں کے درمیان عدم امتیاز اور ہر قید و بند سے آزاد

اختلاط! یہی وہ اُصول ہے جس کے بارے میں مسلم معاشرہ کے اندر لادینی محاذ کو اب تک عمومی سطح پر کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ حالانکہ اس کی اہمیت یہ ہے کہ اگر اس میدان میں لادینیت نے جنگ جیت لی تو پھر اس نے سب کچھ جیت لیا۔ اس جیت کے بعد اسلام کے بچے کھچے معاشرتی نظام ہی کی نہیں اخلاقی نظام کی بھی چولیں ہل جائیں گی۔ اور اس کے بعد کیا دین رہ جائے گا؟ وہ ظاہر ہے۔

عورت اور مرد کی کامل مساوات کا کوئی مظاہرہ اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا کہ کوئی ملک اپنی سیاسی زندگی کی سربراہی کے لیے ایک عورت کا انتخاب کرنے پر آمادہ ہو جائے، کیونکہ اس معاملہ میں دنیا نے ہمیشہ ہی مرد و عورت کے درمیان تفریق کی ہے اور حد یہ ہے کہ مساوات کا یہی وہ نقطہ ہے جس تک پہونچنے کی ہمت وہ مغربی معاشرہ بھی نہیں کر پایا جو اس اصولِ مساوات کا معلّم ہے۔ عورت کے اس مساوی حق کا قائل وہ صرف نظری حد تک ہے۔ رہا اپنے اختیار سے اس کو عمل میں برتنا تو اس سے وہ بھی اسی طرح دور ہے جس طرح دنیا کے تمام سمجھدار معاشرے آج تک دور ہی رہتے آئے ہیں ـــــ پس اگر کوئی معاشرہ عورت کو اپنی سیاسی سربراہی کا شرف بخشنے پر آمادہ ہو جائے یا کم از کم یہ ماننے ہی لگ جائے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے؛ یا اور بھی نیچے اتر آئیے، صرف یہ خیال ہی لوگوں میں پیدا ہو جائے کہ یہ کوئی اس درجہ کی بات نہیں ہے کہ ضرورۃً بھی اس کو جائز نہ رکھا جائے تو مساوات کے اس نقطۂ کمال کے بارے میں یہ ذہن اختیار کر لینے کے بعد وہ معاشرہ کس طرح اس پوزیشن میں رہ سکتا ہے کہ اس سے نیچے کے نقطوں پر لادینیت کی مزاحمت کر سکے!

اب ذرا دیکھیے کہ پاکستان کے اس الیکشنی ہنگامہ میں خود وہاں کے اہلِ دین کے ہاتھوں، عورت کی سربراہی کے مسئلہ میں، کیا ذہن عام لوگوں کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ پاکستان میں دینی محاذ کے سب سے معتمد اور نامور لیڈر مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا وہ عبرت انگیز جملہ تو آپ گزشتہ شمارے میں پڑھ ہی چکے ہیں کہ :-

"کوئی شخص یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ از روئے شریعت عورت کا سربراہ مملکت ہونا حرام ہے"۔

اور پھر اس کے جواز میں مولانا کا یہ استدلال بھی آپ کی نظر سے گزر چکا ہے کہ چونکہ ملکۂ سبا کے ایمان لانے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہ وحی نازل نہیں ہوئی کہ عورت کو سربراہ مملکت نہیں رہنا چاہئے اس لیے یہ ثابت ہوا کہ عورت کے سربراہ مملکت ہونے میں حرج نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ "جماعت اسلامی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ایک اخبار نے (جس کے مدیر جماعت کے ایک ممتاز رکن اور پاکستان کے ایک ابھرتے ہوئے واعظ اور خطیب بھی ہیں) اپنے ایک اداریے کے اندر صاف لفظوں میں اس کو بعض مذہبی حلقوں کے پروپیگنڈے سے تعبیر کیا کہ "شریعت کی رو سے عورت صدر مملکت نہیں بن سکتی ہے"۔ ——

لیکن اس اداریے میں ایسا صرف یہ ایک جملہ ہی نہیں تھا بلکہ پورے دو صفحے میں اس "پروپیگنڈے" کی تردید کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ کوئی قطعی مسئلہ نہیں ہے۔ اس میں دوسری رائے کی بھی پوری گنجائش ہے، چنانچہ ارشاد ہوا کہ

"یہ مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے اور ایسا متفق علیہ بھی نہیں جس میں علماء سلف یا موجودہ اہلِ علم کے درمیان اختلاف نہ پایا جاتا ہو"۔

اور اس کے بعد فرمایا کہ

"جو لوگ اپنی روحانی اغراض کے تحت عورت کے صدر مملکت بننے یا نہ بننے کو کفر و اسلام کا مسئلہ بنا چلے ہیں اُن کی تو اور بات ہے لیکن جن ثقہ اصحاب علم کو بالغ نظری کے ساتھ کسی نتیجہ پر پہونچنا ہے ہم سوئے ادب کی معافی چاہتے ہوئے اکابر علماء کے چند حوالے اُن کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ بات پوری طرح واضح ہو جائے کہ ملکی و ملی ضروریات کے پیش نظر عورت کی سربراہی کو تسلیم کر لینے سے یہی نہیں کہ آدمی دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہوتا بلکہ علم و تقویٰ کے بلند ترین مقامات پر بھی بدستور فائز رہ سکتا ہے"۔

آگے وہ حوالے درج کیے گئے ہیں کہ کن کن اکابر علماء نے اس مسئلہ میں جواز کا حکم فرمایا ہو۔

ان میں دورِ حاضر کے علماء کے نام یہ ہیں۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید مہدی حسن مفتی اعظم دیوبند۔

علماء سلف میں سے جن کا حوالہ دیا گیا ہے اُن کے نام یہ ہیں:۔

علامہ طبریؒ، امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور کچھ دوسرے بے نام کے ائمہ۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ

"یہ ٹھیک ہے کہ ان کے بالمقابل ایسے حوالے بھی پیش کیے جاسکتے ہیں جن میں عورت کو سربراہِ مملکت بنانے کی پرزور مخالفت کی گئی ہے مگر اس گفتگو سے کم از کم یہ تأثر ضرور پیدا ہونا چاہیے ـــــ اور یہی اس سے ہمارا مقصود بھی تھا ـــــ کہ عورت کا سربراہِ مملکت بنایا جانا مدارِ کفر و ایمان نہیں۔ نہ اس کے قائلین کو کافر و گمراہ ہونے کا طعنہ دیا جاسکتا ہے۔"

اس کے بعد "حقیقت پسندی" کے طور پر مسئلہ کے "عملی پہلو" پر توجہ کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"یہ سچ اور درست کہ ایک کامل اسلامی معاشرہ میں مرد ہی کو سربراہِ مملکت ہونا چاہیے اور جہاں تک خلافتِ راشدہ کا تعلق ہے اس میں بھی یہی نظر آتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس عبوری دور میں بعض اہم مصالح کی بنا پر ایک کامل اسلامی معاشرہ کے مقتضیات سے کم پر رضامند ہو جانا دینی اقدار کی رو سے قابلِ برداشت ہے یا نہیں؟

اور پھر اس "حقیقت پسندی" کی دینی سند کے طور پر ارشاد ہوا ہے کہ

"خلافتِ راشدہ کے بعد مسلمانوں پر جو مختلف ادوار گزرے ہیں وہ "خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم" کے مصداق ہمارے اس عہد سے بہر طور بہتر تھے ان میں جو علماء اور صلحاء ہو گزرے ہیں ہمارے یہاں کے اکابر کسی لحاظ سے ان کے مثیل نہیں قرار دیے جاسکتے، اُن کی غیرتِ دینی بھی

شک و شبہ سے بالاتر ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ ان ہزار دو ادوار میں کئی مواقع پر عورت سربراہ مملکت رہی مگر ان اکابر و اعاظم نے کبھی حکومت کے ساتھ اس وجہ سے عدم تعاون کی پالیسی پر عمل نہیں کیا۔"

اب حرفِ مدّعا سُن لیجئے کہ

"مندرجہ بالا گزارشات سے دو باتیں صاف ہوگئیں —— ایک یہ کہ اہل علم میں بعض ممتاز ہستیوں کے نزدیک عورت کے سربراہ مملکت ہونے کی گنجائش ہے —— دوسرے یہ کہ ہماری تاریخ میں بہت سی ایسی حکمران خواتین ہو گزری ہیں جنہوں نے کامیابی کے ساتھ حکومت کی اور اس دور کے علماء و صلحاء نے ان کے ساتھ عدم تعاون نہیں کیا۔"

ہم اس اداریہ کے ضروری اقتباسات کے ذریعہ جو بات مخصوص طور پر سامنے لانا چاہتے تھے وہ آخری اقتباس کے اس فقرہ میں، جسے ہم نے زیر خط کر دیا ہے، اداریہ نگار نے خود ہی بڑی صراحت کے ساتھ کہہ ڈالی ہے کہ ان کا اولین مقصد اس ساری کد و کاوش سے یہ ہے کہ عورت کے سربراہ مملکت ہونے کی ممانعت کو لوگ کوئی قطعی مسئلہ نہ سمجھیں۔ اس میں سلف سے لے کر خلف تک بڑے بڑے علماء کی اختلافی رائیں موجود ہیں —— ہم اس پر تبصرہ آگے کریں گے سر دست اتنا ہی ذہن میں رکھئے کہ کیا تأثر لوگوں کو دیا گیا ہے اور پھر اس تأثر نے کیسے کیسے حلقوں کو آن کی آن میں زیر کر لیا؟ کہ ناواقف عوام کی بات چھوڑیئے قال اللہ وقال الرّسول کی مسندوں تک اس تأثر میں ایسی بہہ نکلیں کہ مارے حیرت کے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا، اللہ و رسول کے جو ارشادات کل تک اس مسئلہ میں جن زبانوں پر فیصلہ کن کراتے تھے آج یہی زبانیں ان میں تاویل کا سبق پڑھانے لگیں۔ اور پھر اس تاویل کے چکر میں کیسی کیسی تشکیک انگیز نکتہ نوازیاں اور کیسی کیسی خطرناک فلسفہ طرازیاں، کہ اگر انداز گفتگو سے سادہ لوحی نہ ٹپک رہی ہو تو ہم کہیں، خود فریب نہیں کھا گئے ہیں کہ بلکہ جان بوجھ کر ابلہ فریبی مقصود ہے۔

اس فریب خوردگی کی ایک ماتم انگیز مثال ہمارے سامنے پاکستان کی ایک عربی درسگاہ کے ماہنامے کا اداریہ ہے۔ جو یوں تو مسلک دیوبند سے وابستہ ہے مگر پاکستانی سیاست میں کچھ دن سے اس کا رجحان جماعت اسلامی کی حمایت و اعانت کا نظر آتا ہے۔ اس رسالے نے عورت کی سربراہی کے مسئلہ پر کوئی اٹھارہ صفحے کا اداریہ اپنی ایک حالیہ اشاعت میں لکھا ہے اور اس میں پاکستانی مسئلہ سے الگ بارہ تیرہ صفحے کی جو خالص اصولی بحث کی ہے وہ پوری کی پوری ایک کتاب عبرت ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے کچھ اقتباسات درج کیے جائیں مگر "طوالت کے خیال سے ہم اپنے ہی الفاظ میں اس کا خلاصہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس رسالے نے لکھا ہے کہ ـــــ مرد ہونے کی شرط تو کتابوں میں امامت و خلافت کے لیے آئی ہے۔ اور امامت و خلافت نام ہے ساری دنیا کے مسلمانوں کی واحد مرکزی حکومت کا۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ملکوں اور علاقوں کے لیے جو امیر اس مرکزی حکومت کی طرف سے مقرر کیے جاتے تھے اُن میں قریشی ہونے کی شرط ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی حالانکہ یہ امام اور خلیفہ کے لیے ضروری شرط تھی۔ پس آج جو مختلف اسلامی ملکوں کے صدر و سربراہ ہوتے ہیں انہیں دور خلافت کے علاقائی اُمراء پر قیاس کرنا چاہیے جن کیلئے خلافت والی شرائط نہیں تھیں۔ اسی لیے مرد ہونے کی شرط بھی آجکل کی صدارت و سربراہی کے لیے ضروری نہ ہوگی۔ ـــــ غور فرمائیے کس قدر خطرناک منطق ہے۔ اس نے اُس وقت تک کیلئے خلافت علیٰ منہاج النبوت کی جڑ ہی کاٹ دی جب تک ساری دنیا کے مسلمان ایک سیاسی مرکز کے تحت جمع نہ ہو جائیں۔ جب تک یہ نہو اُس وقت تک مکمل اسلامی حکومت کے قیام کا مسئلہ ہی ختم ہے!

اچھا اب آگے آئیے!

اس منطق پر یہ اشکال وارد ہو رہا تھا کہ زبان نبوت نے تو بلا کسی تفریق کے فرمایا ہے "لن یفلح قوم ولّوا امرھم امرأۃ" (وہ قوم ہرگز فلاح نہ پائے گی جو اپنی باگ ڈور ایک عورت کے ہاتھ میں دیدے) اس حدیث کی موجودگی میں کسی محدود دلیکن خود مختار علاقے کے مسلمانوں کو بھی کیسے یہ بات جائز رکھنی چاہیے؟ اس اشکال کو دور کرنے کیلئے فرمایا گیا کہ چونکہ قرآن میں ملکۂ سبا کے قصے سے عورت کی سربراہی کا جواز ملتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکومت کچھ جمہوری نوعیت کی تھی۔ اور حدیث کا تعلق ایران کی مطلق العنان شخصی حکومت سے ہے۔ اسلیے شخصی حکومت میں تو عورت کی سربراہی ناجائز ہوگی لیکن جمہوری حکومت میں جائز ہوگی! ـــــ لیکن اب یہ پوچھیے کہ کیا اسلامی خلافت بھی کوئی مطلق العنان شخصی حکومت ہوتی ہے

جس میں آپ عورت کی سربراہی کو منع فرماتے ہیں؟ آپ کو یقین نہ آئے گا۔ لیکن یقین کیجئے کہ اسلامی خلافت کو شخصی بادشاہت ہی[1] کے ہم معنی ان بزرگ نے بتا دیا ہے ؎

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی!

ہم ان باتوں کی باقاعدہ تردید پر کیا اپنا وقت ضائع کریں ان میں سے ہر بات کا نتیجہ خود ہی اسکے باطل ہونے کا ثبوت ہے۔ اور پھر اس فریب خوردگی اور خیرہ نگہی کی انتہا کو کیا کہیے کہ نتیجہ خود سوال بن کر سامنے آ رہا ہے مگر ذہن پر کوئی چوٹ نہیں پڑتی — بہرحال ہمیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ نکتے تمامتر سادگی اور اس پر مستزاد فریب خوردگی کا نتیجہ ہیں ورنہ لوگ اس سے بھی زیادہ غلط باتیں ایسی فنکارانہ شان سے کہتے ہیں کہ تردید میں سر چکرا جائے۔ اگر جان بوجھ کر لوگوں کو مغالطہ دینا اس رسالہ کا مقصود ہوتا تو یقیناً اس کا انداز کچھ اور ہی ہوتا، لیکن یہ بیچارہ خود گمراہ ہوا ہے دوسروں کو گمراہ کرنے کی نیت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے اور اس کی گمراہی کی جڑ ہے وہ حسن اعتماد اور حسن ظن جو اس نے مولانا سید ابوالاعلیٰ اور اُن کے رفقاء کے بارے میں اپنے اندر پیدا کر لیا تھا! اسے کچھ مسائل میں اختلافِ مسلک کے باوجود ان لوگوں کی جو ادائیں بھا گئی تھیں وہ تو یہی تھیں کہ یہ نظامِ مملکت میں اسلام کی فرمانروائی چاہتے ہیں اور وقت کے سب سے بڑے فتنۂ آزادیٔ نسواں کے تو پاکستان میں سب سے بڑے حریف ہی یہ ہیں، بھلا وہ ان لوگوں کے بارے میں کیسے سوچ سکتا تھا کہ ان کا کوئی قدم غلطی سے بھی آزادیٔ نسواں کے حق میں جا سکتا ہے اور کوئی بات یہ ایسی بھی اپنا سکتے ہیں جو نظامِ حکومت کے اسلامی اصولوں کے یکسر خلاف ہو! چنانچہ اس نے جو سنا کہ مولانا ابوالاعلیٰ صاحب کہتے ہیں کہ عورت کے سربراہِ مملکت ہونے میں حرج نہیں ہے اور ان کی جماعت کے اخبارات اور رسائل لکھ رہے ہیں کہ یہ مسئلہ کوئی متفق علیہ قطعی مسئلہ نہیں ہے، شروع سے آج تک بہت سے علماء و فقہاء (جن میں بعض علماء دیوبند بھی شامل ہیں) اس کے قائل رہے ہیں کہ عورت بھی سربراہِ مملکت ہو سکتی ہے تو اسے بلا کسی تامل کے یقین آ گیا کہ ہو نہ ہو مسئلہ یونہی ہے اور پھر ایک ترجمانِ علم و دین کی حیثیت سے اس نے اپنا فرض جانا کہ مسئلے کو اپنے طور پر بھی منقح کرے اور جواز کے جو

---

[1] یہ لفظ ہم لغوی معنی میں استعمال کر رہے ہیں اصطلاحی معنی میں نہیں۔

دلائل اور اعتراضات کے جو جوابات اس کی اپنی سمجھ میں آسکتے تھے انھیں بھی تائیدِ حق کے لیے پیش کرنے ـــــ یہ ہے ہمارے نزدیک اس گمراہی کی کہانی۔ اور اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنے اور اسی حسنِ ظن اور حسنِ اعتماد سے گمراہی کا شکار ہوئے ہوں گے، اس لیے ضرورت ہے کہ اس فریب عقل کا پردہ چاک کیا جائے اور ان سادہ دل اہلِ ایمان کو دکھایا جائے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے رفقاء نے آج اس مسئلہ میں جو کچھ کہا ہے وہ نہ صرف دلائل و حقائق کی روشنی میں غلط ہے بلکہ مولانا مودودی کی اپنی سابقہ تصریحات ہی اس کے تار و پود بکھیر دینے کے لیے کافی ہیں۔

جائزہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب نے جو مسئلہ قرآن کی بنیاد پر ارشاد فرمایا ہے اس پر تو ہم بعد میں گفتگو کریں گے پہلے ان کے حلقے کے اس پروپیگنڈے کا جائزہ لیجئے جس میں سلف سے خلف تک بہت سے ائمہ و علماء کے متعلق یہ خیال پھیلایا گیا ہے کہ وہ عورت کی سربراہی کے قائل تھے۔ اس کا تفصیلی خلاصہ ہم شروع میں دے چکے ہیں اب اس میں سے ایک ایک جزو کو لیجئے۔

(۱)

فرماتے ہیں کہ

> "حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری (جلد ۸ صفحہ ۹۷) پر علامہ طبری کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ عورت کی امارت اور قضا کے قائل تھے۔ اسی فتح الباری (باب کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی کسریٰ) میں امام مالک کے متعلق آیا ہے کہ وہ بھی یہی رائے رکھتے تھے۔ حد یہ ہے کہ صاحب فتح الباری نے امام ابوحنیفہ کا بھی ایک روایت کے مطابق یہی نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ انھوں نے بعض دوسرے ائمہ کا بھی ذکر کیا ہے جو یہ نظریہ پیش کرتے تھے۔"

علامہ ابن حجر کی تالیف فتح الباری (شرح صحیح البخاری) میں یہ مسئلہ دو مقامات پر آیا ہے مذکورہ بالا عبارت سے بھی بادی النظر میں دو الگ الگ مقامات ہی کا حوالہ معلوم ہوتا ہے لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ حوالہ ایک ہی مقام کا ہے۔ کیونکہ باب کتاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم

الی کسریٰ" اور "جلد ۸ صفحہ ۹۰" دونوں ایک ہی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب بنام کسریٰ کا ذکر فتح الباری کے اُس مصری اڈیشن میں جو ۱۳ جلدوں میں شائع ہوا ہے، آٹھویں جلد کے صفحہ ۹۱ پر ہی ہے۔ ہندوستانی فتح الباری مطبوعہ مطبع انصاری دہلی میں اس کو جزء ۱۸ صفحہ ۹۱ پر دیکھا جا سکتا ہے ـــــ بہرحال اس مقام پر فتح الباری کی عبارت یہ ہے۔

والمنع من ان تلی الامارة والقضاء قول الجمهور واجازه الطبری وهی روایةٌ عن مالك وعن ابی حنیفة تلی الحکم فیما تجوز فیه شهادة النساء۔

اس عبارت میں علامہ طبریؒ کا ذکر ہے، امام مالکؒ کا ذکر ہے اور امام ابوحنیفہؒ کا ذکر ہے۔ دوسرے کسی امام کا اس میں کوئی ذکر نہیں۔ جبکہ مدیر شہابؔ فرماتے ہیں کہ "علامہ ابن حجرؒ نے بعض دوسرے ائمہ کا بھی ذکر کیا ہے جو یہ نظریہ پیش کرتے تھے"۔ ان دوسرے ائمہؒ کا ذکر آپ کو فتح الباری کے دوسرے مقام پر ملے گا۔ یہ دوسرا مقام "کتاب الفتن" میں ہے جس کے لیے فتح الباری کے مذکورہ مصری اڈیشن کی جلد ۱۳ صفحہ ۵۶ دیکھنا چاہیے اور ہندوستانی اڈیشن کا جزء ۲۹ صفحہ $\frac{۵۴۴}{(۲۸)}$۔ اس کی عبارت یہ ہے۔

احتج بحدیث ابی بکرة من	وہ لوگ اس حدیث ابوبکرہؓ کو دلیل بناتے ہیں
قال لا یجوز ان تولی المرأة	جو کہتے ہیں کہ عورت کا قاضی بنا دیا
القضاءَ وهوَ قول الجمهور	بنایا جانا) جائز نہیں اور یہ مذہب جمہور
وخالف ابن جریر الطبری وقال	ہے۔ لیکن ابن جریر طبری نے اس میں
یجوز ان تقضی فیما تقبل شهادتها	اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ عورت ان
فیه واطلق بعض المالکیة	معاملات میں قضا کا فریضہ انجام دے سکتی ہے
الجواز۔	جن میں اس کی شہادت مانی جاتی ہے۔

اور بعض مالکیہ کا قول (اس سے بھی بڑھ کر) یہ ہے کہ عورت کی قضا علی الاطلاق جائز ہے (ان امور کی قید نہیں جن میں عورت کی شہادت معتبر ہوتی ہے)"

تو یہ "بعض دوسرے ائمہ" بعض مالکیہ ہوتے ہیں جو بقول مدیر شہاب یہ نظریہ پیش کرتے تھے کہ

عورت سربراہ مملکت ہو سکتی ہے۔

اگر مدیر شہاب "بعض دوسرے ائمہ" کا حوالہ نہ دیتے تو ہم سمجھتے کہ ان کی نظر میں فتح الباری کا یہ دوسرا مقام نہیں ہے۔ لیکن اب یہ سمجھے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ ان کی نظر میں یہ دوسرا مقام بھی تھا اگرچہ اس کا متعین حوالہ انھوں نے نہیں دیا۔ سوال یہ ہے کہ فتح الباری کے اس دوسرے مقام پر بھی نظر رکھنے کے بعد کسی ایمان دار آدمی کے لیے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک نہ سہی علامہ طبری کے بارے میں ہی یہ کہنے کی جرأت کرے کہ وہ عورت کی امارت کے جواز کے قائل تھے؛ اس دوسرے مقام کی عبارت تو صاف بتا رہی ہے کہ اُن کا (ابن جریر طبری کا) اختلاف صرف قضا میں تھا اور وہ بھی صرف اتنا کہ جن معاملات میں عورت شہادت کا حق رکھتی ہے ان میں اُس کو قضا کا حق بھی ہے نہ کہ علی الاطلاق ....

بہرحال اب دیکھئے کہ فتح الباری میں اُس مقام پر کیا کہا گیا ہے جس کا حوالہ مدیر شہاب نے دیا ہے! عبارت ہم نقل کر چکے ہیں لیکن ترجمہ اس کا ہم نے چھوڑ دیا تھا اس لیے کہ دوسرے مقام کی عبارت سامنے آئے بغیر اس کے ترجمہ میں اختلاف ہو سکتا تھا۔ دوسرے مقام کی عبارت سے اگر صرف نظر کر لیا جائے تو اُس عبارت کا ترجمہ یہ ہوگا۔

> "اور اس بات کی ممانعت کہ عورت امارت و قضا کی ذمہ داری سنبھالے یہ قول جمہور کا ہے لیکن طبری نے اس کو جائز کہا ہے اور یہی ایک روایت ہے امام مالک سے اور امام ابوحنیفہ سے روایت (محض ایک روایت) یہ ہے کہ عورت ان امور میں فیصلے (قضا) کی ذمہ داری سنبھال سکتی ہے جن میں عورتوں کی شہادت جائز (معتبر) ہوتی ہے"

اس ترجمے کی رو سے بھی ہمیں مدیر شہاب کے بیان میں کئی غلط بیانیاں یا غلط فہمیاں ملتی ہیں۔

۱۔ اس عبارت میں امام مالک کے مذہب کی صرف "ایک روایت" کا بیان ہے جبکہ مدیر شہاب نے بجائے "ایک روایت" کے امام مالک کا مذہب ہی یہ بتایا ہے۔ یہ ایک اہم فرق ہے جسے اہل علم سمجھ سکتے ہیں۔

۲ اور ۳۔ امام ابوحنیفہ کا قول ایک روایت کے مطابق اس عبارت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ

وہ ایسے اُمور میں عورت کی قضا کو جائز فرماتے تھے جن میں عورت کی شہادت معتبر ہے۔ لیکن مدیر شہاب نے اول تو قضا کے سلسلے میں امام صاحب کی اس تحدید کو بیان نہیں کیا اور اس سے بڑھ کر غضب یہ کیا کہ قضا کے ساتھ امارت کا جواز بھی امام صاحب کی طرف منسوب کر دیا۔

یہ خلافِ واقعہ باتیں تو محض اس عبارت کو سامنے رکھ کر نکل آتی ہیں لیکن دوسری عبارت کو بھی سامنے رکھ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس (پہلی) عبارت کے حوالے سے جو کچھ کہا گیا ہے وہ اول سے آخر تک غلط ہے. کیونکہ دوسرے مقام کی عبارت میں جب یہ بات صاف طور سے آرہی ہے کہ امام طبری کا جمہور سے اختلاف صرف قضا کے مسئلہ میں ہوا ہے ـــــ اور وہ بھی صرف ان امور کی قضا میں جن میں عورتوں کی شہادت چلتی ہے نہ کہ امارت کے مسئلہ میں۔ تو پہلے مقام کی عبارت کا یہ آخری جملہ کہ

تلی الحکم فیما تجوز فیہ شہادۃ النساء	ان معاملات میں عورت قضا کی ذمہ داری سنبھال سکتی ہے جن میں عورتوں کی شہادت معتبر ہوتی ہے۔

اس کا تعلق صرف امام ابوحنیفہ کی اختلافی روایت سے نہیں، جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا، بلکہ امام مالک کی اختلافی روایت اور امام طبری کے مذہب سب ہی سے ماننا صحیح ہوگا۔ اور اب اس پہلی عبارت کا ترجمہ "واجازۃ الطبری" سے آخری جملے تک یوں ہوگا کہ

"لیکن امام طبری نے اس کو جائز کہا ہے اور یہی ایک روایت ہے امام مالک سے اور امام ابوحنیفہ سے (یعنی یہ تینوں حضرات کہتے ہیں) کہ عورت اُن امور میں قاضی بن سکتی ہے جن میں عورتوں کی شہادت معتبر ہوتی ہے"

یہ ظاہر عبارت کے ضرور کچھ خلاف ہے، لیکن جب صاحبِ عبارت خود ہی دوسرے مقام پر پوری صراحت کے ساتھ اختلافِ طبری کی یہ حقیقت بیان کر رہا ہے کہ اختلاف صرف قضا میں ہے اور وہ بھی ان معاملات کی حد تک کہ جن میں عورتوں کی شہادت مقبول ہوتی ہے، تو پھر اس کا کوئی سوال ہی نہیں رہ جاتا کہ ظاہرِ عبارت کی خاطر خلافِ حقیقت اور خلافِ واقعہ مطلب لے لیا جائے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس تفصیل و وضاحت کے بعد کسی صاحب علم کو اس بارے میں ہم سے اختلاف نہ ہوگا۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ بعض ابوالفضول بھی اس مسئلہ میں در آئے ہیں اور کھلی کھلی حقیقتوں سے کشتی لڑا کر ناواقفوں سے داد طلب ہوتے ہیں کہ ان کے دماغ اور زبان میں کس بلا کا زور ہے۔ اور پھر ان کا یہ زور ایک مسئلہ میں جیتنے کی خاطر دس مسئلوں کی بساط اُلٹ دینے اور مکھی کو مارنے کے لیے سر ہی پھوڑ لینے ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ صحافتی تہذیب اور تنقید کے جذباتی حدود بھی اس زور میں اس حد تک بہہ جاتے ہیں کہ قلم بے تکلف بازار کی زبان کے نمونے پیش کرنے لگے اور ایک سے ایک خوبصورت لفظ معترض کے کام و دہن کی تواضع ہو جائے۔ اس لیے ان ارباب قلم کے منہ بھی نہیں لگا جا سکتا ــــــ بس ایسے ہی لوگوں کے خیال سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پیشگی ہی اپنی تائید میں کچھ قابل لحاظ حوالوں کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم پانچویں اور چھٹی ہجری (۴۶۸ھ تا ۵۴۳ھ) کے ممتاز مالکی عالم اور مصنف قاضی ابوبکر ابن العربی اندلسی کی مشہور کتاب "احکام القرآن" جلد دوم کا حوالہ دینا چاہتے ہیں جس میں سورۂ نمل کی آیت "اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَۃً تَمْلِکُھُمْ" کے ذیل میں قاضی ابن العربی فرماتے ہیں:۔

رُوی فی الصحیح عن النبی
صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال حین
بلغہ ان کسریٰ لما مات وَلّٰی
قومہ بنتہٗ لن یفلح قوم ولّوا
اَمرھم اِمْرَاَۃً وھذا نصٌ فی انَّ
المرأۃ لاتکون خلیفۃً ولاخلاف
فیہ ونُقِل عن محمد بن جریر الطبری
امام الدین اَنَّہٗ یُجَوِّزُ اَنْ تکون
المَرْاَۃ قاضِیَۃً وَلَمْ یصح ذٰلِکَ
عنہ ولَعلَّہٗ کما نقل عن اَبی
حنیفۃ انھا تقضی فیما تشھدُ

صحیح حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے
مروی ہے کہ جب آپ کو یہ بات پہونچی کہ
کسریٰ (شاہ ایران) کے مر جانے پر اہل
ایران نے اس کی بیٹی کو اس کا جانشین
بنا لیا تو آپ نے فرمایا وہ قوم ہرگز فلاح
نہیں پائے گی جو اپنی سیادت ایک عورت
کے سپرد کر دے۔ اور یہ حدیث نص ہے اس
باب میں کہ عورت (اسلام میں) خلیفہ نہیں
ہو سکتی اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔
امام دین محمد بن جریر طبری سے یہ بات
منقول ہوئی ہے کہ عورت قاضی ہو سکتی ہے

فیہ۔ الخ ص۱۳۶ ج۲
(طبعۂ اولیٰ۔ مطبعۃ السعادۃ مصر)

لیکن اس قول کی نسبت اُن کی طرف صحت کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔ لیکن اگر انھوں نے کوئی ایسی بات فرمائی ہے تو وہ بات فرمائی ہوگی جو امام ابوحنیفہ سے منقول ہے کہ عورت ان معاملات میں قضا کی اہل ہے جن میں وہ شہادت کی اہل ہے۔"

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ امام طبری کا جمہور سے اختلاف عورت کی امارت کے مسئلہ میں قطعاً نہیں ہے، اگر ہے تو صرف قضا کے مسئلہ میں ہے، دوسرے یہ کہ قاضی ابن العربی کے نزدیک قضا کے مسئلہ میں بھی علی الاطلاق جواز کا قول امام طبری کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔ ہاں اگر ان کی طرف وہ بات منسوب کی جائے جو امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب ہے تو اس میں بحث کی ضرورت نہیں۔ اس سے اس بات کی پوری تائید ہو جاتی ہے کہ فتح الباری میں کتاب الفتن والے مقام پر امام طبری کے اختلاف کی جو نوعیت بیان کی گئی ہے وہی اصل حقیقت ہے اور اسی کی روشنی میں فتح الباری کی پہلی عبارت کا مطلب متعین کیا جائے گا۔[۵]

حسنِ اتفاق سے اس مسئلہ میں جماعتِ اسلامی کی حمایت میں لکھے گئے ایک مقالہ میں بھی ہمیں فتح الباری کی اس عبارت کا ترجمہ اسی انداز میں ملا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عبارت کے آخری جملے کا تعلق صرف امام ابوحنیفہ کے قول سے نہیں ہے بلکہ امام طبری، امام مالک اور امام ابوحنیفہ تینوں ہی کے قول سے ہے۔ یہ مقالہ "فاران" کراچی کے ادارتی صفحات میں کسی

۵؎ قاضی ابن العربی کے مذکورۂ بالا بیان سے اس بات کی طرف بھی توجہ ہونی چاہیے کہ انھوں نے اس مقام پر امام مالک یا کسی اور مالکی کی اختلافی روایت کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ امارت کے مسئلے میں تو "لا اختلاف فیہ" کہا ہی ہے۔ قضا کے مسئلے میں بھی کسی مالکی کے اختلاف کا تذکرہ نہیں کیا جبکہ امام طبری اور امام ابوحنیفہ تک سے منسوب روایتوں کی تاویل و توجیہ کی انھوں نے ضرورت بھی۔ ہمارے خیال میں اس کے بعد یہ بات آسانی سے نہیں کہی جاسکتی کہ امام مالک یا کسی مالکی کا مسئلہ قضا میں بھی اختلاف ہو چہ جائیکہ امارت کے مسئلہ میں ان کا نام لیا جائے۔

"ابن نذیر" صاحب کے نام سے شائع ہوا ہو اس میں اس عبارت کے زیر بحث حصے کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"اور علامہ طبری نے اس کی اجازت دی ہے اور یہی امام مالک اور امام ابوحنیفہ سے بھی روایت ہے۔ یہ تینوں حضرات کہتے ہیں کہ جن معاملات میں عورتوں کی شہادت قبول کی جائے گی اُن میں وہ صاحب امر بھی بنے گی۔

(فاران نومبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۷)

ہمیں امید ہے کہ "شَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ أَهْلِهَا" کے بحیثیت تائیدی شہادت ضرور تسلیم کر لی جائے گی۔[1]

فاران کے اسی مضمون میں (فتح الباری کے منقولۂ بالا حوالے کے بعد متصلاً ہی) المغنی لابن قدامہ کی یہ عبارت بھی نقل کی گئی ہے کہ

وحکی عن ابن جریر انہ لا تشترط الذکوریۃ لان المرأۃ یجوزان تکون مفتیۃ فیجوزان تکون قاضیۃ	اور کہا گیا ہے کہ ابن جریر مرد ہونے کی شرط عائد نہیں کرتے اس لیے کہ جب کسی عورت کو مفتی بنایا جا سکتا ہے تو وہ قاضی بھی ہو سکتی ہے۔

اس حوالے سے بھی اس کی تائید ہوئی کہ ابن جریر کا اختلاف صرف قضا کے باب میں ہے۔

بہرحال یہ بات بالکل طے ہو کہ ابن جریر طبریؒ کا اختلاف اگر کچھ ہے تو عورت کی قضا کے جواز و عدم جواز میں ہے، عام اس سے کہ مطلق جواز کے قائل تھے یا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی

---

[1] لیکن اسے تسلیم کر لینے سے بھی ان حضرات کا کیا بگڑے گا اس ترجمے میں ایک ادھ مصیبت ڈھائی گئی ہو کہ "تلی الحکم" کا ترجمہ "صاحب امر بنے گی" کر دیا گیا ہو۔ ہم اگر پہلے سے اسے دیکھ لیتے تو اوپر کی لمبی بحث کے چکر ہی میں نہ پڑتے۔ کیونکہ اس ترجمے سے یہ امکان معلوم ہوا کہ شاید مدیر شہاب نے بھی اپنے حوالے کی بنیاد اسی لفظ پر رکھی ہو۔ لیکن یہ ہو بالکل غلط کیونکہ "حکم" کا ترجمہ امر و حکومت (عربی میں) نہیں ہوتا ہو۔ حکم تو فیصلہ کرنے (قضا) کو کہتے ہیں۔ اور یہاں بھی وہ اسی معنی صرف لیجئے تو خود سمجھ میں آجائے گا کہ کسی جج اور قاضی ہی کا دائرہ سماعت محدود ہو سکتا ہو اور اسی لیے وہ متعدد ہو سکتے ہیں لیکن کیا کسی ملک میں سربراہ و حکمران بھی متعدد ہو سکتے ہیں کہ ایک کے صدود اختیارات کچھ ہوں دوسرے کے اس سے مختلف کچھ اور؟ مالکم کیف تحکمون!

ایک روایت کی طرح محدود جواز کے۔ لیکن امارت کے مسئلہ میں ان کا مذہب بالکل وہی تھا جو جمہور کا مذہب ہے، کہ عورت کو امیر مملکت بنانے کی اجازت نہیں ہے۔ امام مالک تو ان کی کسی اختلافی روایت کا معاملہ قاضی ابن العربی مالکی کی گفتگو کی روشنی میں سرے سے ہی مشکوک ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی روایت ہے اور فتح الباری کی نقل صحیح ہے تو اس نقل کا جو مطلب امام طبری کے بارے میں لیا جائے گا امام مالک کے بارے میں اس سے مختلف کسی طرح نہیں لیا جا سکتا۔ یعنی یہ کہ اختلافی روایت صرف قضا کے بارے میں ہے۔ اور امام ابو حنیفہ کا معاملہ تو کسی گفتگو کا محتاج ہی نہیں، اُن کی حد تک تو فتح الباری کی ظاہر عبارت سے بھی یہ بات قطعی ہے کہ ان کی اختلافی روایت کا تعلق صرف قضا کے مسئلے سے ہے، وہاں امارت کے مسئلے کا وہم بھی نہیں ہو سکتا ——— اور زیر بحث مسئلہ امارت کا ہے نہ کہ قضا کا!۔

ہماری نظر میں کیا غالباً سبھی کی نظر میں، ان ائمہ کے حوالوں کی جو اہمیت ہو سکتی ہے وہ نہ حضرت تھانویؒ کے کسی حوالے کی، نہ سید سلیمان صاحب ندویؒ کے، اور نہ مفتی مہدی حسن کے کسی فتوے کی۔ الحمد للہ کہ ان اکابر ائمہ کا دامن کسی ایسے قول کے صحیح انتساب سے بالکل صاف نکلا جس کا حوالہ عورت کو سربراہ مملکت بنانے کے حامیوں نے دیا تھا۔ ایسی باتیں غلط فہمی سے ہو جائیں تو دوسری بات ہے اور غلط فہمی کی تھوڑی بہت گنجائش فتح الباری کی کتاب المغازی[1] والی عبارت کے لحاظ سے ہم بھی مانتے ہیں لیکن کتاب الفتن والی عبارت پر نظر رکھتے ہوئے بھی اس طرح کی بات ان ائمہ کی طرف منسوب کر دینا کسی راست باز آدمی کا کام نہیں ہونا چاہیے اور یا پھر ایسے آدمی کو مان لینا چاہیے کہ وہ ان بلند پایہ کتابوں سے استفادہ کی اہلیت نہیں رکھتا! ——— یوں بھی ذرا سوچیے کی بات ہے کہ یہ ائمہ دین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی واضح انتباہی حدیث کے بعد کہ "وہ قوم ہرگز فلاح یاب نہ ہوگی جو ایک عورت کو اپنی مملکت کا اقتدار سونپ دے!" اور اسی حدیث سے جمہور کے اس فیصلے کے بعد کہ عورت کو مسلمانوں کے درمیان سربراہ مملکت بننے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، کیسے یہ جرأت کر سکتے تھے کہ بغیر کوئی مضبوط دلیل یا معقول اعتراض پیش کیے ہوئے جمہور کے اس فیصلے

---

[1] یعنی جلد ۸، ص۹۰ (مصری) یا جزء ۱۰، ص۹۱ (ہندوستانی)

دو گردانی کریں۔ ہاں یہ بات سمجھ میں آنے کی ہے کہ جمہور نے اسی حدیث سے قیاس و اجتہاد کے طور پر مسئلہ قضا کے بارے میں بھی یہی فیصلہ کیا ہو اور بعض ائمہ کے نزدیک یہ قیاس صحیح نہ ہوتا ہو۔ کیونکہ قیاس اور اجتہاد میں ہر امام دوسرے سے اختلاف کا حق رکھتا ہے۔ فتح الباری کی کتاب الفتن والی عبارت کے شروع کے الفاظ پر توجہ کیجئے تو بہت صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ قضا کے مسئلہ میں جمہور کا اس حدیث سے استدلال دلیل قیاسی کے طور پر ہی ہے اور اختلاف کرنے والوں کا اختلاف بھی اس قیاس ہی میں ہے۔ رہا مسئلہ امارت جس کی بنیاد نص حدیث ہے وہ کہیں بحث میں ہے ہی نہیں۔ اس میں سب کے سر صادق و مصدوق علیہ السلام کی تنبیہ کے احترام میں ایک سمت میں جھکے ہوئے ہیں۔ اور یہی ایمان کی شان ہے۔ (باقی ان شاء اللہ آئندہ)

انسان — جس کو سائنس دریافت نہ کر سکی

از- جناب وحید الدین خاں صاحب

جدید علما طویل تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ جس طرح ہم بے جان مادہ کے مطالعہ میں کامیاب ہوئے ہیں، اسی طرح ہم انسان کے متعلق حقائق کو دریافت نہیں کر سکتے۔ جامد مادے کے علوم اور حیاتیاتی علوم کے درمیان یہ فرق ہے کہ جامد مادہ ایک متعین قانون کا پابند ہے۔ جبکہ حیاتیاتی مظاہر گویا "ایک طلسماتی جنگل ہیں جہاں رنگ برنگ کے بے شمار درخت مسلسل طور پر اپنی جگہ اور اپنی شکل بدلتے رہتے ہیں۔" مادی مظاہر کے برعکس حیاتیاتی مظاہر کو جبر و مقابلہ کی مساواتوں میں تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ مادی دنیا کا علم بھی اب تک صرف وصفی علم (Descriptive Science) کے مقام تک پہونچا ہے جو درحقیقت سائنس کی ابتدائی شکل ہے۔ کیوں کہ یہ علم چیزوں کی اصل نوعیت کو ہمارے اوپر بے نقاب نہیں کرتا، بلکہ یہ اس کے چند ظاہری اوصاف مثلاً وزن اور مکانی ابعاد (Spatial Dimensions) وغیرہ کو بیان کرتا ہے تاہم اس علم کی بدولت یہ ہوا ہے کہ ہم میں اتنی طاقت پیدا ہو گئی ہے کہ آئندہ ہونے والے واقعات کے متعلق پیشین گوئی کر سکیں بلکہ اکثر حالات میں ان کے ٹھیک ٹھیک واقع ہونے کی تاریخ کا تعین کر سکیں۔ مادہ کی ترکیب اور اس کی خصوصیات جان لینے کے بعد ہم کو اپنی ذات کے علاوہ تقریباً ہر اس چیز پر قابو حاصل ہو گیا ہے جو زمین کی سطح پر موجود ہے۔ جانداروں کے علم نے بالعموم اور انسان کے علم نے بالخصوص اتنی زیادہ ترقی نہیں کی ہے، یہ علم اب تک صرف وصفی حالت میں ہے جبکہ ذی حیات اشیاء کی اصل حقیقت ان کا غیر وصفی ہونا ہے۔

یہاں میں الکسس کیرل کا اقتباس نقل کروں گا:

"انسان ایک انتہائی پیچیدہ اور ناقابل تقسیم کل ہے. کوئی چیز بھی آسانی کے ساتھ اس کی نمائندگی نہیں کر سکتی. کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے جس کے ذریعہ ہم بیک وقت اس کی پوری ذات کو اس کے اجزاء اور بیرونی دنیا کے ساتھ اس کے تعلقات کو بخوبی سمجھ سکیں. اپنی ذات کا تجزیہ کرنے کے لیے ہم کو مختلف فنی مہارتوں سے مدد لینی پڑتی ہے اور اس طرح مختلف علوم سے کام لینا ہوتا ہے فطری طور پر یہ تمام علوم اپنے کسی عام مقصد کے متعلق کسی ایک متحدہ تصور پر نہیں پہونچتے. وہ انسان سے صرف انھیں چیزوں کی تجرید کرتے ہیں جو ان کے خاص طریقوں سے حاصل ہو سکتی ہیں اور ان مجردات کو ایک دوسرے سے ملا بھی دیا جائے تو وہ ایک ٹھوس حقیقت سے بھی کم قیمتی ہوتے ہیں. ان مجردات کے بعد بھی ایک ایسی ذات باقی رہتی ہے جو بہت ہی اہم ہوتی ہے اور اسکو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا. علم تشریح، کیمیا، فعلیات، نفسیات، تعلیمات، تاریخ، سماجیات، سیاسی اقتصادیات اپنے موضوع کو پورے طور پر ختم نہیں کرتے. وہ انسان جس سے خصوصی ماہرین آشنا ہیں، حقیقی انسان سے بہت دور ہوتا ہے. وہ ایک مفروضہ کے سوا اور کچھ نہیں جو مختلف مفروضات پر مشتمل ہے اور جن کو ہر ایک علم کی فنی مہارتوں نے پیدا کیا ہے.

انسان بیک وقت ایک لاش ہے جس کو تشریح کا عالم چیرتا پھاڑتا ہے، وہ ایک شعور ہے جس کا ماہرین نفسیات اور بڑے بڑے روحانی اساتذہ مشاہدہ کرتے ہیں. وہ ایک شخصیت ہے جس کے اندر دیکھنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اسی کی ذات کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے، وہ کیمیاوی مادہ بھی ہے جس سے جسم کی نسیں اور خلیلیں بنتی ہیں، وہ خلیوں اور تغذیاتی رطوبتوں کا ایک حیرت انگیز گروہ ہے جن کے جسمانی قوانین کا مطالعہ ماہرین فعلیات کرتے ہیں، وہ نسیوں اور شعور سے مرکب ہے جس کو حفظان صحت اور تعلیمات کے ماہرین، جبکہ وہ زمان کے اندر پھیل رہا ہو، امید افزا ترقی دینے کی کوشش کرتے ہیں، وہ ایک گھریلو اقتصادیات کا حامل ہے جس کا کام پیدا کی ہوئی چیزوں کو استعمال کرتے رہنا ہے تاکہ مشینیں، جن کا وہ غلام بن گیا ہے، برابر کام کرتی رہیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک شاعر، سورما اور ولی بھی ہے، وہ نہ صرف ایک انتہائی پیچیدہ ہستی ہے جس کا تجزیہ سائنس کی فنی مہارتوں کے ذریعہ کیا جا رہا ہے بلکہ وہ انسانیت کے رجحانات

قیاسات اور آرزوؤں کا مرکز ہو .... بلاشبہ انسانیت نے اپنی حقیقت کو معلوم کرنے کی بڑی زبردست کوشش کی ہے۔ اگرچہ ہمارے پاس تمام زمانوں کے سائنس دانوں فلسفیوں، شاعروں اور بڑے بڑے صوفیوں کے مشاہدات کا ایک انبار موجود ہو گر ہم اپنی ذات کے صرف چند پہلوؤں کو دریافت کر سکے ہیں۔ ہم انسان کو اس کی کلی حیثیت میں بخوبی سمجھ نہیں سکے ہیں۔ ہم اس کو الگ الگ حصوں سے مرکب جانتے ہیں اور یہ حصے بھی ہمارے اپنے طریقوں کے پیدا کردہ ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص ایک خیالی پیکر ہو جس کے اندر سے ایک نامعلوم حقیقت جھلک رہی ہے۔

حقیقت میں ہماری ناواقفیت بہت گہری ہے۔ وہ لوگ جو انسانی ہستیوں کا مطالعہ کرتے ہیں، اپنے آپ سے بہت سے ایسے سوالات کرتے ہیں جن کا کوئی جواب نہیں ہو۔ ہماری اندرونی دنیا کے وسیع علاقے اب تک نامعلوم ہیں۔ خلیے کے پیچیدہ اور عارضی اعضا کے بنانے کے لیے کس طرح کیمیائی مادوں کے سالمے باہم مل جاتے ہیں، تر و تازہ بیضہ کی نواۃ NUCLEUS کے اندر کے نسلی مادے کس طرح اس فرد کی خصوصیات کا فیصلہ کرتے ہیں جو اس بیضہ سے پیدا ہوتا ہے، کس طرح خلیے خود اپنی کوششوں سے نسیجوں اور اعضا کے جیسے گروہوں میں منظم ہو جاتے ہیں۔ چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی طرح ان خلیوں کو پہلے ہی سے معلوم ہو جاتا ہو کہ اپنے گروہ کو زندہ رکھنے میں انھیں کیا کام کرنا ہے۔ اور چھپی ہوئی بناوٹوں کے ذریعہ وہ ایک ایسے نظام جسمانی کے بنانے کے قابل ہوتے ہیں جو سادہ اور سپے چیدہ دونوں ہوتا ہے۔ ہماری مدت (DURATION) خلیاتی وقت (PHYSIOLOGICAL TIME) اور نفسیاتی وقت (PSYCHOLOGICAL TIME) کی نوعیت کیا ہو۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہم نسیجوں، اعضا، رطوبتوں اور شعور سے مرکب ہیں۔ لیکن شعور اور دماغ کے درمیانی تعلقات اب تک ایک راز بنے ہوئے ہیں۔ ہم کو اعصابی خلیوں کے فعلیات کا پورا پورا علم حاصل نہیں ارادی قوت کس حد تک نظام جسمانی میں تبدیلیاں پیدا کرتی ہو۔ کس طرح دماغ اعضا کے حالات سے متاثر ہوتا ہے، طرز زندگی، غذا کے کیمیائی مادوں، آب و ہوا اور فعلیاتی اور اخلاقی تربیتوں کے ذریعہ کس طرح جسمانی اور دماغی خصوصیات میں، جو بطور وراثت ہر ایک فرد کو ملتی ہیں، تبدیلیاں

پیدا کی جا سکتی ہیں۔

ہم یہ بھی نہیں جان سکے کہ ڈھانچہ، عضلات اور اعضا، اور دماغی اور روحانی سرگرمیوں کے درمیان کس قسم کے تعلقات ہیں۔ ہم ان اسباب سے ناواقف ہیں جن کی بنا پر اعصابی توازن اور تھکان اور بیماریوں کی مدافعت پیدا ہوتی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اخلاقی احساس، قوتِ فیصلہ اور جرأت کو کس طرح ترقی دی جا سکتی ہے۔ ذہنی، اخلاقی اور صوفیانہ سرگرمیوں کی اضافی اہمیت کیا ہے۔ جمالیاتی اور مذہبی احساس کی ضرورت کیا ہے، کس قسم کی قوت سے اشراقی تعلقات کا ظہور ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض فعلیاتی اور دماغی اسباب خوشی یا تکلیف کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کرتے ہیں۔ لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ وہ اسباب کیا ہیں۔ ہم کسی فرد کے اندر مصنوعی طور پر خوشی کا جذبہ نہیں پیدا کر سکتے۔ اب تک ہم اس کو نہیں جان سکے کہ متمدن آدمی کی امید افزا ترقی کے لیے کس قسم کا ماحول زیادہ مناسب ہے؛ کیا ہماری فعلیاتی اور روحانی ساخت سے کشمکش، محنت اور تکلیف کو دور کرنا ممکن ہے، موجودہ تمدن میں ہم انسان کو زوال پذیر ہونے سے کس طرح روک سکتے ہیں۔ ان باتوں کے متعلق، جو ہماری انتہائی دلچسپی کا باعث ہیں، بہت سے دوسرے سوالات کیے جا سکتے ہیں، ان کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ انسان کے متعلق تمام علوم کی مہارت بھی ناکافی ہے اور یہ کہ اپنی ذات کے متعلق ہمارا علم اب تک ابتدائی حالت میں ہے۔"

MAN THE UNKNOWN. P.P. 16-19

یہ اقتباس یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے کہ "انسان" کا علم ابھی تک انسان کو حاصل نہیں ہوا۔ انسانی وجود کے مادی حصہ کے بارے میں تو ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ مگر وہ انسان جو اس مادی وجود کو کنٹرول کرتا ہے اس سے ہم قطعاً لاعلم ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ زندگی اب تک ہمارے لیے ایک رازبنی ہوئی ہے اور جب تک یہ راز نہ کھلے زندگی کی صحیح تعمیر و تشکیل ممکن نہیں۔ الکسس کیرل کی کتاب "انسان نامعلوم" کو دریافت کرنے کی ایک سائنٹفک کوشش ہے۔ اس طرح کی کوششیں موجودہ زمانے میں بہت بڑے پیمانے پر جاری ہیں مگر اب تک کا نتیجہ صفر کے سوا اور کچھ نہیں۔

آج کا انسان ایٹم توڑ سکتا ہے۔ برفیلے علاقوں میں آبادیاں قائم کر سکتا ہے۔ وہ خلاء کے دوسرے سیاروں تک سفر کے منصوبے بنا رہا ہے۔ اس طرح کے ہزاروں واقعات ہیں جن کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح انسان نے مادی دنیا سے واقفیت حاصل کر لی ہے اور اس کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر رہا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے آپ کو بھی جان سکتا ہے اور اپنے معاملات کو درست کر سکتا ہے مگر خود ہماری معلوم دنیا کے اندر اس بات کے اشارے موجود ہیں کہ ہم جس طرح مادے کے اوصاف کو معلوم کر لیتے ہیں، اسی طرح ہم انسان کو سمجھ نہیں سکتے۔

جس وجود کو ہم "انسان" کہتے ہیں، وہ پروٹوپلازم کے بنے ہوئے کروڑوں خلیوں پر مشتمل ایک جسم ہے۔ پروٹوپلازم کیا ہے؟ وہ غیر ذی روح اشیاء کا ننھا سا مرکب ہے جس کے اندر روح پذیری کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے۔ سادہ لفظوں میں وہ زندگی کی اکائی ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح ہم مادی دنیا کو سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ کرتے ہیں ٹھیک اسی طرح ہم پروٹوپلازم کا مطالعہ نہیں کر سکتے۔

وہ سب کچھ جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہ کچھ چیزوں کا مرکب ہی ہوتا ہے۔ اگر وسائل و ذرائع حاصل ہوں تو ہم اس طرح کے تمام مرکبات کو وجود میں لا سکتے ہیں اور انہیں ختم بھی کر سکتے ہیں۔ اسی بنیاد پر جرمن فلسفی کانٹ نے ۱۷۵۵ء میں کہا تھا ــــــ "مجھے مادہ مہیا کر دو اور میں تم کو بتا دوں گا کہ دنیا اس مادہ سے کس طرح بنائی جاتی ہے۔" یا ہیکل (HAECKEL) نے دعویٰ کیا کہ "پانی، کیمیائی اجزاء اور وقت ملے تو وہ ایک انسان کی تخلیق کر سکتا ہے۔"

مثلاً پانی کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ اس کا ایک سالمہ (MOLECULE) آکسیجن کے ایک ایٹم اور ہائیڈروجن کے دو ایٹم سے مرکب ہوتا ہے، یہ بالکل ہمارے بس میں ہے کہ ہم ان گیسوں کو اسی تناسب سے ملا کر پانی کی شکل دیدیں۔ یا پانی کے سالموں کو توڑ کر دوبارہ آکسیجن اور ہائیڈروجن میں تبدیل کر دیں۔ مگر انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے سائنس نے وہ اجزاء معلوم کر لیے ہیں جو پروٹوپلازم میں پائے جاتے ہیں اور ان کے مخصوص

تناسب بھی دریافت ہو چکے ہیں مگر انسان یہ نہیں کر سکتا کہ ان اجزاء کو اسی مخصوص ترتیب سے ملا کر زندگی پیدا کر دے۔ پروٹوپلازم کے اجزائے ترکیبی کے درمیان جو تناسب ہے ٹھیک اسی تناسب سے ان اجزاء کو ملایا جاتا ہے لیکن وہ پروٹوپلازم نہیں بنتا جو ذی روح ہو، حالاں کہ دوسرے کیمیاوی مرکبات ان کے اجزائے ترکیبی کو اسی نسبت سے ملانے پر بن جاتے ہیں۔ گویا ہم جس طرح مادی اشیاء میں تصرف کر کے مادی واقعات کو وجود میں لاتے ہیں ٹھیک اسی طرح ہم انسان کے اوپر تصرف کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔

یہ انسان کے سلسلے میں ہماری پہلی عاجزی ہے جس کا اعتراف کرنے پر ہم مجبور ہیں۔ دوسری اس سے بڑی چیز یہ کہ انسان کے سلسلے میں ہمارا تمام طبیعاتی مطالعہ انسانِ مردہ کا مطالعہ ہے، انسانِ زندہ کا مطالعہ کرنے کی صلاحیت ہم اپنے اندر نہیں رکھتے۔ سائنس نے وہ اجزاء معلوم کر لیے ہیں جو پروٹوپلازم میں پائے جاتے ہیں اور ان کا مخصوص تناسب بھی معلوم ہو چکا ہے۔ لیکن یہ دریافت نہ ہو سکا کہ ان کے درمیان وہ کون سی مخصوص ترتیب ہے جس کے قائم رہنے سے پروٹوپلازم ذی روح بنا رہتا ہے اور جہاں یہ ترتیب بگڑی، ذی روح پروٹوپلازم غیر ذی روح ہو جاتا ہے۔ گویا اصل میں وہ مخصوص ترتیب ہی ہے جو پروٹوپلازم میں روح کی موجودگی کی ذمہ دار ہے مگر مشکل یہ ہے کہ اس مخصوص ترتیب کو باقی رکھتے ہوئے پروٹوپلازم کا کیمیاوی تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ پروٹوپلازم کا تجزیہ کرنے کے لیے لازمی طور پر اس کی کیمیاوی ترتیب کو توڑنا پڑتا ہے اور جوں ہی ہم ایسا کرتے ہیں اس کے اندر سے زندگی رخصت ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب بھی پروٹوپلازم کا کیمیاوی تجزیہ کیا جاتا ہے تو یہ وہی وقت ہوتا ہے جبکہ پروٹوپلازم سے اس کی روح نکل چکی ہوتی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کیمیاوی تجزیہ کیا جا رہا ہو اور پروٹوپلازم میں روح موجود ہو۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک ایسا نہ ہوگا۔ یعنی روح کی موجودگی میں تجزیہ نہ کیا جائے گا، زندگی کی حقیقت معلوم کرنے کے بارے میں سائنس ہمیشہ اندھیرے میں رہے گی۔

مگر ہماری مشکل یہیں ختم نہیں ہوتی۔ وہ اس سے بہت آگے جاتی ہے۔

فرض کیجیے ایک شخص اپنے ذمہ یہ کام لیتا ہے کہ وہ انسانیت کی حقیقت معلوم کرے گا

اور انسان کو بتائے گا کہ زندگی کا قانون کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ انسانی آبادیوں سے اپنے مطالعہ کا آغاز کرتا ہے۔ لمبے عرصہ تک مختلف سماجوں کی چھان بین کرنے کے بعد اسے محسوس ہوتا ہے کہ سماج تو انسانوں کے مجموعے کا نام ہے۔ اس لیے جب تک ہم فرد کو سمجھ نہ لیں، جماعت کو کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اب وہ معاشرہ کو چھوڑ کر انسان کا مطالعہ شروع کرتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ سب سے پہلے نفسیات کی طرف رُخ کرتا ہے، یہاں وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا کوئی ایک نکر نہیں بلکہ اس کی بہت سی شاخیں ہیں۔ اور سب کے نتائج تحقیق الگ الگ ہیں۔ نفسیات کی ایک شاخ کا دعویٰ ہے کہ انسان کے تمام اعمال کا مرکز اس کا احساس ہے۔ کسی کا کہنا ہے کہ انسان خارجی دنیا سے شعوری یا غیر شعوری طور پر جو تاثر قبول کرتا ہے، اس کا ہر کام اسی کا ردِ عمل ہے، کوئی جنسی خواہشات کو اس کے تمام اعمال کا محرک بتاتا ہے، کسی کا مطالعہ یہ ہے کہ اپنے آئیڈیل کو پا لینے کا نامعلوم جذبہ انسان کو متحرک کیے ہوئے ہے۔ کوئی مکتبِ فکر شعور کو اصل قرار دیتا ہے اور اسی کی روشنی میں انسان کی پوری ہستی کی تشریح کرتا ہے اور کوئی اس بات کا قائل ہے کہ عقل اور ذہن کوئی چیز نہیں۔ انسان کے مختلف اعضار کی عنان کسی ایک مرکزی قوت کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ انسان جس حصہ جسم پر زیادہ توجہ دیتا ہے اس کی نشو ونما بہتر طریقہ سے ہو جاتی ہے اسی کے نتیجے میں کوئی ابھار قائم بن جاتا ہے۔ کوئی اچھا مفکر، نفسیات کا یہ اختلاف اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ بعض لوگ سرے سے اس واقعہ ہی کا انکار کرتے ہیں کہ اس نام کا کوئی علم (SCIENCE) فی الواقع موجود ہے۔

خیالات کے اس جنگل کو دیکھ کر وہ سوچتا ہے کہ انسانی وجود کے دوسرے حصے حیاتیات کا مطالعہ کرے تاکہ دونوں کے نتائج کو ملا کر کوئی رائے قائم کی جا سکے۔ جب انسان کو وہ اس حیثیت سے دیکھتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ انسان، نظامِ ہضم، نظامِ تنفس، نظامِ دورانِ خون وغیرہ کا ایک مجموعہ ہے۔ ان نظاموں کی بنیاد چند کیمیاوی تبدیلیوں پر ہے جو کچھ کیمیاوی اشیا اور ان کے آپس کے عمل اور ردِ عمل سے پیدا ہوتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جسم کا سارا نظام کیمیاوی تحلیل (METOBOLISM) کا ہی ایک پیکر ہے۔

اب وہ غور کرتا ہے تو اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ جب جسم انسانی کا وجود اور اس کا

نشو و نما کیمیاوی ردو بدل کا مرہون منت ہے. تو پہلے کیمیاوی تبدیلیوں کے اصولوں کو ہی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے اس کے بغیر انسان کے بارے میں حقیقی اور قابل اطمینان معلومات نہ مل سکیں گی۔ اس لیے اب وہ کیمیا اور طبیعات کا مطالعہ کرنے لگتا ہے اور اس میں ایک عمر کھپا دیتا ہے۔

کیمیا اور طبیعات کا مطالعہ اسے مالیکیول اور ایٹم کے مطالعہ تک لے جاتا ہے اور پھر وہ ایٹم کے اجزائے ترکیبی ــــــ الکٹران اور پروٹان وغیرہ کا مطالعہ شروع کر دیتا ہے۔ جس کے بعد اسے معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات برقی لہروں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس طرح مطالعہ کرتے کرتے بالآخر وہ جدید سائنس کے آخری شعبے ــــ نیوکلر سائنس ــــ میں داخل ہو جاتا ہے ــــ اس طرح معلومات کا عظیم دفتر جمع کرنے کے باوجود وہ کسی نتیجے پر نہیں پہونچا۔ اور جو شخص انسان کی حقیقت معلوم کرنے اور اس کے لیے قانون وضع کرنے چلا تھا۔ وہ ایک ایسی دنیا میں گم ہو جاتا ہے جو نظر آنے کے باوجود نظر نہیں آتی ڈاکٹر جوڈ (JOAD) کے الفاظ میں:-

> "جدید مادہ ایک ایسی بے حقیقت چیز ہے جو ہاتھ نہیں آسکتی۔ یہ فاصلہ اور وقت کے مرکب کا ایک ابھار، برقی رو کا ایک جال ۔ یا امکان کی ایک لہر ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے فنا کے اندر کھو جاتی ہے۔ اکثر اوقات اسے مادہ کے بجائے دیکھنے والے کے شعور کا ایک پھیلاؤ سمجھا جاتا ہے۔"

زندگی کے راز کو مادی علوم میں تلاش کرنے کا یہ عبرت ناک انجام بتاتا ہے کہ زندگی کا راز انسان کے لیے ناقابل دریافت ہے۔ اب جس طرح ایک بیمار شخص کی یہ معذوری کہ وہ خود اپنا علاج نہیں کر سکتا۔ اس کو یہ ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ اس کو ایک ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے اسی طرح نظام فطرت میں انسان کا ایک چیز کے لیے ضرورت مند ہونا اور پھر اس ضرورت کی تکمیل کے لیے کافی صلاحیت نہ رکھنا اس بات کا اشارہ ہے کہ اس کے لیے وہ اپنے اس رب کا محتاج ہے جس نے اسے موجودہ شکل میں بنایا ہے۔ جس طرح خدا نے اسے آکسیجن کا محتاج بنایا اور پھر آکسیجن بے حساب مقدار میں سارے کرہ ارض کے گرد پھیلا دی، اسی طرح اس نے انسان کو زندگی کی حقیقت جاننے کا محتاج بنایا اور پھر اپنے نبیوں کے ذریعہ زندگی کی حقیقت واضح فرمائی۔

Cover Printed at Allahabad Oriental Press, Lucknow

الفرقان لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسئول

محمد منظور نعمانی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

(فی کاپی - ۶۰ پیسے)

جلد ۳۲	بابتہ ماہ شوال ۱۳۸۴ھ مطابق مارچ ۱۹۶۵ء	شمارہ ۱۰

اگر اس دائرے میں ◯ سرخ نشان ہے، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو گئی ہے، براہِ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۱۰ مارچ تک آ جائے ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی پی روانہ ہوگا۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری:۔ براہِ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت:۔ الفرقان ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع فرمائیں۔ اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ کے اندر آ جانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولانا) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر نے [illegible] تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

از ——— عتیق الرحمٰن سنبھلی

ہم خدا کے اس معجزانہ کرم پر صمیم قلب سے شکر گزار ہیں کہ پاکستان کے صدارتی الیکشن کے سلسلے میں وہاں کی جماعت اسلامی اور اس کے قائدین کی جس روش کو ہم نے برصغیر (ہند و پاک) کے مسلمانوں کے لیے ایک عظیم دینی فتنہ جان کر اس کی خطرناکیوں کو اجاگر کرنے کی ذمہ داری بہت سے مخلصوں اور محبوں کی ناگواری اور اپنی گرتی پڑتی صحت کے لیے اس کی ضرر رسانی کے قطعی اندیشوں کے باوجود اٹھائی تھی، اس کی صحت اور ضرورت پر گواہی دینے کے لیے خدا نے جماعت اسلامی پاکستان ہی کی صفوں سے ایک "رجل رشید" کو کھڑا کیا اور اس نے پورے بسط و تفصیل کے ساتھ دنیا کے سامنے اعلان کر دیا کہ جماعت اسلامی پاکستان کی یہ روش (جس کی حمایت و مدافعت کے گناہ میں اس کے قلم نے بھی پورا پورا حصہ لیا ہے) ایک جماعتی اور فروعی نوعیت کا مسئلہ نہیں، بلکہ پورے نظام دین کے لیے منکرین حدیث کے مسلک سے بھی زیادہ خطرناک" اور "دین کی پامالی کے لیے اذن عام" کا حکم رکھتی تھی۔ جسے محض سیاست کی خاطر اپنا کر ایک گمراہ کن دینی فلسفہ اس کے لیے تراش دیا گیا۔

یہ شہادت، ہفت روزہ شہاب (لاہور) کے مدیر جناب کوثر نیازی کی ہے جسے انھوں نے سب سے پہلے اپنے محترم امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمت میں پیش کیا اور جب اس کا نتیجہ صرف مولانا کی برہمی کی شکل میں نکلا تو جماعت سے اپنے استعفے کے ساتھ انھوں نے اسے پبلک کے سامنے رکھ دیا۔

ایک طرف توفیق الٰہی کی دستگیری کا یہ منظر ہے کہ جن کو اعتراف حق میں، جماعت کے ساتھ ساتھ خود اپنی رسوائی کا بھی پورا پورا خیال ہو سکتا تھا ان کے اس خیال پر خدا کا خوف ہی

غالب ہوگیا اور جنگ ہنسائی کا شیطانی وسوسہ بھی مواخذۂ آخرت کے یقین کی طاقت کے آگے اپنی نہیں چلا سکا۔ لیکن اسکے بالمقابل ایک دوسرا منظر یہ ہوکہ جن کا جماعت اسلامی پاکستان کی اس روش کی ذمہ داری سے کوئی تعلق نہیں تھا اور جن کو اللہ نے اس گناہ میں شرکت کے ابتلا کی کسی بھی مجبوری سے دور رہنے کا پورا پورا موقع فراہم کر رکھا تھا انھوں نے خالص عصبیت کے جذبے میں آکر نہ صرف اس غلط روش کی نہایت بھرا اور حلق میں پھنسی پھنسی علمی مدافعت شروع کردی، بلکہ ان میں سے بعض کی عصبیت نے تو یہاں تک زور مارا کہ علمی بادرات لالی گرفتوں کے کسی بھی جواب سے بے نیاز ہوکر نہ صرف طعن و طنز کے سیل یاب چلے ناقدوں کی زبان بندی کے لیے آزمائے بلکہ ان کے باپ دادا تک کو کھلی کھلی گالیاں سنادیں کہ اگر ایسے نہیں تو ایسے تو اس حرکت سے آئندہ کے لیے توبہ کر ہی لیں گے!

طعن و طنز کے یہ تیر ہم جیسے دوسرے دیوانوں کے بھی حصے میں آئے ہیں مگر گالیاں ہمارا نصیب خاص ہیں۔ ہم بھی پہلو میں دل رکھتے ہیں اور گالیاں نہ سہی طنز ہمارے قلم کو بھی تھوڑا بہت آتا ہے اور بالخصوص ایسی حالت میں تو یہ کچھ بھی مشکل نہیں جبکہ اصل مسئلہ پر ایک حرف بھی سامنے سے کہنے کے بجائے یہ ساری خاک ادھر اُدھر سے اُڑائی جارہی ہو، بلکہ اپنی اس بشری کمزوری کا اظہار ہمیں کرنے دیجئے کہ دو چار لفظ تو اس تہذیب گفتار پر کہنے کو جی چاہتا ہی تھا جن سے قلم کو باز رکھنے میں ہم بمشکل کامیاب ہو سکے ہیں۔ اور اس میں اگر کوئی خیر ہو تو اسکی جزا کا پہلا حصہ یہ مددگار ہماری طرف سے جناب کوثر نیازی کو عطا فرمائے کہ انھیں کی قلندرانہ بازگشت سے ہم نے اپنے آپ کو یہ سمجھایا کہ اگر ان کی جیسی مشکل پوزیشن میں بھی آدمی کو رجوع الی الحق کے لیے اس جرأت کی توفیق مل سکتی ہو تو کیوں نہ امید رکھی جائے کہ جن پر صرف عصبیت کا جادو ہو، اور کوئی مشکل راہ میں نہیں، وہ بھی کل کوثر نیازی ہی کے نقش قدم پر نظر آئیں، آخر حق کے جادو کو کیوں عصبیت کے جادو سے کم اثر سمجھ لیا جائے؟ اور کیوں ایک کوثر نیازی کے سوا دوسروں پر اس مبارک بازگشت کی راہ کا بند ہو جانا طے کر لیا جائے؟ آج کوثر نیازی کہہ رہے ہیں کہ

> "مجھے اس سے پیشتر آپکے (مولانا مودودی صاحب کے) نظریۂ حکمت عملی کے ان خطرناک پہلوؤں کا اندازہ نہ تھا جماعت سے نکلنے والے بعض اکابر اس پر گرفت کرتے تھے تو میں

ع‌ ایک بات یہ بھی [illegible] طنز و تعریض کی مشق نہ کریں تو ہم کوثر صاحب سے شکایت کریں گے کہ انھوں نے اس ذیل میں ہمیں کیوں [illegible] جو [illegible] میں تو صراحت کے ساتھ گرفت کی سعادت ہمیں حاصل ہو اور ہم کسی طرح راضی نہیں ہیں کہ ان اکابر کے

اسے مخالفت اور تعصب پر محمول کرتا تھا، مگر صداقتی انتخاب میں پیش ہونے والے اس نئے
نظریئے (یعنی حرمتوں کی ابدی اور غیر ابدی تقسیم۔ ع) نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے اور میں
یہاں تک سوچنے لگا ہوں کہ کیا آپ کا پہلا نظریۂ حکمت عملی انہی مضمرات کا حامل تو نہ تھا؟"

تو ہم کیوں نہ امید رکھیں کہ اس قبیلے میں سے اسی طرح "سوچنے لگنے" والے کچھ اور بھی اٹھ کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اور آج مولانا مودودی کے نظریات پر ہماری تنقید کے "پس منظر" میں آبائی مخالفت و تعصب کا گمان کر کے جو لوگ اس پر کان دھرنے کے لیے تیار نہیں ہیں وہ کل اپنے ضمیر سے ہم آہنگ پا کر برملا اس کی توثیق پر مجبور ہو سکتے ہیں۔

پس اسی امید اور اسی خیال پر ہم یہ تمام تلخ گھونٹ گوارا کر کے اپنے ان دوستوں اور بزرگوں سے کہنا چاہتے ہیں کہ ہماری تنقید اور اس کا "جوش و خروش" آبائی مخالفت ہی پر مبنی سہی، اور وہ ہماری نہیں سنتے نہ سنیں مگر کوثر نیازی کی بات کے لیے تو اپنا دل کھولیں کہ وہاں تو اس بدگمانی کا کوئی موقع نہیں ہے! اور کچھ نہیں تو نیازی صاحب کے اس مکتوب عبرت کے بعد اتنا تو ہو ہی جانا چاہیے کہ مولانا مودودی پر تنقید کرنے والوں کو محض معاندانہ اور نفس زدہ سمجھنے کے بجائے تھوڑے بہت دینی خلوص اور للٰہیت کا امکان ان کے لیے بھی تسلیم کر لیا جائے۔

ہماری دلی آرزو ہے کہ یہ امید پوری ہو لیکن اگر خدا کا فیصلہ یہ نہیں ہے تو ہم مولانا مودودی اور ان کی جماعت کے پُرجوش ہمدردوں سے یہ آخری بات کہہ دینا ہی بہتر سمجھتے ہیں کہ وہ کچھ بھی گمان کرتے ہوں ـــــ اور ہم مدعی بھی نہیں ہیں کہ ہم نفس کے دھوکے میں نہیں آ سکتے ـــــ مگر اپنی فہم اور اپنی دانست میں مولانا مودودی اور ان کی جماعت کے خلاف ہمارا "جوش و خروش" صرف اس لیے ہے کہ اس برصغیر میں ہم انھیں ادھر چند برس کی ان کی مسلسل روش کی بنا پر اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک عظیم فتنہ سمجھتے ہیں۔ جس طرح آپ کو حق ہے کہ انھیں دین حق کے بہترین خادم سمجھنے کی بنا پر ان کی حمایت کریں اسی طرح دوسروں کو بھی حق دیجیے کہ وہ اپنے ضمیر کی (صحیح یا غلط) آواز پر چلیں۔ البتہ ان کے وہ محبین جنھیں "ہندستانی جماعت اسلامی" کہنا چاہیے ان کی توجہ اس حمایت کے مسئلے میں اس بات پر بھی ہونی چاہیے کہ وہ یہ خواہش رکھتے ہیں کہ انھیں جماعت اسلامی پاکستان کے معاملات

میں نہ گھسیٹا جائے، اور جہاں تک ہمارا تعلق ہو کم از کم ہندستان کے موجودہ حالات میں ہم اس کو خود ضروری سمجھتے ہیں (بلکہ خود جماعت اسلامی ہند کی بھی کوئی بات قابلِ تنقید نظر آئے تو اس کے بارے میں بھی یہی فیصلہ کیے ہوئے ہیں کہ جب تک دینی ضرورت کا سوال نہ ہو اس سے کوئی مناقشہ نہ کیا جائے) لیکن یہ خواہش اس صورت میں ہمارے یا کسی کے لیے کس طرح قابلِ تعمیل رہ سکے گی جب آپ خود جماعت اسلامی پاکستان کے معاملات میں اپنی ٹانگ پھنسانے لگیں، اور یہ بھی محض علمی اور استدلالی حمایت کی حد تک نہ ہو بلکہ پوری حریفانہ جارحیت کا مظاہرہ مخالف تنقید وں کے مقابلہ میں کیا جائے؛ آپ مختار ہیں کہ اگر اپنے لیے اسی کو صحیح اور ضروری سمجھیں تو کریں، مگر اس مصالحانہ خواہش سے دستبرداری کا اعلان ہونا چاہیے ـــــ ورنہ یا تو اس خواہش کے اس منطقی تقاضے پر پورا پورا عمل ہو کہ آپ بھی ان معاملات سے اپنے کو بالکل علاحدہ رکھیں یا کم از کم اس حد تک تو نہ جائیں کہ دوسروں کے لیے اس خواہش کے احترام کا (جسے وہ خود بھی ضروری سمجھتے ہیں) کوئی راستہ ہی نہ رہ جائے۔

آخری بات ہمیں یہ اور عرض کرنا ہو کہ اپنی تنقید پر جس جواب کا حوالہ ہم اوپر کے پیروں میں اشارۃً دیتے گئے ہیں، اور جو جماعت اسلامی ہند کے ایک ذمہ دار بزرگ کے قلم سے ہو اس میں بسلسلۂ بحث ہم سے یہ فرمائش بھی کی گئی ہو کہ "جماعت اسلامی پاکستان پر تنقید کی ذمہ داری بھی اگر آپ اپنے اوپر سمجھتے ہیں تو اس سے بڑھ کر یہ ذمہ داری یہاں کی جماعت کے سلسلے میں آپ پر عاید ہوتی ہو پہلے اس کام کو کیجیے" (ملخصاً)، اس مضمون کی جماعت کے سرکاری آرگن "دعوت" میں اشاعت سے اگرچہ یہ سمجھا جا سکتا ہو کہ اس فرمائش کو جماعت کی سرکاری توثیق بھی حاصل ہو، مگر ہمارا دل اسے قبول نہیں کرتا اس لیے احتیاطاً ہم جماعت کی قیادت سے یہ دریافت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ کیا وہ بھی اسے پسند کرتے ہیں؟ ـــــ اگر نہیں تو پھر ان صاحب کے بارے میں کچھ ارشاد ہو جنھیں مبارزت طلبی کے شوق میں موقع و محل سے بھی مطلب نہیں ہے! شبہ ہوتا ہو کہ شاید ؎

ان دنوں جوشِ جنوں ہے ترے دیوانے کو؟

دعوتِ اصلاح

(مدیر الفرقان کی ایک تقریر جو اسی ماہ فروری میں ایک دینی اجتماع میں کی گئی)

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ لقد جاءت رسل ربنا بالحق صلوات اللہ علیھم وعلی کل من اتبعھم باحسان۔

دینی بھائیو اور دوستو!

سب سے پہلے ہم آپ اللہ تعالیٰ کے اس کرم اور احسان کا شکر ادا کریں کہ اس نے ہم کو ایک ایسے مقصد کے لئے دور دراز سے آکر یہاں جمع ہونے کی توفیق دی جو اللہ کی نگاہ میں دوسرے تمام مقاصد سے زیادہ عزیز اور قیمتی ہے —— ہمارا یہ مجمع حاضرین کی کثرتِ تعداد کے لحاظ سے کوئی خاص امتیاز نہیں رکھتا۔ آج کی دنیا میں اس سے بہت بڑی تعداد میں ہر منڈی اور ہر بازار میں انسانوں کی بھیڑ موجود رہتی ہے۔ کھیل تماشوں میں اور سنیما تھیٹر جیسے شیطانی اڈوں میں اس سے بھی بہت زیادہ تعداد میں لوگ جمع ہوتے ہیں —— اسی طرح علم و فن اور دولت و ثروت یا دنیوی وجاہت کے لحاظ سے بھی ہمارا یہ مجمع کوئی ممتاز مجمع نہیں ہے، بلکہ ظاہر بات ہے کہ اس حیثیت سے یہ بہت کم حیثیت مجمع ہے۔

لیکن اس اعتبار سے انشاء اللہ یہ دنیا کا ایک بہترین مجمع ہے کہ اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنی بندگی کے تعلق کو صحیح کرنا اور اس کی رضا و رحمت حاصل کرنا ہے۔ ایسا مجمع اگر صرف پھٹے ٹوٹے غریبوں مسکینوں کا اور بالکل ناتعلیم یافتہ اور پسماندہ قسم کے بندگانِ خدا کا ہو جب بھی اللہ تعالیٰ کو وہ بہت عزیز ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے کہ اللہ کے فرشتے ایسے مجمعوں اور ایسی مجلسوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔

الغرض سب سے پہلی بات میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم آپ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کی

عظمت کو سمجھیں کہ اس نے ہمارے دلوں کو اس طرف متوجہ فرمایا اور ہمیں اس بہترین مقصد کے لئے جمع ہونے کی توفیق دی۔ اگر اس کی طرف سے یہ توفیق نہ ملتی تو یقیناً ہم اس سعادت سے محروم رہتے۔ میں پھر اپنی اور آپ کی طرف سے قرآن کریم کے الفاظ میں عرض کرتا ہوں۔

"الحمد لله الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لو لا ان ھدانا الله"

میرے محترم بھائیو!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت مبعوث ہوئے اسوقت انسانوں کی اس دنیا میں اس زمانہ اور ماحول کے معیار کے مطابق سب کچھ تھا، ہاں اللہ پر ایمان اور اس سے صحیح تعلق رکھنے والے اور اس کی طرف بلانے والے بندے موجود نہیں تھے، ایسے بندوں کے وجود سے اُسوقت یہ دنیا گویا خالی تھی اور اس وجہ سے گویا یہ پوری دنیا بحر ظلمات بنی ہوئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی لئے مبعوث ہوئے کہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ سے آشنا اور وابستہ کریں اور زندگی کا صحیح طریقہ یعنی دین حق ان کو بتائیں ـــــ آپ جب نبی کی حیثیت سے اس دنیا میں کھڑے ہوئے اور دین حق یعنی زندگی کے صحیح طریقے کی آپ نے دعوت دینی شروع کی تو اُس وقت تنہا آپ ہی اس دین اور اس زندگی کے حامل تھے، شروع میں آپ کی دعوت کو ایک ایک دو دو آدمیوں نے قبول کیا، اور ہدایت کا کام بہت سُست رفتاری سے چلا۔ اسی حال میں قریباً تیرہ سال آپ مکہ معظمہ میں رہے۔ اس کے بعد اللہ کے حکم سے آپ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی، وہاں کی زمین دین حق کی دعوت کے لئے زیادہ تیار اور سازگار تھی۔ تھوڑی ہی مدت میں وہاں کی قریب قریب پوری آبادی نے دین حق قبول کر لیا۔ اس وقت دُنیا کے بحر ظلمات میں مدینہ طیبہ نور اور ہدایت کا گویا ایک جزیرہ اور مرکز تھا۔

آپ کی دعوت اور تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں مدینہ طیبہ کی قریب قریب پوری آبادی آپ کے رنگ میں رنگ گئی۔ اسوقت مدینہ طیبہ اُس طرز زندگی کا پورا نمونہ تھا جس کی دعوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیتے تھے، اور جو خود آپ کی زندگی تھی۔

اس زندگی کا اگر تجزیہ اور تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے چار بنیادی امتیازات تھے۔ ایک اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی تمام غیبی حقیقتوں

پر کامل یقین ایسا یقین جو اللہ سے اور ان حقیقتوں سے کبھی غافل نہ ہونے دے۔
دوسرے اس بات کا یقین کہ ہر قسم کی فلاح و سعادت اللہ اور رسول کی اطاعت اور فرمانبرداری میں ہے، اور اس بنا پر پوری اطاعت اور فرمانبرداری اور معصیتوں سے پرہیز۔
تیسری چیز دنیا کی ساری فکروں کے مقابلہ میں آخرت کی فکر کا غلبہ، اور اس کی وجہ سے تنہائیوں میں بھی اللہ کے حضور میں رونا۔
چوتھے اس بات کی فکر کہ یہ ایمان اور ایمان والی زندگی جس کی دعوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیتے ہیں اور جس کی توفیق ہم کو مل گئی ہے ساری دنیا میں پھیل جائے، اور سارے انسان اس سعادت کو اپنا کے اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح کر لیں اور پھر دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل کے مستحق ہو جائیں۔
یہ چار باتیں وہ تھیں جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں بدرجۂ کمال موجود تھیں۔ اور آپ کی دعوت اور تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں آپ کے عام صحابہ کرام فرق مراتب کے باوجود ان صفات اور امتیازات کے حامل تھے۔ گویا اس وقت مدینہ طیبہ ایک ایسی بستی تھی جس کے ہر شخص کا یہ حال تھا کہ اس کو اللہ کی ذات و صفات پر اور دوسری ایمانی حقیقتوں پر ایسا یقین تھا جو اس کی پوری زندگی پر حاوی تھا۔ آخرت کی فکر دوسری تمام فکروں پر غالب تھی جو ان کو رات کی اندھیریوں میں بھی رلاتی تھی، نفس کے تقاضوں کے مقابلہ میں اللہ و رسول کے احکام پر چلنا ان کا شعار تھا۔ عام انسانوں کی ہدایت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کے صحیح ہونے کا مسئلہ ان کے نزدیک اپنے تمام دنیوی مسئلوں سے مقدم اور اہم تھا۔
یہی وہ زندگی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔ اور اس زندگی کی حامل امت کا تیار کرنا آپ کا وہ خاص کام تھا جس کے لیے آپ کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا تھا۔
اس زندگی کی دو خاصیتیں تھیں۔ ایک یہ کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد اور رحمت تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دنیا کی جو طاقت سرکشی اور استکبار کے ساتھ اس زندگی سے ٹکرائی اللہ تعالیٰ نے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور پھر اس زندگی کی حامل امت کے قدموں میں ڈال دیا۔ پہلے اللہ کی اس نصرت کا ظہور عرب میں ہوا اور فتح مکہ پر گویا اس کی تکمیل ہو گئی۔ بعد میں روم اور فارس کی حکومتوں کے ساتھ یہی

ہوا۔ اور یہ دونوں حکومتیں اس امت کے قدموں کے نیچے آگئیں ـــــ بہرحال ایک خصوصیت اس زندگی کی یہ بھی کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد تھی۔ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے اور قیامت تک کے لئیے اللہ تعالیٰ کا وعدہ اور گویا ازلی ابدی آسمانی منشور ہے۔

إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ

یعنی ایمان اور ایمانی زندگی کے داعی اپنے رسولوں کی اور انکی راہ چلنے والے اہل ایمان کی ہم مدد اور حمایت کریں گے۔ اس دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت کے اُس دن بھی جب کہ خداوندی عدالت قائم ہوگی اور اس میں گواہ پیش ہوں گے)

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے۔ "وانتم الاعلون ان کنتم مومنین" (یعنی تمھارے دشمنوں اور مخالفوں کے مقابلہ میں تم کو بالا اور برتر رکھا جائے گا بشرطیکہ تم ایمان کی راہ پر قائم رہو گے)

دوسری خصوصیت اس ایمانی زندگی کی یہ ہے کہ اس میں اللہ نے ایک خاص کشش اور تاثیر بلکہ تسخیر کی طاقت رکھی ہے۔ جو شخص اس زندگی کو صحیح صورت میں دیکھے گا اور اس کا تجربہ کرے گا وہ اس سے ضرور متاثر ہوگا۔ اور اس کا گرویدہ ہو جائے گا

صحابہ کرام جن ملکوں میں گئے۔ اور جن قوموں نے انھیں دیکھا اور ان کی مومنانہ اور خدا پرستانہ زندگی کا تجربہ و مشاہدہ کیا وہ اس کی گرویدہ ہو گئیں۔ اور بہت تھوڑی مدت میں وہ پورے کے پورے ملک دارالاسلام بن گئے۔ یہ شام، یہ عراق، یہ مصر، یہ ایران، یہ سب وہی تو ہیں جنھوں نے شروع میں اسلام کا سخت مقابلہ کیا تھا۔ اب سے کچھ دنوں پہلے تک فتوح الشام اور فتوح العجم اور فتوح المصر وغیرہ کتابیں مسلمانوں میں عام طور سے پڑھی جاتی تھیں۔ آپ میں سے بہت سوں نے یہ کتابیں پڑھی یا سُنی ہوں گی اور آپ کو یاد ہوگا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں یہ سب ملک اور ان کے بسنے والے اسلام کے کیسے سخت دشمن تھے لیکن ان ملکوں پر مسلمانوں کا سیاسی اقتدار قائم ہونے کے بعد جب مسلمان ان ملکوں میں رہے بسے اور یہاں کے رہنے والوں نے ان کو دیکھا برتا تو انھوں نے عام طور پر اُن کے دین اور ان کے طریق زندگی کو اپنالیا۔

بہت سے لوگ ناواقفیت سے یہ سمجھتے ہوں گے کہ یہ ملک جب فتح ہو گئے تو یہاں کے لوگوں نے مسلمانوں کے مقابلہ میں شکست کھا جانے کی وجہ سے اسلام قبول کر لیا۔ ایسا سمجھنا تاریخ سے

ناواقفی اور جہالت کے علاوہ حماقت بھی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ جنگ کے نتیجہ میں جو قوم غالب آجاتی ہے مغلوب اور مفتوح قوم کے دل میں اس کی نفرت پہلے سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے یہ ناممکن ہے کہ شام وعراق اور ایران کے لوگوں نے مفتوح ہونے کے بعد صرف شکست کھا جانے کی وجہ سے اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ کر اسلام کو اختیار کیا ہو ـــ اور دین کے بارہ میں جبر کرنا خود اسلام کے اصولوں کے خلاف تھا۔ قرآن مجید میں پوری صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ "لا اکراہ فی الدین (کہ دین کے معاملہ میں جبر واکراہ کا کوئی جواز نہیں) بلکہ قرآن پاک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تھی کہ جو آدمی اپنے کو مسلمان کہے اور اس کے دل نے پوری طرح اسلام کو قبول نہ کیا ہو وہ منافق ہے اور بدترین قسم کا کافر ہے۔ ایسی صورت میں یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ صحابہ کرام لالچ اور زبردستی سے کسی کو کلمہ پڑھواتے ـــ

بلکہ ہوتا یہ تھا کہ جو شہر یا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آجاتا تھا اسلامی فوجیں اسکو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتی تھیں اور وہاں امن وغیرہ قائم رکھنے کے لئے کوئی چھوٹا سا دستہ چھوڑ دیا جاتا تھا جس کی حیثیت پولیس کے دستہ کی ہوتی تھی۔ اور عوام کے باہمی جھگڑوں کے فیصلے کرنے اور اس طرح کی دوسری حکومتی خدمتیں انجام دینے کے لئے کسی کو شہر کا والی یعنی حاکم اور قاضی مقرر کر دیا جاتا تھا۔ یہ سب لوگ شہر سے باہر وہاں کے عوام سے الگ تھلگ اُس طرح نہیں رہا کرتے تھے جس طرح ہمارے ملک میں انگریزی دور حکومت میں انگریز حکام آبادیوں سے الگ رہا کرتے تھے، بلکہ یہ اپنے آپ کو عوام کی خدمت اور انکی دیکھ بھال کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ اس لئے ان سے رابطہ رکھتے تھے اور عوام کے ہر طبقہ کے لوگ ان کی زندگی کو کھلی کتاب کی طرح دیکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ فاتح قوموں کے سپاہی کیسے فرعون اور بداطوار ہوتے ہیں، لیکن وہ ان مسلمانوں کو دیکھتے تھے کہ ان میں کا ہر شخص راہبوں اور درویشوں سے زیادہ پاکباز اور خدا ترس ہے۔ اسی کے ساتھ یہ مسلمان انتہائی دلسوزی اور سچی دردمندی کیساتھ ان کو دعوت دیتے تھے کہ وہ ایمانی زندگی کے اس طریقہ کو اپنالیں جو اللہ کے سارے پیغمبر لے کر آئے تھے اور سب سے آخر میں مکمل شکل میں اس کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں اور اس طرح خدا سے براہ راست اپنا رشتہ جوڑ کے اُس کی رحمت اور جنت کے مستحق ہو جائیں ـــ ان مسلمانوں کا حال اور ان کی زندگی اس کی گواہی دیتی تھی کہ یہ سچے اور مخلص بندے ہیں اور جو کچھ کہہ رہے ہیں

بالکل سچائی اور دردمندی سے کہہ رہے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ اکا دُکا نہیں بلکہ اجتماعی طور پر اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کرتے تھے۔ اور اس طرح علاقے کے علاقے اور قومیں کی قومیں اسلام میں داخل ہوتی تھیں اور "یدخلون فی دین اللہ افواجا" کا منظر سامنے آتا تھا۔ یہ سب ملک بہت تھوڑی مدت میں دارالکفر سے دارالاسلام بنے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قریباً ۹۰ برس کے بعد جبکہ صحابہ کا نہیں بلکہ انکے فیضیافتہ تابعین کا زمانہ تھا، خلیفۂ راشد حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی خلافت کے دور میں افریقہ کے ایک علاقہ کے عام لوگوں نے اسلام کو اس طرح قبول کیا کہ وہاں کے مسلمان حاکم کو اس میں شبہ ہوا کہ یہ لوگ واقعۃً دل کی رغبت اور شرح صدر کے ساتھ اسلام قبول کر رہے ہیں یا حکومت کا مذہب ہونے کی وجہ سے دنیوی نفع اٹھانے کے لئے اپنے اسلام کا اعلان کر رہے ہیں، چنانچہ انھوں نے حضرت عمر ابن عبدالعزیز کو لکھا کہ اس علاقہ کے سارے لوگ بڑی تیز رفتاری سے اسلام قبول کر رہے ہیں اور حکومتی کاروبار پر اس کا خاص اثر یہ پڑے گا کہ جزیہ کے مد کی آمدنی بالکل ختم ہو جائیگی اس لئے یہ مسئلہ غور طلب ہے۔ اگر آپ کی رائے ہو تو یہ قانون بنا دیا جائے کہ سرکاری طور پر صرف انہی لوگوں کو مسلمان تسلیم کیا جائے گا جو فلاں فلاں طریقوں سے اپنا سچا اور مخلص مسلمان ہونا ثابت کر دیں۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے اس کا جو جواب دیا تھا وہ تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو منور فرمائے اپنے اس جواب میں انھوں نے اسلام اور اسلامی حکومت کا نصب العین کتنے محکم اور اچھے انداز میں واضح کیا ہے۔ انھوں نے افریقہ کے اپنے اس والی یعنی گورنر کو اس کے خط کے جواب میں لکھا

"ویحک، ان محمداً صلی اللہ علیہ وسلم انما بعث ھادیا ولم یبعث جابیاً"

اس مختصر سے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا بُرا ہو، تمہارے سوچنے کا ڈھنگ کتنا غلط ہے تمہیں معلوم ہونا چاہیئے ہمارا کام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو پورا کرنا ہے، اور آپؐ ہدایت کا اور اللہ کے بندوں کو اللہ کے دین کی طرف بلانے کا مشن لے کر آئے تھے، ٹیکس وصول کر کے خزانے بھرنے نہیں آئے تھے، اس لئے اگر اللہ کے بندے اللہ کا دین قبول کر رہے ہیں تو شکر ادا کرو اور خوش آمدید کہو، ٹیکس اور جزیہ کی اور حکومت کے مالیہ کی کوئی فکر نہ کرو۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تابعین کے زمانہ تک جبکہ مسلمانوں میں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم والی زندگی غالب تھی اور عام طور سے لوگ اس کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے تو اللہ کے بندوں کے دل کس طرح ان کی طرف کھنچتے تھے اور وہ اسلام کے کیسے گرویدہ ہوتے تھے۔

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو زندگی لے کر آئے اور جس کی آپ دعوت دیتے تھے اور جو صحابہ کرام نے آپ سے حاصل کی تھی ــــ اور اسی زندگی کا نام دراصل اسلام ہے ــــ اس کی دو خاصیتیں تھیں ایک یہ کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت وحمایت تھی اور غیبی لشکروں سے اس کی مدد کی جاتی تھی۔ اور دوسری یہ کہ انسانی قلوب اور انسانی فطرت کے لئے اس میں کشش تھی، اور سخت سے سخت دشمن بھی تعصب سے خالی ہو کر جب اسکو دیکھتے تھے تو اس کے گرویدہ ہو کر اس کو اپنانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ لیکن یہ خاصیتیں اسلام کے نام میں نہیں تھیں بلکہ اُس زندگی میں تھیں جس کا نام اسلام تھا جس طرح شکر کی مٹھاس، شکر کے نام میں نہیں ہے بلکہ اُس چیز میں ہے جس کا نام شکر ہے۔

میرے دینی بھائیو! ــــ جس طرح پانی کی ٹھنڈک اور آگ کی گرمی اور سورج کی روشنی دائمی خاصیتیں ہیں اسی طرح اسلام کی یہ دونوں خاصیتیں بھی دائمی اور ابدی خاصیتیں ہیں لیکن یہ اجتماعی اسلام کی خاصیتیں ہیں جب دنیا میں کوئی امت اسلام کی حامل ہوگی تو یقیناً اس کے ساتھ اللہ کی نصرت وحمایت ہوگی اور اس کے مسائل ومشکلات میں غیب سے اُس کی مدد کیجائے گی۔ اور دنیا کی جو قومیں اس امت کو دیکھیں اور برتیں گی وہ یقیناً اس کی گرویدہ اور معتقد ہوں گی۔

آج صورت یہ ہے کہ مسلمان کہلانے والی امت دنیا میں بہت بڑی تعداد میں موجود ہے، ابھی اسی ہفتہ میں نے بعض اخبارات میں پڑھا ہے کہ اسوقت دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ۶۲ کروڑ تک معلوم ہو چکی ہے۔ ۶۲ کروڑ بولنے اور لکھنے میں تو کوئی بہت بڑا ہندسہ نہیں ہے لیکن درحقیقت یہ بہت بڑی ہے۔ صحابہ کرام کے کبھی تصور میں بھی نہ ہوگا کہ کسی وقت مسلمان دنیا میں ۶۲ کروڑ ہوں گے۔ لیکن حالت یہ ہے کہ دنیا میں ان کا کوئی وزن نہیں۔ میں یہ بات ہندوستان ہی کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں جہاں ہم اقلیت ں ہیں، اور حکومتی اقتدار ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ میں ان سب ملکوں کو بھی سامنے رکھ کر کہہ رہا دل جو آج اسلامی ممالک کہلاتے ہیں اور جن میں اقتدار مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ یا کی میزان میں آج ان کا کوئی وزن نہیں ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو امریکہ یا روس کی سرپرستی اور امداد

کی ضرورت ہے یہ خدا کی نصرت وحمایت سے محرومی نہیں تو اور کیا ہے ؟ یہ صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ ۴۳ کروڑ کی تعداد میں مسلمان کہلانے والے تو موجود ہیں لیکن دنیا میں ایسی امت موجود نہیں ہے جس کی زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والی زندگی ہو۔ بیشک اس گئی گزری حالت میں بھی صحیح اسلامی زندگی کے حامل افراد موجود ہیں۔ اور ان کو اللہ تعالیٰ یقیناً وہ سب کچھ عطا فرمائے گا جو نیک صالح افراد کے لئے اللہ کا وعدہ ہے۔ لیکن اسلامی زندگی کی جن خاصیتوں کا میں نے ذکر کیا وہ انفرادی زندگی کی نہیں بلکہ اجتماعی زندگی کی خاصیتیں ہیں۔

اب ہمارے آپ کے اور سب مسلمانوں کیلئے دو راستے ہیں ایک یہ کہ جس روش پر ہم چل رہے ہیں اسی پر چلتے رہیں، اور اس کے نتیجہ میں اللہ سے اور اس کے دین سے اور زیادہ دور ہوتے چلے جائیں۔ اور پھر خدانہ کردہ ہمارا وہ حشر ہو جو قرآن مجید میں بنی اسرائیل کا بیان کیا گیا ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی نعمت سے نوازا اور دنیا میں بھی عزت اور سربلندی عطا فرمائی۔ لیکن جب انھوں نے اپنے نبیوں کا راستہ چھوڑ کر نفس پرستی اور خدا فراموشی کا طریقہ اختیار کیا تو اللہ نے اپنی دی ہوئی ساری نعمتیں ان سے چھین لیں۔ اور پھر اس حد تک اُن پر اللہ کا غضب نازل ہوا کہ ان میں سے بہت سوں کو بندروں اور سوؤروں کی شکل میں مسخ کر دیا گیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے "وجعل منھم القردۃ والخنازیر وعبد الطاغوت"

اور سورۂ بنی اسرائیل کے شروع میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے نافرمانی اور خدا فراموشی کا طریقہ اختیار کیا اور وہ اس میں حد سے بڑھ گئے تو اللہ تعالیٰ نے انکے نہایت بے رحم اور جلاد صفت دشمنوں کو ان پر مسلط کیا، پھر انھوں نے بنی اسرائیل کو بری طرح پیسا جس کی تفصیل بنی اسرائیل کی تاریخ میں اسقدر لرزہ خیز بیان کی گئی ہے کہ آج بھی اُسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

میرے بھائیو! خدا کا کسی قوم سے اور کسی نسل سے رشتہ نہیں ہے، اس کا قانون بڑا بے لاگ ہے۔ نوح علیہ السلام اس کے پیغمبر تھے لیکن ان کے بیٹے نے جب کفر کی راہ اختیار کی تو اسوقت کے دبسرے کافروں کے ساتھ وہ بھی خدا کے غضب کا شکار ہوا۔ اور جب نوح علیہ السلام نے ایک غلط فہمی کی بنا پر اس کے حق میں کچھ عرض کیا تو بڑے جلال کے ساتھ

اُن سے فرمایا گیا" اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِکَ، اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ، فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ اِنِّیْ اَعِظُکَ اَنْ تَکُوْنَ مِنَ الْجَاھِلِیْنَ "

یعنی تمہارا بیٹا بد کار ہے اس لئے وہ ہمارے قانون کے مطابق تمہارے لوگوں میں نہیں ہے، ہم تمہیں نصیحت کرتے ہیں کہ نادانی کی بات نہ کرو۔

میرے بھائیو اور دوستو! سوچو اور سمجھو! یہ ہے اللہ کی شان اور یہ ہے اس کا جلال! میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ اللہ کا قانون بڑا بے لاگ ہے ہمیں ڈرنا چاہیے اگر مسلمان قوم یا اس کی غالب اکثریت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والی زندگی سے اسی طرح دور ہوتی گئی جس طرح بنی اسرائیل اپنے پیغمبروں کی لائی ہوئی زندگی سے دور ہوتے چلے گئے تھے تو ہمارا بھی وہی انجام نہ ہو جو بنی اسرائیل کا ہو چکا ہے۔

میں آپ سے عرض کر رہا تھا کہ ہم مسلمانوں کے سامنے دو راستے ہیں ایک یہ کہ ہم اپنی دینی اصلاح کی فکر نہ کریں، اور زندگی کی گاڑی جس طرح چل رہی ہے اسکو اسی طرح چلنے دیں، اس کے متعلق مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں آپ سے صاف صاف کہہ چکا۔ اور میرا کہنا یا نہ کہنا کیا چیز ہے۔ اپنے اس طرز عمل کا نتیجہ تو ہم صدیوں سے بھگت رہے ہیں ۔

اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم اپنی اصلاح کی فکر کریں، اللہ کی طرف پلٹیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی زندگی کو اپنی زندگی بنائیں اور اسکو امت کی اجتماعی زندگی بنانے کی فکر و کوشش کریں، پھر دنیا اور آخرت میں اللہ کی نصرت و رحمت کے مستحق بنیں، اور پھر " یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا " کا منظر قائم ہو۔

شیطان کا یہ بہت بڑا فریب ہے کہ جب یہ بات سامنے آتی ہے تو وہ ہمارے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ یہ تو اس زمانہ میں ناممکن ہے حالانکہ یہ محض اس دشمن خدا کا فریب ہے۔ آپ خدارا سوچیے کیوں ناممکن ہے؟ کیا خدا کی ذات و صفات اور دوسری ایمانیات پر یقین حاصل ہونا ناممکن ہے؟ کیا آخرت کی فکر کا دنیا کی دوسری فکروں پر غالب ہونا ناممکن ہے؟ کیا خدا کے حکموں پر چلنا اور گناہوں سے بچنا ناممکن ہے؟ کیا ان باتوں کو اللہ کے دوسرے بندوں میں عام کرنے کی کوشش کرنا ناممکن ہے؟ کیا انسانوں میں ان اچھی باتوں کے قبول کرنے کی صلاحیت بالکل نہیں رہی؟ اور پیغمبروں کے دکھائے ہوئے راستہ پر چلنا کیا اب قانوناً جرم ہو گیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔ صرف شیطان کا اور اپنے نفس کا فریب ہے۔ اور اس کا علاج یہ ہے کہ ہم اس بارہ میں اپنے ذہنوں کو صاف کریں۔ اور جس طرح اپنے دنیوی کاموں کے سلسلہ میں عزم کے ساتھ فیصلہ کر کے کام شروع کر دیتے ہیں اسی طرح اپنی پچھلی کوتاہیوں سے اللہ کے حضور میں توبہ اور استغفار کر کے آئندہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غائبانہ بیعت کی تجدید کریں اور آپ کے طریقہ پر چلنے اور اسی پر چلتے ہوئے جینے اور مرنے کا عہد کریں یا ایّھا الذین آمنوا توبوا الی اللہ توبۃً نصوحاً عسیٰ ربکم ان یکفر عنکم سیّاٰتکم ویدخلکم جنّٰت تجری من تحتھا الانہار یوم لا یخزی اللہ النبی والذین اٰمنوا معہ نورھم یسعیٰ بین ایدیھم وبایمانھم یقولون ربنا اتمم لنا نورنا واغفرلنا انّک علیٰ کل شیئٍ قدیرہ۔

الفرقان کی ملکیت اور دیگر تفصیلات

اخبارات کے رجسٹریشن (مرکزی) قواعد ۱۹۵۶ء کے قاعدہ نمبر ۸ فارم ۴ کے مطابق حکومت ہند کی وزارت اطلاعات و نشریات کا مطلوبہ بیان

۱۔ مقام اشاعت ... ... لکھنؤ

۲۔ وقفۂ اشاعت ... ... ماہانہ

۳۔ پرنٹر و پبلشر اور ایڈیٹر اور مالک کا نام ...... محمد منظور نعمانی

۴۔ قومیت ... ... ہندوستانی

۵۔ پتہ ...... کچہری روڈ لکھنؤ

میں محمد منظور نعمانی اعلان کرتا ہوں کہ یہ بیان میرے علم و یقین میں بالکل صحیح ہے۔

محمد منظور نعمانی
پبلشر

(یکم مارچ ۱۹۶۰ء)

مخالفینِ مذہب کا استدلال

از ——— جناب وحید الدین خاں صاحب

"جس طرح ایٹم کے ٹوٹنے سے مادہ کے بارے میں انسان کے پچھلے تمام تصورات ختم ہو گئے اسی طرح پچھلی صدیوں میں علم کی جو ترقی ہوئی ہے وہ بھی ایک قسم کا علمی دھماکہ (KNOWLEDGE EXPLOSION) ہے جس کے بعد خدا اور مذہب کے متعلق تمام پرانے خیالات بھک سے اڑ گئے ہیں"[1] یہ جولین ہکسلے کے الفاظ ہیں۔ جدید بے خدا مفکرین کے نزدیک مذہب کوئی حقیقی چیز نہیں ہے۔ وہ انسان کی صرف اس خصوصیت کا نتیجہ ہے کہ وہ کائنات کی توجیہ کرنا چاہتا ہے۔ توجیہ تلاش کرنے کا انسانی جذبہ بذاتِ خود غلط نہیں ہے۔ مگر کم تر معلومات نے ہمارے پرانے اجداد کو ان غلط جوابات تک پہونچا دیا جس کو خدا یا مذہب کہا جاتا ہے، اب جس طرح بہت سے دوسرے معاملات میں انسان نے اپنی علمی ترقی سے ماضی کی غلطیوں کی اصلاح کی ہے۔ اسی طرح توجیہ کے معاملے میں بھی وہ آج اس پوزیشن میں ہے کہ اپنی ابتدائی غلطیوں کی اصلاح کر سکے۔

اس طریق فکر کے مطابق مذہب، حقیقی واقعات کی غیر حقیقی توجیہ ہے، پچھلے زمانے میں انسان کا علم چونکہ بہت محدود تھا اس لیے واقعات کی صحیح توجیہ میں اسے کامیابی نہیں ہوئی اور اس نے مذہب کے نام سے عجیب عجیب مفروضے قائم کر لیے مگر ارتقاء کے عالمگیر قانون نے آدمی کو اس اندھیرے سے نکال دیا ہے اور جدید معلومات کی روشنی میں یہ

---

[1] ہندستان ٹائمس، سنڈے میگزین، ۲۲ ستمبر ۱۹۶۶ء

ممکن ہوگیا ہے کہ اگلی بکھو عقائد یا ایمانیات پر بھروسہ رکھنے کے بجائے خالص تجرباتی اور مشاہداتی ذرائع سے اشیاء کی حقیقت معلوم کی جائے۔ چنانچہ وہ تمام چیزیں جن کو پہلے مافوق الطبیعی اسباب کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا۔ اب بالکل فطری اسباب کے تحت ان کی تشریح معلوم کرلی گئی ہے۔ جدید طریق مطالعہ نے ہمیں بتادیا ہے کہ خدا کا وجود فرض کرنا انسان کی کوئی واقعی دریافت نہیں تھی۔ بلکہ یہ محض دور لاعلمی کے قیاسات تھے جو علم کی روشنی پھیلنے کے بعد خود بخود ختم ہوگئے ہیں۔ جولین ہکسلے لکھتا ہے:

"نیوٹن نے دکھا دیا ہے کہ کوئی خدا نہیں ہے جو سیاروں کی گردش پر حکومت کرتا ہو۔ لاپلاس نے اپنے مشہور نظریہ سے اس بات کی تصدیق کردی ہے کہ فلکی نظام کو خدائی مفروضہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ ڈارون اور پاسچر نے یہی کام حیاتیات کے میدان میں کیا ہے۔ اور موجودہ صدی میں علم النفس کی ترقی اور تاریخی معلومات کے اضافے نے خدا کو اس مفروضہ مقام سے ہٹادیا ہے کہ وہ انسانی زندگی اور تاریخ کو کنٹرول کرنے والا ہے۔"

RELIGION WITHOUT REVELATION

N.Y. 1958 P.58.

طبیعاتی دنیا میں اس انقلاب کا ہیرو نیوٹن ہے جس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کائنات کچھ ناقابل تغیر اصولوں میں بندھی ہوئی ہے۔ کچھ قوانین ہیں جن کے تحت تمام اجرام سماوی حرکت کررہے ہیں۔ بعد کو دوسرے بے شمار لوگوں نے اس تحقیق کو آگے بڑھایا۔ یہاں تک کہ زمین سے لے کر آسمان تک سارے واقعات ایک اٹل نظام کے تحت ظاہر ہوتے ہوئے نظر آئے جس کو قانون فطرت (LAW OF NATURE) کا نام دیا گیا۔ اس دریافت کے بعد قدرتی طور پر یہ تصور ختم ہوجاتا ہے کہ کائنات کے پیچھے کوئی زندہ اور قادر خدا ہے جو اس کو چلا رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ گنجائش اگر ہوسکتی ہے تو ایسے خدا کی جس نے ابتداءً کائنات کو حرکت دی ہو۔ چنانچہ شروع میں لوگ محرک اول کے طور پر خدا کو مانتے رہے۔ والٹیر نے کہا کہ خدا نے اس کائنات کو بالکل اسی طرح بنایا ہے جس طرح ایک گھڑی ساز گھڑی کے پرزے جمع کرکے انھیں ایک خاص شکل میں ترتیب دے دیتا ہے اور اس کے بعد گھڑی کے ساتھ اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ اس کے

بعد ہیوم نے اس "بے جان اور بیکار خدا" کو بھی یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ ہم نے گھڑیاں بنتے ہوئے دیکھی ہیں، لیکن دنیا میں بنتی ہوئی نہیں دیکھیں۔ اس لیے کیوں کر ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم خدا کو مانیں۔

سائنس کی ترقی اور علم کے پھیلاؤ نے اب انسان کو وہ کچھ دکھا دیا ہے جس کو پہلے اس نے دیکھا نہیں تھا۔ واقعات کی جن کڑیوں کو نہ جاننے کی وجہ سے ہم سمجھ نہیں سکتے تھے کہ یہ واقعہ کیوں ہوا۔ وہ اب واقعات کی تمام کڑیوں کے سامنے آ جانے کی وجہ سے ایک جانی بوجھی چیز بن گیا ہے۔ مثلاً پہلے آدمی یہ نہیں جانتا تھا کہ سورج کیسے نکلتا اور کیسے ڈوبتا ہے۔ اس لیے اس نے سمجھ لیا کہ کوئی خدا ہے جو سورج کو نکالتا ہے اور اس کو غروب کرتا ہے۔ اس طرح ایک مافوق الفطری طاقت کا خیال پیدا ہوا اور جس چیز کو آدمی نہیں جانتا تھا، اس کے متعلق کہہ دیا کہ یہ اسی طاقت کا کرشمہ ہے۔ مگر اب جبکہ ہم جانتے ہیں کہ سورج کا نکلنا اور ڈوبنا اس کے گرد زمین کے گھومنے کی وجہ سے ہوتا ہے تو سورج کو نکالنے اور غروب کرنے کے لیے خدا کو ماننے کی کیا ضرورت۔ اسی طرح وہ تمام چیزیں جن کے متعلق پہلے سمجھا جاتا تھا کہ ان کے پیچھے کوئی ان دیکھی طاقت کام کر رہی ہے وہ سب جدید مطالعہ کے بعد ہماری جانی پہچانی فطری طاقتوں کے عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ نظر آیا۔ گویا واقعہ کے فطری اسباب معلوم ہونے کے بعد وہ ضرورت آپ سے آپ ختم ہو گئی جس کے لیے پہلے لوگوں نے ایک خدا یا مافوق الفطری طاقت کا وجود فرض کر لیا تھا۔ اگر قوس قزح گرتی ہوئی بارش پر سورج کی شعاعوں کے انعطاف (Refraction) سے پیدا ہوتی ہے تو یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ آسمان کے اوپر خدا کا نشان ہے ــــــ ہکسلے اس قسم کے واقعات پیش کرتا ہوا کس قدر یقین کے ساتھ کہتا ہے:

IF EVENTS ARE DUE TO NATURAL CAUSES, THEY ARE NOT DUE TO SUPER NATURAL CAUSES.

یعنی واقعات اگر فطری اسباب کے تحت صادر ہوتے ہیں تو وہ مافوق الفطری اسباب کے

پیدا کیے ہوئے نہیں ہو سکتے۔

اب اس دلیل کو لیجیے جو طبیعاتی تحقیق کے حوالے سے پیش کی گئی ہے یعنی کائنات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں جو واقعات ہو رہے ہیں وہ ایک متعین قانون فطرت کے مطابق ہو رہے ہیں۔ اس لیے ان کی توجیہ کرنے کے لیے کسی نامعلوم خدا کا وجود فرض کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ معلوم قوانین خود اس کی توجیہ کے لیے موجود ہیں۔ اس استدلال کا بہترین جواب وہ ہے جو ایک عیسائی عالم نے دیا اس نے کہا:

NATURE IS A FACT, NOT AN EXPLANATION.

یعنی فطرت کا قانون کائنات کا ایک واقعہ ہے، وہ کائنات کی توجیہ نہیں ہے۔ تمہارا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہم نے فطرت کے قوانین معلوم کر لیے ہیں مگر تم نے جو چیز معلوم کی ہے وہ اس مسئلے کا جواب نہیں ہے جس کے جواب کے طور پر مذہب وجود میں آیا ہے۔ مذہب یہ بتاتا ہے کہ وہ اصل اسباب و محرکات کیا ہیں جو کائنات کے پیچھے کام کر رہے ہیں۔ جبکہ تمہاری دریافت صرف اس مسئلہ سے متعلق ہے کہ کائنات جو ہمارے سامنے کھڑی نظر آتی ہے اس کا ظاہری ڈھانچہ کیا ہے۔ جدید علم جو کچھ ہمیں بتاتا ہے وہ صرف واقعات کی مزید تفصیل ہے نہ کہ اصل واقعہ کی توجیہ۔ سائنس کا سارا علم اس سے متعلق ہے کہ "جو کچھ ہے وہ کیا ہے۔" یہ بات اس کی دسترس سے باہر ہے کہ "جو کچھ ہے وہ کیوں ہے" جبکہ توجیہ کا تعلق اسی دوسرے پہلو سے ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے، مرغی کا بچہ انڈے کے مضبوط خول کے اندر پرورش پاتا ہے۔ اور اس کے ٹوٹنے سے باہر آتا ہے۔ یہ واقعہ کیوں کر ہوتا ہے کہ خول ٹوٹے اور بچہ جو گوشت کے لوتھڑے سے زیادہ نہیں ہوتا، وہ باہر نکل آئے۔ پہلے کا انسان اس کا جواب یہ دیتا تھا کہ "خدا ایسا کرتا ہے۔" مگر اب خوردبینی مشاہدہ کے بعد معلوم ہوا کہ جب ۲۱ روز کی مدت پوری ہونے والی ہوتی ہے، اس وقت ننھے بچے کی چونچ پر ایک نہایت چھوٹی سی سخت سینگ ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی مدد سے وہ اپنے خول کو توڑ کر باہر آجاتا ہے۔ سینگ اپنا کام پورا کرکے بچہ کی پیدائش کے چند دن بعد خود بخود جھڑ جاتی ہے۔

مخالفین مذہب کے نظریے کے مطابق یہ مشاہدہ اس پرانے خیال کو غلط ثابت کر دیتا

ہے کہ بچہ کو باہر نکالنے والا خدا ہے کیونکہ خوردبین کی آنکھ ہم کو صاف طور پر دکھا رہی ہے کہ ایک ۲۱ روزہ قانون ہے جس کے تحت وہ صورتیں پیدا ہوتی ہیں جو بچہ کو خول کے باہر لاتی ہیں مگر یہ مغالطہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ جدید مشاہدہ نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے وہ صرف واقعہ کی چند مزید کڑیاں ہیں، اس نے واقعہ کا اصل سبب نہیں بتایا۔ اس مشاہدہ کے بعد صورت حال میں جو فرق ہوا ہے وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ پہلے جو سوال خول کے ٹوٹنے کے بارے میں تھا، وہ سینگ تک کے اوپر جاکر ٹھہر گیا۔ بچہ کا اپنی سینگ سے خول کو توڑنا، واقعہ کی صرف ایک درمیانی کڑی ہے، وہ واقعہ کا سبب نہیں ہے۔ واقعہ کا سبب تو اس وقت معلوم ہوگا جب ہم جان لیں کہ بچہ کی چونچ پر سینگ کیسے ظاہر ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں اس آخری سبب کا پتہ لگالیں جو بچہ کی اس ضرورت سے واقف تھا کہ اس کو خول سے باہر نکلنے کے لیے کسی سخت مددگار کی ضرورت ہے اور اس نے مادہ کو مجبور کیا کہ عین وقت پر ٹھیک ۲۱ روز بعد وہ بچہ کی چونچ پر ایک ایسی سینگ کی شکل میں نمودار ہو جو اپنا کام پورا کرنے کے بعد جھڑ جائے۔ گویا پہلے یہ سوال تھا کہ "خول کیسے ٹوٹتا ہے" اور اب سوال یہ ہوگیا کہ "سینگ کیسے بنتی ہے"۔ ظاہر ہے کہ دونوں حالتوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ اس کو زیادہ سے زیادہ حقیقت کا وسیع تر مشاہدہ کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت کی توجیہ کا نام نہیں دے سکتے۔

یہاں میں ایک امریکی عالم حیاتیات Cecil Boyce Hamann کے الفاظ نقل کروں گا:

"غذا ہضم ہونے اور اس کے جزو بدن بننے کے حیرت انگیز عمل کو پہلے خدا کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ اب جدید مشاہدہ میں وہ کیمیائی ردعمل کا نتیجہ نظر آتا ہے۔ مگر کیا اس کی وجہ سے خدا کے وجود کی نفی ہوگئی۔ آخر وہ کون طاقت ہے جس نے کیمیائی اجزاء کو پابند کیا کہ وہ اس قسم کا مفید ردعمل ظاہر کریں۔ غذا انسان کے جسم میں داخل ہونے کے بعد ایک عجیب و غریب خودکار انتظام کے تحت جس طرح مختلف مراحل سے گزرتی ہے، اس کو دیکھنے کے بعد یہ بات بالکل خارج از بحث معلوم ہوتی ہے کہ یہ حیرت انگیز انتظام محض اتفاق سے وجود میں آگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مشاہدہ کے بعد تو یہ اور زیادہ ضروری ہوگیا ہے کہ ہم یہ مانیں کہ خدا اپنے ان عظیم قوانین کے ذریعہ عمل کرتا

ہے جس کے تحت اس نے زندگی کو وجود دیا ہے ‘‘

THE EVIDENCE OF GOD IN AN EXPANDING

UNIVERSE P. 221.

اس سے آپ جدید دریافتوں کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ سائنس نے کائنات کے بارے میں انسان کے مشاہدے کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اس نے دکھا دیا ہے کہ وہ کون سے فطری قوانین ہیں جن میں یہ کائنات جکڑی ہوئی ہے اور جن کے تحت وہ حرکت کر رہی ہے مثلاً پہلے آدمی صرف یہ جانتا تھا کہ پانی برستا ہے۔ مگر اب سمندر کی بھاپ اٹھنے سے لے کر بارش کے قطرے زمین پر گرنے تک کا وہ پورا عمل انسان کو معلوم ہو گیا ہے جس کے مطابق بارش کا واقعہ ہوتا ہے۔ مگر یہ ساری دریافتیں صرف واقعہ کی تصویر ہیں، وہ واقعہ کی توجیہ نہیں ہیں۔ سائنس یہ نہیں بتاتی کہ فطرت کے قوانین کیسے قوانین بن گئے۔ وہ کیسے اس قدر مفید شکل میں مسلسل طور پر زمین و آسمان میں قائم ہیں اور اس صورت کے ساتھ قائم ہیں کہ ان کی بنیاد پر سائنس میں قوانین مرتب کیے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرت جس کو معلوم کر لینے کی وجہ سے انسان یہ دعویٰ کرنے لگا ہے کہ اس نے کائنات کی توجیہ دریافت کر لی وہ محض دعویٰ ہے۔ یہ ایک غیر متعلق بات کو سوال کا جواب بنا کر پیش کرنا ہے۔ یہ درمیانی کڑی کو آخری کڑی قرار دینا ہے۔ یہاں پھر میں مذکورہ عالم کے الفاظ دہراؤں گا:-

Nature does not explain, she is herself in need of an explanation.

یعنی فطرت کائنات کی توجیہ نہیں کرتی، وہ خود اپنے لیے ایک توجیہ کی طالب ہے۔

اگر آپ کسی ڈاکٹر سے پوچھیں کہ خون سرخ کیوں ہوتا ہے، تو وہ جواب دے گا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ خون میں نہایت چھوٹے سرخ اجزا ہوتے ہیں (ایک انچ کے سات ہزارویں حصے کے برابر) یہی سرخ ذرات خون کو سرخ کرنے کا سبب ہیں۔

’’درست مگر یہ ذرات سرخ کیوں ہوتے ہیں۔‘‘

’’ان ذرات میں ایک خاص مادہ ہوتا ہے جس کا نام ہیموگلوبن (Haemoglobin)

ہے۔ یہ مادہ جب پھیپھڑے میں آکسیجن جذب کرتا ہے تو گہرا سرخ ہو جاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، مگر ہیموگلوبن کے حامل سرخ ذرات کہاں سے آئے۔"

"وہ آپ کی تلی میں بن کر تیار ہوتے ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب! جو کچھ آپ نے فرمایا وہ بہت عجیب ہے۔ مگر مجھے بتلائیے کہ ایسا کیوں ہے کہ خون، سرخ ذرات، تلی اور دوسری ہزاروں چیزیں اس طرح ایک کل کے اندر باہم مربوط ہیں اور اس قدر صحت کے ساتھ اپنا اپنا عمل کر رہی ہیں۔"

"یہ قدرت کا قانون ہے۔"

"وہ کیا چیز ہے جس کو آپ قانون قدرت کہتے ہیں۔"

"اس سے مراد ہے ـــــ Blind interplay of Physical and chemical forces. ـــ (طبیعی اور کیمیائی طاقتوں کا اندھا عمل)۔

"مگر کیا وجہ ہے کہ یہ اندھی طاقتیں ہمیشہ ایسی سمت عمل کرتی ہیں جو انھیں ایک متعین انجام کی طرف لے جائے۔ کیسے وہ اپنی سرگرمیوں کو اس طرح منظم کرتی ہیں کہ ایک چڑیا اڑنے کے قابل ہو سکے۔ ایک مچھلی تیر سکے، ایک انسان اپنی مخصوص صلاحیتوں کے ساتھ وجود میں آئے۔"

"میرے دوست، مجھ سے یہ نہ پوچھو۔ سائنس داں صرف یہ بتا سکتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیا ہے، اس کے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے۔"

یہ سوال و جواب واضح کر رہا ہے کہ سائنسی دریافتوں کی حقیقت کیا ہے۔ بلاشبہ سائنس نے ہم کو بہت سی نئی نئی باتیں بتائی ہیں۔ مگر مذہب جس سوال کا جواب ہے، اس کا ان دریافتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس قسم کی دریافتیں اگر موجودہ مقدار کے مقابلے میں اربوں، کھربوں گنا بڑھ جائیں جب بھی مذہب کی ضرورت باقی رہے گی کیونکہ یہ دریافتیں صرف ہونے والے واقعات کو بتاتی ہیں، یہ واقعات کیوں ہو رہے ہیں اور ان کا آخری سبب کیا ہے۔ اس کا جواب ان دریافتوں کے اندر نہیں ہے۔ یہ تمام کی تمام دریافتیں صرف درمیانی تشریح ہیں جبکہ مذہب کی جگہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ آخری اور کلی تشریح دریافت کرے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ کسی مشین کے اوپر ڈھکن لگا ہوا ہو تو ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ چل رہی

ہے۔ اگر ڈھکن اتار دیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ باہر کا چکر کس طرح ایک اور چکر سے چل رہا ہے۔ اور وہ چکر کس طرح دوسرے بہت سے پرزوں سے مل کر حرکت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس کے سارے پرزوں اور اس کی پوری حرکت کو دیکھ لیں۔ مگر کیا اس علم کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے مشین کے خالق اور اس کے سبب حرکت کا راز بھی معلوم کر لیا۔ کیا کسی مشین کی کارکردگی کو جان لینے سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ خود بخود بن گئی ہے اور اپنے آپ چلی جا رہی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کائنات کی کارکردگی کی بعض جھلکیاں دیکھنے سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ یہ سارا کارخانہ اپنے آپ قائم ہوا اور اپنے آپ چلا جا رہا ہے۔ ہیریز W. Harris نے یہی بات کہی تھی جب اس نے ڈاروِنزم پر تنقید کرتے ہوئے کہا:

Natural Selection may explain the survival of the fittest, but can not explain the arrival of the fittest.

REVOLT AGAINST REASON by A. LUNN. P. 133

یعنی انتخاب طبیعی کے قانون کا حوالہ صرف زندگی کے بہتر مظاہر باقی رہنے کی توجیہ کرتا ہے وہ یہ نہیں بتاتا کہ یہ بہتر زندگیاں خود کیسے وجود میں آئیں۔

یہود کا تبری نامہ اور انجیل

(از افادات مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی)

ایک عالمی نیوز ایجنسی کی اس خبر نے چند ہفتے ہوئے اُن تمام لوگوں کو چونکا دیا، جو تاریخ مسیحیت سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں کہ حکومت اسرائیل کے توسط سے نائب المسیح جناب پوپ کی خدمت میں قوم یہود کی طرف سے ایک تبری نامہ اس مضمون کا پیش ہوا کہ ہماری قوم کی کوئی بھی ذمہ داری مصلوبیت مسیح میں نہیں، پوپ صاحب نے اس عذرنامے کو قبول کرلیا اور اعلان کردیا کہ قوم یہود اس جرم تصلیب مسیحؑ سے بری الذمہ ہے —— خبر میں اس سے زیادہ کوئی تفصیل درج نہ تھی، نہ اور کسی ذریعہ سے اب تک یہ علم ہو سکا کہ قوم یہود نے اپنی تبری پر کون سی شہادتیں پیش کیں اور پوپ صاحب نے بائبل کی مسلم اور مستند شہادت کے مقابلے میں انھیں کیسے قبول کر لیا!

قرآن مجید سے قطع نظر، جس نے صاف یہود کی زبان سے یہ قول فخر کے ساتھ نقل کیا ہے کہ

إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ　　　ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم کو ختم کر دیا۔

واقعہ جس صراحت و وضاحت اور جس تکرار کے ساتھ انجیلوں میں درج چلا آتا ہے اور آج تک مسیحوں میں کسی سے اس کا انکار منقول نہیں۔ ان کے بعد یہ نئی تبری البتہ بڑی عجیب وغریب ہے —— لیکن قبل اس کے کردہ صراحتیں ملاحظہ ہوں۔ پہلے نفس واقعہ کو سمجھ

لینے کی ضرورت ہے۔

واقعہ ملک فلسطین کا ہے۔ شہر یروشلم اسی میں واقع ہے۔ جس زمانہ کا (سنہ ۳۰ عیسوی) کا واقعہ ہے ملک کی آبادی اگرچہ یہود کی تھی۔ جو نسلاً بنی اسرائیل تھے لیکن ملک پر حکومت رومیوں کی تھی جن کا مذہب بت پرستی تھا۔ حاکم اعلیٰ بھی رومی حکومت تھی لیکن اس کی ماتحتی میں یہود کو بھی آزادی وخود مختاری ایک محدود درجہ میں حاصل تھی۔ یہود کے مقدمے خود انھیں کی عدالتوں میں پیش ہوتے۔ اور ان کی عدالتیں مذہبی عدالتیں تھیں جن کے فیصلے فقہاء یہود صادر کرتے۔ پھر اگر جرم فوجداری قانون کا ہوتا تو وہی مقدمہ دوبارہ رومیوں کی ملکی عدالت میں پیش ہوتا اور فوجداری کے جرائم میں سزا کے نفاذ کا حق صرف انھیں ملکی عدالتوں کو تھا۔ حضرت مسیح پر مقدمہ قدرۃً پہلے یہود یا اسرائیل کی اپنی عدالت میں پیش ہوا اور آپ پر فرد جرم توہین مذہب یا الحاد و زندقہ کی لگی۔ جس کی سزا دینی عدالت میں موت تھی لیکن اس کا نفاذ بغیر ملکی عدالت سے رجوع کیے ہو نہیں سکتا۔ اس لیے یہود اپنی عدالت میں آپ کو سزائے موت کا حکم سنا کر پھر آپ کا مقدمہ ملکی عدالت میں لائے۔

انجیل کے بیان کے مطابق خود حضرت مسیح کو اس کا علم ہو چکا تھا کہ انھیں اسرائیلی سرداروں اور فقیہوں کے ہاتھ بہت دکھ جھیلنے ہوں گے! اور بالآخر وہ قتل ہوں گے۔ انجیل متی میں ہے:۔

"اس وقت سے یسوع اپنے شاگردوں پر ظاہر کرنے لگا کہ مجھے ضرور ہے کہ یروشلم کو جاؤں اور بزرگوں اور سردار کاہنوں اور فقیہوں کی طرف سے بہت دکھ اٹھاؤں اور قتل کیا جاؤں"

(۲۱:۱۶)

اور انجیل مرقس میں ہے:۔

"پھر وہ انھیں تعلیم دینے لگا کہ ضرور ہے کہ ابن آدم بہت دکھ اٹھائے اور بزرگ اور سردار کاہن اور فقیہ اسے رد کریں اور وہ قتل کیا جائے۔" (۳۱:۸)

اور پھر انجیل متی میں ہے:۔

"اور یسوع یروشلم جاتے میں بارہ شاگردوں کو الگ لے گیا اور راہ میں ان سے یہ کہا، دیکھو ہم یروشلم کو جاتے ہیں اور ابن آدم سردار کاہنوں اور فقیہوں کے حوالے کیا جائے گا اور وہ اس کے قتل کا حکم دیں گے اور اسے غیر قوموں کے حوالے کریں گے تاکہ وہ اسے ٹھٹھوں میں

اڑائیں اور کوڑے ماریں اور صلیب پر چڑھائیں۔" (۲۰: ۱۸ تا ۱۹)

اور یہی مضمون انجیل مرقس میں بھی دہرایا گیا ہے:۔

"پس اس نے پھر ان بارہ کو ساتھ لے کر ان سے وہ باتیں کہنی شروع کیں جو ان پر واقع ہونے والی تھیں کہ دیکھو ہم یروشلم کو جاتے ہیں اور ابن آدم سردار کاہنوں فقیہوں کے حوالے کیا جائے گا اور وہ اس کے قتل کا حکم دیں گے اور اسے غیر قوموں کے حوالے کریں گے۔ اور وہ اسے ٹھٹھوں میں اڑائیں گے اور اس پر تھوکیں گے اور اسے کوڑے ماریں گے اور قتل کریں گے۔"

(۱۰: ۳۳، ۳۴)

تطویل بیان کے باوجود تیسری عبارت انجیل لوقا کی بھی پڑھ لیجئے:۔

"پھر اس نے ان بارہ کو ساتھ لے کر ان سے کہا کہ دیکھو ہم یروشلم کو جاتے ہیں اور جتنی باتیں نبیوں کی معرفت لکھی گئی ہیں۔ ابن آدم کے حق میں پوری ہوں گی کیونکہ وہ غیر قوم والوں کے حوالے کیا جائے گا۔ اور وہ لوگ اس کو ٹھٹھے میں اڑائیں گے۔ اور بے عزت کریں گے اور اس پر تھوکیں گے اور اس کو کوڑے ماریں گے اور قتل کریں گے۔" (۱۸: ۳۱، ۳۲)

غیر قوم والوں سے مراد ان سارے حوالوں میں ظاہر ہے کہ رومی حاکم ہیں۔ یہ سب تصریح در تصریح ہے۔ آپ کی اس الہامی پیش خبری کی کہ آپ کو اصلاً دکھ اپنے ہی ہم قوموں سے پہونچے گا اور وہی بالآخر آپ کو رومیوں کے حوالے کرکے ان سے سزائے موت آپ کو دلائیں گے۔

آپ نے اسی دوران میں اپنے معاصر و مخاطب یہودیوں پر پوری ذمہ داری اور وہ بھی سخت لفظوں میں پہلے پیمبروں کے بھی خون ناحق کی ڈالی۔ صرف ایک نمونہ انجیل متی سے ملاحظہ ہو۔

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس ہے۔ یہ کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے زمانے میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے۔ اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ ہم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہیں۔ غرض اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھر دو۔ اے سانپو! اے افعی کے بچو، تم جہنم کی سزا سے کیوں کر بچوگے۔ اس لیے دیکھو میں نبیوں اور داناؤں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ ان میں سے بعض کو قتل کروگے اور صلیب پر چڑھاؤگے۔ اور بعض کو عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے۔ اور شہر بشہر ستاتے پھروگے تاکہ سب

راستبازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا تم پر آئے۔ راستباز ہابیل کے خون سے لے کر برکیاہ کے بیٹے زکریا کے خون تک جسے تم نے مقدس قربان گاہ میں قتل کیا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہ سب اسی زمانے کے لوگوں پر آئے گا۔" (۲۳: ۲۹-۳۶)

روایتی مصلوبیت کی بابت تو بڑے ہی واضح لفظوں میں آگاہی مسیح کے کلام میں موجود ہے۔ بلکہ انجیل متی میں یہ تصریح بھی ہے کہ یہود کے دو بڑے لیڈر تو اسی وقت قتل مسیح کی تیاری کرنے لگے تھے۔

"اور جب یسوع یہ سب باتیں ختم کر چکا، تو ایسا ہوا کہ اس نے اپنے شاگردوں سے کہا تم جانتے ہو کہ دو دن کے بعد عید فسح ہوگی اور ابن آدم مصلوب ہونے کو پکڑوایا جائے گا۔ اس وقت سردار کاہن اور قوم کے بزرگ کائفا نام سردار کاہن کے دیوان خانے میں جمع ہوگئے اور صلاح کی کہ یسوع کو فریب سے پکڑ کر قتل کریں مگر کہتے تھے کہ عید کو نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ لوگوں میں بلوہ ہو جائے" (۲۶: ۱-۵)

مرقس اور لوقا اور یوحنا باقی تینوں انجیلوں میں یہ واقعہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ درج ہے۔ مرقس میں ہے:۔

"دو دن بعد فسح اور عید فطیر ہونے والی تھی۔ اور سردار کاہن اور فقیہہ موقع ڈھونڈھ رہے تھے کہ اسے کیونکر فریب سے پکڑ کے قتل کریں۔ کیوں کہ کہتے تھے کہ عید کو نہیں ایسا نہ ہو کہ لوگوں میں بلوا ہو جائے۔" (۱۴: ۱-۲)

لوقا کی سنیئے:۔

"اور عید فطیر جس کو عید فسح کہتے ہیں۔ نزدیک تھی اور سردار کاہن اور فقیہہ موقع ڈھونڈھ رہے تھے کہ اسے مار ڈالیں۔ کیونکہ لوگوں سے ڈرتے تھے۔ (۲۲: ۱-۲)

اور یوحنا کا بیان ہے:۔

"پس سردار کاہنوں اور فریسیوں نے صدر عدالت کے لوگوں کو جمع کرکے کہا ہم کرتے کیا ہیں۔ یہ آدمی تو بہت معجزے دکھاتا ہے۔ اگر ہم اسے یوں ہی چھوڑ دیں تو سب اس پر ایمان لے آئیں گے۔ اور رومی آکر ہماری جگہ اور ہماری قوم دونوں پر قبضہ کرلیں گے ۔۔۔۔۔ پس وہ اسی روز سے اس کے قتل کا مشورہ کرنے لگے۔" (۱۱: ۴۷-۵۳)

اس کے بعد مسیح کے انھیں بارہ رفیقوں یا شاگردوں میں سے ایک یہودی یہوداہ اسکریوتی نامی اس پر بھی تل گیا کہ وہ یہودی لیڈروں کے ہاتھ مسیح کو گرفتار کرادے گا۔ اور اس خدمت کے لیے اس نے ۳۰ روپیہ کی رقم بھی وصول کرلی۔ متی میں ہے:-

"اس وقت ان بارہ میں سے ایک نے جس کا نام یہوداہ اسکریوتی تھا سردار کاہنوں کے پاس جاکر کہا کہ اگر میں اسے تمہارے حوالہ کردوں تو مجھے کیا دوگے؟ انھوں نے اسے تیس روپے تول کر دے دیئے۔ اور وہ اس وقت سے اس کے پکڑوانے کا موقع ڈھونڈھنے لگا" (۲۶: ۱۴-۱۶)

خوب خیال کر لیجیے کہ یہ سارا ذکر یہود ہی کا ہو رہا ہے۔ اصل دشمن خون کے پیاسے یہودی لیڈر رہتے۔ وہی گرفتاری کی فکر میں تھے۔ وہی مسیح مظلوم کی گرفتاری کے لیے سازش کر رہے تھے۔ وہی اس کے قتل کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ وہی اسے رومی عدالت تک پہونچانے والے تھے۔ اور وہی مسیح کے ایک یہودی غدار رفیق سے اس کا سودا بھی کر چکے تھے۔

مرقس کی بھی روایت سن لیجیے:-

"پھر یہوداہ اسکریوتی جو ان بارہ میں سے تھا سردار کاہنوں کے پاس چلا گیا تاکہ اسے ان کے ہاتھ پکڑوا دے۔ وہ یہ سن کر خوش ہوئے اور اس کو روپے دینے کا اقرار کیا۔ اور وہ موقع ڈھونڈھنے لگا کہ کسی طرح قابو پاکر اسے پکڑوا دے" (۱۴: ۱۰-۱۱)

لوقا کی روایت سے بھی بے خبر نہ رہیے۔

"اور شیطان یہوداہ میں سمایا جو اسکریوتی کہلاتا اور ان بارہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس نے جاکر سردار کاہنوں اور سپاہیوں کے سرداروں سے صلاح کی کہ اس کو کس طرح ان کے حوالے کرے وہ خوش ہوئے اور اسے روپے دینے کا اقرار کیا۔ اس نے مان لیا اور موقع ڈھونڈھنے لگا کہ اسے بغیر ہنگامے کے حوالے کردے" (۲۲: ۳-۶)

مسیح کی طرف سے پیشگوئیوں اور اکابر یہود کی طرف سے سازشوں، منصوبوں، تیاریوں کا دور ختم ہوا۔ اور نوبت واقعۃً گرفتاری کی آگئی۔ اکابر یہود کے سپاہیوں کے ہاتھ۔ اور ایک یہودی کنجڑے غدار کی مدد سے پہلے یہ روائت متی کی زبان سے سنیے:-

"وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ یہوداہ جو ان بارہ میں سے ایک تھا آیا اور اس کے ساتھ ایک بڑی بھیڑ

تلواریں اور لاٹھیاں لیے ہوئے سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں کی طرف سے آپہنچی۔ اور اس کے پکڑوانے والے نے یہ نشان دیا تھا کہ جس کا میں بوسہ لوں وہی ہے۔ اسے پکڑ لینا۔ ... اس پر انھوں نے پاس آکر یسوع پر ہاتھ ڈالا اور اسے پکڑ لیا۔ ... اسی گھڑی یسوع نے بھیڑ سے کہا کیا تم تلواریں اور لاٹھیاں لے کر مجھے ڈاکو کی طرح پکڑنے نکلے ہو؟ میں ہر روز ہیکل میں بیٹھ کر تعلیم دیتا تھا اور تم نے مجھے نہیں پکڑا۔" (۲۶: ۴۷-۵۶)

گرفتاری کا یہی منظر مرقس نے بھی دکھایا ہے (۱۴: ۴۳-۴۹) اور لوقا میں بھی (۲۲: ۴۷-۵۴) اور یوحنا میں تفصیل کچھ زائد ہی ہے مثلاً یہ کہ:

"پس وہ اسی روز سے اس کے قتل کا مشورہ کرنے لگے۔ پس اس وقت سے مسیح یہودیوں میں علانیہ نہیں پھرا ... اور سردار کاہنوں اور فریسیوں نے حکم دے رکھا تھا کہ اگر کسی کو خبر ہو کہ وہ کہاں ہے تو اطلاع دے تاکہ اسے پکڑ لیں۔" (۱۱: ۵۳، ۵۴، ۵۷)

یوحنا میں کچھ اور تفصیلات بھی ہیں۔ آخر میں ہے۔

"پس یہوداہ سپاہیوں کی پلٹن اور سردار کاہنوں[1] اور فریسیوں[2] سے پیادے لے کر مشعلوں اور چراغوں اور ہتھیاروں کے ساتھ وہاں آیا۔ (۱۸: ۳)

لیکن اتنے جزو پر سب کا اتفاق ہے کہ مسیح کی گرفتاری یہودی سرداروں کے حکم سے اور انھیں کے سپاہیوں، پیادوں کے ہاتھوں ایک یہودی کی مخبری پر عمل میں آئی۔

یہودی سپاہی اور پیادے حضرت مسیح کو گرفتار کر کے قدرۃً پہلے اپنے سردار کے پاس لے گئے۔ انجیل یوحنا میں ہے:

---

[1] کاہن، یہود اور بابل کی قدیم اصطلاح میں ترجمہ Priest کا ہے۔ عام اردو میں اس کے لیے لفظ "پروہت" یا "پجاری" (پوجا کرانے والے کے معنی میں) موجود ہے۔ سردار کاہن سب سے بڑا اور اعلیٰ پروہت ہوتا تھا جس کا انتخاب ہر سال بہت سی رسوم کے بعد ہوتا تھا۔ یہود کے ہاں یہ سب سے بڑا دینی عہدہ تھا۔ (صدق)

[2] یہ گروہ یہود کے علماء و مشائخ کا تھا۔ انجیلوں میں ان کی ریاکاری و نمائشی دینداری، اور سرتاپا ہے تصنع زندگی پر بڑی لعنت پھٹکار آئی ہے۔ (صدق)

"تب سے سپاہیوں اور ان کے صوبہ دار اور یہودیوں کے پیادوں نے یسوع کو پکڑ کر باندھ لیا۔ اور پہلے اسے حنا کے پاس لے گئے کیونکہ وہ اس برس کے سردار کاہن کائفا کا سسر تھا۔ یہ وہی کائفا تھا جس نے یہودیوں کو صلاح دی تھی کہ امت کے واسطے ایک آدمی کا مرنا بہتر ہے۔"

(۱۸: ۱۲-۱۴)

یہ حنا (Annas) نہ صرف اس وقت کے بڑے پروہت کائفا کا سسر تھا۔ بلکہ خود بھی اس عہدہ پر رہ چکا تھا[1] اور اس وقت بھی یہود میں بڑے اقتدار کا مالک تھا۔

یوحنا میں ہے کہ :-

"پھر سردار کاہن نے یسوع سے اس کے شاگردوں اور اس کی تعلیم کی بابت پوچھا" (۱۸: ۱۹)

اور جب اس پوچھ گچھ، سوال وجواب اور تحقیقات کے وقت مسیح کا لب ولہجہ یہود کے معیار سے زیادہ باادب نہ رہا تو ایک بدبخت یہودی پیادہ نے آپ کے منہ پر تھپڑ مارا دیا اور بالآخر آپ کو باندھ کر سردار کاہن کائفا کے پاس بھیج دیا گیا۔

یوحنا کی روایت ہے کہ :-

"پیادوں میں سے ایک شخص نے جو پاس کھڑا تھا یسوع کے طمانچہ مار کر کہا، تو سردار کاہن کو ایسا جواب دیتا ہے ؟ یسوع نے اسے جواب دیا۔ اگر میں نے برا کہا تو اس برائی پر گواہی دے اور اگر اچھا کہا تو مجھے کیوں مارتا ہے؟ پس حنا نے اسے بندھا ہوا سردار کاہن کائفا کے پاس بھیج دیا" (۱۸: ۲۲-۲۴)

یہود کی اپنی عدالت میں مسیح کے پیش ہونے کا منظر انجیل متی کے حوالے سے ملاحظہ ہو :-

"اور یسوع کے پکڑنے والے اس کو کائفا نام سردار کاہن کے پاس لے گئے۔ جہاں فقیہہ اور بزرگ جمع ہو گئے تھے ... اور سردار کاہن اور سارے صدر عدالت والے یسوع کو مار ڈالنے کے واسطے اس کے خلاف جھوٹی گواہی ڈھونڈنے لگے مگر نہ پائی۔ گو کہ بہت سے جھوٹے گواہ آئے۔ لیکن آخر کار دو گواہوں نے آکر کہا کہ اس نے کہا ہے میں خدا کے مقدس کو ڈھا سکتا

---

[1] لوقا کی روایت ہے کہ حنا اور کائفا دونوں ہی بڑے پروہت کے منصب پر تھے۔ اور حنا اور کائفا سردار کاہن تھے۔ (۳: ۲)

اور تین دن میں اسے بنا سکتا ہوں! اور سردار کاہن نے کھڑے ہو کر اس سے کہا تو جواب نہیں دیتا؟ یہ تیرے خلاف کیا گواہی دیتے ہیں؟ مگر یسوع چپکا ہی رہا۔ سردار کاہن نے اس سے کہا میں تجھے زندہ خدا کی قسم دیتا ہوں کہ اگر تو خدا کا بیٹا مسیح ہے تو ہم سے کہہ دے۔ تو یسوع نے اس سے کہا تو نے خود کہہ دیا بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ تم ابن آدم کو قادر مطلق کی داہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھو گے۔ اس پر سردار کاہن نے یہ کہہ کر اپنے کپڑے پھاڑے کہ اس نے کفر کیا ہے۔ اب ہمیں گواہوں کی کیا حاجت رہی؟ دیکھو تم نے ابھی یہ کفر سنا ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے؟ انھوں نے جواب میں کہا وہ قتل کے لائق ہے۔ اس پر انھوں نے اس کے منہ پر تھوکا اور اس کے مکے مارے اور بعض نے طمانچے مار کے کہا اے مسیح ہمیں نبوت سے بتا کہ کس نے تجھے مارا۔" (۲۶: ۶۰-۶۸)

غرض یہ کہ گرفتاری کی ساری کارروائیاں یہود نے ہی کیں یہود ہی کی اپنی عدالت میں مقدمہ ہوا یہود ہی بطور گواہ پیش ہوئے۔ فیصلہ یہود ہی نے کیا۔ یہود ہی نے اسے واجب القتل ٹھہرایا ہی کی صدر عدالت نے مسیح پر کفر کا فتویٰ دیا۔ ہر طرح کی بدتمیزیاں اور بے ہودگیاں یہود ہی نے ——— تائیدی بیان مرقس کا سنیے:

"پھر وہ یسوع کو سردار کاہن کے پاس لے گئے۔ اور سب سردار کاہن اور بزرگ اور فقیہ اس کے پاس جمع ہو گئے ..... اور سردار کاہن اور سارے صدر عدالت والے یسوع کے مار ڈالنے کے واسطے اس کے خلاف گواہی ڈھونڈنے لگے مگر نہ پائی۔ کیونکہ بہتیروں نے اس پر جھوٹی گواہیاں تو دیں لیکن ان کی گواہیاں متفق نہ تھیں ...... پھر سردار کاہن نے بیچ میں کھڑے ہو کر یسوع سے پوچھا کہ تو کچھ جواب نہیں دیتا؟ یہ تیرے خلاف کیا گواہی دیتے ہیں؟ مگر وہ چپکا ہی رہا۔ اور کچھ جواب نہ دیا۔ سردار کاہن نے اس سے پھر سوال کیا اور کہا کیا تو اس ستودہ کا بیٹا مسیح ہے؟ یسوع نے کہا۔ ہاں میں ہوں۔ اور تم ابن آدم کو قادر مطلق کی داہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں کے ساتھ آتے دیکھو گے۔ سردار کاہن نے اپنے کپڑے پھاڑ کے کہا۔ اب ہمیں گواہوں کی کیا حاجت رہی! تم نے یہ کفر سنا۔ تمہاری کیا رائے ہے؟ ان سب نے فتویٰ دیا کہ وہ قتل کے لائق ہے۔ تب بعض اس پر تھوکنے اور اس کا منہ ڈھانپنے اور اس کے مکے لگانے اور اس سے کہنے لگے۔ نبوت کی باتیں سنا اور پیادوں نے اسے طمانچے مار مار کر اپنے قبضہ میں

لیا۔" (۲۴: ۶۳-۶۵)

لوقا کا بیان گو مختصر ہے۔ لیکن جامع و واضح ہے۔

" اور جو آدمی یسوع کو پکڑے ہوئے تھے اس کو ٹھٹھوں میں اڑاتے اور مارتے تھے۔ اور اس کی آنکھیں بند کر کے اس سے یہ کہہ کر پوچھتے تھے نبوت سے بتا کس نے تجھکو مارا؟ اور انھوں نے طعنے سے اور بھی بہت سی باتیں اس کے خلاف کہیں۔

جب دن ہوا تو سردار کاہن اور فقیہہ یعنی قوم کے بزرگوں کی مجلس جمع ہوئی اور انھوں نے اسے اپنی صدر عدالت میں لے جاکر کہا۔ اگر تو مسیح ہے تو ہم سے کہہ دے۔ اس نے ان سے کہا اگر میں تم سے کہوں تو یقین نہ کرو گے۔ اور اگر پوچھوں تو جواب نہ دو گے لیکن اب سے ابن آدم قادر مطلق خدا کی دہنی طرف بیٹھا رہے گا، اس پر ان سب نے کہا پس کیا تو خدا کا بیٹا ہے؟ اس نے ان سے کہا تم خود کہتے ہو کیونکہ میں ہوں! انھوں نے کہا اب ہمیں گواہی کی کیا حاجت رہی؟ کیونکہ ہم نے خود اسی کے منھ سے سن لیا ہے (۲۲: ۶۳-۷۱)

غرض جب یہ سارے مرحلے مخبری اور گرفتاری سے لے کر طرح طرح کی ذلتوں اہانتوں اور تکفیر کے بعد واجب القتل قرار پانے کے سب یہودیوں کے ہاتھوں اور یہود کی عدالت میں طے پا چکے تو اب سزائے موت کے نفاذ کے لیے مقدمہ کو قدرۃً رومی حاکم عدالت پیلاطس (PILATE) کی پیشی میں لے جانا ناگزیر ہو گیا۔ چناں چہ آگے کی سرگزشت پہلے متی کی زبان سے سنیے:۔

" جب صبح ہوئی تو سب سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں نے یسوع کے خلاف مشورہ کیا تاکہ اسے مار ڈالیں۔ وہ اسے باندھ کر لے گئے اور پیلاطس حاکم کے حوالے کیا۔

یسوع حاکم کے سامنے کھڑا تھا اور حاکم نے اس سے پوچھا۔ کیا تو یہودیوں کا بادشاہ ہے؟ یسوع نے اس سے کہا تو خود کہتا ہے اور جب سردار کاہن اور بزرگ اس پر الزام لگا رہے تھے تو اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس پر پیلاطس نے اس سے کہا کیا تو نہیں سنتا کہ یہ تیرے خلاف کتنی گواہیاں دیتے ہیں۔ اس نے ایک بات کا بھی اس کو جواب نہ دیا۔ یہاں تک کہ حاکم نے بہت تعجب کیا۔ اور حاکم کا دستور تھا کہ عید پر لوگوں کی خاطر ایک قیدی جسے وہ چاہتے تھے چھوڑ دیتا تھا۔ اس وقت برابا نام ان کا ایک مشہور قیدی تھا۔ پس جب وہ اکٹھے ہوئے تو پیلاطس

نے ان سے کہا تم کسے چاہتے ہو کہ میں تمہاری خاطر اسے چھوڑ دوں، برابّا کو یا یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے؟
... لیکن سردار کاہنوں اور بزرگوں نے لوگوں کو ابھارا کہ برابّا کو مانگ لیں اور یسوع کو ہلاک کرائیں
..... وہ بولے برابّا کو۔ پیلاطس نے ان سے کہا پھر یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے کیا کروں؟ سب
نے کہا کہ اس کو صلیب دی جائے۔ اس نے کہا۔ اس نے کیا برائی کی ہے؟ مگر وہ اور بھی چلا
چلا کر بولے کہ اس کو صلیب دی جائے۔ جب پیلاطس نے دیکھا کہ کچھ نہیں بن پڑتا بلکہ الٹا
بلوا ہوتا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا کہ میں اس راستباز کے
خون سے بری ہوں۔ تم جانو۔ سب لوگوں نے جواب دے کر کہا کہ اس کا خون ہماری اور ہماری
اولاد کی گردن پر۔ اس پر اس نے برابّا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالہ
کیا تاکہ صلیب دی جائے۔" (۲۷: ۱۱-۲۶)

مرقس کا بیان اس سے بہت ملتا جلتا ہے، طوالت سے بچنے کے لیے اسے چھوڑ کر لوقا کی روایت پر آجائیے:۔

"پھر ان کی ساری جماعت اٹھ کر اسے پیلاطس کے پاس لے گئی اور انھوں نے اس پر الزام
لگانا شروع کیا کہ اسے ہم نے اپنی قوم کو بہکاتے اور قیصر کو خراج دینے سے منع کرتے اور
اپنے آپ کو مسیح بادشاہ کہتے پایا..... پیلاطس نے سردار کاہنوں اور عام لوگوں سے کہا کہ
میں اس شخص میں کچھ قصور نہیں پاتا۔ مگر وہ اور بھی زور دے کر کہنے لگے کہ یہ تمام یہودیہ میں بلکہ
گلیل سے لے کر یہاں تک لوگوں کو سکھا سکھا کر ابھارتا ہے۔ یہ سن کر پیلاطس نے پوچھا کیا یہ
آدمی گلیلی ہے؟ اور یہ معلوم کرکے کہ ہیرودیس کی عملداری کا ہے۔ اسے ہیرودیس کے پاس
بھیجا کہ وہ بھی ان دنوں یروشلم میں تھا۔" (۲۳: ۱-۷)

بطور جملۂ معترضہ یہ سن لیجئے کہ رومی شہنشاہ کی طرف سے دو امیر ملک فلسطین میں مقرر تھے
ایک سارے گلیل کے لیے اور وہاں کا حکم اس وقت ہیرودیس تھا اور دوسرا خاص علاقہ یروشلم کے
لیے جو پیلاطس کی عملداری میں تھا۔ اب آگے پھر لوقا کا بیان سنئے:۔

"وہ ہیرودیس اس سے بہتیری باتیں پوچھتا رہا، مگر اس نے اسے کچھ جواب نہ دیا۔ اور سردار
کاہن اور فقیہ کھڑے ہوئے زور شور سے اس پر الزام لگاتے رہے..... پھر پیلاطس

نے سردار کاہنوں اور سرداروں اور عام لوگوں کو جمع کر کے ان سے کہا کہ تم اس شخص کو لوگوں کا بہکانے والا ٹھہرا کے میرے پاس لائے ہو اور دیکھو میں نے تمہارے سامنے اس کی تحقیقات کی۔ مگر جن باتوں کا الزام تم اس پر لگاتے ہو۔ ان کی نسبت نہ میں نے اس میں کچھ قصور پایا نہ ہیرودیس نے کیونکہ اس نے اسے ہمارے پاس واپس بھیجا ہے اور دیکھو اس سے کوئی فعل ایسا نہیں ہوا جس سے وہ قتل کے لائق ٹھہرتا پس میں اس کو پٹوا کر چھوڑے دیتا ہوں۔ سب مل کر چلا اٹھے کہ اسے لے جا اور ہماری خاطر برابا کو چھوڑ دے۔ یہ کسی بغاوت کے باعث جو شہر میں ہوئی تھی اور خون کرنے کے سبب قید میں ڈالا گیا تھا۔ مگر پیلاطس نے چھوڑنے کے ارادے سے پھر ان سے کہا۔ لیکن وہ چلا کر بولے کہ اس کو صلیب دے صلیب۔ اس نے تیسری بار ان سے کہا کیوں؟ اس نے کیا برائی کی ہے؟ میں نے اس میں قتل کی کوئی وجہ نہیں پائی پس میں اسے پٹوا کر چھوڑے دیتا ہوں۔ مگر وہ چلا چلا کر سر ہوتے رہے کہ وہ صلیب دیا جائے۔ اور ان کا چلانا کارگر ہوا۔ پس پیلاطس نے حکم دیا کہ ان کی درخواست کے موافق ہو۔ اور جو شخص بغاوت اور خون کرنے کے سبب قید میں پڑا تھا اور جسے انہوں نے مانگا تھا اسے چھوڑ دیا۔ مگر یسوع کو ان کی مرضی کے موافق سپاہیوں کے حوالہ کیا۔"

اس کے آگے کیا گزری، حضرت مسیحؑ واقعی مصلوب ہوئے یا نہیں، اس سے اس مضمون کو کوئی تعلق نہیں۔ یہاں دکھانا انجیلی صراحتوں سے اور ان کی تکرار بلکہ کثرت تکرار سے یہ ہے کہ حضرت مسیح سے اصل دشمنی حکمراں قوم کو نہیں بلکہ صرف مسیح کے ہم قوم یہود کو تھی۔ انھیں نے ان کو پکڑا، انھیں نے فتوائے قتل سنایا اور رومی حاکم کی ہر نرمی اور سفارش کے باوجود آپ کو سولی گھر تک لے آئے۔

آپ کہیں گے۔ اس کے بعد اب وضاحت و شہادت کا درجہ باقی ہی کون سا رہ گیا ہے؟ لیکن ذرا ٹھہرئیے اور ایک شہادت اس سے بھی جلی تر واضح تر، کامل تر ابھی اور سن لیجیے۔ یہ شہادت بھی انجیل ہی کی ہے اور سب سے آخری انجیل یعنی یوحنا کی۔

"پھر وہ یسوع کو کائفا کے پاس سے قلعہ[1] کو لے گئے۔ صبح کا وقت تھا اور وہ خود قلعہ

[1] قلعہ جہاں سرکاری کچہری تھی (صدق)

میں نہ گئے تاکہ ناپاک نہ ہوں[1] بلکہ فسح[2] کھا سکیں۔ پس پیلاطس باہر نکل کر ان کے پاس آیا اور کہا کہ
تم اس آدمی کی کیا فریاد کرتے ہو[3]۔ انھوں نے جواب میں اس سے کہا کہ اگر یہ بدکار[4] نہ ہوتا
تو ہم اسے تیرے حوالہ نہ کرتے۔ پیلاطس نے ان سے کہا کہ اسے لے جا کر تم ہی اپنی شریعت
کے موافق اس کا فیصلہ کرو۔ یہودیوں نے کہا کہ ہمیں روا نہیں کہ کسی کو جان سے ماریں[5].....
پس پیلاطس پھر قلعہ میں داخل ہوا اور یسوع کو بلا کر اس سے کہا کہ کیا تو یہودیوں کا بادشاہ
ہے؟ یسوع نے جواب دیا۔ کیا تو یہ بات آپ سے کہتا ہے یا اوروں نے میرے حق میں تجھ سے
کہی؟ پیلاطس نے جواب دیا۔ کیا میں یہودی ہوں؟ تیری ہی قوم اور سردار کاہنوں نے تجھ کو
میرے حوالہ کیا۔ تو نے کیا کیا ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ میری بادشاہت دنیا کی نہیں۔
..... پیلاطس نے اس سے کہا پس کیا تو بادشاہ ہے؟ یسوع نے جواب دیا تو خود کہتا ہے کہ
میں بادشاہ ہوں۔ میں اس لیے پیدا ہوا اور اسی واسطے دنیا میں آیا ہوں کہ حق کی گواہی دوں۔
جو کوئی سچائی کا ہے۔ میری آواز سنتا ہے۔ پیلاطس نے اس سے کہا۔ سچائی ہے کیا؟
یہ کہہ کر وہ یہودیوں کے پاس پھر باہر گیا[6] اور ان سے کہا کہ میں اس کا کچھ جرم نہیں
پاتا۔ مگر تمہارا دستور ہے کہ میں فسح[7] کو تمہاری خاطر ایک آدمی چھوڑ دیا کرتا ہوں۔ پس کیا تمہیں
منظور ہے کہ میں تمہاری خاطر یہودیوں کے بادشاہ کو چھوڑ دوں۔ انھوں نے چلا کر پھر کہا کہ
اس کو نہیں لیکن برابا کو۔ اور برابا ایک ڈاکو تھا۔ اس پر پیلاطس نے یسوع کو لے کر کوڑے
لگوائے..... پیلاطس نے پھر باہر جا کے لوگوں سے کہا کہ دیکھو میں اسے تمہارے پاس
باہر لے آتا ہوں تاکہ تم جانو کہ میں اس کا جرم نہیں پاتا۔ یسوع کانٹوں کا تاج رکھے اور ارغوانی
پوشاک پہنے باہر آیا۔ پیلاطس نے ان سے کہا دیکھو یہ آدمی۔ جب سردار کاہنوں اور پیادوں[8]

---

[1] یہودی عقیدہ میں مشرکوں کی کسی عمارت کے اندر داخل ہونا اپنے کو ناپاک کرنا تھا (صدق)، [2] ایک قسم کی قربانی (صدق)، [3] یعنی تمہارا استغاثہ اس کے خلاف کیا ہے؟ (صدق)، [4] یعنی مجرم (صدق)، [5] سزائے موت کے نفاذ کا اختیار صرف حکومت (رومی) کو تھا۔ یہود رعایا کی دینی عدالتوں کو اس کا حق نہ تھا (صدق)، [6] اوپر کی ساری گفتگو حاکم نے کچہری کی عمارت کے اندر آکر مسیح سے کی تھی تنہائی میں۔ [7] یہود کا ایک تہوار [illegible] (صدق)

نے اسے دیکھا تو چلا کے کہا کہ صلیب دے صلیب! پیلاطس نے ان سے کہا کہ تم ہی اسے لے
جاؤ اور صلیب دو کیونکہ میں اس کا کچھ جرم نہیں پاتا۔ یہودیوں نے اسے جواب دیا کہ ہم اہل
شریعت ہیں اور شریعت کے موافق وہ قتل کے لائق ہے کیونکہ اس نے اپنے آپ کو خدا کا
بیٹا بنایا۔ جب پیلاطس نے یہ بات سنی تو اور بھی ڈرا۔ اور پھر قلعہ میں جا کر یسوع سے کہا
تو کہاں کا ہے..... پیلاطس اس کے چھوڑ دینے کی کوشش کرنے لگا مگر یہودیوں نے
چلا کر کہا اگر تو اسے چھوڑے دیتا ہے تو قیصر کا خیر خواہ نہیں۔ جو کوئی اپنے کو بادشاہ بتاتا
ہے وہ قیصر کا مخالف ہے[1] پھر پیلاطس یہ باتیں سن کر یسوع کو باہر لایا اور اس جگہ جو چبوترہ
ہے وہ تخت عدالت پر بیٹھا..... پھر اس نے یہودیوں سے کہا۔ دیکھو یہ ہے تمہارا بادشاہ۔
بس وہ چلائے کہ لے جا، لے جا، اسے صلیب دے۔ پیلاطس نے ان سے کہا کیا میں تمہارے
بادشاہ کو صلیب دوں؟ سردار کاہنوں نے جواب دیا کہ قیصر کے سوا ہمارا کوئی بادشاہ نہیں
اس پر اس نے اس کو ان کے حوالے کیا تا کہ صلیب دیا جائے۔" (۱۸ و ۲۸۔م۔۱۹ تا ۱۶)

یہ سارے بیانات انھیں چار انجیلوں سے براہ راست نقل ہوئے جو مسیحیوں کے نزدیک مستند ہیں ہی۔ باقی مجموعہ عہد جدید کے دوسرے حصوں مثلاً اعمال سے بھی اگر بیانات نقل ہوں تو ضخامت اس سے بھی کہیں بڑھ جائے ـــــــ اتنی ساری وضاحتوں، صراحتوں اور ان کی کثرت تکرار کے بعد اب یہود کا قتل مسیحؑ یا اقدام قتل مسیحؑ سے اب تقریباً دو ہزار برس کے بعد یہود کا بری الذمہ قرار پا جانا اور وہ بھی نائب مسیح جناب پاپائے روم کی عدالت سے اگر تاریخ کا ایک عجیب ترین اور ناقابل یقین حد تک حیرت انگیز فیصلہ نہیں تو اور کیا ہے؟

انجیل ہی کے حوالہ سے اوپر یہ مضمون اکابر یہود کا آپ کی نظر سے گزر چکا ہے۔

"اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر!"

انجیل کے براہ راست حوالوں کے بعد کسی اور حوالہ کی ضرورت یقیناً نہیں باقی رہ جاتی۔

---

[1] قیصر یعنی شہنشاہ روم۔ یہود اور ان کے بڑے بڑے پروہتوں کے ترکش کا آخری تیر یہ تھا کہ انھوں نے خود رومی حاکم کو دھمکانا شروع کیا کہ اگر تو یسوع کو چھوڑے دیتا ہے تو خود بھی بادشاہ کا غدار و غیر وفادار ہے (صدیق)

لیکن بے تکلف ایک اور حوالہ یہودیوں کی ایک بڑی اور تاریخی شخصیت کا مل گیا جوزیفس جو پہلی صدی عیسوی کا آدمی ہے اور جس کا زمانہ حضرت عیسیٰ کے عہد سے متصل ہی گزرا ہے۔ اس کا شمار اکابر یہود میں ہے اور اس کی تاریخ ANTIQUITIES OF THE JEWS (آثار یہود) یہودیوں کی مستند اور ایک قدیم ترین تاریخ سمجھی جاتی ہے۔ اس کے باب فصل ۳ فقرہ ۳ میں رومی حاکم پیلاطس (PILATE) کے حالات کے ذیل میں لکھتا ہے:

"تقریباً اسی زمانہ میں یسوع نامی ایک انوکھا شخص کا ظہور ہوا اگر شخص کا استعمال اس کے لیے جائز ہو اس لیے کہ اس سے خوارق عادت ہوتے رہتے تھے اور وہ ان لوگوں کا معلم تھا جو حقیقت کو مسرت سے قبول کرتے رہتے ہیں۔ اس کے گرویدہ بہت سے لوگ ہو گئے، یہود میں سے بھی اور غیر یہود میں سے بھی۔ وہ مسیح تھا اور جب پیلاطس نے <u>اسے ہمارے قوم کے اکابر کی تحریک پر سولی کی سزا دی</u> تو اس کے شیدائیوں نے اسے چھوڑ نہیں دیا...." (ص ۵۳۵ انگریزی ایڈیشن)

اور جو کچھ لکھا۔ اس سے بحث نہیں۔ بحث سے متعلق جو فقرہ جوزیفس کے قلم سے نکلا ہے اسے یہاں زیر خط کر دیا گیا ہے۔ جوزیفس جیسا کہ اس کی عبارت سے ظاہر ہو رہا ہے۔ مسیح کا منکر و مخالف نہیں بلکہ نیم معتقد سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اس کا صاف اقرار کر رہا ہے کہ آپ کو سزائے موت دلانے میں سعی و تحریک اکابر یہود ہی کی رہی۔

(بشکریہ صدق جدید)

عورت کی سربراہی کی حمایت

دینی محاذ کا ایک حادثہ اور لادینیت کے لیے نوید فتح

(عتیق الرحمٰن سنبھلی)

(۲)

اس مضمون کی پہلی قسط میں مدیر شہاب کے صرف ایک جزو پر گفتگو ہوئی تھی بقیہ اجزاء پر اور مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے چیلنج پر گفتگو باقی تھی۔ صرف اشاعت ہی باقی نہ تھی بلکہ یہ سب حصہ مجھے لکھنے کو بھی باقی تھا کیونکہ میری صحت کی ناہمواری نے اس سے زیادہ لکھنے کا موقع مجھے نہیں دیا تھا جو گزشتہ اشاعت میں شائع ہو سکا۔ اسی صحت کے مسئلے نے مجھے مجبور کیا کہ تبدیلِ ماحول کی خاطر ہفتے دو ہفتے کہیں لکھنؤ سے باہر رہوں چنانچہ ۱۱ر فروری سے ۵۲ر فروری تک کا وقت اپنے وطن میں گزارا۔ اور اس کی خاطر یہ بھی طے کرنا پڑا کہ مارچ کے الفرقان کی اشاعت میں کچھ تاخیر گوارا کی جائے۔ لیکن اس تاخیر سے میرے نامکمل مضمون کی تکمیل کی جو صورت کچھ لکھنے کی ادنیٰ زحمت کے بغیر پیدا ہوئی ہے، میں یقیناً اس سے بہتر کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔

میں ۲۶ر کو لکھنؤ واپس آیا اور بحمداللہ صحت کے اس حال میں تھا کہ مضمون کی تکمیل کا کام شروع کر سکوں۔ لیکن ۲۷ر کی صبح ہی کو جو اخبار دیکھا تو اس میں مدیر شہاب (مولانا کوثر نیازی) کا جماعت اسلامی سے استعفے کے اعلان کے ساتھ ایک بیان تھا۔ اور آج یکم مارچ کو نیازی صاحب کا وہ مفصل مکتوب بھی اخبار میں آگیا جو انھوں نے اپنے استعفے سے پہلے مولانا مودودی صاحب

کو لکھا تھا، یہ مکتوب ہی ہے کہ اس مضمون کی وہ بہترین تکمیل ہے جو اس تاخیر کی بدولت آپ سے آپ ہی حاصل ہو گئی۔

اس مکتوب میں مدیر شہاب عورت کی سربراہی کے مسئلہ میں اپنی اس تمام تقریری اور تحریری تائید و حمایت کے بارے میں، جو انہوں نے جماعت اسلامی پاکستان کے فیصلے کے مطابق کی، لکھتے ہیں۔

"میری پوری زندگی کے گناہ ایک طرف اور یہ اکیلا گناہ دوسری طرف کہ میں جس بات کو شرعاً درست نہیں سمجھتا تھا صرف جماعتی قواعد و ضوابط کی وجہ سے اس معصیت پر مجبور ہو گیا کہ اب اس کی نمائندگی کروں! اللہ میرے اس جرم کو معاف فرمائے ورنہ ڈرتا ہوں کہ کہیں اس جرم کی وجہ سے میرا دل رہے سہے ایمان ہی سے محروم نہ ہو جائے۔"

واقعہ یہ ہے کہ عتیق سنبھلی یا کوئی اور شخص نیازی صاحب کے مضمون کی تردید میں کتنے ہی مضبوط دلائل فراہم کر دیتا تب بھی یہ بات بہر حال حاصل نہ ہوتی جو انکے مکتوب کے صرف ان چند جملوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ کسی انسان کا علی الاعلان یہ اقرار کہ وہ اپنے ضمیر اور اعتقاد کے خلاف اللہ کے دین اور اسکی شریعت کے بارے میں کسی غلط بات کی تائید کا ارتکاب کرتا رہا، دنیا کا سب سے مشکل کام اور انسانی زندگی کا سب سے کٹھن مرحلہ ہے۔ اس مرحلے میں اگر آدمی کو تاویل کے لیے تنکے کا سہارا بھی ملتا ہے تو وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ سے لے کر مولینا اشرف علی صاحب تھانویؒ تک کے اقوال کل اپنی تائید میں پیش کرنے والا اگر آج انہیں اپنی غلطی کا ادنیٰ عذر بنانے کو تیار نہیں ہے تو پھر یہ اس بات پر شاہد دلیلوں کی ایک دلیل ہے کہ یا تو ان اقوال کو غلط طور پر استعمال کیا گیا تھا اور یا اگر ان میں سے کسی قول سے کچھ تائید واقعۃً نکلتی بھی تھی تو اس کے علم اور ضمیر کے مطابق یہ قول قابل تردید تھا نہ کہ قابل استشہاد! اور یہی ہمارا بھی موقف تھا کہ مثلاً مفتی دار العلوم دیوبند کے (سابق) فتوے میں یقیناً عورت کو سربراہ مملکت بنانے کا جواز ملتا ہے مگر کوئی صاحب علم

آدمی اپنے علمی ضمیر کو دبائے بغیر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی تائید نہیں کر سکتا۔ اور رہا مس فاطمہ جناح جیسی عورتوں کے حق میں اس کا استعمال تو یہ اہل علم ہی نہیں ایک صاحب ضمیر عامی کے لیے بھی قابل شرم ہے اس کے برعکس امام مالکؒ امام ابوحنیفہ اور امام طبری کی طرف جو عورت کی امامت کا جواز منسوب کیا گیا ہم بتا چکے ہیں کہ وہ سراسر خلاف واقعہ ہے اسی طرح ہمیں حضرت تھانوی، علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اقوال پر گفتگو کر کے بتانا تھا کہ ان میں سے کس کے استعمال کی کیا حیثیت ہے اور وہ کس تبصرے کا مستحق ہے لیکن مدیر شہاب کے اس مکتوب نے ہمارے لیے اس بحث کی ساری بساط اب لپیٹ دی ہے۔ اب اگر کسی کو ان اقوال سے غلجان ہے تو وہ ہم سے نہیں مدیر شہاب سے پوچھے کہ یہ جو اقوال سب سے پہلے ان ہی کے ذریعہ لوگوں کے سامنے گئے اور انھیں کی آڑ میں جماعت اسلامی کے ہر صاحب قلم نے اپنی جماعت اور مولانا مودودی صاحب کی مدافعت کا مورچہ سنبھالا ان کے باوجود انھیں (مدیر شہاب کو) اپنی تائید وحمایت کا فعل کیوں اس قدر سنگین معصیت نظر آیا کہ اس کی پاداش میں یہاں سے محرومی تک کا اندیشہ ان کی زبان پر آ گیا ہے ہمیں تو اب صرف مدیر شہاب کو مبارک باد دینی ہے کہ انھوں نے حق دوستی اور رجوع وانابت الی اللہ کی بڑی ہی قابل شکر اور قابل رشک توفیق خدا کی بارگاہ سے پائی۔ اور اپنے وہ سخت الفاظ واپس لیتے ہیں جو کہیں کہیں ان کے مضمون کی تنقید میں ہمارے قلم سے نکلے۔ یقیناً وہ اپنے اس مضمون سے اب اس طرح بری ہیں جیسے کہ وہ کبھی ان کے قلم سے نکلا ہی نہیں تھا۔

اب ہم اس بحث میں خود کچھ لکھنے کے بجائے مدیر شہاب کا مذکورہ بالا مکتوب ہی اپنے ناظرین کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اس نے جہاں ہمیں مدیر شہاب کے مضمون پر گفتگو سے سبکدوش کر دیا ہے وہاں یہ بات بھی اس سے بدرجہ اتم عیاں ہو جاتی ہے کہ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی نے اس مسئلہ میں جو موقف مس فاطمہ جناح کی حمایت کی خاطر اختیار کیا وہ ان کے سابقہ موقف کی ایسی ضد ہے جسے بقول مدیر

شہاب کی دینی دوغلے پن اور نفاق کے سوا کچھ اور نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بات ہمارے نزدیک بالکل کھلی ہوئی تھی اور اسی لیے ہم نے کہا تھا کہ مولانا مودودی اور ان کے رفقاء نے آج جو کچھ اس مسئلے میں کہا ہے اس کا تار و پود بکھیر دینے کے لیے ان کی سابقہ تصریحات ہی کافی ہیں۔ لیکن حیرت ہے ان لوگوں پر جو مدیر شہاب کی طرح جماعتی جبریت کے تحت اس دوغلے پن کی تائید و حمایت کی کوئی مجبوری نہ رکھتے تھے پھر بھی انہوں نے مولانا مودودی سے پُر جوش تعلق میں اپنا دینی حق یہ جانا کہ جو لوگ جماعت اسلامی پاکستان کی اس روش کو دینی محاذ کا خطرناک رخنہ جان کر تنقید کر رہے ہیں ان کے مقابلے کا محاذ سنبھال لیں جس میں ایک طرف تو وہ دلائل گڑھ گڑھ کر پیش کیے جائیں جن سے لوگوں کو اسلام میں عورت کی سربراہی کا جواز نظر آنے لگے۔ اور دوسری طرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ مولانا مودودی نے اس سے پہلے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی جس سے کسی حال میں بھی عورت کو سربراہ مملکت بنانے کا جواز نہ رہتا ہو اور حد یہ ہے کہ رکھنے والوں نے مولانا کا وہ مضمون بھی سامنے رکھ دیا جس میں سیاست و مملکت کے معاملات میں عورتوں کی عملی شرکت کے جواز کی مطلق نفی کرتے ہوئے مولانا اس حد تک گئے تھے کہ حضرت عثمان غنیؓ کے قصاص کے مطالبے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ہنگامی سربراہی تک کے لیے کوئی استثنائی نوعیت کا جواز بھی تجویز نہ فرما سکے، بلکہ حضرت علی مرتضیٰؓ کی زبان میں اسی بات پر مُصر رہے کہ "حضرت عائشہ کا یہ اقدام حدودِ شریعت سے متجاوز تھا" لیکن اسکے باوجود بھی کہنے والے پورے طمطراق کے ساتھ یہی کہتے رہے کہ مولانا نے اس مضمون میں یہ کہاں لکھا ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی استثنا نہیں ہے؟ ہاں صاحب یہ تو واقعی نہیں لکھا لیکن اگر "بادلت" مس فاطمہ جناح کے لئے مملکت پاکستان کی سربراہی کا کوئی استثنائی جواز نکل سکتا ہے تو کیا ام المؤمنین حضرت عائشہ اس قابل بھی نہ تھیں کہ ایک ہنگامی قضیے کی سربراہی کا کوئی جواز ان کے لیے بھی تجویز کر دیا جاتا؟ اور اگر اجازت ہو تو ہم اس سوال کو اسی مضمون کے مولانا کے ان الفاظ میں دریافت کرنے کی جرأت کریں کہ

"آپکے خیال مبارک میں کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی خواتین کے اندر کوئی خاص نقص تھا جسکی وجہ سے وہ بیرونِ خانہ کی ذمہ داریوں کیلئے نااہل تھیں؟ اور کیا دوسری خواتین کو اس لحاظ سے ان پر کوئی فوقیت حاصل ہو؟"

ہمیں یقین ہے کہ مولانا کی ہر بات کو ڈھونے میں اپنی سعادت دارین سمجھنے والے اس بات کا بھی جواب دے ہی دینگے اور ہمیں چپ کرکے چھوڑیں گے۔ لیکن اس مضمون کا ایک جملہ اور سن لیجئے حضرت علیؓ کی بات نقل کرنے کے بعد مولانا نے فرمایا کہ

"اور حضرت عائشہؓ اپنی کمال درجے کی ذہانت و نقاہت کے باوجود اس کے جواب میں کوئی دلیل نہ پیش کر سکیں"

لیکن اب کون حضرت عائشہؓ کو بیسویں صدی کے اس کمال ذہانت و نقاہت کی خبر جاکر پہونچائے کہ جس چیز کی کوئی معمولی سی دلیل بھی آپ کو حضرت علیؓ کے جواب میں نہ مل سکی تھی آج اس کی دلیل قرآن میں دریافت کرلی گئی ہے۔ اور کیسی دریافت! کہ سارے عالم کو چیلنج دیا جارہا ہے کہ کوئی اس کی نفی میں دلیل لائے!

البتہ (اسی مضمون میں) مولانا نے کہا تھا کہ۔

سیاست و ملک داری میں عورت کے دخل کو جائز ٹھہرانے والے اگر کوئی دلیل رکھتے ہیں تو وہ بس یہ کہ حضرت عائشہؓ حضرت عثمانؓ کے خون کا دعوے لے کر اٹھیں اور جنگ جمل میں حضرت علیؓ کے خلاف نبرد آزما ہوئیں۔ مگر اول تو یہ دلیل اصولاً ہی غلط ہے۔ اس لیے کہ جس مسئلہ میں اللہ اور اس کے رسول کی واضح ہدایت موجود ہو اس میں کسی صحابی کا کوئی ایسا انفرادی فعل جو اس ہدایت کے خلاف نظر آتا ہو ہرگز حجت نہیں بن سکتا۔ صحابہ کی پاکیزہ زندگیاں بلاشبہ ہمارے لئے مشعل ہدایت ہیں مگر اس غرض کے لیے نہیں کہ ہم اللہ اور رسول کی ہدایت کو چھوڑ کر ان میں سے کسی کی انفرادی لغزشوں کا اتباع کریں"

اور یہی ان کے متبعین کا بھی غلو کی حد تک شعار تھا۔ مگر کل جنھیں صحابہؓ کی لغزشوں کے اتباع سے بھی عار آتی تھی آج وہ کتابوں اور اخباروں کے پرانے فائلوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے زمانے کے لوگوں تک کی لغزشوں کو مشعل ہدایت بناتے ہوئے نہیں شرمارہے ہیں۔ یہ فلاں کا بیان ہے' یہ فلاں کا فتویٰ ہے یہ فلاں کی تحریر ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت سربراہ مملکت بنائی جاسکتی ہے۔

ع۔ پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے

خیر اب چھوڑیئے اس قصہ کو پتہ نہیں کتنی گالیوں کا، باپ دادا تک کے لیے ان چند سطروں نے مزید سامان کرا دیا ہوگا۔ اب تو مدیر شہاب مولانا کوثر نیازی کا وہ خط پڑھیے جو دراصل اس مضمون کی قسط دوم ہے۔

عہ یہ تمام اقتباسات مولانا ابوالاعلیٰ صاحب کے جس مضمون سے لئے گئے ہیں وہ ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ میں اور اسی کے حوالے سے الفرقان محرم ۱۳۷۲ھ میں بھی شائع ہوا ہے۔

.... بنام مولانا مودودی

مولانا کوثر نیازی

محترم امیر جماعت!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

پچھلے دنوں میں نے ایک تفصیلی ملاقات کے لیے آپ سے حاضر ہونے کی اجازت چاہی تھی، حاضر بھی ہوا مگر آپ خواجہ عبدالحی مرحوم کی فاتحہ خوانی کے لیے تشریف لے جا رہے تھے، سرسری سی بات ہوئی اور تفصیلات پھر کسی وقت کے لیے ملتوی ہو گئیں۔ بعد میں مجھے درد گردہ کا دورہ پڑ گیا، اب طبیعت بحال ہے مگر مسلسل نشست رکھوں تو تکلیف ہونے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تحریری طور پر آپ کو مخاطب کر رہا ہوں۔

متحدہ محاذ میں جماعت کی شمولیت پر میرے خیالات آپ سے اور دوسرے رفقاء سے ڈھکے چھپے نہیں۔ جب ۱۹۶۲ء میں مسٹر سہروردی مرحوم سے آپ نے متحدہ محاذ کے سلسلے میں گفتگو کا آغاز کیا تو میں نے "شہاب" مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں "مسٹر سہروردی سے چند سوالات" کے زیر عنوان ایک اداریہ شذرہ سپرد قلم کیا تھا مقصود یہی تھا کہ جو لوگ غیر اسلامی نظریات کے علمبردار اور ملک میں جمہوریت کے قاتل ہیں جماعت ان کی طرف دست تعاون بڑھانے سے باز رہے۔ اس پر آپ نے ایک ملاقات میں مجھے اس طرح کی تحریریں لکھنے سے منع کر دیا۔ کیوں کہ آپ کے نزدیک اس سے جماعت کی پوزیشن خراب ہوتی تھی۔ میں نے آپ کے اس حکم کی تعمیل کی مگر اس کے ساتھ میں برابر "شہاب" کے ذریعے ایک اسلامی محاذ کی تشکیل پر زور دیتا رہا۔

متحدہ محاذ کی شرکت

۱۹۶۴ء میں جماعت کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور اس زمانے میں مرکزی دفتر کے باقی ماندہ اصحاب نے محاذ کے قیام کے لیے دوسری پارٹیوں کے ساتھ پھر سے مذاکرات شروع کر دیئے، میرا خیال یہ تھا کہ جماعت موجود نہیں اور یہ اصحاب اپنی ذاتی حیثیت میں محاذ میں شریک ہو رہے ہیں، اس لیے میں نے ۱۶ فروری ۱۹۶۴ء کے "شہاب" میں ایک مرتبہ پھر تفصیل سے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا اور بدلائل واضح کیا کہ اس طرح کے متضاد اور متصادم عناصر کا اتحاد ملک و ملت دینی اقدار اور خود جماعت کے لیے سخت تباہ کن ثابت ہوگا۔ اس مضمون کے چھپتے ہی ان رفقاء نے میرے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم تیز تر کر دی، کارکنوں کو یہ یقین دلایا گیا کہ انھوں نے یہ سب کچھ جیل سے آئی ہوئی ہدایات کے مطابق کیا ہے اور دوسری طرف یہ دھمکی دے کر میرا منھ بند کرنے کی کوشش کی گئی کہ اگر میں اس طرح کے خیالات ظاہر کرنے سے باز نہ آیا تو خلاف قانون قرار دیئے جانے کے باوجود جماعت کا جو ڈھانچہ اپنے طور پر انھوں نے قائم کر رکھا ہے وہ پورے ملک کے متعلقین کو جماعت سے میرے نکل جانے کی اطلاع کر دے گا۔

مایوسی۔ اضمحلال اور جمود

میں پروپیگنڈے کی اس مہم سے متاثر تو نہیں ہوا اس لیے کہ میرے خلاف اس طرح کی کئی مہمیں عرصہ سے بعض ممتاز اصحاب کے زیر سایہ جاری تھیں اور میں زبانی اور تحریری طور پر کئی دفعہ آپ کو ان کی اطلاع بھی دے چکا ہوں اور بطور احتجاج اس سلسلے میں اپنے منصب سے استعفیٰ بھی دے چکا ہوں، لیکن اس خیال سے کہ آپ کی عدم موجودگی اور جماعت کی بندش کے باوجود اس طرح کے اختلافات جگ ہنسائی کا باعث بنیں گے اور اس سے ہمارے سادہ دل کارکنوں کو بہت صدمہ ہوگا، میں خاموش ہوگیا تا آنکہ جماعت نے صدارتی انتخابات میں اپنے سابقہ موقف کو چھوڑ کر محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کو دین اسلام کا تقاضا اور جہاد قرار دے دیا۔ آپ باہر تشریف لے آئے اور جماعت کی پوری طاقت کو آپ نے اس انتخابی مہم میں جھونک دیا، یہ مرحلہ بظاہر اب ختم ہو چکا ہے مگر اس کے خطرناک نتائج و عواقب کارکنان جماعت میں بڑھتی ہوئی مایوسی، اضمحلال اور جمود کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں، جماعت جس غلط راستے پر چل پڑی ہے بلکہ اس راستہ کی جس منزل پر جا کر رک گئی ہے

اس کی مثال ایک تنگ گلی کی سی ہے جس سے پیچھے ہٹنے یا آگے بڑھنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی۔ دوسرے لفظوں میں ہماری تحریک "رہروان پشت بمنزل" کا قافلہ بن چکی ہے۔ کتمان حق ہوگا اگر میں جماعتی خیرخواہی کے لیے آپ کے سامنے اپنے قلبی احساسات کی یہ تصویر نہ رکھوں کہ جن تصورات کے تحت میں جماعت میں شامل ہوا تھا۔ آج وہ تصورات نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں اور اپنی ذاتی اصلاح و تکمیل کا جو مقصد مجھے جماعت میں لایا تھا جماعت کی پالیسی اور طرز عمل نے دوسرے بہت سے ارکان کی طرح مجھے اس مقصد سے محروم ہی نہیں کیا بہت دور پھینک دیا ہے۔

مذہبی اور سیاسی دیوالیہ پن

صدارتی انتخاب کی مہم کے دوران جو غلطیاں ہم سب نے کی ہیں وہ اتنی ہولناک ہیں کہ ان کے تذکرے سے بھی دل کانپتا ہے اور چونکہ جماعت کی پالیسی کے تحت مجھے بھی ان غلطیوں کا بار بار ارتکاب کرنا پڑا ہے اس لیے میں ان کی شدت کو بہت زیادہ محسوس کر رہا ہوں، مجلس عاملہ کے حالیہ اجلاس میں اگر اپنی غلطیوں کا احساس و اعتراف کر کے راست روی اختیار کر لی جاتی تو شاید اس احساس میں کمی واقع ہو جاتی مگر عاملہ نے اس سلسلے میں جو قرارداد منظور کی ہے میں اس پر مسلسل غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اس سے جماعت ایک ایسے راستے پر ڈال دی گئی ہے جو دینی اعتبار سے سخت دو رخے پن بلکہ (مجھے اس سخت لفظ کے استعمال کے لیے معاف فرمائیے) نفاق کا راستہ ہے اور سیاسی حیثیت سے فہم و فراست اور حکمت و دانش کے پہلو سے ہمارے دیوالیہ ہو جانے کا اعلانِ عام ہے۔ اس قرارداد کا تضاد خلق خدا کے ساتھ ساتھ مضطرب ارکان اور کارکنوں کو مغالطے میں ڈالنے کی ایک دردناک مثال پیش کرتا ہے۔

اس قرارداد کے ایک حصہ میں تو کھلم کھلا اعتراف کیا گیا ہے کہ۔

"یہ اخلاقی حالت اگر ہماری قوم کی نہ ہوتی تو انتخابات کے یہ نتائج ہرگز ہرگز برآمد نہ ہو سکتے تھے۔ یہ صورت حال اس امر کی ضرورت کو بالکل واضح کر دیتی ہے کہ خود جمہوریت کی بحالی کے لیے بھی قوم کی اخلاقی اصلاح ناگزیر ہے۔ جب تک ہم طبقات کے اخلاق کو پختہ بنیادوں پر استوار کرنے کی فکر اور کوشش نہ کریں گے۔ اس وقت تک دھن، دھونس اور دھاندلی کے ذریعے سے آمروں کے مسلط ہونے کا دروازہ بند نہ ہو سکے گا۔"

اور اس کے دوسرے حصوں میں یہ کہہ کر مغالطہ دہی کی حد کر دی گئی ہے کہ

"گذشتہ تین ماہ میں قوم جس آزمائش سے گزری ہے اس سے اس کا یہ احساس بالکل واضح ہو گیا ہے کہ وہ اب بیدار ہے اور اپنے حقوق کے لیے ہر ممکن جدوجہد کا داعیہ رکھتی ہے۔"

اس کے ساتھ دوسرے فیصلوں میں اس امر کا بھی دانشگاف الفاظ میں اعلان کیا گیا ہے کہ

"جماعت اسلامی متحدہ محاذ کا بدستور ساتھ دیتی رہے گی۔"

الفاظ کا گورکھ دھندا

ان قراردادوں کا جو مطلب میں سمجھا ہوں اور جو میرے خیال میں ہر پڑھا لکھا آدمی سمجھے گا یہ ہے کہ جماعت اپنے ارکان کے اندر پیدا شدہ بے چینی کو الفاظ کے گورکھ دھندے میں دبا دینا چاہتی ہے، اس میں ان لوگوں کے لیے بھی سامان تسکین موجود ہے جو اصلاح معاشرہ کے طویل اور کٹھن کام کو "مجذوب کی بڑ" سمجھتے اور اس لادینی سیاست کے چکر میں الجھ کر متحدہ محاذ کا ساتھ دینا چاہتے ہیں اور اس میں ان لوگوں کے ذوق کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا جو انقلاب قیادت کے لیے خود معاشرہ کی اصلاح کو ضروری قرار دیتے ہیں، اس طرح کے دو متصادم نظریات کو ایک ہی سانس میں دہرا دینے کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ جماعت کی قیادت اب بھی اپنے ارکان اور کارکنوں سے صفائی کے ساتھ بات نہیں کرنا چاہتی اور اسے اپنی سابقہ غلطیوں کا اعتراف کرنے میں شدید تامل ہے۔

"ابدی اور غیر ابدی حرمتیں"

محترم مولانا۔ اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ دوسری بہت سی اصولی غلطیوں کے علاوہ ہم نے عورت کی صدارت کے مسئلہ میں جو روش اختیار کی اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی جو سزا ملے گی اس کا مسئلہ تو الگ ہے اس دنیا میں بھی اندرون و بیرون ملک ہماری دینی حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ اگر ہمیں صدر ایوب کی مخالفت کرنی ہی تھی اور محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دینا ہی تھا تو سیاسی اور جمہوری ضرورت کا اظہار کر کے ایسا کیا جا سکتا تھا مگر اس کے لیے ہم نے غریب اسلام پر جو نوازش کی ہے اور حرمت کی ابدی اور غیر ابدی تقسیم کا جو نیا نظریہ پیش کیا ہے اس کے بعد دینی حلقے تو ایک طرف رہے دوسرے طرح جانب دار عناصر حتی کہ اپوزیشن تک کے بعض نمایاں افراد ہمیں ابن الوقت اور سیاست کی خاطر دین میں ترمیم اور تحریف کرنے والا گروہ تصور کرنے لگے ہیں۔ آپ عالم

اسلام کی صفِ اول کے ممتاز عالمِ دین ہیں اور میں ایک معمولی طالبِ علم، میں نے کچھ سیکھا بھی ہے تو آپ کے طفیل، لیکن اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں کہ حرمتوں میں ابدی اور غیر ابدی کی یہ تقسیم مان لینے کے بعد ہمارا موقف منکرینِ حدیث کے گمراہ کن نظریہ سے بھی زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ منکرینِ حدیث کا نظریہ یہی تو ہے کہ وہ فقط قرآن میں بیان کردہ حرمتوں کو ابدی مانتے ہیں، حدیث کی حرمتیں ان کے نزدیک غیر ابدی ہیں مگر ہم یہ کہہ کر ان سے بھی دو قدم آگے بڑھ جاتے ہیں کہ نہیں ساری حرمتیں، قرآن کی بھی ابدی نہیں، حرمتیں قرآن کی ہوں یا حدیث کی سب کی سب ابدی اور غیر ابدی کے خانوں میں تقسیم ہیں۔

دین کی پامالی کا اذنِ عام

محترم مولانا! یقین فرمائیے کہ اس نظریہ کی تاویل میں اب تک آپ نے یا دوسرے حضرات نے جو کچھ لکھا یا کہا ہے وہ میری نظر میں ہے (اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ جماعتی پالیسی کی جبریت کے تحت میں خود آپ کے اس نئے نظریہ کا دفاع کرنے والوں میں شامل رہا ہوں) مگر اس کے باوجود اس نظریہ کی صحت مجھ پر واضح نہیں ہو سکی اور آج جب کہ یہ سطور لکھتے وقت میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے میں آپ کا بدترین بدخواہ ہوتا اگر اس مہلک نظریہ کے متعلق اپنے دل کی بات آپ کے سامنے بیان نہ کرتا۔ قرآن اور حدیث میں حرمتوں کے متعلق "اہون" اور "غیر اہون" کا تصور ضرور پایا جاتا ہے مگر "ابدی" اور "غیر ابدی" کا نہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ دروازہ کھول کر ہم نے تجدد پسندوں کو دین کی پامالی کا اذنِ عام دے دیا ہے۔ غیر ابدی حرمتوں کی لکھی لکھائی فہرست تو کہیں درج نہیں ہوگی یہی کہ جو شخص یا گروہ اپنی ضرورتوں اور مصلحتوں کے تحت چاہے گا کسی حرمت کو غیر ابدی ٹھہرائے گا، آخر کسی حرمت کو غیر ابدی ٹھہرانے کا حق ہمیں ہی تو ارزانی نہیں ہوا، دوسرے بھی تو اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم یہ تو کہہ سکیں گے کہ جن ضرورتوں اور مصلحتوں کی خاطر تم ایک حرمت کو جائز قرار دے رہے ہو، یہ ضرورتیں اور مصلحتیں معتبر نہیں مگر اس کا کیا جواب ہوگا جب پلٹ کر کسی نے یہ کہہ دیا کہ یہ اجتہادی مسئلہ ہے۔ آپ کے نزدیک یہ مصلحتیں غیر معتبر ہیں۔ ہمارے نزدیک معتبر اور جہاں تک نظریہ کا سوال ہے وہ خود آپ ہی کا عطا کردہ ہے اس لیے ہم نے اپنے غلط اجتہاد پر عمل کرتے ہوئے بھی

سو حرمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

تو ہم اس لیے ثواب کے امیدوار ہیں کیوں کہ مجتہد کے نامۂ اعمال میں غلط اجتہاد پر بھی نیکی لکھی جاتی ہے۔ مجھے اس سے پیشتر آپ کے نظریۂ حکمتِ عملی کے ان خطرناک پہلوؤں کا اندازہ نہ تھا۔ جماعت سے نکلنے والے بعض اکابر اس پر گرفت کرتے تھے تو میں اسے مخالفت اور تعصب پر محمول کرتا تھا مگر صدارتی انتخاب میں پیش ہونے والے اس نئے نظریہ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے اور میں یہاں تک سوچنے لگا ہوں کہ کیا آپ کا پہلا نظریہ حکمتِ عملی ان ہی مضمرات کا حامل تو نہ تھا۔؟

انتہائی ندامت کے ساتھ

میں آپ کے سامنے انتہائی ندامت کے ساتھ خود اپنے بارے میں بھی یہ اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے حقیر سے علم اور مطالعہ کی بنا پر میری رائے یہی تھی کہ موجودہ سیاسی اور جمہوری روایات کی بات تو دوسری ہے لیکن شرعاً عورت کسی بھی صورت میں صدر مملکت نہیں بنائی جا سکتی اور اس کا تو میں کوئی تصور اپنے ذہن میں نہیں رکھتا تھا کہ کبھی ہم بھی اسلام کے نام پر ایک خاتون کی حمایت میں ایسی تحریک چلا سکتے ہیں چنانچہ میں نے اپنی مسجد میں سوالات کا جواب دیتے ہوئے سینکڑوں افراد کے سامنے قرآن و حدیث کے دلائل سے اپنے اس عقیدے کی وضاحت کی اور بعد میں بعض اخباری نمائندوں کی خواہش پر اس خطبہ کا خلاصہ اخبارات کو بھی بھجوا دیا مگر اس دوران مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ جماعت اس سے الگ نقطۂ نظر پر سوچ رہی ہے اور امکان غالب اس کا ہے کہ مس فاطمہ جناح کی حمایت کا فیصلہ کیا جائے گا۔ میں اس انکشاف پر سراسیمگی کا شکار ہو کر رہ گیا اور جماعت کے فیصلے کے انتظار میں اس بیان کو واپس لے لیا۔

مجھے بعد میں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے جیل سے مرکز جماعت کو یہ ہدایت بھجوائی ہے کہ اس مسئلہ پر ہرگز متحدہ حزبِ اختلاف کا ساتھ نہ دیا جائے۔ آپ کی گزشتہ تحریروں کی روشنی میں امید بھی اس بات کی تھی لیکن جب مجلسِ مشاورت میں جیل سے آئی ہوئی آپ کی وہ تحریر پڑھ کر سنائی گئی جسے بعد ازاں لفظ بلفظ مجلس مشاورت کی قرارداد کی صورت میں اخبارات کو ارسال کر دیا گیا، تو میرے حسن ظن کو انتہائی ٹھیس پہونچی۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو میں یہاں یہ بھی وضاحت کر دوں کہ مجلس مشاورت کے جس اجلاس میں محترمہ کی حمایت کا فیصلہ کرتے ہوئے اس قرارداد کو منظور

کیا گیا میں اس میں اپنی غلط فہمی (یا وقت کے بارے میں غلط اطلاع) کی وجہ سے شریک نہ ہو سکا جب میں پہونچا تو یہ قرارداد اخبارات کو بھجوائی جا چکی تھی کاش! میں اس وقت موجود ہوتا اور اس غلط نظریہ پر اہل مجلس کو متنبہ کر کے کم از کم قرارداد کے الفاظ تو تبدیل کرا دیتا ـــــ ظاہر ہے کہ اس کے بعد "تیراز کمان رفت" والا معاملہ تھا اب جماعتی دستور کی رو سے میں اس فیصلہ کی تائید پر مجبور تھا اور جس رائے کو میں دلائل کی بنا پر مرجوح بلکہ غلط سمجھتا تھا اب صرف اس لیے کہ وہ بطور قرارداد منظور ہو چکی ہے جماعت اور مجلس مشاورت کا رکن ہونے کی وجہ سے میں تحریر و تقریر کے ذریعے اس کی تائید و توثیق کرنے لگا۔

مولانا! میں بہت گناہ گار ہوں مگر میری پوری زندگی کے گناہ ایک طرف اور یہ اکیلا گناہ دوسری طرف کہ میں نے جس بات کو شرعاً درست نہیں سمجھا تھا صرف جماعتی قواعد و ضوابط کی وجہ سے اس معصیت پر مجبور ہو گیا کہ اب اس کی نمائندگی کروں؟ اللہ میرے اس جرم کو معاف فرمائے ورنہ ڈرتا ہوں کہ کہیں اس جرم کی وجہ سے میرا دل رہے سہے ایمان ہی سے محروم نہ ہو جائے۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیات اعمالنا۔

مولانا! میری رائے یہ ہے کہ اب ہماری یہ محبوب جماعت اسلامی ایک عجیب و غریب صورت حال سے دوچار ہے۔

قول و فعل کا تضاد اس جماعت کی ابتدا کے وقت نظام حکومت کی اصلاح کا جو تصور آپ نے پیش کیا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ افراد میں ایمان و اسلام اور احسان کا صحیح شعور پیدا کر کے انھیں انفرادی زندگی میں متقی بنایا جائے اور ان افراد کے ذاتی عمل اور شہادت حق کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کی جائے۔ اس طریقے سے نظام حکومت کی اصلاح آپ سے آپ یوں ہو گی جیسے سنگترے کے بیج سے سنگترے کا درخت اور پھر اس درخت سے سنگترے کا پھل پیدا ہوتا ہے۔ اس طبعی عمل کے طور پر اسلامی حکومت اسی اصلاح یافتہ معاشرے سے ظہور پذیر ہو گی، یہ تصور اگر جماعت کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا تو کسی اہم مرحلے پر لے آ جا کر کرنے کے بعد پھر سے زیر عمل لایا جا سکتا تھا لیکن دوسرے بہت سے اصحاب قلم کے علاوہ خود آپ نے پچھلے آٹھ دس برس میں جماعت کو جو فکری غذا دی ہے اور جس طرح پہلے دوسرے اور تیسرے مرحلے کا تصور دے کر جماعت کے کارکنوں کو یہ باور کرایا ہے کہ جماعت جو بھی پالیسی اختیار کر رہی ہے وہ اسی تصور اقامت دین ہی

کا نتیجہ ہے جو آپ نے شروع میں پیش فرمایا تھا، اس کے بعد جماعت کے کارکنوں کو پھر سے اصلاح ذات اور اصلاح معاشرہ کے کاموں پر لگا دینے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ مزید برآں ہم نے پچھلے چند سالوں میں بالعموم اور صدارتی انتخاب میں بالخصوص جس قسم کی اپوزیشن کا کردار ادا کیا ہے ارباب اقتدار کو اپنا حریف بنایا اور خود جس طرح ان کے حریف بنے ہیں اس کے بعد داعیٔ دین کی حیثیت سے ہمارے لیے ملک میں کام کرنے کی کوئی صورت موجود نہیں۔ اس پہلو سے میری مایوسی اس وجہ سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے کیوں کہ ہم نے ۴۹ء کی انتخابی پالیسی سے لے کر عورت کے مسئلہ صدارت تک ہر متضاد بات کے لیے جس طرح نصوص قرآن و حدیث کو پیش کیا ہے اس کے بعد اس ملک میں کوئی ذی فہم آدمی ہماری پیش کردہ دینی اور اصلاحی دعوت پر اعتماد نہیں کر سکتا۔

ماضی اور حال تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں، تضادات کا شکار ہوئے جانے کے ہمارے ادوار آپ سے بڑھ کر کس پر روشن ہوں گے۔ پہلے ہم نے امیدواری کو حرام قرار دیا۔ اس کے لیے صحابہ تک کی کسی جلیل القدر شخصیت میں امیدواری کا کوئی پہلو ہمارے سامنے پیش کیا گیا تو ہم نے اپنی اجتہادی رائے کو نص کا درجہ دے کر اس پر تنقید کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ مگر اب ہم اپوزیشن کے ساتھ مل کر امیدواروں سے خود درخواستیں طلب کر رہے ہیں۔ ہم نے کہا کہ صالح نمائندہ پنچایتی سسٹم سے آئے جس جماعت یا گروہ سے بھی تعلق رکھتا ہو پھر ہم نے صالح نمائندوں کو جماعت کے دائرے میں مخصوص کر دیا۔ پہلے ہم پارٹی ٹکٹ کو لعنت کہتے تھے اب محاذ کے ساتھ شریک ہو کر "غیر صالحین" کو بھی ٹکٹ بانٹ رہے ہیں۔ ہم نوٹ پر قائد اعظم کی تصویر چھاپنے پر سخت برہم تھے۔ صدارتی انتخاب میں ہمارے کارکنوں نے ان کی بہن کی تصویریں دو چار گلی گلی فروخت کیں۔ پہلے ہم نے صدارتی سے بھی بڑھ کر امارتی تصور خلافت پیش کیا تھا، اب ہم پارلیمانی نظام جمہوریت کو اسلامی قرار دیتے ہیں۔ پہلے ہم اسمبلیوں میں اراکین کی الگ پارٹیاں بنانے کو غیر اسلامی قرار دیتے تھے بعد میں ہم نے خود اس پر عمل کیا۔ پہلے ہم مخلوط جلسوں میں شریک نہیں ہوتے تھے اب مخلوط جلسوں کی صدارت کرتے اور ان میں تقریریں کرتے ہیں۔ پہلے ہم علماء کے اتحاد کی کوشش کرتے اور موجودہ پارٹیوں کو ساتھ ملانا غلط سمجھتے تھے۔ اب علماء کے اتحاد سے بے نیاز اور سیاسی پارٹیوں کے محاذ کو مضبوط کرنا تقاضائے اسلام سمجھتے ہیں۔ پہلے ہم خواتین کو

کو ووٹ کا حق دینے میں راضی نہ تھے اب ان کی صدارت تک کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ پہلے ہم اپوا کے زبردست ناقد تھے اب ان ہی کا ایک حصہ متحدہ حزب اختلاف کی خواتین کمیٹی کی صورت میں منظم ہوا ہے تو ہمارے اکابرین کی بیگمات ان کے جلسوں سے خطاب فرماتی ہیں، پہلے ہم طلبا کو عملی سیاست میں حصہ لینے سے روکتے تھے۔ اب ان سے عملی سیاست میں شریک ہونے کی اپیلیں کرتے ہیں۔ پہلے ہم جلوسوں اور نعروں کو غیر اسلامی کہتے تھے۔ اب غلاف کعبہ تک کے جلوس نکالتے اور اپنے رہنماؤں کے لیے زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں۔ پہلے ہم ان انسانی (غیر اسلامی) قوانین پر چلنے والی عدالتوں میں مقدمات لے جانا بہت بڑا گناہ سمجھتے تھے اب ان ہی عدالتوں کو ہم عدل وانصاف کا محافظ قرار دیتے ہیں۔ پہلے ہم وکیلوں کو شیطانی برادری کا رکن سمجھتے تھے اب ان ہی کو جمہوریت کا سرپرست کہتے ہیں۔

میں یہ عرض نہیں کرنا چاہتا کہ ہماری ان باتوں میں سے کون سی بات صحیح تھی اور کون سی غلط۔ یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہے اور یقین مانئے انتہائی دکھ کے ساتھ میں نے جماعتی تاریخ کی طرف یہ اشارے کیے ہیں، عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب اتنے واضح تضادات کو وقت کی گردش کے ساتھ ساتھ ہم اسلامی اور دینی سمجھ کر چھوڑتے اور اختیار کرتے رہے ہیں تو اب ترک واختیار کے ان مظاہروں کے بعد اپنے ارکان کے سوا کون ہمارے دینی فکر پر بھروسہ کرے گا؟

غیر جمہوری نظام

۲۔ اگر ہم دین کے لیے کوئی کام نہ کر سکتے تو ہمارے لیے ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے کام کرنے کا دوسرا میدان باقی تھا۔ مگر میں نہایت افسوس کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ ہماری تنظیم کے قواعد اور اس کی موجودہ ہیئت اس کے لیے سخت غیر موزوں اور نامناسب ہے۔ ہمارے نظام میں محدود رکنیت کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس کی وجہ سے ہمارے ارکان کی تعداد غالباً ابھی تک ڈیڑھ ہزار سے متجاوز نہیں ہو سکی۔ اس میں کچھ ہر پندرھواں رکن تنخواہ دار ہمہ وقتی کارکن ہے۔ جماعت کے پورے دروبست اور قیادت پر ان ہی ہمہ وقتی اصحاب کا قبضہ ہے، یہ ٹھیک ہے کہ ان میں انتہائی مخلص لوگ شامل ہیں۔ لیکن جیسا کہ آپ کی طرف سے تیم حلقہ ہونے کی بالاصرار دعوت پر میں نے عرض کیا تھا ہمہ وقتی ہونے کے بعد تنخواہ اور حادثہ کی شرح سے کام کی پیمائش ہوتی ہے۔ اس کے لیے غریب کارکنوں

کو اپنے دفاع میں بہت کچھ کارگزاری بیان کرنا پڑتی ہے معترض ارکان کا جواب دینے کے لیے حامی ارکان ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بے لوث تنخواہ دار قیادت بھی سازشوں کا اور گروہ بندیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں معیار بدقسمتی سے یہ نہیں کہ کون اہل ہے جسے اعزازی طور پر ہی سہی جماعت کی قیادت سونپ دی جائے معیار یہ ہے کہ کون فارغ یا معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہے جسے ہمہ وقتی بنا کر قائد بنا دیا جائے۔ آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کروں کہ آج جماعت کی ہیئت حاکمہ مجلس عاملہ تک میں ایک آدھ رکن کو چھوڑ کر باقی سب حضرات یا تو تنخواہ پانے والے ہمہ وقتی رفقاء ہیں۔ ان کی سیرتیں بہت بلند سہی مگر ظاہر ہے جماعت سے معاشی وابستگی کے ہوتے پورے زور اور جرأت سے اختلاف رائے کا اظہار نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں تو یہ بات اور مشکل ہو جاتی ہے جبکہ ہمارے دستور دبمطابق قرارداد مانچسٹر گوجرانوالہ) کی رو سے وہ شخص جماعت کے کسی منصب پر فائز ہو ہی نہیں سکتا جو کبھی جماعت کی طے شدہ پالیسی سے اختلاف رائے کا اظہار کر چکا ہو (خواہ یہ اظہار اختلاف خود آپ کے سامنے ہی کیوں نہ ہو۔)

پھر رائے دہندگی کے معاملہ میں بھی ہم نے لینے اور دینے کے باٹ الگ الگ بنا رکھے ہیں۔ ہم پورے ملک میں تو بالغ رائے دہی چاہتے اور بنیادی جمہوریتوں کے نظام پر سخت سے سخت تنقید کرتے اور حقوق کے معاملہ میں درجہ بندیوں کو از روئے اسلام ظلم عظیم سمجھتے ہیں مگر خود اندرون جماعت ہمارا رویہ یہ ہے کہ ہم نے اس میں متاثر، ہمدرد، متفق اور رکن کی درجہ بندیاں قائم کر رکھی ہیں اور جماعت کے عہدہ داروں وغیرہ کے انتخاب میں ان کارکنوں کو بھی ووٹ دینے کا حق نہیں دیتے جو سالہا سال سے نہایت اخلاص اور ایثار کے ساتھ جماعت کی خدمت بجا لا رہے ہیں۔ جو اس کی مالی امداد کرتے، اس کے جلسوں میں دریاں بچھاتے۔ اس کی وجہ سے ملازمتوں سے ہاتھ دھوتے اور زمانہ بھر کی مخالفتوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ووٹ کا حق ہمارے ہاں صرف رکن کو ہے متاثر، ہمدرد کارکن اور متفق اس سے محروم ہیں۔ البتہ ارکان کے ووٹوں سے بنے ہوئے نظم کی سمع و طاعت از روئے اسلام ان کا فرض ہے۔ جماعت کی بنیادی پالیسیاں ارکان کے اجتماع کے بجائے مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ میں طے ہوتی ہیں اور اب تو ایک عرصہ سے (بالخصوص ۷۵ء میں جماعتی دستور کی ترامیم کے بعد) شوریٰ کو بھی کم ہی زحمت دی جاتی

ہے فیصلے کرنے کے لیے سارا دارومدار آپ کی کیبنٹ یعنی عاملہ پر ہے۔ جو فیصلہ یہ کردے۔ اس سے کوئی رکن اختلاف نہیں کرسکتا۔ اختلاف کرے تو جماعت اسے باہر کا راستہ دکھا دیتی ہے۔

قیادت وامارت

یہی صورت ہمارے ہاں قیادت وامارت کی ہے۔ ۱۹۴۱ء سے لے کر اب تک ہمارے ہاں کوئی ایک فرد بھی جماعتی تربیت سے ایسا تیار نہیں ہوا جو آپ کے بعد (اللہ تعالیٰ آپ کو تادیر سلامت رکھے) جماعت کی قیادت کر سکتا ہو یا جو جماعت کے اندر اور باہر اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے نمایاں اور ممتاز ہو، جس جماعت کی جمہوری اور عددی صورت حال یہ ہو جس کی قیادت اول سے آخر تک تنخواہ دار ہو جس میں اظہار رائے پر قدغن ہو جس میں مٹھی بھر لوگ ووٹ کا حق رکھتے ہوں جس میں آپ کی پیش کردہ علمی اور دینی آراء سے اختلاف کرنا جماعت کی مخالفت کرنے کے مترادف ہو اس میں ایسا آدمی کیسے داخل ہو سکتا ہے جو خود سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو ایسا شخص تفصیلات معلوم کیے بغیر شامل ہو بھی جائے تو وہ یہاں پنپ نہیں سکے گا۔ آپ کی تو پورے عالم کی وسیع سیاسیات پر نظر ہے۔ آپ سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے کہ جس جماعت میں فقط وہی لوگ چل سکتے ہوں جو آمنا وصدقنا اور احسنت و مرحبا کی صدا بلند کرنے ہی کو سعادت سمجھیں وہ جماعت کبھی ایک زندہ قوم کی راہنمائی نہیں کرسکتی۔

خدمت خلق کے کام

۳۔ تیسری صورت یہ تھی کہ ہم سیاست اور اصلاح وتزکیہ دونوں اہم کاموں سے دست کش ہو کر رفاہ عام کا منصوبہ بناتے اور خدمت خلق کے لیے کام شروع کر دیتے مگر سالہا سال کے غور وفکر، مطالعہ ومشاہدہ سے نظر یہ آتا ہے کہ ہم اس میدان کے بھی مرد نہیں ہم نے اپنے کارکنوں کو (الا ماشاء اللہ) جو ذہن دیا ہے وہ یہ ہے کہ خدمت خلق کا کام سیاسی نتائج حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور بس ہم نے ہمیشہ اپنے شفاخانوں اور خدمت خلق کے دوسرے کاموں کو جماعت کے اثر ورسوخ اور سیاسی مواقع کے حصول کے پیمانے سے ناپا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی سیاسی اور ہنگامی مقصد کے بغیر ہم خدمت خلق کا کوئی اہم منصوبہ زیر عمل نہیں لا سکتے۔

ہماری اخلاقی حالت

محترم امیر جماعت! یہ تینوں صورتیں ممکن تھیں مگر میں ان تینوں دروازہ جماعت کے لیے بند پاتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ جماعت کی اخلاقی حالت (میں اپنے کو مستثنیٰ قرار نہیں دوں گا) انتہائی حد تک زوال پذیر ہو چکی ہے اور اس پہلو میں حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں تو میری مایوسی اور شدید ہو جاتی ہے۔ میں نے اس سلسلے میں کئی مرتبہ آپ کو توجہ دلائی ہے اور مجھے یاد ہے ہر بار آپ دل گرفتہ ہو کر سر تھام کر بیٹھ جاتے تھے اور اعتراف کر لیتے تھے کہ یہ سب کچھ آپ کو معلوم ہے مگر آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ ۲۱ اکتوبر ۶۳ء کو اپنے منصب سے مستعفی ہوتے وقت میں نے تحریری طور پر عرض کیا تھا کہ

"میں عرصے سے دیکھ رہا ہوں کہ احیائے دین کا کام کرنے کے لیے جو کم سے کم ضروری صفات ہم میں ہونی چاہئیں، ہماری عملی زندگی ان کی شہادت نہیں دیتی۔ جماعت کے دو ولیت پر قابض بجاہد ہماری مشاہرے لینے والے ہمارے بعض رہنما ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے، الزامات عائد کرنے اور چغلی اور غیبت کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔ بعضوں کی بول چال تک آپس میں بند ہے۔ یہ ایک دوسرے پر جماعت کے اندر گروپ بندی تک کے الزامات لگاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ "گیلانی برادران" اور "کراچی گروپ" وغیرہ کی افسوسناک اصطلاحیں آپ کے کانوں کے لیے بھی اجنبی نہیں ہوں گی۔ اختلاف رائے کو برداشت نہیں کیا جاتا۔ 'ہاں' میں 'ہاں' ملانے والے، علم دین سے کورے اور عربی زبان سے بالکل نابلد افراد کو جماعت کی صف اول میں لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تقویٰ، علم دین اور دوسرے خصائص ہماری نگاہ میں ثانوی بنتے جا رہے ہیں۔ اب "نائب امیر" کے منصب کے لیے بھی ہماری نگاہ اٹھتی ہے تو چودھری غلام محمد صاحب جیسے رفیق پر جاتی ہے جو بیچارے علم دین تو بڑی بات ہے اردو کے چند فقرے بھی صحیح نہیں بول سکتے۔ میں چونکہ ایسے لوگوں کی سربراہی سے اختلاف کرنے کا قصوروار ہوں، ان خوبیوں کا ناقدر ہوں، چودھری صاحب کی شائع کردہ ایک کتاب "فقہ السنہ" پر بے لاگ تبصرہ کر چکا ہوں، اس لیے مجھے اس جرم کی سزا مرکزی شوریٰ کے ہر اجلاس پر بھگتنی پڑتی ہے۔ جگہ جگہ میرے بارے میں بحث کیا جاتا ہے جس کی صفائی پیش کرتے کرتے اب قریب قریب عاجز آ چکا ہوں۔ یہ صورت حال یقیناً آپ سے بھی مخفی نہیں، سخت

افسوسناک ہے۔ ہماری تنظیم میں یہ رجحانات ہمارے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں اور اس وقت ملک میں جو لوگ اگر ہمارے باہمی تعاون اور تعلقات کے مداح ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ دوسری جماعتوں کی طرح ہمارے اندرونی حالات خوش قسمتی سے اخبارات میں شائع نہیں ہوتے۔

اندریں حالات، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں جماعت میں اپنے منصب اور ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں جماعت کے جلسہ ہائے عام سے خطاب نہ کروں، ایک معمولی رکن کی حیثیت سے خدمت انجام دیتا رہوں تاکہ جماعت میں جو لوگ اپنی بیش قیمت صلاحیتیں خواہ مخواہ مجھے بدنام کرنے میں صرف کرتے رہتے ہیں، ان کے لیے تسکین دل کا سامان فراہم ہو سکے۔"

یہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۶۲ء کی تحریر ہے۔ آج تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد ان خرابیوں میں اضافہ ہی ہوا ہے کمی نہیں ہوئی تاہم ہی عدادتیں ترقی پر ہیں، لین دین کے معاملات میں کارکن تو ایک طرف رہے، ہمارے رہنما تک افسوسناک کردار رکھتے ہیں، امانتیں ضائع ہو رہی ہیں، عشر اور زکوٰۃ کی رقوم خالص سیاسی اور انتخابی مہمات اور بہ وقتی کارکنوں کی تنخواہوں پر صرف کی جا رہی ہیں۔ رائج الوقت سیاسی بحثیں اتنی مرغوب ہو چکی ہیں کہ ہماری مجالس میں خدا اور رسول کا تذکرہ بھی برائے بیعت رہ گیا ہے عبادات میں ہم سخت تساہل کا شکار ہیں اور شاید یہ بھی ہمارے لٹریچر کا غیر شعوری اثر ہے جس میں عبادات کو مقصود کے لیے ذریعہ اور وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔

میں مایوسی کا شکار ہوں

حضرت مولانا! میرا خط طویل ہو گیا۔ اس میں بعض تکلیف دہ باتیں بھی یقیناً ہوں گی اور آپ ہمیشہ مجھ پر جو شفقت فرماتے رہے ہیں اس کے پیش نظر اتنی جرأت کبھی مجھے جسارت نظر آتی ہے لیکن خدا گواہ ہے میں نے یہ سب کچھ معاندانہ جذبہ سے نہیں ایک حقیقی بہی خواہ اور ہمدرد کے جذبہ سے سپردِ قلم کیا ہے۔ جماعت سے میرا پندرہ سولہ سالہ تعلق مجبور کرتا ہے کہ میں آپ کے دوسرے مشیروں کی طرح محض "سب اچھا" کی رپورٹ آپ کے سامنے پیش نہ کروں بلکہ پوست کندہ حقائق پر آپ کو غور و فکر کرنے کی دعوت دوں۔ اب کیا ہو، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ کبھی سوچتا ہوں ہمیں کھلم کھلا اعتراف کر لینا چاہیے کہ ہم اپنی اسکیموں میں ناکام ہو گئے ہیں، لہٰذا جماعت کے کارکن اور ارکان آزاد ہیں۔ وہ جو راستہ چاہیں اختیار کریں، کبھی خیال آتا ہے ہمیں ایک بہادر انسان کی طرح مان لینا چاہیے

کہ ہمارا فکر اور عمل دونوں غلط تھے، اب ہم ارکان جماعت کا ایک کل پاکستان اجتماع بلا کر اپنے لیے از سر نو لائحہ عمل ترتیب دیں گے .... کوثر نیازی ۔ لاہور ۲۱ فروری ۱۹۵۷ء

مولانا مودودی کا جواب

"محترمی جناب کوثر صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا مفصل خط مجھے ملا، اس کو بغور پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کو اب سے بہت پہلے جماعت سے الگ ہو جانا چاہیے تھا۔ آپ نے غلطی کی کہ اتنی طویل مدت سے یہ احساسات رکھنے کے باوجود آپ جماعت کے ساتھ چلتے رہے، بہرحال اب مناسب یہی ہے کہ آپ مستعفی ہو جائیں اس کے بعد آپ کا جو طرز عمل رہے گا اس کو دیکھ کر یہ رائے قائم کی جا سکے گی کہ آپ نے اس خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ للّٰہ فی اللہ اور حقیقی بہی خواہی و ہمدردی کے جذبے سے لکھا ہے یا نہیں۔ اگر خدانخواستہ اس کے محرکات کچھ دوسرے بھی ہوئے تو آپ اطمینان رکھیں کہ اس سے پہلے جن حضرات نے بڑی خدا ترسی کے ساتھ مجھ پر کرم فرمائیاں کی ہیں ان کی باتوں پر جس طرح میں نے صبر کیا، آپ کی عنایات پر بھی کروں گا۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

یہ کتاب
اسی صورت حال کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے

ALFURQAN (Regd. N. L. 353) LUCKNOW.

Cover Printed at Allahabad Oriental Press, Lucknow.

سنہ آغاز ۱۹۳۳ء

الفرقان لکھنؤ

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسئول

محمد منظور نعمانی

فی پرچہ ساٹھ نئے پیسے

سالانہ چندہ
ہندستان سے ۶/-
پاکستان سے ۸/-
ششماہی
ہندوستان سے ۳/۵۰
پاکستان سے ۴/-

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

(فی کاپی ۸۰ پیسے)

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
.... شلنگ
ہوائی ڈاک سے
ایک پونڈ

جلد (۳۲) | بابتہ ماہ ذیقعدہ وذی الحجہ ۱۳۸۴ھ مطابق اپریل ۱۹۶۵ء | شمارہ (۱۱)

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو، تو

اس کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے براہ کرم آئندہ کیلئے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ اپریل تک آجائے ورنہ اگلا شمارہ بصیغۂ وی، پی ارسال ہوگا۔

پاکستان کے خریدار: - اپنا چندہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور صرف ایک سادہ کارڈ کے ذریعہ ہم کو اطلاع دے دیں۔ ڈاکخانہ کی رسید ہم کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

نمبر خریداری: - براہ کرم خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجیے۔

تاریخ اشاعت: - الفرقان ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۲۰ تاریخ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو فوراً مطلع کریں اس کی اطلاع ۲۰ تاریخ تک آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر و پروپرائٹر نے تنویر پریس میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہ اولیں

عتیق الرحمٰن سنبھلی

دین کے احیاء کی وہ تحریک جسے تبلیغی کام سے موسوم کیا جاتا ہے جو شخص بھی اس کی جس قدر افادیت کا قائل ہو اسی قدر رنج والم کے ساتھ اس نے یہ خبر سنی ہوگی کہ اس کام کے سربراہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اچانک وفات پائی۔ اور احیاء دین کی اس جدوجہد کی وہ مثالی شخصیت جس کے جذبۂ عمل کے مشاہدے اور جس کے انفاس گرم کی تاثیر سے کتنوں ہی کو ہمہ سوز و ہمہ گل ہو جانے کی توفیق ملی وہ آج راہِ خدا کے ان دیوانوں کے درمیان موجود نہیں ہے۔

بے شک بقا و دوام اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کی اس دنیا میں کسی کو موت سے رستگاری نہیں لیکن یہ بھی حق ہے کہ

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مولانا نے جس راہ پر دیوانہ وار چلتے ہوئے جان دی ہے یہ اسی عشق کی راہ ہے جس میں مرکر بھی آدمی مرتا نہیں۔ اس کی صرف یاد زندہ نہیں رہتی بلکہ اس یاد کے اثرات سے دلوں کو زندگی ملتی ہے اور یہی حیاتِ دوام ہے جو صرف عشاق کے نصیب میں آتی ہے۔

ہندوستان اور پاکستان میں دین سے معمولی تعلق رکھنے والا بھی کون مسلمان ہوگا جو حضرت مولانا محمد یوسف صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے نام نامی سے آشنا نہ ہو۔ آپ کے عظیم المرتبت والد ماجد حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آج سے ۴۰ برس پہلے دین کی عمومی دعوت اور اس کے احیاء کی جو عظیم مگر سادہ جدوجہد اپنی مومنانہ بصیرت اور ایک والہانہ سوز و تڑپ کے اثر سے شروع کی تھی، مولانا کے انتقال پر (یعنی اب سے ۲۰ برس قبل) اس کی گراں بار ذمہ داریاں آپ کے کاندھوں پر آئیں جبکہ آپ کا سن ۳۰ برس کے اندر تھا۔ مگر آپ کی خداداد صلاحیتوں نے ان بیس برس کے اندر اس دینی تحریک کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔ پہلے جس کام کا دائرۂ عمل غیر منقسم ہندوستان کے اندر محدود تھا اب اس کی جڑیں روئے زمین کے ہر ہر خطہ میں جا پہونچیں اور خود ہندوستان و پاکستان کے اندر وہ مناظر اس کام کی وسعت و مقبولیت کے

آج جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ جو کل صرف آرزوؤں اور تمناؤں کا درجہ رکھتے تھے ـــ غرض وہ پودا جو تھوڑی سی ہی نشوونما حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی زندگی میں پا سکا تھا مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی مجاہدانہ کوششوں اور ذہنی صلاحیتوں سے ایک قدآور درخت کی شکل میں دنیا کے سامنے ہے ـــ
أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا.

افسوس اس ہستی کا چراغ حیات ۲ر اپریل (۲۹ر ذی قعدہ) یوم جمعہ کی سہ پہر کو لاہور کی سرزمین پر آناً فاناً گل ہو گیا۔ ایک ہستی کا چراغ نہیں بجھا دین کا ایک روشن چراغ بجھ گیا۔ روشنی کا ایک بلند مینار گر گیا۔ دین کے لیے سوز و تڑپ کی ایک تصویر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی، جسے دیکھ دیکھ کر ہر دن اور ہر رات نہ معلوم کتنے دلوں میں اسی تڑپ کی بجلیاں کوندنے لگتی تھیں ـــ خدا اپنی رحمت بے پایاں کی بارشیں ان کی روح پر فرمائے اور اس عظیم خلا کو اپنی قدرت خاص سے پُر فرمائے جو ان کی اچانک وفات سے پیدا ہو گیا ہے ـــ

مولانا کا لاہور میں قیام اسی دینی دعوت کے سلسلے میں تھا جس کے لیے ان کی زندگی کا لمحہ لمحہ وقف تھا۔ شوال کے پہلے (اور فروری کے دوسرے) ہفتے میں آپ اپنے رفقاء کے ساتھ پاکستانی احباب کی دعوت پر مشرقی اور مغربی پاکستان کے ایک لمبے دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ لاہور اس سفر کی آخری منزل تھی اور ۲ر اپریل ۲۹ر ذی قعدہ ہی کی تاریخ دہلی واپس ہونے کے لیے مقرر تھی۔

ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

ـــ واپسی ٹھیک اسی تاریخ کو ہوئی مگر کس طرح کہ وہ لاہور ہی میں جمعہ و عصر کے مابین ابدی نیند سو چکے تھے اور اسی نیند کے عالم میں شب کو تین بجے ایک ہوائی جہاز انھیں دہلی کے ہوائی اڈہ پر لے کر اترا اور وہ تبلیغی مرکز (مسجد) جہاں دوسرے دن صبح کو ان کے ارشادات سننے اور ان کی زیارت کا شرف حاصل کرنے کے لیے دور دور سے سمٹ کر مشتاقوں کا مجمع ہوتا تھا اُن کے اشکبار سوگواروں سے بھری ہوئی تھی۔ اور مسجد کیا بھری ہوئی تھی دہلی بھری ہوئی تھی۔

افسوس کیسی بجلی ملت کے شکستہ ایوان پر گری اور کیسی نعمت چشم زدن میں ہاتھوں سے نکل گئی۔ ابھی مولانا کی عمر پچاس سال کی بھی نہ تھی۔ قویٰ مضبوط اور جسم تنومند تھا۔ مگر یہی واقعہ ہے کہ وہ دل سے جتنا کام لیتے تھے اور اعصاب پر جتنی شدید محنت کا بوجھ انھوں نے ڈال رکھا تھا اس میں ظاہری قوت و صحت کے باوجود دل کا جواب دے جانا کوئی بہت حیرت انگیز واقعہ نہیں۔ دن و رات میں کئی کئی بار طویل طویل خطابات، پھر ان خطابات میں ایک جذبہ و حال۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے کام کی فکر و نگہداشت، آرام سے بے نیازی، صحت و مرض کی

قدروں سے لاپرواہی، ہر لمحہ محویت کا عالم، یہ ایسی چیزیں نہیں جنھیں قلبِ اعصاب بڑی دیر تک برداشت کر سکیں۔ بے شک یہ بڑا ہی عظیم خسارہ ہے کہ دین کے احیا کی جدوجہد کے لحاظ سے ایک نادرۂ روزگار ہستی یوں کہاں کی آن میں دنیا سے اٹھ گئی۔ مگر انھوں نے ایک نمونہ دیا ہے کہ آدمی کمر باندھے تو دین کے لیے کیا کچھ کر سکتا ہے۔ ایسے زندۂ جاوید نمونے جب اٹھتے ہیں تو اپنے پیچھے میدان خالی چھوڑ کر نہیں جاتے۔ ان کی موت سے زندگی کے چشمے ابلتے ہیں، وہ ایک روح ایک کی جگہ کتنوں ہی میں سرایت کرتی ہے۔ اور جو جذبہ ایک ذات میں محدود تھا وہ موت کے بعد کتنوں ہی کی میراث بن جاتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس حادثہ کا صرف صدمہ ہی ملت کے حصے میں نہیں آئے گا بلکہ اس کا یہ صلہ بھی خدا کی رحمت سے بھرپور عطا ہو گا۔

کچھ تفصیلات

ان سطروں کی تحریر کے بعد مولانا کے سانحۂ ارتحال کی کچھ تفصیلات علم میں آئی ہیں جن کا اضافہ مناسب ہو گا۔

معلوم ہوا ہے کہ مولانا کی طبیعت کچھ پہلے سے مضمحل چل رہی تھی۔ چہارشنبہ ۱۳؍مارچ کے ایک پروگرام میں مولانا کی تقریر کے اندر نمایاں طور پر کچھ رکاوٹ اور نقاہت محسوس کی گئی اور اس کے بعد مولانا کے تمام پروگرام منسوخ کر نا طے کر دیا گیا۔ جمعرات یکم اپریل کو (غالباً بعد نماز مغرب) ایک عقدِ نکاح میں مولانا کو تقریر فرمانا تھی۔ یہ ذمہ داری بھی وقتی طور پر مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری کے سپرد کر دی گئی اور وہ اس غرض کے لیے تشریف لے گئے۔ لیکن بعض حضرات یہ دیکھ کر کہ بڑا ہی منتخب مجمع آیا ہوا ہے مولانا کی خدمت میں واپس آئے اور بالآخر شدے سے مولانا ہی کو زحمت دیدی گئی مولانا نے تقریر فرمائی جس میں وہی نقاہت و رکاوٹ تھی۔ حد یہ ہے کہ اپنی عادت کے حیرت انگیز حد تک خلاف صرف ایک منٹ کی دعا فرمائی اور اس طرح تقریب کی تکمیل کر کے فوراً واپس ہو پڑے۔ قیام گاہ چونکہ بالکل ہی متصل تھی اس لیے سواری کا سوال نہ تھا۔ مگر قیام گاہ پہنچنے کے راستے ہی میں بیہوشی طاری ہو گئی۔ پسینے سے تربتر تھے۔ ہاتھوں ہاتھ قیام گاہ پر لائے گئے۔ حکیم ڈاکٹر کی دوڑ ہوئی۔ گھنٹوں کے بعد ہوش آیا۔ عشا کی نماز ساڑھے تین بجے اشاروں سے پڑھی۔ نماز فجر بھی اشاروں ہی سے ادا ہوئی۔ رفیقوں سے معافی مانگی۔ ہر دم کے رفیق اور عزیز قریب مولانا انعام الحسن صاحب کو اپنی کتابوں کی زکوٰۃ نکال دینے کی وصیت کی۔ ڈاکٹر دہلی نے صبح کے معائنہ کے بعد کہا کہ اب خطرے سے باہر ہیں مگر شدید احتیاط کی جائے، دوسرا دورہ ہوا تو مشکل ہو جائے گی۔ دہلی کو واپسی جو اسی جمعہ کے دن طے تھی اس کا تو اب سوال ہی کیا رہا تھا مگر قضا و قدر کے نوشتوں میں واپسی کی یہ تاریخ اٹل ہو چکی تھی۔ ٹھیک جب وقت جمعہ کا خطبہ شروع ہو رہا تھا حالت متغیر ہو گئی۔ قیام گاہ چونکہ بالکل متصل ہی تھی امام نے ہلچل محسوس کر لی۔ ماشاء اللہ فقیہ تھے اور رفیق بھی۔ بحد اختصار سے خطبہ اور نماز پوری کی۔ ڈاکٹر

بلائے گئے۔ سانس اکھڑی ہوئی تھی مگر ہوش وحواس قائم تھے۔ مولانا انعام صاحب نے سانس کی طرف اشارہ کرکے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ بھی سمجھ تو چکے تھے مگر کہا شاید بلغم پھنس رہی ہے فرمایا نہیں سانس پھنس رہی ہے۔ اتنے میں ڈاکٹر آگئے۔ انھوں نے دیکھا کہ اب آکسیجن کی منزل ہے، فوراً اسپتال کا مشورہ دیا۔ مولانا نے اسپتال کی بات سنی تو فرمایا وہاں نرسیں ہوتی ہیں میں نہ جاؤں گا۔ پاکستان کے بااثر اشخاص نیازمندوں میں تھے عرض کیا حضرت ایک نرس بھی پاس نہ آپائے گی آپ اطمینان فرمائیں۔ فرمایا پھر کوئی مضائقہ نہیں، ازراہ عجلت ایک بڑی کار میں جو وہاں بہت سی موجود تھیں مولانا کو لٹایا گیا۔ لا الٰہ الا اللہ کا ورد مولانا کی زبان پر تھا۔ مولانا انعام الحسن صاحب اسی کار میں ساتھ تھے۔ باقی دوست آگے پیچھے دوسری کاروں میں۔ کچھ لوگ پہلے انتظامات کے لیے اسپتال پہونچ چکے تھے۔ راستے میں بس ایک بار دریافت فرمایا کتنی دور اور ہے۔ کہا بس پہونچ رہے ہیں۔ لیکن ابھی مشکل سے ایک ڈیڑھ منٹ کا فاصلہ اور رہا تھا کہ اس بےچین روح کو رحمت حق نے بڑھ کر اپنی آغوش میں لے لیا اور ادھر کار بھی ایک جھپاکے میں اسپتال کے اندر تھی۔ ڈاکٹروں کی ٹیم دروازہ پر موجود۔ جھٹ پٹ کار کا دروازہ کھلا۔ بتایا گیا کہ ہونی ہو چکی۔ مگر ڈاکٹروں نے اپنا آخری فرض ایک انجکشن دے کر ادا کیا کیونکہ جسم میں گرمی باقی تھی۔

یہ ہے اس داعیِ آخرت کے سفر آخرت کی مختصر روداد۔ ۳۰ ذی قعدہ مطابق ۱۳ اپریل یوم شنبہ کو ۹½ بجے صبح اپنے والد ماجد کے پہلو میں اسی مسجد کے احاطہ میں تدفین ہوئی جو آپ کا تبلیغی مستقر تھا۔

رہے نام اللہ کا

افسوس ہے کہ اس حادثہ کے وقت والد ماجد مولانا محمد منظور نعمانی اور مخدومی مولانا علی میاں مدظلہما دونوں ہی ایک ساتھ ہندوستان سے باہر ہیں۔ جبکہ مولانا مرحوم پر لکھنے کا حق انھیں کا تھا۔ کوشش ہے کہ یہ کمی آئندہ اشاعت میں پوری ہو جائے۔ اور ممکن ہو تو آئندہ کی پوری اشاعت ہی مولانا مرحوم سے متعلق ہو۔ اس سلسلے میں مولانا اور ان کی دعوت سے واقفیت رکھنے والے اہل قلم سے بالعموم گزارش ہے کہ مضامین ارسال فرمائیں۔

یہ شمارہ:— ذی قعدہ اور ذی الحجہ دونوں مہینوں کا مشترک شمارہ ہے۔ بعض نئے کاتبوں کی وجہ سے بیشتر مضامین کی کتابت زیادہ باریک ہو گئی اس بنا پر صفحات میں کچھ ناگزیر ہوئی۔ (ادارہ)

حضرت شاہ ابو سعید حسنی رائے بریلویؒ کے روابط حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور اُن کے خاندان سے

مراسلات کی روشنی میں

تحقیق و ترتیب ——— مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

اب سے پانچ سال پیشتر عالی جناب ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی مرحوم و مغفور کے زمانۂ حیات میں ان کی اجازت اور مولانا سید ابو الحسن ندوی زید مجدہم کی وساطت سے مجھے ان کے خاندانی نوادر اور مخطوطات دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی، اب اسی رمضان میں لکھنؤ گیا تو مولانا محمد میاں سلمہم اللہ صاحبزادۂ ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی مرحوم نے از راہ کرم فرمائی دوبارہ ان نوادر کے مطالعے کا موقع دیا جن کی مدد سے میں اپنے اس مقالے کو مرتب کر رہا ہوں ——— اسی ماہ رمضان میں دوسری مرتبہ حضرت مولانا نعمانی مدظلہ کے ہمراہ رائے بریلی حاضر ہونے کا اتفاق ہوا — وہاں دائرہ حضرت شاہ علم اللہ حسنی قدس سرہٗ اور اس کے آثار باقیہ نے دونوں مرتبہ میری روح کو پیام سکون اور میرے دل و دماغ کو دعوت کیف و نشاط دے کر تاریخ ماضی کا ایک زریں باب میری تصور کی آنکھوں کے سامنے کھول دیا ——— یہ حضرت شاہ علم اللہؒ کی تاریخی مسجد ہے جس میں ہزاروں اہل اللہ سر بسجود ہوئے ہیں اور علم و ذکر کے حلقے مدتوں اس میں قائم [illegible] — تقوی اور سعادت ابدی کی بنیادوں پر یہ مسجد کھڑی کی گئی ہے ——— آج بھی

اس کے در و دیوار سے دل کی آنکھوں کو خاص کیفیات محسوس ہوتے ہیں ۔ اس کی طرز تعمیر کو دیکھ کر آثار متبرکہ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ حضرت شاہ علم اللہؒ نے گریہ شب اور آہ سحر میں مشغول رہ کر اتباع سنت اور متابعت شریعت کے جذبے کے ساتھ اسی مسجد میں اپنے فیوض و برکات کو تقسیم کیا ہے۔ اُن کی باکمال اولاد اور اولاد کی اولاد نے جن میں ہر ایک آفتاب و ماہتاب اور گوہر شب چراغ تھا اس مسجد کے محراب و منبر اور سقف و بام کو اپنے اپنے زمانے میں اپنی دعا کی روشنی سے روشن اور منور رکھا ہے اور درس توحید و معرفت اور درس کتاب و سنت سے اس مسجد کی فضاؤں کو معمور کیا ہے انھیں تعلیمی و تذکیری حلقوں کی تاثیر سے حضرت سید احمد شہیدؒ جیسا مرد مجاہد اور غازی علم اللٰہی خاندان میں نمودار ہوا جس نے اسی مسجد کے صحن میں بیٹھ کر ملت اسلامیہ کی سرسبزی و شادابی کے لیے، اُمت مسلمہ کی سربلندی اور سرفرازی کے لیے ایک نقشہ بنایا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ بالاکوٹ کے میدان میں مع اپنے رفقاء کے شہید ہو کر حیات ابدی سے ہمکنار ہوا۔ اور مستقبل کے لیے ایک ایسی فضا قائم کردی کہ نعرۂ حق و صداقت گوشے گوشے میں بلند ہوتا رہے اور ایمان و یقین کے جھنڈے اونچے رہیں۔

—— یہ سَسی ندی ہے، مسجد کے جنوب میں بہ رہی ہے۔ ندیاں تو اور بھی بہت سی ہیں مگر اس میں رونق ہی کچھ اور ہے۔ سکوت شام کے وقت اس کا سکوت گوش دل کو ایک مستقل داستان سُناتا ہے، صبح کے سہانے وقت میں اس کی دل آویزی اور بڑھ جاتی ہو۔ کتنے اولیاء اللہؒ نے اپنے مبارک قدم سے اس کے کناروں کو سرفرازی بخشی ہوگی کتنے مجاہدین اور ذاکرین نے اس ندی سے وضو کیا ہوگا؟ شام و سحر میں جب چڑیاں ندی کے کنارے، مسجد کے بام و در پر اور قریب کے ہرے بھرے کھیتوں پر چہچہاتی ہیں تو ایک خاص کیفیت حاصل ہوتی ہے اور قلب و دماغ میں یاد ماضی کی لہریں اُٹھنے لگتی ہیں۔

یہ حضرت شاہ علم اللہؒ آغوش لحد میں سو رہے ہیں۔ یہ سادات قطبیہ کے چشم و چراغ ہیں۔ حضرت شاہ آدم بنوریؒ قدس سرہٗ کے خلیفہ یعنی صرف ایک واسطے سے حضرت مجدد الف ثانی نوراللہ مرقدہٗ کے فیض یافتہ ہیں۔ ان کا تقویٰ اور جذبۂ اتباع سنت۔ اللہ اکبر۔ تاریخیں اور تذکرے ان کے ذکر خیر سے لبریز ہیں۔ ان کی باکمال اولاد کی قبریں اُن کے

پہلو میں اور آس پاس ہیں۔ یہیں ہندوستان کا ایک مایۂ ناز عظیم مورخ (جس کو مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) محو آرام ہے، یہیں حکیم صاحبؒ کے والد ماجد حضرت مولانا سید فخرالدین حسنیؒ مدفون ہیں جنھوں نے مہر جہانتاب لکھ کر اپنے محقق صاحبزادے کے لیے تاریخ و تذکرہ کی شاہراہ قائم کی۔ یہیں حکیم صاحب کے تحت بجگر ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ بھی دفن ہیں جنھوں نے اپنے والد ماجد کے جواہر پاروں اور شاہکاروں کو محفوظ رکھا، شائع کرایا اور اپنے خاندان کی ایک ایک روایت کو اپنے سینے اور سفینے میں ثبت کیا، جن کے دینی کارناموں میں ایک زبردست کارنامہ یہ بھی ہے کہ اپنے برادر عزیز (مولانا علی میاں مدظلہ) کی تعلیم و تربیت کا انتظام ایک خاص نصب العین کے ماتحت کیا جس کے نتیجے میں نہ صرف ہندوستان کے تعلیمی و روحانی حلقوں اور عالم اسلامی سے ایک مفید رابطہ قائم ہوا بلکہ یورپ کے مادہ پرستانہ ایوانوں میں بھی غلغلۂ توحید اور نعرۂ صداقت بلند ہو گیا ــــــ آج اس خاندان کی روایات کہن انھیں مولانا علی میاں مدظلہ سے زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کے خاندان کو صحت و عافیت سے رکھے اور ملت بیضا کو تا دیر اُن سے مستفیض رکھے (آمین)

احاطۂ مزار حضرت شاہ علم اللہؒ سے کچھ فاصلے پر ایک عظیم شخصیت سپرد زمین ہے یہ حضرت شاہ ابوسعید حسنیؒ حضرت سید احمد شہیدؒ کے نانا ہیں۔ ان کے مزار پر ولی اللٰہی فیوض و برکات مجھ جیسے دور از کار کو بھی محسوس ہوتے ہیں۔ اس باعظمت شخصیت نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے کس قدر فیض حاصل کیا تھا اور ان کے خاندان سے کس قدر ربط و تعلق تھا اس کو تفصیل سے لکھوں تو مستقل ایک رسالہ ہو جائے مگر مجھے تو ایک مقالہ لکھنا ہے۔ آنے والا مورخ توفیق پائے گا تو ان کے مزید حالات خاندانی مخطوطات اور دستاویزوں سے لکھے گا۔ میں اس مقالے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، حضرت شاہ اہل اللہ پھلتیؒ، حضرت شاہ محمد عاشق پھلتیؒ، حضرت شاہ نور اللہ بڈھانویؒ، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے مکتوبات بنام شاہ ابوسعید رائے بریلوی کہیں کل کہیں اقتباس اور تلخیص کی شکل میں مع ترجمہ پیش کر رہا ہوں جن سے تاریخ کے طالب خصوصاً ولی اللٰہی سلسلے کی معلومات کے خواہاں کے لیے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوں گی جو کسی تاریخ اور تذکرے میں نہیں ہیں۔

خود حضرت شاہ ابوسعید کے کشوفات اور واردات جو انھوں نے اپنے پیر و مرشد اور دیگر حضرات اکابر کو لکھ کر بھیجے ہیں — اس مقالے میں شامل کروں تو میرا مقالہ شکوہ کوتاہی داماں کرنے لگے — اس لیے حضرت رائے بریلوی کی بعض تحریرات بقدر ضرورت کہیں کہیں بطور تلخیص پیش کروں گا۔ بعض اکابر نے حضرت رائے بریلوی کے صاحبزادے میاں سید ابواللیث کو بھی (جو ان مکتوبات اکابر کے جامع ہیں) گرامی نامہ بھیجا ہے اس کو بھی حسب موقع شامل مقالہ کیا جائے گا۔ آخر میں میر محمد نعمان رائے بریلوی (حضرت میر ابوسعید کے برادر عم زاد) کا ایک مفصل مکتوب بھی اس مقالے میں ترجمہ کے ساتھ شامل کیا جائے گا جس میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی وفات کے مکمل حالات ہیں۔ اور جس سے آخری وقت میں بھی حضرت شاہ صاحب کے اپنے عزیز و محبوب مرید کو یاد کرنے کا پتہ چلتا ہے یہ بھی تاریخ کی ایک نادر چیز ہے۔

اب میں حضرت شاہ ابوسعید کے مختصر حالات لکھتا ہوں۔

حضرت شاہ ابوسعید رائے بریلوی کے مختصر حالات

میر شاہ ابوسعید بن سید محمد ضیا بن سید آیت اللہ ابن شیخ الاعظم میر شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلوی رحمہم اللہ —

آپ رائے بریلی میں پیدا ہوئے، مولانا عبداللہ امیٹھوی[1] سے تحصیل علم کی، بعدہٗ اپنے چچا سید محمد صابر ابن سید آیت اللہ نقشبندی سے بیعت ہوئے (جو حضرت خواجہ محمد معصوم کے صاحبزادے خواجہ محمد صدیق کے خلیفہ تھے) ایک مدت ان کے بتائے ہوئے اشغال میں مشغول رہے اپنے والد کے خلیفہ میر محمد یونس سے بھی اپنے آبائے کرام کی روحانی نسبت حاصل کی، پھر دہلی کا سفر کیا اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے روحانی تعلق پیدا کر کے اُن سے اخذ فیض کیا۔ حضرت شاہ صاحب کے وصال کے بعد ان کے ماموں زاد بھائی اور خلیفہ حضرت شاہ محمد عاشق پھلتی کی طرف رجوع ہوئے اور ان سے مابقی سلوک طے کیا۔ حضرت شاہ محمد عاشق پھلتی نے ان کو خلافت نامہ لکھا جس میں تحریر ہے کہ "حضرت شاہ صاحب کے فیض و توجہ سے ان کو وہ احوال و آثار ظاہر ہو چکے تھے جو جمہور اہل کے نزدیک

---

[1] مولانا عبداللہ حنفی امیٹھوی علامہ نظام الدین فرنگی محلی کے شاگرد رشید تھے۔

انتہائی درجے کے ہیں۔ جب حضرت شاہ صاحبؒ کا وصال ہو گیا تو انھوں نے قصد کیا کہ نقشبندیہ قادریہ چشتیہ، وغیرہا طرق کے باقی اشغال فقیر سے حاصل کریں۔ جب میں نے ان کو اس کا شائق پایا تو ان کے مقصد کو پورا کیا اور اس راہ میں اُن کے کمال کا مشاہدہ کر کے اجازت دی جس طرح مجھے میرے شیخ معظم (حضرت شاہ ولی اللہ محدثؒ) نیز میرے والد ماجد شیخ عبید اللہ پھلتیؒ نے مجھے اجازت دی تھی ــــ میں نے ان کو اس کی بھی اجازت دی کہ بعد مطالعہ و مراجعت شروح، تفسیر و حدیث اور فقہ و تصوف وغیرہ کا درس بھی دیں" ــــ علاوہ کمالِ علم ظاہر و باطن حضرت میر ابو سعیدؒ جلیل الوقار، کریم النفس اور مہمان نواز بزرگ تھے۔ ۲۰ ربیع الاول ۱۱۸۱ھ کو مکۂ معظمہ پہونچے اور حج سے فارغ ہو کر مدینۂ منورہ حاضر ہوئے وہاں چھ ماہ اقامت کی اور شیخ ابو الحسن سندھی الصغیرؒ کے حلقۂ درس میں مصابیح کی سماعت کی، ایک مرتبہ مواجہہ شریف میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار ہوا، آپ کے خلیفہ شیخ امین الدین کاکوروی نے اپنے رسالے میں لکھا ہے کہ خود حضرت شاہ ابو سعیدؒ فرماتے تھے کہ میں نے مدینۂ منورہ میں اپنی ان ظاہری آنکھوں سے آقائے نامدار حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی [illegible]ت کی ہے ــــ بعدہٗ مکۂ معظمہ واپس ہوئے اور وہاں جزریہ قاری میر داد انصاریؒ سے پڑھی۔ تجوید کے یہی اُستاد معرفت و سلوک میں آپ کے خلیفہ ہوئے ۱۱۸۲ھ میں ہندوستان آئے اور مدراس میں داخل ہوئے وہاں ایک زمانے تک مقبولِ خواص و عوام ہو کر رہے۔ اس علاقے کے غرباء و رؤسا نے آپ سے آخرت کا نفع حاصل کیا۔ ۹ رمضان ۱۱۹۳ھ کو وفات پائی۔ رائے بریلی تکیۂ حضرت شاہ علم اللہؒ میں دفن ہوئے۔ آپ کے حسب ذیل ممتاز اور جلیل القدر خلفاء تھے۔

(۱) میر عبد السلام بدخشانیؒ (۲) قاری شیخ میر داد انصاری مکیؒ (۳) مولانا جمال الدین بن محمد صدیق قطبیؒ (۴) مولانا عبد اللہ آفندیؒ (۵) شیخ عبد اللطیف حسینی مصریؒ (۶) حاجی امین الدین کاکورویؒ (۷) شاہ عبد القادر خالص پوریؒ۔

(ماخوذ از نزہتہ الخواطر جلد (۶) و سیرت سید احمد شہید جلد اول طبع چہارم و مجموعۂ نوادر قلمی نزد مولانا محمد میاں صاحب حسنی مدیر البعث لکھنؤ)

مکتوبات[1] حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بنام حضرت شاہ ابو سعید حسنی رائے بریلوی

(۱) حقائق و معارف آگاہ سیادت و نجابت دستگاہ، سلالۃ الاکابر میر سید ابو سعید سلمہم اللہ تعالیٰ از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد از سلام محبت التزام مطالعہ نمایند ____ الحمد للہ رب العلمین علی عافیۃ الطرفین نامہ مشکیں شمامہ متضمن بعض مشاہدات متعلقہ بلطیفۂ خفیہ و اخفیٰ رسید در برابر آں شکر الٰہی بجا آوردہ شد، ایں راہ کہ میروند ہماطریق مستقیم است کہ اکابر اہل عرفان رفتہ اند ہیچ دغدغہ خاطر ایشاں را مشوش نسازد...... بالجملہ آنچہ خدائے تعالیٰ عطا کردہ است نعمتے است عظیمہ بر آں از جان و دل شکر کنندہ و متوقع مزید باشد و آنچہ از نور محمدی علی صاحبہ الصلوات والتسلیمات دیدہ اند نمائش است از نسبت اویسیہ، سالق آرزوئے ایں نسبت داشتند، الحمد للہ کہ حاصل شد ___ برائے خفقان خواندن یا حمید معید خواہد بود۔ متفرق در اوقات صلوٰۃ خمس و خواہ یک جا ہزار بار ___ درباب وجہ معاش و آسودگی ایشاں....متفکر نباشد ہرچہ میگذرد ہمہ حکمت حق است و نافع است بنسبت شما۔ ہرچند نافعیت معلوم نباشد من بعد روشن خواہد شد والسلام۔ فقیر زادہا و والدہ ایشاں سلام می رسانند و متوقع دعائے خیر ہستند کہ دعائے مومن برائے برادر غائب مستجاب است ___

ترجمہ ___ حقائق و معارف آگاہ سیادت و نجابت دستگاہ .....میر سید ابو سعید سلمہم اللہ تعالیٰ۔

فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام محبت التزام مطالعہ فرمائیں ___ طرفین کی خیر و

---

[1] مجموعۂ نوادر میں حضرت شاہ صاحب کے گیارہ مکتوبات ہیں۔ میں نے اس مقالے میں دس مکتوبات کل یا تلخیص کے طور پر لیے ہیں ___ ان مکتوبات کو مولانا سید ابو القاسم بن سید محمد عبد العزیز ہنسوی نے ۱۳۰۲ھ میں مکتوب المعارف کے نام سے مع عرضداشت شاہ ابو سعید مطبع مطلع الانوار سہارن پور میں شائع کرا دیا تھا۔ یہ رسالہ اب کمیاب ہے ___ بقیہ دوسرے اکابر کے مکتوبات جو اگلی قسط میں آئیں گے غیر مطبوعہ ہیں۔

عافیت پر اللہ رب العٰلمین کی حمد ہے ۔ آپ کا نامۂ شکیں شمامہ جو بعض مشاہدات متعلقہ بلطیفۂ خفی اخفیٰ کے بارے میں لکھا تھا ۔ پہونچا ۔ شکرِ الٰہی ادا کیا گیا ۔ یہ راستہ جس پر آپ چل رہے ہیں وہ صراطِ مستقیم ہے جس پر اکابر اہلِ عرفان گامزن ہوئے ہیں ۔ کسی قسم کا دغدغہ آپ کے دل میں نہیں ہونا چاہیے ..... حاصلِ کلام یہ ہے کہ جو کچھ خداوند کریم نے آپ کو عطا فرمایا ہے وہ ایک عظیم نعمت ہے اس کے حصول پر جان و دل سے شکر کریں اور مزید نعمت کی توقع رکھیں ۔ اور نورِ محمدی صلی اللہ علیٰ صاحبہ وسلم جو دیکھا ہے وہ بھی نسبتِ اویسیہ کا ظہور ہے ۔ پہلے سے اس نسبت کی آرزو رکھتے تھے الحمد للہ کہ اب حاصل ہو گئی ۔ دل کی گھبراہٹ کے دفع کرنے لیے یا حمید پڑھنا مفید ہوگا ۔ ایک ہزار مرتبہ ۔ خواہ متفرق پانچوں نمازوں کے اوقات میں خواہ ایک جگہ ۔ وجہ معاش اور آسودگی کے بارے میں متفکر نہ ہوں جو صورت گزر رہی ہے وہ عین حکمتِ الٰہی ہے اور آپ کے حق میں نافع ہے ۔ اگرچہ بالفعل اس کی نافعیت معلوم نہ ہو بالآخر اس کا نافع ہونا واضح ہو جائے گا والسلام ۔ فقیر کے لڑکے اور اُن کی والدہ سلام کہتے ہیں اور دعائے خیر کے متوقع ہیں اس لیے کہ برادرِ غائب کے حق میں دعائے مومن مستجاب ہوتی ہے ۔

(۲) سیادت و نقابت پناہ حقائق و معارف آگاہ سلالۃ الاکابر میر سید ابو سعید سلمہ اللہ تعالےٰ از فقیر ولی اللہ عفی عنہ ، بعد سلام محبت التیام مطالعہ نمائند ۔ الحمد للہ علی العافیۃ والمسئول من فضلہ ان یدیم العافیۃ لنا ولکم ۔ بعد انتظار بسیار رقیمۂ کریمہ متضمن بعض معارف و بعض اسولہ ضرور یہ رسید چوں مشعر بعافیت و سلامت ایشاں بود مع اولاد و اتباع موجب کمال سرور و باعث حمدِ الٰہی شد ..... والسلام از اندرونِ خانہ سلام خوانند ہمیشہ خیریت ایشاں مسئول از جناب رب العزت می باشد انچہ از ایذائے برادراں نوشتہ بودند معلوم شد خود سعی در ایذائے کسے نکنند خدائے تعالیٰ نصرت خواہد داد میر محمد معین و میر محمد امام و میاں یونس سلام خوانند برخوردار سعادت اطوار میر ابو اللیث دعوات خوانند فرزند ابو القاسم مبارک باد خدائے تعالیٰ بعافیت دارد ۔ از عبد العزیز سلام نیاز قبول باد ۔

ترجمہ — سیادت پناہ حقائق و معارف آگاہ ..... میر ابوسعید سلمہ اللہ تعالیٰ۔
فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام محبت التیام مطالعہ کریں — خیر و عافیت پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس کے فضل سے اس بات کا خواہاں ہوں کہ وہ مدام ہماری اور آپ کی عافیت کو برقرار رکھے۔ بڑے انتظار کے بعد آپ کا مکتوب جو کہ بعض معارف اور بعض معاملات ضروریہ پر مشتمل تھا — پہونچا۔ چونکہ وہ مکتوب آپ کی اور آپ کی اولاد و متعلقین کی کی عافیت و سلامتی سے آگاہ کرنے والا تھا اس لیے موجب کمال مسرت اور باعث حمد الٰہی ہوا ..... والسلام اندرون خانہ سے (اہلیہ کی طرف سے) سلام — آپ کی خیریت ہمیشہ جناب رب العزت سے چاہی جاتی ہے — جو کچھ بھائیوں کی ایذا دہی کے متعلق لکھا تھا معلوم ہوگیا خود کسی کو ایذا دینے کی سعی نہ کریں اللہ تعالیٰ مدد فرمائے گا — میر محمد معین، میر محمد امام اور میاں محمد یونس کو سلام۔ برخوردار سعادت اطوار میر ابواللیث کو دعائیں۔ فرزند ابوالقاسم مبارک ہو — اللہ تعالیٰ عافیت سے رکھے — عبدالعزیز کا سلام نیاز قبول ہو —

(۳) سیادت و نقابت مآب حقائق و معارف آگاہ۔ سلالۃ الکرام میر ابوسعید سلمہ اللہ تعالیٰ۔

از فقیر ولی اللہ عفی عنہ۔ بعد سلام مطالعہ نمائند — الحمد للہ علی العافیۃ والمسئول من اللہ عزوجل ان یدیم العافیۃ لنا ولکم — اجمالاً ہمیشہ در حق ایشاں طلب کردہ می آید کہ خدائے عزوجل ہم در ظاہر نعمت خود دہد و بغیر خود محتاج نگذارد و ہم در باطن اعانت و انعام فرماید تا بر جادۂ آبائے کرام مستقر ماندہ بہمہ جہت مرضی باشند انّہ قریبٌ مجیب — اگر نجیب الدولہ در باب آں عزیز القدر خط موثر نویسد و چوبدار ہمراہ کند می باید باں طرف رفت متوکلاً علی اللہ و معتمداً علیہ — و ایں را یکے از انواع تیسیر الٰہی دانند و اگر گرمی ہوا ہم رسد اینجا تشریف آوردہ رمضان اینجا گزرانیدہ بآہستگی قصد وطن مالوف نمائند۔ خدائے عزوجل ہر چہ اوفق و اصلح باشد بہار را بظہور آرد والسلام۔ شاہ عزیز القدر ابراہیم خلیل خاں از فقیر سلام و دعوات خوانند و شیخ غیاث الدین سادات دیگر

ہرکہ آنجا باشد سلام محبت مشام مطالعہ نمائند ___ محمد فصیح بخدمت ایشاں می رسد درکار معہود ہر قدر ممکن باشد توجہ خواہند نمود احتیاج ابرام نیست والسلام ___

ترجمہ ___ سیادت مآب حقائق و معارف آگاہ ..... میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام مطالعہ کریں ___ عافیت پر اللہ کا شکر ہے ___ اللہ تعالیٰ سے درخواست ہے کہ وہ ہمیں اور آپ کو ہمیشہ عافیت سے رکھے ___ اجمالی طور پر ہمیشہ آپ کے حق میں یہ دعا کی جاتی ہے کہ خدائے عزوجل آپ کو ظاہر میں بھی اپنی نعمت سے نوازے اور اپنے علاوہ کسی کا محتاج نہ کرے اور باطن میں بھی اعانت و انعام فرمائے تاکہ اپنے آبائے کرام کے راستے پر قائم رہ کر ہر طریقہ سے پسندیدہ ثابت ہوں۔ انہ قریب مجیب ___ اگر نجیب الدولہ[1] العزیز کے سلسلے میں کوئی مؤثر خط لکھ دیں اور چوبدار ہمراہ کر دیں تو اللہ پر توکل اور بھروسہ کرکے اپنے وطن کی طرف جائیں ___ اور اس سہولت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کی آسانی تصور کریں ___ اگر گرمی شوق بھسم پہونچے تو پھر رمضان ہمارے یہاں آکر گزاریں اور اطمینان سے قصد وطن بالوقت کریں۔ جو صورت بھی بہتر ہو اللہ تعالیٰ اس کو ظہور میں لائے۔ والسلام خان عزیز القدر ابراہیم خلیل خاں کو فقیر کی طرف سے سلام و دعا اور شیخ غیاث الدین اور دیگر سادات جو وہاں دلشکر میں ہوں ___ سلام محبت مشام مطالعہ کریں ___ محمد فصیح آپ کی خدمت میں پہونچ رہے ہیں کار معہود میں جس قدر ممکن ہو توجہ کریں۔ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔

---

[1] میر ابوسعیدؒ جائدادی معاملات میں اپنے وطن سے نجیب الدولہ کے پاس تشریف لے گئے تھے غالباً نجیب الدولہ کا لشکر اس زمانے میں ضلع میرٹھ میں کہیں تھا۔ اس وقت مرہٹوں کا شدید ہنگامہ تھا، وطن کی واپسی میں خطرات پیش آ رہیں۔ بنا بریں حضرت مآب ابراہیم خلیل خاں کی ہمراہی میں میر ابوسعیدؒ اپنے وطن پہونچے جیسا کہ ایک دوسرے مکتوب سے معلوم ہو رہا ہے۔ ابراہیم خلیل خاں کے حالات کی جستجو ہے۔ ابھی تک ان کے حالات معلوم نہ ہو سکے مکتوب گرامی پر تاریخ بھی نہیں ہے جس سے معلوم ہو جاتا کہ یہ کس زمانے کا واقعہ ہے ___ اندازہ یہ ہے کہ جنگ پانی پت سے کچھ پیشتر کی بات ہے ___

(۴) ایک مکتوب گرامی کے آخر میں ارقام فرماتے ہیں۔

.... بدست ہر آئندہ ایں صوب احوال ظاہر و باطن خود می نوشتہ باشند کہ خاطر نگراں جانب ایشاں می ماند	اس طرف کے ہر آنے والے کے ہاتھ اپنے احوال ظاہر و باطن لکھ کر بھیجتے رہیں اس لیے کہ دل آپ کی طرف نگراں رہتا ہے۔

(۵) حقائق و معارف آگاہ سیادت و نجابت دستگاہ میر ابوسعید سلمہ اللہ تعالیٰ۔

از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد سلام مطالعہ نمائند ـــــ الحمد للہ علی العافیہ ـــــ نامہ مشکیں شمامہ رسید احوال باطن کہ نوشتہ بودند ہمہ بہر نہج صواب است آنچہ سابق واضح شدہ بود از لطیفہ سر بود و آنچہ الحال واضح شد از لطیفہ خفیہ است ہمہ خیر است و ہمہ بر نہج صواب است ان شاء اللہ تعالیٰ بتفصیل و با توفیق با شریعت نوشتہ شود الحال وقت تنگ است دو ٹوکری بہنگی انبہ رسید و یکے بخانہ میاں اہل اللہ رسید جزاکم اللہ خیر الجزاء از اندرون خانہ و از فقیر زادہا و از خواجہ محمد امین و جمیع اہل مدرسہ سلام خوانند ـــ

ترجمہ ـــــ حقائق و معارف آگاہ سیادت و نجابت دستگاہ میر ابوسعید سلمہ اللہ تعالیٰ

فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام مطالعہ کریں ـ الحمد للہ عافیت سے ہوں ـ نامۂ مشکیں شمامہ پہونچا ـ احوال باطن جو لکھے تھے سب صحیح ہیں جو حال پہلے ظاہر ہوا تھا لطیفۂ سر سے تھا اور جو کچھ اب واضح ہوا ہے لطیفۂ خفیہ سے ہے سب بہتر ہے اور درست ہے اگر اللہ نے چاہا تو شریعت کے تطابق کے ساتھ تفصیل سے (آئندہ) لکھا جائے گا اب وقت تنگ ہے ـــ آموں کی دو بہنگیاں مجھ کو ملیں اور ایک میاں اہل اللہ کے گھر پہونچی ـ اللہ تعالیٰ آپ کو بہترین جزا عطا فرمائے ـــ اندرون خانہ فقیر زادوں نیز خواجہ محمد امین اور تمام اہل مدرسہ کی طرف سے سلام پہونچے ـــ

(۶) ..... بالجملہ بخاطر جمع دریں سیر و سلوک سعی نمائند ہمہ موافق سیر صوفیہ است و ہم مطابق شریعت دریں سخن آخر	الغرض دلجمعی کے ساتھ سیر و سلوک میں سعی کریں یہ سب کچھ سیر صوفیہ کے موافق ہے اور مطابق شریعت بھی ہے۔

طول و عرضے دارد کہ بالفعل در نوشتن نمی آید۔

مطابقت شریعت والی بات ذرا طول و عرض رکھتی ہے فی الحال نہیں لکھی جا رہی ہے۔

(۷) حقائق و معارف آگاہ، سیادت و نقابت دستگاہ میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ۔

از فقیر ولی اللہ عفی عنہ، بعد سلام محبت التزام مطالعہ نمایند۔ الحمد للہ علی العافیۃ۔ ازاں باز کہ بسبب ہجوم مرہٹہ انتقال از میرٹھ نمودہ ہمراہ رفعت مآب ابراہیم خلیل خاں آں گزار گنگا رفتند ــــ مدتے گزشتہ کہ احوال خیریت مآل آں عزیز القدر نشنیدہ بودم ــ الحمد للہ نامۂ نامی ایشاں رسید۔ موجب تسکین خاطر فاطر گشت مبدء را اجمال و عالم را تفصیل نوشتہ بودند و از مشاہدۂ ایں صورت انس و سرور و از استتار آں تفرقہ و حزن می خیزد ایں ہمہ موافق قاعدہ است ازینکہ سلف رفتہ اند ہمیں راہ راست ہیچ تردد بخاطر [illegible] ..... یک تعویذ نواسیر برائے بستن ..... و دیگر برائے شستہ خوردن فرستادہ شد ــــ رفعت مآب ابراہیم خلیل خاں سلام شوق مطالعہ نمایند۔

ترجمہ ــــ حقائق و معارف آگاہ ...... میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ ــ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعد سلام محبت التزام مطالعہ کریں ــــ الحمد للہ عافیت سے ہوں ــ اس کے بعد کہ ہجوم فوج مرہٹہ کی وجہ سے میرٹھ سے منتقل ہو کر ہمراہ ابراہیم خلیل خاں گنگا پار کر کے (وطن) گئے تھے ــــ ایک مدت گذر گئی تھی کہ آپ کے احوال خیریت مآل سے آگاہ نہ تھا ــ الحمد للہ نامۂ نامی پہونچا۔ موجب تسکین خاطر ہوا ــ مبدء کو اجمال اور کائنات عالم کو تفصیل ۔ تحریر کیا تھا۔ اس صورت کے مشاہدے سے انس و سرور اور غائب ہو جانے سے تفرقہ و حزن ہوتا ہے اور یہ سب موافق قاعدہ ہے۔ سلف جس راستے پر چلے ہیں وہ یہی راستہ ہے، کوئی فکر دل میں نہ رکھیں ...... ایک تعویذ نواسیر کا باندھنے کے لیے اور دوسرا دھو کر پینے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ رفعت مآب ابراہیم خاں سلام شوق مطالعہ کریں۔

(۸) ...... فقیر بجہت جمعیت ظاہر و باطن ایشان و برائے صحت مزاج

فقیر آپ کی جمعیت ظاہر و باطن نیز صحت مزاج اور کشادگی رزق کے لیے دعا گو ہے

وکشائش رزق، دائمی است خدائے عزوجل بفضل وکرم خود قبول فرماید۔	خدائے عزوجل اپنے فضل وکرم سے یہ دعا قبول فرمائے۔

(۹) حقائق ومعارف آگاہ، خلاصۂ دودمان سیادت وسلالۂ خاندان سعادت میر ابوسعید سلمہ اللہ از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد سلام مطالعہ نمایند ۔ الحمد للہ علی العافیۃ۔ رقیمۂ کریمہ مشتمل بر احوال خوانده شد بود تدرسید و بسعی ایشان صد روپیہ بدست آمد خدائے تعالیٰ برکات بسیار نصیب ایشاں کناد ۔ اگر سفارش نواب وجوہ دار بدست آمدہ است البتہ بوطن باید رفت امید کہ ز لطف حضرت لطیف آنست کہ وجہے برائے جمعیت ظاہر پیدا شود انہ قریبٌ مجیب...... والسلام والاکرام عزیز القدر ابراہیم خلیل خاں سلام اشتیاق تمام مطالعہ نمایند ۔ فقیر محمد امین سلام شوق میرساند۔

ترجمہ ۔ حقائق ومعارف آگاہ..... میر ابوسعید سلمہ اللہ ۔ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام مطالعہ کریں ۔ الحمد للہ خیر و عافیت سے ہوں۔ مکتوب گرامی جو احوال پر مشتمل تھا پہونچا ۔ اور آپ کی سعی سے سو روپے حاصل ہوئے اللہ تعالیٰ برکات بسیار آپ کو نصیب فرمائے ۔ اگر نجیب الدولہ کی سفارش اور جوہدار مل گیا تو اپنے وطن رائے بریلی جانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم سے امید یہ ہے کہ کوئی صورت جمعیت ظاہر کی پیدا ہوگی انہ قریبٌ مجیب ۔..... والسلام والاکرام۔ عزیز القدر ابراہیم خلیل خاں سلام شوق مطالعہ کریں۔ (کاتب تحریر ہذا) فقیر محمد امین سلام شوق پیش کرتا ہے ۔

(۱۰) حقائق ومعارف آگاہ خلاصۂ دودمان نجابت میر ابوسعید بعافیت دارین باشند۔ از فقیر ولی اللہ عفی عنہ بعد سلام واضح باد ۔ از زبان بعض مردم شنیدہ شد کہ آں سیادت پناہ را عارضہ گسل (یا کسل؟) پیش آمدہ بود خاطر متردد است احوال خیریت مآل خود بنویسند ۔ و از سرانجام کار کہ بسبب آں در لشکر توقف شد نیز بنگارند ۔ در رجب صد روپیہ از طرف نواب رسیدہ بود آدم را فرستادہ شد اگر صد یا زیادہ کم بدست آید دریں ایام مطلوب است ۔ خان والاشان ابراہیم خلیل خاں سلام مطالعہ نمایند ۔ میر عتیق اللہ ومیاں غیاث الدین وجمیع یاران آنجا سلام مطالعہ نمایند ۔

ترجمہ ــــ حقائق و معارف آگاہ..... میر ابو سعید عافیت سے رہیں۔ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے بعدِ سلام واضح ہو کہ ــــ بعض لوگوں کی زبانی سنا گیا کہ آپ کچھ علیل ہو گئے تھے ــ دل پریشان ہے ۔ اپنے احوالِ خیریت مآل لکھیں ــ اور جس کام کی وجہ سے لشکر میں ٹھہرنا پڑا ہے وہ انجام پایا یا نہیں اس کو بھی لکھیں ۔ ماہِ رجب میں نواب (نجیب الدولہ) کی طرف سے سَو روپے پہونچے تھے ــ اگر سَو روپے یا اس سے کم و بیش حاصل ہو جائیں تو اس وقت مطلوب ہیں ۔ آدمی کو بھیجا گیا ہے ــــ خان والاشان ابراہیم خلیل خاں سلام مطالعہ کریں ــــ میر عتیق اللہ، میاں غیاث الدین اور اس جگہ کے تمام دوستوں کو سلام ـــ

(باقی)

سیّدنا ابوسفیانؓ

مولانا سراج الحق مچھلی شہری

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحیح حدیث مروی ہے "اَللّٰہَ اَللّٰہَ فِی اَصْحَابِی" الخ
ترجمہ پوری حدیث کا یہ ہے۔ ڈرا اللہ تعالیٰ کی ناخوشی سے ڈرتے رہنا ڈرتے رہنا میرے
صحابہ کے بارے میں۔ دیکھو میرے بعد کہیں ان کو (کسی معاملہ میں) نشانۂ ملامت نہ بنانے لگنا۔ جو
شخص میرے صحابہ سے محبت کرے گا وہ میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت رکھے گا (وجعلنا اللہ
منھم) اور جو شخص میرے صحابہ سے بغض ونفرت کرے گا تو وہ میرے بغض کی وجہ سے اُن سے بغض رکھے گا
(داعاذنا اللہ منھم) اور جس نے ان کو ایذا دی اس نے گویا خود مجھے ایذا دی (اعاذنا اللہ منہ) ترمذی مختصراً۔
اس ارشاد نبوی میں تین لفظ خاص طور سے قابل توجہ ہیں۔ ایک[1] مِنْ بَعْدِی (میرے بعد) دوسرے[2]
بِحُبِّی اَحَبَّھُمْ (جس نے ان سے محبت کی اس نے میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت کی) اور
تیسرے[3] مَنْ آذَاھُمْ فَقَدْ آذَانِی (جس نے ان کو ایذا دی اس نے یقیناً مجھے ایذا دی)
چونکہ حضورؐ دیکھ رہے تھے کہ ارشادات قرآنی کے اولین مخاطب۔ میری رسالت و نبوت کے پہلے
ہد اور گواہ۔ قرآن پاک کے پہلے حامل اور حامل یہی صحابہ ہیں اس لئے حضورؐ کو منظور یہ ہوا (اور خدا کی مرضی
ی یہی تھی) کہ صحابہ کی عزت اور حرمت زیادہ سے زیادہ محفوظ اور ان کی عظمت اُمت میں بیش از بیش ملحوظ
ہے کیونکہ خود میری عزت اور حرمت اور میری عظمت بھی اسی طرح محفوظ رہ سکتی ہے۔ حضورؐ کو گوارا نہ ہوا کہ میری
ت پر یا قرآن پاک پر کوئی حرف آئے اس لئے حضورؐ نے اس کا دروازہ بند کرنے کے لئے چاہا کہ صحابہ کی محترم
یتوں پر کسی قسم کا حرف نہ آنے پائے، پس آپ نے نہایت تاکید واہتمام سے مختلف عنوانات سے ان کے
م کا حکم فرمایا، چنانچہ یہیں اگرچہ بجملہ خبریہ ارشاد ہو رہا ہے لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ مقصود انشاء حکم ہے

ان سے محبت کا۔

(۱) مِنْ بَعْدِی فرما کر تو حضورؐ اپنا یہ اندیشہ ظاہر فرمانا چاہتے ہیں کہ میری حیات اور موجودگی میں تو میرا لحاظ کر کے مخلص اور منافق دونوں ہی قسم کے لوگ صحابہؓ کے ساتھ بھی ضرور محبت کریں گے اور اگر بالفرض کسی کو ان سے کوئی رنجش ہوگی تو میں اسکی اصلاح کر دیا کروں گا اور پھر صلح و اصلاح کے بعد میری موجودگی کا لحاظ کر کے سب باہم محبت ہی سے رہیں گے۔ غرض میری موجودگی میں سب کو تعلق در اصل مجھ سے ہوگا اس لئے اس کا تو وہم و گمان بھی نہیں کہ میری حیات میں کوئی شخص میرے صحابہؓ کے اکرام کے خلاف کوئی قول۔ کوئی فعل۔ کوئی عمل کرے گا۔ البتہ جب میں دنیا سے چلا جاؤں گا تب اس کا اندیشہ زیادہ ہے کہ ان کے احترام میں کمی ہونے لگے کیونکہ میری ذات کے موجود نہ رہ جانے کی وجہ سے سب کی توجہ براہ راست ایک دوسرے کی طرف ہونے لگے گی اور شیرازہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے سب منتشر اوراق کی مانند ہو جائیں گے، اس لئے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو یا دوسرے لوگ ان کو عام انسان سمجھ کر ان سے عام لوگوں کی طرح معاملہ کرنے لگیں اور ان کی صحابیت فراموش ہونے لگے، اس لئے آپ نے متنبہ فرما دیا کہ میرے بعد بھی ان کا پورا اکرام کرتے رہنا۔ بقول شاعر:

ع: جب میں جاؤں کہ مرے بعد مرا دھیان رہے

(۲) فَبِحُبِّی اَحَبَّهُمْ فرما کر حضورؐ نے در اصل صحابہؓ کا درجہ بیان فرمایا ہے یعنی اس ارشاد کے دو پہلو ہیں ایک کی تعبیر تو بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ "بِسَبَبِ حُبِّیْ اِیَّاهُمْ اَحَبَّهُمْ" یعنی اس مسلمان نے ان سے اس وجہ سے محبت کی ہے کہ خود مجھے ان صحابہؓ سے محبت ہے"۔ اس میں محبت کی نسبت فاعلی حضورؐ کی جانب اور نسبت مفعولی صحابہ کی جانب ہے اور حضورؐ صحابہؓ کو اپنا محبوب فرما رہے ہیں، اس صورت میں یہ مضمون گویا اَکْرِمُوْا اَصْحَابِیْ کا ہم مضمون ہوگا۔ اور دوسرے پہلو کی تعبیر ان الفاظ میں سمجھئے کہ "بِسَبَبِ حُبِّهٖ اِیَّایَ اَحَبَّهُمْ" یعنی اس مسلمان نے میرے صحابہؓ سے اس وجہ سے محبت کی کہ اُسے مجھ سے محبت ہے تو میرے دوستوں اور ساتھیوں سے بھی محبت ہونی ہی چاہیئے بقول شاعر ع: وَمَا حُبُّ الدِّیَارِ شَغَفْنَ قَلْبِیْ وَلٰکِنْ حُبُّ مَنْ سَکَنَ الدِّیَارَا — وَمِنْ مَذْهَبِیْ حُبُّ الدِّیَارِ لِاَهْلِهَا۔ اس صورت میں حضورؐ گویا اپنی محبت کا واسطہ دے کر ان سے محبت رکھنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔

(۳) تیسرا لفظ "مَنْ آذَاهُمْ فَقَدْ آذَانِیْ" فرما کر حضورؐ نے انتہائی اختصاص کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ سیدہ زہرا بتول رضی اللہ عنہا جو آپ کی جگر گوشہ تھیں جن سے حضورؐ کو طبعی محبت بھی بغایت تھی ایک موقع پر حضورؐ نے ان کی ایذا کو اپنی ایذا کے برابر فرمایا تھا "یُرِیْبُنِیْ مَا اَرَابَهَا وَیُؤْذِیْنِیْ مَا آذَاهَا" (بخاری)

اسی طرح آپ نے سیدنا جابر کے بارہ میں فرمایا "مَنْ آذَىٰ عَمِّي فَقَدْ آذَانِي" "جس نے میرے چچا کو ستایا اس نے گویا مجھے ستایا۔ غرض جس طرح حضور نے خون قرابت اور عزیزداری رکھنے والوں کی ایذا کو اپنی ایذا کے برابر بتایا ٹھیک اسی طرح دینی رشتے (شرع و دین) سے یگانگی رکھنے والے صحابہؓ کی ایذا کو بھی حضورؐ نے اپنی ایذا کے برابر بتایا ہے۔

غرض اس اہتمام سے اکرام صحابہؓ کی ترغیب دینے سے میری سمجھ میں دو باتیں یہ آئی ہیں کہ:۔

(۱) اس اہتمام سے حضورؐ کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ سے جو محبت رکھی جائے وہ ایسی ہونی چاہیئے جس میں حضور کی محبت واسطہ بنے اور حضورؐ کی محبت اس کی محرک و باعث ہو یعنی صحابیت کو اولیت تقدم کا درجہ دیا جائے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کسی نے کسی ایسے صحابی سے محبت رکھی جن میں خود ذاتی خوبی، شخصی کمال، نسبی کرامت، شجاعت، غنا، تقدم اسلام، ہجرت، شرکت جہاد وغیرہ کی حیثیتیں خود ہی محبت کا تقاضا کرتی ہوں مثلاً سیدنا ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، علی مرتضیٰ، ابن عوف، حمزہ، حسین وغیرہم رضی اللہ عنہم تو یہ محبت تو طبعی اور ذوقی محبت بھی ہوگی گو یہ بھی فی نفسہ ایک فضیلت ہے مگر یہ محبت اس حکم نبوی کے امتثال و تعمیل میں نہ ہوگی بلکہ ایسی طبعی اور ذوقی محبت کا تو حکم دینے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ پس اس حکم کا اقتضا سوا اس کے کچھ نہیں کہ حضورؐ کا منشا یہ ہے کہ بالفرض میرے کسی صحابی سے قبل اسلام یا بعد اسلام کوئی واقعہ ایسا ہو بھی گیا ہو جس سے کسی مسلمان کے قلب میں ان کے لئے کوئی کشش معلوم ہوتی ہو تب بھی اسے میرا خیال کر کے ان سے محبت کرنی چاہیئے کیونکہ انھوں نے میری دعوت پر کفر چھوڑ کر اسلام اختیار کیا۔ نور محبت اور نور ایمان کے ساتھ مجھے دیکھا اور میرے ساتھ رنج و راحت۔ میدان جہاد اور اطاعت میں شریک رہے۔ طبیعت کے موافق اور مخالف احکام کو مانا اور مرتے دم تک اسلام پر قائم رہے۔ دنیا پر آخرت کو ترجیح دی، دکھ جھیلے، جانیں دیں، نور اسلام پھیلایا۔ پس اس حکم محبت کا تو منشا پورا ہوتا ہے، در اصل سیدنا ابوسفیان، معاویہ۔ عمرو بن العاص۔ مغیرہ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ محبت کرنے سے۔ اگر کسی مسلمان نے ابوبکر و علی رضی اللہ عنہم سے محبت کی تو کون سا بڑا کمال کیا کیونکہ ان کے جوہر ذاتی اور کمالات دینی و روحانی۔ فضائل اخلاقی و عقلی کی طرف اپنے تو اپنے غیر و بیگانہ بھی جھکتے ہیں اور ان کی تحسین کرنے پر مجبور رہیں البتہ وہ صحابہؓ جن کو دشمنان دین نے طرح طرح سے ایسا بدنام کر دیا کہ آج بہت سے مسلمانوں کے دلوں سے ان حضرات کی عظمت و حرمت کو آپ کم پائیں گے۔

ان مظلوم صحابہؓ سے صرف رسول کی محبت کے ناطے محبت کرنا البتہ اس مبارک ارشاد کے تقاضوں کا کرنا ہے۔

کسی صحابی کے قبل از اسلام حالات کے بیان کرنے میں بھی لازم ہے کہ ان کی صحابیت اور عظمت برابر ملحوظ رکھی جائے۔ یعنی اگر کسی مورخ کو آج ضرورت ہے کہ وہ مثلاً حضرت ابوسفیان کے قبل اسلام واقعات لکھے تو ان الفاظ میں کہ۔ "اس نے ایسا کیا۔ اس نے کہا۔ وہ یہ چاہتا تھا" ہرگز ہرگز نہ لکھنا چاہیئے۔ اس کو دوسری مثال سے سمجھئے اگر مان لیجئے آج کوئی مسلمان مکہ کے ابوجہل کا تذکرہ کرنا چاہتا ہے تو غور فرمایئے کہ وہ ابوجہل جیسے کسی کافر کے لئے کیا طرز اختیار کریگا؟ وہ یہی تو لکھے گا کہ "ابوجہل یہ چاہتا تھا ابولہب وہاں گیا" تو آخر آپ نے ایک صحابی کا حال لکھنے میں ارشاد رسول کا کیا حق ادا کیا۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے ذکر قبل اسلام میں (جبکہ حضرت ابوسفیان کا خاتمہ یقینی طور پر اسلام پر ہوا) اور ابوجہل کے حالات میں (جب کہ اس کا خاتمہ یقینی طور کفر پر ہوا) آپ نے کیا فرق رکھا؟ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ۔

اس ضروری تمہید کے بعد اب ہم سیدنا ابوسفیان کے حالات درج کرتے ہیں کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے بہت سے مسلمان بھائی ان کی عزت و عظمت سے تو درکنار خود ان کے حالات سے بھی واقف نہ ہوں گے۔

آپ کا نام و نسب حضرت ابوسفیانؓ کا نام نامی صخر تھا اور کنیت ابوسفیان تھی۔ مگر صخر زیادہ مشہور نہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے نام کے سلسلہ میں بعض اہل علم نے بھی غلطی کی ہے ان کے والد کا نام حرب اور دادا کا نام امیہ تھا جو حوصلہ مند اور بہادر ہونے کے باعث اموی خاندان کے مورث اعلیٰ بنے آپ کا نسب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب میں چوتھی پشت میں جا کر مل جاتا ہے، نسب نامہ یوں ہے:

۱۔ حضرت سرور کائنات فخر موجودات سیدنا و مولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ابن خواجہ عبداللہ ابن خواجہ شیبہ (عبدالمطلب) ابن خواجہ ہاشم، ابن عبد مناف

۲۔ سیدنا ابوسفیان صخر رضی اللہ عنہ، ابن حرب، ابن امیہ، ابن عبد شمس، ابن عبد مناف

مکہ میں قریش کے چند گھرانے بہت ممتاز اور مشہور تھے۔ ان میں سب سے زیادہ شریف و مشہور معزز اور مقدس گھرانہ بنو ہاشم کا تھا کیونکہ اہل مکہ بلکہ پورے عرب کی دینی سیادت یعنی کعبہ کی حجابت و سقایت

انھیں میں تھی، ان کے بعد دوسرا معزز گھرانہ بنو امیہ کا تھا کیونکہ اہل مکہ کی دنیاوی سیادت اور قومی قیادت انھیں میں تھی۔ بنو اسد اور بنو مخزوم وغیرہ گھرانے ان کے بعد تھے، کیونکہ ان گھرانوں میں جو قومی مناصب تھے مثل سفارت، خطابت وغیرہ ان کی اہمیت قوم میں اتنی زیادہ نہ تھی۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ میں قرابتیں بھی باہم زیادہ ہوتی تھیں۔

حضرت ابوسفیان صخر اسی بنو امیہ کے گھرانہ سے تھے۔ آپ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں دس برس بڑے تھے، یہ قریش کے معززین واشراف میں تھے۔ بہادر، سمجھ دار، خوش خلق تھے قوم نے ان کو بالاتفاق سپہ سالار لشکر بنا دیا۔ حضورؐ میں اور ان میں اعلان نبوت سے قبل باہم ویسی ہی محبت تھی جیسی عموماً قریبی رشتہ داروں میں ہوا کرتی ہے۔ اعلان نبوت کے بعد بھی ان کو اور ان کے صاحبزادے سیدنا معاویہؓ کو حضورؐ سے یا اسلام سے ذاتی طور پر کوئی غصہ، کد، کدورت وغیرہ نہ تھی، پوری قوم کو جو مخالفت حضورؐ سے تھی اس میں تو حضرت صخر نے ضرور قوم کا ساتھ دیا اور من حیث القوم حضرتؐ سے جنگ بھی کی مگر اس وقت بھی انھوں نے کوئی ایذا حضورؐ کو نہیں پہنچائی۔ اوقات جنگ میں ضرور حضورؐ سے لڑے مگر جیسی ایذا و شرارت کی حرکات ابوجہل مخزومی اور ابولہب ہاشمی سے ظاہر ہوئیں کہ کبھی حضورؐ کی پشت مبارک پر بحالت سجدہ، اونٹ کی بجوبجھ رکھ دی، کبھی حضورؐ کی چادر گھسیٹی جس کے نشانات گردن مبارک پر ظاہر ہوئے، کبھی حضورؐ کے راستہ میں کانٹے بچھائے، ایسی کوئی حرکت کسی تاریخ میں حضرت صخر کی طرف سے منقول نہیں۔ حضرت صخر رضی اللہ عنہ کی یہ خصوصیت تھی کہ اوقات جنگ کے علاوہ برابر حضورؐ کے ساتھ میل ملاپ۔ رشتہ داری کے لحاظ، آدمیت کے پاس اور شرف آبا کے موافق برتاؤ کرتے تھے۔

قبل اسلام اگرچہ کچھ بد دینوں نے آپ کو بہت بدنام کیا ہے اور آپ کے متعلق کچھ غلط باتیں دینی اور تاریخی کتابوں میں شامل کر دی ہیں، مگر آپ کے حسب ذیل واقعات اب بھی کتب سیر ورجال میں ملتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کے حسن تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔

(۱) اعلان نبوت کے بعد جب کفار مکہ حضورؐ کو بہت ستانے لگتے تو آپ ان کے ہجوم اور شر سے بچنے کے لئے بعض وقت گھبرا کر انھیں حضرت صخر کے مکان میں چلے جاتے، وہ مکہ کے معززین میں ہونے کے علاوہ فوج کے سپہ سالار بھی تھے، اہل مکہ پر ان کا ایک رعب تھا۔ ان کے گھر میں داخل ہوتے ہی شر پسندوں کی ایذا سے حضورؐ کو امن مل جاتا۔ گو وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے مگر شرف نسب اور کرم طبع کی یہ خصلت ان میں

یہ بڑا اہم تھی کہ اگر عام دشمن بھی کسی پریشانی میں کسی وقت ہمارے گھر آکر پناہ لینا چاہے تو اس کو امن و راحت دی جائے اور اس کے ساتھ نیک سلوک کیا جائے۔ اُسے خطرہ سے بچایا جائے اس وقت اُسے ستانے کو شرافت کے خلاف جانتے۔ یہ تو عام دشمن کے ساتھ برتاؤ ہوتا اور حضورؐ جیسے عزیز قریب (گو مسلک میں مخالف) کیساتھ بھی ایسا ہی برتاؤ ان کا تھا بلکہ ان کے گھر میں حضورؐ کے پناہ لینے کے وقت ان کے پورے گھرانے ہی کا برتاؤ صلہ رحمی کا تھا۔ چونکہ حضرت صخرؓ نے حضورؐ کے ساتھ خوش خلقی اور صلہ رحمی اس وقت کی جب کہ میں حضورؐ پریشان تھے، اسی لئے حضورؐ نے بھی آٹھ دس برس بعد موقع ملنے پر ان کی اس نیکی کی قدردانی کی اور فتح مکہ کے وقت یہ اعلان فرما دیا کہ جو ابوسفیان کے گھر پناہ لے لے گا اُسے بھی امان ملے گی (مفصل قصہ آگے آرہا ہے)
(اصابہ ذکر صخر)

(۲) حضورؐ نے مدینہ کے قیام کے زمانہ میں حضرت عمرو بن امیہ ضمری کے ذریعہ کچھ عجوہ کھجور حضرت صخر کے پاس ہدیۃً بھیجی تو انھوں نے بھی جواب میں کوئی چیز (جس کو حدیث میں ادم کہا گیا ہے) حضورؐ کے پاس ہدیۃً بھیجی بلکہ ایک روایت یہ ہے کہ حضورؐ ہی نے فرمائش کرکے ان سے ادم منگوائی تھی (منتقیٰ از حافظ ذہبی، حاشیہ ص۲۵۳)

(۳) حضورؐ نے مدینہ میں سُنا کہ مکہ میں قحط اور تنگی ہے تو حضورؐ نے کئی سو دینار کسی کے ذریعہ حضرت صخر کے پاس بھیجے کہ یہ رقم مکہ کے اہل حاجت میں تقسیم کردیں۔ حضرت صخر ابوسفیان نے رقم لے تو لی مگر ہنس کر کہ اچھا اب یہ محمد ہمارے نوجوانوں کو شاید خریدنا چاہتے ہیں (حضورؐ نے یہ رقم ابوسفیان ہی کے پاس بھیجی تو اس سے خاص تعلق اور خصوصی قرابت ظاہر ہوتی ہے)

(۴) سنہ ھ میں حضورؐ نے حضرت ابوسفیان صخرؓ سے (یا تو بذریعہ قاصد مکہ میں کہلایا۔ یا شاید کسی سفر میں صخر خود مدینہ گئے ہوں جب خود) کہا کہ تمھاری لڑکی ام حبیبہ رملہ بیوہ ہوگئی ہیں۔ میں اُن سے نکاح کرنا چاہتا ہوں تم بھی اجازت دیدو تو بہتر ہے انھوں نے اجازت دیدی چونکہ سیدہ رملہ اس وقت حبش میں تھیں۔ حضورؐ نے حبش کے نواب نجاشی کے پاس جو مسلمان ہوگئے تھے انھیں صحابی عمرو بن امیہ ضمری کے ذریعہ کہلایا کہ میں تم کو اپنا وکیل بناتا ہوں کہ تم رملہ بنت ابی سفیان کی عدت گزرنے کے بعد ان سے میرے نکاح کا پیام دو، اگر وہ راضی ہوں تو تم وہیں ان سے میرا عقد نکاح کردو۔ نجاشی نے بی بی رملہ کی عدت گزرتے ہی ایک کنیز سیدہ رملہ کے پاس بھیجی اور حضورؐ کا پیام نکاح ان کو دیا۔ وہ پہلے ہی خواب دیکھ چکی تھیں کہ کوئی شخص ان کو "ام المومنین" کہہ کر پکارا ہے، اب نجاشی کی کنیز کی زبان سے یہ پیام سُن کر سمجھ گئیں کہ خواب کی تعبیر یہی ہے۔ انھوں نے قبول کرلیا تو کنیز نے دوسری

ت یہ کہی کہ تم بھی کسی کو اپنی طرف سے اپنے نکاح کا وکیل بنا دو جو تمہارا نکاح حضورؐ کے ساتھ کر دیں انھوں نے خالد بن سعید جو حبشہ کو اپنا وکیل بنا دیا۔ نجاشی نے محفل نکاح ترتیب دی اور حضورؐ کے چچیرے بھائی جعفر بن ابی طالب سے جو حبش میں ہجرت کر کے مقیم تھے کہا کہ خطبۂ نکاح تم پڑھو، چنانچہ حضرت جعفرؓ نے خطبہ پڑھ کر نجاشی وکیل آنحضرتؐ اور حضرت سعید وکیل سیدہ رملہ کی موجودگی میں عقدِ نکاح باندھ دیا۔ نجاشی نے حضورؐ کا وکیل اور نائب بن کر سیدہ رملہ کا مہر چار سو اشرفی خود تجویز کیا اور اُسی مجلس میں حضورؐ کی طرف سے خود ادا بھی کر دیا۔

اس نکاح کی خوشی میں سیدہ رملہ نے چاندی کے دو کنگن نجاشی کی اُس کنیز کو دے ڈالے۔ اس کے بعد حضورؐ نے ایک دوسرے صحابی حضرت شرجیل بن حسنہ کو بھیجا کہ ام المومنین رملہ رضی اللہ عنہا کو حبشہ سے مدینہ لے آئیں۔ حضرت ابوسفیان صخر کو جب نکاح کی اطلاع ملی تو انھوں نے حضورؐ کی شاد تحسین ہی کی۔ (منتخب طبع مصر، ص۲۵۱ حاشیہ)

(فائدہ) اوّل چونکہ حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو حضورؐ نے کئی بار کئی موقعوں پر حضرت ابوسفیان صخر کے پاس مختلف کاموں سے بھیجا تو کچھ بددین جو بنوامیہ کی اور ابوسفیان کی بدگوئی کرنا چاہتے ہیں اور اسی بدگوئی کی نیت سے امیر حمزہ کی جھوٹی کہانیوں میں ان کو انھوں نے معاذ اللہ عیار، مکار، لالچی وغیرہ لکھا ہے یہ صریح مخالفت ہے حکم لَا تَتَّخِذُوهُمْ غَرَضًا کی۔

دوم ۔ مہر عورت کا حق ہے اور لڑکی والے ہی اسے مقرر کرتے ہیں۔ سیدہ رملہ کا مہر بھی حضرت خالد نے کچھ کہا ہو گا مگر حضورؐ کے اس نکاح میں نجاشی نے جو نائب بن کر چار سو اشرفی مہر مقرر کیا، اسکی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ مرد کو حق ہے کہ مقررہ مہر سے بڑھا کر اپنی خوشی سے زیادہ رقم ادا کر دے۔ نجاشی چونکہ نواب تھے اس لئے انھوں نے نیابت میں خود اپنی ریاست کی بھی رعایت کی اور رئیسوں کا سا مہر خوشی بڑھا کر ادا کیا۔ آیت قرآنی وَلَا تَنسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ میں اس حُسنِ خلق کی تعلیم ہے۔

(۵) ان کا اسلام لانا (جس کا مفصل بیان آگے آ رہا ہے) بھی حضورؐ ہی کی ایک دعا کی برکت سے تھا۔ امام سیوطی لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ حضورؐ کی بعثت کے اوائل میں ایک دن ابوجہل نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ایک تھپڑ مار دیا تھا، انھوں نے اس کی شکایت جا کر حضورؐ سے کی، آپ نے فرمایا بیٹی جاؤ اور ابوسفیان سے اس کا تذکرہ کرو۔ انھوں نے جا کر ابوسفیان سے کہا۔ انھوں نے سیدہ فاطمہؓ کا ہاتھ پکڑا (کیونکہ بہت چھوٹی تھیں) اور

نے کر وہاں پہنچے جہاں ابوجہل بیٹھا تھا اور کہا کہ بیٹی تم بھی اس کے منہ پر تھپڑ مارو، جیسے اس نے تمہیں مارا تھا (اور اگر یہ کچھ بولے گا تو میں اس سے نپٹ لوں گا) انھوں نے ابوجہل کو تھپڑ مارا۔ اس کے بعد انھوں نے آکر یہ سارا واقعہ حضورؐ سے بیان کیا تو آپ نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور دعا کی "اللّٰھم لا تنسھا لابی سفیان" (اے میرے اللہ! ابوسفیان کے اس نیک سلوک کو بھولے گا نہیں) ابوسفیانؓ کا ایمان لانا حضور کی دُعا ہی کی وجہ سے تھا۔

(دیکھو سیرت نبویہ سید احمد زینی دحلان برحاشیہ سیرۃ حلبیہ، جلد ۲، ص ٣٠٦ طبع مصر)

(۶) صلح حدیبیہ کے بعد (سنہ ۶ھ میں) بصریٰ کے سردار کے پاس حضورؐ نے اسلام کا دعوت نامہ بھیجا جو ہرقل شاہ روم کے نام تھا اُس نے وہ فرمان نبوی ہرقل شاہ روم کی خدمت میں پیش کیا اس نے جب فرمان پڑھا تو اہل دربار سے اہل عرب کے متعلق دریافت کرایا تو معلوم ہوا کہ مکہ کے قریشیوں کا ایک قافلہ تجارت کے لئے آیا ہوا ہے، اُس نے ان لوگوں کو بلایا اور پوچھا کہ عرب کے ان رسول کا سب سے قریبی رشتہ دار تم میں سے کون ہے، ابوسفیان صخر بولے کہ میں ان کا چچیرا بھائی ہوں، اس کے بعد اُس نے اُن سے چند سوالات کیے اور جوابات پانے کے بعد ہرقل نے اپنے سوالات کی حکمت بتائی اور کہا کہ "جو باتیں تم نے بتائی ہیں اگر وہ سب سچ ہیں تو ان کا قبضہ ایک نہ ایک دن اس جگہ تک ہو کر رہے گا جہاں یہ میرے دونوں قدم ہیں۔" یہ سُننا تھا کہ دربار کے لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا (ان کو محسوس یہ ہوا کہ شاید ہرقل بھی مسلمان ہو گیا یا ہونے والا ہے) تو ہرقل نے ان مکہ والوں کو دربار سے رخصت کر دیا۔ جب ابوسفیان وہاں سے باہر آئے تو انھوں نے ساتھیوں سے کہا۔ خود ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:-

"لقد أمر أمرُ ابن ابی کبشۃ انہ	ابن ابی کبشہ (شوہر بی بی حلیمہ) کے بیٹے
یخافہ ملک بنی الاصفر فما	(حضورؐ) کا معاملہ اب اس حد تک پہنچ گیا کہ رومی
زلت موقنًا انہ سیظھر حتی	گوروں کا بادشاہ ہرقل بھی ان سے ڈرنے لگا!
ادخل اللہ علیَّ الاسلام "	بس اُسی دن سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ غلبہ ان کا

ہو کر رہے گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اسلام داخل فرما دیا۔ (بخاری باب بدء الوحی)

یعنی مجھے ان کے غلبہ کا یقین ہو گیا اور اسی یقین کا نتیجہ تھا کہ میں اسلام لایا۔ دعائے نبوی کے بعد ان کا:

یقین ان کے اسلام لانے کی طرف پہلا قدم تھا۔

ان کا اسلام لانا حضورؐ نے جب ۸ھ میں مکہ پر چڑھائی کی تو مکہ کے قریب پہنچ کر ایک مقام مرّالظہران پر رات گزارنے کے لئے پڑاؤ کیا۔ ابوسفیان کو مکہ میں اسکی اطلاع ملی تو وہ ایک ساتھیوں کے ساتھ جاسوسی کے لئے اسلامی فوج میں چھپے چھپے پہنچے۔ فوج کی شان دیکھ کر سناٹے میں آگئے۔ دور تک دس ہزار مجاہدوں کا لشکر اترا پڑا تھا۔ ہر قبیلہ کے خیمے الگ، ہر پلٹن اور قبیلہ کا جھنڈا الگ، لوگ ہر طرف پھیلے ہوئے، ذکر نماز، تلاوت میں یا کھانے پینے کی ضرورتوں یا فوجی تیاریوں میں مشغول نظر آئے۔ جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں۔ ابوسفیان ابھی اس منظر کے دیکھنے اور تعجب کرنے ہی میں لگے تھے کہ بعض مجاہدین نے ان کو پہچان لیا۔ ان سے تو وہ کچھ نہیں بولے، دوڑتے ہوئے سیدھے حضورؐ کے پاس پہنچے کہ حضورؐ سے اجازت مل جائے تو ان کو یہیں ٹھکانے لگا دیں۔ اُدھر قدرت کا انتظام سنئے اسی وقت ان کو حضرت عباسؓ نے بھی دیکھ لیا ابوسفیانؓ اور حضرت عباسؓ دونوں میں بہت دوستی تھی، حضرت عباسؓ خچر پر سوار تھے۔ تیزی سے ان کے پاس آئے اور ان کو اپنے پیچھے خچر پر بٹھا کر تیزی سے حضورؐ کے خیمہ کی طرف دوڑے، انھیں خطرہ ہوا کہ کہیں کوئی مسلمان غصہ میں آکر ان کو قتل نہ کردے یا کوئی دوسرا حضورؐ کے پاس مجھ سے قبل نہ پہنچ جائے۔ خیمہ کے پاس پہنچ کر ان کو باہر چھوڑا، خود اندر گئے تو دیکھا ایک دوسرے صحابی عمرؓ پہلے سے پہنچکر حضورؐ سے ابوسفیان کی جاسوسی کا ذکر کرکے ان کے قتل کی اجازت مانگ ہی رہے تھے کہ حضرت عباسؓ نے جلدی سے عرض کیا "یا رسول اللہ میں نے ان کو اپنی پناہ میں لیا ہے اور انھیں اپنے ساتھ لایا ہوں، باہر کھڑے ہیں اجازت ہو تو بلاؤں"۔ فرمایا بلاؤ۔ جب وہ آئے تو آپ نے اُن سے فرمایا:

> "ابوسفیان! کیا تم ابھی تک نہیں سمجھ سکے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسری ذات اس قابل ہے ہی نہیں کہ انسان (اشرف المخلوقات ہوکر) اسکی غلامی یا اُسے سجدہ کرے"؟

یہ سن کر ابوسفیان صخر بولے "واقعی آپ بڑے حلیم اور نیک ہیں (کہ مجھے آپ نے سزا دینے کی بجائے تبلیغ و نصیحت فرمائی)، واقعی اگر کوئی ذات قابل پرستش ہوتی تو اس وقت میری مدد کرتی (مطلب یہ ہوا کہ خدا کے سوا کوئی ذات معبود بننے کے قابل نہیں) جب حضورؐ نے اُن سے یہ اقرار توحید سُن لیا (جو اسلام کی طرف ان کا دوسرا قدم تھا) تو فرمایا:-

> "اور کیا ابھی اس کا وقت نہیں آیا کہ تم مجھے حق تعالیٰ کا رسول مانو"؟

حضرت ابوسفیان نے جواب میں پھر کہا:

"واقعی آپ بڑے حلیم ہیں۔ مگر آپ پر میرے ماں باپ قربان! ابھی اس معاملہ (رسالت) میں میرے دل میں کچھ شک سا باقی ہے"۔

یہ سیدنا ابوسفیان کی انتہائی دیانت اور سچائی تھی کہ جو بات دل میں تھی اُسے صاف کہہ دیا۔ بہرحال یہ سُن کر حضور سمجھ گئے، ابھی میری اطاعت سے اور تسلیم رسالت سے ان کو انکار ہے۔ سپہ سالار اور سردار قریش ہونے کا غرور اور جاہلیت کا نخوت اور عار ابھی مزاج میں ہے۔ حضور خاموش ہو رہے۔ اس موقع پر حضرت عباسؓ نے آگے بڑھ کر عرض کیا کہ:

"حضورؐ! ابوسفیان ایک جاہ طلب آدمی ہیں ان کے ساتھ کچھ رعایت ہی کی جائے تو مناسب ہے"۔

حضورؐ نے وہیں مرّ الظہران میں یہ اعلان فرما دیا کہ:

"کل جو شخص مسجد حرام میں پناہ لے گا۔ یا جو ابوسفیانؓ کے گھر میں پناہ لے گا۔ یا جو ہتھیار ڈال دے گا۔ یا جو اپنے گھر میں گھس کر اپنا دروازہ بند کر لے گا اور ہم سے نہ لڑے گا۔ ان سب کو امان ہے"۔

یہ فرما کر آپ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا ان کو اس طرح واپس لے جاؤ کہ یہ مسلمانوں کی فوج کی پوری شان دیکھتے ہوئے جائیں، تو حضرت عباسؓ اسی طرح پوری فوج کی سیر کراتے ہوئے ان کو مکہ کے قریب پہنچا کر واپس چلے گئے اور حضرت ابوسفیان رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سطوت ظاہری اور رفعت اخلاقی کی حیرت افزا یادیں لئے ہوئے اپنے گھر پہنچے وہ اگرچہ اسلام نہیں لے آئے تھے مگر مائل بہ اسلام ضرور ہو چلے تھے (ایک روایت تو مرّ الظہران کے روداد کی یہ تھی لیکن اس روداد کی ایک دوسری روایت یہ بھی ہے کہ) جب مرّ الظہران میں ابوسفیان صخر نے فوج کے مجاہدین کی شان دیکھی، پھر حضور کے سامنے پہنچے تو یہ دیکھا کہ سب مجاہدین حضورؐ کے ایسے عاشق ہیں کہ حضورؐ کے قریب پہنچنے کے لئے ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ اس وقت حضور کا درجہ دیکھ کر ان کے دل میں کچھ حسد سا پیدا ہوا اور دل میں ارادہ کرنے لگے کہ "اچھا تو میں بھی ان کے مقابلہ کے لئے ایک بڑی فوج جمع کراؤں گا" بس ادھر ان کے دل میں اس خیال کا آنا تھا کہ حضورؐ نے اُن کے سینہ پر ہاتھ مار کر فرمایا "اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ

تم کو بہت ذلیل کر دیں گے"۔ حضرت ابوسفیانؓ یہ معجزہ دیکھ کر کہ حضورؐ کو خطرۂ قلبی کی اطلاع ہوگئی چونکہ بے پڑنے، ادھر حضرت رسالت پناہ کا دست رحمت جو (حضرت عمرؓ کے واقعہ کی طرح) ان کے سینہ مس ہوگیا تو یکایک حسد کا وہ شیطانی جذبہ دل سے دور ہوگیا اور آپ کے منہ سے بیساختہ استغفر اللہ واتوب الیہ نکل گیا اور کہنے لگے "خدا کی قسم میں نے یہ بات کسی کے سامنے اب تک نہیں کہی تھی بس اسی وقت یہ خیال دل میں آیا تھا کہ آپ کو خدا نے اس سے مطلع فرمایا، اس معجزہ پر مجھے آپ کے رسول برحق ہونے کا بھی پورا یقین ہوگیا"۔ یہ اسلام کی طرف آپ کا چوتھا قدم تھا مگر ابھی کچھ کسر باقی تھی۔ اپنی سپہ سالاری کا ایک آخری غرور پھر آپ کے دل میں گزرا کہ "نہ جانے یہ محمدؐ کس وجہ سے ہم پر غالب آ رہے ہیں"۔ ان کے دل میں یہ خطرہ گزرا ہی تھا کہ حضورؐ نے فرمایا "خدائے واحد کی مدد سے غالب ہوں"۔ یہ سن کر ان کے دل و دماغ سے تمام شکوک و شبہات دور ہو گئے اور سپہ سالاری اور سیادت کا غرور جو قلب کا زنگ ہمیشہ کے لئے کافور ہوگیا اور آپ وہیں مرالظہران ہی میں فتح مکہ سے قبل کی رات ہی میں سچے دل سے پکار اٹھے کہ:

"اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" صلی اللہ علی نبینا وسلم (یہ دونوں روایتیں اصابہ میں ہیں)

(**فائدہ**) چونکہ سیدنا ابوسفیانؓ کی زندگی اسی سیادت و سپہ سالاری میں گزری تھی بلکہ انکی کئی پشتیں اسی سیادت و سرداری کی حالت اور اسی غرور میں گزری تھیں اسلئے سولہ برس تک حضورؐ سے برسرپیکار رہے اور اسی وجہ سے آخری موقع پر بھی حسد اور مقابلہ کے خیالات ان کے دل میں آرہے تھے مگر اس رات میں انکی سعادت ازلی اور دولت کبری (اسلام) کا وقت آگیا تھا اسلئے یہ حالات پیش آئے اور جیسے ہی حضورؐ کا کیمیا اثر دست مبارک ان کے قلب اور سینہ سے مس ہوا سارا زنگ دور ہوگیا، وہ اب تک منصب رسالت کی رفعت و عظمت سے واقف نہیں تھے نہ وہ حضورؐ کی صحبت میں رہے تھے اس شب کو ان کو خلاق نبوی کی بلندیوں کا بھی علم ہوا اور اپنے متعلق حضورؐ کے دو معجزے بھی دیکھے تو سچے دل سے اسلام لے آئے۔

بعد اسلام | بہرحال ۸ھ میں فتح مکہ سے ایک رات قبل مقام مرالظہران میں آپ بہ ہمراہ سالار ایمان لائے اور آپ کا ایمان اچھا اور سچا ثابت ہوا چنانچہ آپ کے کارنامے اسلام میں دیکھیں۔

(۱) حضورؐ نے مشرکین کی ایک مشہور دیوی منات کو گرانے اور توڑنے کا کام انہیں کے سپرد فرمایا۔ آپ کی بستی میں

گئے اور آپ نے اسے توڑ کر برباد کر دیا، کسی کو ان کے سامنے آنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ بُت توڑنے کا کام حضورؐ نے بہت ہی خاص خاص صحابہؓ سے لیا ہے ان میں حضرت ابوسفیانؓ بھی ہیں (فائدہ) کفر و شرک سے انسان کی عقل ماری جاتی ہے۔ کفارِ عرب کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خدا بغیر بیوی کے کیونکر ہو سکتا ہے اسلئے انھوں نے اللّٰہ کے لفظ میں تائے تانیث لگا کر اللات ایک دیوی اور نعوذ باللہ اللہ کی بیوی تجویز کی، اسی طرح منان کے لفظ میں ت لگا کر دوسری دیوی منات تجویز کی اور عزیز کے لفظ میں ت لگا کر تیسری دیوی عزّیٰ بنا لی نعوذ باللہ۔

(۲) غزوۂ حنین میں حضرت صخرؓ نے حضورؐ کے ہمرکاب ہو کر جہاد کیا۔ اس جنگ میں حضورؐ نے آپ کی دلیری جانبازی سے خوش ہو کر ان کو مالِ غنیمت میں سے سو اونٹ اور چالیس اوقیہ سونا عطا فرمایا۔

(۳) فتح طائف میں بھی آپ نے حضورؐ کے ہمرکاب ہو کر جہاد کیا کہ اچانک ایک تیر آپ کی ایک آنکھ میں آکر لگا اور آپ کی آنکھ جاتی رہی۔ حضورؐ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا "ابوسفیان! کہو تو میں دعا کر دوں اور تمہاری آنکھ اچھی ہو جائے لیکن اگر تم پسند کرو اور صبر کرو تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض تم کو جنت دیں گے"۔ آپ نے زبانِ رسولؐ سے جنت کی بشارت جو سنی تو تکلیف کا احساس اسکے سامنے جاتا ہی رہا اور آپ نے عرض کیا۔ "میں جنت چاہتا ہوں" آپ نے سوچا ہوگا کہ اگر حضورؐ کو دعا کرنا پسند ہوتا تو از خود دعا فرما دیتے مجھ سے نہ پوچھتے مگر جب مجھ سے پوچھ رہے ہیں تو یقیناً حضورؐ کو پسند یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں آنکھ جانے پر صبر کر لوں اور اسی میں میرے لئے خدا کی طرف سے مصلحت، خیریت اور رحمت معلوم ہوتی ہے۔

(۴) آپ عہدِ فاروقی میں ۱۳ھ میں جنگ یرموک میں اپنے بڑے بیٹے یزید کی ماتحتی میں جہاد کر رہے تھے جنگ سخت تھی، اسلامی فوج کچھ شکست ہو چلی تھی کہ یکایک ایک آواز خارا شگاف فضا میں گونجی، "اے نصرتِ خداوندی جلد آ" وہ آواز انھیں کی تھی جس سے مجاہدین کے دل از سرِ نو گرم ہو گئے، غرض آپ اسی طرح خدا کو یاد کرتے ہوئے دلیری سے لڑ رہے تھے کہ یکایک کسی شقی نے آپ کی اچھی آنکھ پر ایک پتھر مارا اور راہِ خدا میں آپ کی دوسری آنکھ بھی جاتی رہی ــــ رضی اللّٰہ عنہ وارضاہ۔

(۵) ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضورؐ نے آپ کو نجران کا گورنر بھی بنا دیا تھا۔ یہ روایت اگرچہ سند کے لحاظ سے ضعیف ہے لیکن یہ بات قرینِ قیاس ہے کیونکہ حضرت ابوسفیانؓ حکومت کی خاص صلاحیتیں رکھتے تھے بلکہ بنو امیہ کے افراد عام طور سے اس صلاحیت میں ممتاز ہوتے تھے، اسی لئے اکثر ان کو آپ حکومتی ذمہ داریاں سپرد کرتے تھے اور اسی سنت کی پیروی میں حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ نے بھی ان کو

حکومتی مناصب دیے

(۶) آپ نے حضورؐ سے چند احادیث بھی روایت کی ہیں جن کو آپ سے حضرت معاویہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے۔

الغرض آپ نے ستانوے برس کی عمر پائی جس میں ۷۱ سال کفر میں اور ۲۶ سال اسلام میں گزارے اور عہد عثمانی میں ۳۳ھ کے اواخر یا ۳۴ھ کے اوائل میں آپ کا وصال ہوا، اور مدینہ شریف کے مشہور قبرستان جنت البقیع میں مدفون ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ

دربارِ عالمگیری

(از مولانا مصطفیٰ حسن صاحب علوی ایم اے پی ایچ ڈی)

[جناب ڈاکٹر مصطفیٰ حسن صاحب علوی کا یہ مضمون آپ کی ایک زیر تصنیف کتاب کا سلسلہ ہے، امید ہے ناظرین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ ——— ادارہ]

عنوان سے متبادر غالباً یہی ہوگا کہ میں عالمگیر جیسی شخصیت کے احوال زندگی قلم بند کروں گا اور اس کی سوانح حیات یا عہد حکومت پر تبصرہ یا تنقید کے درپے ہوں گا حالانکہ میرا مقصد یہ نہیں نہ میرا یہ مطمح نظر ہے کہ اس کے عہد حکومت یا اس دور کے حوادث لیل و نہار اور وقائع روزگار پر بحث اور تحقیص کو موضوع سخن بناؤں۔ مختلف پہلوؤں اور کئی کئی عنوانوں کے ساتھ اس کے متعلق جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ لکھا جا چکا۔ تنقیدی ہو چکیں تبصرے ہو چکے اور اس کے اعمال اور کردار پر محاکمہ اور موافقانہ نکتہ چینیاں بھی ہو چکیں اس سلسلہ میں مجھے اگر کچھ لکھنا ہے تو اس قدر کہ فی الجملہ اس کی شخصیت اجاگر ہو جائے اور مختصراً اس کی ذات متعارف ہو سکے۔ اس کا میلان طبع اور اس کے فطری رجحان اور خلق اور خلقی افتاد اور اس پر مرتب شدہ وقائع اور حوادث کی نشان دہی ہو جائے واقعات عجیب ہیں تو سروکار نہیں اور حوادث لرزہ خیز ہیں تو کچھ مطلب نہیں شخصیت کے ساتھ اگر اس کے نمایاں پہلو سامنے آ جائیں گے تو وہی پہلو ہوں گے جو محل نزاع نہیں اور وہی صفات ہوں گی جن پر کوئی حرف نہ آیا ہو۔ اگر کوئی اچھائی اور خوبی عالمگیر میں نہ تھی تو میں نہ کہوں گا کہ یہ خوبی اس میں تھی اور اگر کوئی بدی اور برائی اس میں تھی تو میں نہ کہوں گا کہ یہ بدی اور برائی اس میں نہ تھی۔ اس کے اسلاف اور اخلاف میں بزرگ سے بزرگ تر بادشاہ اور بادشاہتیں ہوئیں اور سریر آرائے

حکومت ہوئے۔ قدر مشترک اس میں اور ان میں حکومت اور ریاست تھی۔ کسی حیثیت سے وہ موقر اور
اہم تھے اور کسی حیثیت سے یہ موقر اور محترم ہوا۔ کسی شخصیت پر روشنی ڈالنے کے معنی یہ نہیں کہ صرف
کے محاسن اور صفات حسنہ و فضائل جمیلہ ہی سامنے آجائیں۔ برائیاں اور معائب اور مثالب بھی سامنے
آئیں مگر یہ ضروری نہیں کہ ان معائب کی تاویل کی جائے اور ان نقائص کے مفہم اور غیر مفہم اسباب
اور علل لکھیے۔ ان کے اہمیت کو کم یا نیست و نابود کر دیا جائے۔ یا معائب مطلقاً سامنے ہی نہ لائے جائیں
اور لائے جائیں تو ان سے اغماض کیا جائے یا دوسروں کے سامنے ان کا دفاع! اور دشمنوں کے مواجہہ
میں ان کے صحیح یا غلط عمل سامنے رکھ دیے جائیں۔ یا یہ خاص صفات کا حامل تھا اور اس لیے قابل ستائش
شاہجہاں میں یہ یہ خوبیاں تھیں اس لیے وہ قابل مدح و پذیرائی اور اکبر میں یہ اچھائیاں تھیں اور
عالمگیر میں یہ اس لیے یہ بادشاہوں میں ممتاز ہوئے اور جہان بانوں اور تاجوروں میں نمایاں۔ اگر
ایک شخص میں حفظ و اتقان تیقظ ذہانت ذکاوت اور وسعت نظر ہے لیکن اس میں ادبیت تفقہ
اور اجتہاد کی صلاحیت مفقود ہے تو کیا ضرور ہے کہ یہ بات بھی بیان کر ہی دی جائے۔ کسی کے پاس
جاگیری زمین ہل بیل اور آلات کشاورزی سب کچھ ہیں جو اس کی ثروت، دولت اور حشمت کی نمامی
کرتی ہیں اس کو بیان میں لاکے اگر اس کی نقدیات اثاثہ بیت صنعتی کارخانوں اور حرفتی سازو
سامانوں کے ذکر سے بالقصد یا بلا قصد سکوت اختیار کر لیا جائے تو چنداں قابل ملامت اور حرف
گیری کے نہیں، اس کی ثروت کی نشان دہی کرنا تھی وہ ہو چکی اور اسی پہلو کو لوگوں کے علم میں لانا
تھا جو صفات کسی میں مفقود ہوں اگر ان کو یاد نہ دلایا جائے اور جو صفات موجود ہیں ان کو سامنے
رکھ دیا جائے تو کسی خوردہ گیری کا محل نہیں۔ بے عیب ذات وحدہ لاشریک کی ہے۔ تمام عیوب سے
منزہ اور کوئی ہستی نہیں، نہ کوئی ذات ہے۔ بڑوں سے بڑوں میں نقائص صوری اور معنوی موجود
ہیں اور وہ عادات اور خصائل ہیں جو قابل صد ملامت اور سرزنش ہوتے ہیں۔ ہاں جو صفت
کسی میں نہیں اور تاویلات بعیدہ کے ساتھ اس کو کوئی صفت بنا کے سامنے رکھ دے تو جوابدہی
ایسے کرنے والے سے ضرور ہو سکتی ہے اور جاسکتی ہے۔ خوبصورتی اور جمال کو اس انداز سے
پیش کرنا مناسب ہوتا ہے جو خوبصورتی اور جمال پیش کرنے کے انداز ہیں۔ ہاں کسی بدصورتی کو
مصور کا موئے قلم مناسب رنگ دے کے غیر واقعی اور غیر حقیقی حقیقت اور واقعیت بنا دے

تو اس کی خوش نظری، خوش خیالی اور حسن ظن کی چنداں داد نہیں دی جا سکتی۔ جب حمایت کا موقع ہی نہ ہو تو بے موقع اور بے محل حمایت بھی بے سود ہی ہوتی ہے۔ عظمت اور بڑائی کے پل باندھے تو باندھتے ہی چلے گئے اور نقائص اور کمتری کے غار کھودے تو کھودتے ہی چلے گئے۔ نہ وہ افراط محمود ہے نہ تفریط اور کسی کے ہنر کے نقوش کو ہی ہنر کی حیثیت سے نہیں بلکہ عیوب کی حیثیت سے غیر ملائم اور نامناسب رنگوں سے بھر دیا گیا تو قابل اور در خور ملامت۔ اگر انسانیت اور آدمیت علم ہنر ثقافت دین و مذہب کو کثرت سے کسی نے فائدہ پہونچایا تو اس کی تعریف زبانوں پر آتی ہے اور اس کی مدح و ستائش لکھنے کے لیے انگلیوں میں قلم دبا لیے جاتے ہیں لیکن شاذ و نادر قتل و غارت نہب و سفاکی کے تذکرے مضمحل اور ناقابل اعتنا ہو جاتے ہیں۔ وقتی ماحول اور زمانے کے تقاضوں سے اس وقت اور زمانے کے کسی ممتاز کردار اور اس کے حسن عمل کی داد دینا چاہیے اگرچہ مرور ایام اور امتداد زمانہ کے اثرات' بعد سے وہ معیار کوئی بلند معیار نہ رہے۔ آج اگر کسی علم اور عمل کی قدریں آنکھوں میں نہ آئیں تو اس وقت کی قدروں کو سامنے لانا ضرور چاہیے جب وہ قدریں سمجھی جاتی تھیں۔ اگر کسی زمانہ کی جمہوریت نے مختلف صورتوں سے عوام کو فائدے پہونچائے تو اس جمہوریت کی داد دینا ہوگی۔ اس طرح اگر کسی شخصیت سے عوام و خواص اصاغر اکابر اعالی اسافل کو کل شخصی ذاتی، معاشرتی، دینی مذہبی اور اجتماعی فائدے پہونچے تو ان فائدوں اور شخصیتوں کو ضرور بالضرور سامنے لے آنا چاہیے خواہ آج ان کی افادیت افادیت نہ بھی جانے۔ آج کی سوسائٹی اور سیاست اگر کسی شخص یا فرد کی اپنے اغراض و مقاصد کے پیش نظر ایک بدنما اور دھبتے پڑی ہوئی تصویر اتار کے سامنے رکھ دے تو برا ہے اسے انصاف کوئی مستحسن عمل ہرگز نہ کہے گا کسی شخص کی تندی مزاج اور اس کی سختی اور جذبات انتقام کو سامنے رکھنا اور ان کے ماتحت سزا دینا تو ذہن میں رہے لیکن جرم اور اس کی نوعیت اور اس کی کیفیت کو فراموش کر دے تو یہ عدل نہ ہوگا۔ فلاں جرم کی یہ سزا ہونا تھی لیکن سزا دینے والے نے سزا نہیں دی بلکہ اس کے برخلاف اپنے لطف و کرم سے سزا گھٹا دی یا معلق دی یا نہیں تو یہ بھی قابل ستائش ہے اگر کوئی ایسی خطا کا مرتکب ہوتا ہے اور کوئی ایسا جرم کرتا ہے جس کے مقابل دوسری خطائیں اور دوسرے جرم بڑے چھوٹے تھے تو اس میں یہی ستائش کا پہلو

نکل سکتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بڑے لوگ اگر اپنے ہی میں سے کسی بڑے کو اپنی اپنی بصیرت اور سمجھ سے اپنے سے بھی بڑا سمجھنے لگیں تو یہ اس شخص کی بڑائی کی دلیل ہے۔ ایک عالم اور ماہر فن اگر اپنے ہی جیسے ماہر فن کی تعظیم و تکریم غیر معمولی کریں یا ایک بہادر دوسرے بہادر کو اپنے سے زائد بڑا سمجھے یا ایک دولت مند کو اس جیسے دولت مند کسی اور نقطۂ نظر سے معظم و محترم جانیں تو اس سے اس کی عظمت و توقیر میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ تیوپین جیسے کمانڈر کی دوسرے ہم درجہ کمانڈروں کی نگاہ میں غیر معمولی عزت و توقیر رہی یا ایک طبیب کے دوسرے اطباء جو ہم درجہ ہیں زائد متاثر ہوں تو یہ اس کے لیے خاص امتیاز کا سبب بنے گا۔ اگر ایک بڑا شخص چھوٹوں سے محبت اور پیار سے پیش آئے اور ان کے رکھ رکھاؤ کو ہر وقت دل میں رکھے تو یہ اسے دوسرے بڑوں کے مقابلہ میں اور محبوب بنا دے گا۔

بابر شجاعت کا ایک مجسمہ، بہادری کا پیکر کشور کشائی میں ممتاز بلند پایہ بادشاہ تھا اسی کے ساتھ ساتھ علم و ثقافت کا دلدادہ، عارفان باللہ صوفیہ اور اولیاء و مشائخ، اہل فضل و دانش کا قدردان، علم نواز، ہنر پرور، محبت شفقت اور انس سے لبریز دل رکھنے والا حسین اور پُرشکوہ سخن فہم سخن سنج، شاعر دماغ، شاعر دل اور شاعر پسند اور خوش طبع فرمانروا تھا۔ یا ہمایوں علم ہیئت اور ریاضی کا ماہر، بلند مرتبہ شاعر، نکتہ سنج، دقیق النظری اور معانی آفرینی میں ممتاز تھا۔ ایک سلیم فطرت رکھتا۔ سخن گستر تھا اور آلات رصدی کرہ و اصطرلاب کی شناخت میں یدطولیٰ اور درجہ کمال رکھتا۔ زہد اور اتقیا کا مرجع، محاسن معنوی اور فضائل صوری سے آراستہ علم نواز، شریعت پرور تھا۔ اس کے ساتھ جدت پسند فواحش و منکرات سے حتی الوسع محترز صوم و صلوٰۃ کا پابند ایک کشور کشا تاجور تھا۔

اکبر کو علمی اور ادبی ذوق و شوق تھا، علوم و فنون کا قدردان علم دوست اور ادب پرور تھا۔ علماء اور فضلا سے اسے دلچسپی تھی اس کی سرپرستی میں مفید مفید تصانیف کی گئیں اور تالیفات تیار ہوئیں اس میں ایک سیاسی سوجھ بوجھ بھی تھی اور اس کے دور حکومت کو ایک خاص عظمت اور شوکت حاصل رہی۔ اس ذکر کے بعد یہ کیا ضروری ہے کہ یہ بھی کہہ دوں!

جائے کہ وہ خود اسی محفل تھا اور اسے اس توجہ کے ساتھ خوبصورت بنایا جائے کہ علوم ظاہری کی جگہ اسے علم لدنی حاصل تھا اور جو کچھ عقل و دانش اور علمی دستگاہ اسے حاصل تھی وہ الہامی اور خداداد تھی۔ جہانگیر ایک انشاپرداز اور ایک بلند پایہ نقاد اور نکتہ چین گزرا ہے۔ خود شاعر تھا اور شاعر دوست بھی اور علما ودین کا سرپرست اور قدردان علم پرور اور جوہر شناس تھا اور پنڈتوں، پنڈتوں اور غیر مسلموں سے بھی فراخدلی اور عقیدت مندی سے ملنے والا صوفیا کی صحبت کا دلدادہ تھا اور ان کے سرچشمہ علم وفضل سے سیراب ہونے کی دل میں لگن رکھتا لیکن باوجود ان مستحسن اور قابل پذیرائی اعمال اور کردار کے اس سے لغزشیں ہوئی اور خطاؤں کا مرتکب ہوا۔ اسی طرح شاہجہاں فنون لطیفہ کا دلدادہ تھا۔ اس کے ذوق طبع کی خوبی اور نفاست مزاج کی اچھائی کی وہ تعمیری یادگاریں ہیں جو آج تک عالم کے نوادر میں شمار ہوتی ہیں۔ تاج محل کا روضہ، تخت طاؤس اور قلعہ معلیٰ کی تعمیر نے اسے شہرت دوام کا طغرائے امتیاز دے دیا۔ دیوان خاص اور دیوان عام کے در و دیوار اس کے حسن ذوق اور ہنرپسندی کی داد دے رہے ہیں۔ اس کی زرپاشیوں اور فیاضیوں سے علما اور شعرا، ادبا بہرہ اندوز رہے۔ اس کے صحیفہ حیات کا کوئی صفحہ علمی دلچسپیوں سے خالی نہیں اس نے کوئی علمی یادگار نہیں چھوڑی اور اگر چھوڑی بھی تو اس میں جہانگیر جیسی ادبی رنگینی، جزالت اور روانی نہیں نہ عالمگیر کی انشا جیسی سلاست اور برجستگی۔ عالمانہ نظر رکھتا محقق تھا۔ حکمت بھری باتیں کرتا اور رائیں قائم کرتا دور اندیش تھا اور محتاط۔ عالمگیر اقلیم ہند کا تاجدار اور ہمالیہ سے لیکے راس کماری تک کے محاصل کا محصل کرناٹک کا حاکم اور چاٹگام سے لیکے غزنی تک کا فرمانروا اور مصالح کا نگراں گلستان تیموری کا گل سرسبد تاج مغلیہ کا تابندہ گوہر، دستار بابری کا طرہ امتیاز، دامن شاہجہاں کا گل تر۔ عمان کرم کا در ثمین آسمان سخاوت کا بدر کامل، شبستان ممتاز محل میں ۱۵ ذیقعدہ ۱۰۲۷ھ مطابق ۲۴ اکتوبر ۱۶۱۸ء کو شب کو صوبہ گجرات کے دوحد قصبہ میں یہ شمع روشن ہوئی۔ نام اورنگ زیب رکھا گیا۔ مقام پیدائش نالائم اور ناخوشگوار تھا۔ اورعین آئے جشن وضیافت شایان شان تزک و احتشام سے منایا گیا۔ شاعر دربار طالب کلیم نے آفتاب عالم تاب اور کسی اور شاعر نے گوہر تاج ملوک اورنگ زیب سے تاریخ ولادت نکالی۔ ابوالمعالی نجرانی خان جیسے مرتاض تقوی و ورع کی بی بی نے دودھ پلایا۔ بڑھا، پلا اور عربی و فارسی کی متداول اور نصابی کتب اپنے

وقت کے بڑے بڑے اساتذہ سے پڑھیں اور یہ جو بعد کو شہنشاہ ابوالمظفر محی الدین عالمگیر کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ حافظ قرآن بھی تھا، امام غزالی کی احیائے العلوم کیمیائے سعادت اور صوفیا میں سے یحییٰ منیری وغیرہ وغیرہ کے مکتوبات اور ملفوظات اکثر و بیشتر اس کے مطالعہ میں رہتے اور تفسیر حدیث و فقہ کے معیاری فنون اور شروح پڑھتا اور سنتا رہتا فن انشا اور حسن خط میں دستگاہ کامل رکھتا۔ ایام شہزادگی میں باپ کے یہاں سے ایک معمولی وظیفہ مقرر ہو گیا تھا جو تدریجاً بڑھتا گیا جب سن شعور کو پہونچا تو سب سے پہلے باپ نے دکن میں فوج کا کمانڈر بنایا پھر دکن کا ناظم اور گورنر بنا دیا گیا۔ منصب میں ترقی پائی۔ پہلے ایرانی خاندان کی ایک لڑکی دلرس بانو سے شادی ہوئی پھر اور اور بیگمات بھی اس کے حبالۂ نکاح میں آئیں۔ رفتہ رفتہ پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیوں کا باپ بنا۔ اس کے نوشتہ تقدیر میں یہ بھی تھا کہ خاندانی اور برادرانہ رقابت اور عداوت کا شکار بن کے باپ کی نظروں سے گر جائے۔ معزول ہو۔ اور دکن کی نظامت منصب کے عطیات اور جاگیریں سب سے محروم کر دیا گیا۔ بعد چندے اس نے اپنی ذاتی اہلیت اور طبعی صلاحیت سے باپ کے دل میں پھر جگہ کر لی۔ اور بلخ اور بدخشاں کی مہم اسے تفویض ہوئی اور اس میں کامیابی کا سہرا اس کے سر باندھا گیا۔ ایک وقت وہ آیا کہ پنجاب کے صوبہ ملتان کا صوبہ دار بنایا گیا۔ قندھار کی کمان بھی اس کے ہاتھ میں آ گئی اور سندھ میں بھی اس نے کچھ کم کارہائے نمایاں انجام نہیں دیے۔ زندگی میں اس کے لیے بڑے بڑے ابتلا کے وقت آئے۔ اور کٹھن سے کٹھن آزمائش کی گھڑیاں پڑیں اس نے طعنے سہے تشنیع اور سب و شتم برداشت کیے۔ معاندانہ تیروں نے اس کے دل اور دماغ کو نشانہ بنایا اور مخالفت کے تیروں نے اس کے سینے کو چھلنی کیا۔ اس کے خلاف سازشوں کے جال بچھائے گئے۔ قدم قدم پر اس کی ہلاکت کے لیے تدبیریں ہوئیں۔ مگر اس نے صبر و شکیب تحمل اور برداشت کے جادوں سے قدم نہ ہٹائے۔ اور ماتھے کی جبیں پر بل نہ آئے۔ اس کی تمنا کا خون ہوا۔ اس کو مایوسیوں نے گھیرا۔ یاس اور حرمان سے دوچار رہا لیکن اطاعت اور استقامت کا دامن اس نے نہ چھوڑا۔ باپ کی نظروں میں اسے بے ایمان اور خائن بنایا گیا۔ وقتاً فوقتاً اس کی شکائتیں کی گئیں۔ اس کی کانوں میں پڑتی رہیں۔ دیکھتا رہا، سنتا رہا مگر برکتا رہا۔ اجیروں اور ملازموں کی دلداری اور سفارشیں اور مذہبی مدارس اور...

کے دظیفوں کی حمایت کرتا۔ ناکتخداؤں بیواؤں اور ... انڈوں کو ٹھکانے لگانے اور ان کے نکا
میں مددگار بنتا۔ اس کے یہاں مذہب وملت کی کوئی تفریق نہ تھی۔ مسلمان جس طرح مستفیض ہو
دیسے ہی دوسرے مذاہب والے بھی۔ دور بنی امیہ کے برخلاف عہد عباسیہ کی طرح مغلوا
میں بھی پوری زمام اختیار تقریباً ایک ہی ہاتھ میں اور سیاست مذہبی اقتدار کے ماتحت تھ
عالمگیر نے اپنی عاقبت اندیشی اور دور رس دماغ سے اسے نباہا۔ اور "عیسیٰ بدین خود موسیٰ
بدین خود" پر عامل رہا۔ ڈپلومیسی اور پر فتنہ وفریب حکمرانی اور سیاست سے دامن بچائے
رہا۔ جب شاہجہاں کے بیٹے حکمرانی کے لیے صرف آپس ہی میں نہیں بلکہ باپ تک سے دست و گ
ہوئے اور ہندوستان کی سرزمین خونیں مناظر پیش کرنے لگی۔ تو اس نازک دور میں اس نے
قدم اٹھایا اور اپنی شجاعت بہادری تدبر اور استقلال سے سریر آرائے حکومت ہوا۔ نامذ
جدا ... ں کو اس نے دبایا۔ اور ہندوستان میں اسلام کی ڈوبتی کشتی پھر سطح آب پر لے آ
... س کی طبیعت میں انتہائی خاکساری تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اسے اپنے مفاخر اور مکارم کی دا
... ناپسند خاطر ہوئی اور اس نے وہ محکمہ ہی ختم کر دیا جو اس کام کو انجام دیتا تھا۔ اسے علم و
سے محبت نہیں بلکہ انتہائی شغف تھا۔ اور اسی کے پیش نظر اس نے قصبوں اور شہروں میں
مکاتب اور مدارس قائم کر دیے تھے۔ اور ان میں منتخب اور چیدہ چیدہ اساتذہ مقرر تھے
اور طلبہ کی تشویق کے لیے وظائف بھی جاری کیے تھے۔ فصاحت و بلاغت ہمیشہ اہل ذوق سخ
سنج اس سے تعلیم و تربیت انشا اور نثر میں حاصل کرتے۔ اللہ نے اسے ایک قادر البیان
اور میانہ رو دل دے رکھا تھا۔ میدان سخن میں اس کا تند یز قلم خوب خوب چال دکھا گیا۔ اس
تحریروں کی بندش خواہ اوامر و نواہی پر یا قرامین و عطیات پر مشتمل ہوں ایک عجیب تاثیر اور کیف آ
ہوتیں۔ سیاسی اور معاشرتی اجتماعی شادی و غم حزن و شادمانی۔ عتاب و تنبیہہ و تہدید احوا
نگاری شکوہ و شکایت ایک دلکش اور جاذب نظر طرز بیان سے بھری ہوئی ہوتیں۔ اس کی تحری
میں واقعات کے انبار تلمیحات کی بہتات اور وسعت معلومات اور اطلاعات کے سراغ خو
خوب ملتے ہیں۔ اسے سحر آفریں ادیب کہیں تو بیان واقعہ اور ایک معجز نگار انشا پرداز کہیں
تو اظہار حقیقت ہے۔ اس کی انشا میں ... ... نیاں درویشوں فقیروں بندگوں اور شا

سے اسے خاص دلچسپی رہی۔ مکروہات اور منہیات سے خاص طور پر اجتناب اور حتی المقدور احتراز برتا۔ فرائض مذہبی کی انجام دہی اور ادائے عشر و زکوٰۃ میں خاص اہتمام سے کام لیا۔ شرعی احکام کی پابندی یہاں تک ہو ابے حد کی۔ زبان پر اکثر و بیشتر کلمہ طیبہ اور درود سے اوراد رہتے۔ نوافل و سنن کی ادائگی میں بھی عدم تہاون اور تساہل نمایاں ہی رہا۔ حق پرست اور حق پسند تھا۔ فن خطاطی میں بھی یگانہ عصر تھا اور یہ حصول دنیا کیلئے یا نام آوری کے لیے نہیں بلکہ آخرت اندوزی کے لیے بھی اور اخروی نجات کے لیے۔ شاہان تیموریہ میں یہ امتیاز صرف اسی کو حاصل ہوا کہ اس نے کلام پاک حفظ کیا۔ اور پھر اپنی عمر کے تینتالیسویں سال میں اس نے سلوک و طریقت کے مختلف مراحل میں قدم رکھے اور تصفیۂ باطن اور تزکیہ نفس میں جدوجہد کی اور نجات سرمدی اور فلاح ابدی کے حصول میں کوشاں رہا کیا۔ غیر شرعی لباس اور چاندی سونے کے برتنوں کے استعمال اور آلات ملاہی و ملاعب سے محترز رہا۔ بہت علم پرور اور بڑا علم دوست تھا۔ اور اس کا دور حیات بڑے بڑے علماء، بڑے بڑے فضلا ادبا، نامور محققین محدثین اور فقہا کے نقطۂ نظر سے ایک خاص امتیاز رکھتا ہے۔ ان میں وہ تھے جن کا اس سے بالواسطہ تعلق تھا اور وہ تھے جو اس کے عطیات اور نوازشات سے ہی مستفید اور مستفیض ہوتے اور وہ بھی تھے جن کا دربار سے بلاواسطہ الحاق تھا۔ اور وہ بھی تھے جن سے یہ براہ راست استفادہ اور کسب کمال کرتا اور وہ بھی تھے جو اس کی ذات اور شخصیت میں کمال اور امتیاز پیدا کرنے اور کرانے میں ممد اور معاون ہوتے۔ جن کے علوم و فنون کی فراوانی اور وسعت نظر کی بہتات اس کے لیے مایہ دانش و بینش تھی۔ اور جن کے سامنے تلمذانہ آداب اور طور و طریق اور نیازمندانہ انداز سے پیش آتا رہا۔ منجملہ ان کے ایک شیخ احمد تھے جو ملا جیون کے عرف سے آج بھی یاد کیے جاتے ہیں اور آج بھی ان کی علمی عظمت اور رفعت لوگوں کے ذہنوں اور دماغوں میں موجود ہے۔ رحمہ اللہ۔

ملا جیون

عالمگیر سے تعلق ان کا اور عالمگیر کا بلاواسطہ شاگردی اور استادی کا تعلق تھا۔ عالمگیر نے ان سے متداول فقہی و روایات کے علاوہ دوسری کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ یہ ان کی دینی رتبہ، اور علمی منصب کے شایان شان بڑی عظمت اور توقیر کرتا اور شاگردانہ

لحاظ اور آداب سے پیش آتا۔ مسلسل چھ برس تک عالمگیر کی دکھنی فوج میں کسی منصب پر فائز بھی رہے۔

آپکے والدین آپ کے والد بزرگوار کا نام نامی ملا ابوسعید ہے اور آپ شاہ عالمگیر کے داروغہ مطبخ (میر آتش) عبداللہ عرف نواب عزت خاں امیٹھوی کی ہمشیرہ کے بطن سے پیدا ہوئے آپ دو بھائی

تاریخ ولادت تھے۔ بھائی کا نام ملا بڈھن تھا۔ روز سہ شنبہ وقت صبح صادق ۲۵ر شعبان ۱۰۴۷ھ آپ کی تاریخ پیدائش ہے۔ ملا سعید اپنے والد امجد کے سایہ عاطفت میں پلے اور آپنے سات برس کی عمر میں کلام پاک حفظ کر لیا اور بقول[۱] خود اگرچہ قواعد تہجی اور اعراب سے واقف نہ ہوئے

آپ کی تعلیم و تربیت تھے تاہم الفاظ مہملہ اور منقوطہ کو صحت کے ساتھ ادا فرما لیتے۔ صرفی اور نحوی قاعدہ اور اصول کے نہ جانتے ہوئے بھی فاعل اور مفعول کو سمجھ کے ترجمہ کر لیتے۔ درس نظامیہ کا نصاب تھا۔ کتب درسیہ میں تقدیم و تاخیر ملحوظ خاطر تھی پھر بھی ان علوم ظاہریہ متداولہ میں مہارت اور پوری دست رس حاصل کی۔ ۲۲ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ اور درس دینا شروع کر دیا۔ طلبہ کا آپ کے گرد ہجوم رہتا۔ چالیس سال کی عمر تھی کہ آپنے اجمیر اور دہلی کو اپنی

حج کے لیے روانگی اقامت گاہ بنایا اور ہزاروں کو علوم ظاہریہ سے مستفید کیا۔ ۵۵ سال کی عمر میں پہلی بار حرمین شریفین کی زیارت کو تشریف لے گئے۔ قدرے دکن میں بھی قیام پذیر رہے۔ ۵ سال حرمین میں اقامت گزیں ہونے کے بعد دکن پھر واپس ہوئے۔ اور یہی وہ زمانہ ہے کہ جب شاہی

دکن میں قیام فوج سے آپ کا الحاق رہا اور شاہ عالمگیر کے دربار میں آمد و شد اور تلمذانہ ملاقات کے دوران سیکڑوں اور ہزاروں کے مقاصد دینوی کے حصول کا ذریعہ بنتے رہے۔ اسی دوران میں یہ خیال پیدا ہوا کہ والدین کی طرف سے حج بدل کیا جائے۔ خدا سے دعا کرتے رہے ادھر اپنے والد ملا سعید کو خواب میں دیکھا کہ وہ حج بدل کے طلبگار ہیں۔ ادھر دعا قبول ہوئی اور توفیق الٰہی شامل حال ۱۱۱۲ھ کو عالمگیر کی با دل ناخواستہ اجازت حاصل کر کے حرمین کی زیارت سے مشرف ہوئے اس وقت آپ کی عمر ۶۶ سال تھی اور تین سال واپسی کے بعد دکن میں پھر قیام

مراجعت وطن کر کے ۱۱۱۶ھ میں مراجعت فرمائے وطن ہوئے۔ اب عمر کا سترواں سال تھا۔

---

[۱] سوانح خود نوشت ملا جیون "می گوید فقیر جیون الخ" (مخطوطہ)

دو سال یہاں رہے محمد معظم بادشاہ خلد منزل کے جلوس کے پہلے سال ۲۵ محرم کو طلبہ اور شاگردوں کے ایک جم غفیر کے ساتھ شاہجہاں آباد کا سفر اختیار کیا صفر کے آخری چہار شنبہ کو دہلی پہونچے معظم بادشاہ اس وقت موجود نہ تھے۔ دکھن سے واپس آتے ہوئے اجمیر میں ان سے ملاقات ہوئی اور بادشاہ ان سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کو باصرار اپنے ساتھ لاہور لے گئے۔ وہاں چندے قیام رہا کہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے پھر شاہجہاں آباد مراجعت فرمائی اور اپنی عمر کے ۸۳ ویں سال تک وہاں مقیم رہے۔ اسی دوران میں شاہ فرخ سیر بادشاہ نامدار ابو المظفر معین الدین سے ملاقات ہوئی[1] اور اپنی فیاض طبیعت اور فطرۃً فیض رساں ہونے کے

آپ کے فیوض

باعث اپنے اہل وطن اور دوسرے ارباب حاجت کی بادشاہ کے دربار سے حاجت روائی میں دل و جان سے مدد کی۔ اور ان کو مرفہ حال بنانے میں معاون ہوئے۔

آپ کا وصال

شروع ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۱۳۰ھ سے ہی آپ نے اپنے ارتحال کی خبر دینا شروع کی اور چاہتے تھے کہ کسی طرح وطن پہونچ کے جان بحق تسلیم ہو۔ بے چین رہتے اور مضطرب کہ کسی طرح اُڑ کے وطن پہونچ جائیں لیکن قضا و قدر کا تقاضا اس کے خلاف تھا۔ آپ کی تمنا پوری نہ ہوئی۔ ۸ ذیقعدہ دوشنبہ کے روز سنہ ۱۱۳۰ھ کو حسب معمول اور عادت طلبہ کے درس و تعلیم سے فارغ ہوئے۔ نماز مغرب مع اوابین وادا و وظائف ادا کی۔ رات کا کھانا تناول فرمایا۔ عشا پڑھی اور سنن و نوافل ادا کیں۔ نصف شب گزری تو سینہ میں کچھ سوزش محسوس کی جو بڑھتے بڑھتے پہلو میں کجی ہونے لگی۔ شام کے وقت کوئی ستارہ ٹوٹتے ہوئے دیکھا تو فرمایا تھا کہ کوئی عالم کامل دنیا سے رخصت ہونے کو ہے۔ درد کی حالت میں اپنے بیٹے ملا عبد القادری سے جو موجود تھے فرمایا کہ وقت آخر ہے اور یہ کہہ کے جامع مسجد دہلی کے جنوبی دالان کی طرف ایک کوٹھری میں جا کے لیٹ گئے۔ کلمہ طیبہ وردِ زبان تھا کہ روح اطہر جسدِ عنصری کو چھوڑ راہی جنت ہوئی۔[2] ۹ ذیقعدہ سہ شنبہ سنہ ۱۱۳۰ھ کا دن تھا۔ ظہر کے وقت آپ کی میت کو میر محمد شفیع کے تکیہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۱۴ محرم سنہ ۱۱۳۱ھ چہار شنبہ کے دن پچاس روز کے بعد آپ کی

---

[1] تذکرہ ملا جیون مخطوطہ ملا عبد القادر ابن ملا جیون [2] تذکرہ ملا جیون از ملا عبد القادری مخطوطہ

میت کو ایک تابوت میں رکھ کر امیٹھی لایا گیا اور وہاں قدیم مدرسہ اسلامیہ کے ملحق مقبرہ میں دفن کر دیا گیا۔ شیخ تاج محمد بن ملا سرکی نے جو آپ کے استاد زادے اور شاگرد بھی تھے، مندرجہ ذیل وفات کی تاریخ لکھی ہے

محیط علم آں مولائے اعظم ۔۔۔ با حمد عمرت چون شد معلم
جہاں را روشنی زاں شمع دین بود ۔۔۔ بعلم ظاہر و باطن مسلم
چو رحلت کرد در ذیقعدہ تاسع ۔۔۔ بوصل دوست خود گشتہ مکرم
بتاریخش خرد داد اگوشم
ندا از کامل و فیاض عالم

۱۱۳۰

مزار مبارک پہ ویہم نعمۃ علیات ۱۱۳۰ھ کی لوح لگی ہوئی ہے۔ آپ سلسلہ قادریہ میں مرید تھے اور مجاز بیعت بھی اور سلسلہ چشتیہ سے بھی آپ کا سلسلہ ملتا تھا۔ (باقی)

مُطَالعَہ

لبرل اسلام

——— وحیدالدین خاں

"اگر ہمارے مجوزہ تنقیدی طریقہ کے مطابق شریعت کے پورے ڈھانچے کی جانچ کی جائے تو ظاہر ہوگا کہ مذہب کے قدیم اور جامد سانچہ کی جگہ ایک نیا پروٹسٹنٹ اسلام ——(PRO-TESTANT ISLAM) جنم لے گا —— جو بیسویں صدی کی زندگی کے حالات سے مطابقت رکھتا ہوگا۔ وہ ماضی کے سوکھے ہوئے درخت کو کاٹ ڈالے گا اور مستقبل کو پرامید شکل میں دیکھ رہا ہوگا۔ اس نئے مذہب کا نام رکھنے کے لیے ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تاہم اگر اس کو کوئی نام دیا جاسکے تو اس کو لبرل (آزاد) اسلام (LIBERAL ISLAM) کہنا صحیح ہوگا۔" صفحہ ۱۰۴

یہ آصف فیضی صاحب کے الفاظ ہیں جو انھوں نے اپنی کتاب:

A MODERN APPROACH TO ISLAM

میں تحریر فرمائے ہیں۔ مسٹر آصف فیضی (ASAF A.A. FYZEE) جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی صف میں ایک نمایاں آدمی ہیں۔ وہ ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم سینٹ زیویرس کالج بمبئی اور سینٹ جانز کالج کیمبرج میں ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں انھوں نے بمبئی ہائی کورٹ میں ایک قانون داں کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ ۴۷-۱۹۳۸ء کے درمیان وہ گورنمنٹ لا کالج بمبئی میں اصول قانون کے پروفیسر نیز اس کے پرنسپل رہے۔ ۴۹-۱۹۴۷ء میں وہ بمبئی پبلک سروس کمیشن کے ممبر تھے اور ۱۹۴۹ء میں قاہرہ میں ہندستان کے سفیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں وہ دوبارہ

ہندوستان واپس آئے اور یونین پبلک سروس کمیشن نئی دہلی کے ممبر نامزد کیے گئے۔ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۰ء تک وہ کشمیر یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ۱۹۵۵ء میں فیضی صاحب کا انتخاب عرب اکیڈمی دمشق کے نمائندہ ممبر کی حیثیت سے ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں انھیں ہندوستان کے صدر کی طرف سے پدم وبھوشن کا خطاب عطا کیا گیا۔

فیضی صاحب اس وقت انگلستان میں ہیں اور کیمبرج کے اپنے پرانے کالج میں پروفیسر ہیں۔ وہ متعدد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ موصوف کی مندرجہ بالا کتاب جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، وہ جدید تقاضوں کے مطابق اسلام کی نئی تشریح و تعبیر کے مسئلہ پر لکھی گئی ہے۔ یہاں اس پر کوئی تفصیلی تبصرہ مقصود نہیں ہے۔ البتہ میں اس کا ایک مختصر تعارف پیش کروں گا تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کے بارے میں کس انداز سے سوچتا ہے۔

مصنف کتاب کے آغاز میں سب سے پہلے یہ سوال کرتے ہیں:

WHAT DOES ISLAM STAND FOR?

یعنی اسلام سے کیا مراد ہے؟ (صفحہ ۱) اس کے بعد جواب دیتے ہیں کہ اس کا کوئی ایک جواب نہیں ہو سکتا۔ اس کا انحصار اس "وقت" پر ہے جب وہ پوچھا گیا، اس ملک پر ہے جہاں اس سوال کا جواب دینا ہو، اور اس "شخص" پر ہے جو یہ جواب دے رہا ہو۔

اس مسئلہ کو حل کرنے کی چند صورتیں ہیں۔ مثلاً ایک ہے تاریخی طریقہ (Historical Method) اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو ایک ایسی چیز سمجھا جائے جو تاریخ میں سفر کر رہا ہے۔ اس ڈھنگ سے اگر ہم اسلام کے تاریخی رجحانات کا مطالعہ کریں تو ہم کچھ نتائج تک پہنچ سکتے ہیں۔ (مثلاً ابتدائے اسلام میں مسلم سوسائٹی پردہ کی سختی سے حامل تھی، اب مسلم سوسائٹی میں پردہ تیزی سے اٹھ رہا ہے) دوسرا طریقہ اعتقادی طریقہ (Dogmatic Method) ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کی اصل تعلیمات اور شریعت کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور اس سے جو کچھ ملے بس اسی کو ہمیشہ کے لیے فیصلہ کن قرار دیا جائے۔ اسی طرح اور دوسرے طریقے۔

اس کے بعد کتاب کے پہلے باب میں روح اسلام (THE ESSENCE OF ISLAM) کے عنوان سے مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلامی خیالات کا تعارف ہے جو گویا آئندہ بحثوں کے

لیے سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ مصنف کے نزدیک مولانا آزاد اپنی دیگر خصوصیات کے ساتھ انتخابی (Electric) بھی تھے یعنی وہ تمام بڑے مذاہب کی صداقتوں کو ماننے پر زور دیتے تھے اس تعارف کا ماخذ مولانا آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ ہے۔

مصنف کی تشریح کے مطابق مولانا آزاد کے افکار کا خلاصہ یہ ہے۔

قرآن جس زمانے میں اترا' مذہب ایک طبقاتی چیز بنا ہوا تھا۔ ہر طبقہ کا مذہب اپنے ساتھ اعمال و رسوم کی ایک فہرست لیے ہوئے تھا۔ یہ فہرست چونکہ ہر ایک کے یہاں مختلف تھی' اس لیے ہر ایک دوسرے کو غلط سمجھتا تھا اور صرف اپنے مقررہ اعمال و رسوم کی بجا آوری کو نجات کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ اس صورت حال کے فطری نتیجے کے طور پر ایک دوسرے کے خلاف تعصب اور تشدد کا سلسلہ جاری تھا۔ قرآن نے اس غلطی کو واضح کیا۔ اور مذہب کی آفاقی صداقت (Universal Truth) کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اسلام نے بتایا کہ یہ اعمال و رسوم جن کو اصل قرار دے کر تم نے گروہ بندیاں کر رکھی ہیں' یہ اصل مذہب نہیں۔ مذہب کی روح تو خدا پر اعتقاد ہے۔ اور وہ سب کے یہاں ہے۔ گویا ہر مذہب یکساں طور پر صداقت کا حامل ہے خواہ ظاہری اعمال و رسوم میں ان کے درمیان کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو۔ اس طرح قرآن مذہب کی روح (Essence of Religion) اور اس کے ظاہری طریقے (Ritual) کے درمیان فرق کرتا ہے۔ اصل مذہب ایک ہے اور تمام انسانیت کے لیے یکساں ہے۔ ظاہری طریقے ہر ملک اور ہر زمانے کے لیے جدا ہوتے ہیں۔ انسان مذہب کی بنیادی وحدت کو بھول جاتا ہے اور ظاہری اعمال کے اختلاف کو اہمیت دینے لگتا ہے۔ حالانکہ خارجی اعمال اور سماجی طریقے انسان کی روحانی نجات میں کوئی حقیقی موثر کی حیثیت نہیں رکھتے (صفحہ ۲' ۲۲-۲۳)

اس طرح مصنف اس نتیجے تک پہونچے ہیں کہ کسی عملی ڈھانچہ کو لازمی قرار دے کر ہر شخص' ہر ملک اور ہر زمانہ کے لیے اس کی تعمیل پر اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔ جس چیز کے لیے اصرار کیا جا سکتا ہے' وہ مذہب کی اصل روح — اس کا عقیدہ — ہے۔ ظاہری اعمال نہ ضروری ہیں اور نہ ہمیشہ یکساں رہ سکتے ہیں۔

دوسرے باب کا عنوان ہے قانون اور مذہب اسلام میں (Law and Religion in Islam)

جدید علمائے قانون کی تحقیق کے مطابق انسانی قانون تین مراحل سے گزرا ہے:

ابتدائی مرحلہ:- جبکہ قانونی رواج تھے مگر عدالتیں نہیں تھیں۔

درمیانی مرحلہ:- جبکہ عدالتیں وجود میں آگئی تھیں مگر قانون داں نہیں ہوتے تھے۔

ترقی یافتہ مرحلہ:- جبکہ قانون کے ساتھ عدالت اور قانون داں بھی موجود ہیں۔

معلوم ہوا کہ قانون کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو زندگی سے الگ ایک چٹان کی طرح کھڑا ہو۔ وہ زندگی کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ماہر قانون جسٹس ہومز (HOLMES) کے الفاظ میں:

"اگر تمہارا موضوع قانون ہے تو جان لو کہ وہ علم الانسان، اقتصادیات، قانونی نظریات، اخلاق اور پھر مختلف راہوں سے گزرتا ہوا بالآخر تمہارے نظریۂ زندگی تک پہونچتا ہے" صفہ

"ایک اہم قابل لحاظ حقیقت" مصنف کے نزدیک یہ ہے کہ "ہندوازم کی طرح اسلام میں قانون خدا کا بنایا ہوا (GOD MADE) ہوتا ہے۔ انسانی تقاضے، سیاسی ضروریات، تمدنی زندگی اور ارتقائی تحریکات، علم الانسان کے نتائج مطالعہ سے کہ انسان کے اپنے عادلانہ تصورات ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ قانون کا معیاری تصور یہ ہے کہ وہ ایک حکم ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ فقہ کی عمارت انھیں الہی الفاظ پر قائم ہوتی ہے۔ اس طرح قانون کا ماخذ اور اس کا آخری مقصد دونوں الگ ہو جاتے ہیں۔ (یعنی قانون عملاً تو نافذ ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی پر مگر انسان اپنی زندگی کے تقاضوں کے پیش نظر خود قانون بنانے کا حق نہیں رکھتا) جدید یورپی قانون میں عوام کی خواہش قانون کی ماخذ ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے معاملات میں ایک نظم کے تحت لوگوں پر عدل قائم کیا جائے۔ اسلام میں اس کے برعکس قانون کے نفاذ کا مقصد خدا کی رضا حاصل کرنا ہے۔ مشہور مستشرق (SNOUCK HURGRONJE) کے الفاظ میں ــــــ یہ ادائگی فرض کا ایک اصول ہے۔ اس میں انسان خدا کے مقابلہ میں خود اپنا کوئی حق نہیں رکھتا۔" (صفحہ ۲۹)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"بعض مذاہب مثلاً ہندوازم اور اسلام میں قانون کا تصور یہ ہے کہ وہ اپنی آخری شکل میں خدا کا حکم ہے۔ یہ نظریہ کہ قانون خدا کا بنایا ہوا ہے، قانون کی زبان میں صرف ایک قانونی من گھڑت (LEGAL FICTION) ہے جس کا بنیادی مقصد صرف یہ ہے کہ قانون کی مکمل

اطاعت کے لیے اخلاقی فضا پیدا کی جائے۔ اس طرح ایک قانونی معیار (LEGAL NORM) سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ قدیم قومیں جن میں تنظیم اور سماجی احساس اس حد تک نہیں تھا کہ وہ خود اپنے فائدے کی خاطر قانون کی پیروی کریں، اس وقت یہ خوف دلایا گیا کہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے پر خدا کا عذاب ہوگا تاکہ لوگ قانون کی پیروی کریں۔" صفحہ ۳۳

قانون (LAW) اور مذہب (RELIGION) دونوں کا ماخذ ایک ہونے کی وجہ سے مذہبی عقائد کی طرح قانون بھی ایک حالت پر باقی رہ گیا۔ تاریخ کا سبق، سماج کے بدلتے ہوئے حالات، تہذیب کا ہمیشہ بدلتا ہوا ڈھانچہ اور جدید دنیا کے اقتصادی نظام میں ارتقائی عمل، شریعت میں کوئی قابل لحاظ توجہ کا مستحق نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کا قانون بالکل پیچھے چلا گیا اور ارتقاء سے محروم رہ گیا۔ صفحہ ۳۶۔ ۳۷

ارتقاء سے محرومی کی ایک مثال یہ ہے کہ اسلام نے مخصوص حالات میں مردوں کو اجازت دی ہے کہ وہ عورتوں کو اصلاح کی غرض سے مار سکتے ہیں۔ حالانکہ

HARDLY ANY COURT OF LAW WOULD JUSTIFY

SUCH CORPORAL CORRECTION IN THE 20TH CENTURY

(P. 41)

بیسویں صدی میں مشکل ہی سے کوئی عدالت اس طرح کی جسمانی سزا کو حق بجانب قرار دے سکتی ہے

"چوں کہ یہ باب قانون اور مذہب پر بحث کرتا ہے۔" اس لیے مصنف نے "اسلام کے طلبہ کے غور و فکر کے لیے تاریخی تجزیہ کا ایک عقلی طریقہ (RATIONALIZED METHOD OF HISTORICAL CRITICISM) تجویز کیا ہے جو شریعت کے مطالعہ میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔" صفحہ ۴۵

"بہت سے مصنفین نے اسلامی اصول قانون پر تنقید کی ہے کہ وہ غیر ترقی پذیر، جامد اور منجمد ہے۔ یہ تنقید ایک حد تک صحیح ہے اور اس سے بالکل انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایچ۔ اے۔ آر۔ گب —— (H.A.R. GIBB) نے اپنے بصیرت افروز لیکچر —————— اسلام میں جدید رجحانات (MODERN TRENDS IN ISLAM) میں نشاندہی کی ہے کہ بہت سے اچھے مظاہر اور امید افزا امکانات کے باوجود مسلمانوں کا پرانا ذہنی مرض ابھی ان میں باقی ہے، وہ ماضی کی عظمت کے

ایک رومانی تصور میں مگن ہیں اور فکری حیثیت سے مفلوج رہنے کو پسند کرتے ہیں۔" صفحہ ۵۴

"مشرق اوسط کے بارے میں اپنی معلومات اور اسلامی تہذیب اور عربی لٹریچر کے طویل اور گہرے مطالعہ کی بنا پر" مصنف لکھتے ہیں: "اس مستشرق نے موجودہ اسلام کے مرض کی صحیح تشخیص کی ہے ایک مسلمان کی حیثیت سے میں اس تنقید کے وزن کو تسلیم کرتا ہوں، اس چیلنج کو قبول کرتا ہوں اور اس کا ایک حل پیش کر رہا ہوں۔" صفحہ ۵۴

وہ حل یہ ہے کہ ـــــ "اسلام کے اصول قانون (اصول) اور قانونی احکام (فروع) کا مطالعہ سماجی حالات کے ذیل میں کرنا چاہیے۔" یعنی ان تاریخی، سیاسی اور تمدنی حقائق کو معلوم کرنا چاہیے، جو سابق سماج میں کسی شرعی حکم کے تعین کا سبب بنے۔ اس طرح یہ معلوم ہو جائے گا کہ کوئی قانون کس طرح کے حالات میں نافذ کیا گیا اور یہ بھی کہ اب بدلے ہوئے حالات میں کیوں ہم اس قانون کو نافذ نہیں کر سکتے۔

اس تاریخی مطالعہ کو مصنف کے نزدیک درج ذیل پانچ مرحلوں سے گزرنا چاہیے۔

۱۔ اسلام کا کوئی حکم جس سماجی معاملے میں نافذ کیا گیا، اس معاملے میں اس سے پہلے کی سماجی حالت کیا تھی۔

۲۔ قانون ابتداءً اپنی اصل حیثیت میں کیا تھا۔ اس سے قطع نظر کہ بعد کے فقہاء نے اس کی کیا تشریح کی۔

۳۔ اب چودہ سو برس گزرنے کے بعد یہ قانون مسلم ممالک میں کس حالت میں ہے۔ وہ ابھی تک رائج ہے یا حالات بدلنے کی وجہ سے متروک ہو گیا۔

۴۔ کیا ہم اسلام کی روح کو سامنے رکھتے ہوئے قانون کی تعبیر ایسے نئے انداز سے نہیں کر سکتے جو وقت کے تقاضے اور سائنس کی تحقیقات سے زیادہ مطابقت رکھتی ہو۔

کتاب کا تیسرا باب ہے ـــــ اسلامی قانون اور دینیات ہندستان میں:

ISLAMIC LAW AND THEOLOGY IN INDIA

اس باب میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا مقصد مصنف کے الفاظ میں یہ ہے کہ ـــــ "بیسویں صدی کے قانونی اور تاریخی اصولوں کو اسلام کے ایک بنیادی مسئلہ کے سمجھنے میں استعمال

کیا جائے اور شریعت کی جدید تشریح کے لیے ایک تجربی اور آزمائشی طریقہ (TENATIVE METHOD) پیش کیا جائے۔"

"اسلام میں مذہب اور قانون دونوں کا سرچشمہ خدا ہے۔ اگر ہم جدید انداز سے اس مذہبی مفروضہ (THEOLOGICAL DOGMA) یا قانونی من گھڑت (LEGAL FICTION) کا جائزہ لیں تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کون سے تاریخی یا فلسفیانہ اسباب تھے جنھوں نے سامی مذاہب خاص طور پر یہودیت اور اسلام میں یہ تصور پیدا کیا کہ خدا ہی قانون وضع کرنے والا ہے اور کیوں اب جدید قانونی نظریات، سیاسی تبدیلیوں، تمدنی ترقیوں اور بین الاقوامی تعلقات کے بعد ضروری ہو گیا ہو کہ اسلامی سماج مقدس شریعت اور دنیوی قانون کے درمیان واضح امتیاز پیدا کرے۔" صفحہ ۵

اس ضمن میں مصنف نے ہندستان کے مسلمانوں کی تین تقسیمیں کی ہیں۔

۱۔ قدامت پسند مدرسۂ فکر

۲۔ وہ لوگ جو خاص طور پر اقبال کی فکر سے متاثر ہیں۔

۳۔ جدید مدرسۂ فکر (MODERN SCHOOL) اس کے رہنما سرسید احمد خاں، شبلی، آزاد اور اجمل خاں ہیں۔ صفحہ ۷۶

قدامت پسند مدرسۂ فکر شریعت کو بالکل اسی شکل میں رائج کرنا چاہتا ہے جیسے کہ وہ ہزار برس پہلے تھی۔ اس کے برعکس دوسرے دونوں مدارس فکر حالات حاضرہ کے مطابق اسلام پر از سرِ نو غور و فکر کرنے کے قائل ہیں:

"یہ ہر دور کے علماء کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے عقیدہ کی تشریح اپنے وقت کے لحاظ سے کریں اس اصول پر شاہ ولی اللہ، سرسید اور اقبال نے زور دیا ہے۔" صفحہ ۱۱۱۔ ۱۱۰

سرسید، مصنف کے الفاظ میں "ہندستان میں اسلامی فکر کے جدید اسکول کے بانی ہیں۔" (صفحہ ۷) یہی نہیں۔ بلکہ:

"شاہ ولی اللہ اور عبید اللہ سندھی اپنے وقت کے علماء کے درمیان ہراول (VANGUARD) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تصنیفات میں ہندستان میں جدید مذہبی اسکول کے لیے ایک نئی تحریک کا سامان تھا۔ مگر قدیم روایت پسندی اس کے بعد پورے زور سے اٹھی اور وہ

تحریک ختم ہو گئی ——" صفحہ ۴۳

اس باب میں ماضی اور حال کا جائزہ لینے کے بعد وہ مستقبل کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مصنف کا یقین ہے کہ بتدریج تمام انفرادی اور پرسنل قوانین جو قدیم اصولوں پر مبنی ہیں، وہ سب کے سب یا تو ختم ہو جائیں گے یا ان میں اس حد تک اصلاح ہو جائے گی کہ وہ ان عام ملکی قوانین کے ڈھانچے میں بیٹھ سکیں جو مذہب کی تفریق کے بغیر سارے باشندوں کے لیے بنائے گئے ہیں۔ یہ تحریک مختلف شعبوں میں اس وقت بھی چل رہی ہے۔ مثلاً منفق ضوابط، سرکاری شعبے اور خود پرسنل لا مثلاً سول میرج اور طلاق سے متعلق قوانین۔ اس طرح کی تدریجی اصلاح خواہ وہ شرعی قوانین ہی میں کیوں نہ ہو، وہ عقیدہ اسلام کی اصل صداقت (ESSENTIAL TRUTH) کو ختم نہیں کرتی۔ مسئلہ کے زیادہ گہرے اور صحیح جائزے سے معلوم ہوگا کہ بہت سے شرعی اجزا محض بیرونی خول ہیں جو مغز اسلام کے اوپر چڑھے ہیں۔ اور یہ مغز صرف ہر عہد اور ہر دور کی تہذیب کے مطابق نئی تعبیر کے ذریعہ ہی محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اب از سر نو یہ طے کرنا کہ اسلام کے اجزا میں سے کون دوامی (DURABLE ELEMENTS) ہیں اور کون قابل تغیر اجزا (changable elements) یہ موجودہ زمانے میں ہماری ذمہ داری ہے علماء کی روایتی دینیات موجودہ صدی کے ذہن اور نقطۂ نظر کو مطمئن نہیں کر سکتی۔ اسلام کے بنیادی اصولوں کی ایک نئی تحقیق اور نئی تعبیر و تشریح ہمارے دور کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔" صفحہ ۸۲-۸۳

"اگر ہم عالم اسلام کو دیکھیں، خواہ مشرق قریب میں یا مشرق وسطیٰ میں یا مشرق بعید میں، تو ہم لوگوں کی زندگیوں میں چند چیزیں عام طور پر پائیں گے۔ ہم سیاسی کمزوری، معاشی عدم استحکام، روحانی دیوالیہ پن کا مشاہدہ کریں گے۔ ان تینوں میں بھی روحانی دیوالیہ پن تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ یہ وہ قومی مرض —— (ENDEMIC CANKER) ہے جو اسلامی سماج کی طاقتوں کو کھائے جا رہا ہے۔ اس کا اعتراف مسلمانوں نے بھی کیا ہے اور مغربی علماء نے بھی، جن کی اسلام سے ہمدردی ہر قسم کے شبہ سے بالاتر ہے اس لیے اب وقت آ گیا ہے کہ اس سوال پر غور کیا جائے —— اب ہمیں کیا کرنا ہے۔" صفحہ ۸۴

چوتھا اور آخری باب اسلام کی از سر نو تشریح و تعبیر کے مسئلہ پر ہے اور اس کا عنوان ہے:

THE REINTERPRETATION OF ISLAM

مصنف کے خیالات کو جاننے کے لیے یہی باب سب سے زیادہ اہم ہے اور اس اعتبار سے پچھلے ابواب

گویا اسی آخری باب کی تمہید ہیں۔

"اس وقت اسلام میں ایک اندرونی کش مکش جاری ہے۔ اسلام کے عمر رفتہ قوانین (AGELESS CONCEPTS) جدید تمدنی قوانین سے ٹکرا رہے ہیں۔" (صفحہ ۸۰) یہ مصنف کے مقدمے کی بنیاد ہے۔ مثلاً مذہب کا دعویٰ ہے کہ خدا ایک ہے اور ہم سب اس کے محکوم بندے ہیں۔ اس کے برعکس جدید جمہوریت کا اصرار ہے کہ اسٹیٹ ایک ہے اور اس کے قوانین یکساں طور پر سب کے اوپر نافذ ہوتے ہیں۔ (صفحہ ۸۰) گویا مذہب میں جو مقام خدا کا تھا وہ جدید علمی ترقی نے اسٹیٹ کو دے دیا ہے۔ اسی طرح مذہب میں عقیدے کا جو جز ہے وہ اندرونی طور پر ماننے کی چیز ہے۔ اس کے لیے کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ قوانین بجبر نافذ کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح عقیدہ ایک ایسی چیز ہے جس کو بدلنے کی ضرورت نہیں وہ ہمیشہ ایک رہتا ہے اور قانون سماجی حالات کے ساتھ ناگزیر طور پر بندھا ہوا ہے۔ وہ مختلف ملکوں اور مختلف اوقات کے لیے مختلف ہوتا ہے' قانون' وقت اور حالات کی کٹھالی میں دھات کی مانند ہوتا ہے۔ وہ پگھلتا ہے' وہ بتدریج مختلف شکلوں میں منجمد ہوتا ہے۔ پھر وہ دوبارہ پگھلتا ہے اور مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے۔ (صفحہ ۸۰)

انسانی سماج ایک مسلسل ارتقائی عمل سے دوچار ہے۔ یہاں کوئی بھی چیز غیر متحرک نہیں سوا اس کے جو مردہ اور بے روح ہو۔ مذہبی قوانین بھی غیر متحرک (STATIC) نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ مختلف اسلامی ملکوں میں اس طرح کی حیات بخش تبدیلی کا آغاز ہو چکا ہے ــــ پرانے قانون کی سختیوں کو دور کرنے کی غرض سے قدیم اسلامی اصولوں کے ساتھ ایک نئے نظام کا جوڑ لگایا جا رہا ہے۔ یا ایک نیا قانونی نظام شریعت کی جگہ لے رہا ہے۔ تمام اسلامی ملکوں میں یہ دہرا عمل جاری ہے۔ انسانی قانون' یا تو شریعت کے احکام کو ختم کر رہا ہے یا اس میں تبدیلی کر رہا ہے ــــ شمالی افریقہ میں فرانسیسی اصول قانون' وسط ایشیا میں سودیت قانون' ہندستان میں انگلش کامن لا' انڈونیشیا میں ڈچ لا' اور ان سب سے بڑھ کر بین الاقوامی قانون۔ جو نہ صرف یہ کہ شریعت کے قانون کو متاثر کر رہا ہے۔ بلکہ اس نے مسلمانوں کے تصور عدالت تک کو بدل دیا ہے۔" (صفحہ ۸۰)

اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ ہم مذہب کے بارے میں پرانے تصورات کو بدل دیں اور چند باتیں بطور اصول تسلیم کر لیں۔ مصنف کے نزدیک یہ خاص طور پر تین ہیں:

۱۔ مذہب اور قانون کی تشریح بیسویں صدی کی اصطلاحات کی روشنی میں کی جائے۔

۲۔ اسلام کے دو حصے کرکے مذہب (عقیدہ) اور شریعت (قانون) کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا جائے۔ ــــ اور یہ مان لیا جائے کہ جہاں تک قانون کا تعلق ہے وہ قابل تغیر ہے۔

۳۔ اس بنیاد پر از سر نو اسلام کی تشریح کی جائے اور اسلام کے عقیدے کو ایک نیا مفہوم دیا جائے۔

"اگر اس تجزیے سے" مصنف لکھتے ہیں" کچھ ایسے عناصر جن کو ہم روح اسلام کے اجزا سمجھتے رہے ہیں، متاثر ہوں یا سرے سے ترک ہو جائیں تو ہمیں حالات کے اس فیصلے کو قبول کرنا چاہیے۔ اگر اندرونی عقیدہ بچایا جا سکتا ہو اور اس کو طاقتور بنایا جا سکے، تو اس قسم کا آپریشن، اگرچہ وہ کافی تکلیف دہ ہوگا، لیکن وہ ایک ایسے جسم کو صحت اور طاقت دے گا جو خون کی کمی کی وجہ سے سوکھ رہا ہے! دوسری رہنمائی کے لیے کوئی دوسرا اصول موجود نہیں۔" صفحہ ۸۰

اس کے بعد مصنف نے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ راسخ العقیدہ مسلمان

۲۔ غیر راسخ العقیدہ یا غیر مقلد مسلمان

راسخ العقیدہ سے وہ تمام لوگ مراد ہیں جو اب بھی اس پر مطمئن ہیں کہ بہ حیثیت مجموعی مذہب کی وہ تفصیلی صورت جو ائمہ اربعہ نے مقرر کی ہے، وہی اصل مذہب ہے اور آج بھی مسلمانوں کے لیے وہ مفید ہے اور اس میں کسی قسم کی انقلابی تبدیلی خطرناک ہوگی۔ یہ لوگ اب بھی سنجیدگی کے ساتھ مخصوص روایات پر یقین رکھتے ہیں اور بڑے پیمانے پر اسی پر عمل کر رہے ہیں۔ مثلاً نماز، روزہ، حج وغیرہ اگر وہ کچھ احکام پر عمل نہ بھی کر پاتے ہوں تو وہ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ غلطی کر رہے ہیں۔ اور یہ کہ ان کے لیے اچھا ہوگا کہ وہ قدیم روایتی ڈھانچہ کو پوری طرح برقرار رکھیں۔

غیر راسخ العقیدہ یا غیر مقلد وہ ہے جو اسلام کی باضابطہ روایات پر عقیدہ نہیں رکھتا۔ وہ ائمہ کی مقرر کی ہوئی مذہبی بنیاد کو نہیں مانتا۔ عقیدہ کا سنجیدہ اقرار اسلام کی واحد کسوٹی ہے۔ اسلام کے اعمال اپنی تمام تفصیلات میں قبول نہیں کیے جا سکتے۔ اسی طرح اگر آپ خدا اور رسول کے سوا دوسرے عقائد کو رد کر دیں تو آپ پھر بھی غیر مقلد مسلمان باقی رہیں گے ــــــ مصنف کے

نزدیک ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ایک معقول تعداد اسی دوسری قسم سے تعلق رکھتی ہے صفحہ ۹۱
"میں اسی قسم کا ایک غیر مقلد (NON CONFORMIST) مسلمان ہوں" مصنف لکھتے ہیں۔
"یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ میں مذہب کا منکر نہیں ہوں مگر وہ شخص ہے جو سرے سے مذہب یا اسلام کی حقیقت کا انکار کرے یا کم از کم مذہبی عقاید کے بعض بنیادی اصولوں کو چیلنج کرے۔ ایک غیر مقلد، مذہب کے بعض اعمال یا تصورات پر معترض ہو سکتا ہے۔ یا اس کا انکار کر سکتا ہے۔ مگر پھر بھی وہ بنیادی طور پر ایک مذہبی آدمی ہوگا۔ وہ مذہب میں اپنی ذاتی بصیرت کے مطابق اعتقاد رکھتا ہے نہ کہ روایتی تصورات کے مطابق۔ میں یہ ماننے سے انکار کرتا ہوں کہ عقائد کا موجودہ ڈھانچہ ہمارے لیے مفید یا ہمارے موجودہ زمانے میں بھی وہ اپنے اندر صداقت رکھتا ہے۔ میں پسند کرتا ہوں کہ اپنے عقیدے کی از سر نو تشریح کروں۔ میں اس مروجہ تشریح کو قبول نہیں کر سکتا جو سنی علماء یا شیعہ مدارس فکر نے پیش کی ہیں۔ پیچیدہ تفصیلات، بے معنی رسوم اور بے مدرج تصوارت نے مجھے جمود میں مبتلا کر دیا ہے۔ ذیل میں میں کوشش کروں گا کہ مختصر طور پر اسلام کی آزادانہ تشریح (LIBERAL INTERPRETATION) کی ایک اسکیم پیش کروں۔ صفحہ ۹۱

تاریخی طریقہ

(HISTORICAL APPROACH)

اسلام کا پیغام چودہ سال پہلے کے دور میں آیا تھا۔ کیا اب اس کی نئی تشریح کی ضرورت ہے۔ کیا وہ تمام دنیا اور ہر زمانے کے لیے نہیں۔ دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں ہے۔ خواہ ایک پیغام سچا ہو اور خواہ وہ ایک مفہوم میں دوامی بھی ہو، پھر بھی اسی ارتقاء کے تحت ضروری ہے کہ اس کو جدید دنیا کی سائنس، فلسفہ، نفسیات، مابعد الطبیعات اور دینیات کے تحت سمجھا جائے ورنہ دنیا کا فکر اور اس کی روشنی اسے ختم کر دے گی۔

انسان کی تاریخ میں یہ تقریباً صرف دس ہزار برس پہلے کی بات ہے کہ اس کے ذہن میں خدا کا تصور آیا جو اس کی قسمت پر حکمراں ہے۔ آسمان کے ستارے، جنگل کے درندے، ہوا کی چڑیاں، خشکی پر رینگنے والے جانور اور سمندر کی مچھلیاں مافوق الفطرت ہستیاں تصور کی گئیں

جو قضیاں پہونچانے کی طاقت رکھتی ہیں اور ساری دنیا میں انسان نے ان خداؤں کو پوجا شروع کیا اور قربانی بھی، مذہبی اعمال و رسوم اور رقص کے ذریعہ اس نے کوشش کی کہ انکی کا قہر سے بچ سکے اس کے تقریباً پانچ ہزار برس بعد یعنی اب سے پانچ ہزار برس پہلے مصر یونان یا اس کے پاس اور ہندستان میں معلوم تاریخ میں پہلی بار انسان اس عقیدہ تک پہونچا کہ خدا ہزاروں نہیں بلکہ صرف ایک برتر ہستی ہے۔ ایک برہم، ایک وجود مطلق (ABSOLUTE) ایک خالق، رام یا رحیم جس نام سے بھی تم اسے پکارو، وہی ایک عبادت کا مستحق ہے۔ ایک لمبی دکھ بھری تلاش کے بعد انسان اس عظیم دریافت تک پہونچا۔ بلاشبہ انسان کی تاریخ میں واحد عظیم ترین دریافت! جو زیادہ عظیم ہے جزیرہ کی دریافت سے، آگ کی دریافت سے، لوہے اور نظریہ اضافیت کی دریافت سے یا اور کسی دریافت سے وحدانیت کا تصور نہایت نادر چیز ہے۔ وہ ایک پراسرار طاقت ہے، وہ مایوس روحوں کو زندگی دیتا ہے، وہ زندگی کو بامعنی بناتا ہے۔ وہ آدمی کو وہ کچھ دیکھنے کے قابل بناتا ہے جو وہ نہیں جان سکتا۔ وہ انسانی علوم اور ان کی تبدیلیوں پر منحصر نہیں ہے۔ یہ ایک دوامی تصور ہے جو بدلتا نہیں جس کے لیے نہ زوال ہے نہ نقص۔ یہ پیغام اکثر کسی حساس انسان کی مرتعش روح کی معرفت آیا ہے۔ انھیں منتخب لوگوں میں سے ایک پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں۔ ان کی تحریکی تاریخ، ان کا ذہنی کرب اور بالآخر روشنی کا حصول قرآن میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب سچائی کے اس اندرونی ادراک سے بھری ہوئی ہے جس نے انسانی تاریخ کو خدا کی معرفت بخشی۔ (یہاں مصنف نے مثال کے طور پر سورہ تکویر کا ترجمہ نقل کیا ہے)

خدا کے وجود کا عقیدہ تجربے پر منحصر ہے۔ وہ نہ ثابت کیا جا سکتا نہ ہی غلط ٹھہرایا جا سکتا۔ انسانی عقل یا معلومات یا سائنس کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ سائنس کے مفروضے، نظریات اور حقائق عین اپنی فطرت کے اعتبار سے قابل تغیر ہیں مگر خدا کا عقیدہ ناقابل تغیر اور وجدانی ہے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں، ان کے لیے یہ انسان کی عظیم ترین واحد دریافت ہے۔

مگر اس کامل صداقت کا انتقال ایک ناقص ذریعہ سے ہوتا ہے یعنی زبان کے ذریعہ سے۔ زبان ایک انسانی چیز ہے۔ وہ بدلتی رہتی ہے۔ کوئی زبان پانچ یا دس ہزار برس سے زیادہ پڑھی اور سمجھی نہیں جا سکتی۔ ہماری زمین پر ایسی بہت سی انسانی تحریریں موجود ہیں جن کا مطلب جاننے

والے لوگ آج نہیں. عرب کی قدیم زبان میں پچھلے دو ہزار برس کے اندر کافی تبدیلیاں ہو چکی ہیں. اور لسانیات کا مطالعہ قطعی طور پر بتاتا ہے کہ الفاظ کے معانی اور ان کے باہمی فرق میں ارتقائی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں. کوئی زبان ٹھہری ہوئی نہیں رہتی. جب یہ ظاہر ہے کہ پیغمبر کے زمانہ میں عرب جو زبان استعمال کرتے تھے اس میں بہت کچھ تبدیلیاں ہو چکی ہیں اور ہوتی رہیں گی، یہاں تک کہ وقت گزرنے کے بعد اس کا سمجھنا اتنا ہی مشکل ہو سکتا ہے جتنا کہ موہن جو داڑو کی زبان کا سمجھنا. مگر ہم مسلمان یقین رکھتے ہیں کہ اس کا مرکزی پیغام اس کی زبان سے زیادہ مدت تک باقی رہے گا. اور وہ ہے خدا کا عقیدہ —— "آسمان اور زمین فنا ہو جائیں گے مگر میرا کلام فنا نہ ہوگا."
(انجیل، صفحہ ۹۲)

اس لیے میرے نزدیک یہ بالکل واضح ہے کہ ہم قرآن کی طرف واپس نہیں جا سکتے. البتہ قرآن کو لے کر آگے بڑھ سکتے ہیں. میں قرآن کو سمجھنا چاہتا ہوں اس مفہوم میں جیسے کہ پیغمبر کے زمانے کے عربوں نے سمجھا تھا. مگر صرف اس کی تعبیر نو کے لیے اور اس کو اپنی زندگی کے حالات پر منطبق کرنے اور اس پر اس حد تک عقیدہ رکھنے کے لیے جس حد تک وہ بیسویں صدی کے انسان کی حیثیت سے مجھے اپیل کرتا ہے. مجھ سے صحرا میں رہنے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ میں اونٹ پر سواری کروں اور گرشے گھوڑے کھاؤں. قبائلی لڑائیوں میں شریک ہوں اور داڑھی رکھوں اور چغہ پہنوں اور ایک دقیانوسی عرب کی ذہنیت اپنے اندر پیدا کروں. مجھے فرق کرنا چاہیے. شاعرانہ حقیقت (POETIC TRUTH) اور حقیقی صداقت FACTUAL TRUTH میں. میں فرق کروں گا مذہب کے مغز اور اس کے چھلکے میں، قانون میں اور مذہبی افسانہ میں. مجھے اسلام کے پیغام کو ایک جدید انسان (MODERN MAN) کے طور پر سمجھنا اور قبول کرنا ہے نہ کہ ایسے شخص کی طرح جو صدیوں پہلے رہتا تھا. میں محترم شخصیتوں کا احترام کرتا ہوں مگر شعوری معاملات میں بلا کیف (WITHOUT HOW) کسی بات کو تسلیم نہیں کر سکتا.

اسلام کی بنیاد قرآن پر ہے. اور قرآن کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تشریح تاریخی اصولوں کے مطابق کی جائے. سب سے پہلے ہم ماقبل اسلام عیسائیت اور یہودیت کا مطالعہ کریں گے. یہودیت اور عیسائیت کو ان کے تاریخی پس منظر میں پوری طرح سمجھنے کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ پیغمبر اسلام

کو صحیح طور پر سمجھا جا سکے۔

ہندستان ایک مذہبی ملک ہے۔ ہم ہندستان میں بالخصوص زیادہ بہتر طور پر اس پوزیشن میں ہیں کہ مذہب کی تعبیر کر سکیں۔ یہاں ہندو، بدھسٹ، جینی، سکھ، عیسائی، زرتشت کے پیرو، یہودی اور مسلمان ایک سیکولر دستور کے سایہ میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ جو قانونی طور پر ہر عقیدہ کی یکساں ضمانت دیتا ہے۔ یہ دستور ہماری طویل رواداری روایت کے مطابق ہر شہری کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنا عقیدہ رکھے، اس پر عمل کرے اور اس کی تبلیغ کرے۔ اس طرح ہندستان کے مسلمان اپنی زندگی کے ہر دن اپنے ہم وطنوں کے ساتھ اپنے عقائد اور مذہبی اعمال کا مقابلہ کر کے اسے سمجھ سکتے ہیں۔ ہندو مذہبی شخصیتوں کا احترام مسلمانوں کی طرف سے اور مسلم مذہبی شخصیتوں کا احترام ہندوؤں کی طرف سے اس ملک کی عام خصوصیت ہے۔ یہ اسلام کی ایک ہندستانی تعبیر (INDIAN INTERPRETATION OF ISLAM) ہے جو تعصب اور مذہبی دیوانگی کو ختم کرنے والی ہے اور انتخابیت (ELECTICISM) اور رواداری کو جنم دیتی ہے۔ (۹۴)

(باقی)

بعض مفید کتابیں

فضائل صبر و شکر :- از افاضات حکیم الامت تھانویؒ — قیمت ۸/۰

شمائم امدادیہ :- قیمت ۲/۰ — حالات مشائخ کاندھلہ قیمت ۳/۵۰

تذکرہ حسن :- سوانح حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ — قیمت ۲/-

تہذیب النسواں :- نواب شاہ جہاں بیگم (سابق والیہ بھوپال) — قیمت ۴/-

اصول فقہ :- مولانا قاری حبیب الرحمٰن صدیقی — قیمت ۴/۲۵

محمدیہ پاکٹ بک :- (رد قادیانیت) — قیمت ۶/-

ملنے کا پتہ :- کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ۔

ایک تاریخی وثیقہ

مولانا سندھی کے ساتھی ظفر حسن صاحب کی "آپ بیتی"

سنہ ۱۹۱۰ء کے بعد پاک و ہند کے مسلمانوں میں یک بارگی برطانیہ دشمنی کی ایک لہر اٹھی تھی، جو سنہ ۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان اور اس کے بعد ۱۹۱۱ء کی جنگ طرابلس کی وجہ سے برابر زور پکڑتی گئی پھر پہلی جنگ عظیم شروع ہوتی ہے، گو اس جنگ کے دوران برطانوی حکومت کے جبر کے تحت مسلمان خاموش رہے لیکن جیسے ہی جنگ ختم ہوئی ان کی یہ برطانیہ دشمنی ایک طوفان کی شکل اختیار کر گئی چنانچہ خلافت تحریک کے سلسلے میں کوئی بیس ہزار مسلمان بڑے جوش و خروش سے جیلوں میں گئے اور اس وقت برطانیہ دشمنی اسلام کا ایک لازمی شعار سا بن گیا۔

برطانیہ دشمنی کی اس لہر کے اہم مرکز علی گڑھ کالج، لاہور اور بعض دوسرے شہروں کے کالج تھے یعنی گذشتہ تیس چالیس سالوں سے ان کالجوں میں جن مسلمان نوجوانوں کو حکومت وقت کی وفاداری کی تلقین ہو رہی تھی ان ہی میں سے بعض ایسے نوجوان اٹھتے ہیں جو برصغیر سے برطانوی اقتدار کو ختم کرنے کے لیے جان کی بازی لگاتے ہیں، اور وہ کچھ کر گزرتے ہیں کہ ان کے کارنامے آج ہمیں ایک افسانہ معلوم ہوتے ہیں۔

ان مسلمان نوجوانوں کے دلوں میں برطانیہ دشمنی کی اس آگ کو ہوا دینے میں مولانا محمد علی مرحوم کے انگریزی ہفتہ روزہ "کامریڈ" علامہ اقبال کی ملی نظموں اور مولانا ابوالکلام آزاد کے "الہلال" کا بڑا دخل تھا۔ زیر نظر کتاب "آپ بیتی" کے مصنف محترم ظفر حسن صاحب

اس دور کے ان مسلمان نوجوانوں میں سے ایک تھے' جنہوں نے اس سرزمین سے برطانیہ کو نکالنے اور اس سرزمین سے باہر دوسرے مسلمان ملکوں کو اس کے چنگل سے بچانے کی خاطر ۱۹۱۵ء میں اپنے قدیم وطن کو خیرباد کہا، اور اب اپنے نئے وطن ترکی میں ابھی اس پچاس سال کی جدوجہد کی ایک مختصر کہانی ہمیں سنا رہے ہیں۔

محترم ظفر حسن صاحب حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کے معتمد ترین' مخلص ترین اور قابل ترین ساتھیوں یا زیادہ صحیح الفاظ میں جیسے کہ وہ خود بار بار اس کتاب میں اپنا تعارف کراتے ہیں' شاگردوں میں سے فائق ترین ہیں۔ اور ان کی یہ "آپ بیتی" ایک لحاظ سے حضرت مولانا عبیداللہ سندھی ہی کی آپ بیتی کا ایک حصہ ہے۔ اور اس سے نہ صرف ان دونوں بزرگوں کی زندگی اور جدوجہد کی ایک تصویر ہمارے سامنے آتی ہے بلکہ اس دور کی برصغیر اور اس کے علاوہ بین الاقوامی سیاسیات کی تاریخ سے ہم متعارف ہوتے ہیں۔

ظفر حسن صاحب ۱۹۰۵ء میں کرنال میں پیدا ہوئے' ان کا خاندان ایک مذہبی خاندان تھا۔ مشہور بزرگ، مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری جنہیں "وہابیوں" کے لیے خفیہ چندہ کرکے سرحدی علاقے میں بھیجنے کے الزام میں کالا پانی کی سزا دی گئی تھی' آپ کے رشتہ دار تھے چنانچہ ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں:۔

"میں نے ان کو کئی دفعہ جب میں بہت چھوٹی عمر کا تھا' دیکھا تھا اور ان کو بچا جی کہہ کر پکارا کرتا تھا۔"

ظفر حسن صاحب نے پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کیا۔ اور اس میں وظیفہ لیا جس کی وجہ سے وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گئے'' ایف ایس سی میں بھی ان کو وظیفہ ملا۔ اور بی اے میں انھوں نے ریاضی لی۔ اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

> "مجھے گورنمنٹ کالج میں آئے ہوئے ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ جنگ بلقان شروع ہو گئی۔ اس کے بعد جنگ طرابلس ہوئی۔ اس سے مسلمانوں میں بہت بے چینی پھیلی۔ ترکوں کی حمایت میں عام جلسے ہونے لگے۔ چندے جمع کیے جانے لگے...... ڈاکٹر اقبال مرحوم ان جلسوں میں اپنی نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ میں بھی اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ ان جلسوں

تھا شریک ہوا کرتا تھا طرابلس کے شہیدوں کے بارے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی اس نظم کا بھی کا عنوان "حضور رسالت مآب میں" ہے ہمارے دلوں پر بہت اثر ہوا۔"

اس نظم کے آخری دو شعر یہ ہیں:-

نگہ میں نذر کو آبگینہ لایا ہوں — یہ چیز وہ ہے کہ جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں — طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

ترکوں کے خلاف انگریز اور دوسری یورپی قومیں جس طرح برسرپیکار تھیں اور ان کو ختم کرنے کا تہیہ کر چکی تھیں اس سے مسلمانان پاک وہند کے جذبات بڑے مشتعل تھے۔ اس کے نتیجے میں جہاں ایک طرف انگریزوں سے نفرت بڑھ رہی تھی، وہاں دوسری طرف کالجوں میں پڑھنے والے مسلمان نوجوانوں میں اسلامیت کا جذبہ ابھر رہا تھا۔ اسی زمانے میں ایم۔ او۔ کالج علی گڑھ کے طلبہ نے گوشت کھانا چھوڑ دیا اور اس طرح جو پیسے بچائے وہ ترکوں کی امداد کے لیے بھیجے۔ ان ہی دنوں کا ذکر ہے ایم او کالج کے طلبہ یہ لا پتے سنے جاتے تھے، "بلقان چلو بلقان چلو" مولانا شبلی کی مشہور نظم شہر آشوب اسلام اسی دور کی یادگار ہے۔ اس کا مشہور شعر ہے:

کہاں تک ہم سے لوگے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤگے ہمیں جنگ صلیبی کا نشاں کب تک

اسلامی ہند کی یہ فضا تھی، جس سے ظفر حسن صاحب اور ان کے گورنمنٹ کالج لاہور کے بعض دوسرے ساتھی متاثر ہوئے۔ چنانچہ جہاں وہ پابندی سے نمازیں پڑھنے لگے، وہاں برطانوی حکومت کے خلاف کچھ نہ کچھ کرنے کے منصوبے بنانے میں لگ گئے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے، وہ لکھتے ہیں۔

> کالج کے باغ کے کمپاؤنڈ میں مسلمان طالب علموں نے نماز کے لیے ایک چبوترہ بنایا تھا۔ اسی کے نزدیک کسی بزرگ کی قبر تھی ...... ہم صبح کی نماز اکثر جماعت سے پڑھا کرتے تھے۔

ظفر حسن صاحب کے کئی ایک اور ساتھی تھے، جن میں سے اکثر ان کے ساتھ ۱۹۱۵ء میں عازم کابل ہوئے اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں۔

> جنگ بلقان کی خبریں اکثر بحث میں آیا کرتی تھیں۔ اور ہم سب ترکوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ہمارے اس زمانے کے قومی و مذہبی خیالات کی نشوونما میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے انگریزی اخبار کامریڈ اور مولانا ابوالکلام مرحوم کے ہفتہ وار "الہلال" اور "البلاغ" کا بہت

اور ان ہی اخبارات کے مقالات نے ہمیں ترکوں کا گرویدہ بنا دیا۔ انگریزوں کے خلاف بھی ہمیں ان

ہی تحریروں نے ابھارا اور ہم میں قومی جذبات بھی ان ہی تحریروں نے پیدا کیے۔

موصوف اپنے ایک ساتھی خوشی محمد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں کالج کے بورڈنگ میں ان کے کمرے میں پانی لینے گیا، تو دیکھا کہ اس نے صراحی توڑ دی ہے اور وہ مغموم بیٹھا ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا بلغاریوں کے ترکوں کے شہر اڈریانوپل پر قبضہ کرنے کی خبر آئی ہے، اور میں نے اظہار غم میں صراحی توڑ دی ہے۔ یہ خوشی محمد ظفر حسن صاحب کے ساتھ کابل گئے، اور وہاں سے روس چلے گئے۔

یہ تو بہرحال نوجوان تھے، اور ان کی جذباتیت سمجھ میں آتی ہے، لیکن اس دور میں بڈھوں کا کیا حال تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے۔

مولانا محمد علی مرحوم نے اپنی ایک نامکمل تصنیف میں لکھا ہے

میں بلقان کی پُرمصائب جنگ کے دوران میں ایک وقت شدت جذبات سے اتنا بے قابو ہو گیا تھا، میں آج یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اس وقت خودکشی کرنے تک کا سوچا....

.... اس رات اس مضمون کا رائٹر کا آخری تار مجھے ملا تھا کہ بلغاریہ کی فوجیں قسطنطنیہ کی دیواروں سے صرف ۲۵ میل دور رہ گئی ہیں۔ وہ قسطنطنیہ جو گزشتہ پانچ صدیوں سے ہر مسلمان کے لیے اس کی سب سے اعلیٰ امیدوں کے مرکز ہونے کی وجہ سے مقدس تھا۔"

وہ تو اتفاق سے عین اس وقت ان کا ایک بے تکلف دوست آ گیا، جو انہیں زبردستی وہاں سے اٹھا کر لے گیا ورنہ مرحوم کے الفاظ میں "ایک ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور خون سے لت پت جسم کا ہولناک منظر دیکھنا پڑتا جس کے بارے میں تیسری منزل سے اتفاقیہ گرنے کا حکم لگایا جاتا۔"

ترکوں کو جن مصائب سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا، اس کی وجہ سے ان سے ہمدردی کا جذبہ جس حد تک پہنچ گیا تھا، وہ آپ نے دیکھا۔ اور بقول ظفر حسن صاحب کے خوشی محمد اور ان کے چند دوستوں نے جن میں ہمارا ہم جماعت شجاع اللہ بھی شریک تھا یہ سوچا کہ گورنمنٹ کالج کو آگ لگا کر انگریزوں سے انتقام لیں۔ ۔ ۔ شجاع اللہ نے ایک رات کو کالج کے کلارک کے کمرے کی کھڑکی کا شیشہ مکا مار کر توڑا۔ اور ان کے ساتھیوں نے کچھ مٹی کا تیل کمرے میں چھڑک کر مٹی کے تیل میں ڈوبے ہوئے جلتے چیتھڑوں

کو اندر پھینکا اور دفتر کو جلانے کی کوشش کی لیکن آگ زیادہ نہ جلی اور دفتر کے کاغذات وغیرہ کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہونچا ۔۔۔۔۔ "

گورنمنٹ کالج لاہور کے ان طالب علموں نے بنگالی ہندوؤں کی طرح بم بنانے کا بھی سوچا چنانچہ اس لیے فیصلہ ہوا کہ مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم سے جو اس وقت کلکتہ میں " الہلال " نکالا کرتے تھے، مل کر ان کے ذریعہ سے بم حاصل کریں۔ اس غرض سے ہم نے شیخ عبداللہ کو کلکتہ بھیجا لیکن وہ وہاں سے خالی ہاتھ لوٹا کیونکہ مولانا آزاد مرحوم کو ایسی سازش کی کارروائی سے اور قتل وغارت سے کوئی تعلق نہ تھا۔"

ان ہی دنوں پہلی جنگ عظیم شروع ہو جاتی ہے۔ اور اس میں ترکی جرمنی کے ساتھ انگریزوں کے خلاف شامل ہوتا ہے۔ ظفر حسن صاحب اور ان کے ساتھی ایک برطانوی جریدہ میں سلطان ترکی کی ایک تصویر دیکھتے ہیں، جس میں وہ ایک عام جلسے میں جہاد کا فتویٰ پڑھ رہے تھے۔ اس تصویر کے نیچے برطانوی جریدے نے تحقیر آمیز عبارت لکھی تھی۔

۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ میں حضرت سید احمد اور حضرت شاہ اسمٰعیل کی شہادت کے بعد ان کے ماننے والوں میں سے مجاہدین کی ایک جماعت نے افغانستان اور ہندوستان کی سرحد کے آزاد علاقے میں اپنے مرکز قائم کر لیے تھے اور وہاں سے خفیہ طور پر ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف کام ہوتا تھا۔ ان ہی دنوں اس جماعت کے بعض نمائندوں کا ظفر حسن صاحب اور ان کے ساتھی طالب علموں سے ربط پیدا ہوتا ہے۔ ان نمائندوں کو جب اطمینان ہو گیا تو انھوں نے خلیفۃ المسلمین کے فتویٰ جہاد کی ایک نقل ہمارے پاس بھیج دی۔ اس سے ہم سب میں ترکوں کی صفوں میں شریک ہو کر انگریزوں کے برخلاف جہاد کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ ہمارے اس قسم کے خیالات کو قوی تر بنانے کے لیے انھوں نے ہمیں ــــ سیپارہ (۱۰) سورہ توبہ رکوع ۲ کی اس آیت کو قل ان کان اباءکم وابناؤکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ واللہ لا یھدی القوم الفاسقین پڑھ کے اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی نصیحت

کی اور کہا کہ جہاد کے لیے اس دار الکفر سے نکل کر ہمیں ایک دار الاسلام میں چلا جانا چاہیے اور وہاں سے ترکی فوج میں داخل ہونے کے لیے ترکی پہونچنا چاہیے۔ ہم سب اس پر راضی تو ہو گئے لیکن میں نے استخارہ کیے بغیر اس طرح کا فیصلہ کرنا نہ چاہا.....“

موصوف کے بی اے کے امتحان میں صرف ایک ماہ باقی تھا۔ اور چونکہ وہ بڑے محنتی تھے اور جماعت میں ہمیشہ اوّل رہتے تھے۔ اس لیے خود ان کے الفاظ میں ”مجھ سے یہی توقع کی جاتی تھی کہ میں اسٹیٹ سکالرشپ لے کر ولایت جا سکوں گا۔ چودھری ظفر اللہ صاحب پہلے مسلمان تھے، جن کو یہ وظیفہ ملا تھا۔ ان کے بعد کئی سال تک کسی مسلمان کو یہ وظیفہ نہ مل سکا۔ اب سب مسلمانوں کی امیدیں اس پر لگی ہوئی تھیں کہ یہ وظیفہ پھر ایک مسلمان طالب علم کو ملے گا...“

۵ر فروری ۱۹۱۵ء کو جمعہ کی نماز کے بعد ان طالب علموں کا پہلا قافلہ لاہور سے روانہ ہوا سب سے پہلے یہ ہری پور ہزارہ پہونچا، وہاں سے ریاست امب کی حدود میں داخل ہوا۔ نواب امب کے وزیر اعظم جماعت مجاہدین کی خفیہ طور پر حمایت کیا کرتے تھے۔ ہری پور سے یہاں تک پہونچنے میں ان نوجوانوں کو جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وزیر اعظم مذکور کے ہمدردانہ الفاظ سے ان کی کچھ تلافی ہو گئی۔ یہاں سے اس قافلے نے دریائے سندھ پار کیا۔ ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں:

> دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر اتر کر ہم نے اللہ اکبر کے نعرے لگائے اور خدا کا شکر کیا کہ خیریت سے سلامتی کی جگہ پر پہونچ گئے ... ... اب میں ایک ایسی سرزمین کی طرف روانہ ہو رہا تھا جہاں نہ کوئی میرا واقف تھا اور نہ وہاں کی زبان میں سمجھتا تھا۔ اس سرزمین میں کیسے گزارہ کروں گا۔ وہاں کوئی مفید کام کر سکوں گا یا نہیں، یہ سب کچھ مجہول اور نامعلوم تھا۔ اگر تسلی تھی تو صرف یہ تھی کہ اسلامی احکام کی پابندی کے لیے یہ سب پابندیاں عائد کر رہا ہوں۔

دریائے سندھ کو پار کرنے کے بعد انتہائی کٹھن سفر طے کر کے یہ قافلہ جماعت مجاہدین کے مرکز اسمس واقع علاقہ بنیر میں پہونچا۔ اس مرکز کی اس وقت کیا حالت تھی، اس کا مختصر خلاصہ ”آپ بیتی“ میں یوں دیا گیا ہو“..... جماعت مجاہدین جو ایک مقصد کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کے ارکان، بہت خاص اور جاں نثار تھے۔ سراپا عمل اور ہر قسم کی مصیبتوں کے سامنے سینہ سپر

ہونے کو تیار تھے۔ ان کو نہ مال و دولت کی آرزو تھی اور نہ دنیاوی جاہ و عزت کی تمنا تھی۔ وہ تو صرف جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اپنی جانیں وقف کر چکے تھے اور اس امید پر کہ ان کو ایک دن کفار سے لڑنے، جہاد کرنے اور میدان جنگ میں جام شہادت پینے کا موقع ملے گا۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کو دنیا کے تبدیل شدہ حالات کے مطابق کوئی تعلیم و تربیت دینے والا اور ان کو نئی فوجی قواعد سکھانے والا نہ تھا۔ ان میں سے بہت سے بالکل ان پڑھ تھے۔ ان کے پاس نئی بندوقیں صرف چند ایک تھیں۔۔۔۔ یہ بندوقیں زمس مجاہدین کے محافظین کے ہاتھ میں تھیں۔ باقی لوگوں کے پاس چقماقی یا فلیتلی بندوقیں تھیں جن کا استعمال اب دنیا میں شاید کہیں بھی نہ رہا تھا۔۔"

ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں کہ یہ جماعت دنیا کی ترقیات اور زمانے کی رفتار سے بالکل بے خبر رہ کر ایک طفیلی اور مسکین سی ٹولی بن گئی تھی جس کا گزارہ یا تو ہندوستانی مسلمانوں کے چندے پر تھا یا حکومت افغانستان کے وظیفہ پر۔

نوجوان طلبہ کا قافلہ چند دن یہاں رہا اور مصنف آپ بیتی کے الفاظ میں اس ناگفتہ بہ حالت کا "ہم پر بہت برا اثر ہوا۔ ہم اس نتیجے پر پہونچے کہ یہاں رہ کر ہم ہندوستان کی آزادی کے لیے کچھ کام نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہمیں کابل جانا چاہیے تاکہ افغانی حکومت کو جنگ میں شامل ہونے پر راضی کریں۔ اگر کامیابی نہ ہو تو ترکی چلے جائیں اور وہاں ترکی فوجوں میں بھرتی ہو کر انگریزوں کے خلاف لڑیں۔ اس لیے کابل کو مجاہدین کا ایک وفد بھیجا گیا تاکہ ہمارے کابل جانے کا راستہ صاف کیا جائے اور افغانی حکومت سے ہمارے لیے کابل جانے کی اجازت لی جائے۔"

آخر کابل جانے کی اجازت آگئی۔ بڑی مشکلوں سے اور سخت جاں گداز تکلیفوں کے بعد ظفر حسن صاحب اور ان کے ساتھی جلال آباد پہونچے۔ جلال آباد میں انھیں نہایت گندی سرائے میں ٹھہرنا پڑا۔ لیکن اس کے بعد ان نوجوان طلبہ کے ساتھ جو اسلام اور مسلمان ملکوں کی خدمت کے لیے اپنا گھربار، عزیز و اقارب اور وطن چھوڑ کر اور اپنے مستقبل کی تمام امیدوں کو ختم کر کے ایک آزاد مسلمان ملک میں وارد ہوئے تھے، کیا سلوک کیا گیا۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

ہم رات کو رباط آکر سو رہے لیکن صبح کے قریب جب رحمت علی اور عبدالرشید وضو کے

کہ ہم سارے باہر نکلنے لگے تو ان کو ایک سپاہی نے جس کی بندوق پر سنگین زبر بھی لگی ہوئی تھی، معہ کاندر سنگین کو ان کی طرف پھیر کر بہت غصے سے کہا۔ موقف است بیرون بر آمدہ نمی توانی (یعنی تمہارے لیے باہر جانا منع ہے) یہ بیچارے ڈر کر پریشانی کی حالت میں واپس آئے۔ جب دن نکلا تو ہم نے دیکھا کہ ہم سب کے سب نظر بند ہیں اور ہم پر ہتھیار بند سپاہیوں کا پہرہ لگا ہوا ہے....."

ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں کہ یہاں سے ہماری وہ نظر بندی شروع ہوئی جو چار سال یعنی ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خاں کے قتل تک جاری رہی۔

اس نظر بندی کی وجہ تھی کہ ان طلبہ کی ہجرت پر پنجاب کے لفٹنٹ گورنر سر مائیکل اڈوائر کا اخبارات میں یہ بیان چھپا تھا کہ اگر ان میں سے کوئی بچ کر آگیا تو اس کو ہندوستان کی سرحد پر سب سے پہلے درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی جائے گی۔

معلوم ہوتا ہے کہ امیر حبیب اللہ خاں کے پرائیویٹ سکریٹری علی احمد خاں کی نظر سے یہ بیان گزرا، اور اس نے برطانوی حکومت کو خوش کرنے کے لیے نظر بندی کا یہ حکم صادر کر دیا اور جب ایک بار اس طرح کا حکم صادر ہو گیا، تو پھر کون کسی کا پرسان حال ہو سکتا تھا۔

"آپ بیتی" میں اس وقت افغانستان کی جو حالت تھی اس کا اجمالی خاکہ بھی دیا گیا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں وہاں انتہائی حد تک تو پسماندگی تھی ہی، لیکن خود افغانی عوام کی دنیا کی ہر چیز سے بے خبری کا یہ عالم تھا کہ مصنف کے الفاظ میں:-

اس وقت افغانستان میں صرف ایک ہفتہ وار فارسی اخبار نکلتا تھا.....
.....اس اخبار کا نام سراج الاخبار تھا..... جلال آبادی اکثر ان پڑھ ہونے کی وجہ سے اور لوگ عام طور پر پشتو گو ہونے کے سبب سے سراج الاخبار کو کوئی زیادہ نہیں پڑھتا تھا اور بازار میں اخبار نہ بکتا تھا اس لیے ہم جنگ کے متعلق کوئی تازہ خبر حاصل نہ کر سکے۔ ہم جب لوگوں سے پوچھتے کہ جنگ کے بارے میں تازہ خبریں کیا ہیں، تو وہ جواب دیتے تھے "جنگے مقدمہ ہست" یعنی جنگ جاری ہے۔"

ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں کہ ہم اپنے خیال میں افغانستان کو ایک مہذب ملک تصور کیا کرتے تھے لوگوں کے اس قسم کے جواب سے ہمیں تعجب بھی ہوا اور مایوسی بھی، ہم نے امیدیں باندھ رکھی تھیں کہ افغانستان ہندوستان کی آزادی میں مدد دے گا اور انگریزوں سے لڑے گا۔ یہاں آکر دیکھا کہ کسی کو جنگ عظیم کے بارے میں کچھ خبر ہی نہیں۔ لوگ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہیں۔ ہم نے خط لکھنے کے لیے کاغذ اور لفافے تلاش کیے تو معلوم ہوا کہ کوئی ایسی دکان ہی نہیں جہاں قلم دوات یا پنسل بکتی ہو۔ ہمیں کہا گیا کہ کاغذ قصاب کی دکان پر بکتے ہیں، مگر قلم دوات بیچنے والا کوئی نہیں۔

دریائے اٹک سے اس پار کے ان مسلمان عوام اور ان کی حکومت سے یہ امیدیں صرف کالج کے ان نوجوان طلبہ ہی کو نہ تھیں، بلکہ مصنف کے الفاظ میں :

"اس وقت ہم کو اور ہماری طرح ہندوستانی مسلمان لیڈروں کا یہ خیال تھا کہ افغانستان ایک قوی اسلامی ملک ہے۔ اور اگر وہ لڑائی میں شریک ہو کر ہندوستان پہ حملہ کرے تو وہ انگریزوں کو ضرور ہندوستان سے نکال دے گا، مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم کا افغانستان آنا اسی غرض سے تھا کہ افغانستان کو شامل ہونے پہ اور ہندوستان پہ چڑھائی کرنے پر آمادہ کیا جائے۔"

اور یہ خوش فہمی صرف ہمارے ان بزرگوں کی نہیں تھی، بلکہ اس سے تقریباً ایک سو سال قبل ہمارے دوسرے بزرگ بھی اس قسم کی خوش فہمیوں کے ساتھ ہندوستان سے نکل کر دور دراز کی مسافتیں طے کر کے اٹک سے اس پار پہونچے تھے اور پھر ان کوششوں کا جو دردناک حشر ہوا معرکہ بالاکوٹ اس کا امٹ نشان ہے۔ افسوس ہے اس معرکے کے بعد بھی مجاہدین کی بعض جماعتیں ان آزاد علاقوں کا رخ کرتی رہیں اور بعد میں ان کے مراکز کی جو افسوسناک حالت ہوئی "آپ بیتی" میں کئی جگہ اس کا ذکر ہے جسے پڑھ کر سخت روحانی اذیت ہوتی ہے اور خلوص اور للہیت کے ضائع جانے کا رنج ہوتا ہے۔

یہ بہادر طالب علم جان جوکھوں میں پڑ کر ایک آزاد مسلمان ملک میں پہونچے لیکن جلال آباد پہونچتے ہی وہ نظر بند کر دیے گئے، ان کے سالار قافلہ عبدالمجید خاں جو سارے ساتھیوں کا بھاری سامان لانے کے لیے خفیہ طور پر پشاور سے بھیجا گیا تھا، ڈکہ گئے اور جلال آباد واپس آتے انھیں ٹائی فائڈ ہو گیا اسی بخار کی حالت میں وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ... خچروں پر سوار ہو کر کابل روانہ

ہوئے کابل تک ساتھ رہتے تھے عبدالمجید خاں کی طبیعت بخار کی وجہ سے روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی لیکن راستے میں ٹھہرنے اور رہنے کا امکان نہ تھا.......... کیونکہ راستہ میں پڑاؤ پر کوئی ڈاکٹر موجود تھا اور نہ کوئی دوائی مل سکتی تھی اسلئے ہم چار و ناچار سفر کرنے پر مجبور تاکہ جلد کابل پہونچ کر کسی ڈاکٹر سے ان کا معالجہ کرائیں۔

عبدالمجید خاں کابل تک تو زندہ پہونچ گئے اور ایک ہندوستانی ڈاکٹر نے انہیں دوائی بھی دی لیکن وہ جاں بر نہ ہو سکے اور ۱۹۔ اپریل ۱۹۱۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں کہ ان کی موت سے ہم کو جتنا صدمہ ہوا، اس کا ذکر بیان میرے قلم کی طاقت سے باہر ہے۔

ان طلبہ کے قافلے کے دو رکن عبدالرشید اور محمد حسن یعقوب تھے۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں اسی زمانے میں مولوی بشیر صاحب رجماعت مجاہدین کے امیر، کابل سے رخصت ہو رہے تھے انھوں نے ہمارے ساتھیوں میں سے عبدالرشید اور محمد حسن یعقوب کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے تیار کیا تاکہ عبیداللہ صاحب کو کہا تاکہ اس کی جماعت مجاہدین میں ایک تازہ اور نئی روح پھونکیں، لیکن افسوس ہے کہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے ان دو نوجوانوں کو وہاں بھیجنے کے باوجود بھی وہ لکیر کے فقیر لوگ ایسے دقیانوسی خیالات کے ثابت ہوئے کہ عبدالرشید تو ان کے رئیس نصرت اللہ کی مخالفت سے تنگ آگیا اس کو شبہ ہوا کہ نصرت اللہ انگریزوں سے مل گیا ہے۔

"اس نے ایک کام تو نصرت اللہ کو قتل کر دیا۔ اس کے محافظوں نے عبدالرشید کو زخمی کیا اور ابھی وہ جان ہی تو ڑ رہا تھا کہ اسے تنور میں ڈال کر جلا دیا"

عبدالرشید کا تو یہ انجام ہوا۔ محمد حسن یعقوب مجاہدین کے دوسرے مرکز علاقہ ...... کے گاؤں چمرکنڈ چلے گئے اور وہاں سے ان کی مدد سے مولوی محمد بشیر صاحب نے سائیکلو اسٹائل میں انگریزوں کی مخالفت میں ایک ماہوار پرچہ نکالا اور بعد میں وزیرستان کے علاقہ میں محمد حسن یعقوب کی سرکردگی میں مجاہدین کی ایک ٹولی بنائی اور اس طرح پر انگریزوں کے برخلاف لوگوں کو اکسانے کی کوششیں کیں لیکن یہ سب جد و جہد بے اتفاقی کی وجہ سے ناکام رہی۔

اس زمانہ کا شہر کابل کیا تھا؟ امیر کابل کی درباری زندگی کیسی تھی؟ امیر کابل کے شہر والی افغان ..... تک بڑھتے ہوئے تھے۔ پھر دربار میں کون کون سے سیاسی گروہ تھے ظفر حسن صاحب نے

بڑی وضاحت سے اسے بیان کیا ہے اور اسے پڑھ کر اس زمانے کے کابل اور اس کی سیاست کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔

طلبہ کی جماعت نظر بند تھی کہ ۲ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کو ہندستانی، ترکی، جرمن مشن کابل پہونچا۔ اس مشن کے لیڈر راجہ مہندر پرتاپ تھے۔ اور اس کے ایک رکن مولانا برکت اللہ بھوپالی تھے۔ مصنف کے الفاظ میں:-

> اس وفد کا مقصد امیر افغانستان کو انگریزوں کے برخلاف اکساکر افغانستان سے ہندوستان پر حملہ کرانے کی تیاریاں کرنا اور اس طرح پر انگریزی فوجوں کے ایک معتد بہ حصّے کو یوروپین محاذوں کی بجائے ہندوستان میں رہنے پر مجبور کرنا اور جرمنی اور ترکی فوجوں کو اس کے برخلاف زیادہ جنگ کرنے کا موقع دینا اور اگر افغانستان انگریزوں سے لڑ پڑے تو ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا تھا۔

۲ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کو یہ وفد کابل پہونچا، اور ۱۵ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کو مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم بھی کابل پہونچ گئے۔ ظفر حسن صاحب نے بڑی تفصیل سے اس تاریخی وفد کی سرگرمیوں اس کے ساتھ افغان حکومت کی ودغلی پالیسی، اور وفد کی سرگرمیوں میں مولانا سندھی کی شرکت کا ذکر کیا ہے۔ مولانا کی وجہ سے ظفر حسن صاحب اور ان کے ساتھیوں کی نظر بندی کی تکلیفیں کچھ کم ہوگئیں اور وہ قدرے آرام سے رہنے لگے۔ حضرت مولانا نے ان بہادر نوجوانوں کی حوصلہ افزائی بھی کی اور انھیں وہ آگے بڑھانے لگے مصنف لکھتے ہیں۔

> قبلہ مولانا مرحوم نے ہمیں مرحوم عبدالمجید خاں کی جگہ ایک نیا سردار چننے کو کہا اور ہم نے اتفاق رائے سے عبدالباری[1] صاحب کو اس عہدے کے لیے انتخاب کر لیا۔ اس کے بعد جب مولانا صاحب مرحوم کو ہندوستانی، ترکی، جرمن وفد سے ملنے کی اجازت ہوگئی تو وہ عبدالباری کو اپنے

---

[1] میاں عبدالباری صاحب ایم۔ این۔ اے۔ (مدیر)

ساتھ جایا کرتے تھے تاکہ وہ ان کی انگریزی میں ترجمانی کرے اور ان کی گفت و شنید سے بھی واقف ہو۔ آئندہ کے لیے جو منصوبے وہ بنائیں۔ انھیں ان کے مشیر کے طور پر کام دے۔

یہ وفد کا نام رہا۔ اور امیر حبیب اللہ خاں نے اس کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں سے اپنا وظیفہ اور بڑھوا لیا۔ راجہ مہندر پرتاپ نے اپنی حکومت موقتہ ہند بنا رکھی تھی، جب وہ کابل آئے تو انھوں نے اس میں مولانا عبید اللہ صاحب کو شامل کر لیا اور انھیں وزیر داخلہ کا عہدہ دیا۔ اس حکومت کی طرف سے روس کو ایک وفد بھیجا گیا، جس میں ظفر حسن صاحب کے ایک ساتھی طالب علم خوشی محمد بھی شریک تھے۔ غرض کابل پہونچنے کے بعد مولانا عبید اللہ کی جتنی بھی سرگرمیاں تھیں، ان میں یہ طالب علم برابر حصہ لیتے رہے اور ان کی وجہ سے مولانا کو اور انھیں کافی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔

مصنف نے بڑی شرح و بسط سے یہ تفصیلات بیان کی ہیں، یہ محض ایک تاریخی وثیقہ کی حیثیت نہیں رکھتیں، بلکہ سیاسی کام کرنے والوں کے لیے بڑی سبق آموز اور عبرت انگیز بھی ہیں۔ اسی ضمن میں "ریشمی چٹھی" کا واقعہ بھی آگیا ہے۔

"ریشمی چٹھی" کے واقعہ کے بعد طلبہ اور مولانا کو دوبارہ نظر بند کر دیا گیا۔ ان ہی دنوں کا ظفر حسن صاحب ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں، جو بڑا ہی تکلیف دہ ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

> ہم اسی گھر میں رہتے تھے کہ جون ۱۹۱۶ء میں سید علی عباس بخاری پشاور سے ہجرت کر کے کابل پہونچنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ پشاور میں انگریزوں کی مخالفت کرنے کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں میں اپنے قوم پرست جذبات کے سبب سے بہت قابل قدر ہستی مانے جاتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم اور مولانا محمد علی جوہر سے ان کا تعلق تھا۔ قبلہ مولانا مرحوم سے وہ دہلی میں ملے تھے۔ کابل آنے پر امیر حبیب اللہ نے ان کو نظر بند کر دیا۔ ان کی نظر بندی ہماری نظر بندی کی نسبت بہت سخت تھی۔ وہ بالکل اکیلے ایک گھر میں رہتے تھے اور ان کو بازار جانے کی بھی اجازت نہ تھی اور نہ کوئی ان کے گھر جا کر ان سے

مل سکتا تھا معلوم ہوتا ہے کہ امیر افغانستان نے انگریزوں کے اشارے پر ان کو سخت نظر بندی میں ڈالا تھا۔

ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں "ہم نے ایک دو دفعہ اپنے پہرہ داروں کو رشوت دے کر اور ان کے جمادار مرزا کو پھسلا کر ان سے ملاقات کی۔ اس قید تنہائی کی وجہ سے ان کے حواس مختل ہونے لگے تھے۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم بھی ایک دفعہ ان سے ملنے میں کامیاب ہو گئے تھے جس سے انکی بہت تسلی ہوئی تھی ظفر حسن صاحب کے الفاظ ہیں۔

وہ بہت ایماندار، اسلام کے دردمند رشید لیڈر تھے اور ایک حساس شخصیت رکھتے تھے عالم اسلام کی حالت اور ترکی کی جنگ کی رفتار سے ان کو بہت صدمہ ہوتا تھا۔ ان جیسی قابل قدر ہستی کا اس طرح محبوط الحواس ہو کر بے کار ہونے کا گناہ امیر حبیب اللہ خاں کی گردن پر رہے گا۔

سردار محمد نادر خاں، جو بعد میں فرمانروائے افغانستان ہوئے، اس وقت فوج کے سپہ سالار تھے ان کا ذکر "آپ بیتی" میں یوں کیا گیا ہے۔

فوج کے سپہ سالار جنرل محمد نادر خاں ولد سردار محمد یوسف خاں صاحب خاص حضور امیر صاحب تھے۔ شاہی رسالے کے بڑے افسران کے دوسرے بھائی مثلاً سردار ہاشم خاں، سردار محمد علیخاں، سردار شاہ ولی خاں اور سردار شاہ محمود خاں تھے۔ ان سب صاحبان کی عمر کا بڑا حصہ ڈیرہ دون میں گزرا تھا کیونکہ ان کا خاندان شاہ شجاع اور امیر دوست محمد خاں کے زمانے میں بادشاہ گردی کی جہ سے افغانستان سے ہندستان میں پناہ گزیں ہو گیا تھا۔ افغانستان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگ اسی خاندان میں سے تھے۔

...... مرحوم سپہ سالار سردار محمد نادر خاں ہندستانی مسلمانوں کے خاص کر حامی اور طرفدار تھے... مثلاً ہمارے محترم مرشد قبلہ مولانا عبید اللہ سندھی کی اور ہماری حمایت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ز سردار محمود بیگ طرزی کو ..... ترکی معاشرت کا دلدادہ کہا جائے تو مرحوم سردار محمد نادر خاں کو ہندستانی معاشرت کا حامی کہنا بجا ہوگا۔ مرحوم سردار سپہ سالار محمد نادر خاں کا خاندان مرحوم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا مرید تھا۔ سردار سپہ سالار مرحوم میرے تو خاص طور محسن تھے۔ قبلہ مولانا صاحب مرحوم بھی اُن کے

بکیفہ مشکور رہے۔ اور ان سے ہر وقت اظہار ممنونیت کیا کرتے تھے۔

اسی سلسلے میں وہ سردار نادر خاں کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں۔ ان حضرات کی نظر بندی کے زمانے میں سردار نادر خاں مرحوم نے ان کے لیے شہر کے باہر ایک باغ میں خیمے لگوا دیے۔ اس موسم میں بقر عید بھی آئی اور سردار سپہ سالار محمد نادر خاں مرحوم قبلہ مولانا صاحب مرحوم سے ملنے اور عید مبارک دینے کیلئے آئے۔ اس ملاقات کے دوران میں انھوں نے شیر ببر کی طرف اشارہ کرکے (اس باغ چڑیا گھر تھا) قبلہ مولانا مرحوم کو کہا: "اس باغ میں شیر رہتے ہیں۔"

کابل کے پورے دوران قیام میں سردار نادر خاں مرحوم مولانا عبید اللہ صاحب اور ظفر حسن صاحب کی ہر ممکن مدد کرتے رہے۔ اور بہت سے نازک موقعوں پر مرحوم ان کے کام آئے۔ ظفر حسن صاحب تو بعد میں ایک لحاظ سے مرحوم کے دست راست بن گئے تھے اور وہ موصوف پر غایت درجہ اعتماد کرتے تھے "آپ بیتی" میں سردار نادر خاں کی شرافت نفس ہمدردی اور عالی حوصلگی کے بہت سے واقعات درج ہیں۔ راقم السطور کو ذاتی طور پر معلوم ہے کہ سربراہ سے افغانستان ہونے کے بعد بھی سردار نادر خاں مولانا کو نہیں بھولے تھے۔ چنانچہ انھوں نے دو مرتبہ مکہ معظمہ میں مولانا کو ایک خطیر رقم بھجوائی تھی۔

مولانا عبید اللہ صاحب جب کابل پہنچے، تو ان تعارفی خطوط کی وجہ سے جو وہ ساتھ لائے تھے انھیں بآسانی افغان حکومت کے بعض صاحب اختیار اور آخر میں امیر حبیب اللہ خاں سے ملنے کا موقع مل گیا۔ مولانا نے امیر صاحب کو انگریزوں سے الگ کرنے کے لیے جو جال بچھا دیا تھا، آپ بیتی میں ان سب واقعات کی تفصیل سے ذکر ہے۔ نیز راجہ مہندر پرتاپ نے جرمنوں کو ہندوستان کی جو ایک طرح تصویر پیش کی تھی، مولانا نے ہندوستانی، ترکی، جرمن مشن کے جرمن ارکان سے مل کر اس کا جس طرح توڑ کیا وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ خوش قسمتی سے ان تمام معاملات میں کابل کے یہ نوجوان مولانا کے بہترین مددگار ثابت ہوئے۔

۱۹۱۸ء کی گرمیوں میں پہلی جنگ عظیم ترکوں کی شکست پر ختم ہوئی۔ جس سے افغانستان کے انگریز پرست امراء بڑے خوش ہوئے لیکن ظفر حسن صاحب کے الفاظ میں قبلہ مولانا صاحب مرحوم کو اس شکست سے جتنا رنج ہوا۔ اسکو یہاں بیان کرنا میری طاقت سے باہر ہے۔"

۱۹۱۹ء ۱۹۱۸ء کے موسم سرما میں امیر حبیب اللہ خاں جلال آباد میں مارے گئے۔ اور تھوڑی ہی

گزر جانے کے بعد امان اللہ خاں ان کی جگہ امیر بن گئے۔ جنھوں نے تخت پر بیٹھتے ہی فوج اور قوم کے سامنے دو باتوں کو پورا کرنے کا وعدہ کیا.... ایک اپنے والد کے قاتل کا پتہ لگا کر وہ اس کو سزائے موت دیں گے۔ دوسری بات یہ تھی کہ انگریزوں سے افغانستان کا استقلال حاصل کریں گے۔ وہ اپنی سب تقریروں میں ان دونوں وعدوں کو ہمیشہ دہرایا کرتے تھے۔

"اپنے دوسرے وعدے کو پورا کرنے کے لیے امیر امان اللہ خاں نے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان تیاریوں میں ایک اہم حصہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم کی کوششوں کا تھا۔ قبلہ مولانا مرحوم سردار نصر اللہ خاں کے تخت سے دست بردار ہونے کے بعد امیر امان اللہ خاں کے بلانے پر جلال آباد سے کابل آئے اور امیر صاحب سے ملے، اس پر امیر صاحب نے ان سے کہا من ہموں ہستم (یعنی میں تو وہی ہوں) قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے بحیثیت وزیر داخلہ حکومت موقتہ ہند امیر امان اللہ خاں سے وہی معاہدہ کیا، جو ان کے والد سے کیا تھا..... اس زمانے میں ہندستان میں بد امنی تھی۔ اور پنجاب میں جلیانوالہ باغ کے واقعات کی وجہ سے بہت ہل چل مچی ہوئی تھی..... افغانستان کو اپنا استقلال حاصل کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی موقع نہ مل سکتا تھا۔"

ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں کہ قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے ایک رات کو شین خانہ کابل کے چھاپے خانہ میں جا کر ہندستانیوں کے نام اردو اور انگریزی میں اعلان چھاپے۔ جن میں انھیں انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی دعوت دی۔ یہ اعلانات ہندستان پہنچوائے گئے اور مولانا کے بھتیجے اور مولانا احمد علی کے بھائی ان اعلانات کو حیدر آباد دکن تک پہنچا کر آئے۔

آخر جنگ ہوئی۔ اس میں افغانستان کی افواج کی ابتری، بد نظمی اور بزدلی کا جو عالم تھا آپ بیتی میں بڑی تفصیل سے اس کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ خوش قسمتی سے ٹل کے محاذ پر سردار محمد نادر خاں متعین تھے ان کی فراست جنگی تدابیر اور عزم و حوصلہ سے اس محاذ پر افغان افواج کو فتح ہوئی۔ اس طرح محض سردار محمد نادر خاں کے طفیل افغان حکومت کا بھرم رہ گیا۔ اس معرکے میں ظفر حسن صاحب کی یا صحی دانی بڑے کام آئی۔ اور ان کی بتائی ہوئی پیمائش پر جب توپ سے گولہ پھینکا گیا تو وہ قلعہ کے ٹھیک میگزین پر پڑا؟ ... (دراصل) پر پھٹا جس سے وہاں آگ لگ گئی اور اس سے مجاہدین کے حوصلے بڑھ گئے بعد میں سردار

نادر خاں نے اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا اور انھیں دربار شاہی میں امان اللہ خاں کے سامنے پیش کرتے ہوئے یہ کلمات کہے۔

> اس نوجوان کی عمر کم ہے، لیکن اس نے ایسی بہادری دکھائی ہے کہ فوج کے بڑے بڑے اور تجربہ کار افسروں کو مات کر دیا ہے۔

اس حملے میں سردار نادر خاں کا ٹھل شہر پر قبضہ ہو گیا۔ گو ٹھل قلعہ بدستور انگریزی تسلط میں رہا شروع میں تو قبائلیوں نے حسب عادت اس شہر کو لوٹا لیکن بعد میں ان کو روک دیا گیا۔ اس ضمن میں ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں:-

> ہم نے رات کو شہر میں کرفیو لگایا۔ اور رات کو بغیر اجازت اپنے گھروں سے باہر نکلنے سے منع کر دیا۔ تاکہ رات کے اندھیرے میں کہیں پھر فتنہ و فساد اور یغماگری نہ ہو سکے۔ شہر میں مختلف اور اہم جگہوں پر پہرے لگوا دیئے اور فوجی پٹرول چلانے کا انتظام کیا تاکہ رات کو سپاہی شہر میں گھوم کر دورہ کریں.... .... اس طرح میں اس پہلے آزاد ہندستانی شہر کا پہلا سول ایڈمنسٹریٹر بنا اس انتظام کی وجہ سے رات کو شہر میں کوئی واردات نہ ہوئی۔

معرکۂ ٹھل میں ظفر حسن صاحب نے جو کارنامہ سرانجام دیا، اس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ اس جرمن توپ کو جس سے قلعہ پر گولے پھینکا گیا تھا، مصنف کے الفاظ میں:- ہاتھی کی پیٹھ پر لاد کر مورچے پر لایا گیا۔ یہاں سردار سپہ سالار مرحوم نے مجھے کہا کہ اس نقشے کی مدد سے جو میں نے متون میں تیار کیا تھا اس مورچے سے ٹھل کے قلعہ تک کا فاصلہ معلوم کروں میں نے نقشہ سے ناپ کر یہ فاصلہ میل اور گز کے حساب سے ان کو بتایا۔ انھوں نے مجھے اس کو میٹر میں تحویل کرنے کو کہا کیونکہ اس توپ کی مار میٹر کے حساب سے تھی۔ توپچی اس عمل تحویل سے بالکل بے خبر تھا اور نہ ہی وہ نقشے سے دو جگہوں کے درمیانی فاصلے کو ناپ سکتا تھا.... معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ صلح میں افغانی سپاہیوں کو فوجی تعلیم خاص کر توپ بازی کی تعلیم اس وقت بالکل نہ دی جاتی تھی یہاں تک کہ افسر بھی اپنے فوجی فرائض کو نہ جانتے تھے۔"

بہر حال ظفر حسن صاحب نے فاصلے کا حساب کر کے بتایا اور سردار سپہ سالار محمد نادر خاں نے خود ہی اس توپ کو

Aiming Post یعنی نشانہ لگانے والے بانس کے ذریعہ قلعہ مغل کی سیدھ میں لگایا اور فیر کیا۔

ظفر حسن صاحب کی کوششوں سے مغل شہر میں امن قائم ہو گیا۔ لوگ اپنے کاروبار میں اطمینان سے معروف ہو گئے، اور مجاہدین کو بھی کھانے کا سامان بہم پہونچتا رہا۔ اس ضمن میں اسلام کے پرستاران محب الوطن "ہندوستانیوں" کو خود افغانوں کی خدمت کرتے ہوئے قدم قدم پر جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اور ان کے حاسد افغان ان کے خلاف طرح طرح کی جو سازشیں کرتے تھے اس کی ایک مثال ظفر حسن صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

> اگلے روز صبح کو مجھے سردار سپہ سالار مرحوم کا زبانی پیغام ملا جس میں انھوں نے مجھے پڑاؤ کو لوٹ آنے کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ میں شہر کا انتظام ایک افغان فوجی افسر کے سپرد کر کے پڑاؤ کو واپس آگیا وہاں آکر مجھے سردار سپہ سالار مرحوم کے چیف پرائیویٹ سیکریٹری مرزا محمد یعقوب خاں سے معلوم ہوا کہ مجھے واپس بلانے کا سبب یہ تھا کہ بعض میرے بدخواہوں نے میرے بارے میں سردار سپہ سالار مرحوم کے کان بھرے اور کہا کہ ظفر انگریزوں سے مل گیا ہے۔ اور اب وہ کبھی واپس نہ آئے گا۔ امتحاناً مجھے واپس بلایا گیا تھا۔ سیکریٹری نے کہا کہ آپ کی واپسی سے آپ کی صداقت کا ثبوت مل گیا ہے۔ اور آپ کی غیبت کرنے والے لوگوں کو شرمندہ ہونا پڑا۔

اگر انگریزوں کو یہ ڈر نہ ہوتا کہ افغانستان سے جنگ نے طول پکڑا تو ہندوستان کے اندر بغاوت ہو جائے گی اور یہ کہ افغانستان میں مقیم محب الوطن ہندوستانی حکومت افغانستان کو ہر طرح کی کمک پہونچا رہے ہیں تو چند دن بعد ہی افغان فوج کی ہوا اکھڑ جاتی اور امیر امان اللہ کو بہت جھک کر صلح کرنا پڑتی۔

افغانستان کی اس جنگ آزادی کی روئداد جو آپ بیتی میں دی گئی ہے، پڑھنے کے قابل ہے۔ جلال آباد کے محاذ کا کمانڈر ان چیف سپہ سالار محمد صالح خاں تھا۔ بہترین افغانی پلٹن جن کی بندوقیں نئی اور جن کی توپیں سریع آتش Quick firing تھیں اس محاذ پر مقرر کی گئی تھیں۔

اس محاذ پر جو کچھ ہوا، وہ ظفر حسن صاحب کی زبان سے سنئے۔

"... صالح محمد خان نے کابل سے اعلان جنگ کئے جانے سے پہلے تورخم کے مقام پر ایک متنازعہ فیہ چوکی پر قبضہ کر کے ہمتی لشکروں کو انگریزوں سے لڑائی چھیڑ دی۔ انگریزوں نے ایک ہوائی جہاز بھیجکر اسکی فوج پر بم پھینکے جس سے اس کا پاؤں زخمی ہو گیا۔ اس پر وہ ہائے مرا شہید شد کہتا ہوا محاذ سے ہٹ کر ڈکہ کی طرف پسپا ہوا۔ فوج لوٹے [illegible] جب [illegible] پہنچے [illegible] نے پیچھا کر کے ڈکہ پر قبضہ کر لیا۔ جلال آباد کے صوبے کے لوگوں نے اس شکست سے یہ سمجھا کہ بس اب حکومت کا خاتمہ ہو گیا ہو۔ اس پر انھوں نے آکر شہر جلال آباد کو لوٹ لیا۔ اس سرکاری خبر کے ساتھ امیر صاحب نے سردار سپہ سالار محمد نادر خاں مرحوم کو یہ حکم بھی بھیجا کہ فوراً آگے بڑھ کر ہندوستان پر حملہ کریں تاکہ انگریزی فوجیں ڈکہ سے آگے بڑھ کر جلال آباد پر قبضہ نہ کر سکیں۔"

ٹل کے محاذ پر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ سردار نادر خاں کو فتح ہوئی تھی اور افغانوں کا ٹل شہر پر باقاعدہ قبضہ بھی ہو گیا تھا۔ لیکن ٹل قلعہ وہ فتح نہ کر سکے آخر قلعہ کو انگریزی فوج کی وقت اپر کمک پہونچ گئی یہ سنکر فاتح افغان فوج کس طرح بھاگ کھڑی ہوئی، ظفر حسن صاحب بڑی دردمندی سے اس کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔

"اس روز ابھی شام بھی نہ ہوئی تھی کہ میں نے دیکھا کہ ہماری مشین گنیں جو قلعہ کی چوکیوں پر گولہ باری کے لئے دریائے کرم کے پار بھیجی گئی تھیں، خچروں پر لدی ہوئی ... واپس لائی جا رہی ہیں۔ میں نے ان کے سپاہیوں کو روک کر واپس محاذ پر بھیجنے کی کوشش کی لیکن سپاہیوں کے تیور راستے بدلے ہوئے تھے کہ اگر میں زیادہ اصرار کرتا تو شاید وہ مجھ پر گولی چلا دیتے۔ اسکے بعد میں نے دیکھا کہ محاذ سے پسپا ہونے والے سپاہیوں کا تانتا بندھ گیا۔ سردار سپہ سالار مرحوم ... سے معلوم ہوا کہ دریائے کرم کے پار کے تمام پیادہ سپاہیوں، توپوں اور مشین گنوں کے مسلح سپاہیوں نے اپنے مورچے چھوڑ دیئے اور اپنے افسروں کے حکم کے برخلاف سرکشی کر کے خود بخود پڑاؤ کو واپس آگئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر باقی فوج میں بھی ہل چل پڑ گئی۔ ہر کوئی اپنی مرضی سے افغانی سرحد کی طرف پسپا ہونے کو تیار ہو گیا۔ یہانتک کہ بعض سپاہیوں نے باربرداری کے خچروں پر سوار ہو کر افغانستان کا راستہ لیا اور سامان جنگ اور رسد وغیرہ کو جو ان خچروں پر لدنے والا تھا، پیچھے چھوڑ دیا ش

بغیر لڑے اور بغیر کوئی ہزیمت اٹھائے ان میں یوں بھگدڑ مچ جانے کا باعث صرف یہ تھا
"انھوں نے صرف قلعہ کو کمک پہونچ جانے سے ڈر کر پسپائی اختیار کی۔ ان کو شاید خطرہ ہوا کہ
اگلے روز انگریزی فوج ضرور قلعے سے نکل کر ان پر حملہ کرے گی"

اس معرکے میں کئی موقعوں پر ظفر حسن صاحب نے نہایت خطرناک کاموں کے لیے سردار صاحب کو اپنا نام
پیش کیا، اور یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے بھی موصوف پر جس طرح اعتماد کیا، ان کی ہر موقع پر
اور آخر وقت تک ان کے ساتھ قریبی عزیز اور مخلص رفیق کا سلوک کیا۔ وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ بلفاظ
آپ بیتی میں جہاں بھی سردار محمد نادر خاں کا ذکر آتا ہے، اس سے مصنف کی عقیدت اور شکر
ٹپکتا ہے اور واقعی مرحوم اس کے مستحق بھی تھے۔

تھل کے محاذ جنگ تک جاتے ہوئے ہر پڑاؤ پر سردار نادر خاں نے ظفر حسن صاحب کو اپنے
خیمے میں جگہ دی۔ پھر اپنے جنگی پلان کے بارے میں جن چند ساتھیوں سے وہ مشورہ کرتے تھے ان میں سے
ایک موصوف بھی ہوتے تھے۔

سردار سپہ سالار محمد نادر خاں ظفر حسن صاحب کا کس قدر خیال رکھتے تھے، اس ضمن میں ان
کی زبان سے ایک واقعہ سن لیجئے۔

"دسمبر ۱۹۲۱ء میں مرحوم انور پاشا بخارا پہونچے۔ انکے پہونچنے پر افغانی حکومت نے ان کو
روس کے برخلاف خفیہ مدد دینے کا فیصلہ کیا۔ اسلیے سردار سپہ سالار مرحوم (محمد نادر خاں)
کو قطغن اور بدخشاں کے افغانی صوبوں کا رئیس تنظیمیہ مقرر کرکے خان آباد بھیجا۔ چونکہ وہ
پاشا مرحوم کو روسیوں کے برخلاف مدد دینے کو جا رہے تھے اور میں انگریزوں کا دشمن ہونے
کی وجہ سے روسیوں کا دوست مانا جاتا تھا، وہ مجھے اس کام پر اپنے ساتھ نہیں لے
گئے، حالانکہ اس سے پہلے انھوں نے مجھے نہ جنگ کے دنوں میں اور نہ صلح کے زمانے
میں کبھی اپنے سے جدا کیا تھا۔ یہاں تک کہ جب مجھے ایک روز بخار رہا اور میں وزارت
حربیہ کے سرکاری کام پر نہ جا سکا، تو وہ شام کو میری بیمار پرسی کے لیے گھر بھی تشریف
لائے تھے۔"

اس جنگ کے نتیجے میں جس میں سردار محمد نادر خاں کا حصہ سب سے نمایاں تھا، افغانستان کی آزادی

تسلیم کر لی گئی اور وہ دوسرے ملکوں سے سفارتی تعلقات رکھنے کا مجاز ہو گیا۔ افغان وفد جو انگریزوں سے گفتگو کرنے ہندوستان گیا تھا، اس کے بارے میں لکھا ہے۔

"...... یہ وفد (افغان وفد) افغانی استقلال کی تصدیق کے سوا اور کوئی بھی شرطیں جو کہ انگریز ہیں حاصل نہ کر سکا۔ ہمیں امید تھی کہ شاید یہ وفد ہندوستان کو کچھ اختیارات دلوانے اور صوبہ شمال کے علاقوں (؟) اقامت قائم کرنے میں ضرور مدد دے سکے گا جس کی وجہ سے انگریز ہندوستان کی جانب سے پر باقاعدہ قبضہ کر کے افغانستان پر پوری طاقت سے حملہ نہ کر سکے .... اور ڈکہ کو لے کر وہیں ٹھہرنے پر مجبور ہو گئے اور جلال آباد تک بڑھنے کی جرأت نہ دکھا سکے۔

ظفر حسن صاحب نے بجا طور پر شکایت کی ہے کہ افغانستان کے وفد کی طرف سے ہندوستان میں ہوم رول قائم کرانے کے بارے میں مولانا تو درکنار اس وفد کے قیام ہندوستان کے دوران (۱۹۲۱ کے شروع میں) وہاں ہندوستانی مسلمان لیڈروں کی دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہونے لگیں اس سے مجھے بہت رنج ہوا لیکن اس کا سبب اس وقت میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ افغانی وفد ہندوستان سے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کامیابی حاصل کر کے لوٹ آیا۔"

بعد میں موصوف پر ہندوستانی مسلمان لیڈروں کی گرفتاریوں کا راز کھلا، جلال آباد سے واپسی پر مولانا عبید اللہ صاحب سے انہیں معلوم ہوا کہ جب یہ افغانی وفد ہندوستان جا رہا تھا تو اس کے صدر سردار محمود طرزی نے مولانا سے ہندوستان کے بعض مسلمان لیڈروں کے نام خط لکھوایا تھا "تاکہ اگر انگریز افغانی وفد کے مطالبات کو منظور نہ کریں یا افغانستان کی آزادی کی تصدیق میں لیت و لعل برتیں تو یہ خط ہندوستانی مسلمان لیڈروں کو دے کر ان کے ذریعہ انگریزوں کے برخلاف بغاوت کرانے کی کوشش کی جائے۔ افغانی وفد نے انگریزوں سے کچھ رعایات حاصل کرنے کے لیے اس خط کو انگریزی حکومت کو دے دیا۔ ..." اور اسی کی وجہ سے مسلمان لیڈروں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔

اسی زمانے میں ہندوستان کے مسلمانوں نے افغانستان کی طرف ہجرت کی تحریک شروع کی، اس تحریک کا جو حشر ہوا "آپ بیتی" میں بڑی تفصیل سے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ مسلمانان برصغیر کے چند عظیم تاریخی المیوں کے تحریک ہجرت بھی ایک بہت بڑا المیہ ہے جس کا ظفر حسن صاحب کے الفاظ میں۔

"نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں سادہ لوح مسلمان اپنے گھر بار سے محروم ہوئے افغانستان پر بار ہوئے، ہندوستانی مسلمان افغانوں سے اور افغان ہندوستانی مسلمانوں سے کبیدہ خاطر ہوئے۔ اگر

کسی نے اس سے فائدہ اٹھایا، تو وہ صرف انگریز تھے۔

اگرچہ افغانستان کی طرف ہجرت کرنے کا فتویٰ بقول مصنف مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور دوسر علمائے دیوبند نے اس بنا پر دیا تھا کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔ اس لئے مسلمانوں کا فرض ہے کہ یہاں سے ہجرت کر کے کسی دارالاسلام میں چلے جائیں لیکن اسکی حوصلہ افزائی خود امیر امان اللہ خان نے بھی کی تھی۔ اس بارے میں ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں:۔

"...... اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں نے اس وقت ایک تقریر کی جس کے لئے خاص کر قابل ذکر ہیں۔" افغانستان بہمہ وسعت خود آمادہ است کہ مہاجرین ہندی را پناہ بدہد۔" اس قسم کے بیانات کو قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے کچھ پسند نہ کیا، لیکن ان پر اعتراض بھی نہ کیا امیر صاحب کے ان بیانات کا مقصد صرف اتنا تھا کہ مسلمانان ہند کے لئے زبانی ہمدردی کریں اور اس سے ذرا انگریزوں کو ڈرا کر افغانستان کے لئے کچھ رعایات لے لیں"

ہندوستان کے اندرونی حالات اور مصنف کے الفاظ میں حضرت مولانا عبیداللہ کے تدبر سے "افغانستان آزاد ہو گیا مگر افسوس ہے کہ ہندوستان ویسا ہی غلام رہا جیسا کہ پہلے تھا۔ افغانستان نے اپنے جنگی حلیف یعنی ہندوستانی مسلمانوں کو اپنی قدیم روایتی عادت کے بموجب ان کی قسمت پر چھوڑ دیا اس کے بعد انگریزوں نے جو ہندوستانیوں پر ظلم کئے، وہ تو سب دنیا کو معلوم ہی ہیں مگر امیر امان اللہ خاں مستقل بادشاہ بن گئے۔ اور اس کامیابی کا سہرا انھوں نے صرف اپنے سر پر رکھ لیا"

انہی سالوں میں برصغیر میں بڑے وسیع پیمانے پر اور زبردست جوش و خروش کے ساتھ تحریک خلافت چلی جس میں کوئی تیس ہزار مسلمان انگریزوں کی جیلوں میں گئے۔ اس تحریک کا مقصد ترکی خلافت کی بحالی تھی مسلمانوں کی ان قربانیوں کا کیا نتیجہ نکلا۔ اس ضمن میں ظفر حسن صاحب بالکل صحیح کہتے ہیں:۔

"...... ان کارروائیوں سے ترکوں کو مدد تو ضرور ملی لیکن اس سے ہندوستان کی آزادی کا راستہ نہ کھلا۔ صرف انگریزوں کے لئے ذرا ہندوستان میں پریشانی بڑھ گئی۔ مگر ان کو کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوا"

اسی زمانے میں سلطنت ترکیہ کے سابق وزیر جمال پاشا کابل گئے۔ پھر انور پاشا نے ان اطراف کا رخ کیا۔ عالم اسلام کی ان دو مشہور شخصیتوں کے بارے میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے تاریخی اہمیت رکھتا ہے

کیونکہ ہمارے ہاں عرصہ دراز تک خاص طور سے افغان بادشاہ کی ایک ... حیثیت رہی ہے۔
انگریزوں سے اپنی آزادی تسلیم کرانے کے بعد حکومت افغانستان کو ایسے ہندوستانیوں کا وجود بار معلوم
ہونے لگا جو انگریزوں کے مخالف تھے، ان میں سے بعض کو تو جیسے کہ ڈاکٹر عبدالحفیظ تھے طریقے
سے چلتا کر دیا گیا اور دوسروں پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کی جانے لگیں۔ اس سلسلے میں مصنف لکھتے ہیں:۔

"وزیر امینہ شجاع الدولہ سے کہا گیا کہ "میں خفیہ طور پر انگریزی سفیر سے ملتا جلتا رہتا ہوں۔
وزیر امینہ نے یہ بات فوراً امیر صاحب کے کان تک پہنچائی کہ وزیر حربیہ سپہ سالار محمد نادر خاں
کا اعتماد یافتہ اور نعمت پروردہ ظفر حسن تو انگریزی جاسوس ہو، جو افغانی وزارت
حربیہ کے سارے رازوں کو انگریزوں کو دیتا رہتا ہے"

اس پر قدرتاً سردار سپہ سالار بالکل حواس باختہ ہو گئے اور مولانا عبیداللہ صاحب نے جب ایک
خط لکھ کر ذاتی ضمانت دی تو یہ معاملہ رفع دفع ہوا۔ اس کے بعد بھی وزیر امینہ ظفر حسن صاحب کے درپے
آزار رہا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

" اس چغلی کے واقعہ کے چند روز بعد میں ایک شام کو ہوا خوری کے لئے شہر سے باہر سڑک
پر ٹہل رہا تھا کہ وزیر امینہ وہاں سے گھوڑے پر گزرا۔ اس نے مجھے دیکھ کر یہ کہا: خیر
اس دفعہ تو تمھاری جان بچ گئی، لیکن آئندہ دیکھیں کیا ہوتا ہے"

انہی دنوں مولانا عبیداللہ صاحب نے کابل میں ایک "ہندوستانی اردو یونیورسٹی" قائم کرنے کا منصوبہ
بنایا۔ اور اسکے لئے حکومت افغانستان سے چارٹر مانگا۔ مولانا نے اس کا نظام نامہ بھی بنا لیا تھا اور
وزیر خارجہ محمود طرزی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ حکومت افغانستان اور امیر صاحب سے اس کی منظوری لے دیں گے۔

اس کے بعد اس ضمن میں جو کچھ ہوا، وہ "آپ بیتی" میں یوں مذکور ہے:۔

" ۱۹۲۱ء میں ڈوبس کے (برطانوی) مشن سے عہد نامہ صلح ہو جانے پر قبلہ مولانا صاحب
مرحوم نے اپنی ساری طاقت کو اس ہندوستانی اردو یونیورسٹی کا چارٹر حاصل کرنے
میں خرچ کرنا شروع کیا"

اس یونیورسٹی کی ابتدا کے طور پر سردار نادر خاں کی مالی امداد سے ایک اسکول بھی قائم ہو گیا لیکن
انگریز پرست افغانوں کی شہ پر اس میں اشتراک کرائی گئی، اور بعد میں حکومت نے مجوزہ یونیورسٹی

کو جانے دینے سے انکار کر دیا۔

مصنف لکھتے ہیں کہ ان تمام امور سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ حکومت افغانستان نے اب انگریزوں سے صلح کر کے ہندوستانی قوم پرستوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا...... قبلہ مولانا صاحب مرحوم کے لیے صرف دو طریقے باقی رہ گئے۔

(۱) افغانستان میں بالکل خاموش بیٹھ جائیں اور باقی زندگی سیاست سے کنارہ کشی کر کے بالکل بیکار گزاریں۔ یہ طریقہ کار ان کی سیاسی موت کے مرادف تھا۔

(۲) افغانستان چھوڑ کر کسی اور ملک میں رہیں اور وہاں سے انگریزوں کے برخلاف اپنا کام جاری رکھیں۔

آخری فیصلہ کرنے کے لیے قبلہ مولانا نے تقریباً ایک سال غور کیا اور آخر روس کے راستے ترکی پہنچنے کی تجویز طے پائی۔

مولانا عبید اللہ صاحب ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچے تھے اور اس سے چند ماہ پہلے مارچ ۱۹۱۵ء میں ظفر حسن صاحب اور ان کے ساتھی افغانستان میں داخل ہوئے تھے۔ ۷ سال بعد ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو مولانا ظفر حسن صاحب اور بعض دوسرے ہندوستانی نوجوان روسی علاقے میں داخل ہوئے۔ یہاں کتاب "آپ بیتی" ختم ہوتی ہے جو ظاہر ہے کہ اس کا پہلا حصہ ہے۔ خدا کرے اس کے دوسرے حصے بھی جلد شائع ہوں۔

محترم ظفر حسن صاحب...... کی "آپ بیتی" (حصہ اوّل) ایک ایسا تاریخی وثیقہ ہے جسے برصغیر کی اسلامی تاریخ کے ہر طالب علم اور سیاسیات سے علمی و عملی دلچسپی رکھنے والے ہر چھوٹے کارکن اور ہر بڑے لیڈر کو پڑھنا چاہیے۔ یہ محض گزرے ہوئے واقعات کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں عبرتیں اور سبق ہیں جو ہمارے لیے آئندہ مشعل کا کام دے سکتے ہیں۔

ظفر حسن صاحب نے "آپ بیتی" لکھ کر مسلمانان برصغیر کی بہت بڑی خدمت کی ہے اور ملی تاریخ کا وہ باب جو زینت طاق نسیاں بن گیا تھا، اسے انھوں نے دوبارہ ہمارے لیے تازہ کر دیا ہے ہمیں امید ہے کہ کوئی مسلمان پڑھا لکھا گھرانا اس کتاب سے خالی نہ رہے گا۔　(م س)

گزارش } اس شمارہ میں جن حضرات کو چندہ ختم ہونے کی اطلاع دی جا رہی ہے براہ کرم جلد از جلد اپنا چندہ ارسال فرمائیں ——— مینیجر

عکسی
حیاۃ الصحابہ اردو
چہارم پنجم ششم ہفتم
تالیف: حضرت مولانا محمد یوسف صاحب دامت بر
ترجمہ
حضرت مولانا محمد عثمان خاں صاحب فیض آبادی مدظلہ
شاگرد رشید شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ قدس سرہ
مؤلف مدظلہ کی شہرۂ آفاق کتاب حیاۃ الصحابہؓ عربی جو ہند، و پاک کے
ممالک اسلامیہ میں بھی قبولیت عامہ حاصل کر چکی ہے۔ اس کی جلد اول کے ترجمہ کے تینوں
اشاعت کا عالم یہ ہے کہ ایک ہی سال کے اندر دوسرا ایڈیشن بھی ہاتھوں ہاتھ نکل
چکا ہے اب عربی کی جلد دوم کے اردو ترجمہ کو چار برابر حصوں میں شائع کیا جا رہا
اردو ترجمہ کی خصوصیت
اس میں بھی مترجم موصوف نے اصل عربی الفاظ کو ترجمہ میں اس طرح سمویا ہے
مطلب واضح بھی ہو جائے اور ترجمہ بامحاورہ سلیس اور دلکش بھی بن جائے اور حضرات علمائے
اہل حق کی نظر میں ترجمہ کی خوبی و پسندیدگی نے تو کتاب کا معیار کافی بلند کر دیا ہے۔
کتاب خریدتے وقت
اصل مترجم حضرت مولانا محمد عثمان خاں صاحب کا اسم گرامی ضرور دیکھ لیں کیونکہ
کتاب کے پہلے تینوں حصوں کا ترجمہ بھی موصوف ہی کا ہے۔
کاغذ سفید، کتابت واضح، طباعت عکسی، ٹائیٹل حسین رنگین، ہر حصہ میں تقریباً دو سو (۲۰۰) صفحات۔
ناشر: احقر انیس احمد غفرلہ ادارہ اشاعت دینیات حضرت نظام الدین نئی دہلی ۱۳
حصہ اول، دوم، سوم
یکجا مجلد ریگزین ۱۰/-
حصہ چہارم، پنجم، ششم، ہفتم
یکجا مجلد ریگزین ۱۲/-